مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الکہف و سورۃ مریم —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الکھف و سورۃ مریم —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۃ الکہف وسورۃ مریم)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	فروری 2011ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

سورۃ کہف اور سورۃ مریم

میں نے اس سورت کے متن کو امعانِ نظر سے پڑھا ہے۔

الحمد اللہ یہ ہر قسم کی اغلاط سے پاک ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ ان کے متن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

حافظ قاری عطاء اللہ

مستند پروف ریڈ، تاج کمپنی لمیٹڈ

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔علامہ پرویز ؒ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورہ کہف

مطالب الفرقان فی دروس القرآن

پیش لفظ

پہلا باب: سورۂ کہف آیات 1 تا 22

خانقاہیت کے معاملے میں عیسائی یہودیوں سے بھی آگے تھے 30
خانقاہیت کا مسلک خدا کے تصور حمدیت کے برعکس ہے 03
قرآن حکیم انسان کو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، تخلیق کائنات پر
غور وفکر کرنے کی تاکید کرتا ہے 31
عبد کا مفہوم 32
قندیل آسمانی کی خصوصیات 32
باطنی علم اور روایات 33
کتاب اللہ کے دو مصرف 34
ہزار سال سے ہماری حالتِ زار 35
حق اور ذمہ داری لازم وملزوم چیزیں ہیں 35
ازل اور ابد کا قرآنی مفہوم 36
''ایک اور آنے والے کا تصور'' بہائیت
اور مرزائیت کا پیدا کردہ ہے 37
خدا کے بیٹے کا تصور 37
خدا عرش پر ایک تخت پر ارجمند ہے 38
جہالت پر فخر کرنے والی قوم ایمان نہیں لاسکتی 39
کائنات میں حسن کی فراوانی 40
ترک دنیا کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا 40
داستان کہف کی حقیقت 41
شام میں تو پہلی خانقاہ بنانے والے کا نام ہی عثمان تھا 42
عیسائیت کا عروج 42
دین کے نفاذ کے لیے اصحاب الکھف کی تیار کردہ تدابیر 44
ایمائیت کی چند ایک مثالیں 45
اصحاب کہف کا اعلان 46
زمین کی ملکیت کی اتھارٹی کسی کے پاس نہیں 47
ہجرت کا مقصد 48
غاروں کی کیفیت 49
مرشد کا یہ لفظ خدا نے صرف اپنے لیے استعمال کیا ہے 50
غار کے اندر گذرنے والے لمحات کی کیفیت 50
باہر کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا

طریق اور پروگرام 51
باہر کے حالات کامیابی کی شکل اختیار کر چکے ہیں 52
اس کے بعد پھر مذہب اور خانقاہیت کے پرچار کا غلبہ 52
امت روایات میں کھوگئی 53
اصل سوال ان کی تعداد کا نہیں' ان کے عمل کا ہے 53
قرآن اور انجیل کے بیان میں فرق 54
قرآن کے نزدیک اصحب کہف کا مقامِ بلند 54
بات تو خدا کی طرف سے عطا کردہ معاشی نظام کی تھی 55
تصوف کی پہلی اینٹ شام میں دوسری صدی میں رکھی گئی 55
آج ہمارے ہاں خانقاہیت کی آبیاری کے لیے
شب و روز کی مصروفیات 56
قرآن حکیم تاریخ کے تمام پیچ وخم کو نکالنے کے
لیے نازل ہوا ہے 56

دوسرا باب: سورۂ کہف آیات 23 تا 44

حقیقت خرافات میں کھوگئی 58
مجاوروں کی داستان گوئی اور قسمتوں کا حال 59
لفظ انشاء اللہ کا استعمال 59
دراصل یہ ذمہ داری سے فرار ہے 60
جنت کا حصول تو قدم قدم پر موجود ہے 60
جرآت کا دوسرا نام ہی اعتراف حقیقت ہے 61
انسان کی نفسیاتی کیفیت اور توبہ کا مفہوم 61
میرا پروگرام اسلام کی تاریخ لکھنے کا بھی ہے 62
انشاء اللہ کا مفہوم 62
ہمارے ہاں لفظ انشاء اللہ کا استعمال اور اصل حقیقت 63
ان کی تعداد کے قصے اور تین سو سال تک انہیں
سلائے رکھنے کی کہانی 65
قرآن کے نزدیک اس داستان کو بیان کرنے کا اصل مقصد 65
عبادت کا مفہوم ہی حقِ حکومت ہے 66
ہندوستان میں بت پرستی کے خاتمے کا رواج 67
قوم کے زیور سے تیار کردہ بت 67
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جھنجھلاہٹ اور حضرت ہارونؑ کا جواب 68
فرقہ بندی مفاد پرستی پر مبنی ہے۔ امت پر مشکل ترین مرحلہ 68
نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ کی تاکید 69
جماعت کی اہمیت اور افادیت 70
منزل کے حصول کیلیے مصائب وآلام کا سامنا 71
جنت اور جہنم کا ذکر تشبیہات کے آئینہ میں 72
اجر ہمیشہ عمل سے مشروط ہوتا ہے 73
پہلے مزدوری بعد میں معاوضہ 74
جنت کی نعما 75
یہ نعمائے خداوندی صرف انسانی ذات کے ارتقاء کا ذریعہ ہیں 76
ایران کی فتح اور مالِ غنیمت 77
مالِ غنیمت امانت کے طور پر مرکز کے سپرد کیا گیا 78
امیر المومنین کا کردار 79
گفتگو کے انداز میں ساءت مرتفقا کا مفہوم سمجھانے کا طریق 79

دنیا بھی امیر کی اور جنت بھی امیر کی 80
انہوں نے ملت کو ایک فریب نفس میں مبتلا کر رکھا ہے 81
قیامت کے روز چوری کا واپس کرنا 82
اگر آبی وسائل کا یہ قانون ہی نہ ہوتا تو 83
ہمارے ہاں جاگیرداری کا تباہ کن نظام 84
تیسرا باب: سورۂ کہف آیات 45 تا 57
سیکولرازم، مذہب اور قرآن 87
جنت کے پروانوں کی لوٹ سیل sale 88
ایک ہی سکے کا دوسرا رخ 88
آخر کار کائناتی قوانین کو ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے 89
ہمارے ہاں کے عام تراجم 90
اشیائے کائنات کے متعلق قرآن حکیم کی تعلیم 90
ضروریاتِ زندگی کے دو پہلو 91
تغیر پذیر اور تغیر نا آشنا کی حقیقت 92
حیات جاوداں کا تصور اور اس کا حصول 93
ہر پیدا ہونے والا بچہ واجب التکریم ہے 93
افلاطون اور ارسطو کا نظریہ 94
قرآن حکیم کے آخری دو پاروں کی اہمیت 95
عربوں کے ہاں مجازی مفہوم کا استعمال 95
یہاں ایک جہانِ نو پیدا ہوگا 96
شہنشاہِ ایران یزدگرد کا انجام 97
مساوات انسانی کی لازوال مثال 97
تیری اور میری کی تفریق سے پہلے کا دور 99
قحط کے دنوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پہلا فرمان خلافت 99
نظام خداوندی کے بغیر آج دنیا بر کی حالت زار 99
نظام خداوندی کی خصوصیات 100
قرآنی فہمی کے لیے تصریف آیات کی اہمیت 101
شیطان اور ابلیس کی حقیقت 102
جن کا تصور 102
انسانی جذبات سائیکالوجی کے آئینہ میں 103
ابلیس کی ذریت اور لفظ عدو کی روشنی میں
باہمی عداوت کی بنیادی وجوہات 104
گدڑی والوں کے ذریعے جنت میں داخلہ 105
مقام نبوت کی انقلابی ذمہ داریاں اور ہماری خودساختہ روایات 106
کائناتی کنٹرول ذات خداوندی کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے 106
اس قدر تصریف آیات کے باوجود ذہنی طور پر جھگڑالو کیفیت 108
مورخ کے ذہن کی رسائی اور قرآن کا بیان کردہ فلسفہ تاریخ 109
حق کبھی حق کے ساتھ نہیں جھگڑتا 110
حق کے مقابلے میں کمینگی کی بات 110
انبیائے کرامؑ کی سنت 111
چوتھا باب: سورۂ کہف آیات 58 تا 82
عیسائیت کے مقابلے میں رحم اور سزا کا قرآنی تصور 114
مہلت کے وقفے سے فائدہ حاصل نہ کرنے والی قوموں کا حال 116
حضرت موسیٰؑ اور خضر کا افسانہ 116

خدا حقائقِ دین بیان کرتا ہے لطائف نہیں 117
مقامِ نبوت اور مفکر میں فرق 118
نبی گمراہ نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے 118
فرعونی سیاست سے بےزاری اور حقیقت کی تلاش میں سرگرمِ عمل 119
قرآن کا انداز بیان 121
تفاسیر میں مچھلی کی زیب داستان 122
انسان کیلیے نفسیاتی راہنمائی کی ضرورت 124
اہلِ طریقت کا علم لدنی اور اس کی حقیقت 125
صاحب علم کی ہدایت اور حضرت موسیٰ کی جذباتی کیفیت 126
خبر اور خُبر کے معنی میں فرق 127
کشتی کے سوراخ پر پہلا اعتراض 128
دوسرا اعتراض 129
تیسرا اعتراض 129
بلامزدو معاوضہ خدمت کا جذبہ 130
تینوں واقعات کی وجہ جواز اور مصلحت وحکمت 130
قتل کرنے کی وجہ 131
دیوار کو تعمیر کیوں کیا! 132
یہ بات نہیں ہے 133

پانچواں باب: سورۂ کہف آیات 83

خدا کا عطا کردہ دین عالمگیر انسانیت کیلیے ہوتا ہے 136
قرآن حکیم میں نام کے ساتھ تمام رسولوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟ 136
قرآن حکیم تمام صداقتوں کا مجموعہ ہے 137
حضرت عیسیٰ u کے متبعین کے متعلق انجیل کا بیان 137
قرآن حکیم کی شہادت اور کشادہ نگہی 138
قرآن حکیم میں خضر کا نام تک نہیں 139
قندیل آسمانی کی روشنی میں نقطہ نظر کی تبدیلی 140
ذوالقرنین (3500.600) کے قصے کا پس منظر 141
جناب ذوالقرنین سے مظلوم قوم کا مطالبہ 141
ذوالقرنین کون تھا اور اس نے کیا کچھ کیا 142
ایران والوں کی نسل پرستی 142
اصطخر کے مقام پر کھدائی کے دوران قرآن حکیم کی ایک شہادت 143
ذوالقرنین کا پہلا واقعہ 144
خدا کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا 145
ذوالقرنین کی پہلی مہم 145
دوسری مہم 146
ذوالقرنین کی تیسری مہم 146
ایرانیوں کا آج کا جشن اور قرآن کی چودہ سو سال پیش کردہ تحریر 147

چھٹا باب: سورۂ کہف آیات 83 تا 102

ذوالقرنین کا یہودیوں جیسی ضعیف وناتواں
قوم کو غلامی سے نجات دلانے کی روداد 150
یہودی قوم کو سوسالہ غلامی سے نجات دلانے کی مہم 150
ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق ایک ضروری وضاحت 150
لفظ قلنا کا استعمال 153
ذوالقرنین کا مشرق کی جانب سفر (دوسری مہم) 154

ذوالقرنین کی ایک اور اہم مہم 154
یاجوج وماجوج کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی تفسیری داسانیں 155
یاجوج وماجوج کون تھے؟ اور کیا کرتے تھے؟ 156
ہلاکو اور چنگیز کے ہاتھوں سے بغداد کی تباہی اور
عباسی سلطنت کا خاتمہ 156
اسلام کی بنیادوں پر ہر قسم کا نسلی تعلق ختم ہوجاتا ہے 157
سلمان فارسیt کے نزدیک ان کے والد کے نام کی نسبت 158
تین ہزار سال پہلے کے آثار قدیمہ کو پاکستان کا کلچر بتایا جاتا ہے 158
ہم نے عبرت کی ان طاغوتی قوموں کے
کھنڈرات کو پاکستانی کلچر بنادیا 159
اس ثقافت کے تحفظ پر کروڑوں کا خرچ 159
اہلِ مصر کی سوچ 160
عالم اسلام کا کلچر صرف اور صرف قرآنی معاشرہ ہے اور بس! 160
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ 160
خونی رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا 161
خدارا سوچیے کہ ہمارے ساتھ کیا کیا جارہا ہے: سوچیے اور بار بار سوچیے 162
ہمیں پوری قوم، پوری ملت کی نفسیات کو بدلنا ہوگا 162
قرآن حکیم میں ذوالقرنین کے تذکرے کی وجہ 163
اسلامی مملکت کا فریضہ معاشرے کو ہر قسم کے
ظلم واستبداد سے محفوظ کرنا ہوتا ہے 164
درہ دانیال کی یہ دیوار ہمیشہ کے لیے کام نہیں دیگی 165
آنے والے دور میں طاقت وقوت کے مظاہر 166
ان رکاوٹوں کا سہارا کب تک کام آئے گا؟ 166
صور پھونکنے کا مقصد جنگ کے لیے اکٹھا ہونا تھا 167
یہ جنگ خدا کے قوانین سے اعراض برتنے والی قومیں ہوں گی 168
قوموں کے مابین باہمی جنگ وجدل کی اصل وجہ 169
نوعِ انسانی کی ہلاکت کا علاج وحدتِ انسانیت میں مضمر ہے 169
سوال صرف باہمی اتحاد ہی کا نہیں، اس کی بنیاد کا بھی ہے 170
یہودی المذہب کے لیے اسرائیل کی نسل سے ہونا ضروری ہے 170
غریب قوموں کی مدد کرنا بند کردی جائے گی: امریکہ کا کردار 170
قوانین خدواوندی سے ہٹ کر کسی بھی اتحاد کا نتیجہ قلبی جہنم ہوگا 171

ساتواں باب: سورۂ کہف آیات 103 تا 106

سب سے زیادہ خسارہ پہنچانے والے اعمال 173
انسانوں کے لیے دو نظریاتِ حیات 174
حیوانی زندگی کا مقصود ومنتہیٰ 174
زندگی کا معیار کاروبار میں نقصان! کاروبار میں گھاٹا! 175
انسانی زندگی کے متعلق ہمارے دور کی ریسرچ 176
انسانی جسم کے اندر انسانی ذات کا اضافہ 177
انسانی اعمال کا انسانی ذات پر اثر 177
ذات خداوندی پر ایمان کا مفہوم 178
سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟ 178
نظریاتی طور پر دو قسم کے گروہ 179
مذہبی رسوم کے سلسلہ میں مسلمانوں کا ایک گروہ 180
غلطی کا احساس انسان کی خوش بختی ہے 181

ربوٰ کی مختلف شکلیں 182

جب کوئی برائی حسنات دکھائی دینے لگ جائے تو

انسان فریب نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے 183

صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم 184

اذان میں اللہ اکبر کے الفاظ کوئی رسم نہیں 184

صنعاً کا قرآنی مفہوم 184

قرآن فریب نفس کا پردہ چاک کر دیتا ہے 185

لاوڈ سپیکر پر اللہ کا ذکر 186

اللہ اکبر کا معنی خدا کے قانون کی بالادستی ہے 186

اس کے باوجود ہماری سوچ آج بھی یہی ہے 187

لقا کا قرآنی مفہوم 188

قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت 189

ترازو بھی کھڑا نہیں کیا جائے گا 190

آٹھواں باب: سورۂ کہف آیات 107 تا اختتام

اعمال کے بے وزن ہونے کی وجہِ جواز 192

ہر عمل اپنی نتیجہ خیزی سے پہنچانا جاتا ہے 193

سوچا کرو 195

دوسرے طبقہ کی سوچ 195

دین کی صلوٰۃ اور مذہب کی صلوٰۃ میں فرق 196

حج کا مقصد، پروگرام اور اہمیت 197

آخر کار ہمیں کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا 198

خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی مذاق نہیں ہے 198

جنت کسی مقام کا نام نہیں بلکہ قرآنی نظام حیات کی

خصوصیات کا نام ہے 199

جنت بخشش کے طور پر نہیں ملتی یہ تو انسان کے

حسن عمل کا نتیجہ ہوتا ہے 199

شرفِ انسانیت قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے 200

خدا کے ہاں مہمان داری کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ دراز 201

خدا کا نظام ربوبیت تو اپنے اندر نہ ختم ہونے

والی وسعت لیے ہوئے ہے 201

جیمز جینس کی نظر میں کائنات کی وسعت 201

کائنات کی وسعتوں کی حقیقت 202

حجرہ میں مصلے پر بیٹھے کرہِ ارض کی سیر کی 203

میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں لیکن مجھ پر وحی ہوتی ہے 204

صاحبِ اقتدار صرف ذاتِ خداوندی ہے 204

دین کی ساری بنیاد ہی صرف اور صرف اس پر ہے

کہ اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے 205

قرآن حکیم کی روشنی میں عبادت کا قرآنی مفہوم 206

''معاشرہ میں قانون انسانوں کا ہو اور عبادت خدا کی''

یہ ممکن ہی نہیں 206

کعبہ کے اندر 365 بتوں کی جمہوریت 207

❀❀❀❀

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورہ مریم

مطالب الفرقان فی دروس القرآن

نواں باب: سورۂ مریم (تمہیدی نکات)

اصحاب الکہف کی قبروں کو خانقاہوں میں بدل دیا گیا 212

تصوف کی پہلی خانقاہ 153 ہجری میں قائم ہوئی 213

سورۃ الکھف دین کو مذہب میں بدلنے کے طریق سے آگاہ کرتی ہے 213

ہر نبی کی زندگی بڑی مجاہدانہ زندگی ہوتی ہے 214

دسواں باب: سورۃ مریم (1 تا 7)

حروف مقطعات کی حقیقت 215

عبدہ کا مقامِ بلند 216

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وادی غیر ذی زرع میں کعبہ کی

تولیت کیلیے چن لیا گیا 217

بنی اسرائیل کا شجرِ نسب 218

نبوت کا انتخاب قوانین خداوندی کی رو سے ہوتا تھا 218

منصب کے انتخاب کا اصول 219

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل کی آرزو 220

ہمارے ہاں تو حضرت صاحب اپنی مکھی کو بھی خود نہیں اڑاتے 220

حضورؐ کے اسوہ کی عظمت کی ایک روشن مثال 221

بڑھاپے کے احساس کے ساتھ ساتھ ایک وارث کی آرزو 222

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں وارث ہونے کی آرزو کیوں؟ 223

قرآن میں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا استعمال 224

گیارھواں باب: سورۃ مریم (8 تا 15)

قرآن ہمیشہ حقائق سے بحث کرتا ہے لطائف بیان نہیں کرتا 226

حضرت زکریاu کی بیوی میں کوئی طبعی نقص تھا 227

یہودیوں کے ہاں چپ کا بھی روزہ رکھا جاتا تھا 228

عربی زبان میں لفظ وحی کا مختلف انداز میں استعمال 229

قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ ہوتا ہے 230

حضرت یحیٰu کی عادات، عقل وشعور اور خصائل 231

حضرت مریم کی داستان کا آغاز اور غلط عقائد 231

انجیل کے بیانات کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی کم مائیگی 233

عیسائیت کے ان عقائد پر مسلمانوں کا ایمان 233

عیسائی دانشوروں کی تحقیقات لیکن ہماری صورت گری 234

پنجابی نبوت کا دعویٰ 234

وفاتِ مسیح کے متعلق دو مختلف متضاد عقائد اور بن باپ کا تصور 234

مرزا غلام احمد آف قادیان کا اعلانِ عام 235

آج دنیا بھر کا مسلمان ذہنی الجھنوں کا شکار بھی ہے
اور ذلیل وخوار بھی۔ آخر کیوں؟ 235

مسلمانوں کے ساتھ گہری سازش 235

اقبالh کی نظر میں ابلیس کی مجلس شوریٰ 236

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے 236

دین کو مذہب میں بدلنے کا نتیجہ 237

خدا کی تو کوئی بیوی ہی نہیں 237

حضرتِ مریم بطور راہبہ (Num) ہیکل کی نذر 238

ہیکل کی خودساختہ شریعت 239

ہیکل کی خودساختہ شریعت کے خلاف حضرتِ مریم کا جہاد 239

ان عبادت گاہوں کی ہوسنا کیاں 240

مجاوروں کی قرعہ اندازی 240

انجیل میں حضرتِ مریم کے خاوند کا نام یوسف نجار بتایا گیا 241

حضرت مریم کی ربوا کی طرف نقلِ مکانی 241

مرزا غلام احمد صاحب کا آسمان سے مینار پر اور مینار سے زمین پر اترنا 242

قادیان کو پہلے دمشق قرار دیا اور پھر مینار کی تعمیر کی 242

انجیل کے مطابق مجاوروں کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کی وعظ 243

حضرتِ مریم کے متعلق یہودیوں کا الزام لیکن قرآن کی گواہی 243

حضرت مریم کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں میں فرق 244

قرآن حکیم کی تعلیم کا تقاضا 244

آخر ہمارے ہاں ان عقائد کو اتنی اہمیت کیوں؟ 245

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تقابل 245

نبی اکرم علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی!! 246

رسول اللہ ﷺ کی وفات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کا آسمانوں پر زندہ ہونا 246

کفر اور اسلام کا معیار صرف قرآن ہے 247

احساس کمتری کے مہلک مرض نے قوموں کی قومیں تباہ کریں ہیں 248

بارھواں باب: سورۃ مریم (16 تا 21)

مروجہ تفاسیر کے سلسلہ میں بنیادی کمزوری 249

منکرِ حدیث کی ڈگڈگی بجانے والوں سے التماس:

جرح وتعدیل حدیث 250

کفر کے فتوے صادر ہونے کی وجہ 250

اہلحدیث کے نزدیک حنفی کافر اور حنفیوں کے نزدیک اہلحدیث کافر 251

قربانی کا مشترکہ بکرا: پرویز 251

بات اصل حقائق پر غور کرنے اور انہیں جاننے کی ہے 252

مسلمانوں کے ہاں عیسائیت کے دو بنیادی عقائد کی پیروی 253

سوچیے کہ آج کا مسلمان کہاں کھڑا ہے؟ 253

ہیکل میں بالغ لڑکیوں کی شادی بذریعہ لاٹری...قرعہ 254

اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے درمیان میری حیثیت 255

حضرتِ مریم کے عظمتِ کردار پر قرآن حکیم میں اِصطفٰی کا لفظ 255

چچازاد بھائی یوسف کا کردار 256

عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام 256

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق وحی خداوندی کا بیان 256

طلوع اسلام پڑھنے والے کے نکاح کے متعلق
مولوی صاحب کا فتویٰ 256

قرآن حکیم کے نزدیک حضرت مریم کے قصے کی اہمیت کیوں؟ 257
حضرتِ مریم کی قدم قدم پر مخالفت کے باعث
ان کی مصر کی طرف روانگی 258
بچے کے ساتھ حضرتِ مریم علیہا السلام کی پریشانی 259
انڈیا کے اندر مسلمانوں کی طرف سے مجھ پر کفر کا فتویٰ 260
اے رسول! تُو ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتا 261
لفظ ''رسول'' کا استعمال 262
ہمارے ہاں کے وضع کردہ افسانے 262
حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف سے پیغام رسانی 263
روح کا لفظ وحی کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے 263
جبرئیل ایک انسان کی شکل میں؟ 263
حضرت مریم علیہا السلام کو پیغام 263
باہمی طور پر نفسیاتی کشمکش کی بنا پر پیدا ہونے والے بچے
کی کیفیت ایک حقیقت کشا واقعہ 265
اس جرات پر پادریوں کی طرف سے طوفان 266
ہمارے ہاں کے معاشرتی حالات کا آنے والی نسلوں پر اثر 266
حضرت مریم علیہا السلام کو تذبذب سے دور رہنے کی ہدایت 267
اس مقام پر قال کذالک کا لفظ غور طلب ہے 268
علامہ اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ ہم نے قرآن کو چیستاں بنا رکھا ہے 269
مرزا غلام احمد کی ایک مشکل کا تذکرہ 269
مذہب گرویدہ انسانوں کی رسائی 270
شخصیت اقبال اور پرویزؒ کی شاعری 270
''ایک وقت آئے گا کہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے شعر بھی
پھیکے پڑ جائیں گے 271
سب کچھ پڑھنے کے باوجود آخر سمجھنے والی کون سی بات باقی ہے؟ 271
قرآن کو سمجھنے کا طریقہ 271
مذہب کے چھٹکارے کے لیے دس سال کا طویل سفر 272
مجھے فخر ہے کہ میں کافر باطاغوت ہوں 272
میری چالیس سالہ محنت کا ماحصل 273
کامیاب زندگی کے لیے ''میرا رب اللہ ہے''
کہنے کے بعد اس پر جم کے کھڑے ہونا ہوگا 274
آخر فرشتے نازل ہوکر کرتے کیا ہیں؟ 274

تیرھواں باب: سورۃ مریم (22 تا 40)

انسانی ذہن پر ہپناٹزم (Hypnorism) کا اثر گہرا ہوتا ہے 278
مذہبی اعتقادات سے نجات پانا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے 279
زبان کا عام انداز 280
پریشانی کی انتہا 280
وضع حمل کے وقت پریشانی کا عالم 281
باغ والے کی طرف سے عملی اور نفسیاتی سہارا 282
بچے کی پیدائش کے متعلق اگر کوئی سوال کرے تو؟ 282
بچے کی پیدائش کے بعد گھر والوں میں واپسی 283
وطن واپسی پر حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ بدزبانی 284
ہمارے ہاں کی افسانہ نویسی 285
ہیکل کے پجاریوں کا غرور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب 285
مذہب میں عقل کو دخل نہیں ہوتا 286
ہیکل کی سیڑھیوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریر 287

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وضاحت 289
مجھے خدا کی طرف سے مشن عطا ہوا ہے 290
یہودیت اور عیسائیت کے مابین چپقلش کی وجہ جواز 291
زمین و آسمان پر خدا کی حکمرانی کا نام قرآنی انقلاب ہے 291
مذہبی پیشوائیت کا مطالبہ 293
تحریک پاکستان کی مخالفت کی وجہ 293
صلیب کے سلسلہ میں تختی کی عبارت 294
سینٹ پال کا وضع کردہ عقیدہ 295
کن فیکون صفات کی حامل ہستی کا جواب 296
دینِ خدا تو فرقوں کی موجودگی میں کبھی باقی رہ ہی نہیں سکتا 296
فرقہ بندی کی ایک پختہ نشانی: مسجد الگ، نماز الگ 297
مسجد ضرار کی تعمیر 297
الگ نماز کا پڑھنا بھی فرقہ بندی ہے 298
موجودہ حالات میں اس فرقہ بندی کا علاج 298
امت واحدہ کی پہلی نشانی 299
بہائیوں کا اعلان 299
اہلِ قرآن کا فرقہ 299
طلوعِ اسلام والوں کی نہ کوئی الگ مسجد ہے اور نہ کوئی الگ نماز 300
مکاتب فکر اور فرقے میں کیا فرق ہے؟ 300
اگر یہ مکاتب فکر ہیں تو پھر فرقے کہاں ہیں؟ 300
آج ساری امت حسرت کا مجسمہ ہے 302
قرآن حکیم کی صدر اول کے مسلمانوں کو وارننگ 303

چودھواں باب: سورۃ مریم (آیت 41)

کچھ ذکر حضرت ابراہیمؑ کا 304
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم و فراست 305
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی دعوت کا انداز 306
ابوسفیان ہرقل کے دربار میں 307
بلندیٔ کردار کا ثبوت 308
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سچائی کے
باوجود قرآن کی حامل قوم کا بہتان 308
اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا بیان اور اس کی حقیقت 309
بات کو سمجھنے کا طریق 310
فنظر نظرۃ کا قرآنی مفہوم 310
مومن کا ایمان تو ہمیشہ تنقیدی ہوتا ہے 311
لفظ سقیم کے معنی اور اس کا استعمال 311
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بہترین نمونہ ہے 311
شاعری لطائف ہوتی ہے جبکہ رسول حقائق بیان کرتا ہے 313
بات کرنے کا ایک موثر ترین انداز 313
بات کرنے کے لیے ابراہیمی علیہ السلام کا انداز چاہیے 315
جھوٹا شخص کبھی بردبار نہیں ہوتا 316
حضرت ابراہیم علیہ السلام پر تیسرا بہتان 316
تورات کی یہ باتیں ہمارے ہاں کیسے؟ 317
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے
متعلق قرآن حکیم کا فرمان اور ہمارے ہاں کی روایات 318
وضعی روایات کی تائید میں تاویلیں 319
سچ کے لیے جھوٹ کے سہارے کا انجام 319

برادرانِ عزیز! میں یہ کچھ نہیں کہہ سکتا 320

ان روایات کی آڑ میں مودودیؒ صاحب کا فتویٰ اور انبیاء کی سیرت 320

ضرورت صرف قرآن حکیم کو معیار قرار دینے کی ہے 321

دار العلوموں سے فارغ التحصیل طالب علموں کی حالتِ زار 321

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے 322

مختلف مساجد میں نوکری کی تلاش 322

مسجد ضرار کی تعمیر اور قرآن 324

یہ قرآن کے علی الرغم کیوں؟ 325

فرقوں کے مٹنے سے الگ الگ کاروبار ٹھپ ہوجائے گا 226

بت پرستی میں ہندووں جیسا Sincere کون ہوگا 326

صداقت کی دلیل کسی کا خلوص نہیں بلکہ خدا کی سند ہے 326

پندرھواں باب: سورۃ مریم (آیت 42 تا 50)

انسانوں کی اپنی مطلب براری نے انبیا کی سیرت کو داغ دار کر رکھا ہے 329

انبیاء کرام کے علاوہ قرآن میں کئی ایک دوسری شخصیات کا ذکر قابلِ غور ہے 330

قرآن کی نظر میں جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے کی قدرومنزلت 331

حضرت مریم علیہا السلام کی عظیم شخصیت 332

غلط نظریات کا عالمگیر انسانیت پر اثر 333

بیٹے کا باپ سے خطاب 333

والدین کی اطاعت کے سلسلے میں رام کا کارنامہ 334

''ماں باپ کی اطاعت فرض ہے'' کے تصور کی حقیقت 335

حضرت ابراہیم کا کردار ابتدا سے ہی اطاعت کی بجائے اصول پر مبنی تھا 336

اولاد اور والدین کے لیے اطاعت کرنے اور کروانے کا ایک اپنا اپنا مقام ہے 336

بڑھاپے میں انسان کی ذہنی کیفیت 337

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے، اطاعت فرض نہیں ہے 338

حضرت اسماعیل کو بیابان ویرانے میں چھوڑ کر چلے جانے کی روایت 338

بیوی کی پریشانی اور خدا کا حکم 338

اپنی بہو کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کیلیے پیغام 339

اطاعت صرف قرآن کی فرض ہے حتیٰ کہ کسی نبی کی بھی نہیں 340

دراصل یہ مسلمہ انسانی عقل وفکر کے لیے بوجھ ثابت ہوتا ہے 340

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم 340

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ کے ساتھ ان کے معبودوں کی بابت گفتگو 342

ہندوستان میں پیپل دیوتا کے درخت پر فسادات 342

دیوتے کو پانی پلایا جارہا ہے 342

دو دیوتاؤں میں لڑائی 343

پیپل کی ٹہنی اور تعزیے کا جلوس 343

پیر کی قبر کے تبرک واحترام کا تو مجھے آج تک یاد رہے 344

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جرات اور حق گوئی وبیباکی 344

اتباع اور اطاعت میں فرق 345

اتباع کا مفہوم 345

قومیت کی پہلی اینٹ	346
شیطان کے لیے بھی عبودیت کا لفظ استعمال ہوا ہے	346
جب کسی سے کوئی جواب نہیں بن پائے تو پھر؟	348
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کو جواب	
''خدا تجھے سلامت رکھے''	349
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے	
اس سلامتی کی تمنا کے برعکس ہمارے ہاں استغفار کا مفہوم	349
حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بردبار صفات کے حامل تھے	350
صداقت کو اپنائے بغیر سہارا اور برداشت پیدا نہیں ہوسکتی	350
انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت	351
عربوں کے ہاں حلیم کا مفہوم	352
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت قرآن کی نظر میں	352
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوشش اور آپکا کردار	353
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کھلے بندوں عام اعلان	353
نظریہ قومیت کی تعریف	354
خدا کی طرف جانے کا مفہوم	354
لفظ شقیاً کا قرآنی مفہوم	355
نسلوں تک صداقت ورفعت اور سرفرازی کی نعمت کا ملنا	355
نہ معلوم روزِ قیامت قرآن کی اس روشن تعلیم کے	
سامنے ہمارا کیا جواب ہوگا	356
سولھواں باب: سورۃ مریم (آیات 51 تا 54)	
استبداد کی تین مہیب شکلیں	357
دوسروں کے ساتھ لڑنے کے لیے عسکری قوت اور	
اقتدار کی فروانی کی مالکہ مذہبی پیشوائیت	358
فرعون کے مقابلے میں دو نبی یا دو رسول	358
قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے کی تلقین ہے	359
رسولاً نبیاً' یہ دونوں الفاظ اکٹھے کیوں آئے؟	359
جواہر لال نہرو کے لیے رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم	
کے الفاظ پر اعتراض	359
نبی کے الفاظ میں ہیگل کا منصب	360
رسالت کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا	361
امت میں دعویٰ نبوت	361
وحی کا نام کشف یا الہام رکھ لیا	362
پنجابی نبی کی پہلی زندگی اور ان کی نبوت کی منطق	362
تصوف کا باطنی علم	363
میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے رسالت کا نہیں	363
ایک خودساختہ روایت	363
تصوف کی خلوت گاہوں کا علم	364
تصوف کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کا چھٹا لیکچر	364
تصوف کی دنیا میں انسان کی چلہ کشیوں اور ریاضتوں کی حقیقت	365
میں بھی ایک زمانے میں اس کشف والہام کا مہابلی ہوتا تھا	366
دیوبندی حضرات کا نظریہ حیات	367
مولا حسین احمد مدنی بھی صاحب کرامت تھے	367
سرسیدؒ کا جواب مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق	368
مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے نزدیک نبی اور رسول میں فرق	368
نبی ہے اور وہ رسالت کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے	369

نبی اور رسول ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں 370
رسالت کے سلسلہ میں ایک اہم ترین وضاحت 370
قرآن حکیم کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کرنے کا انداز 371
نزولِ وحی کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے لیے محسوس سے محسوس ذرائع بھی ختم کر دیئے گئے 371
ویلی جٹی اُن ویلے 372
ہمارے ہاں یونانی فلسفہ اعتقادات کی حد تک جا پہنچا 372
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم خدا وندی با الفاظ تھا 372
دراصل وحی جلی اور وحی خفی کا عقیدہ یہودیوں کا عقیدہ تھا 373
حقائق کو تسلیم کرنے کی بجائے کفر کے فتویٰ 374
معیار نسل کا نہیں' نظریات کا ہے' Idelogy کا ہے 375
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولا دشجرہ نسب 376
بنی اسرائیل کا وضع کردہ نسل پرستی کا عقیدہ 376
یہودیوں کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مخالفت
اور ہماری روایات 377
یہودیوں کے ہاں ایک آنے والے کا انتظار 377
انسان دوستی بھول جاتا لیکن عداوت نفسیاتی طور پر کبھی نہیں بھولتی 378
اس تنزل اور مسکنت کا علاج نسل پرستی کے عقیدے میں نہیں 378
آج امت کی ناگفتہ بہ حالت 379
اسرائیل کے خطوط پر ہماری نسل پرستی 379
وعدہ کی اہمیت 380
مغرب کے مفکرین کے نزدیک انسان کی تعریف 380
نیٹشے کا قول: انسان وہ ہے جو بدلتا نہیں 381

سترھواں باب: سورۃ مریم (آیت 55)

انسان اور حیوان میں فرق 383
قرآن کی تعلیم کے مطابق اہل کا مفہوم 384
صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے حکم کی اہمیت 384
قرآن حکیم میں قانون کا لفظ نہیں آیا اور نہ ہی نظام کا
لفظ ان معنوں میں آیا ہے 385
کلمۃ اللہ کا لفظ نظام اور قانون خداوندی کے مفہوم کا ظاہر کرتا ہے 385
بیت المال کا اور سٹیٹ بنک کا ایک ہی مفہوم ہے 386
محمد اقبالؒ اور محمد علی جناحؒ سے علماء کرام کے تنازعہ کی وجہ 387
مولوی حضرات کے نزدیک امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کا مفہوم 388
اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیات 388
نبیؐ کا تمکن فی الارض حاصل کرنے پر دوسرا اعتراض 388
حکومت کا فریضہ زکوٰۃ لینا نہیں بلکہ زکوٰۃ دینا ہے 389
زکوٰہ کا مفہوم سامانِ نشو ونما کا مہیا کرنا ہے 389
ہر فرد' مملکت کا بھی فرد ہے اور نوعِ انسانی کا بھی 389
اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح کا مفہوم سوشل سسٹم کی شکل میں پورا ہوگا 390
صلوٰۃ کی یہ ظاہرہ شکل نماز بھی ضروری ہے 390
قدم قدم پر نفسیاتی کیفیت کا اظہار 390
بالارادہ حرکات کے اظہار کی اہمیت 391
صلوٰۃ کے معنی فرائض منصبی کا ادا کرنا ہیں 391
قرآن کا سوشل سسٹم اور اکنامک سسٹم 292
ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ذات کی نشو ونما بھی 393
کمیونزم انسانی ذات کو تسلیم نہیں کرتا 393

تزکیہ کا قرآنی مفہوم 393
تربیت کے معنی ربوبیت کے ہیں 394
حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ اور ہماری نماز میں فرق 394
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قابلِ غور الفاظ 395
قرآن اردو یا انگریزی میں نہیں بلکہ عربی میں نازل ہوا ہے 396
قرآن تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں راضی برضا کا تصور 397
دنیا میں سب سے مشکل کام' سوچنا ہے 398
ان الفاظ کا ترجمہ ہی قوانین خداوندی سے ہم آہنگی ہے 399
حکم اور ہدایت میں فرق 399
رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کا دوسرا نام ہی
باہمی رفاقت ہے 400
واقعہ معراج کے تحت قاب قوسین کا مفہوم 400
رفیق اعلیٰ کی کمان اور انسان کی کمان کا باہمی ربط 401
باہمی رفاقت کی کیفیت 402
مولوی صاحب کی علمی بصیرت اور رسالت کا مقامِ بلند 403
میدان بدر کا ذکر قرآن حکیم کی نظر میں 403
ایک اہم بات کی وضاحت 404
ہر ایک کی مشیت میں اپنا اپنا اختیار 405
قرآن کی منشا یہ ہے کہ انسان کی مرضی خدا کی مرضی
کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے 406
حکم اور قانون میں فرق 407
کلمات اللہ کبھی تبدیل نہیں ہوتے 407
اطاعت کا مفہوم 407
اطاعت اور Duty میں فرق 408

اٹھارھواں باب: سورۃ مریم (آیت 56 تا 61)

کیا حضرتِ آدم نبی تھے؟ 410
حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق وغریب روایت 411
مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کا مینارا لمسیح 412
خدا کے تصور کی اہمیت 412
لفظ ظھریا کا مفہوم 412
دین میں اصل چیز خدا کا تصور ہے 413
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں اوپر آسمانوں
میں اٹھا لینے کی حقیقت 414
ہمارے ہاں عرش کا غلط مفہوم 414
انسان تو اپنی جان کے متعلق بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ
جسم میں کہاں ہے اور کسی ہے 415
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمانوں پر پانے کا
تصور کس طرح پیدا ہوا 416
صفاتِ خداوندی کا ظہور حدِ بشریت میں 416
تخلیق یا خلق کا مفہوم فاطر کے مقابل نہیں لایا جا سکتا 417
حیوانات میں تولید ہوتی ہے' تخلیق تو ہوتی ہی نہیں 418
قربِ خداوندی مدارج کی بلندی کا دوسرا نام ہے 418
جسمانی طور پر جان کا کوئی مقام متعین نہیں 419
شیطان کے ہر آن' ہر جگہ' شہ رگ سے بھی نزدیک
تر موجود ہونے کا عقیدہ 419
دین کو مذہب میں بدلنے کا موثر ترین طریق 419

انسان کے اپنے سرکش جذبات کا نام ہی شیطان یا ابلیس ہے 420
دینِ خدا میں خدا صحیح تصور کی اہمیت 420
خدا پر ایمان کے سلسلہ میں ہماری کیفیت 421
قرآن انسان کے ذہن میں ایک اپنا تصور قائم کرتا ہے 421
انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں مذاہب عالم کا مشترکہ تصور 422
قرآن تک رسائی کے لیے تمام غیر قرآنی تصورات سے کفر اختیار کرنا ہوگا 423
ہم نے تو جنوں کا نام ہی خرد رکھا ہوا ہے 424
یہودیوں کا پہلا جرم نسلی امتیاز تھا 425
غیر از بنی اسرائیل جنت میں جا ہی نہیں سکے گا 426
جنت میں داخلے کی لیے ختنے کی پہچان 426
بچوں کے ختنے جنت کے باہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کرینگے 426
حضرت ابراہیم کی ذریت سے کیا مراد ہے؟ 427
سجدہ کرنے کا مقصد تو قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوتا ہے 427
بکیاً کا مفہوم 428
جبر کی اطاعت اور دل و جان کی اطاعت میں بنیادی فرق ہوتا ہے 429
ہمارے ہاں صلوٰۃ کو ضائع کر دینے کا مفہوم 429
سرکش جذبات کا اتباع کرنا دراصل صلوٰۃ کا ضائع کرنا ہے 430
قرآن تو آج بھی قدم قدم پر پکار رہا ہے 430
توبہ کا مفہوم 431
قدرت عرقِ انفعال کے قطروں کو کبھی ضائع نہیں کرتی 431
عین موت کے وقت تو چلنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی 432
نتیجہ ہمیشہ عمل کے بعد نکلتا ہے مومن کا بالغیب پر ایمان 432
لاہور یا پنڈی ہمارے پاس نہیں آتا بلکہ ہم اس تک پہنچتے ہیں 433
جنت تک پہنچنے کے لیے انسان کو ہی یہ فاصلہ طے کرنا ہوگا 433

انیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 62 تا 67)

جنت کی چند ایک خصوصیات 435
جنتی زندگی کے ایک ایک سانس کو محفوظ کیا جائے گا 435
معاشرے کی مثال تو گھڑی کے پرزوں کی سی ہے 436
اس دنیا میں اجتماعی زندگی کے لیے انسان کی انفرادی کوشش 437
زندگی کا ایک ایک سانس، جو بے مقصد ہے وہ باطل ہے، لغو ہے 437
ہمارے تراجم نے ہمیں قرآن سے بیگانہ کر دیا 438
انگریزی زبان میں مختلف قرآنی الفاظ کے مختلف تراجم کی مثال 438
قرآن حکیم نے نجات کے لفظ کی بجائے **فوز العظیم** کہا ہے 439
سوشلزم، کمیونزم اور موجودہ اشتراکیت کے اندر روٹی، کپڑا، مکان ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا ہے 440
سلامتی کے ساتھ "سالم" زندگی کا ایک لازمی جز ہے 441
تکمیلِ ذات اور حیاتِ جاویدانی کے حصول کا معیار اور پیمانہ 441
ایک فرد دوسرے فرد کی تکمیل ذات کے لیے کوشاں 441
اپنی ذات کو تندرست و توانا بنائے رکھتا کہ کارواں کا ہم رکاب بنا رہے 442
آزادی اوپر سے نہیں اترتی: قوم کو اس تک جانا ہوتا ہے 442
اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے تم کیا سلوک کرتے ہو 443
وراثت کا مفہوم 444

ہمارے لیے پاکستان کی یہ مملکت اجرا العالمین نہیں ہے	445
جنت کے حصول اور ملائکے کے نزول کے لیے	
استقامت شرط ہے	445
فرعون کی فرعونیت کا دارومدار	446
اس دنیا کی زندگی میں خدااور کائناتی قوتوں کی رفاقت کا مفہوم	447
وہاں تو خدا خود میزبان ہوگا	447
درود کی حقیقت اور اہمیت	448
قرآن کی روشنی ہر شے کی حقیقت کو آشکار کر دیتی ہے	449
جنت کی پہلی خصوصیت ہی خوف وحزن سے محفوظیت ہے	450
کوئی بات بھی کسی دوسرے سے چھپی نہ ہوگی	451
جہنمی معاشرے کی کیفیت	451
یہ کچھ دینے اور عطا کرنے کے باوجود خدا شکریہ تک کا	
بھی متمنی نہیں ہوگا	452
قرآن حکیم کی نظر میں زمانہ حال کے تصور کی حقیقت	453
ارض سماوات کی حقیقت	454
اجرامِ فلکی میں جاندار مخلوق کا باہمی ملاپ	455
انسانیت کی سطح زندگی کا ارتقاء	455
دہقان سے لے کر نیوٹن تک کیلیے اعترافِ حقیقت	456
زندگی کا خاتمہ موت سے نہیں ہوتا	457

بیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 68 تا 75)

مستقل اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے اقتدار اور	
دولت کے حصول کا نتیجہ	458
آخری مقام پر جب علت ومعلول کی کڑیاں بھی ختم	
ہو جاتی ہیں تو پھر؟	459
آخر کار سرکشی کرنے والوں کو گھیر گھیر کر، کھینچ کھینچ کر	
چھانٹ چھانٹ کر، نکال لیا جائے گا	460
زندگی کے اس مرحلہ پر آئندہ زندگی کی شکل وصورت	
اور ہیئت وطبائع کو کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا	460
ہر دو فریقین کے لیے سزا	460
کوئی سچا آدمی کسی جھوٹے کو اپنا نمائندہ نہیں بناتا	461
دراصل زندگی کے یہ حقائق موجودہ انسانی معاشرے	
کے متعلق بھی ہیں	462
ہمیں اپنی اس سوچ کا رخ بدلنا ہوگا	462
جہنم کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے مروجہ تراجم	463
بنی اسرائیل کے نزدیک جہنم اور جنت کا تصور	464
جنت اور جہنم کا یہ تصور بنیادی طور پر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے	465
انسان کی تندرستی کا دارومدار قوتِ مدافعت کی اہمیت میں مضمر ہے	466
قرآن حکیم کے نزدیک حصول جنت کا فارمولا	467
قرآن حکیم میں تو سزا کا تصور ہی نہیں ہے	468
اقبالؒ کی محفل میں عظمتِ قرآن عظیم اور مکتب وملا کا مقام	468
المطہرون کا قرآنی مفہوم	469
لفظ وارد اور صادر کا قرآن مفہوم	470
پل صراط مجوسیوں کا تصور ہے نیز یہ لفظ عرب کا بھی نہیں	470
اہل جنت اور اہل جہنم کے مابین فرق	471
سوائے متقیوں کے جہنم سب کے لیے	472
نجات کا غیر قرآنی تصور	473

یہودیت اور عیسائیت کے اس تصور کے بعد ہندوؤں کا تصورِ نجات 473
تصوف کی دنیا میں نجات کے عقیدے کی کیفیت 474
نجات کا ملخص 474
نجات کا یہ ملخص خدا کی شان کے شایان نہیں 475
قرآن حکیم انسانی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو عملِ پیہم کی
دعوت دیتا ہے 476
آج کا انسان اگر یہاں کی زندگی کی آخری کڑی ہے
تو اُخروی زندگی کی ابتدا بھی ہے 476
اس زندگی میں تو انسان نے اپنی صلاحیتوں کو مشہور کرنا ہوتا ہے 477
فتح مکہ کے بعد مجرمین قریش کی کیفیت 478
ہماری غلط نگہی اور اس کی حقیقت 478
کہاں وہ اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ! زندگی کی دو رخی تصویر 479
مہلت کے وقفہ کی اہمیت 480
خدا کی صفتِ رحمانیت اور قرآنی لفظ الساعۃ کا مفہوم 480
درد کی شکل میں خطرے کی گھنٹی بھی ایک رحمت ہے 481

اکیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 76 تا 87)

مالی وسائل کی فراوانی کو ہی کامیاب زندگی قرار دیا جاتا تھا
اور آج بھی یہی ہے 484
بدترین معاشرے کی نشانی 485
حضرت نوح علیہ السلام کے دور کی معاشرتی حالت 485
اگر حشمت وقوت میں مستقل اقدار کی چاشنی شامل
نہ کی جائے تو پھر ہر لقمہ زہر آلود ہو جاتا ہے 486
مھدیٰ کا مفہوم 486
قرآنی لفظ سبلنا کا مفہوم 487
راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا 488
لفظ فانی اور لفظ باقی کا مفہوم 489
فنا کے معنی تغیر پذیر ہونا ہے، بنیادی طور پر اس کا ختم ہو جانا نہیں 490
جسمِ انسانی ہر آن تغیر پذیر ہے 491
انسان اپنی اس 'میں' کو اپنے ہی ہاتھوں سے مسل کر رکھ دیتا ہے 492
ثواب کا قرآنی مفہوم 493
ہر دو جہانوں میں عمل کے اجر (ثواب) کا ملنا 494
اس دنیا میں ثواب کے ریٹرن (Return) کی محسوس شکلیں 495
جتنا صرف کرو گے، جتنا مانگو گے، اتنا اور مل جائے گا، ختم ہی نہیں ہوگا 495
ثواب بخششیں نہیں بلکہ انوسٹمنٹ کی ریٹرن ہے 496
لفظ خیر کے تصور کا قرآنی مفہوم 497
نشو ونما یافتہ خودی کی کیفیت و ماہیت 497
ایسا شجرِ طیب جو موسموں کی قیود کا بھی پابند نہ ہوگا 497
باطل کا نظام افراد کی تعداد پر متشکل ہوتا ہے نہ کہ اصولوں پر 498
مفاد عاجلہ ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے 499
وارث کا قرآنی مفہوم 500
انسان کی ''میں'' اس کے ہر عمل کی ذمہ دار ہوگی 500
یہ تمام اضافی سہارے ختم ہو جائینگے 501
جنت میں متقین بحیثیت مہمان ہوگا 502
آخر میں مجرمین کی حالت 502
ہمارے ہاں شفاعت کا مفہوم 503
انسانی ذات پر اس کا ایک ایک عمل منقوش ہوتا ہے 504

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پورے
قرآن میں شفیع کا لفظ نہیں آتا 505
شفاعت کا قرآنی مفہوم 505
عدالت کی تمثیلی منظر کشی 506
شہادت کے لیے ذاتی علم کا ہونا ضروری ہے 507
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم کے متعلق شہادت 508
شفاعت کا ترجمہ سفارش کرنا غلط ہے 509
شفاعت کے متعلق یہ تصور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے 509
شفاعت کے سلسلہ میں وضعی روایات 509

بائیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 88 تا اختتام)

عیسائیت کا بنیادی عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے کفارے پر ایمان 512
عیسائیت کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی
دو خصوصیات اور ان کا مقصد 513
نہ ماننے پر عیسائیت سے بھی خارج اور اسلام سے بھی خارج 514
عیسائیت کے عقیدہ کی بنیاد کو تسلیم کر لیا 515
لایموت تو صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے 516
دو فرقوں کی قادرِ مطلق ہونے پر بحث اور اس کی حقیقت 516
خدا کی تو کوئی بیوی ہی نہیں 517
تولید اور تخلیق میں کیا فرق 518
اصل بات خدا کو ماننا نہیں بلکہ اس تصور کو قبول کرنا ہے
جو قرآن میں محفوظ ہے 519
عیسائیت کے ایمان اور مسلمانوں کے ایمان میں فرق 519
امریکہ سے اٹھنے والی آواز 519
خدا کو اس طرح ماننے کی کوئی اہمیت نہیں ہے
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں نبی اکرمؐ
کا مقام: بخاری کی ایک روایت 521
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا قصہ 522
مجھے تو اپنا صرف فریضہ ادا کرنا ہے 523
قرآن حکیم کی تعلیم انسانی ذہن کی تمام پیچیدگیوں کو دُور کر دیتی ہے 523
آخر کار تو یہ بھی خدا کی بارگاہ میں پیش ہونگے 524
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کیلئے اہلِ قریش کی دعوت 525
قرآن حکیم کے خلاف ایک گہری سازش یعنی قرآن
سات زبانوں میں نازل ہوا تھا 526
ذکر کچھ تفاسیر جلالین کا 527
قرآن حکیم کی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے والی قوموں کے
برعکس سوختہ بخت قوموں کی حالت زار اور اُن کا انجام 227
کتابیات 529

پیش لفظ

قرآنی معارف کو خود قرآن کی روشنی میں سمجھنے والے صاحبانِ علم وبصیرت کے لئے بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے سورۃ نحل اور سورہ بنی اسرائیل کے بعد اب اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی جو **سورۃ الکھف اور سورۃ مریم** پر مشتمل ہے پیش خدمت ہے۔

پہلی دو جلدوں کی مانند کتاب ہذا بھی اپنی مثال آپ ہے جہاں تک سورۃ الکھف کا تعلق ہے تو قرآن حکیم نے اس سورہ میں اصحاب کھف کی مجاہدانہ زندگی کی حقیقی داستان کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد انسانیت کو خانقاہیت کی ابتدائی تاریخ کے علاوہ اس کے تباہ کن اثرات کے حقائق سے آگاہ کرنا ہے تاکہ ہر آنے والا دور اس برگِ حشیش کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہے اور یہ جان لے کہ خانقاہیت کا مسلک خدا تعالیٰ کے تصورِ حمدیت کے بالکل برعکس ہے کیونکہ قرآن حکیم کی تعلیم جہاں انسان کو اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، تخلیق کائنات پر غور وفکر کرنے کی تاکید کرتی ہے وہاں وہ انسان پر یہ فریضہ بھی عائد کرتی ہے کہ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو مسخر کرتے ہوئے اسے نوع انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرے۔

سورۃ الکھف کے بعد سورۃ مریم کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم نے حضرت مریمؑ کی داستان حیات کو جس حقیقت بدوش اور حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ شاہراہ زندگی کے ہر مسافر کے لئے ایک چراغ راہ ہے۔ حضرت مریم کی ازدواجی زندگی کے سلسلہ میں: ۱۔ حضرت مریم بطور راہبہ ہیکل کی نظر ۲۔ ہیکل کی خودساختہ شریعت ۳۔ ہیکل کی خودساختہ شریعت کے خلاف حضرت مریم کا جہاد ۴۔ ان عبادت گاہوں کی ہوس ناکیاں ۵۔ اور مجاوروں کی قرعہ اندازی کی روداد کو پیش کرنے کے علاوہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور پھر موصوف کے ان خطبات کو بھی پیش کیا گیا ہے جو آپ نے اس دور کی مذہبی پیشوائیت کے نمائندوں کو خطاب کرتے ہوئے دیے۔

بہرحال مندرجہ بالا موضوعات کے علاوہ کتاب ہذا میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر اور اس پر سرسید احمد خاں کا تبصرہ بھی لائق مطالعہ ہے اور پھر آخر میں ذوالقرنین کے حقیقت کشا کردار کا پس منظر بیان کرتے ہوئے یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ

ذوالقرنین نے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ جن کی بنا پر خدائے علیم وخبیر نے انہیں اپنے ہاں اس قدر مقام بلند عطا کیا کہ پوری نوع انسانی رہتی دنیا تک آپ کا نام عزت واحترام سے لیتی رہے گی۔

قارئین کرام! یہ تمام کے تمام حقائق بڑی تفصیل کے ساتھ آپ حضرات کے ذوق مطالعہ کے لئے پیش خدمت ہیں جن سے ہر شخص اپنی اپنی بصیرت اور ذوق کے مطابق استفادہ کرسکتا ہے۔

نمائندہ بزم طلوع اسلام جناب محمد اشرف ظفر ہمارے خصوصی شکریہ کے حقدار ہیں کیونکہ درحقیقت یہ سارا پروجیکٹ انہی کے Initiative کا مرہون منت ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانیوں میں پتھر پھینکنے پر میں اشرف ظفر صاحب کو سلام کرتا ہوں، مجھے امید ہے کہ اب اشاعت کے اس عظیم منصوبہ کے لیے پیش کی گئی تگ وتاز سے تحریک کے دیرینہ جمود میں ذوق عمل کی لہریں ضرور پیدا ہوں گی۔

جناب ڈاکٹر منظور الحق کی زیرنگرانی دروس قرآن کو ضبطِ تحریر میں لانے کا یہ پروگرام رواں دواں ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ وہ سارے مسودے کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے مناسب حد تک اس کی Punctuation کا اہم کام سرانجام دیتے ہیں۔

ہم اس موقع پر دیگر احباب کے علاوہ محترم ایاز حسین انصاری (چیئرمین ادارہ طلوع اسلام، لاہور) کے احسان مند ہیں کہ جن کا شروع سے آخر تک پرخلوص حسن تعاون (کئی ایک مشکلات کے باوجود) پوری دل جمعی کے ساتھ اس تاریخی کام کی کامیابی کے لیے ممد ومعاون رہا۔

جس طرح قوانین فطرت کا وجود بالحق ہے۔ اسی طرح مطالب القرآن فی دروس الفرقان کو ضبط تحریر میں لانا مشیت ایزدی کے پروگرام کا حصہ ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ آفتابِ قرآن کی روشنی سے باطل کے تمام اندھیرے کافور ہو جائیں گے۔ خدا ہم سب کو نورِ قرآن سے اکتسابِ فیض کی توفیق عطا فرمائے۔

راقم اس موقع پر یہ مناسب خیال کرتا ہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کے نومنتخب چیئرمین جناب محمد شریف لون کا وہ مکتوب (جو اسی سلسلہ کی کڑی ہے) اور جو آپ نے محمد اشرف ظفر نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور کے نام تحریر کیا ہے قارئین کی خدمت میں بھی پیش کر دیا جائے تاکہ ان صاحب کے ایمان افروز خیالات سے ہم استفادہ کرسکیں اور مجھے یقین کامل ہے کہ محمد شریف لون صاحب کے خیالات بزم طلوع اسلام کے اراکین لیے بھی حوصلہ افزائی کا باعث اوران کے عزم کو پختہ کرنے کا سبب بنیں گے۔

عاطف طفیل

سیکرٹری بزم طلوع اسلام، لاہور

مکتوب محمد شریف لون

پریذیڈنٹ اقرا قرانک ایجوکیشنل سوسائٹی رجسٹرڈ فیصل آباد

محترم محمد اشرف ظفر صاحب......السلام علیکم

مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل کی جلد میں نے سرسری نظر سے پڑھی ہے۔ یہ پہلا ایڈیشن ہے جو اپریل ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا ہے۔

آپ نے اس سورۃ کی پہلی آیت کے ضمن میں علامہ پرویز مرحوم کے ابتدائی الفاظ تحریر کیے ہیں۔ آج ۸ جون ۱۹۷۵ء سے سورۃ بنی اسرائیل شروع ہوئی۔ قاری ۳۰ سال کی مسافت طے کرتے ہوئے وہیں 25/B گلبرگ کے لان میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں مرحوم اپنے مخصوص انداز میں درس کی ابتدا کر رہے ہوتے تھے۔ جن خوش بختوں کو دروس میں ذاتی طور پر شامل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے لیے تو اس کتاب کے اوراق قند مکرر کے مترادف ہیں اور وہ پرانی حسین یادوں کو تازہ کر لیتے ہیں۔ نئی نسل کے نوجوان جو قرآن کو اس خوبصورت انداز میں سمجھنا چاہتے ہیں کہ کوئی ابہام نہ رہے۔ کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ رہے۔ ان کے لیے یہ کتاب ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔

(۲) یہی درس آپ بذریعہ ویڈیو/آڈیو کیسٹس سنتے ہیں۔ اس کا ایک اپنا مقام ہے۔ مگر ذرا سی دخل اندازی پر سلسلہ درس منقطع ہو جاتا ہے۔ ٹیپ کا بند آگے نکل جاتا ہے۔ بے لطفی سی محسوس ہوتی ہے۔ بھری محفل میں پھر سے وئیں سے شروع کرنے کی درخواست کرتے ہوئے انسان کچھ سبکی سی محسوس کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی جلدی میں مختلف حوالہ جات یعنی آیت نمبر یا کوئی اور ریفرنس نوٹ نہیں کر سکتا تو پریشانی سی محسوس ہوتی ہے۔ مگر وہ اس کتاب سے درس کا مطالعہ کرتے وقت ایسی صورت سے درپیش نہیں ہوتا کسی بھی موقعہ پر متعلقہ صفحہ پر پنسل سے نشان لگا کر انسان بے فکر ہو جاتا ہے اور فارغ ہو کر پھر سے بغیر کسی تردد کے درس شروع کر سکتا ہے۔ نیز مختلف آیات اور دیگر حوالہ جات وغیرہ بڑے اطمینان سے اپنی ڈائری میں نوٹ کر سکتا ہے۔ اس طرح قاری کو کہیں دقت پیش نہیں آتی۔

مفکر قرآن درس دیتے ہوئے کسی بات کو واضح کرنے کے لیے پنجابی کے الفاظ بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اس سے بات نکھر کر سامنے آجاتی تھی اور سامعین کے اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ جہاں بھی ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا مفہوم اردو زبان میں حاشیہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے پنجابی زبان سے نابلد حضرات بھی بات کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ ہاں اہل پنجاب تو اس سے بہت ہی زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(۳) واقعہ معراج یا داستان بنی اسرائیل کو ہی لیجیے۔ علامہ صاحب مرحوم نے جن ٹھوس شواہد اور بے پناہ وضاحت سے کام لیتے

ہوئے ان دروس میں تاریخی اور روایتی حوالے دیئے ہیں۔ یہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بذریعہ آڈیو/ وڈیو کیسٹس تو یہ ایک مخصوص حلقہ تک ہی پہنچ سکتے ہیں مگر ان کو کتابی شکل دے کر ہمیشہ کے لیے عوام کے لیے عام کر دیا گیا ہے۔ اس سے بے شمار لوگ مستفیذ ہوں گے۔ قرآن فہمی کا سلسلہ کبھی کسی دور میں بند نہیں ہوا اور نہ گا۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں دروس قرآن کو تصریف آیات کی بنا پر پیش کیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بہترین ریکارڈ ثابت ہوگا۔ یہ ایک عظیم خزانہ ہے۔ جسے قلم بند کر کے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ آڈیو/ وڈیو کیسٹس میں یہ بات نہیں ہے۔ کبھی ٹیپ بوسیدہ ہو گیا۔ اور کبھی پلیر کام نہیں کرتا۔ کبھی بجلی نہیں ہے مگر یہ کتابی شکل میں بہت محفوظ ہے۔ جب وقت میسر ہو۔ فرصت کے لمحات مل جائیں۔ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(۴) ان دروس کو کتابی شکل دینا بڑا صبر آزما کام ہے۔ یہ خاراشگافی ہے۔ بلکہ تیشہ فرہاد سے نہر کھودنا ہے۔ جسے فکر قرآنی سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے دیوانوں نے کر کے دکھا دیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خوبصورت جلد میں اچھے کاغذ پر اس مہنگائی کے زمانہ میں برائے نام قیمت پر پیش کر دیا ہے۔ کیسٹ سن کر ان کو مختصر نویسی کے مرحلہ سے نکال کر اصل صورت میں لا کر کتابی شکل میں پیش کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ محمد اشرف ظفر صاحب کی یہ کاوش ان کے نام کو لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے زندہ و تابندہ رکھے گی۔

ان سے دیوانوں کی اے اہل جہاں قدر کرو
ان سے دیوانوں کے تاریخ میں نام آتے ہیں

(۵) علامہ مرحوم کے دروس کے ویڈیو/ آڈیو کیسٹس تو حلقہ طلوع اسلام سے باہر کم ہی لوگ مستفیذ ہوتے ہیں۔ اگر ان کو اسی طرح کتابی شکل دے کر اہل علم لوگوں تک پہنچایا جائے۔ تو اس کے بڑے اچھے اثرات برآمد ہوں گے۔

میری ان تمام احباب سے درخواست ہے جو یہ کتاب خریدیں وہ اسے اپنے تک ہی محدود نہ رکھیں۔ اسے پڑھ کر اپنی لائبریری/ الماری کی زینت ہی نہ بنا دیں۔ بلکہ اہل ذوق افراد کے نوٹس میں لائیں ان کو یہ کتاب مطالعہ کے لیے دیں۔ فارغ ہونے پر دوسرے شخص کو دیں۔ یہ کتاب آپ اپنے کسی عزیز کو خوبصورت پیکنگ میں بطور تحفہ دیں۔ اس قیمت میں تو آج کل ایک کیک بھی نہیں آتا۔ یہ کتاب تو جس کے پاس بھی جائے گی ایک یادگار ثابت ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ کتاب اس کو دیں جسے غور و فکر کی عادت ہو۔ تحقیقی کاموں میں دلچسپی رکھتا ہو۔ آپ اس کے اثرات دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور تقاضا کریں گے کہ علامہ پرویز صاحب مرحوم کے دیگر دروس کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

آخیر میں محترم ظفر صاحب! میں آپ کو ان کارہائے نمایاں کو سرانجام دینے پر تہہ دل سے مبارک پیش کرتا ہوں کہ آپ نے دروس کو بڑی محنت سے کتابی شکل دی ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ ان کاموں کے لیے آپ اتنا وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔

اور بھی غم ہیں غم دوراں کے سوا''

ایک التماس: قارئین کرام سے التماس ہے کہ تفسیر ہذا میں اگر قرآن حکیم کے متن میں سہواً کسی قسم کی کوئی کوتاہی رہ گئی ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔ مہربانی ہوگی۔

(نوٹ) جہاں کہیں آپ قرآنی آیات کے حوالہ جات دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے عرض ہے کہ ان میں سے ایک نمبر سورۃ کا ہے جب کہ دوسرا نمبر آیت کا ہے۔ یعنی 4:2 کا مطلب ہے 4: سورۃ النسآء کی 2: دوسری آیت۔

محمد اشرف ظفر نمائندہ بزم طلوعِ اسلام لاہور

مئی 2004

ایک ضروری گزارش

جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار دروس کو قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے مطالب الفرقان فی دروس القرآن کا یہ سلسلہ دراز اکتوبر ۲۰۰۳ء میں سورۃ نحل سے شروع ہوا اور اس کے بعد اس کی دوسری کڑی سورۃ بنی اسرائیل اپریل ۲۰۰۴ء میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دی گئی جب کہ اب اسی سلسلہ کا تیسرا مرحلہ جو سورۃ الکھف وسورۃ مریم پر مشتمل ہے۔ مطالب الفرقان فی دروس القرآن کے ٹائٹل کی بجائے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کا نام تجویز کیا گیا ہے۔ جہاں تک مذکورہ کتاب کے ٹائٹل کی تبدیلی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس سے پیشتر معارف القرآن کے سلسلہ میں طلوع اسلام ٹرسٹ کی طرف سے (الحمد سے الحجر تک) شائع ہونے والے لٹریچر کے مابین قارئین کو کسی قسم کی کوئی الجھن پیدا نہ ہو چنانچہ اس بنا پر اس سلسلہ کی تیسری کڑی یعنی سورۃ الکھف و سورۃ مریم کا ٹائٹل پہلے ٹائٹل کی بجائے اب اس نئے ٹائٹل کے نام سے دیا گیا ہے۔

چنانچہ اس موقع پر میں دل کی گہرائیوں میں ابھرنے والی اپنی کوتاہ دامنی کے اعتراف کے ساتھ ملت اسلامیہ کی نوجوان نسل کی اس بھری محفل میں ارباب فکر و نظر کے سامنے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کی تیسری جلد......سورۃ الکھف وسورۃ مریم......پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس وقت میرا راہرو عمر ۷۰ سال کی منزل عبور کرنے میں مصروف ہے اور زندگی کے اس دور میں میری آخری خواہش یہ ہے کہ پیر سالی کے اس مہلت کے عرصہ میں اگر موقع مل گیا تو مجھے امید ہے کہ خدا کا فضل و کرم اور آپ احباب کی رفاقت شامل حال رہی تو ۴ یا ۵ سال کے عرصہ میں دروس القرآن کا یہ سلسلہ جو ۴۰/۵۰ جلدوں پر مشتمل ہوگا اُسے مکمل کر دیا جائے۔

آخر پر میں ان تمام احباب کا دلی طور پر احسان مند ہوں کہ جنہوں نے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کی ترتیب، تدوین، کتابت اور طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں میری مدد کی اس ضمن میں محترم ایاز حسین انصاری کا چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور، پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق صاحب اور محمد علی فارق صاحب کا نام سرفہرست ہے کہ جن کی انتظامی اور ادبی خدمات کو نظر انداز کرنا میری نزدیک بہت بڑی خیانت ہوگی۔ میرا ایمان ہے کہ اس سلسلہ میں ان تمام حضرات کی قرآنی خدمت کا اجر کا ذرہ ذرہ خدا علیم خبیر کے ہاں پوری طرح محفوظ ہے۔

تاریخ 25/5/2004

والسلام

آپ کی رہنمائی اور دعاؤں کا متمنی

محمد اشرف ظفر

نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور

پہلا باب: سورۃ الکھف (آیات 1 تا 22)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ ۝١ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ
وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝٢ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝٣ وَّيُنْذِرَ
الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝٤ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَاۗىِٕهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ
اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝٥ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ
اَسَفًا ۝٦ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَي الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝٧ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا
صَعِيْدًا جُرُزًا ۝٨ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝٩ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ
اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبْنَا عَلٰٓي اٰذَانِهِمْ فِي
الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝١٢ نَحْنُ نَقُصُّ
عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝١٣ وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا
فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۟ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝١٤ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ
كَذِبًا ۝١٥ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ
لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ۝١٦ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ
تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ
فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝١٧ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ڰ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ڰ

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ
رُعْبًا ﴿۱۸﴾ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ
بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ
اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ
يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ
حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ
بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ
بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1975 کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الکھف سے ہو رہا ہے۔ یہ 15 واں پارہ' 18 ویں سورۃ ہے۔

خانقاہیت کے معاملے میں عیسائی یہودیوں سے بھی آگے تھے

سابقہ سورۃ کے آخر میں عیسائیوں کے اس عقیدے کی ضمناً تردید ہوئی تھی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔ اس سورۃ میں عیسائیت کے متعلق کچھ زیادہ بیان ہے اور اسی نسبت سے اسکا نام بھی الکھف ہے۔ کہف غار کو کہتے ہیں۔ یہ واقعہ عام طور پر تو چند نوجوانوں کا بیان کیا جاتا ہے جو غار میں جا کر چھپ گئے تھے لیکن درحقیقت یہ عیسائیت کے مسلکِ خانقاہیت کی تردید ہے۔ یہ ان کے Saints کی خانقاہیں ہیں۔ یہ خانقاہیت والی چیز یہودیوں میں تو آ گئی تھی لیکن اس شدومد سے نہیں آئی تھی جتنی یہ عیسائیت میں آئی۔ اِن راہبوں نے عیسائیت پر سب سے بڑا رنگ بدھ مذہب کا غالب کیا اور اسی سے انہوں نے ترکِ دنیا کی تعلیم اخذ کی اور پھر اسی مقصد کے لیے مسلکِ خانقاہیت اختیار کیا۔ انکی خانقاہیں عام طور پر غاروں میں ہوتی تھیں۔ اس لیے واقعہ کے اعتبار سے تو آپ سمجھیے کہ یہ وہ چند نوجوان ہیں جن کا ذکر آئے گا لیکن اصول کے اعتبار سے مسلکِ خانقاہیت کے متعلق اس میں ذکر ہوگا۔

خانقاہیت کا مسلک خدا کے تصورِ حمدیت کے برعکس ہے

سورۃ کی ابتداء ہوتی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (18:1)۔ ذاتِ خداوندی عام مفہوم کے اعتبار سے قابلِ حمد و ستائش ہے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم ہے کہ ستائش' تعریف اور حمد میں فرق ہے۔ قرآن حکیم نے یہاں حمدیت سے بات ہی اس لیے شروع کی ہے کہ اگر ترکِ دنیا یا خانقاہیت کا مسلک اختیار کیا جائے تو خدا کی حمدیت کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

ہے۔ حمدیت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ "کسی عظیم خالق کے نادر شاہکار پر غور و فکر کے بعد جو بے ساختہ تحسین کے الفاظ زبان پہ آ جائیں' اسے حمد کہا جائے گا۔" اب اس کے لیے تو ضروری ہوا کہ انسان اس خارجی کائنات پر غور و فکر کرے' ایک ایک شے کی اصل و کنہ و حقیت و خواص و امتیازات تک پہنچے اور اس کے بعد بے ساختہ یہ کہے کہ **رَبَّـنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:190)۔ کہ ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو باطل پیدا نہیں کیا' نہ بے فائدہ اور بے کار اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لیے۔ یہ چیز تو وہی کہے گا جو اس کائنات کی ہر شے پر پوری ریسرچ کرے گا۔ مگر اس کے برعکس جو تصور ہی یہ لے کے بیٹھے کہ یہ کائنات اور یہ مادہ اور اس کی ساری تخلیق اور صناعتیں اور حسن و زیبائشیں' یہ ساری کی ساری قابلِ نفرت ہیں' ترک کر دینے کے قابل ہیں' چھوڑ دینے کے قابل ہیں' یہ آلائش ہے' اس میں ملوث نہیں ہونا چاہیے' تو وہ کب خدا کی حمدیت کا قائل ہو سکے گا؟ جب کہ قرآن حکیم نے تو بنیاد ہی یہاں سے شروع کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے کسی چیز کو بے کار پیدا ہی نہیں کیا اور نہ کوئی ایسی چیز پیدا کی ہے جو قابلِ نفرت ہو' قابلِ نفرت پیدا کرنے والے کے متعلق تو کوئی تحسین و آفرین کے کلمات اپنی زبان پر لائے گا ہی نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ مسلکِ خانقاہیت' جسے آپ اپنے ہاں تصوف کہتے ہیں' حمدیت کی نقیض ہے۔ قرآن کی ابتداء ہی حمدیت سے ہوتی ہے : **اَلْـحَمْدُ لِلّٰهِ** (1:1)۔ اس کائنات کے نظم و نسق' اس میں کارفرما حیرت انگیز نظام کو دیکھ کر ہر صاحب بصیرت کی زبان پر بے ساختہ تحسین و آفرین کے کلمات آ جاتے ہیں کہ "اے اللہ تعالیٰ! اس نادر شاہکار کی تحسین و ستائش تجھے ہی زیب دیتی ہے۔" سارا قرآن حمدیتِ خداوندی سے بھرا پڑا ہے۔ یہ قرآن کائنات کی ایک ایک چیز پر غور و فکر کرنے کے لیے کہتا ہے۔

قرآن حکیم انسان کو اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے' تخلیق کائنات پر غور و فکر کرنے کی تاکید کرتا ہے

اُولِـی الْاَلْبَـابِ الَّـذِيْـنَ يَـذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:190-191)۔ عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر' زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے' لیٹے' قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب' اندازِ پیدائش پر غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ تو مومنوں کی تعریف ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ اربابِ عقل و بصیرت جو اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے' اس کائنات کی ایک ایک شے پر غور و فکر کرتے ہیں' تخلیقِ ارض و سما پر' لیل و نہار پر' اختلافِ شمس و قمر پر الغرض ایک ایک چیز پر غور و فکر کے بعد بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ : **رَبَّـنَـا مَـا خَلَقْتَ هٰـذَا بَــاطِلًا** (3:191)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے یہاں کوئی شے باطل نہیں پیدا کی۔ یہ ہے حمدیت کے معنی۔ "اس طرح سے کسی شے کی حقیقت تک پہنچ کر بے ساختہ اس کے بنانے والے کے متعلق دل سے اس خیال تحسین و آفرین کا ابھرنا حمدیت ہے۔" میں نے کہا ہے کہ جس تصور میں یہاں کی ہر شے کو قابلِ نفرت قرار دیا جائے تو سوچیے تو سہی کہ اس کے بنانے والے کے متعلق حمدیت کے جذبات آپ کے دل سے کیسے ابھریں گے؟ تو چونکہ یہاں اس سورۃ میں آگے چل کر اسی خانقاہیت کا ذکر آئے گا' عیسائیت

کا ذکر آئے گا تو قرآن نے ابتداء ہی یہاں سے کی: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (18:1)۔واجبِ حمد و ستائش ہے وہ ذات کہ جس نے اس کائنات کو پیدا کیا' جس نے اس کائنات کی تکمیل کے لیے اپنے عبد پر الکتاب' ضابطۂ قوانین نازل کیا۔ اب پہلے تو خارجی کائنات کے متعلق حمدیت آئی تھی۔اب اس کتاب کی وجہ سے حمدیت آئی کہ جواس نے نازل کی' عَلٰی عَبْدِهِ (18:1)۔اپنے عبد پر۔

عبد کا مفہوم

میں نے پہلے بھی عرض [1] کیا تھا کہ انسانی دنیا کے اندر بلند ترین مقام خدا کا عبد ہونا ہے۔ یہ ''عبد ہونا'' تو ''کچھ ہونا'' ہے۔ یہ اصل میں جو بلندی شرف ہونا ہے' اس کے یہی معنی ہیں: خدا کے علاوہ کسی اور کا عبد نہ ہونا۔ یہ ہے لا الہ۔اور یہ ہے شرفِ انسانیت۔اس تصورِ عبد میں نہ کائنات کی کسی طاقت کا' نہ انسانوں میں سے کسی دوسرے انسان کا' نہ اپنے ہی جذبات کا عبد بننا ہوتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ ان کا عبد نہ ہو جانا۔اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان میں سے کسی کی بھی محکومیت اختیار نہ کرنا۔قرآن کریم کہتا ہے کہ میرے عبد ان میں سے کسی کی فرماں پذیری اور غلامی اختیار نہیں کرتے اور اگر کسی دوسرے کی فرماں پذیری کی بات کی تو پھر انسان خدا کا عبد نہیں رہتا چنانچہ اگر اس طریق کی خدا کی عبدیت اختیار نہیں کرتے تو یہ سرکشی ہوگی۔خدا کے عبد سوائے خدا کے کسی کی بھی محکومی اختیار نہیں کرتے۔ صرف ایک کی اختیار کرتے ہیں اور وہ خدا ہے' خدا کی بھی کتاب ہے' جس کی وجہ سے ہم اس کی حمد کرتے ہیں۔تو یہ عبدہ ہونا' انسانیت کا بلند ترین مقام ہے۔اسی لیے قرآن نے انبیاء کے متعلق عبد کہا' نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی عبد کہا ہے اور اسی کی شہادت دینے کے لیے آپ کو ''عبدہ ورسول اللہ'' کہلوایا گیا ہے۔ یہاں کہا کہ ''عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ'' (18:1)۔الکتاب اس کی طرف نازل کی۔ضابطہ قوانین دیا۔

قندیلِ آسمانی کی خصوصیات

اب اس کتاب کی تعریف اور خصوصیت دو تین لفظوں میں بتائی گئی ہیں۔ایک تو یہ کہ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (18:1)۔اس میں کوئی پیچ دار بات نہیں ہے' کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ یہاں بڑی چیز آئی ہے۔ابتدا میں ہی Mysticism کے خلاف بات آ گئی۔ یہ جو علمِ باطنی ہے اس پہ تصوف کی ساری بنیاد اٹھتی ہے۔اس میں تو ساری چیزیں پیچ و خم کی ہوتی ہیں۔اس باطنی علم کی بنیاد اس پہ ہے کہ خود قرآنِ کریم کے الفاظ سے جو معنی آپ کی سمجھ میں آتے ہیں یہ معنی نہیں ہیں۔ان الفاظ کے بطن میں معنی چھپے ہوئے ہیں۔اور یہ اہلِ باطن

---

[1] اس نکتے کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' 2004' ص۔69

کہتے ہیں کہ وہ معنی ہم جانتے ہیں، وہ سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوتے ہیں اور اسی کا نام رومی کے الفاظ میں مغز قرآن ہے۔ اس کے الفاظ میں الفاظ والا قرآن تو، معاذ اللہ، ہڈیاں ہیں۔ جو "پیشِ سگاں افتادہ ایم" ہیں: ہم نے کتوں کے آگے ڈال رکھی ہیں (معاذ اللہ)۔ اس باطنی علم میں ہر چیز پیچ وخم کی ہوتی ہے، راز ہوتا ہے، سرِ مستور ہوتے ہیں، صدری راز ہوتے ہیں، کسی اور کو بتانے کے لیے نہیں ہوتے۔ تو عزیزانِ من! اس سے بڑی رونے والی بات اور کونسی ہو سکتی ہے! اسے تو سرتا پا پیچ وخم کہا جاتا ہے۔ جب کہیے کہ صاحب! کچھ ہمیں بھی بتائیے، کہتے ہیں کہ بتائیے کیا یہ تو:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

یہ نشہ تو وہی جان سکتا ہے جو خود پیے۔ چل بھئی! بات پوری ہوئی۔

باطنی علم اور روایات

پھر اس کی سند کے لیے جیسا کہ ان کا طریقہ ہے، عربی کا ایک فقرہ جوڑا، قال قال رسول اللہ ﷺ اس سے پہلے لگایا۔ چلیے صاحب! سند آ گئی۔ یہ سند لانے والے، یہ کچھ کہنے والے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ ابدی کے آخری تین سال پہلے ایمان لائے تھے۔ یہ اتنا مختصر سا تین سال کا وقت ہے اور ہزار ہا حدیثیں ہیں، ان کا ایک Multitude ہے، ان کا انبار در انبار ان کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ساری عمر کے ساتھ رہنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، کسی نے بیس، کسی نے تیس، کسی کی طرف زیادہ سے زیادہ سو حدیثیں، روائتیں آئی ہیں مگر کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے تین ہزار سے زیادہ روائتیں منسوب ہیں۔ بہرحال یہ انہی کی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہؐ نے مجھے علم کے دو برتن دیئے تھے۔ ایک تو میں نے کھول کے دیدیا ہے اور جو دوسرا ہے اگر اسے کھولوں تو میرے گلے پہ چھری چل جائے۔ اس کے اندر ایسی راز کی باتیں ہیں کہ وہ عوام کے سامنے کھولنے کا ہی نہیں ہے۔ "بڑا زہریلا سپ اے اس کجے وچ۔"[1] چلیے صاحب! ایک روایت یہ آئی ہے۔ وہ جو کہتا ہے کہ یہ دوسرا برتن ہر ایک کے سامنے کھولنے کا نہیں ہے اور خطرناک اتنا ہے کہ اگر وہ عوام کے سامنے کھول دیا جائے تو گلا کاٹ کے رکھ دے صاحب! یہ اس رسول ﷺ کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے، جن کے متعلق خدا نے یہ کہا ہے: **بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ** (5.67)۔ جو کچھ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے، اسے پہنچائے جا، پہنچائے جا۔ اگر **لَّمۡ تَفۡعَلۡ** (5.67) تو نے نہ پہنچایا تو **فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَہٗ** (5.67)۔ تو فریضہ رسالت ادا نہیں کرے گا۔ تو یاد رکھ، تجھ سے پکڑ ہوگی۔ پہنچانے کا طریقہ تو یہ ہے۔ لیکن ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ بتا رہے ہیں کہ جو آدھا حصہ ہے وہ تو ان کے ارشاد کے مطابق عام کر دیجیے اور جو باقی آدھا حصہ ہے اُسے میں عام نہیں کر سکتا، وہ باطنی علم تو خواص کے لیے ہے۔ آپ غور کیجیے گا۔

---

[1] اس برتن میں بڑا زہریلا سانپ ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو کے آگے چلیے گا۔ آگے خانقاہیت کی بات آنی ہے۔ لہٰذا اس کتاب کے متعلق سب سے پہلی چیز یہ کہی کہ **لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا** (18.1)۔ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں' کوئی پیچیدہ بات نہیں' اس کے اندر کوئی رازِ مستور نہیں ہے' کھلی کھلی سی بات ہے: واضح' روشن' ہموار' اس میں سیدھی باتیں کی گئی ہیں۔ کہا: یہ **قِيِّمًا** (18.2) ہے۔ اس میں نہایت سیدھی' واضح اور متوازن بات ہے۔ لفظ **قَیِّمٌ** میں توازن ہے' اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوئی بات ہے جس میں ابدی طور پہ کوئی لغزش نہیں۔ یہ سارے معنی اس کے اندر آجاتے ہیں۔ کہا: اس میں توازن قائم ہونے والی بات ہے۔ یہ لفظ قیام سے ہے۔ یہ وہ ہے جو اپنے مقام پہ کھڑی ہوئی ہو' واضح ہو' متوازن ہو۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا: **فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ** (98.3)۔ اس کے اندر ہم نے جتنے احکام دیئے ہیں' نہایت قیم واقع ہوئے ہیں' محکم واقع ہوئے ہیں' متوازن واقع ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم نے اسلام کو **دِيْنُ الْقَيِّمُ** (9:36) کہا ہے۔ اس نے قیوم (3:2) خود خدا کی صفت بیان کی ہے۔ اس نے کعبہ کے متعلق کہا ہے کہ یہ **قِيٰمًا لِّلنَّاسِ** (5:97) ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو قرآن کی رو سے عالمگیر انقلاب آنے والا ہے یا آیا ہے یہ وہ انقلاب ہوگا جس میں **يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6)۔ عالمگیر انسانیت خدا کا نظام ربوبیت قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ یہ حقیقت میں قرآن ہے اور اسی کے لیے کہا: **قِيِّمًا** (18:2)۔ وہ جگہ جو خود محکم ہے' اور محکمیت عطاء کرنے والی ہے کیونکہ یہ خدائے قیوم کی طرف سے ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کتاب کاہے کے لیے ہے؟

کتاب اللہ کے دو مصرف

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (18:2)۔ اس کتاب کے وہی دو مصرف ہیں: نذیر اور بشیر۔ یہ وہی ہیں جو رسول کی صفت بتائی گئی ہے: وہی تنذیر و تبشیر۔ تو ان لوگوں کو آگاہ کردے جو صحیح روش کو چھوڑ کر' غلط راستہ اختیار کرتے ہیں' تو وہ تباہی کی طرف جانے والے ہیں۔ انہیں اس سے آگاہ کردے۔ یہ تنذیر ہے۔ کہا: **لِيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا** (18:2)۔ ان سے کہہ دو کہ غلط روش کا نتیجہ بڑی سخت قسم کی تباہی ہوتی ہے۔ پھر کہا کہ یہ تباہی کس کے قانون سے آتی ہے؟ جواب دیا یہ: **مِنْ لَّدُنْهُ** (18:2)۔ خدا کے قوانینِ مکافات کی رو سے آتی ہے۔ اس سے ان لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ آگہی کن کے لیے ہوگی؟ سورۃ یٰسین میں کہا ہے کہ یہ آگہی ان کے لیے ہے جو **لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا** (36:70)۔ جو زندہ ہے اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ کہا: یہ اس کے لیے ہے۔ اس کے برعکس جو خودکشی کرنے کے لیے جا رہا ہو' اسے یہ کہنا کہ صاحب! یہاں دریا میں نہ کودنا' یہاں پانی بہت گہرا ہے' تمہیں ڈبو دے گا تو وہ کہے گا کہ ''موج ہوئی' میں تو اسی کی تلاش میں نکلا تھا۔'' کہا: خطرے سے آگہی تو اس کے لیے ہے' جو زندہ رہنا چاہتا ہو: **لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا** (36:70)۔ کیا بات ہے کہ وہ زندہ ہو! ایک تو وہ جو مردہ ہے اُسے تو آگاہ کرنا ہی بیکار ہے۔ قبرستانوں میں وعظ کرنے سے کیا

حاصل! وہی جو ہمارے یہاں مسجدوں میں وعظ کرنے سے حاصل ہو رہا ہے: جیسے مردے گئے، ویسے ہی مردے واپس آ جاتے ہیں۔ تو پہلی شرط یہ ہے: لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70)۔ کہ یہ قرآن بطور ضابطہ حیات اس کے لیے ہے جس میں زندگی کی حرارت باقی ہو اور وہ زندہ رہنا چاہے۔ اسے پھر دہرادوں کہ یہ اس کے لیے ہے جس میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہو، زندہ رہنا چاہنے کی تمنا ہو، تو اسے یہ کہا جائے گا کہ اس طرف نہ جانا۔ یاد رکھو! آگے گہرا کنواں ہے، گر جاؤ گے، مر جاؤ گے۔ اس کے برعکس جو پہلے سے مردہ ہو گیا ہے، یا جو جینا چاہتا ہی نہیں ہے، اس کے لیے تو آگہی بے معنی چیز ہے۔

ہزار سال سے ہماری حالتِ زار

یہ جو ہزار سال سے ہمیں سارے راز کہے جا رہے ہیں، اس کے باوجود ہم میں زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں رہے، تو اس کی یہی وجہ ہے کہ یا تو ہم پہ ایسی موت طاری ہو چکی ہوئی ہے کہ ہم بالکل قبرستانوں میں چلتی پھرتی، سانس لیتی لاشیں ہیں، ممی شدہ لاشیں کہہ لیجیے یا دوسری چیز یہ ہے کہ ہمارے دل کے اندر سے زندہ رہنے کی تمنا ختم ہو گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ چیز زیادہ صحیح ہے: یہ آرزو ختم ہو گئی ہے۔ سانس لینے تک کا نام زندگی نہیں ہے عزیزانِ من! اسی لیے قرآن نے جو دوسری جگہ کہا ہے: اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24)۔ Response کرو، لبیک کہو خدائے رسول کی اس آواز پر، جو تمہیں زندگی عطاء کرنے کے لیے دی جا رہی ہے۔ زندہ انسانوں سے کہا جا رہا ہے۔ یہ استجیبوا کہا جا رہا ہے اگر میں آپ کو Duty & responsibility میں فرق بتانے لگوں تو بات دور نکل جائے گی۔ کہا: اس آواز پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطاء کرنے کے لیے دی جا رہی ہے۔ کاہے کے لیے یہ آواز دی جا رہی تھی؟ کہا: میدان جنگ میں جہاد کے لیے۔ غور فرمایا یہاں زندگی کس چیز کو کہا گیا ہے۔ بات یہ چلی تھی: لِيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ (18:2)۔ جو زندہ رہنا چاہتا ہے، اسے راستے کے خطرات سے آگاہ کر دو اور اس کتاب، قرآن کریم، ضابطہ حیات کا دوسرا مصرف یہ بتایا کہ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ (18:2)۔ اور وہ جو اس پر ایمان لانے والے ہیں، جو ان صداقتوں پر یقین رکھنے والے ہیں اور پھر اس یقین کے بعد جو صلاحیت بخش کام کرتے ہیں، جن سے ان کی اپنی ذات سنورے، کائنات کے امور سنوریں، انہیں بشارت دے دو۔ صٰلحٰت کے یہ معنی ہوتے ہیں: ''جو صلاحیت بخش کام کریں جن سے حسن کائنات میں اضافہ ہو اور ان کی اپنی ذات سنورے۔'' کہا: انہیں اس امر کی بشارت دے دو کہ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا o مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (18:2-3)۔ ان کے لیے ان کے اعمال کا نہایت خوشگوار، حسین اجر ہے۔

حق اور ذمہ داری لازم وملزوم چیزیں ہیں

آپ نے دیکھا کہ جو کچھ ملتا ہے، اعمال کے اجر میں ملتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں فساد کی نئی روش چلائی گئی ہے، جسے انقلاب کہا جاتا

ہے' یہ دھوکہ دینے کے لیے ہے۔ یہ فساد ہے' انقلاب نہیں ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ Rights, Rights حقوق حقوق حقوق حقوق کا یہی مطالبہ ہر جگہ ہے: ان کے حقوق یہ ہیں' ان کے حقوق یہ ہیں۔ اس میں ذمہ داری کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ اور قرآن یہ کہتا ہے کہ تم ہر ذمہ داری ادا کرو' اس کے بدلے میں تمہارا ایک حق ثابت ہوتا ہے۔ پہلے تمہاری Responsiblility ہے جب اسکو Discharge کرلو' جب تم اس کو پورا کرو' تو حق مسلم ہوتا ہے۔ قرآن نے جہاں بھی اجر بتایا ہے' وہ اعمالِ صالحہ کا ہی نتیجہ بتایا ہے: یہ پہلے کرے تو پھر یہ ملے گا۔ آپ نے دیکھا کہ ذمہ داری ادا کرنے سے معاشرے میں کس قدر صلاحیت و صالحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہا کہ پہلے ذمہ داریوں کو پورا کرو پھر حق کی بات آئے گی۔ اب اگلی چیز رہ جاتی ہے جسے استبداد کہتے ہیں کہ وہ ذمہ داریوں کو پورا کراتا ہے مگر حق دیتا نہیں ہے۔ تو اس کا ردِعمل یہ ہے کہ ذمہ داری پوری نہیں کی جاتی صرف حق طلب کیا جاتا ہے۔ یہ اس کا Reaction ہے۔ اگر ذمہ داری پوری کرنے والے کا حق ادا کر دیا جائے تو وہ کبھی اس چیز سے ہٹے ہی نہیں کہ ذمہ داری پوری نہ کرے اور حق مانگتا چلا جائے۔ انہوں نے ذمہ داری' ذمہ داری' ذمہ داری عائد کی تو انہوں نے کہا: اچھا بَچُّو لو۔ اُنہوں نے ذمہ داریاں تو ساری چھوڑ دیں۔ حقوق' حقوق' حقوق طلب کرنے شروع کر دیئے۔ تو یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ پہلی چیز جو اس نے کی' وہ یہ تھی کہ لَانُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (7:170)۔ جو اپنی زندگی اور معاشرے کو سنوارنے والے ہوں ہم اُن کے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اس لیے کوئی شخص جو ذمہ داری پوری کرتا ہے' اس کا اجر دینا ہوگا۔ یاد رکھو! یہ سیدھی بات ہے۔ مانگنے والے سے کہا کہ پہلے ذمہ داری پوری کرو گے تو اس کے بعد تمہارا حق مسلط ہوگا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو یہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیزیں یوں ہی نہیں ہیں کہ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا (18:2)۔ یہ یونہی کہہ دیا بلکہ کہا کہ جو اس ضابطہ حیات (قرآن حکیم) کے مطابق زندگی بسر کریں انہیں ان کے صلاحیت بخش اعمال کے خوش گوار نتائج ملتے ہیں۔ یہ ان کا اجرِ حسن ہے: مَاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (18:3)۔ وہ اس سے ہمیشہ متمتع ہوتے رہے گے۔

ازل اور ابد کا قرآنی مفہوم

قرآنِ کریم میں جنت کے متعلق بھی ہے اور دیگر مقامات پہ بھی کہ انسان ابدی طور پر اس میں رہے گا۔ ''ابد'' اور ''ازل'' کے الفاظ تو خدا ہی کے لیے ہیں۔ جسے آپ ''ہیشگی'' کہتے ہیں' ہمیشہ سے ہے' ہمیشہ رہے گا' یہ کسی اور کے لیے تو ہو نہیں سکتا۔ تو اس لیے یہ جو ''ابداً'' کے معنی مومنین کے لیے یا جنت کے نظاروں کے لیے یا اگلی زندگی کے لیے ہیں' اسکے وہ معنی دوام اور ہیشگی تو نہیں ہو سکتی جو خدا کے لیے ہے۔ وہ دوام اور وہ ہیشگی کیسی ہوگی' ہم نہیں جان سکتے۔ لیکن یہ جو یہاں قرآن کہتا ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالح کے بدلے میں ایسی جنت ملے گی جس سے نکلو گے نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے یا آپ کے کسی اسلاف میں سے کسی نے ایمان اور

اعمال صالحہ سے یہاں دنیا کی جنت حاصل کر لی جیسے کہ صدرِ اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم نے قائم کی تھی تو ایک دفعہ وہ کر لیا اور اس کے بعد پھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور پھر مسلمانوں کی یہ قوم ہمیشہ جنت کے اندر رہے گی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تو یہ ہے کہ جب تک یہ کرتے رہو گے' یہ ملتا رہے گا۔ جب یہ کرنا چھوڑ دو گے' چھن جائے گا۔ اس نے اسلام کو شجر طیب جو کہا ہے تو اس کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہر موسم میں اپنے پھل دیتا چلا جائے گا۔ تو یہ اسی صورت میں ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے' اسے پانی دیا جائے' اس کی رکھوالی کی جائے' کیڑے مکوڑے سے ان کی حفاظت کی جائے تو اس صورت میں پھل دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام کا شجر طیب ایسا درخت ہے کہ یہ نہیں کہ یہ ایک دور کے لیے تھا' اس کے اگلے دور میں یہ پھل دینا ختم کر دے گا' اس کے پھل دینے کی مدت ہی اتنی تھی۔ یہ ہمیشہ پھل دے گا لیکن اس شجرِ طیب کی حفاظت پہلی شرط ہے۔ حفاظت کرو گے اور کرتے جاؤ گے تو یہ درخت ہمیشہ خوش گوار پھل دے گا اور دیتا جائے گا۔

''ایک اور آنے والے کا تصور'' بہائیت اور مرزائیت کا پیدا کردہ ہے

وہ جو بہائیت کے اندر کھلے ہوئے الفاظ میں یہ بات آئی کہ صاحب! یہ قرآن ہزار سال کے لیے تھا' بس اس کے بعد تو اس درخت نے پھل ہی دینا بند کر دیا۔ اور اسی کا ایک چھپا ہوا سا پردہ مرزائیت کی تعلیم میں آپ کو یہ ملا کہ ہاں ایک اور آنے والے کی ضرورت تھی وہ اب آ کے کہے گا یعنی جو پچھلا تھا اس کا دور ختم ہوا ہے۔ یہ دور ختم ہونے کی باتیں ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن کا یہ دور ختم نہیں ہوتا اور قرآن کے ہوتے ہوئے کسی اور آنے والے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آنے والا صرف رسول ہوتا ہے' پیغام لاتا ہے' پیغام کی موجودگی میں کسی نئے پیغامبر کے آنے کا تصور ہی غلط ہے۔ اس میں یہ خصوصیت ہے کہ یہ پھل دیتا رہے گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ یہ باغ ہمارا ہے' آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان درختوں کی حفاظت کریں' ان کی نشوونما کرتے رہیں۔ یہ ہیں اعمالِ صالح۔ یہ کرتے رہیے' اِس میں صلاحیت ہے کہ قیامت تک یہ پھل دیتا رہے گا۔ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا. وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (18:3-4)۔ یہ وہ خوش گوار نتائج ہیں جن سے وہ ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اس کے برعکس غلط روش حیات پر چلنے والوں میں خصوصیت سے وہ لوگ شامل ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا ہے حالانکہ یہ تصور یکسر باطل اور جہالت پر مبنی ہے۔ (17:111)۔

خدا کے بیٹے کا تصور

کہا: خاص طور پہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس سے تو خدا کے متعلق بنیادی تصور ہی غلط ہو گیا۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ تم یہ بیٹا اسی لیے بناتے ہو کہ بڑھاپے میں یہ ضروری ہوتا ہے' یہ عصا ضروری ہے کیونکہ یہ بڑھاپے کے زمانے میں کام آنے والا ہوتا ہے۔ تو تمہارا تصور یہی ہے کہ خدا بھی بوڑھا ہو چکا ہے' اسے ایک بیٹے کی ضرورت ہے جو اس کی جگہ کام کاج

کرے۔ ایک طرف تو تم نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ اس کے کام کاج کے لیے بیٹے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف یہ کہا کہ بیٹا جوان ہوا تو اسے پھانسی چڑھا دیا۔ لو اپنے ہی ہاتھوں! کیا حقائق ہیں!! عزیزانِ من! یعنی بس وہ اتنے سے کام کے لیے ایک بیٹا بنایا۔ ہر بوڑھا باپ جوان بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دیتا ہے۔ یہاں ایک ہی بیٹا ہے نہ اس کے آگے نہ پیچھے کوئی اور۔ اور اس ایک بیٹے کا کام بس اتنا ہی ہو کہ وہ جوان ہوا' ان کے عقیدے کے مطابق تیس ہی برس کے تھے۔ عزیزانِ من! کہ اسے سولی چڑھا دی۔ کہنے لگے: ''نہیں نہیں' وہ سولی چڑھ کے فوت نہیں ہوئے تھے۔'' پھر جی! کیا ہوا تھا؟ کہنے لگے کہ اپنے پاس بلا لیے یعنی کسی کام کاج کے لیے نہیں۔ اپنے پاس ہی بلا لیے کہ بیٹھو بیٹا یہاں۔ غور کیجیے عزیزانِ من! لوگ کہتے ہیں کہ صاحب یہ دیکھیے' اتنی کروڑوں کی تعداد میں دنیا میں پڑھے لکھے لوگ' جن میں ان کے ہاں بڑے بڑے مبصر چلے آرہے ہیں۔ دو ہزار سال سے اتنی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی' اب کیا کیا جائے؟ اب آپ دیکھ لیجیے کہ یہ کتنی آسان سی سازش ہے۔ یہ اسے مانتے چلے آرہے ہیں۔ تو کہا کہ خاص طور پر انہیں اس بات سے آگاہ کرو کہ یہ کتنا باطل عقیدہ ہے جو اسے لیے پھرتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہوگا۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ (18:5)۔ علم کی بارگاہ سے نہ انہیں اس کی سند مل سکتی ہے' نہ ان کے باپ دادا کو مل سکی تھی جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ سب جہالت کی بنیاد پہ مانتے چلے آرہے تھے اور یہ بھی جہالت کی بنیاد پہ مانتے چلے آرہے ہیں۔ جس وقت سے یورپ میں علم آیا ہے' انہوں نے اس بیٹے کو ہی نہیں بلکہ خدا سمیت باپ بیٹے دونوں کو ہی سمندر میں پھینک دیا۔ انہوں نے سرے سے مذہب سے ہی انکار کر دیا' لبادہ ہی اتار کر پھینک دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو عقیدہ رکھ رہے ہیں' علم آجانے کے بعد یہ عقیدہ باقی نہیں رہے گا۔ تو یورپ کے اندر جتنی دہریت پھیلی ہے یہ عیسائیت کے ان باطل عقائد کے ردِعمل کی بناء پہ پھیلی ہے۔ اور جتنی دہریت اب آج کے نوجوانوں میں پھیلتی جا رہی ہے وہ ساری اس جہالت کا ردِعمل ہے جو ان کو وہاں مسجدوں میں' وعظوں میں اور منبروں سے افیون کی طرح پلائی جا رہی ہے۔ جب بھی کسی قوم کا شعور بیدار ہوتا ہے تو پھر اس قوم کا ردِعمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ انہوں نے یہی بات کہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ بیٹا تھا۔ یہاں یہ مقربین اور مصاحبین کی صف در صف بچھائی ہوئی ہے اور خدا کو عرش پر' ایک مسند پہ' بٹھا رکھا ہے۔

خدا عرش پر ایک تخت پر ارجمند ہے

آپ کو وہ حدیث معلوم ہی ہے جو میں اکثر بیان کرتا ہوں کہ آٹھ پہاڑی بکرے ہیں' جنہوں نے اپنے سینگوں پر اس تخت کو اٹھا رکھا ہے جس پہ خدا بیٹھا ہوا ہے۔ یہ پہاڑی بکرے ہیں۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے اور وہ بکرے اتنے بڑے بڑے ہیں کہ سمندر کا پانی صرف ان کے گھٹنوں تک آتا ہے۔ ان کے سینگوں پہ تخت ہے' تخت پر خدا ہے۔ یہ آپ کے نوجوانوں کو پڑھایا جا رہا ہے۔ تو اس کا ردِعمل یہ کچھ کیوں نہ ہوگا۔ یہ ہے وہ جو قرآن کہتا ہے: مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ (18:5)۔ اس عقیدہ کی سند میں' نہ ان کے

پاس کوئی علمی برہان ہے اور نہ ہی ان کے آباؤاجداد کے پاس تھی جنہوں نے اس عقیدے کی ابتدا کی تھی۔عزیزانِ من! دین علم کی بنیادوں پر دیا جاسکتا ہے۔قرآن حکیم نے حضور کی زبان مبارک سے کہلوایا کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ (12:108)۔ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں' علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں' علم' دلیل و برہان کی بنیادوں پر دعوت دیتے ہیں۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں اور میرے بعد جو صادر ہونگے' وہ بھی میری سنت کے پیرا ہونگے' ان کا بھی مسلک یہی ہوگا۔اب اس کے برعکس یہ وہی علم ہے' وہی عقل و خرد ہے جو آج آپ کے ہاں کفر قرار پا گئی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ عقل سے کام لینا تو ابلیسی کام ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ ان کے پاس علم نہیں ہے اور نہ ہی ان کے آباء کے پاس تھا۔ یہ عقیدہ جہالت پر مبنی ہے۔ جب بھی علم آئے گا یہ عقیدہ ختم ہو جائے گا۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (18:5)۔گویا یہ سوچتے ہی نہیں کہ یہ کیسی سخت بات ہے جسے یہ یونہی بلا سوچے سمجھے منہ سے نکال دیتے ہیں۔ یہ تو اتنی کھلی ہوئی بات ہے جو یہ کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا جب ذرا سی بھی علم کی شعاع اور کرن آئی یہ تاریکیاں ختم ہو جائیں گی۔یہ جو کچھ منہ سے نکالتے ہیں اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (18:5)۔ یہ بالکل' قطعاً جھوٹ ہے۔یہ کچھ کہنے کے بعد ان کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اب سوچو: یہ ہے وہ قوم مخاطب جس کے پیچھے تو جان گھلا رہا ہے۔ یہ علم کی بنیادوں پہ تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ جہالت اتنی واضح ہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھتے چلے آ رہے ہیں جس کا علم نہ ان کے آباؤاجداد کے پاس تھا' نہ ان کے پاس ہے۔تو کہا فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (18:6)۔کہ تیرے مشفق ہونے کے متعلق تو ہم جانتے ہیں' تو سینے میں بڑا دردمند دل رکھتا ہے لیکن کیا تو ان کے پیچھے اپنی جان گھلالے گا کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے ہیں۔

جہالت پر فخر کرنے والی قوم ایمان نہیں لا سکتی

ایمان تو وہ لائے گا جو علم کی بنیادوں پہ بات کو سنے' سمجھے' پرکھے پھر کسی نتیجہ پہ پہنچے۔ جہالت اور جہالت پر فخر کرنے والی قوم کیسے ایمان لے آئے گی؟ یہ جو بنیادی طور پہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسلمان' جو مذہب کی گرفت میں چلا آ رہا ہے' قرآن اس کے پاس موجود ہے' لیکن اس طرف نہیں آتا اِس کے برعکس جو بھی قرآن کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے' اس کی مخالفت ہوتی ہے۔اسکی وجہ یہی ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ جو لوگ جہالت کی بنیادوں پہ اپنے عقائد استوار رکھتے ہیں' وہ علیٰ وجہ البصیرت اُن باتوں کی طرف آتے ہی نہیں ہیں۔ چمگادڑ دن میں اپنی آنکھ کھولتی ہی نہیں ہے۔اس نے اپنی آنکھ ہی ایسی بنالی ہے کہ وہ صرف اندھیرے میں ہی آنکھ کھولے۔ جہالت کی بنیادوں پر یہ کچھ ہو جاتا ہے اگر ان پر دو چار نسلیں بھی آگے چلتی رہیں تو اُن میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی مفلوج ہو جاتی ہے۔

کائنات میں حسن کی فراوانی

اب ان کی خانقاہیت کی بات آئی قرآن حکیم نے کہا اَحۡسَنُ (18:7)۔عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ قرآن کا کیا انداز ہے ایک ہی مثال کی رو سے وہ ساری بات واضح کر گیا ہے۔کہا: اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (18:7)۔اس کائنات میں ہم نے تو حسن کو بکھیر کے رکھ دیا ہے۔کہا: زیبائش کی چیزیں' آرائش کی چیزیں' الغرض روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے اسے تو ہم نے زمین اور اس پر رہنے والوں کے لیے وجہ زینت بنا دیا۔ہم نے یہاں حسن کائنات کو اس قدر عام کر دیا ہے۔ نبات الارض کو دیکھیں تو سہی یہ سارا کچھ حسنِ کائنات کے لیے کیا ہے۔اب اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوگا کہ انہیں استعمال کیسے کرتے ہیں۔دراصل سارا سوال ان کے استعمال کا ہے۔سنکھیا بھی اپنا ایک حسن رکھتا ہے بشرطیکہ وہ معالج کی ہدایت کی مطابق فالج زدہ مریض کو دیا جائے۔وہ اس کا علاج ہے۔اگر غلط استعمال کیا جائے تو زندہ کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔تو کہا کہ کائنات کی یہ جتنی چیزیں بھی ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (18:7)۔یہ ظاہر ہو جائے کہ اِن کے استعمال میں' کون اعتدال اور توازن کی راہ اپناتا ہے۔یہی تو حقیقت ہے۔زندگی حسن کارانہ راہ ہے۔تو اس طرح دیکھنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ان کے استعمال میں کون ہے جو انہیں حسن کارانہ طور پر استعمال کرتا ہے اور کون انہیں شر کے لیے استعمال کرتا ہے۔یہ تمام چیزیں قابل نفرت نہیں ہیں۔ زینت قابل نفرت نہیں ہے' آرائش و زیبائش اور رہائش کی چیزیں قابل نفرت نہیں ہیں۔ان کا غلط استعمال قابل نفرت ہے۔

ترکِ دنیا کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا

کہا: اب اس کے بعد سوچیے جو بات قرآن کہتا ہے وہ کیا ہے؟ کہا: کہ وَاِنَّا لَجٰعِلُوۡنَ مَا عَلَيۡهَا صَعِيۡدًا جُرُزًا (18:8)۔ تمہارے ہاں کتنی ہی اچھی پھلواری ہی کیوں نہ لگی ہوئی ہو' اس میں خوبصورت پھول آ رہے ہوں' ان کی مہکتی ہوئی خوشبوؤں سے تمہارا سارا کمرہ ہی بھر جاتا ہو' لیکن اگر اس کو پانی دینا چھوڑ دیجیے' اس کی حفاظت کرنا چھوڑ دیجیے تو کچھ عرصہ کے بعد چٹیل میدان بن جاتا ہے جس میں دھول اڑتی ہے' وہ ساری کی ساری چورا ہو کے رہ جاتی ہے اور پیداوار کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔خانقاہیت میں یہی ہوتا ہے۔یہ ہے خانقاہیت۔اس میں انسانی زندگی کی تمام صلاحیتیں خشک ہو جاتی ہے۔اسی لیے تو قرآن نے اس کائنات اور اس کی تمام زیبائش کی چیزوں کے متعلق کہا ہے: مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ (7:32)۔ان سے کہو کہ کون ہے جو ہماری زینت کی چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔حرمت کا سوال نہیں ہے۔سوال صرف یہی ہے کہ تم انہیں استعمال کس طرح سے کرتے ہو؟ لیکن اگر ان کو قابل نفرت سمجھ کے ان سے اعراض برتا جائے اور انہیں چھوڑ دیا جائے تو انہیں کہا کہ دیکھ لو' کھیتی کا کیا حشر ہوتا ہے۔کسی کھیتی کی ایک فصل کی نگہداشت کرنا چھوڑ دیجیے' اس کے بعد دیکھیے کہ وہی زمین جو حسن کی لہلہاتی کھیتیاں تھیں' پھر کیا بن جاتی ہیں۔فصلیں چورا ہو جاتی ہیں۔کہا: کچھ عرصے کے بعد وہ زمین بنجر

ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن نے ایک مثال سے کیسے ساری بات سمجھا دی۔ دین کی ابتداء تو ہوتی ہی اس لیے ہے کہ کائنات کی ہر شے کو خدا کی دی ہوئی ایک نعمت تصور کر کے اس سے صحیح فائدہ اٹھایا جائے لیکن جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر ترک دنیا' اس کی تمام چیزوں سے' ترک ترک ترک اور پتہ نہیں ہر چیز میں ترک اور بس ترک: یہ چھوڑ' وہ چھوڑ و۔ بس یہی رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ ٹھیک ہے' زمین چھوڑ' اس کی کھیتی کو چھوڑ' نباتات کو چھوڑ' پھر دیکھو کہ اگلی فصل میں حشر کیا ہوتا ہے؟ کہا: یہ خانقاہیت ہے۔ عزیزانِ من! اس چیز کی کتنی عجیب بین مثال ہے۔ کھیتی کو قابل نفرت قرار دے دیجیے' بس اگلے سال دیکھ لیجیے: ایندھن بن جائے گا۔

داستان کہف کی حقیقت

یہ سب کچھ کہنے کے بعد اب بات شروع ہوئی: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (18:9)۔ اے مخاطب! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں ''اصحب الکھف والرقیم کہہ کر پکارا جاتا ہے' کوئی خارقِ عادت مخلوق ہے یا کوئی اچھنبے کی چیز تھے؟ ایسا نہیں تھا' بات کچھ اور تھی۔ عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا' اس میں عیسائی تو رہے ایک طرف' خود عرب جو مکہ والے یا مدینہ والے تھے' انہیں بھی یہ قصہ معلوم تھا۔ قرآن جن قوموں اور لوگوں کی داستانیں بیان کرتا ہے یہ وہی تھے' جن سے یہ عرب پہلے سے واقف تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ ان کے ہاں جو داستانیں مشہور تھیں' ان میں غلط باتیں مل گئی ہوئی تھیں۔ قرآنِ حکیم ان غلط باتوں کو الگ کر دیتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ واقعہ صحیح بیان کرتا ہے اور اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ یہ تاریخ کی کتاب نہیں؟ کہ اس میں جو واقعہ تھا میں نے اس کی صحت کر دی ہے۔ بلکہ قرآن جس مقصد کے لیے وہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے' اس کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ ہے قرآن کا انداز۔ تو یہ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ (18:9) تھے۔ قرآن نے اتنی سی بات کہی۔ آپ دیکھیں گے کہ کہیں یہ نہیں آیا ہے کہ پھر کسی نے ان میں سے پوچھا ہو کہ صاحب! یہ کون تھے؟ کیا بات ہے؟ گویا جو کچھ کیا' وہ سب کو معلوم تھا اور انہوں نے کہا کہ اچھا۔

اب بات آگے آئے گی کہ ان کی بات میں جو اصل واقعہ ہے وہ ہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔ تو گویا جو بھی وہ واقعہ تھا' ایک داستان کے طور پر وہ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔ کہف کے معنی ''غار'' کے ہیں اور جو الرقیم ہے' عام طور پر اس کے معنی مرقوم کے کئے جاتے ہیں۔ ابن درید نے اپنی تالیف کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے کہ الرقیم دراصل فعیل کے وزن پر بمعنی مفعول یعنی مرقوم آیا ہے۔ مرقوم کے معنی ہیں: کھلی ہوئی۔ مرقوم کے معنی تختیم کے اوپر' جن کے احوال لکھے ہوئے ہوں۔ لیکن بات یہ نہیں ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ اس لفظ کی Origin کچھ اسی طرح سے ہو۔ لیکن تورات میں اس لفظ الرقیم کو راقیم کہا اور لکھا گیا ہے۔ یہ الرقیم وہی ہے جو شام میں نبطیوں (Nabataean Kingdom)[1] کی حکومت کا دارالخلافہ تھا۔ اس شہر کا نام رقیم تھا۔ عیسائیت کی یہ خانقاہیں پہلے شام میں ہی پھیلی تھیں۔

---

[1]

شام میں تو پہلی خانقاہ بنانے والے کا نام ہی عثمان تھا

ضمناً یہ عرض کردوں کہ مسلمانوں کے ہاں جو تصوف آیا ہے' اس کی پہلی خانقاہ کی بنیاد رکھنے والے کا نام عثمان تھا۔ اس نے شام میں ہی خانقاہ قائم کی تھی۔ وہ عیسائیت سے Convert ہو کے مسلمان ہوا تھا۔ اُس زمانے میں یہی فلسطین کا علاقہ اور شام کا علاقہ آپس میں ملے ہوئے علاقے تھے۔ زیادہ تر یہ خانقاہیں یہیں ہوتی تھیں کیونکہ یہ نسبتاً پہاڑی علاقہ ہے اور یہ جیسے پہاڑوں کی کھوہ یا غار کہتے ہیں' اس میں خانقاہیں ہوتی تھیں۔ یہاں جو آثارِ قدیمہ کی تحقیقات (Archaeological Researches) ہو رہی ہیں' ان میں وہاں سے اتنی غاریں نکل رہی ہیں کہ گویا وہاں ساری سرزمین ان غاروں سے پھٹی پڑی ہے اور ہر غار کوئی نہ کوئی خانقاہ تھی۔ تو یہ جو رقیم تھا' نبطی حکومت (Nabataean Kingdom) کا دارالخلافہ تھا۔ جب شام کو رومیوں نے فتح کیا ہے۔ تو انہوں نے اس شہر کا نام Petra[1] (پیڑا) رکھا۔ اب رومن ہسٹری کے اندر اسے Petra کہا گیا ہے۔ عربوں نے اسی لفظ کو بدل کر اس کا نام بطرہ رکھا۔ اس کا یہ نام آج بھی بطرہ ہے اس کے کھنڈرات رہ گئے ہیں۔ یہ شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتی تھی۔ پہلی عالمی جنگِ عظیم (1914-1918) کے بعد جو وہاں کھدائیاں شروع ہوئی ہیں تو ان میں جس طرح موہنجوداڑو اور ٹیکسلا[2] کے مقام پہ کھنڈرات ملے ہیں' اسی طرح بطرہ یا پیڑا کے مقام پر بھی کھنڈرات ملے ہیں۔ اس زمانے کی غاروں میں بہت زیادہ خانقاہیں برآمد ہوئی تھیں۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب اصحاب کہف (غاروالوں) یا اصحاب الرقیم (بطرہ والوں) کے قصہ سے واقف تھے لیکن انہی تفاصیل کے ساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔ تو یہ ہے جو **اَصۡحٰبَ الۡکَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ** یعنی وہ غاریں جو بطرہ میں واقع ہوئی تھیں۔ اب ان غار والوں کا قصہ تمہارے سامنے آتا ہے۔

عیسائیت کا عروج

قصہ یوں مشہور تھا کہ جب یہ عیسائیت نئی نئی آئی اور پھیلی تو خود رومن (Romans) بھی اس زمانے میں اس کے خلاف تھے۔ ان کا ایک بادشاہ تھا' جس کا نام King Diocletianus (A.D. 254-313) تھا۔[3] یہ جو آپ کے ہاں دقیانوس کا لفظ ہے' یہ وہی Diocletian ہی ہے جو King تھا۔ وہ جو ہمارے ہاں دقیانوسی بنے' وہ تو پوچھو نہیں کہ کتنے قدامت پرستوں کو کہتے ہیں۔

---

[1]

[2] موہنجوداڑو صوبہ سندھ میں اور ٹیکسلا صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔

[3]

عربوں کے نزدیک تو یہ عیب بھی پرانے زمانے کا عیب ہوگا حالانکہ یہ تیسری صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ یہی کوئی غالباً 249 یا 251ء کا زمانہ تھا۔ اس میں یہ رومنز کا بادشاہ Diocletian دقیانوس سے۔ اس زمانے کا ذکر ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ بڑے متعصب تھے' سخت گیر تھے۔ ابتدائی دور میں' ہر انقلابی جماعت کی طرح' عیسائیوں کے اوپر بڑا تشدد ہوا تھا۔ یہ تصوف اور غاروں کا مسلک (خانقاہیت) تو انہوں نے اس تشدد کے بعد اسی لیے اختیار کیا تھا کہ حکومت کی طرف سے ان پہ بڑا تشدد ہوتا تھا۔ یہ تو بعد میں جب رومن ایمپائر (Roman Empire) نے عیسائیت اختیار کی ہے تو پھر یہ مذہبِ عیسائیت پھیلا ہے لیکن اس وقت جو دین تھا وہ ختم ہو چکا ہوا تھا' وہ بدل کر مذہب بنا تھا جو باقی تھا یا یوں کہیے کہ جورہ گیا تھا۔ اس دین کا تو Saint Paul (C.A.D. 5-67) نے شروع میں ہی بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ یہ یہودی تھا جو عیسائی ہو گیا تھا۔ یہ جو عیسائیوں کے سب سے بڑے Saints ہیں' ان میں Saint Paul کو بہت بڑا Saint گنا جاتا ہے۔ دِینِ عیسٰی علیہ السلام کو مذہب عیسٰی میں تبدیل کرنے کا موجب یہ یہودی تھا۔ آپ کے ہاں بھی تو Converts نے کچھ کم قیامت نہیں ڈھائی۔ ابتداً اگرچہ عیسٰی علیہ السلام بھی انبیاء کرام کی طرح ایک عظیم انقلابی ہستی تھی۔ یاد رکھو! برناباس کی انجیل میں یہ چیزیں ملتی ہیں کہ وہ کیا پیغام لے کے آئے تھے۔ یہ چیز تو ان اناجیل میں بھی ملتی ہے۔ رومنز نے یہودیوں کے ساتھ ساز باز کر کے وہی مذہب اور ملوکیت' دونوں کا گٹھ جوڑ کیا۔ یہودیوں کے ہاں یہ چیز تھی اور اس لیے یہ ان کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ عظیم انقلابی ہستی' عیسٰی علیہ السلام ہمیں ہمارے مذہب میں نہیں رہنے دے گا بلکہ ہمیں دینِ موسوی کے اوپر لے جائے گا اور جب دین موسوی آیا تو ایک انقلاب آ جائے گا۔ برناباس کی انجیل میں تو بڑی عجیب چیزیں بیان کی گئی ہیں اور میری جو کتاب ''شعلۂ مستور'' ہے' اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ میں نے وہاں ان کے حوالے (Quotalions) دیئے ہوئے ہیں۔ یہ جو ان کے ہاں کے سارے مذہبی پیشوائیت والے تھے' یہ یہودیوں کے پینل (گروہ) (Panel) میں بیٹھ کے مشورہ کرتے ہیں کہ اس وقت کیا کریں۔ آگے راوی عیش لکھتا ہے: نہ کوئی کام' نہ کاج۔ بیٹھے ہیں' تقدس بھی ہے' لوگ پاؤں بھی چومتے ہیں اور بہترین چیزیں بھی لا کے دیتے ہیں۔ بڑا مزہ آ رہا ہے صاحب! اور یہ شخص جس دین کے اوپر لے جا رہا ہے اس میں تو پیشوائیت ہی ختم کر دے گا۔ پھر ہمیں روٹی بھی بھیک کی طرح مانگ کے کھانی پڑے گی۔ اس لیے اس کی مخالفت نہایت ضروری ہے۔ یہ تھی ان کی مخالفت۔ رومنز (Romans) سے جا کے کہا کہ یہ تو ایک انقلابی شخص ہے' تمہارے خلاف بغاوت کر رہا ہے' تمہاری بادشاہت کو الٹ کے رکھ دے گا۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ دونوں کے گٹھ جوڑ نے ان کے خلاف یہ کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ یہ دوسری انجیلوں میں بھی یہ کچھ قدرے تغیر سے موجود ہے۔ وہ جسے صلیب دیتے تھے تو اس مجرم کے جرم کو تختی پہ لکھ کے ساتھ لٹکا دیتے تھے۔ تو ان کی انجیل کے مطابق جو حضرت عیسٰیؑ کو صلیب پہ لٹکایا گیا تو اس پہ جو رومن نے تختی لکھی تھی اس پہ یہ تحریر تھا کہ یہ ان کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ یہ صحیح بات ہے۔ انبیائے کرام گدڑیاں پہننے کے لیے نہیں آیا کرتے تھے۔ وہ تو ''گدڑی پوشوں'' کو تختِ پرویزی عطا کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان سے پیشوائیت بھی کانپتی تھی' ان سے ملوکیت بھی کانپتی تھی۔ یہ تھے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور یہ تھی ان کی جماعت۔ بہر حال میں نے اپنی کتاب میں

یہ سب کچھ لکھا ہے' آپ وہاں تفصیل سے دیکھئے گا۔

تو یہ تھے اُس ابتدائی دور کے یہ عیسائی نوجوان جنہوں نے پیشوائیت کے خلاف اور رومن کی ایمپائر کے خلاف یہ علمِ بغاوت بلند کیا۔ یہ عیسائی نوجوان دینِ عیسٰی علیہ السلام والے تھے' مذہبِ عیسائیت والے نہیں تھے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ دین کی ابتداء کیسے ہوتی ہے۔ پھر دین کے ان علمبرداروں کے ساتھ ان کے یہ متبعین عیسائی نوجوان کیا کرتے ہیں۔

دین کے نفاذ کے لیے اصحاب الکہف کی اختیار شدہ تدابیر

عزیزانِ من! اس قصے میں ساری بات ہی یہ بتائی گئی ہے کہ یہاں عیسائیت کیسے آن پہنچی۔ اِذْ اَوَى الْـفِتْيَةُ اِلَى الْـكَهْفِ (18:10)۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ نوجوان تھے جو دین کے اصولوں پر انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے (18:14)۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے چنانچہ انہوں نے پہاڑوں کے اندر ایک بہت بڑے غار میں جا کر پناہ لی تا کہ وہاں اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیاری کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان پر تشدد ہوا' تو انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ جب تک پوری تیاری نہیں ہوتی' کہیں جا کے چھپ جانا چاہیے۔ وہ لوگ آئے اور انہوں نے ایک غار تلاش کیا۔ وہ اس میں یہ کہتے ہوئے چھپ گئے کہ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (18:10)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اب کچھ ایسا انتظام کیجیے کہ جہاں سامانِ پرورش بھی ملتا رہے اور امرا بھی نہ دیکھیں۔ وہ جو ہمارے سامنے پروگرام ہے اس کی کامیابی کے لیے کچھ تدبیریں ہوتی رہیں' ہمارے لیے کچھ ایسا کر دیجیے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے جو لوگ ہونگے' یہ ان کے ساتھ ہمراز ہونگے' ان کی وساطت سے ہی یہ کچھ ہو سکتا ہے۔ غار کے اندر کھانے پینے کی چیزیں یا حسنِ تدبیر کے معاملات از خود تو طے نہیں ہوتے تھے۔ ان انقلابی جماعتوں کا ہوتا ہی یہی ہے۔ وہ جسے آج کی اصطلاح میں Underground جانا کہتے ہیں' تو ان میں سے کچھ Underground چلے جاتے ہیں' جو باہر ہوتے ہیں وہ ان کی گروہ بندی کا موجب بنتے ہیں۔ قرآن کوئی بھی داستان تاریخی لحاظ سے Historically بیان نہیں کرتا' قرآن حکیم داستان کے جو متفرق ٹکڑے ہوتے ہیں' ان میں نشان دہی کرتا چلا جاتا ہے۔ اسے ایک مسلسل داستان کی شکل میں لانا انسانی فکر پہ چھوڑ دیتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ شاعری کی کتاب تو نہیں ہے لیکن شاعری کے اندر بہترین حسن وہ ہوتا ہے جہاں ایمائیت ہوتی ہے' Suggestiveness ہوتی ہے۔ یعنی یوں کھلے کہ آپ کو جو بات کہہ دینا ہے اس میں وہ لطف نہیں ہوتا جتنا کسی ایسی بات میں ہوتا ہے کہ جو اشارہ کرے اور سننے والے کے Imagination پہ چھوڑ دے کہ وہ بات کو پورا کرے۔ ایمائیت بڑی چیز ہوتی ہے۔ ادھر آ جاؤں گا تو بہر حال بات ہی کہیں سے کہیں نکل جائے گی۔ یہ اندازِ بیان میں جان ہوتی ہے۔ مثلاً شاعر کا یہ مصرعہ دیکھیے: ''معلوم نہیں کدھر چلے آئے۔'' میں کہتا ہوں کہ اگر یہ شخص اس پر پوری کتاب بھی لکھ دیتا کہ ''مجھ پہ کیا بیتی ہے اور کس طرح سے لوگ اس طرف آ رہے ہیں'' تو وہ بات نہ پیدا ہوتی جو یوں پیدا ہوئی کہ اس نے اُس چیز کو ہمارے تخیل پہ چھوڑ دیا۔

ایمائیت کی چند ایک مثالیں

کچھ لوگ بچشمِ تر چلے ہیں
معلوم نہیں کدھر چلے ہیں

گدا سمجھ کہ وہ چپ تھا، میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

دیکھیے کو کچھ نہیں کہا مگر سب کچھ ایک لفظ میں کہہ گیا: ''میری جو شامت آئی۔'' دوسری مثال ملاحظہ کیجیے:

دل دھڑکتا ہے، قدم رکتے ہیں، گلشن کے قریب
آج یہ کیسا اجالا ہے، نشیمن کے قریب

تو میں نے کہا یہ ہے کہ یہ بیان میں ایک حسن ہے جہاں بات ایمائیت سے کہی جاتی ہے۔عزیزانِ من! قرآن میں تو یہ حسن انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ میں اس کی ایمائیت پہ جو غور کرتا ہوں تو پوچھو نہیں کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے یہ جتنے اشعار آپ کو سنائے ہیں، اس قسم کے سینکڑوں اشعار میرے پاس ہیں۔ قرآن کریم کی ایمائیت کے مقابلے میں یہ سارے کے سارے پھیکے ہو کے رہ جاتے ہیں۔

بات آگے چلے گی کہا: فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (18:11)۔اس غار کے اندر ان پہ ایک وقت گذر گیا۔ وہ اس غار میں کئی برس تک اِس طرح رہے کہ وہ باہر کی دنیا سے منقطع تھے۔ قرآن حکیم یہاں فتیٰ (18:10) کہہ کے ایک بات کہہ گیا۔ کہ فتی (18:10) نوجوان: قَامُوْا (18:14)۔اس مقصد کو لے کر اُٹھے۔ یہاں قاموا کا لفظ کہہ کے قرآن ایک بات کہہ گیا: ''اٹھ کھڑے ہوئے۔'' قرآن حکیم غار میں چھپنے کی بات کہہ کے ساری بات کہہ گیا۔ وہاں جا کر انہوں نے بیان کیا۔ کہ سامانِ رحمت بھی عطا ہو اور جو ہمارا پروگرام ہے اس کی کامیابی کے لیے بھی کچھ ہوتا رہے۔ قرآن یہ ساری باتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ اس غار میں ان پر کتنا ہی وقت گزر گیا۔ وہ جو اس وقت گزرنے کے قصے داستانیں بنتی ہیں، وہ تو ہماری تفسیروں میں موجود ہیں، ان میں آپ پڑھیے، پوچھیے کہ ان کے ہاں کیا کچھ ہوتا ہے۔ وہ جیسے جہالت پر مبنی عقائد چلے آ رہے تھے، اسی طرح جہالت پہ مبنی پھر یہ قصے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن تو یہ کچھ کہتا ہوا چلا جاتا ہے: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ (18:12)۔ یہاں بعث کا لفظ ہے۔ سبحان اللہ! ہمارے ہاں تو ''بعث بعد الموت'' پہلے ہی کہا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد کھڑا ہوگا۔ یہ لفظ جو ''ب ع ث'' سے ہے، اس کے بارے میں پہلے بھی یہ بات آئی ہے کہ بعث کے معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ ''وہ زنجیریں جو کسی کے ہاں آزادی کے راستے میں رکاوٹ ہوں، ان کو اٹھا لیا جائے تو اسے عربی میں بعث کہتے ہیں۔''

میں نے کہا تھا کہ یہ جو عراق کی بعث پارٹی ہے اس کا نام بعث پارٹی کیوں ہے؟ یہ Freedom Movement والی بات ہے۔ یہ لفظ ہی Freedom کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کہا: ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ (18:12)۔ پھر نوجوانوں کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل تھیں، وہ

اٹھ گئیں۔ پھر کہا: لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (18:12)۔اب یہ دیکھنے کے لیے کہ اس دوران میں جو باہر تغیر واقع ہوا ہے' اس میں یہ جو دو پارٹیاں تھیں' ایک ان کی پارٹی اور دوسری مخالف پارٹی' ان دو پارٹیوں نے اس درمیانی وقفے میں کیا کیا؟ کیا ان کی پارٹی کچھ غالب آئی یا اسی طرح سے مغلوب ہے؟ اس دوران میں یہ انقلاب آ چکا ہوا تھا۔ یہ جو نوجوان' غار میں پناہ گزین عیسائیوں کی پارٹی تھی' یہ مضبوط اور محکم ہوگئی تھی۔ اس لیے قرآن نے ''حزبین'' کہہ کے یہ بات ختم کردی۔ دو پارٹیوں کا ذکر کردیا کہ اس دوران یہ دیکھا جائے کہ ان دو پارٹیوں کی کیفیت کیا ہوئی ہے۔ کہا: یہ تھی ساری داستان جو لوگوں کی زبانی آپ نے لی۔ لوگوں کی زبانی جو قصے مشہور ہیں وہ تو وہی کالا جن اور سبز پری کے قصے تھے۔ ان کے متعلق عوام میں طرح طرح کی باتیں وابستہ ہو کر مشہور ہو چکی ہیں۔ کہا: نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ نَبَاَھُمْ بِالْحَقِّ (18:13)۔ سچی بات ہم بتاتے ہیں۔ ہم تمہیں ان کی بابت ٹھیک ٹھیک بات بتاتے ہیں۔ یہ سچی بات کیا تھی؟ کہا: اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی (18:13)۔ یہ ایک نوجوانوں کی جماعت تھی جو خدا کے قوانین کی صداقت پر ایمان لے آئے ہوئے تھے اور ان کی بات دُور دُور تک پھیل رہی تھی۔ یہ جو اس آواز کا پھیلنا ہوتا ہے' یہ مخالف قوتوں سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ ''ان کی بات پھیل رہی تھی'' آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کیا بات کہہ جاتا ہے۔ اگر وہ بات چند نوجوانوں تک محدود رہتی اور یہ مملکت ان کو محصور کر دیتی تو پھر کوئی بھی کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ وہاں تو بات ہی یہ تھی کہ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی (18:13)۔ ان کے راستے کشادہ ہو رہے تھے' اس سے مملکت کو خطرہ پیدا ہوا کہ بات پھیل رہی ہے۔ انہوں نے مخالفت شروع کی۔ قرآن کہتا ہے: وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اِذْ قَامُوْا (18:14)۔ واہ یہاں پہ وہ لفظ ''قاموا'' آ گیا۔ کہا: جب یہ اپنے پروگرام کو لے کے اٹھے ہیں' یہاں یہ نہیں کہا کہ انہوں نے کتنا تشدد کیا۔ کہا یہ کہ ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ دلوں کو مضبوط اسی لیے کیا جاتا ہے کہ کسی خطرے کا جو ڈر ہوتا ہے' جو خوف ہوتا ہے' وہ دور ہو جائے اور استقامت سے اس نصب العین کے حصول کے لیے کام میں لگ جائیں۔ کہا: ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔

اصحاب کہف کا اعلان

اب یہاں قرآن کہتا ہے کہ فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (18:14)۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا نشوونما دینے والا تو ارض وسما کو بھی نشوونما دینے والا ہے اس لیے اِن کے معاشرہ میں اس خدا کا نظام قائم ہوگا جس کا نظام کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر جگہ مسلط ہے۔ انہوں نے یہ وہی انقلابی اعلان کیا جو عزیزانِ من! ہر رسول کی زبان سے ہم سنتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہا کہ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلٰھًا (18:14)۔ ہم اس نظام کے ساتھ کسی اور کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم صرف اسے مانتے ہیں جو رب کی بات ہوتی ہے۔ ہر حاکم' ہر بادشاہ' جو ربوبیت کا سامان ہے' جو پرورش کا سامان ہے' جو روٹی کا سامان ہے' وہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ فرعون نے اپنے زمانے میں یہ کہا تھا: اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (79:24)۔ میں تمہارا سب سے

بڑا رب ہوں، میں ہی تمہارا سب سے بڑا ان داتا ہوں۔ تو یہ کچھ اپنی پرستش کے لیے نہیں کہہ رہا تھا کہ تم میری پرستش کرو۔ اس نے یہ کہا تھا کہ دیکھو! یہ زمین کس کی ہے؟ ہماری ملکیت ہے۔ یہ نہریں کس کی ہیں؟ ہماری ہیں۔ پھر کہا: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ میرے ہاتھ میں تمہارا رزق ہے۔ یہ ساری بات ہی یہاں رزق کی ہوتی ہے۔ جوتا مارو پھر ہر بات اس سے کراؤ۔ اگر کوئی کسی دوسرے کا روٹی کا محتاج نہ ہو۔ تو وہ کیوں دوسرے کی محکومیت اختیار کرے، کیوں غلام بنے۔ وہ پھر کسی کا غلام نہیں بنتا۔ اعلان ہی یہ ہے: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (18:14)۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ دنیا کا کوئی انسان یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ انسانوں کی نشو ونما کے سامان کو اپنے ہاتھ اور اپنے قبضے میں رکھے۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ سامانِ نشو ونما خدا کا دیا ہوا ہے اور خدا کی ہی تحویل میں رہنا چاہیے۔ وہ سمٰوٰت میں ہی خدا نہیں ہے، ارض میں بھی وہ خدا ہے۔ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا (18:14)۔ اس کے سوا ہم کسی حکمران کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کرتے، اس کے سوا ہم کسی کا اقتدار اور قانون ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیونکہ لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا (18:14)۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ بات ہمیں حق کی راہ سے بہت دور لے جائے گی۔ ہم قطعاً یہ کہنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے برعکس: هٰۤؤُلَاۤءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً (18:15)۔ یہ جتنی قوم ہمارے ساتھ ہے، انہوں نے خدا کی حکمرانی کو چھوڑ کے سارے کے سارے معبودانِ باطل، یہ حکام، یہ افسر، یہ بادشاہ، یہ مذہبی پیشوائیت، ان سب کو خدا بنا رکھا ہے، انہی کی قوتوں کے اقتدار کو تسلیم کر رکھا ہے۔ ہم ان کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے اٹھے ہیں۔

زمین کی ملکیت کی اتھارٹی کسی کے پاس نہیں

یہ تھا جو کہا تھا کہ ہم بتاتے ہیں کہ اس کی صحیح داستان کیا ہے۔ اس داستان میں، کہانی کی جزئیات نہیں بتائیں۔ اصل داستان بتائی کہ بات تو یہ تھی۔ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ (18:15)۔ کہا کہ ان کے پاس کہنے کی کوئی اتھارٹی نہیں ہے کہ یہ زمین میری ملکیت ہے۔ سُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ (18:15)۔ کی کیا بات ہے۔ کہا: There is no authority اور آج بھی عزیزانِ من! دنیا کے ہر دور کے اندر یہ اتھارٹی، یہ سند، کسی کے پاس نہیں ہوسکتی کہ یہ زمین میری ملکیت ہے، یہ روشنی میری ملکیت ہے، حرارت میری ملکیت ہے۔ سند آپ کے پاس تو وہی ہوگی جو آپ نے کسی سے خریدی ہے۔ بس Immediate جو آپ کے ہاں کا مالک ہے، وہاں تک کی سند ہے۔ باپ سے بیٹے نے لیا، وراثت کی اتنی سند ہے لیکن پہلے تو یہ ثابت کرو کہ اس کا اصلی مالک کون تھا؟ اگر آپ اس سے انگوٹھا بھی لگوالیں، اس سے دستاویز بھی لکھوالیں تو آپ کو یاد ہے کہ اس قانون میں بھی وہ قابلِ سماعت نہیں گنی جاتی اور نہ ہی وہ سند سندِ بین ہوتی ہے۔

قرآن کہتا ہے عزیزانِ من! کہ پہلے یہ اتھارٹی لاؤ، کہ یہ ثابت کرو کہ جس سے تم کہتے ہو کہ میں فلاں سے لے کے مالک بن گیا ہوں، وہ ثابت کرو کہ کیا وہ مالک تھا؟ پھر سلطنِ بین کی یہ بات آئے گی: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (18:15)۔ تم

کہتے ہو کہ ہماری حکومت میں ظلم نہیں ہوتا' ٹھیک ہے' کیا یہ کچھ کم ظلم ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ اتنا بڑا جھوٹ کہ خدا کی زمین کو کہتے ہو ہماری ملکیت ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ ہم ظلم نہیں کرتے۔ اگر ظلم نہیں کرتے تو کیا یہ عدل ہے؟ یہ ہے جو حضرتِ صالح علیہ السلام نے قوم ثمود سے کہا کہ وہ ارض' ارض اللہ ہے' یہ ناقۃ' ناقۃ اللہ ہے' زمین خدا کی ہے یہ جاندار خدا کے ہیں۔ زمین خدا کے ان مخلوق کے لیے کھلی رہنی چاہیے۔ یہ ہے حق: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (18:15)۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ حدود فراموش اور کون ہوسکتا ہے جو خدا پر اس طرح افترا باندھے؟ چنانچہ انہوں نے پھر آپس میں بات کی۔ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ (18:16)۔ اب انہوں نے آپس میں یہ کہا کہ بھئی! جب ایسا کھلا ہوا مسلک تم نے اختیار کرلیا ہے۔ تم نے یہ اعلانیہ کہہ دیا تو جب اتنا بڑا انقلابی مسلک تم نے اختیار کرلیا تو اب ان حالات میں ان کے اندر رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ (18:16)۔ اس لیے انہوں نے غار میں جا کے پناہ لی تھی۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ قصہ کیا تھا اور خود عیسائیت ابتداء میں کیا تھی۔ جب تک کوئی امت اپنے رسول کے دین کے اوپر رہتی ہے تو وہ بڑی انقلابی امت ہوتی ہے۔ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (18:16)۔ انہوں نے جوان کے ہاں کے سرغنے تھے آپس میں مشورہ کیا کہ خدا کا قانون ربوبیت جسے متمکن کرنے کے لیے انہوں نے آواز اٹھائی ہے ایسا انتظام کردے گا کہ تمہاری ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کو وہاں تک پھیلا دے اور تمہارے مقصد کی تکمیل کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے اُسے بھی حاصل کرنے کے لیے آسان بنا دے تو پھر انہوں نے کہا کہ اب ہمارے لیے طریق کار ہی یہ رہ گیا ہے۔ لہٰذا اب ہم نے اعلانیہ ان سے یہ کہہ دیا ہے: قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (109:1-6)۔ تو ان لوگوں کو' جو تمہاری دعوت کی اس طرح مخالفت کررہے ہیں' برملا کہہ دے کہ تمہاری اور میری منزل بھی الگ الگ ہے اور راستے بھی جدا جدا ہیں۔ تمہارے معبود الگ ہیں میرا معبود الگ۔ تم اپنے معبودوں کی پرستش کرتے رہو' میں اپنے معبود کے احکام و قوانین کی اطاعت و عبادت سمجھتا ہوں۔ یہ بھی مت خیال کرو کہ ہمارا اور تمہارا اختلاف وقتی اختلاف ہے۔ تمہارے معبود الگ رہیں گے میرا معبود الگ۔ لہٰذا یہ اختلاف ان مٹ ہے۔ تمہارا پروگرام الگ ہے' میرا الگ۔ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو' مجھے اپنے پروگرام پر چلنے دو' نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر کار کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔

ہجرت کا مقصد

عزیزانِ من! یہ ہے اعلان۔ کوئی Compromise نہیں ہوگا۔ ہمارا مسلک الگ ہوگیا' دین الگ ہوگیا' کوئی مناسبت نہیں' کوئی مفاہمت نہیں' کوئی مصالحت نہیں۔ لیکن اعلان کے بعد تو پھر ٹکراؤ لازم ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پہ جو غار کی طرف

آئے ہیں' یہ وہی ہے جو بڑے پیمانے پہ ہجرت کہلاتی ہے۔ اور یہ فرار کی راہ نہیں ہے۔ بار بار یہ چیز آتی ہے کہ **وَيُهَيِّئۡ لَكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا** (18:16)۔ تمہارے پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے بھی تدبیریں ہو جائیں۔ یہ خدا کرے گا۔ تو یہ Escapism تو نہیں ہے' فرار نہیں ہے' یہ Strategy ہے۔ اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے ایک نیا طریقہ کار ہے' جو تجویز کیا گیا ہے۔ ٹھیک ہے' یہ کرنا چاہیے۔ یہ تھا جو طے ہوا۔ آپ نو جوان وہاں غار میں گئے۔

غاروں کی کیفیت

جن لوگوں نے وہ غاریں دیکھی ہیں' وہ جانتے ہیں کہ یہ کیا ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ غار ہوتا نہیں ہے اور جو ہوتے بھی ہیں تو وہ اتنے سے تنگ و تاریک ہوتے ہیں گویا کہ وہ ''کورنے جۓ ہوندے ہیگے نیں' جینوں نمار غار کیندے ہیگے نیں''[1] لیکن یہ وہ غاریں تھیں جن کے اندر پوری کی پوری فوج سما جایا کرتی تھی۔ اس کے باہر اتنا چھوٹا سا منہ' آگے چل کے غار کے اندر سے بہت کھلا سا 'بڑا میدان' ہوتا تھا۔ اب بھی جو غاریں' وہاں کھل رہی ہیں' ان کے منہ سے نظر آ رہا ہے کہ وہ اندر ایسے جیسے بستیاں بستی ہیں۔ قرآن نے کہا: انہوں نے اس قسم کے غار کو تجویز کیا کہ وہ جو کچھ شمالاً جنوباً ہو۔ تاکہ نہ چڑھتے سورج کی روشنی اندر آ کے پڑے' نہ غروب ہوتے وقت اس کی روشنی اندر آ کے پڑے۔ غار کا رُخ ایسا ہو۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ دور سے' باہر سے جاتے ہوئے ہی روشنی میں کوئی یوں جھانک نہ لے کہ اندر یہ کیا ہے۔ تاریک غاریں بڑی ڈراؤنی' خطرناک ہوتی تھیں۔ ان کے اندر تو خوفناک درندے رہتے تھے۔ عام طور پر تو لوگ غاروں میں جھانکتے بھی نہیں تھے۔ مگر یہ غار ایسا تھا کہ جس میں: **وَتَرَى الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ تَّزٰوَرُ عَنۡ كَهۡفِهِمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ** (18:17)۔ سورج طلوع ہوتا تھا تو ایک جانب سے اس کی زیارت کرتا ہوا گزرتا تھا۔ ویسے تو اس ''ترازو'' کے معنی ''ذرا سا جھک جانے کے'' ہوتے ہیں۔ یہ اصل میں تو ''زار و نزار'' ہوتا ہے لیکن یہ جو ہمارے ہاں کا لفظ ''مزار'' آ گیا ہے۔ یہ اسی المزار سے ہے' جس کے معنی ''ملاقات کرنا'' یا جا کر جس چیز کی زیارت کی جائے کے ہیں۔ زیارت کے اندر وہ کسی کے سامنے جھک جانے کو کہتے ہیں۔ تو یہاں یہ جو لفظ ہے وہ ذو معنی لفظ ہے۔ سورج چڑھتا تھا تو وہاں سے یوں جھک کے چلا جاتا تھا تو براہِ راست روشنی نہیں پڑتی تھی۔ **وَاِذَا غَرَبَتۡ تَّقۡرِضُهُمۡ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمۡ فِىۡ فَجۡوَةٍ مِّنۡهُ** (18:17)۔ غروب ہوتا تھا تو پھر وہ ان کا راستہ کاٹ کے دوسری طرف جنوب کی طرف نکل جاتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ براہِ راست روشنی اس کے اندر نہیں پڑتی تھی۔ اور وہ اندر سے ''فجوۃٍ'' تھا' وہ کھلا ہوا میدان تھا۔ اس میں یہ رہ رہے تھے۔ نظر آتا ہے کہ اس پارٹی کی جو اس کے اندر گئے ہیں' خاصی تعداد تھی۔ **ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ** (18:17)۔ انہوں نے جب اس غار کا انتخاب کیا ہے تو کہا کہ یہ اب بھی اس پروگرام میں خدا کی بتائی ہوئی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ ہمیں ایک غار بھی اس قسم کا ایسا مل رہا ہے۔ یہاں **ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ**

---

[1] ایسے ہوتے ہیں جیسے جانوروں کے بل ہوتے ہیں' انہیں ہی غار کہتے ہیں۔

لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا (18:17) آیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ انتظام خدا کی نشانیوں میں سے تھا۔ جو خدا کی راہنمائی میں چلتا ہے۔ کوئی اس کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ جو اس کے راستوں کو چھوڑ دیتا ہے پھر کوئی بھی اس کو صحیح راستے پہ نہیں لگا سکتا۔

مرشد کا یہ لفظ خدا نے صرف اپنے لیے استعمال کیا ہے

قرآن نے کہا ہے کہ: **فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا** (18:17)۔ اس میں ''مرشد'' کا لفظ آیا ہے مگر ہم ہیں جو روز مرشد پکڑتے ہیں۔ خدا نے صرف اپنے آپ کو مرشد کہا ہے۔ رشد و ہدایت اس کی طرف سے ملتی ہے۔ **عکبت بین الرشد من الواحد** قرآن نے رشد اور غائیت کو الگ الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس اعتبار سے خدا ہی مرشد ہے۔ کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔ رشد دے ہی نہیں سکتا۔

غار کے اندر گذرنے والے لمحات کی کیفیت

اندر جا کر انہوں نے اپنا پروگرام بنایا: **وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ** (18:18)۔ تو اس انداز سے وہاں نیند پوری کرتے تھے کہ اگر کہیں جھانک بھی لے تو اسے معلوم ہو جائے کہ سوئے ہوئے نہیں ہیں' جاگ رہے ہیں۔ ویسے تو ''رقود'' کہتے ہی ''تھوڑی سی نیند کو'' ہیں۔ لیکن ایسی تھوڑی سی نیند جو بہت اچھی طرح سے آئے۔ اس میں وقت تھوڑا لگے۔ کیا بات ہے ''رقود'' لفظ کی۔ تو ایسا نظر آتا ہے کہ کچھ پہرہ دار مقرر کر دیئے ہونگے' کچھ جاگتے رہیں' کچھ سوتے رہیں' تھوڑی تھوڑی سی نیند کریں۔ دو دو لفظوں میں قرآن کیا کچھ کہہ گیا ہے۔ **وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ** (18:18)۔ اور ویسے بھی وہ اپنی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔ جسے آپ پوزیشن کہتے ہیں۔ یہ غار کے اندر پوزیشنیں بھی بدلتے رہتے تھے کبھی جنوب کی طرف' کبھی شمال کی طرف۔ یہ ان کے اندر کی Strategy بتائی ہے۔ کہ وہ اندر جا کے ''تسبیحاں نئیں پھیردے ہیگے سن' تے مصلیاں تے نئیں سن بیہ گئے''[1]۔ وہ ساری چیز نظر آتی ہے جیسے ایک عسکری نظام ہو جس کے تابع یہ سب کچھ کر رہے ہیں' پہرے بھی دیئے جا رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقت سوتے ہیں' تھوڑا وقت جاگتے ہیں' کبھی دائیں طرف ہو جاتے ہیں' کبھی بائیں طرف ہو جاتے ہیں۔ **وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ** (18:18)۔ اور وہ دروازے کے اوپر ان کا جو کتا ہے' وہ بہت بڑا ہو گا۔ وہ یوں بیٹھا ہے' جیسے شیر کا بچہ پہرہ دے رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی غار کے منہ کے اوپر ہی آ جائے تو اندر پتہ چلے۔ کتا تو بہت دور سے دیکھے گا۔ اس زمانے کا انتظام ایسا ہی تھا۔ غار کے اوپر باہر اگر وہ پہرہ دار کھڑے کر دیتے تو وہ تو بھید ہی کھل جاتا۔ تو پہرہ دار آدمی نہیں کھڑا کیا' بلکہ بہت بڑا کتا بٹھا دیا۔ کسی کو آتا دیکھے گا تو وہ دور سے اعلان کر دے گا۔ انہوں نے غار میں متعدد راستے بنائے ہونگے' ایسا نظر آتا ہے۔ **لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا** (18:18)۔

---

[1] وہ تسبیحاں نہیں کیا کرتے تھے' وہ جائے نماز پہ جا کر نہیں بیٹھ گئے تھے۔

اس جگہ ایسی بھیانک غار اور اس قسم کا انہوں نے اس کو بنا رکھا تھا کہ اگر کسی کو کچھ اطلاع بھی ہو جائے کہ کتا ہے شاید یہاں کوئی جاندار چیز ہو تو وہ ڈراونا' بھیانک ایسا منظر تھا کہ کوئی جھانکنے کی جرآت ہی نہیں پاتا تھا۔ وہیں ڈر جائے' ڈر کے مارے۔ ایسے انتظامات کیے ہوئے تھے۔ **وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ** (18:19)۔ اس طرح سے پھر ان کی وہ جو رکاوٹیں تھیں جب وہ دور ہوئیں تو پھر ان کو ہم نے اٹھا کھڑا کیا۔ پھر انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ بھئی! کتنا ایک وقت ہو گیا ہو گا۔ تو گویا انہیں اندر اندازہ نہیں تھا۔ غار تھا' جہاں سورج کے طلوع و غروب کا بھی کچھ حساب مشکل ہی تھا۔ یوں ہی بیٹھے ہوئے اندازہ کر رہے ہیں کہ کیا خیال ہے بھئی! کتنا عرصہ ہم رہے ہونگے۔ **قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ** (18:19)۔ انہوں نے کہا اس کی کیا بات ہے کچھ مدت تم کہتے ہو اتنی یا اتنی' یعنی وہ اس جھگڑے میں پڑے ہی نہیں' اس کے یہ معنی ہیں۔ یہ گننے کے جھگڑے میں نہیں پڑے کہ کتنی مدت تک ہم رہے۔ **قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ** (18:19)۔ چھوڑ دو اس قصہ کو خدا جانتا ہے کہ کتنا عرصہ غار میں رہے۔

باہر کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا طریق اور پروگرام

بات تو یہ ہے کہ ہمیں اب کرنا کیا ہے؟ **فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ** (18:19)۔ اپنے میں سے ایک آدمی بھیجیں اور یہ اپنے زمانے کا جو سکہ تھا وہ لے کے جائے۔ **فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا** (18:19)۔ اور وہاں کسی نان بائی کی دوکان سے صرف روٹی خریدنے کے لیے جائے۔ اور اتنے میں سارا کچھ دیکھتا چلا جائے۔ ایک تو اگر یہ سلطنت' مملکت ہی بدل گئی ہو گی تو سکہ ہی بدل گیا ہو گا۔ وہ انگریزوں کے زمانے میں ہمارے ہاں ''ٹکہ پیسہ ہوندا سی سکے دا''[1] تو پہلی چیز تو یہ تھی کہ وہاں یہ نظر آ جائے گا کہ سکہ (Currency) بدلا ہوا ہے یا نہیں۔ وہاں سے یہ بات پتہ چل جائے گی کہ مملکت بھی بدل گئی ہے یا نہیں۔ **وَلْيَتَلَطَّفْ** (18:19)۔ جو جانے والا ہے وہ بڑی باریک بینی سے کام لے کیونکہ اس میں بڑا رسک (Risk) ہے۔ اس سکے کو لیجا رہے ہیں۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے! خدا نے اپنے آپ کو لطیف الخبیر (6:103) کہا ہے۔ ''باخبر ہے'' لیکن اس طرح خبر رکھنے والا کہ جس کے متعلق خبر رکھ رہا ہے اس کو پتہ تک نہ چلے کہ یہ مجھے Watch کر رہا ہے۔ ایسا Ingediator ۔ کہا: اس قسم کا آدمی بھیجو اور اسے تاکید کرو کہ دیکھنا کسی کو خبر تک نہ ہو کہ Watch کر رہے ہو۔ یہ بڑا ضروری ہے: **وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا** (18:19)۔ دیکھنا تمہارے متعلق کسی کو کسی بھی طرح سے ذرا سا شعور تک نہ ہونے پائے۔ **اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا** (18:20)۔ ذرا سی بھی اگر انہیں بھنک پڑ گئی تو یاد رکھیے' پھر تم قابو آ جاؤ گے۔ اس کے بعد پھر دو ہی مطالبے ہونگے کہ یا تو یہی کہ وہ کہیں گے ہمارا دین اختیار کرو یا تمہیں سنگسار کر دیں گے' پتھروں سے مار دیں گے۔ یاد رکھو' کتنا بڑا رسک ہے۔ اور پھر کبھی کامیابی کا منہ دیکھنا

---

[1] انگریز کے دور حکومت میں سکہ ٹکے پیسے کی صورت میں ہوتا تھا۔

نصیب نہیں ہوگا۔ **وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَارَيْبَ فِيْهَا** (18:21)۔ ہم نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ لوگ ان کے حال سے مطلع ہو گئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کے گم گشتہ لیڈر زندہ ہیں اور خدا نے جو وعدہ کیا تھا پورا ہو چکا۔ وہ انقلاب جس کے لیے انہوں نے آواز بلند کی گی' وہ بلا شبہ آ چکا۔

باہر کے حالات کامیابی کی شکل اختیار کر چکے ہیں

اس طرح سے وہ گئے اور وہاں جا کے انہوں نے اندازہ لگایا کہ ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا۔ ان کی پارٹی Strong ہو گئی ہوئی تھی' یہ مسلک پھیل چکا تھا۔ دیکھنے والے نے کہا کہ وہ جو خدا نے وعدہ کر رکھا تھا کہ تمہارا یہ پروگرام کامیاب ہوگا' وہ تو ہو رہا ہے۔ **اَنَّ السَّاعَةَ لَارَيْبَ فِيْهَا** (18:21)۔ وہ انقلاب تو آ گیا ہے جس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔

''الساعۃ'' قرآن کی اصطلاح میں ''انقلاب'' کو کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے ہمارے ہاں یہ کہتے ہیں کہ ''یہ گھڑی محشر کی ہے' تو عرصہ محشر میں ہے۔'' یہ وہی لفظ ہے جس کا ترجمہ ''گھڑی'' کر دیا۔ یہ لفظ ''الساعۃ'' انقلاب کے معنی میں ہوتا ہے۔ ''ساعۃ'' کے معنی ہوتا ہے: ''کوئی چیز جو آنے والی ہو' اس کا تیزی سے آنا'' **اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا** (18:21)۔ کیا بات ہے! قرآن کہاں سے کہاں جا پہنچتا ہے! کہتا ہے: بات تو یہ تھی' ایسے انقلابی تھے یہ لوگ اور یہ کچھ انہوں نے کر کے دکھایا۔ اس کے بعد یہ مسلک آگے پھیلا۔

اس کے بعد پھر مذہب اور خانقاہیت کے پرچار کا غلبہ

(18:21) میں کہا کہ پھر وہ مر گئے۔ اس کے بعد آگے یہ مذہب پرست مجاور آ گئے' انہوں نے ان کی قبریں بنا دیں۔ پھر ان قبروں پر جھاڑو لے کر بیٹھ گئے اور ان کی حیات کے کارناموں میں رنگ آمیزیاں کرنے لگے۔ اس کے بعد آپس میں جھگڑا شروع ہوا کہ صاحب! ان کی یادگار کس قسم کی قائم کی جائے؟ چلیے' مزار کیسا بنایا جائے؟ خانقاہ کیسی بنائی جائے؟ کس قسم کی قائم کی جائے صاحب! **قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا** (18:21)۔ وہ پارٹی جو اس بحث ونزاع میں غالب آ گئی' اس کی اکثریت تھی تو انہوں نے کہا کہ ''خالی خانقاہ ہی نہ بناؤ۔ داتا صاحب دے مزار دے نال مسجد وی بناؤ۔ جیہڑا مزار تے نئیں آئے گا' نماز پڑھن تے آئے گا۔''[1] کہنے لگے: یہ کرو کہ زیارت گاہ بناؤ اور اگر کچھ عرصے کے بعد وہ عبادت گاہ والی کشش باقی نہ رہی' تو خود ان کی یہ خانقاہ' یہ مزارات' خود عبادت گاہ بن جائیں گے۔ بس یہ ہے جو انہوں نے کہا تھا: یہ کرو۔ انقلابی جماعتوں کے بعد' عزیزانِ من! پھر یہ کچھ ہوتا ہے۔

---

[1] اکیلی خانقاہ ہی نہ تعمیر کرو۔ داتا صاحب کے مزار کے ساتھ ایک مسجد بھی بنا دو۔ جو مزار پہ نہیں آئے گا وہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تو ضرور آئے گا۔ (اس طرح مزار تو آباد رہے گا۔)

امت روایات میں کھو گئی

یہاں ہمارے ہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ کئی مزار ہیں: غازی، فلاں شہید اور وہ مزار اسی قسم کے ہوتے ہیں جیسے فقیروں کے مزار ہوتے ہیں۔ ان میں میلے لگتے ہیں، ڈھول بجتے ہیں، عرس ہوتے ہیں۔ نام کے ساتھ غازی لکھا ہوتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ ابتداء میں کون تھے۔ اور اس کے بعد جب وہ قبریں پوجنی شروع کرتے ہیں تو پھر وہ کسی بھنگی خانہ کا فقیر ہو، وہ غازی و شہید ہو، کوئی بھی ہو، بس اس کا تو مزار ہوتا ہے، مجاور ہوتے ہیں اور وہ اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ کہنے لگے کہ بجائے اس کے کہ جو اوپر مجاور بیٹھے ہوں وہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ یہ کتنے بڑے انقلابی لوگ تھے اور انہوں نے کس قسم کی معرکہ آرائیاں کی تھیں اور کیسے جان دی تھی، یہ سب داستانیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے متعلق مجاور یہ کچھ باتیں کرتے رہتے ہیں: **سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ** (18:22)۔ وہ بیٹھے ہوئے اس طرح کی کہانیاں بیان کرتے رہتے ہیں: کوئی کہتا ہے کہ یہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا۔ دوسرا کہتا ہے: ''سوٹا لا کے کہ نئیں اوئیں چار سن پنجواں کتا سی''[1] قرآن نے سچ کہا ہے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا: **رَجْمًا بِالْغَيْبِ** (18:22)۔ یہ اندھیرے میں تیر تکے چلاتے رہتے ہیں۔ کیا لفظ ہے قرآن کا! کیا نقشہ کھینچا ہے قرآن نے! **وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ** (18:22)۔ ان کے ہاں کا ایک بہت بڑا ''سرپنچ کہنے لگے: ''اوتسی سارے بک بک کردے او۔ تہانوں کچھ پتہ نئیں، ککھ نئیں پتہ ہیگا۔ اواصل وچ سات ہیگے سن، اٹھواں کتا سی''[2] یہاں قرآن حکیم کہتا ہے: **قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ** (18:22)۔ یہ بات ہی کونسی ایسی تھی۔ کوئی کہہ دے گا کہ تم لوگ اس بحث میں مت پڑو۔ صرف اتنا کہو کہ ان کی گنتی شمار خدا ہی جانتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے اصلی حالات چند لوگوں کو معلوم تھے اور اُن میں اب کوئی بھی باقی نہیں ہے۔

اصل سوال ان کی تعداد کا نہیں، ان کے عمل کا ہے

لہٰذا سوال یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی۔ بات یہ کہو کہ وہ کون تھے اور کیا کر گئے۔ یہ تھی وہ بات جو کہنے کی ہے۔ **فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا** (18:22)۔ اب قرآن مخاطب سے یہ کہتا ہے کہ تم بھی ان کے متعلق ان بحثوں میں نہ پڑ جانا کہ تعداد کتنی تھی۔ نہ تمہیں پتہ ہے، نہ انہیں پتہ ہے۔ یہ جو ظاہراً قرآن نے بات کہی ہے، وہیں تک رہو۔ اس پہ غور کرو۔ **وَلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا** (18:22)۔ اور نہ ہی اب تم اس کے متعلق ریسرچ سکالر بٹھاؤ کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ کتنے لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی تعداد کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ ارے کچھ سکالر بٹھانے ہیں تو اس پہ بٹھاؤ کہ یہ کیا کرنے آئے تھے؟ انہوں نے کیا کیا تھا؟

---

[1] دوسرا اکٹھ لگا کر کہتا ہے کہ نہیں بھئی! نہیں وہ چار تھے اور پانچواں ان کا کتا تھا۔

[2] ایک مہاپنچ کہنے لگا: ارے کیا بک بک جھک جھک کر رہے ہیں تمہیں اس کا کچھ نہیں معلوم۔ اصل یہ ہے کہ وہ خود تعداد میں سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

یہ کون تھے؟ لیکن اس کے بعد آپ دیکھیں گے صاحب! کہ ان مجاوروں میں ساری باتیں اس قسم کی ہوتی رہیں گی۔ کسی کے متعلق یہ نہیں بتایا جائے گا کہ کتنی بڑی انقلابی جماعت تھی' انہوں نے کیا کچھ کیا' ان کا کیا مقام تھا۔

کسی غازی کی قبر ہو' یا کسی مجذوب کا مقبرہ ہو' وہاں تو دونوں ہی کی پرستش ہوتی ہے۔ اور ان قبروں پر بیٹھے ہوئے مجاور ان کے متعلق لوگوں سے یہ قصے کہانیاں سناتے رہتے ہیں اور لوگ بھی جا کر سنتے رہتے ہیں۔ انہیں خود بھی اتنا ہی علم ہوتا ہے جو وہ کہہ رہے ہوتے ہیں۔ سننے والوں کو کچھ پتہ نہیں ہوتا' وہ سن کے چلے آتے ہیں۔ وہ پھر ان کے ہاں کی ایک عبادت گاہ بن کے رہ جاتی ہے' عقیدت مندوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے اور پھر وہاں اس قسم کی لغو باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو قرآن بتانے والا ہے۔ یہ تھا جو قرآن نے بتایا ہے کہ آخر میں جا کے دین کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ یہ تھی عیسائیت۔ کہا: جو کہہ رہے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا تھا' اُن سے یہ کہو کہ یہ بتاؤ کہ وہ کتنا بڑا انقلابی انسان تھا اور اس نے آ کے کس قسم کی جماعتیں پیدا کی تھیں۔

قرآن اور انجیل کے بیان میں فرق

عزیزانِ من! میں کہتا ہوں اتنی سی چیز سے عیسائیت اور قرآن کے اندر نمایاں فرق نظر آ جاتا ہے۔ انجیل کی کیفیت یہ ہے کہ حضرتِ مسیح کے کل بارہ حواری یعنی ساتھی تھے۔ ان کی انجیل کے مطابق ساری زندگی میں انہیں تو کل بارہ ساتھی نصیب ہوئے۔ ان میں سے ایک نے تو تیس روپے لے کر مخبری کر کے بیچ دیا اور باقی جو گیارہ تھے جب یہ پکڑے گئے ہیں تو وہ گیارہ کے گیارہ بھاگ گئے۔ کوئی ایک بھی ساتھ نہیں تھا۔ یہ ان کی انجیل آج بھی یہ کہہ رہی ہے۔ کہاں کے اس قسم کے ساتھی تھے۔ عزیزانِ من! یہ تو خدا کے انقلابی رسول تھے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ڈاکوؤں کے ساتھ بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں' جو آخر تک ساتھ دیتے ہیں۔ اب آگے جو اگلی بات آتی ہے اس سے تو کلیجے پہ چھری چل جاتی ہے کہ خود حضرتِ مسیح علیہ السلام کو جب صلیب پہ چڑھایا تو انہوں نے کہا کہ اے میرے اللہ! تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ لو وہ ساتھی ان کو چھوڑ گئے اور یہ وہاں خدا سے کہہ رہے ہیں کہ تُو تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ (معاذ اللہ) اب قرآن آتا ہے عزیزانِ من! اندازہ لگائیے کہ ان عیسائیوں نے اسلام کی کتنی مخالفت کی۔

قرآن کے نزدیک اصحٰب کہف کا مقامِ بلند

قرآن نے آ کے یہ کہا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آواز دی کہ لو بھئی! خطرے کا مقام آ گیا۔ ہمارے پروگرام میں نازک گھڑی آ گئی اور آپ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہا کہ کون ہے جو اس معاملے میں میرا ساتھ دے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ پورے کے پورے حواریوں نے بیک زبان کہا کہ ہم ساتھ دیں گے۔ ''جئیں گے بھی تمہارے ساتھ اور مریں گے بھی تمہارے ساتھ۔'' قرآن یہ کچھ کہتا ہے۔ ان کے ہاں کے عیسائیوں کے بزرگ اور راہب' ان کے ہاں کے Saints' ان کے ہاں کے پجاری' انہی میں یہ سارے شامل جنہوں نے ان

کے ہاں کی یہ انجیلیں وغیرہ مرتب کیں، وہ اپنی انجیلوں میں ان کے متعلق اس کے بالکل برعکس لکھتے ہیں۔ قرآن ان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی یہ کہہ کے مدافعت پیش کر رہا ہے کہ اس نے آواز دی اور انہوں نے سامنے سے یہ آواز دی کہ ''ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔''

بات تو خدا کی طرف سے عطا کردہ معاشی نظام کی تھی

اگلی بات کیا چیز ہے جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا؟ قرآن نے ایک لفظ میں یہ کہہ دیا کہ انہوں نے کہا کہ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ''ان کے ہاتھوں سے روٹی نہ آئے، روٹی خدا کے ہاتھ سے آئے۔'' یہ بات تو پھر ہمارے ہاں داستانوں میں پڑ گئی کہ وہ جی! کس طرح سے، آسمان سے ایک سالن اترا کرتا تھا! پکی پکائی تازہ روٹی آسمان سے اترتی تھی، تازہ بہ تازہ روٹی: ''اودسیا ہونداائے، ایڈی وڈی مچھلی ہوندی، سی اینیاں روٹیاں ہوندیاں سن، اوناں دا پیو بیٹھا ہویا سی اسے دیٹر والا'' ❶ عزیزانِ من! جب دین مذہب میں آ جاتا ہے تو وہ مضحکہ انگیز ہی نہیں ہوتا، وہ تو حوصلے پست کر کے رکھ دیتا ہے۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ بڑی انقلابی چیز ہے کہ جس کو ہم لے کے آئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان روٹی کے لیے ان کا محتاج نہ ہو، روٹی خدا کے ہاں سے آئے۔ اس کے لیے ہم تمہارا ساتھ دیں گے، جہاں تک جانا پڑا ہم تمہارے ساتھ جائیں گے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن نے ان کو کہا کہ یہ حواری ہیں کہ جن کا دامن ہر قسم کے عیب سے پاک تھا، دھلا ہوا تھا۔ قرآن ان کے قصوں میں یہ باتیں بتا رہا ہے۔ یہ جو عیسائیت میں اصحب الکھف تھے ان کے قصے ان کے ہاں بہت مشہور ہیں۔ وہاں ان غاروں کے اوپر، انہوں نے ان کے معبد بنائے ہوئے ہیں۔ شام میں جو اب یہ کھنڈرات نکلے ہیں، ان میں یہ جو چیزیں نکلی ہیں وہ ان تختیوں پہ لکھی ہوئی ہیں۔ وہاں لکھا ہوا تو یہی ہے کہ یہ بہت بڑے Saint تھے، اور وہ دنیا کو تیاگ کے آ بیٹھے ہوئے تھے۔ قرآن ان کا یہ قصہ، ان کے رسول ﷺ کا نہیں، ان کے حواریوں کا نہیں، بلکہ اصل میں ان کا جو انقلابی لوگ تھے، جن کے متعلق غلط داستانیں مشہور تھیں، صحیح کر رہا ہے، صحیح بات بتا رہا ہے۔ یہ ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا (2:97)۔ کہ تمہارے ہاں کی تعلیم جو بگڑ چکی ہوئی ہے، میں تو اس کو بھی سیدھا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ تو بگڑی ہوئی تعلیم یوں سیدھی ہوتی ہے۔ قرآن نے ان کے غاروں کے متعلق یہ بتایا۔

تصوف کی پہلی اینٹ شام میں دوسری صدی میں رکھی گئی

آپ کے ہاں یہ تو پھر بھی تیسری صدی تھی۔ 249ء دوسری صدی ہجری میں غالباً 153ھ میں اسی شام کے اندر انہی غاروں میں سے ایک غار میں آپ کے ہاں کی پہلی خانقاہ کھل گئی اور سب سے پہلے تصوف کی بنیاد وہاں رکھی گئی اور یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ ان کی یہ خانقاہیں پھیل گئی تھیں تو اب تو یہ معدود اور محصور ہو کے رہ گئی ہوئی ہیں۔ وہ عام طور پہ پہلے ایسی نہیں تھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یورپ میں علم آیا ہے تو انہوں نے اس کو بند کر دیا ہے، محصور کر دیا ہے۔ اب جاؤ، دیکھو کہ کیا وہاں کوئی پادری یا کوئی فقیر بیٹھا ہوا ہے؟ قطعاً نہیں۔ اب یہ صرف ہمارے ہاں ہی آباد ہیں۔

---

❶ یہ بتایا ہوتا تھا کہ اتنی بڑی مچھلی آتی تھی، اتنی زیادہ روٹیاں آتی تھیں۔ بھلا بتاؤ تو وہاں ان کا باپ بیٹھا ہوا تھا جو یہ سب کچھ بنا سنوار کر بھیج رہا تھا۔

آج ہمارے ہاں خانقاہیت کی آبیاری کے لیے شب و روز کی مصروفیات

ہماری خانقاہیں تو آج ساری امت کے اوپر چھائی ہوئی ہیں اور دن بدن یہ سلسلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ بڑھتا اس لیے جاتا ہے کہ مذہب کے اندر ملوکیت فروغ پاتی ہے۔ دین کے اندر یہ مذہب اور ملوکیت دونوں فنا ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم تاریخ کے تمام پیچ وخم کو نکالنے کے لیے نازل ہوا ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں قرآن میں وہ اصحب الکھف جن کا قصہ بیان ہوا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن ان لوگوں کے ہاں کی یعنی دوسرے مذاہب کے ہاں کی بھی بگڑی ہوئی داستانوں کو صحیح لے کے آجاتا ہے۔ یہ ہے قرآن حکیم کی وہ تعلیم کہ جس میں کہا کہ اس میں کوئی کسی قسم کا پیچ وخم نہیں ہے۔ آپ اس قصے میں دیکھیے۔ یہ جو سنار کے پاس جنتری [1] ہوتی ہے جس میں سے وہ تار کو کھینچتا ہے تو اس تار کے سارے بل نکل جاتے ہیں۔ عزیزان من! یہ قرآن کریم ان تاروں کو درمیان سے کھینچتا ہے اور پھر سارے بل نکل جاتے ہیں اور ہم ڈرتے ہی اس لیے ہیں کہ یہ کہیں ہمارا بل نہ نکال دے اور مذہب کو دین القیم نہ بنا دے جبکہ یہ دین خداوندی سیدھا' متوازی' جنتری میں سے نکلا ہوا دین ہے اور آج ہماری سرتوڑ کوشش یہ ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

عزیزان من! ہم سورۃ الکھف کی آیت 22 تک آ گئے۔ آیت 23 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀......❀

---

[1] لوہے کی ایک سوراخ دار پلیٹ جس میں سونے چاندی کے تار ڈال کر انہیں لمبا کرتے ہیں یا ان تاروں کے بل نکالتے ہیں۔

دوسرا باب: **سورۃ الکہف** (آیات 23 تا 44)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ
لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ
غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۖ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَاتْلُ مَآ
اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ
مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ
فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي
الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۚ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ
عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا
خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ ۚ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ وَاضْرِبْ لَهُمْ
مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ
اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ
مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ
قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ
مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ
قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ
وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ
يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿٤٢﴾ وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ﴿٤٣﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1975 کی 5 تاریخ ہے۔ اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 23 سے ہو رہا ہے: (18:23)۔

حقیقت خرافات میں کھوگئی

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا سابقہ آیات میں اصحب الکہف کا قصہ چلا آ رہا تھا۔ جب ان مجاہد نو جوانوں کی جو خدا کی کبریائی بلند کرنے کے لیے اٹھے، مخالف قوتوں نے زندگی دوبھر کر دی تو انہوں نے اپنی Strategy کے طور پر کچھ وقت کے لیے ایک غار میں پناہ لے لی۔ یہ ساری بات تو پیچھے بیان ہوتی چلی آ رہی تھی۔ بہر حال پھر اس کے بعد جب وہ باہر آئے، ان کی پارٹی کو کامیابی ہوئی اور پھر جیسا کہ ہوتا ہے، کچھ عرصے کے بعد ان کے مزاروں کو پرستش گاہ بنا دیا گیا، ان پر مجاور بیٹھ گئے۔ اب جو لوگ بھی وہاں جاتے، بجائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کیے جاتے کہ انہوں نے کس طرح باطل کی قوتوں کے خلاف جہاد کیا اور کس طرح اس میں اپنی جان تک دے دی تو وہاں باتیں یہی چھڑتی رہیں کہ ان کی تعداد کتنی تھی، وہ کتنے تھے، تین تھے، پانچ تھے، سات تھے، کتا ان کا آٹھواں تھا۔ یہ ساری اس قسم کی چیزیں اور بحث تمحیث جو کچھ مزاروں میں داستانیں بیان ہوتی ہیں، وہاں بیان ہونے لگ گئیں تو بس وہ جو مزار تھے، وہ مقبرے تھے وہ سب ان کی پرستش گاہیں بن گئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ تو یہ کہا کہ انہیں یقینی طور پر اس کا بھی علم نہیں ہے۔ یہ یونہی تکا چلانے والی باتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہوتے ہیں۔ درمیان میں قرآن ایک ٹکڑا لایا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم صرف تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ کسی داستان کو مسلسل بیان کیے چلا جا رہا ہے۔ داستان بیان کرنے سے بھی کسی نتیجہ تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ اور اس کے درمیان میں بھی اگر ضرورت پیش آتی ہے تو وہ توجہ کا رُخ اُدھر موڑ دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو ماضی کے قصے ہیں۔ یقینی طور پر کہنا کہ اصل واقعہ کیا تھا تو تحقیق کرنے سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

مجاوروں کی داستان گوئی اور قسمتوں کا حال

یہ مجاوران مزاروں کے اوپر بیٹھے ہوئے' قسمت کا حال بتا رہے ہیں' تقدیریں بدل رہے ہیں۔ یہ لوح وقلم سے خود ہی ان کی پیشانیوں کے اوپر ان کی قسمتیں لکھ رہے ہیں۔ یہ کہا کہ یہ جتنی بھی چیزیں ہیں' مستقبل کے متعلق یہ جو بھی کچھ باتیں کرتے ہیں' ان کی تو خود یہ کیفیت ہے کہ **وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا** (18:23)۔ انسان یقینی طور پر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ''میں کل کیا کرونگا''۔ کسی دوسرے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ دس برس کے بعد یہ ہو جائے گا' یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ کسی کام کے ہونے کے لیے کتنے عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ کتنی شرائط کا پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دن پہلے بھی انسان یہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ فی الواقعہ یہی حالات کل بھی رہیں گے جن میں میں یہ کچھ کرونگا۔ لہٰذا انسان کے علم کی تو کیفیت یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ کہا کہ یہ چیز یقین کے ساتھ از خود نہیں کہنی چاہئیں اور آگے ایک ٹکڑا آتا ہے' جس کے غلط مفہوم نے الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ یہ ٹکڑا ہے **اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ** (18:24) کا۔

لفظ انشاء اللہ کا استعمال

آپ کو معلوم ہے کہ مشیتِ خداوندی کے متعلق بڑی تفصیلی بحثیں ہمارے درس میں گزر چکی ہیں اور میں اپنی کتاب ''کتابِ التقدیر''[1] میں اس کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور پھر وہی انشاء اللہ والی بات ہمارے سامنے ہے۔ آپکو معلوم ہے کہ اب انشاء اللہ کہاں بولا جاتا ہے؟ یہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں پہلے ہی من میں چور ہو کہ میں نے یہ کچھ کرنا ہی نہیں ہے اور اتنی جرآتِ اخلاق نہ ہو کہ یہ کہہ دے کہ ہاں صاحب! میں نہیں آؤنگا' میں نہیں کرونگا۔ مگر کہا یہ جاتا ہے کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے میں آؤنگا اور اب تو یہ اتنا مذاق ہو گیا کہ اسی وقت وہ منہ پہ کہہ دیتے ہیں کہ میاں! سچی بات کرو' آؤ گے یا نہیں آؤ گے۔ یہ درمیان میں انشاء اللہ والی بات چھوڑو۔ اور اگر اس لفظ کا Origin بھی Seriously لیا جائے' تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ اعترافِ شکست اور کوئی ہے ہی نہیں کہ وہ ذمہ داری خدا کی طرف لوٹا دی جائے کہ وہ چیز خود تو نہ کی جائے اور کہا یہ جائے کہ بھئی! میں نے تو انشاء اللہ کہا تھا' نہیں ہوا تو وہ خدا نے نہیں چاہا' اس لیے نہیں ہوا۔ میں تو ذمہ دار نہیں ہوں۔ یہ یاد رکھیے کہ یہ جتنے غلط' باطل نظریات واعتقادات بنتے ہیں' یہ صرف جہالت نہیں ہوتی۔ ہاں بعد میں تو لوگ جہالت کی ہی بناء پہ ایسا کہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ Originally یہ چیز جس کسی نے بھی کہی تھی اس کے اندر بڑی مکاری تھی۔

---

[1] پرویزؒ کتاب التقدیر ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) گلبرگ لاہور سے پہلی بار 1991ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی اور اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا قابل فہم' بصیرت افروز حل دیا گیا ہے یہ کتاب انڈکس اور فہرست مشمولات کے ساتھ 412 صفحات پر بڑی تقطیع کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔

وعدہ کیا گیا' اسے پورا تو خود نہیں کیا اور کہا یہ کہ صاحب! دیکھیے میں نے تو اسی لیے انشاء اللہ کی یہ شرط لگا دی تھی اگر اللہ کو منظور ہوا تو یہ ہوگا' اگر نہیں ہوا تو یہ اللہ کو منظور نہیں تھا' اس لیے میں تو بری الذمہ ہوں۔

دراصل یہ ذمہ داری سے فرار ہے

یاد رکھیے کہ ہر وہ بات جس میں آپ اپنی ذمہ داری قبول کرنے سے اعراض برتتے ہیں' گریز برتتے ہیں' فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں' اس میں آپ کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ یونہی مذاق کی بات نہیں ہے کہ انشاء اللہ پہ ٹال دیا: خدا کو منظور نہیں تھا۔ اور اس کے بعد تو آپ کے ہاں یہ بات مسلمات میں سے ہوگئی کہ "وہی ہوتا ہے' جو منظورِ خدا ہوتا ہے"۔ چل بھئی! کوئی ذمہ دار ہی نہ رہی۔ مرضیٔ مولا دعویٰ محولہ۔ چلیے صاحب! بات یہ ہوگئی کہ خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں تھا۔ آپ نے اس کے اندر یہ دیکھا کہ Originally یہ بات کہاں سے چلی تھی۔ یہ ذمہ داری سے فرار کی راہیں ہیں۔ جیسا کہ آپ کو اب معلوم ہے کہ ذمہ داری سے فرار کی راہ اختیار کرنا تو قرآن نے ابلیس کا مقام بتایا ہے اور کہا ہے کہ جو ایسی ذہنیت لیے ہوئے ہو' اس کی کبھی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ جسے کہتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ ہو جاتا ہے۔ وہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اللہ میاں کو بڑا غصہ آ گیا اور اس نے یہ کہہ دیا کہ نکل جاؤ' نکال دو' مارو اس کو جوتے۔ سوال یہ نہیں ہے اصل میں وہ شخص ذمہ داری قبول نہیں کرتا' اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ اگر یہ نہیں ہوا تو "میں ذمہ دار ہوں"۔ یہ کیا ہے تو "میں نے کیا ہے"۔ جو اس کا اعتراف نہیں کرتا' ذمہ داری کسی دوسرے کے اوپر ڈالتا ہے' اس کی اصلاح نہیں ہو پاتی۔

جنت کا حصول تو قدم قدم پر موجود ہے

جو اپنی کوتاہیوں کے احساس کے بعد کہتا ہے: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23)۔ کہ میں ذمہ دار ہوں' میں بھول گیا' میری خطا ہے۔ اس کی تو اصلاح ہو جاتی ہے۔ چلو! کوئی بات نہیں' ہماری طرف سے ہدایت آئے گی' اس کے مطابق چلتے رہو گے تو کچھ نہیں بگڑا۔ پھر اسی جنت میں تم آ سکتے ہو جو چھینی تھی۔ ایک دفعہ کی لغزش سے وہ قصہ کوئی ایسا نہیں تھا کہ وہ جنت وہاں سے چھینی' یہاں آ گئے' یہاں مرنے کے بعد ملے گی۔ یہ تو قدم قدم کے اوپر ہوتا ہے۔ ایک غلط بات آپ کر جاتے ہیں' جنت سے ایک قدم پیچھے ہو جاتے ہیں۔ اب اگر اس ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے کیا ہے تو اس کے بعد آپ میں اصلاح کا امکان ہوتا ہے' پھر آپ کا قدم اسی جنتِ گم گشتہ کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ Paradise lost , Lost forever نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر آپ یہ کہتے رہیں کہ نہیں صاحب! میں تو اس کا ذمہ دار ہی نہیں ہوں' آپ کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ عزیزانِ من! سارا راز اس میں ہے۔ قرآن نے انسان کو بتایا ہے کہ یہ اپنے ہر فیصلہ کا' اپنے ہر کام کا' خود ذمہ دار ہے۔ اگر اس کا اعتراف کرتا ہے اصلاح کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ اگر اعتراف نہیں کرتا ہے تو پھر یہ چیز پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

جرأت کا دوسرا نام ہی اعتراف حقیقت ہے

میں کیا عرض کروں کہ جب بھی کوئی بات آتی ہے' تو وہ بات پھر اسی سائیکالوجی کے اوپر آ جاتی ہے۔ سائیکالوجی کی رُو سے بات یوں ہے کہ اگر ایک غلط قدم اٹھتا ہے' اُس کا اعتراف نہیں کیا جاتا تو پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز Suppressed حالت میں ہوتی ہے۔ یعنی اس کی Consciousness میں' اس کے شعور میں' یہ موجود ہوتا ہے کہ "میں نے غلطی کی ہے' مجھ سے غلطی ہوگئی"۔ اُسے اعتراف کی جرأت نہیں ہوتی۔ یہ وہ ماہرین نفسیات بھی کہتے ہیں' قرآن بھی یہ کہتا ہے کہ اگر یہ بات ہے تو اس میں تمہیں صرف جرآت کی ضرورت ہے' اس سے تمہاری جلد اصلاح ہو جائے گی۔ یہ چیز اب آپ کے ہاں کے Pycho Analysis میں پہنچی ہے۔ دیکھیے کہ قرآن کے حقائق کی شہادتیں ہمیں کہاں سے مل رہی ہیں۔ وہ ماہرین تحلیل نفسی کہتے ہیں کہ اگر کچھ عرصہ اسی طرح گزار دیا جائے تو Supressed (اپنے اندر کی بات کو اندر ہی دبے رہنے دینا) جو ہے تو اس سے پھر Repressed (وہ خود اس دبی ہوئی بات کا مطیع) ہو جاتا ہے۔

انسان کی نفسیاتی کیفیت اور توبہ کا مفہوم

یہ دبایا گیا مواد (Suppressed Material) نفس شعوریہ کی بجائے Unconscious Mind [1] کی گہرائیوں میں چلا جاتا ہے اور اسی کو کہتے ہیں کہ آدمی اُسے بھول جاتا ہے تو اس کی اصلاح کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مواد تو اب آپ کو یاد ہی نہیں رہا۔ یہ وہی مواد ہوتا ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ صاحب! ہمیں یاد نہیں رہا۔ بات یہ ہوتی ہے کہ وہ مواد نفس غیر شعوریہ (Unconscious Mind) میں چلا گیا ہوتا ہے۔ جب یہ چیز وہاں پہنچتی ہے تو یہ وہی ہوتا جو پھر آپ کو یاد نہیں رہتا۔ اس طرح جو بھی آپ سے غلطی ہوئی تھی' خطا ہوئی تھی' وہ اس طرح سے آپ کو یاد نہیں رہتی۔ وہ نفس غیر شعوریہ (Unconscious Mind) میں چلی جاتی ہے۔ وہاں وہ دباؤ کی حالت (Repression) میں ہوتی ہے اس لیے عموماً نفسیات کی زبان میں کہتے کہ وہ Repressed ہوگئی ہے۔ آپ کے الفاظ میں یوں ہے کہ یاد نہیں رہتی وہ مٹ تو نہیں جاتی۔ اس کا نقش زائل تو نہیں ہو جاتا۔ یہ نہیں کہ اس کا اثر ہی باقی نہیں۔ اور وہ آئی گئی بات ہوگئی۔ وہ رہتی ہے جبکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آئی گئی بات ہوگئی۔ لیکن اصل میں یہی تو وہ وہاں جمع شدہ نقوش ہیں جو باہر ابھریں گے تو آپ کا اعمال نامہ بن کے سامنے آئیں گے۔ آج آپ کا یہ علم Insist کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ ان ماہرین نفسیات کے نزدیک انسان کا ہر خیال

---

[1] اس نکتے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) گلبرگ لاہور اکتوبر 2003ء ص 35 تا 39' 51' 166' 302' 306 اور پرویزؒ مطالب الفرقان فی دروس القرآن بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور 2004ء عنوان انسانی نفس کی دو سطحیں' ص 94 اور 95۔

Supressed تک کو بدل سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے جو قرآن نے کہا کہ اگر لغزش ہوجائے تو فوراً توبہ کی طرف آجاؤ کیونکہ اس طرح اس کی توبہ بڑی جلدی قبول ہوتی ہے۔ یہ قبولیت کیا چیز ہے؟ یہ توبہ کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ قرآن نے کیوں کہا ہے کہ فوراً اس طرف آجاؤ؟ وہ یہی چیز ہے کہ جب تک یہ Supressed حالت کے اندر ہے' اس کا ازالہ آسان ہے۔ لیکن جب بات آگے چلی جائے بات۔ epressed ہوجائے' وہ احساس Unconscious Mind کے اندر چلا جائے' تو پھر وہ آپ کے Unconscious Mind کو ستاتا نہیں ہے۔ اسے ہی آپ کہتے ہیں' گم گشتہ ہوئی وہ چیز۔ اس ساری چیز کے بعد تو انسان ذمہ داری لیتا ہی نہیں ہے۔ سارا سوال تو ذمہ داری قبول کرنے کا ہے عزیزانِ من! تو یہ ہے وہ چیز جہاں سے انشاء اللہ' یعنی تقدیر کی بات چلی تھی کہ خدا ہی سب کرتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

میرا پروگرام اسلام کی تاریخ لکھنے کا بھی ہے

یہ سب چیزیں ابتداء میں جن لوگوں نے کی تھیں' میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے جہالت کی بناء پہ نہیں کی تھیں۔ اس لیے کہ میں نے تو اب تاریخ میں یہ دیکھا ہے کہ کن لوگوں نے یہ باتیں کہی تھیں' کن حالات میں کہی تھیں اور یہ کہ کیا کہی تھیں۔ تبھی تو میں کہا کرتا ہوں کہ اگر فرصت ملی تو مجھے اسلام کی پوری تاریخ بھی لکھنی ہے' جس کے کچھ خدوخال میں نے ''شاہکارِ رسالت'' کے [1] آخری باب میں دیئے ہیں جو کہ تفصیل سے لکھنے کی بات ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ تصور کہاں سے آگیا کہ انشاء اللہ کے معنی ''اگر اللہ نے چاہا تو'' ہوجائیں گے۔ یہ تو ذمہ داری سے فرار کی راہ ہے جو اختیار کی گئی ہے اور یہ بھی کہ یہ دانستہ کی گئی ہے۔ بعد میں یہ چیزیں جہالت کی بنا پر مروج ہوگئیں۔ اب اسی جہالت سے بھی اگلا مرحلہ Indifference کا آگیا۔ یونہی اب ہمارے ہاں یہ محاورہ ہی ہوگیا ہے کہ 'ہاں بھئی! ہاں' میں آؤنگا انشاء اللہ''۔ یہ بڑی گہری چیزیں ہیں' عزیزانِ من! انسانی کردار پہ ان کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہم نے شاء کے معنی یا ترجمہ کردیا کہ ''اگر اللہ نے چاہا تو'' بس اس چاہا والی بات نے ہر چیز کو الٹ کر رکھ دیا۔ جب کہ اصل بات کچھ اور ہے۔

انشاء اللہ کا مفہوم

شاء کے معنی ہیں: قانونِ خداوندی کے مطابق۔ یہاں کہا کہ الا ان یشاء اللہ (18:24)۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم یقینی طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ میں یہ ضرور کرونگا' الا یعنی بجز اس کے کہ یہ کہو کہ اس کے کرنے کے لیے جو قانونِ خداوندی نے شرائط' عناصر اور Conditions مقرر کی ہیں' اگر وہ Fulfill ہوگئیں تو یہ یقیناً ہو کے رہے گا۔ یہ تو یقینی چیز ہے جو یہ انشاء اللہ کہا جا رہا ہے۔ میں اس کی

[1] پرویز' شاہکارِ رسالت ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ لاہور جس کا چہارم (بلاترمیم ایڈیشن 1987ء میں طباعت سے آراستہ ہوکر دنیائے علم میں آیا۔ نشاناتِ راہ سمیت یہ کتاب بڑی تقطیع کے 114 ابواب پر مشتمل ہے اور 528 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ورنہ ان کے معنی آپ کو بتاتا کہ یہ معانی ومطالب اس کے مطابق ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' خدانہ کرے' خدانہ کرے۔ قرآن کو سامنے رکھ کے اپنی طرف سے کچھ اور کہنا تو اتنا بڑا شرک ہے جو کبھی بھی معاف نہیں ہوسکتا۔ یہ ساری چیزیں قرآن میں ہیں۔ یہ ساری چیزیں عربی زبان میں ہیں۔ ایک تو حتمی طور پہ وہ یہ کچھ کہتا ہے۔ انشاءاللہ کے معنی ''چونکہ یہ چیز'' کے ہیں۔ آج وہ کہتا ہے کہ اگر کہنا ہے تو یہ یقینی چیز ہے۔ اِن کے ''معنی چونکہ'' کے آئیں گے: ''چونکہ'' یہ چیز ان قوانین کے مطابق ہے جو میں کہہ رہا ہوں' چونکہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے' اس لیے ہوکر رہے گا۔ یہ ہے انشاءاللہ۔ اور اگر مستقبل کے متعلق آپ نے یہ چیز کہنی ہے جن کے بارے میں آپ ابھی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ساری شرائط پوری ہوجائیں گی تو یہ کہیے کہ ''اگر یہ تمام شرائط جو قانونِ خداوندی نے اس کی کامیابی کے لیے مقرر کی ہوئی ہیں تمام کی تمام ہوگئیں تو یقیناً یہ ہوجائے گا''۔ آپ نے دیکھا بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اب آپ کا کام یہ ہے کہ وہ جو قانون مشیت خداوندی نے اس کے لیے شرائط اور عناصر اور Conditions اور حالات و کوائف مقرر کیے ہیں انہیں پورا کریں۔ اسے قانونِ مشیت کہیے' یہ خدا کا بنایا ہوا قانون کہیے۔ یہ جو ہمارے ہاں کا چاہنا ہے' یہ بات خدا کے ہاں نہیں ہے۔ یہ ''چاہنا کی بات'' تو آپ کے دورِ ملوکیت میں عیسائیت کے شروع کی ہے۔ اب اس دورِ ملوکیت میں ملک یعنی بادشاہ نے یہ چاہا یہ ہوگیا' گھڑی میں دوسرا چاہا وہ ہوگیا۔ چاہا نہیں تو نہیں ہوا۔ اس کا صحیح مفہوم قانونِ مشیت ہے۔ کہو: یہ چیز حتمی طور پہ تم آج نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اس کے کرنے کے لیے بہت سے شرائط اور عناصر ہونگے' جو خارج میں بھی ہونگے' ان کے متعلق تم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے' اس لیے یہ بات کہو کہ اگر یہ سارے حالات قانونِ خداوندی کے مطابق ہوئے تو یقیناً یہ ہوکے رہے گا کیونکہ میں تو قانونِ خداوندی کے مطابق کرونگا۔ مثلاً اگر کل صبح یہ ہوگیا کہ لکڑیاں بھی ہوئیں' ماچس بھی ہوئی' چولھا بھی ہوا تو ہو نہیں سکتا کہ پھر ماچس نہ جلاؤں اور لکڑی نہ جلاؤں اور وہ آگ نہ جلے اور پانی گرم نہ ہو۔ لہٰذا پانی گرم ہوکے رہے گا۔ بشرطیکہ یہ شرائط' عناصر' احوال' کوائف' Conditions پوری ہوجائیں۔ یہ ہے انشاءاللہ۔ بشرطیکہ وہاں میں نے آگ جلانے کا سامان مہیا کردیا۔ اور اگر کل یہ پانی گرم نہیں ہوسکا تو اس کے لیے یہ ہے کہ تم نے یہ سامان مہیا نہیں کیا تھا۔ کہو کہ میں نے یہ سامان مہیا نہیں کیا تھا تو یہ ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ مشیت میں نہیں تھا۔ ''مشیت جو چاہتی تھی کہ یہ یہ چیزیں پوری کرو تو آگ جلے گی' مجھ سے یہ نہیں ہوسکیں۔ اس لیے آگ نہیں جلی' اس لیے پانی گرم نہیں ہوا' اس لیے میں آپ کو چائے نہیں پلا سکا''۔ اس طرح ساری ذمہ داری آپ نے لی۔ اور اگر اس کے برعکس یہ چیز تھی کہ میں تو ہر طرح سے تیار تھا صاحب! کہا: اللہ ہی کو منظور نہیں تھا تو پھر کیا کیا جائے! چل بس بات ختم ہوئی۔ دراصل بات اس میں یہی ہوئی کہ آپ درمیان میں سے نکل رہے ہیں' ان احوال وکوائف کو' ان شرائط وعناصر کو پورا نہیں کررہے۔ یہ ہے ملخص قرآن کی تعلیم کا عزیزانِ من!

ہمارے ہاں لفظ انشاءاللہ کا استعمال اور اصل حقیقت

ان آیتوں کا عام ترجمہ سنیے: کہ یہ نہ کہیے' بالکل کہ میں ایسا کل کرونگا' ماسوا اس کے یہ کہے کہ اگر اللہ کو منظور ہوگا تو یہ ہوگا اور آگے کہا

جاتا ہے۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّىْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا (18:24)۔اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اگر یہ کہنا بھول جائے یعنی انشاء اللہ کہنا بھول جائے تو پھر جس وقت بھی یاد آئے انشاء اللہ کہہ دے۔اور پھر خدا تمہیں صحیح راستہ دکھادے گا اور جب یاد آ جائے اس وقت پھر یہ انشاء اللہ کہہ لے۔کہا: پھر تمہیں وہ صحیح راستہ ملے گا۔عزیزانِ من! کیا مذاق ہو رہا ہے قرآن کے ساتھ!اور اس کے اوپر پھر جب آپ تفسیری افسانے سنیں گے' اُف میرے اللہ! کیا عرض کروں' بہنیں اور بیٹیاں مجلس میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہر شے برہنہ گفتم۔میرے لیے بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔ان کی تفسیر میں یہ بات ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی سو بیویاں تھیں اور انہوں نے ایک دن کہہ دیا کہ میں ایک رات ان سب کا دورہ کرونگا۔اور آپ دیکھیں گے کہ سو مجاہد پیدا ہونگے۔اور اس کے بعد ہوا یہ کہ صاحب! وہ سو تو ایک طرف رہا' ایک بچہ پیدا ہوا تو وہ بھی اپاہج تھا۔تو رسول اللہ نے کہا: تم نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا اس لیے یہ سب بات ناکام رہ گئی۔دیکھیں کہ اپنے ذہن کے مکر یا جھوٹ کو ثابت کرنے کے لیے کیا کچھ کہہ دیا جاتا ہے:

ترے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

نہ خدا ان کے نشتروں سے بچتا ہے نہ رسول ان کے نشتروں سے بچتے ہیں۔کہ جی انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا معاذ اللہ۔یہاں بات صاف ہے: بجز اس کے کہ وہ تمام شرائط پوری ہوں' وہ تمام سامان پورا ہو جائے کہ جو اس مقصد کے لیے مشیتِ قانونِ خداوندی نے مقرر کیا ہوا ہے کہ یہ ہو جائے تو ہو گا اور اگر فرض کر وان میں سے کوئی ایسی بات ہے جو تم بھول گئے ہو وہ نہیں ہوئی تو اس کے معنی ہیں کہ اس کے بعد جب بھی وہ یاد آئے کہ یہ رہ گئی تھی اس وقت اسے پورا کرلو۔اس کے بعد پورا ہو جائے گا اس طرح اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان جس کام کا ارادہ کرتا ہے اگر اس کے لیے وہ تمام اسباب و ذرائع جمع ہو جائیں جو اس کی کامیابی کے لیے ازروئے قوانین خداوندی ضروری ہیں تو پھر وہ ارادہ پورا ہو سکتا ہے۔اس لیے ارادہ کرنے کے بعد انسان کی توجہ ان اسباب و ذرائع کے مہیا کرنے پر مرکوز ہونی چاہیے۔اگر اس سلسلہ کی کوئی کڑی بھول جائے اور اس طرح اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ سوچنا یہ چاہیے کہ وہ کونسی وجہ ہے جس سے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی یا تاخیر ہو رہی ہے۔اگر یوں متعلقہ قوانین کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جائے تو منزل مقصود تک پہنچنے کا قریب تر راستہ سامنے آ سکتا ہے۔یہ ہے: عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّىْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا (18:24)۔یہ اس وقت بھی اگر تمہیں یاد آ جائے اور ابھی اس کا وقت ہو تو کرلو تو اس وقت بھی خدا تمہیں کامیابی کا راستہ پھر سے دکھادے گا۔اَقْرَبَ (18:24)۔عجیب چیز ہے: کہ وہ ٹھیک وقت کے اوپر ہونا تھا۔یہ ٹھیک ہے وہ جو بعد میں بھولنے کے بعد دوبارہ تم نے کیا ہے تو کچھ تو ان دونوں میں فرق پڑ جائے گا۔وہ بروقت ہوا ہے یہ ذرا دیر سے ہوا ہے لیکن بہر حال تمہیں کامیابی سے قریب تر کردے گا۔کیا بات ہے اقرب کی! لیکن ہوگا اسی طرح سے کہ اگر تم نے وہ شرائط پوری کردیں' جو قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کی کامیابی کے لیے ضروری تھیں' ان میں سے اگر کوئی چیز بھول جائے تو خیر اس وقت تو وہ نہیں ہو سکا اگر ابھی اس کی گنجائش باقی ہے' جب یاد

آ ئے اس کو پھر پورا کر لو تو پھر یہ بہر حال تمہیں اس کامیابی سے قریب تر کر دے گا۔ یہ جو ایسا کرنا ہے' یہ کل کی بات بتائی۔

اس کے بعد پھر وہی بات اس داستان کی چلی آئی کہ پھر وہ یہ باتیں کرتے ہیں: **وَلَبِثُوْا فِیْ کَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا** (18:25)۔ وہ مجاوروں کی باتیں آئیں کہ یہ لوگ بلا علم و دلیل قیاس آرائیاں کرتے۔ پہلے تو یہ تھا کہ تعداد کتنی تھی؟ کوئی کہتا تھا' تین تھی' کوئی کہتا تھا چار تھے' ادھر سے اٹھا اور کہنے لگا: ''(اوئے نئیں اوئے سات تھے آٹھواں کتا تھا' تہانوں لکھ پتہ نئیں ہیگا۔ ایویں تسی یا ویاں ٹکادے رہندے ایتھے بیہ کے سامنے۔ اومجاور اس طرح دیاں گلاں کر دے ہیں'')۔ ❶ یا یہ کہ وہ غار میں کتنا عرصہ رہے؟ کوئی کہتا ہے کہ وہ تین سو سال تک رہے' کوئی زیادہ محقق بنتا ہے تو کہتا کہ تین سو نہیں بلکہ تین سو نو سال تک رہے۔

ان کی تعداد کے قصے اور تین سو سال تک انہیں سلائے رکھنے کی کہانی

یہ قصہ چھیڑا ہے کہ جی! وہ اس غار میں تین سو سال تک رہے تھے' اب وہ کرامت تو بنانی ہے عجوبہ تو پیدا کرنا ہے' جو زیبِ داستان کا کام دے۔ کہا: وہ تین سو سال تک غار میں سوئے ہوئے رہے' نہ کچھ کھایا' نہ پیا' سوئے ہوئے تین سو سال تک! ادھر سے اس نے کہا کہ نہیں تم ٹھیک نہیں کہہ رہے' نو سال کا اس میں اور اضافہ کرو: **وَازْدَادُوْا تِسْعًا** (18:25)۔ تین سو نو سال تھے۔ پھر یہ اس طرح کی باتیں وہاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ سے کہا کہ ممکن ہے یہی سوالات تم سے بھی کرنے لگ جائیں کہ کتنے تھے اور کتنے سال رہے' انہیں کہو کہ یہ باتیں کیا ہیں؟ **قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (18:26)۔ یہ کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اہمیت حاصل ہے کہ میں اس کی تحقیق کرتا پھروں۔ یہ خدا کے علم میں ہے' وہ جانتا ہے کہ کتنا عرصہ رہے۔ **غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (18:26)۔ کائنات ارض و سما میں غیب کا علم اسی کو ہے جو کچھ بھی ہے وہی: **اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ** (18:26)۔ بہترین دیکھنے والا' بہترین سننے والا ہے۔

قرآن کے نزدیک اس داستان کو بیان کرنے کا اصل مقصد

اصل چیز جس کے لیے یہ داستان بیان کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ **مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِهٖۤ اَحَدًا** (18:26)۔ خدا کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھا وہ دعویٰ جس کو لے کے یہ نوجوان اٹھے تھے اور اس کا انجام یہ چیز تھی کہ وہ جو اس کے خلاف چلنے والے' اپنے اقتدار اور حکومتوں کے داعی تھے' انہیں شکست ہوئی اور کوئی بھی ان کا حامی و ناصر نہ ہوا۔ اور یہ جو کہنے والے تھے کہ ہم اس کی حکومت میں' اس کے اقتدار میں' کسی کو شریک نہیں کرتے' یہ تھے وہ جو کامیاب ہو کے رہے۔ انہیں کہا کہ یہ قصے کیا ہیں کہ کتنی تعداد تھی اور چوتھا کتا تھا اور کتنے سال رہے اور کہاں سے کھایا اور کہاں سے پیا' سوال یہ نہیں ہے۔ بات یہ کہو کہ وہ

---

❶ ارے! وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ تمہیں تو خاک علم نہیں ہے۔ ایسے ہی یہاں بیٹھے ٹامک ٹوئیاں مار رہے رہو۔ وہ مجاور اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔

مقصد کیا تھا جس کو یہ لے کے اٹھے تھے پھر اس کا انجام کیا ہوا' ان کو یہ بات بتاؤ۔ اور یہی چیز ہے جس کے لیے اس قسم کے قصے ہم بیان کرتے ہیں: وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ (18:27)۔ اس مقصد کے لیے تم یہ قرآن انکے سامنے پیش کرو وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ ایک ہی ملخص ہے قرآن کی تعلیم کا عزیزانِ من! شرک کے معنی یہاں واضح ہوجاتے ہیں۔ ایسے صاف معنی ہوتے ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تاویل یا تشریح وتفسیر کی گنجائش ہی نہیں۔ وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ یہ اپنے حقِ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اقتدارِ اعلیٰ صرف اس کو حاصل ہے۔ وہ اپنی Sovereignty میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اس میں اگر کوئی شریک ہو تو یہ شرک ہو جائے گا۔

عبادت کا مفہوم ہی حقِ حکومت ہے

یہاں تو یہ کہا اور اس کے بعد اسی سورۃ میں آگے جاکے آخری سورہ' جو 110 نمبر آیت ہے' اس میں بڑی عجیب چیز بیان کی ہے۔ یہاں فرمایا تھا: وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ یہاں حکم کا لفظ آیا ہے یعنی خدا تعالیٰ اپنی حکومت اور اقتدار میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ وہاں آیت 110 میں یہ کہا ہے: وَلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا (18:110)۔ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اب یہاں لفظ ''عبادت'' ہے' وہاں لفظ ''حکم'' ہے۔ تو قرآن تو خود اپنے معنی آپ کرتا ہے۔ یہاں اس نے خود بتادیا کہ عبادت کے معنی حقِ حکومت ہے۔ عبودیت اختیار کرنے کے معنی محکومیت اختیار کرنے کے ہیں۔ اس کے معنی' Worship نہیں' پرستش نہیں' پوجا نہیں' بندگی نہیں۔ ایک ہی سورۃ میں دو آیتوں میں بات واضح کردی۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ گویا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اور آخر میں آ کے ان لوگوں کو یہ حکم دیا کہ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا (18:110)۔ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ لفظِ عبادت جو میں کہہ رہا ہوں تو عبدیت کے تو معنی ہی محکومیت ہیں۔ پھر قرآن کی یہ دو آیتیں واضح کررہی ہیں۔ ایک جگہ تو عبادت کا لفظ ہے اور ایک جگہ حکم کا لفظ ہے۔ عبادت کے معنی ہی حکم ہیں۔ کہا: یہ تھی وہ بات جس کے لیے یہ اٹھے تھے اور یہ ہے وہ چیز کہ وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ (18:27)۔ تم ان کے سامنے یہ کتاب پیش کرو۔ یہی ہے وہ تعلیم جو ملتی چلی آرہی ہے: لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (18:27)۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور جو ایسا نہیں کرتے وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (18:27)۔ جو اس میں شرک برتے گا' برت کے دیکھ لے' اس کو کہیں دنیا کے اندر پناہ نہیں مل سکتی۔ آپ انسانوں کو عزیزانِ من! حقِ حکومت دے دیجیے اور پھر کیجیے ذرا ان کی مرضی کے خلاف پھر دیکھیے کہیں پناہ ملتی ہے آپ کو۔ پناہ نہیں مل سکتی۔ یہ ہے سارا ملخص قرآن کی تعلیم کا۔

اب یہ گفتگو نبی اکرم ﷺ سے ہورہی ہے اور آپ ﷺ کی وساطت سے ہمیں یہ سب کچھ کہا جارہا ہے۔ کہا یہ کہ ہم نے یہ بات تو

کھدی ہے وَلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا (18:26)۔ کہا ہے کہ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرنا۔ کہنے کو تو چار لفظ ہیں لیکن کہا کہ یہ مرحلہ بڑا جانگداز ہے' بڑا صبر آزما ہے۔ یہ جو انسانوں نے مختلف قسم کے اقتدارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں' کون چھوڑے گا آسانی سے! بت پرستی کا چھڑا دینا تو کچھ مشکل نہیں۔ تھوڑا سا علم سامنے لے آیئے' وہ خود بخود چھوٹ جاتی ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر تو کوئی پیغمبر نہیں آیا جس نے آ کے ہندوستان میں ہندوؤں جیسے بت پرستوں میں یہ انقلاب پیدا کیا ہو۔ وہاں بت پرستی کا خاتمہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں بت پرستی کے خاتمے کا رواج

ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاں کا سب سے بڑا دانشور Intellectual Leader گاندھی تھا جو دنیا میں اتنا اونچا مقام رکھتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت تھی جو میں نے خود دیکھا ہے کہ صبح اٹھ کے وہ ہندو کس طرح ''نوندے ہیگے نیں۔ اوا پنے اک بکس وچوں کڈ دا ہوندا سی یہ بھی۔'' [1] اور اس کے بعد مورتی کے آگے ہاتھ جوڑتا تھا۔ یہ اس کا قول ہے: ''میں ساتن دھرمی ہندو ہوں۔ میرے روئیں روئیں میں ایک ایک بت کی پرستش لکھی ہوئی ہے''۔ آج وہ پورا انڈیا بجز ان قبائل کے جو نیچے کے کشٹ ہیں یا بجز ان برہمنوں کے جن کا یہ Profession ہے' وہاں کوئی بت پرست رہا ہی نہیں۔ یہ تو خود علم کی بارگاہ ان چیزوں کو دور کر دیتی ہے۔ اسی لیے آپ کو معلوم ہے کہ جب حضرتِ موسیٰؑ چند دنوں کے لیے جماعت سے باہر تشریف لے گئے' بھائی سے کہہ گئے' بھائی بھی پیغمبر تھا کہ میری عدم موجودگی میں اس کی نگہداشت کرنا' ہم یہ نئے نئے لوگ اِدھر لائے ہیں' پتہ نہیں کہ کس وقت یہ کیا کر بیٹھیں' اس لیے ان کی کڑی نگرانی رکھنا۔

قوم کے زیور سے تیار کردہ بت

مختصر قصہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ حکمِ خداوندی لینے کو وہ طور پہ گئے' ادھر سامری نے ان کے ہاں' انہی کے زیوروں سے انہی کے لیے ایک بت بنایا۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ آپ ہی کے پیسوں سے یہ سارے مقبرے بنتے ہیں اور دروازے بنتے ہیں۔ یہ جو وہاں کا مجاور ہوتا ہے' وہ تو چار پیسے بھی اس گلے میں خود نہیں ڈالتا۔ ''تہاڈیاں جوتیاں' تہاڈے سر ہوندیاں نے او تھے'' [2] تو سامری نے یہی کیا۔ قرآن دو لفظوں میں عجیب چیز کہہ جاتا ہے کہ وہ اپنے پلے سے کچھ نہیں کرتے۔ سامری نے اسی قوم کا زیور لیا اور اسے یہ کہا کہ ''کڑیئے [3] اے جے لبیا پیا ہیگا جے اے کم تہاڈے کٹ نئیں آئے ہیگے نیں۔ خوامخواہ نال جسے کہتے ہیں یہ وبالِ دوش بنے او سارا انہاں کولوں لے لیا اے''۔ اب اسی کے بت بنا لیے کیا بات ہے قرآن کی! اور خود دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہی زیوروں سے یہ سارا کچھ ہمارے ہی سامنے بنایا ہے۔

---

1. صبح نہاتے ہیں۔ (وہ گاندھی) اپنے بکس میں سے ایک مورتی نکالتا تھا۔
2. وہاں تو تمہارے جوتے' تمہارے سر
3. اے لڑکی! یہ جو زیور تمہیں ملا ہے یہ تمہارے کس کام کا ہے یہ تو خواہ مخواہ تمہاری جان کی مصیبت ہے اس نے یہ سارا زیور ان سے لے لیا۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کی جھنجھلاہٹ اور حضرت ہارون علیہ السلام کا جواب

بہر حال حضرتِ موسیٰ علیہ السلام واپس آئے۔ انہوں نے آ کے دیکھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بیٹھے ہوئے ہیں' بڑے جھنجھلائے ہوئے ہیں' بھائی سے کہا: میں تمہیں تاکید کر کے گیا تھا' یہ دیکھا نہیں تم نے کیا کیا ہے؟ کہنے لگے: میں بھی دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا کر رہے تھے۔ میں نے بھی کوشش کی۔ میں نے یہ دیکھا کہ کچھ بھی کہنے سے انکے اندر دو پارٹیاں بن رہی ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو میری بات مان لیں گے' کچھ وہ ہیں جو سامری کی بات مانیں گے اور پھر ان میں تفرقہ پڑ جائے گا' میں نے ان کی بت پرستی جو عارضی طور پر تھی' اسے تھوڑے وقت کے لیے گوارا کر لیا' اس لیے کہ جب بھی ان کو ذرا سی بھی بات سمجھائی جائے گی' تو یہ بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی لیکن اگر قوم کے اندر تفرقہ پڑ گیا تو وہ چیز نہ میرے بس میں ہو گی' نہ تمہارے بس میں ہو گی۔ میں نے اس لیے اسے گوارا کیا' قوم میں تفرقہ نہیں پڑنے دیا۔ کہا: ایک رسول نے۔ اور اسے مانا بھی ایک رسول نے۔ دونوں مطمئن ہو گئے

فرقہ بندی مفاد پرستی پر مبنی ہوتی ہے۔ امت پر مشکل ترین مرحلہ

عزیزانِ من! شرک جہالت کے اوپر مبنی ہوتا ہے۔ جہالت دور کرنے سے وہ آسانی سے دور ہو جاتا ہے۔ مگر یہ جو پارٹی بازی اور فرقہ بندی ہے' یہ مبنی بر جہالت نہیں رہتا۔ یہ مفاد پرستی کے اوپر آ جاتا ہے' یہ نہیں نکل سکتا۔ یہ قوموں کو تباہ کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے کہا۔ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ** (30:31-32)۔ مومن ہونے کے بعد مشرک نہ بن جانا کہ اپنے اندر تم فرقے پیدا کر لو' اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ اب قرآن کی ان آیتوں کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ عزیزانِ من! پچیس تیس سال سے میں یہ دہراتا چلا جا رہا ہوں۔ کہہ رہا ہوں کہ ان سے پوچھو کیا معنی ہیں فرقہ بندی کے؟ قرآن نے یہ کہا ہے کہ فرقہ بندی کا کوئی جواز نہیں ہے لیکن اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر ایک ابلیسی ذہنیت اٹھی۔ اس نے کہا کہ بچے کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیجیے وہ رہا تو ہندو کا ہندو۔ کہا: یہ فرقے نہیں ہیں بلکہ یہ تو مکتبِ فکر ہیں۔ پرستش کے اوپر مطمئن ہو گئے۔ بت کا نام خدا رکھ دیا' حافظ ہو گئے۔ کیا ان فرقوں کو مکتبِ فکر کہنے سے حقیقت بدل گئی کہ یہ فرقہ نہیں ہیں۔ یہ ہے وہ جسے قرآن شرک کہتا ہے۔ یہ ہے امت پر وہ مشکل ترین مرحلہ' جو اس امت کو توحید کے اوپر نہ لانے کا آیا ہے۔ بت پرستی چھڑا دینے والی بات ایسی نہیں ہے اس کے مقابلے میں یہ چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اب بڑے صبر آزما مراحل آئیں گے۔ **وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا** (18:28)۔ اے رسول! تو بھی اپنے رفقاء کے ساتھ جو صبح شام ہر وقت نظام خداوندی کی دعوت کو عام کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اپنی تمام توجہات کو اسی مرکز پر مرکوز رکھتے ہیں اس پروگرام پر استقامت کے ساتھ

جمارہ۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ تو دنیاوی مفاد عاجلہ کی کشش و جاذبیت کے پیچھے لگ کر ان لوگوں سے اپنی نگاہیں پھیر لے۔ عزیزانِ من! عظیم آیت ہے۔ اب جو تُو اس اعلان کے لیے اٹھے گا کہ کسی کو اللہ کے سوا حق حکومت حاصل نہیں ہے تو بڑی سخت مخالفت ہوگی۔ اس کے لیے تمہیں بڑے لالچ دیئے جائیں گے۔

حق پر ہی مفاہمت نہیں ہوسکتی

آپ کو یاد ہے میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انہوں نے کہا تھا کہ قرآن میں ہمارے ساتھ کچھ Compromise کر لو۔ یا تو اس قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لے آ ؤ یا کم از کم اسی میں ہی کچھ تبدیلی کر دو اور جواب یہ آیا تھا کہ اگر یہ میرا وضع کردہ Constitution یا یہ Laws ہوتے تو میں کر بھی دیتا' میری پارٹی کے وضع کردہ ہوتے تو میرے لیے مشکل ہی کیا تھا' فوراً Emergent Meeting بلاتا اور فوراً وہاں ووٹنگ لیتا میری اکثریت تو ہر وقت موجود ہی ہے' لیجیے پانچ منٹ میں میں دوسرا قانون بنا دیتا۔ جواب یہ دیا گیا کہ میری دشواری یہ ہے کہ یہ میرا وضع کردہ ہی نہیں ہے۔ میں تو صرف پہنچانے والا ہوں۔ مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں کچھ تبدیلی پیدا کروں۔ کیا بات ہے! Compromise نہیں' مصالحت نہیں۔ یہاں لالچ بھی کہا: تمہیں بڑے لالچ دیں گے یاد رکھو! آنکھ اٹھا کے بھی ان چیزوں کی طرف مت دیکھنا' کبھی ان کی بات نہ ماننا' کیا لفظ ہے یہاں! **وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ** (18:28)۔ تم کسی ایسے شخص کی بات پہ کان نہ دھرنا۔ ہمارے لیے کتنی بڑی ہدایت ہے کہ اس کی اطاعت نہ کرنا' بات نہ ماننا: **مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا** جس کے دل نے ہمارے قوانین کو فراموش کر دیا ہو' جس کے دل پر ہمارے قوانین کی طرف سے پردے پڑ چکے ہوں' کبھی اس کی بات نہ ماننا۔ **وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا** (18:28)۔ اور یہ اس کی بھی نہیں جو اپنے ہی جذبات کے پیچھے لگ رہا ہو۔ ایسے شخص کا معاملہ حد سے گزر چکا ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو خدا تعالیٰ کی تاکید

عزیزانِ من! پہلا معیار یہ آ گیا کہ جو بھی خدا کی بات کہہ کر منوا رہا ہے دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے اپنے دل کے اندر اس کے قوانین کی یاد موجود ہے یا نہیں؟ کیا ایسا تو نہیں کہ وہ اس کے قوانین کو ہر وقت سامنے رکھتا ہی نہیں؟ ذکر کے معنی یہی ہوتا ہے: یاد ہی نہیں بلکہ کسی چیز کو نصب العین کے طور پر ہر وقت سامنے رکھنا۔ اگر وہ ہمارے قوانین کو بطور نصب العین سامنے نہیں رکھتا تو پھر کبھی اُس کی بات نہ ماننا' لالچ میں نہ آ جانا' آنکھ اٹھا کر ان چیزوں کی طرف نہ دیکھنا۔ ایسا کہنے والے' اپنے خیالات اور خواہشات اور جذبات کا اتباع کر رہے ہوتے ہیں اور حد سے زیادہ آگے بڑھے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی مصالحت' مفاہمت نہ کرنا۔ ان سے تو ٹکراؤ کی بات ہوگی۔

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ (18:28)۔ یہ وہ مقام ہے' عزیزانِ من! جو اس سے پیشتر بھی آ گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو تاکید کی جاتی ہے کہ یہ جو ساتھی ہیں جن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں' قرآن نے انہیں بڑی اہمیت دی ہے۔ کہا کہ اس نظام کا قیام تمہارا رسول ﷺ کے لیے بھی ممکن نہیں تھا' یہ اجتماعی نظام ہے۔ رفقاء کے ساتھ ہی اس تمام نظام کا قیام ممکن ہوگا۔ کہا کہ اپنے آپ کو

استقامت سے رکھوا کیلئے نہیں۔ مع الذین ہیں، ساتھ صحابہ کرامؓ ہیں۔ اب ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو صبح شام، اٹھتے بیٹھتے، خدا کے قوانین کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اس میں اپنا ذاتی کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ (18:28)۔ مقصد صرف خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کرنا ہے۔ ان کا رخ یعنی وجھہ (18:28) کے معنی اگر طریق راہ لیا جائے، یہ بھی اس کے معنی ہوتے ہیں، تو ان کے سامنے یہ ایک ہی راستہ ہے جو انہیں ان کے خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے متعلق یہ خصوصیات قرآن بتا رہا ہے۔ عزیزانِ من! اس میں کوئی استثنا نہیں کر رہا۔ آپ سوچیے کہ قدوسیوں کی اس جماعت کے متعلق یہ چیز کہنا کہ دو چار کی استثنا کر کے، باقی سب کے سب جہنم رسید کرا دینا، قرآن سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ وہ ان کے اتنے مرتبے بتا رہا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ جب میں اس مقام پہ آیا تھا تو میں نے قرآن کی متعدد آیات آپ کے سامنے پیش کی تھیں جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام بتایا گیا ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے یہ چیز بتائی: اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا (58:27)۔ پکے اور سچے مومن ہیں. خدا نے کہا: وَیُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا (98:8؛58:22)۔ ان کا کردار اور ان کی سیرت اتنی بلند اور پاکیزہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے جنت لکھ دی ہے: رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ (98:8؛58:22) اور اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ قرآن نے مہاجرین، مجاہدین کو شامل کیا، حتیٰ کہ وہ یہ بھی لے آیا ہے کہ جو اَلسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ (9:100) ہیں، ان کے مدارج زیادہ ہیں لیکن فتح مکہ کے بعد بھی جو تمہارے ساتھ آ کے مل گئے ہیں یہ وعدے ان کے لیے بھی ہیں اور ان کے لیے بھی جو ہمارے ساتھ نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں تخصیص نہیں اور یہاں یہ کہا ہے کہ دیکھنا، ان کو کہیں جھڑک نہ دینا، دھتکار نہ دینا، الگ نہ کر دینا، یہ ساری چیزیں ان کے متعلق ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں، عزیزانِ من! اگر ان کا مقام دیکھنا ہو تو سورۃ انفال (8:62) دیکھیں۔ کہا: یہ مخالفت ہوگی، یہ اس طرح سے امڈ کر آئیں گے، اس طرح سے تمہارے خلاف شدت ہوگی، یہ سارا کچھ کرنے کے بعد کہا: بالکل نہ گھبرانا۔ هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:62)۔ خدا نے تمہیں تقویت پہنچائی ہے تمہاری تائید کی ہے: خود اپنی نصرت سے اور اس جماعتِ صحابہؓ کی نصرت سے یعنی اکیلی اپنی نصرت سے نہیں کی۔ ان کے ساتھ اپنے آپ کو ملایا ہے۔

جماعت کی اہمیت اور افادیت

اگلی آیت میں تو اس سے بھی زیادہ صاف بات ہوگئی، عزیزانِ من! یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:64)۔ اے نبی! تیرے لیے خدا کافی ہے، یہ بات کافی تھی۔ مگر یہاں اتنا ہی نہیں کہا۔ کہا یہ ہے کہ خدا اور یہ لوگ، جو تیرا اتباع کرتے ہیں، جو مؤمنین کی جماعت ہے۔ خدا اور یہ مومنین کی جماعت تیرے لیے کافی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ان کا اور ان کے ساتھیوں کا مقام کیا ہے، اس لیے کہ یہ جو جنتِ ارضی قائم ہو رہی تھی۔ وہ انفرادی چیز تھی ہی نہیں۔ انفرادی ہوتی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اطاعتِ خداوندی میں جو مقام ہے، وہ کسی اور کا مقام ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر یہ چیز اکیلے کسی کے کرنے کی ہوتی، اگر خانقاہوں میں، خلوت میں، زاویوں میں اور

مصلوں کے اوپر ہی بیٹھ کر کرنا ہوتا تو اس کے لیے رسول ﷺ کافی تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ تیرے لیے خدا اور یہ جماعتِ صحابہ دونوں مل کر کافی ہیں۔ کیونکہ اس کے لیے کہا گیا کہ **فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ** (89:29-30)۔ میرے بندوں کی جماعت کے اندر شامل ہو پھر جنت کے اندر قدم رکھ سکتا ہے۔

منزل کے حصول کے لیے مصائب و آلام کا سامنا

رفقاء کی جو جماعت ہے اس کا اتنا بلند مرتبہ ہے۔ یہ نظام ہے عزیزانِ من! کسی ایک فرد کی بات نہیں ہے۔ بہرحال یہ کہا کہ دیکھنا' بڑے سخت مراحل آئیں گے' جس میں تمہیں تکلیف بھی ہوگی' خوف بھی دلایا جائے گا' ترحیب (تعظیم) بھی ہوگی' ترہیب (ڈرانا) بھی ہوگی' لالچ بھی دلایا جائے گا' مگر زینت الحیوۃ دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ یاد رکھو! ان میں سے کسی کی بات نہ ماننا' یہ تمہیں خدا کی طرف نہیں بلائیں گے۔ بلکہ یہ اپنی خواہشات کی طرف آئیں گے۔

اس کے بعد آگے جو بات ہے' وہ یہ ہے کہ تمہارے ذہن میں آتا تھا کہ میں ان تمام کو مسلمان کرلونگا اور یہ سب کے سب ایمان لے آئیں گے۔ کہا: یہ بات نہیں ہے' یہ جو تمہارے پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں' ان کی مخالفت کی مدافعت کے لیے ہم یہ کچھ کر رہے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ تم اس طرح سے' خود اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کو ساتھ ملا کر تلوار ہاتھ میں لو اور اس کے بعد یہاں سے وہاں تک مسلمان کرتے چلے جاؤ۔ یہ تو اسلام کے خلاف اتنی بڑی سازش ہوئی۔ سازش یہ ہوئی کہ یہ تاثر قائم کر دیا گیا کہ اسلام پھیلا ہی شمشیر کے زور پہ تھا۔ یہ بات ہے جو آپ کے ہاں چلی ہوئی ہے۔ یہ ان کے ہاں کی پھیلائی ہوئی چیز تھی۔ عزیزانِ من! ان کی تو مدافعت کر لیتے' ان کے جواب تو ہم دے جاتے لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کے ہاں آج کے بلند ترین مفکرین یہ کچھ فرما رہے ہیں۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1903-1978) اپنی تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' ایڈیشن اول طبع 1930ء میں یہ کہہ رہے ہیں' معاذ اللہ۔ معاذ اللہ! کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہاں اتنے سال تک وعظ کرتے رہے' نتیجہ کیا نکلا۔ ''پنجابی اچ جنوں کیندے نیں''[1] وہ چند ہی آدمی ساتھ ہوئے اور اس کے بعد جب انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی تو یہاں سے وہاں تک اسلام پھیل گیا۔ اللہ اکبر! دیکھیے جواب یورپ کے متعصب عیسائیوں کو۔ یہ توفیق' عزیزانِ من! ان میں سے بھی جو کوئی سعادت نصیب تھے انہی کو ہو سکتی تھی۔ آرنلڈ کی Preaching of Islam پڑھ کے دیکھیے' وہ عیسائی ہے اتنا بڑا۔ Preaching of Islam کی کتاب آپ پڑھ کے دیکھیے۔ وہ شروع سے آخر تک یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف یہ سخت الزام ہے' یہ سخت جھوٹ ہے جو لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا۔ انہوں نے کہیں بھی بزورِ شمیر نہیں پھیلایا' یہ تو ان کی Preaching ہے' یہ تو ان لوگوں کا Character تھا کہ جس کی وجہ سے اسلام اس سرعت سے پھیلا۔ پھر ایک بات پیار کی بھی ہے' اس کا بھی استعمال نہ کرنا۔ خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر یوں ہوگا کہ اچھا بابا! تم چھوڑ دو' تمہارا جی تو

[1] جسے پنجابی زبان میں کہتے ہیں۔

نہیں مانتا۔ پیار و محبت میں تو ہم یوں بھی کہتے کہ خاطر تو یہ کرو۔ میرے ساتھ محبت ہے، میرے ساتھ پیار ہے۔ یہ کہہ کر بھی ہم کئی باتیں اس طرح سے منوا لیتے ہیں۔ یہ تو اس محبت و پیار کے Response کی بات ہے، یہ جس کسی نے بھی کی اس کے دل سے اٹھے گی۔ وہ ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ اگر یہ چیز دل سے نہیں اٹھی ہے تو پھر آپ کوئی طریقہ بھی استعمال کر لیں وہ اکراہ کہلائے گا۔ یہاں کہا کہ یہ اعلان کردو: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ لیکن ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہہ دو کہ یہاں تک تو تمہارے اختیار کی بات ہے کہ جس کا جی چاہے غلط راستے پہ چل پڑو اور جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کر لو لیکن وہ اتنا سمجھ لے کہ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (18:29)۔ ان قوانین سے انکار کر کے دوسری راہیں اختیار کرنے والوں کا انجام تباہی کا وہ عذاب ہے جو انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ان سے برملا کہہ دو کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے کہ چلو تو تم غلط راستہ پہ اور پہنچ جاؤ صحیح منزل پر۔ یہ ان پہ واضح کر دو کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ اس سے کفر اختیار کرو یا اس پر ایمان لے آؤ لیکن یہ واضح کر دو کہ انکار کی صورت میں چاروں طرف سے گھیرنے والی تباہی سے یوں ہوگا کہ: وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا (18:29)۔ جب وہ اس عذاب کی تلخی اور شدت کے خلاف فریاد کریں گے تو اس مصیبت کو کم کرنے والی کوئی چیز انہیں نصیب نہ ہوگی بلکہ وہی سامان جو مساعد حالات میں ممدِ حیات ہوتا ہے ان کے لیے وجہ ملامت بن جائے گا۔ وہی سونا چاندی جس کے بل بوتے پر یہ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے یوں سمجھیے کہ اسے پگھلا کر ان کے حلق میں انڈیلا جائے گا۔ (9:34:35) کس قدر ہلاکت انگیز ہوگا یہ تلخابہ اور کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوگا وہ سہارا جسے وہ اپنے لیے وجہ آسائش سمجھا کرتے تھے! عزیزانِ من! کیا بات ہے یہ!

جنت اور جہنم کا ذکر تشبیہات کے آئینہ میں

آپ کو معلوم ہے کہ جسے قرآنِ کریم نے بتایا اور میں نے یہ واضح بھی کیا ہے کہ یہ جو آنے والی جنت یا جہنم ہے، اسے قرآن نے تشبیہات کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ اور یہ کی ہی اسی طرح سے جا سکتی ہے۔ یہ تو ہمارے ادراک کی موجودہ سطح سے ماورا چیز ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ زندگی کس کیفیت اور نوعیت کی ہوگی۔ ایمان یہ ہے کہ وہ ہوگی ضرور۔ تو وہاں کی جتنی بھی تفصیلات ہیں، انہیں تشبیہات میں بیان کیا ہے۔ جس چیز کو ہم یہاں سخت عذاب کہتے ہیں، سخت اذیت کہتے ہیں، سخت تکلیف کہتے ہیں، وہ سمجھ لیجیے کہ وہ جہنم کا نقشہ ہے۔ جسے ہم آسائشیں کہتے ہیں، جسے ہم دل کا سکون کہتے ہیں، اطمینان کہتے ہیں، نشو و نما کہتے ہیں وہ جنت ہے۔ وہ مراتب ہیں، سرفرازیاں ہیں۔ ایک بات اور بھی سن لیجیے کہ جنت اور جہنم تو یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے لیکن وہاں یعنی حیات آخرت تک کے متعلق جب بھی یہ بات آئے گی تو اسے آپ کو تمثیلی انداز میں دیکھنا ہوگا۔ یہاں کہا یہ ہے کہ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر حق کا راستہ چھوڑ دو گے تو ٹھیک ہے، یہاں

جو جہنم تمہارے لیے ہوگا' اس میں بھی تمہارے لیے ذلت ورسوائیاں ہونگی۔ یہاں اسی ارضی زندگی پر سامانِ رزق تو ہوگا لیکن کیسا ہوگا؟ کہنے لگے: یہی پانی کہ جو ممدِ حیات ہے' کھیتیوں کا دارومدار اس پہ ہے' اگر دو دن بھی گرمی میں پودوں کو پانی نہ ملے' تو مرجھا جاتے ہیں۔ اگر لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب پودے کے اوپر کھولتا ہوا پانی ڈال دیجیے تو وہی پانی' وہی سامانِ زیست' اس کے لیے سببِ موت ہو جائے گا۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں اس آیت میں دو لفظ آئے ہیں۔عزیزانِ من! پوچھیے نہیں' آدمی وجد میں آ جاتا ہے۔کہا: یہ سارا سامانِ زیست زندگی بخش ہے۔ اگر اسے غلط طریق پر استعمال کیا جائے تو یہ مرض آفریں ہو جاتا ہے۔ انہی چیزوں سے ہی تباہیاں آ جاتی ہیں۔ یہ دو لفظ ہیں' عزیزانِ من! انہیں سمجھ لیجیے۔ یہاں کہا: سَآءَتْ مُرْتَفَقًا (18:29) مجھے ذرا آگے چلنے دیجیے' دونوں کو سامنے لے آؤنگا۔ یہاں کہا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا. اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (18:30:31)۔ جو لوگ اس ضابطۂ خداوندی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں گے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے' تو ان کے حسنِ عمل کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوگا۔ ان کی قیام گاہ ایسے باغات میں ہوگی جن کی بہاریں خزاں ناآشنا ہوں گی۔ ان کے معاشرے میں مستقل خوش حالیاں اور فارغ البالیاں رہیں گی۔ سروری اور سرداری کے جس قدر گراں بہا اسباب تمہارے ذہن میں آ سکتے ہیں' انہیں سب میسر ہوں گے مثلاً سونے کے کنگن جو سرداری کے امتیازی نشانات ہیں' دبیز اور ریشمی ملبوسات' جو اعلیٰ ترین معیارِ زیست کی خصوصیات ہیں' بلند و بالا شہ نشینوں پر تکیہ لگائے' جو شاہانہ نشست کا نقشہ ہے۔ انہیں یہ سب میسر ہوگا۔ کس قدر خوشگوار ہوگا ان کی محنتوں کا یہ معاوضہ اور کیسی حسین ہوں گی آسائشیں' جو ان کے لیے مزید ارتقاء کا توازن بدوش سہارا بنیں گی۔ عزیزانِ من! اس سے پہلی آیت میں وہاں ہے: سَآءَتْ مُرْتَفَقًا (18:29) یہاں اس آیت میں ہے۔ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (18:31) سامان وہی ہے' یہی پانی' کھانا' پینا' کپڑے دھونا' رہنا سہنا۔ صاحب! یہ سب جتنے بھی ہیں' وہی سامان ہیں۔ جہنم کے اندر بھی یہی چیزیں بتائی ہیں' اور یہی چیزیں جنت کے متعلق بھی ہیں۔ پہلے وہ عام ترجمہ یا لفظی معنی بتادیں گے کہ ہم کسی کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ لیکن وہ اجر کس سے مشروط (Conditioned) ہے' اس کا ذکر نہیں کریں گے۔

اجر ہمیشہ عمل سے مشروط ہوتا ہے

عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ اجر کسی کام کا نتیجہ ہے۔ جنت کا فی ''سبیل اللہ'' ملنا بالکل غلط ہے۔ اللہ واسطے کی جنت نہیں ملتی ہے۔ خیرات کے ٹکڑوں پہ لی ہوئی جنت خود انسان کے نزدیک کسی بھی کام کی نہیں ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) ہی کہتا ہے:

جنت تری پنہاں ہے' ترے خونِ جگر میں

یہ خونِ جگر سے حاصل کی ہوئی جنت ہی اس قابل ہوتی ہے کہ اس میں فخر کا امکان رہے۔

اگر بخشش کے طور پر' اگر خیرات کے طور' تجھے جنت بھی ملتی ہے تو کچھ نہیں ہے۔ ہاں! تیرے اپنے کام کے بدلے میں اگر کوئی چیز ملتی ہے تو پھر یہ جنت کچھ قابلِ قبول شے ہے۔ اسی لیے قرآن نے ہر مقام پہ: **نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ** (29:58)' **لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا** (18:30) ہر جگہ یہ کہا ہے کہ یہ تمہارے ہی اعمال کا فطری نتیجہ ہوگا' یہ اسی کی جزاء ہوگی جو تمہیں ملے گی' یہ اسی کا صلہ ہوگا جو تمہیں دیا جائے گا۔ یہ جزا اور یہ صلے اس کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں' انسان اس کے اوپر ذرا سی بھی قدرت نہیں رکھتا کہ اس میں کمی بیشی کر سکے۔ بھئی! تمہارے ہی اعمال کا یہ بدلہ تھا۔ بس اتنا ہی یہ ہے کہ ہم اچھا معاملہ کرنیوالے ہیں' ہم اس میں ڈنڈی نہیں مارتے' اس میں کھوٹ نہیں پیدا کرتے' صحیح صحیح اجر دیدیتے ہیں لیکن ہوتا یہ تمہارے ہی اعمال کا اجر ہے۔

پہلے مزدوری بعد میں معاوضہ

یاد ہے' پچھلی دفعہ پچھلے ہی درس میں' میں نے یہ کہا تھا کہ جسے آپ حقوق اور ذمہ داریاں کہتے ہیں' قرآن کی رُو سے اس وقت تک آپ کا کوئی حق متعین نہیں ہوتا' مسلم نہیں ہوتا' جب تک پہلے آپ ایک ذمہ داری پوری نہ کرلیں۔ پہلے آپ اپنی ذمہ داری کو پورا کریں گے' جو آپ نے لی یا آپ کے سپرد کی گئی ہے' جب وہ پوری ہوگی تو اس سے آپ کا ایک Right' یعنی حق Establish متعین ہوگا۔ کبھی آپ نے اس پہ غور نہیں کیا کہ **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** (1:4) ہے اور اس کے بعد ہے: **وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ** (1:4)۔ ہم تیرے احکام کی' تیرے قوانین کی' اطاعت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق یہ سارے کام کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داریاں ہیں جو پوری کرتے ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ "میں یہ کر آیا ہوں جی! یہ پوری ہوئی ہے۔" اسے حق حاصل ہے یہ کہنے کا: **اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ** (1:4) اب ہم تجھ سے اس کی مدد مانگتے ہیں۔ جو **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** (1:4) نہیں کہتا یعنی جو ان قوانین کے مطابق نہیں کر کے آیا' اس کو حق حاصل نہیں ہے **اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ** (1:4) کہنے کا۔ بغیر ان قوانین کے کام کیے وہ بھلی اب کہتا پھرے کہ صاحب! مانتا کون ہے' سنتا کون ہے؟ اس کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس نے دن بھر کام ہی نہیں کیا' وہ شام کو مزدوری لینے کیسے آجائے گا۔ دھکے دے کے آپ نکال دیں گے۔ یہ **وَاِیَّاکَ نَعۡبُدُ** (1:4) کرنے والے کا حق ہے کہ وہ آ کے یہ کہے کہ **وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ** (1:4) اور پھر وہ "جو دینے والا ہے' وہ کہے کہ ہاں ہم مستعد ہیں۔ یوں ہوتی ہے اس کی اعانت۔

عزیزانِ من! بات یہ ہوئی تھی کہ ہر پوری کی گئی Responsibility' ذمہ داری ایک Right' ایک حق کو Establish کرتی ہے' متعین کرتی ہے۔ اس دور کے اندر جو ساری دنیا میں فساد مچ رہا ہے' وہ یہی چیز ہے کہ ذمہ داری (Responsilility) اور حق (Right) میں تعلق متعین (Establish) نہیں ہو رہا۔ ہر ایک کو حقوق' حقوق یعنی Rights , Rights کا سکھایا جاتا ہے۔ Responsibility یعنی ذمہ داری کا کوئی سبق نہیں دیا جاتا۔ نتیجہ فساد ہے۔

First Discharge Responsibility , then a right is approved

ذمہ داری (Responsibility) کے ڈسچارج کرنے پر فطری طور پر آپ کا ایک حق متعین ہوتا ہے۔ **لَانُضِيۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا** (18:30)۔ہم اجر ضائع نہیں کرتے۔ **اُولٰٓـئِکَ لَهُمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ**(18:31)۔ ان کی قیام گاہیں ایسے باغات میں ہوں گی جن کی بہاریں خزاں ناآشنا ہیں۔

جنت کی نعما

عزیزانِ من! پھر یہی **جنت عدن** ہے ٗ ہمیشہ رہنے والی ہے ٗ سدا بہار ہے ٗ خزاں ناآشنا ہے۔اور پھر یہ دیکھیے کہ کیا کیا سامان ہیں! ہر وہ چیز جو یہاں مُلّا نے حرام قرار دی ہوئی ہے ٗ وہ جنت میں خدا ان کو دیتا چلا جائے گا۔ملاحظہ فرمائیں: سونے کے کڑے پہنائے جائیں گے۔ اب تو ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔اس زمانے میں ٗ ایران کی مملکت میں جس کو سب سے بڑا منصب دیا جاتا تھا ٗ وہ یہ تھا کہ اس کو ایک شاہانہ کنگن پہنایا جاتا تھا۔یہ چیز مغلیہ سلطنت میں بھی موجود تھی۔ ان کے ہاں کا جو یہ اساور ہے یہ وہی چیز تو ہے۔جس طرح اکبر کے دربار میں کنگن والے نورتن کہلاتے تھے ٗ یہ وہی چیز تو تھی۔کنگن بلند ترین سرفرازیوں کی علامت ہوتی تھی۔ قرآن نے یہ ساری چیزیں تشبیہ کی ہیں۔یعنی عربوں کے ذہن میں جو چیزیں انتہائی آرائش ٗ زیبائش اور سرفرازی اور منصب اور عزت اور جاہ کی تھیں ٗ وہ ایران کی مملکت اور روم کی مملکت کے اندر دیکھ رہے تھے اور یہ بیچارے عرب تو انتہائی ناآشنائے آسائش تھے۔ ان کا تو عیش دو وقت کی روٹی تھا۔ عیش کے تو معنی ہی روٹی کے ہیں۔ان کو گیہوں کی روٹی ملتی تھی تو یہ کہتے تھے ٗ راوی عیش لکھتا ہے۔جس قوم کی یہ صورت تھی: ساری عمر کھجوریں اور کھجوروں کی گٹھلیاں ہی کھاتے تھے۔کہیں چار درخت کھڑے ہو گئے تو اس کو باغ کہہ لیا ٗ کہیں چشمے کا ذرا سا پانی ہوا تو اسے نہر کہہ دیا۔ان کے نزدیک دائیں بائیں دو بڑی تہذیبیں تھیں۔ان میں جو کچھ یہ دیکھتے تھے ٗ وہ ان کے سامنے نقشہ تھا۔جھلسے ہوئے صحرا کے مارے ہوئے یہ بدو ٹینٹ میں رہنے والے تھے۔ان کو جو کہا جائے کہ ایسے باغات ٗ جن میں کبھی دھوپ ہی نہیں آئے گی اور جن کے پتے خشک نہیں ہونگے ٗ وہ ملیں گے تو کہیں گے: سبحان اللہ۔اور پھر یہ کہا جائے: پانی ایسا ہے جو ختم ہی نہیں ہوگا ٗ رواں دواں چلے گا۔ ایسے صاحب! وہاں پھل ہوں گے تو ان کے لیے تو فراوانیاں ہی فراوانیاں ہوں گی۔اور اتنی سی بات ہی نہیں ٗ وہ ایران کے وزراء اور امراء کو کنگن پہنے ہوئے دیکھتے ہو ٗ انہیں کہا گیا کہ خدا کے ہاں سے وہ انہیں بھی ملیں گے۔اچھا جی: **وَيَلۡبَسُوۡنَ ثِيَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ** (18:31)۔ ریشمی کپڑے ٗ حریر و اطلس کے بستر ٗ نرم و نازک گدے ٗ صوفے ٗ فرش نہایت اعلیٰ درجے کے قالین کیسے؟ **علی الارائک** تکیے لگے ہوئے ٗ آسائشیں۔یعنی یہ پوری تصور پہلے سے ان کے ذہن میں تھا جو یہ کہہ کے دیا کہ مثلاً جنت۔یہ ہم مثال کے طور پر بات بتا رہے ہیں ٗ آگے چل کر سچ مچ ہی یہ نہ کہہ دینا کہ صاحب! لاؤ وہ ریشمی کپڑا جو تم کہتے تھے اور بتائیے درزی کہاں ہے؟ یعنی یہ

سارا تصور ہے جو دیا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ساری چیزیں' زندگی کے سامانِ زیست جن پہ زندگی کا دارومدار ہے اور زندگی کے بعد وہ چیزیں جن پہ آسائش کا' آرائش کا' زیبائش کا دارومدار ہے یہ سب چیزیں بتائیں۔ یعنی مادی کائنات کی ہر چیز کا جو انسان کی دل پسند ہے ذکر کیا۔ یہ تمام چیزیں بتائیں۔ یہاں اس آیت کے دو لفظ ہیں عزیزانِ من! جن کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ کہا: کیا ان کی حیثیت اور کیا ان کی کیفیت!

یہ نعمائے خداوندی صرف انسانی ذات کے ارتقاء کا ذریعہ ہیں

عزیزانِ من! غور سے سنیے گا اور ان دو لفظوں کو یاد رکھیے گا کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ یہ ''ارتفاق'' کا لفظ ہے۔ یہ وہی ہے جسے رفق کہتے ہیں: ہر وہ چیز جس پہ کہنی ٹیک کے آپ اونچے اٹھیں۔'' یعنی یہ سہارا اور یہ سامان مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف تمہاری ذات میں ارتقاء پیدا کرنے کا سہارا ہے۔ جس کی بلندی کی بناء پر تم اوپر اٹھ سکتے ہو۔ اللہ اکبر۔ ایک لفظ کے اندر' عزیزانِ من! یہ قرآن کیا کہہ گیا! قرآن ہے یہ خدا کا کلام ہے صاحب! میں نے جس دن **مرتفقا** کا لفظ پڑھا' اس کا مفہوم سمجھا' بس اس دن زندگی کا بھید کھل گیا۔ یا اللہ! قرآن کیا باتیں کر جاتا ہے۔ سب کچھ دے رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ان چیزوں اور آسائشوں کو مقصود بالذات نہ سمجھ لینا۔ یہ تو کرسی کا وہ بازو ہے جس سے ٹیک دے کر تم کھڑے ہو سکتے ہو' یہ سب چیزیں تو اوپر اٹھنے کا صرف سہارا ہیں ورنہ مادیت (Materialism) کے اندر ڈوب کر اوپر اٹھا ہوا انسان بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں یہ تو ضروری چیزیں ہیں۔ یاد رکھیے! ذات کو ابھارنے کے لیے یہ فقر و فاقہ اور چالیس چالیس روز ایک جگہ کے اوپر گزارنا' حدیثِ بے خبراں ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے۔ قرآن یہ سب کچھ دیتا ہے' عزیزانِ من! دیکھیے تو اسی آیت میں یہ سب کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے آگے انسان کا اور کیا تصور ہو سکتا ہے۔ یہ تو چودہ سو سال پہلے کی بات ہے۔ آج بھی آپ دیکھیے تو یہی چیزیں گنائی جائیں گی۔ مہذب ترین سوسائٹی میں سب سے بڑی اونچی جو ویلفیئر سوسائٹی ہے جو آپ کے ہاں کی ہوگی جہاں سب کچھ نصیب ہوگا وہ یہی کچھ ہوگا۔ وہ کہتا ہے یہ سب کچھ ہوگا' یہ انہیں دیا جائے گا لیکن انہیں صرف یہ معلوم ہو کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ چیزیں انسانی ذات کے اوپر ابھارنے' اٹھانے کے لیے' ٹیک لگا کے اٹھنے' کا سہارا ہیں۔ یہ ہے قرآن!

اب آئیے اس چیز کی طرف کہ سارا سامان تباہی کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ **مرتفقا** (18:29) کیا لفظ ہے! کرسی پہ آپ بیٹھے ہوئے ہوں اور اسکے بازوؤں کے اوپر آپ نے ٹیک لگا کے اٹھنا ہو اور نیچے سے کرسی کا توازن بگڑ جائے تو یہی سہارا آپ کے گرنے کا اور موت کا باعث بن سکتا ہے۔ سآءت کے معنی ہوتے ہیں: ''جس کا توازن بگڑا ہوا ہو۔'' یہاں آیا ہے: **سَآءَتْ مُرْتَفَقًا** (18:29)۔ یہی ارتفاقات کی چیز ہے جو تمہارے اونچے اٹھنے کا سہارا بنتی تھی اگر ان کا نیچے سے توازن بگڑ گیا' تو یہی چیز تمہارے گرنے

کا موجب بن جائے گی' چوٹ لگے گی' موت کا موجب بن جائے گی۔ اور آگے ہے: حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (18:31)۔ اگر تم نے ان کا توازن برقرار رکھا تو یہی تمہیں اوپر اٹھا دیگی۔ میں سمجھتا ہوں کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس مادی کائنات میں قرآن حکیم نے خیر و شر کے مسئلے کو حل کر کے انسان کی پوزیشن کو واضح کر دیا۔ مادے کی ان تمام چیزوں کو' زیبائشوں کو' آرائشوں اور سامانِ زیست کو' تمہارے لیے وجۂ لطافت بنا دیا۔ قرآن ان تمام چیزوں کا مقصود ایک ہی لفظ کے اندر بیان کر گیا۔ چیز وہی ہے' یہ ارتفاقات وہی ہیں' وہی سہارے ہیں' ان میں کچھ فرق نہیں' فرق ''ساءت'' اور ''حسنت'' کا ہے۔ اگر ان کا توازن صحیح ہے تو پھر یہی سہارے اوپر اٹھنے کا موجب' اگر نیچے سے توازن بگڑ گیا تو یہی سہارا تمہاری موت کا باعث ہے' اس کا نام جہنم ہے۔ یہ ساری مادی اور سامانِ زیست کی چیزیں ہیں' جن میں توازن بگڑ گیا ہوا ہے۔ ان کا نتیجہ جہنم ہے۔ ایسی تمام چیزیں' جن کا توازن برقرار رکھا ہو' وہ جنت کی طرف لے جانے والی چیزیں ہیں۔ ''ساءت مرتفقا'' اور ''حسنت مرتفقا'' میں مرتفقا دونوں ہی ہیں۔ یعنی سہارے مگر ایک اٹھانے کا اور دوسرا گرانے کا۔ اس پہ غور کیجیے گا' بار بار غور کیجیے گا اس پہ کہ قرآن بات کس طرح سے کہہ جاتا ہے۔ کیا چیز کہہ گیا ہے یہاں۔ یہ ترکِ دنیا' ترکِ لذائذ' ترکِ مادہ' یہ تمام زینت کی چیزوں سے نفرت' یہ سارا آپ کے ہاں کا تصوف ہی تھا' جو بدھ مت کا پیدا کردہ تھا اور بدھ مت کے راستے ہی آپ کے ہاں آیا۔ اور سارا اس سازش کے تحت دیا گیا کہ جن کے دلوں میں ابھی اللہ کا خیال کچھ باقی ہے ان کو بھی اس طرف لگا دو:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے

قابلِ نفرت' قابلِ نفرت' قابلِ نفرت' ہاں! یہ قابلِ نفرت ہمارے لیے چھوڑو۔ پوچھو یہ ان سے کہ جنہوں نے ان کو مختص سمجھا تھا۔

ایران کی فتح اور مالِ غنیمت

عزیزانِ من! آپ نے ''شاہکارِ رسالت'' میں دیکھا ہو گا جب سعد بن وقاص اور ان کی جماعت والوں نے مدائن فتح کیا ہے' یہ سلطنتِ ایران کا دارالسلطنت (Capital) تھا' ہزار ہا سال کی کاذبیت [1] کے ماحصل کے نوادرات' نادر مجسمے اور شاہکار تصاویر اس کے اندر جمع تھے۔ اس قدر بیش قیمت گنائی گئی ساری چیزیں وہاں موجود تھیں۔ وہی قوم جس کے ساتھ یہ ایرانی ابھی کل تک جنگ لڑنا بھی باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے' آج ان کے تخت و تاج' سلطنت و حکومت اور دولت و حشمت' سب کی مالک تھی کیونکہ یہ سب کچھ انہوں نے فتح کیا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی' یہ عرب جو یہاں سے اٹھ کے ایران گئے اور وہاں یہ سب کچھ فتح کیا تو گویا یہ سب ان کا ہو گیا مگر ان عربوں نے' جنہیں یورپ کے تنگ نظر مؤرخ نہایت وحشی کہہ کر پکارتے ہیں' اس سب کچھ کو اسی طرح رہنے دیا' کسی کو توڑا پھوڑا نہیں۔ ہیکل اور دیگر مؤرخین کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق حضرت سعد کو کسریٰ کے خزانوں سے بیس کھرب دینار ملے اور محل (قصر ابیض) میں جو ساز و سامان ملا اس کی قیمت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اب آزادی کے وقت ہمارے ہاں کی کیفیت دیکھیں تقسیم کے بعد جو ہم یہاں پاکستان میں

---

[1] دروغ گوئی

آ ئے ہیں تو یہاں جتنی ہندوؤں کی دوکانیں تھیں' ان کی لوٹ مار کی۔ اس وجہ سے توازن بگڑ گیا۔ پاکستان میں تو کچھ بھی نہ تھا جو میں نے گزارش کی ہے۔ وہاں ایران میں یہ سب کچھ تھا۔ اس کی تفصیل ایران کی تاریخ میں سب موجود ہے۔ ان سے پوچھیے کہ اس کی تفاصیل کتنی ہیں۔ ان سے پوچھ لیجیے کہ انہوں نے ان کے ہاں سے کیا کچھ پایا' اور وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے کیا کچھ دیکھا: حلوان میں کسریٰ کا موتیوں کا ہار اور جواہرات سے مرصع تاج اور زرکار ریشمی ملبوسات جن میں جوہرات ٹکے ہوئے تھے' کسریٰ کی زرہ اور تلواریں بھی جواہرات سے مرصع تھیں۔ سعد بن وقاص نے دربار خلافت میں اس کی تفصیل لکھ کے بھیجی۔ اہل مدینہ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ ساٹھ گز کا تو صرف ایک قلین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا' اس کی زمین سونے کی تھی' جابجا موتیوں کی نہریں تھیں' کناروں پر چمنستان تھا جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے' پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔ کیا بات تھی ان لوگوں کی! اس تفصیل کے اندر یہ ساری چیزیں انہی الفاظ میں لکھیں جن الفاظ میں ان کا ذکر قرآن میں آیا ہے کہ ''اساورۃ'' کے ڈھیر ہیں: ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ (18:31) ہیں۔ نرم اور باریک ریشمی ملبوسات ہیں۔ پوچھو نہیں ایک انبار ہے۔ یعنی یہ سارا کچھ لکھنے کے بعد یہ لکھا کہ خدا نے ہم سے جو وعدے کیے تھے' وہ سچ کر دکھائے ہیں۔ پھر انہوں نے لکھا کہ اے امیر المؤمنین! آپ نے انہیں نہیں دیکھا ہم زبانِ حال سے کہیں گے کہ ہاں تیرا ایک ایک وعدہ سچا ہو کے ہمارے سامنے آ گیا ہے۔

مالِ غنیمت امانت کے طور پر مرکز کے سپرد کیا گیا

اس کے بعد جب یہ سامان بھیجا ہے تو آپ سوچیے کہ یہاں کس قدر خوشی اور جشن ہوا ہوگا۔ وہاں سے جو سفیر آیا تھا' وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی ایک چٹھی بھی لایا تھا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ امیر المؤمنین! آپ اور آپ کے یہ رفقاء ان چیزوں کو دیکھ کے بہت خوش ہونگے' واقعی مقامِ مسرت ہے لیکن اس سے زیادہ ایک اور مقامِ مسرت ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے سپاہی تھے: بھوکے' ننگے' کپڑا تک ان کے پاس نہیں تھا' سواریاں تک ان کے پاس نہیں تھیں۔ یہ آئے اور اس سارے ملک کے مختلف شہروں کے اندر یہ ساقہ کی حیثیت سے پھیل گئے۔ یہ بھوکے' ننگے یہ سارے سپاہی پھیل گئے۔ یہ سارا سامان جو اور جتنا بھی ملا ہے' اس کی فہرست ہمارے پاس نہیں تھی' ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر یہ سارا سامان' یہ تمام زر و جواہرات' ان کے قبضے میں تھا۔ پتہ نہیں کوئی کہاں تھا' کوئی کہاں تھا۔ انہیں تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں تھا۔ اے امیر المؤمنین! خوش ہونے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے لیے نہیں لی۔ سب کچھ لا کر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا۔ خوش ہونے کی بات یہ ہے کہ یہ تمام حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (18:31) ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہہ گئے۔ کہنے لگے: اِس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟ حضرت علی بھی موجود تھے۔

امیر المؤمنین کا کردار

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمر! معلوم ہے کہ اِس دیانت اور امانت کا راز کیا تھا کہ ان سپاہیوں میں سے کسی نے ایک سوئی بھی کیوں اس طرح سے چوری کر کے نہیں اٹھائی؟ انہوں نے کہا فرمایئے: ان کا جو امیر المؤمنین ہے وہ غلط طریقے سے ایک سوئی تک نہیں لیتا' اس لیے اس کی رعایا کی یہ کیفیت ہے۔ چونکہ اے عمر! آپ کا دامن صاف ہے' اس لیے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیت میں بھی فرق آ جاتا۔ عزیزانِ من! سارا اسلام نچوڑ کے دو فقروں کے اندر آ گیا۔ اور بتا دیا کہ **حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا** کیا ہوتے ہیں' اس سے زیادہ ارتفاقات کی اور چیزیں دنیا میں کیا ہوں گی! حسنت اس لیے بنی ہیں کہ ان چیزوں نے ان کے مزاج کا توازن نہیں بگاڑا۔ اور نیچے سطح پر ان کا اثر اس لیے تھا کہ ان کے امیر المؤمنین نے سوئی تک بھی غلط انداز سے' باطل طریق سے' بھی نہیں لی۔ اس کا یہ طریق ہے صاحب! جو ان کا اثر نیچے تک جا کے پہنچتا ہے۔ اسے کہتے ہیں جنت! یہ تھے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے! اور یہ ہیں وہ جنت میں جانے کے مستحق کیونکہ انہوں نے یہ ذمہ داریاں یوں پوری کیں۔ ان کا یہ حق ہے۔

گفتگو کے انداز میں ساءت مرتفقا کا مفہوم سمجھانے کا طریق

یہ دونوں چیزیں آپ کے آمنے سامنے لانے کے بعد قرآن فوراً ایک محسوس مثال کی طرف آ گیا: آؤ تمہیں بتائیں کہ یہی چیزیں **سَآءَتْ مُرْتَفَقًا** (18:29) کیسے بنتی ہیں اور **حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا** (18:31) کیسے بنتی ہیں؟ **وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ** (18:32)۔ مثال کے طور پر دو آدمی تھے۔ کیا بات ہے! بات بہت اونچی تھی' جھٹ ان کی سطح کے اوپر آ گیا ''جیوں ساڈے ہوندے ناں اک سی بادشاہ۔''[1] مثال یوں ہوتی ہے: دو تھے آدمی! **جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا** (18:32)۔ ان میں سے ایک کے پاس انگور کے دو باغ تھے جن کے گرداگرد کھجوروں کے پیڑ تھے بڑے لمبے لمبے' ان میں بڑے عمدہ خوشے تھے' ان کے درمیان جو جگہ تھی اس میں کھیتی لہلہا رہی تھی۔ یہ دونوں باغ سرسبز و شاداب تھے۔ **كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ** (18:33-34)۔ یہ دونوں باغ ہمیشہ ہی بہت پھل دیتے تھے۔ ان کی پیداوار میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے نیچے پانی کی نہریں جاری تھیں جن سے آبپاشی ہوتی تھی اور وہ شخص کچھ عرصے کے بعد بڑا مالدار ہو گیا۔ یہ دو تھے۔ اس کا ایک ساتھی تھا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ **فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ** (18:34)۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ **اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا** (18:34)۔ اس مالدار آدمی نے کہا کہ اوئے! ذرا دیکھ کے چل' میرے برابر قدم اٹھا رہا ہے' دیکھتا نہیں میرا کتنا مال ہے۔ اور پھر اس مال کے زور پر میرا جتھہ اور پارٹی کتنی

---

[1] جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ایک تھا بادشاہ۔

مضبوط ہوگئی۔ یہاں قرآن نے یحاور (18:34) کہا تھا۔ اس میں تو برابر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ تو اتنا بھی برداشت نہیں کر سکا۔ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (18:35)۔ اس کے باغات تو ہرے بھرے تھے اس میں تو کوئی کمی نہیں تھی لیکن اس نے اپنے آپ سے جو زیادتی کی تھی، یہ اس کی نگاہ میں نہیں تھا۔ کسی نے کہا ہوگا کہ میاں! اس کے ساتھ حسنِ اخلاق کا بھی خیال کرو۔ یہ بھی دیکھو کہ یہ سب کچھ تمہارا اپنا نہیں ہے اس میں تم دیکھو تو سہی کہ خدا کا دیا ہوا کتنا حصہ ہے۔ اس بات کو بھی تو ذہن میں رکھو، اس پر اس قسم کا غرور و تکبر نہ کرو، اپنے برقعے میں رہو۔ یاد رکھو کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں حالات ایسا تغیر پیدا کریں کہ یہ سارے کا سارا ضائع ہو جائے۔ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا (18:35)۔ کہنے لگا بالکل نہیں صاحب! بڑا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ کبھی برباد نہیں ہو سکتا۔ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (18:36)۔ تمہاری یہ باتیں سب واہمہ ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ انقلاب کی گھڑی (قیامت) جس سے تو مجھے ڈراتا ہے، کبھی آئے گی۔ ہاں! یہ کچھ بھی کہا جا رہا ہے کہ یہاں نہیں تو قیامت میں سہی، وہاں تو بربادی ہوگی، تم کہتے ہو کہ وہاں جا کے جن چیزوں میں ظلم کر رہے ہو اس بناء پہ زیادتیاں کر رہے ہو تو اس کے لیے بربادی ہوگی۔ کہنے لگا: میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اس قسم کی بات ہوگی۔

دنیا بھی امیر کی اور جنت بھی امیر کی

کہنے لگا اور اگر ہوگی بھی ...... قرآن یہاں بڑی عجیب چیز لایا ہے۔ یہ تو وہ قرآن کی بتائی ہوئی خدا کی وہ جنت ہے، جو اعمال کے ساتھ تل کے ملتی ہے۔ ایک جنت مُلا بھی بیچتا ہے: جو جی میں آئے کرو، ایک حج کر آؤ، زم زم کے پانی سے ایسے دھلو گے، جیسے ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوئے ہو۔ چل بھئی! پچھلے سارے دھوتے گئے۔ ''اگلے وارے کر کے پھر اسی طرح نال ٹر جائیں۔''❶ عزیزانِ من! جنت میں اس طرح نہیں جا سکتے۔ کہنے لگے: کوئی بات نہیں ہے۔ مسجد یہاں بنا دیجیے، چونے مٹی کی مسجد بنوایئے، اللہ تعالیٰ موتیوں کا گھر جنت میں دے دیگا۔ یہاں جنت بکتی ہے۔ یہ کس کے لیے بکتی ہے اور کون جائے گا حج کرنے کے لیے؟ وہی جس کے پاس سات آٹھ دس ہزار روپیہ ہوگا۔❷ غریب تو نہیں جا سکتا۔ یہاں کون مسجد بنا کے دے گا؟ وہی جس کے پاس اتنا مال ہے۔ یہ جنت بکتی ہے۔ آج کی بات نہیں ہے۔ یہ بات تو شروع سے چلی آ رہی ہے۔ یہ ابلیس تو آدم کے ساتھ ہی یہاں آ گیا تھا۔ وہ جنت فروش، وہ مالدار، وہ دو باغ کا مالک کیا کہتا ہے؟ کہتا ہے: اول تو میرا خیال ہے کہ یہ یونہی ''ایویں ہی ہے قیامت ویامت والی بات ہے''❸ اور اگر تم ایسا کہتے ہو کہ یہ قیامت واقع ہوگی اور مجھے اپنے پروردگار کے حضور جانا پڑا تو پھر سن رکھو کہ: وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا (18:36)۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے اس کے نام پہ دے رکھا ہے تو مجھے وہاں اس سے بہتر ٹھکانہ ملے گا۔ مجھے وہاں بھی

---

❶ پچھلے تو سارے گناہ دھل گئے اگلے والے گناہ پھر حج کر کے دھل جائیں گے۔ ❷ 1975ء کا زمانہ ذہن میں رکھیے۔

❸ یہ تو یونہی دور از کار سی قیامت کی بات ہے۔

جنت ملے گی۔ جب کہ تم یہاں بھی دھکے کھا رہے ہو' وہاں بھی دھکے کھاؤ گے۔ غریب آدمی تو ان کے معیار کے مطابق کوئی نیکی کے کام کر ہی نہیں سکتا اس لیے وہ بیچارہ خالی نفل پڑھ چھوڑتا ہے۔ ''پیسے ای پلے نئیں ہوندے دین واسطے۔''❶ لیکن یہ خالی نفلوں پہ تو جنت نہیں دیتے۔ یہ تو جو یہاں ایک دیتا ہے وہاں اسی کو ستر دیتے ہیں۔ جو یہاں یہ پیسہ خرچ کرتا ہے اس کے بدلے میں وہاں جنت ملتی ہے۔ بیچارے غریب آدمی کے اپنے پاس تو کچھ نہیں ہوتا تو اس نے خرچ کہاں کرنا ہے۔ یہ ہے وہ جوان کو فریبِ نفس دیا جاتا ہے' انہیں غلط فہمی میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ یہ یونہی جہالت میں رہتے ہیں۔

انہوں نے ملت کو ایک فریبِ نفس میں مبتلا کر رکھا ہے

جب یہ اس سے بڑھتے ہیں تو اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو ہے' یہ تو خیر ہمارا حصہ ہوا اور یہ حصہ ہوا دیوتاؤں کا اور اٹھتے ہوئے گوئے بھی اپنی جھولی میں ڈال کے لیجاتے ہیں۔ ''او سارا کچھ جیہڑا مردے واسطے رکھیا ہوندا ہیگا ڈھیر لگا کے۔''❷ وہ پھل بھی' فروٹ بھی اور وہ کھانا بھی' پھر وہ کپڑے بھی' اس کی جوتی بھی' وہ نالہ' پراندہ' پگڑی' سرمے سلائیاں بھی' یہ سارا جو کچھ ہے' یہ سارا اس مردے کے لیے ہوتا ہے۔ تو دعا کیجاتی ہے اور اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یا اللہ یہ سب جو کچھ ہے اس کا ثواب اسے پہنچا دے اور یہ سارا کچھ تو جنت خریدنے کے لیے ہی ہے۔ کیا بات ہے!

عزیزانِ من! یہ آج کی بات نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ النحل میں ہے کہ یہ حصے لگا لیتے ہیں اور اس میں یہ کر دیتے ہیں کہ ہاں ٹھیک ہے صاحب! یہ تو ہو گیا: ہمارا حصہ۔ ہمارا دے دیاناں۔ ''مُلاں دا جیہڑا الگ دیندے ہیگے نیں۔''❸ آج بھی وہ الگ مولوی صاحب کو دیتے ہیں اور اس کے بعد یہ لوگ کہتے ہیں یہ خدا کا حصہ ہے' یہ دیوتاؤں کا حصہ ہے۔ اس کے بعد یہ حصے بھی خود ہی لیجاتے ہیں۔ یہ ہے وہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ جو مالدار کے لیے جنت ہے وہ قدم قدم پہ دیتے ہیں یہ وعدہ دیتے ہیں' وہ اسی لیے ہے کہ ان کے ہی مال کے اوپر یہ حضرات اپنے لیے سامانِ عیش خریدتے ہیں۔ اور واقعی یہ جتنا کچھ کرنے والے ہیں' ان میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا ایمان اس پر ہوتا ہی نہیں ہے کہ یہ چیز ہمارے اعمال میں ہمارے سامنے آنی ہے اور اس کا حساب دینا ہے۔ اِن کے ہاں یہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ یہ جو کہا ہے کہ میں مانتا نہیں' یہ کچھ ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ یہ نہیں مانتے اور کہنے کے لیے اسے کہتے ہیں کہ اچھا بابا! اگر ایسی بات تم کرتے ہی ہو کہ یقیناً مولا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا' وہاں بھی پھر تم دیکھو گے کہ ہم کو اس سے بھی بہتر ملے گا۔ اگر مولا نے چاہا تو ہم نے اتنا کچھ کر لیا ہوا ہے۔ تو وہاں کا یہ حساب تو وہ اس طرح سے برابر کر دیتے ہیں۔

---

❶ دینے کے لیے اس کے پاس رقم نہیں ہوتی

❷ وہ تمام مال واسباب جو مردے کے کے لیے انبار لگا رکھا ہوتا ہے۔

❸ مولویوں کا جو کہ انہیں الگ سے دیا جاتا ہے۔

قیامت کے روز چوری کا واپس کرنا

آپ کہیں گے کہ بات کو مثال میں لے آیا۔ کسی نے بکری چرا کے کھالی تھی۔ کہا: یہ بڑی بری بات ہے۔ چور نے کہا کہ یہ بکری تو اللہ کے نام کی تھی' اس لیے میں نے تو ان کی بکری کھائی ہی نہیں۔ کہنے لگے: قیامت کے دن کیا کرو گے؟ کہا: میں کہہ دونگا کہ میں نے بکری نہیں چرائی۔ کہنے لگے: وہاں بکری موجود ہوگی اور وہ خود شہادت دے گی کہ مجھے اس نے چرایا تھا۔ کہنے لگے: بڑا آسان ہے۔ کہنے لگے: کیا آسان ہے جی؟ کہنے لگے: ''بکری دا کن پھڑ کے کہونگا کہ لے میاں اپنی بکری لے لے۔''[1] عزیزانِ من! قرآن نے کہا تھا کہ آیات اللہ کو مضحکہ نہ بناؤ لیکن ان جنت فروشوں نے دین کو مضحکہ بنا دیا۔ عزیزانِ من! جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں' جو جس طرح سے جی میں آئے' مال جمع کرتے چلے جائیں۔ سال کے بعد اس میں چالیسواں حصہ ہمیں دے دو' اس کے بعد وہ روایت بیان کر دیتے ہیں معاذ اللہ۔ معاذ اللہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا: باقی سارا مال پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ او کم بختو! خود اپنی طرف سے یہ جتنا جی چاہے کرو۔ اس ذاتِ اقدسِ اعظم ﷺ کو تو نہ کہو' جو زندگی میں حیاتِ ارضی کے آخری لمحہ میں بیٹی سے کہہ رہے ہیں: فاطمہ! یہ نہ سمجھ لینا کہ محمد کی بیٹی ہو کے چھوٹ جاؤ گی۔ وہاں تمہارا اپنا کیا ہوا سامنے آئے گا۔ اور ایک تم ہو کہ اس قسم کی باتیں آپ کی طرف منسوب کرتے ہو۔ **قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا. لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا** (18:37-38)۔ اسی کے دوست نے جو اس سے باتیں کر رہا تھا کہا کہ کیا تو اُس خدا کے قانونِ مکافات سے انکار کرتا ہے جس نے تیری پیدائش کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر ایسے نطفہ سے آگے بڑھایا' پھر مختلف عناصر میں اعتدال پیدا کر کے تجھے انسانی شکل میں نمودار کر دیا۔ کیا اس کے بعد بھی تم سمجھ رہے ہو کہ تمہیں جو کچھ حاصل ہے وہ تمہاری اپنی ہنرمندی کی بنا پر ہے۔ مگر وہ ہے کہ کہہ رہا ہے کہ یہ سب کچھ میرا ہے' میری کاریگری ہے' میں نے سب کچھ کیا ہے۔ کہنے لگا: او اپنی حیثیت تو دیکھ' تو شے کیا تھا' کہاں سے تمہاری تخلیق کی ابتداء ہوئی؟ ایک قطرہ آب' ایک بچہ' بے کس' بے بس' اپنی زندگی کے لیے ہر ایک کا محتاج' اس نے تجھے اس کے سامانِ زیست کے سہارے' اس کے دیئے ہوئے نظام کے صدقے میں دنیا میں بھیجا' تمہیں مسلسل ایک انسان بنا دیا' ایک آدمی بنا دیا۔ تم مجھ سے یہ کیا کہتے ہو کہ یہ سارا میری ہُنرمندی کا نتیجہ ہے۔ تم دیکھو تو تم خود اپنی ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہو تو یہ تمہاری ہنرمندی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میں کسی دوسرے وقت میں تفصیل سے یہ نقطہ بیان کرونگا خیر۔ میں تو یہ نہیں کہتا۔ میں تو یہی کہونگا۔ **هُوَ اللّٰهُ رَبِّىْ** (18:38)۔ نشوونما بھی اسی نے دی ہے' نشوونما کا سامان بھی وہی پیدا کرتا ہے' اس لیے: **وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّىْٓ اَحَدًا** (18:38)۔ یہ جو سامانِ نشوونمائے زیست ہے' اس میں تو میں' اس کے سوا کسی اور کو شریک کر ہی نہیں سکتا۔ یہ سارا اسی کا ہے۔ یہ ہے جی ساری بات۔ **وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ**

[1] میں بکری کا کان پکڑ کر کہہ دوں گا کہ لو میاں! اپنی بکری لے لو۔

جَنَّتَکَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْکَ مَالاً وَّ وَلَدًا (18:39)۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ یہ اس قدر مال و دولت، اس قدر یہ پھل، یہ درخت، یہ فصلیں اور یہ سب کچھ نظر آنے پر تیرا رہتا تو اس میں تیری کچھ محنت نہیں ہے: وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39)۔ انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہو گی جیسی جدوجہد اس قسم کے اس کے نتائج۔ خدائی پیمانہ کے مطابق معاوضہ صرف محنت کا ہو گا اور مجھے صرف یہ جو میری محنت ہے، جو صرف میری مزدوری ہے، صرف اس پر میرا حق ہے، یہ باقی سارا کچھ خدا کا پیدا کردہ ہے، میری صلاحیتیں بھی اس کی عطا کردہ ہیں۔ کہا: اگر تو کہتا ہے کہ سارا کچھ قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے۔ قوت، استعداد، صلاحیت اس کی عطا کردہ ہے، اس کے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ تو اس کے بعد پھر یہ تیری ذہنیت نہ ہوتی کہ جس کے پاس یہ مال و دولت نہیں ہے اس کو تو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، پھر یہ بات پیدا نہ ہوتی۔ یہ وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں تو سمجھتا ہے کہ یہ میری قوت استعداد و صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ تجھے چاہیے کہ تو جب بھی اپنے باغ میں آئے اور ان پھلوں اور پھولوں کو دیکھے تو کہے کہ یہ کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس کے سوا اور کسی میں یہ قوت اور اقتدار نہیں کہ ان چیزوں کو پیدا کر سکے۔

اگر آبی وسائل کا یہ قانون ہی نہ ہوتا تو

فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِکَ وَیُرْسِلَ عَلَیْھَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا. اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُھَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَہٗ طَلَبًا (18:40-41)۔ یاد رکھو کہ جتنا یہ تم بتا رہے ہو: یہ درخت، یہ سب کچھ، اس کا سارا دارومدار تو پانی پہ ہے، تو کیا یہ پانی تمہارا پیدا کردہ ہے؟ اگر یہ زمین جو اس وقت چاہی یا نہری ہے بارانی ہوتی، تو پھر کیا ہوتا؟ قرآن نے دوسری جگہ (67:20) میں بھی یہ کہا ہے کہ یہ اس کا قانون ہے کہ پانی جو ہے یہ اوپر کو تم کھینچے ہو تو آ جاتا ہے پھر یہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ کہا: پانی بھی اگر ہوتا اور اگر قانون یہ ہوتا کہ کنوئیں میں یہ نیچے کی طرف جاتا اوپر نہ آتا تو کہاں سے لے لیتے۔ کہنے لگے: قانون کی اتنی ہی تبدیلی ہوتی تو تمہارا باغ ستیاناس ہو جاتا۔ یہ چشموں سے پانی نہ ابلتا، نیچے چلا جاتا تو پھر چشموں میں تم کیا کر لیتے۔ میرے ذہن میں معاشی نظام کی بات ہے اور اس دفعہ عزیزانِ من! میں کنونش پہ ایک خطاب کا موضوع یہی رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہ آپ کے ہاں معاشی نظریہ، معاشی نظام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، میرے ذہن میں اس کی اہمیت ہے اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ میں ایک پورا خطاب اس کے اوپر رکھوں [1] اور اس سے معاشیات کے نظام کے اور ان سے متعلقہ چیزوں کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے: کیا

---

[1] اس خطاب کا نام ہے: جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اُس سے آگے)۔ یہ طلوعِ اسلام کنونشن 1975ء سے پرویز کا خطاب تھا جو ادارہ طلوع اسلام گلبرگ لاہور سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر منظور الحق صاحب نے کیا ہے جو عنقریب طبع ہو کر سامنے آئے گا۔

فرق ہے قرآن کے معاشی نظام میں اور یہ جو آپ کے ہاں کمیونزم یا سوشلزم کا نظام لیے پھرتے ہیں۔ اس خطاب کی بنیادی کلید یہی ہے۔ کہا: وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (18:42)۔ اس کا مال و دولت تباہی کے گھیرے میں آ گیا اور وہ کف افسوس مل کر کہنے لگا کہ میں نے ان باغات اور کھیتوں پر کس قدر روپیہ صرف کیا' وہ سب برباد ہو گیا اور باغات کی حالت یہ ہو گئی کہ ان کی ٹہنیاں گر کر زمین کے برابر ہو گئیں۔ ہاں تو عزیزانِ من! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو روش اس نے اختیار کی' زمینیں برباد ہو گئیں' بنجر ہو گئیں' فصلیں اجڑ گئیں' برا حال ہوا۔ آپ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ ہاں صاحب! اس نے اس چیز پر خدا کا نام نہیں لیا اس لیے یہ سب کچھ اجڑ گیا۔

ہمارے ہاں جاگیرداری کا تباہ کن نظام

عزیزانِ من! آپ اُن بڑے بڑے زمیندار کے ہاں کبھی جا کے دیکھیے کہ ان کی زمینیں کیسے اجڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ جواب تحدید کر رہے ہیں' یہ اس کی بنیادی وجہ نہیں بتا رہے ہیں کہ یہ جو اتنے اتنے زیادہ ہزاروں مربعوں کے یہ رقبے دیئے جاتے ہیں وہ اس میں زیادہ دلچسپی ہی نہیں لے سکتے۔ وہ اس میں محنت نہیں کرتے۔ اتنا فراوانی سے ان کے ہاں آ جاتا ہے کہ اپنے اپنے ڈیرے میں بیٹھے ہوئے ہیں' دس دس مراسی' گرداور' بیس بیس مصاحب موجود ہیں' حقہ پہ حقہ چل رہا ہے۔ ''پھنگ کوٹ لئی ہیگی اے' کتیاں داڈار داڈارا اے۔''[1] اگلی بات میں نہیں کہنا چاہتا کہ وہ کیا کچھ ہے جس میں وہ سب پڑے ہوئے ہیں۔ زمینیں برباد ہو رہی ہیں۔ کچھ مزارع کھائے جا رہے ہیں اور کچھ مصاحب لوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ وہ بیچنے والے' منڈیوں میں بیچتے ہیں' پچیس ان کے پلے ڈالتے ہیں۔ یہ جو چیز ہو جاتی ہے اس سے یہ سب چیزیں اجڑتی ہیں۔ کہا: اس کا نتیجہ یہ تباہی تھا کیونکہ ان کے ہاں باطل مال آ گیا: دولت' پارٹی' یہ سارا کچھ آیا تو محنت ختم' توجہ ختم' نظم و نسق ختم ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فصلیں اجڑ گئیں' باغات برباد ہو گئے: وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (18:42)۔ اب وہ کہتا تھا کہ اے کاش! میں اپنے نشوونما دینے والے کے قانون ربوبیت کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرتا۔ اس وقت یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ربوبیت کے مسئلے کے اندر سامانِ نشوونما اور نظامِ نشوونما کے اندر اگر یہ چیز شامل نہ کی جائے تو واقعی خدا کے نظام کے تابع یہ سارا کچھ ملتا ہے اور اگر محنت ختم' توجہ ختم' نظم و نسق ختم کر دیا جائے پھر اس کا نتیجہ یہ بربادی اور تباہی ہو جاتی ہے۔ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا (18:43)۔ کہنے لگا: پوچھو ان بڑے بڑے جاگیرداروں سے کہ وہ جتھہ جو پورے کا پورا ڈیرے میں آ کے' صبح و شام رہتا تھا' وہ پوری پارٹی جو پیچھے پیچھے آپ کے جلوس نکالنے کی شکل میں آیا کرتی تھی' وہ آج کہاں ہے؟ اس نے کہا: یہ سارا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کہا: یہ یاد رکھو! ذہن میں نظامِ قوانینِ خداوندی کو کبھی نظر

---

[1] بھنگ کوٹ کوٹ کر پی جا رہی ہے۔ کتے رکھتے ہوئے ہیں بے شمار اور مست ہیں۔

اندازنہ کرنا اور یہاں آ کے کہا کہ دیکھا' انکو سمجھادو: هُنَالِکَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ (18:44)۔کائنات میں سارا اقتدار واختیار صرف خدا کے لیے ہے' اس لیے اسی کی Protection' حفاظت میں داخل ہو جا۔ یہ اگر کہتے ہو کہ راحت اور سکون صرف حق پر مبنی خدا کے قوانین سے ہی حاصل ہوسکتا ہے تو پھر هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا (18:44)۔بہترین معاوضہ' اجر وصلہ دینے میں بھی وہی ہے جو اس کے قانون کے مطابق ملتا ہے' انجام اور مال بھی اسی محنت کا صحیح نکلتا ہے جو اس کے قوانین کے تحت صَرف کی جاتی ہے۔ یہ بات ہے جس کے لیے پہلے سَآءَتْ مُرْتَفَقًا (18:29) کہا اور پھر حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (18:31) کہا۔اس کے بعد مثال کے طور پر دو آدمی جن کی یہ کیفیت تھی ان کا احوال بیان کیا اور اس کے بعد پھر آ گے اس نے مسلک خانقاہیت اور دنیاوی زیبائش وآرائش کا صحیح مقام کیا ہے وہ بیان کرتا ہے جس کے لیے اِس سورۃ الکھف کی ابتداء قصہ غارِ کھف میں رہنے والوں سی کی تھی۔لیکن وقت ہو گیا' اسے ہم آئندہ درس کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔آج ہم سورۃ الکھف کی آیت 44 تک آ گئے۔عزیزانِ من! 45 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ ط

❀......❀......❀......❀

تیسرا باب: سورۃ الکہف (آیات 45 تا 57)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿٤٤﴾ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ
السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿٤٥﴾ اَلْمَالُ
وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿٤٦﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ
وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿٤٧﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰي رَبِّكَ صَفًّا ۭ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا
خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ۡ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا
فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا
حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ
فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿٥٠﴾ مَآ
اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿٥١﴾ وَيَوْمَ
يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَاۗءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾ وَرَاَ
الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿٥٣﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ
مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى
وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا
هُزُوًا ﴿٥٦﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً
اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿٥٧﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1975ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 45 سے ہو رہا ہے: (18:45)۔

سیکولرازم، مذہب اور قرآن

جیسا کہ میں نے اس سورۃ کے آغاز میں کہا تھا کہ اس سورۃ میں عیسائیت کے مسلکِ خانقاہیت کے متعلق قرآنِ کریم نے اجمالاً ذکر کیا ہے اور پھر اصولاً اس مسلک کی تباہ کاریوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اگر انسان وحی کو چھوڑتا ہے تو اس کی فکر Extremes میں، افراط و تفریط میں، جھولا جھولتی ہے، اعتدال پہ نہیں رہتی۔ اگر انسان مذہب کی دنیا میں اس مسلک کی طرف آتا ہے جسے پہلے Materialism کہا جاتا تھا، اب اس کے لیے سیکولرازم کی Term استعمال کی ہے تو اسے صرف سیاست میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ تو ایک بڑا بنیادی نظریہ ہے جس میں کہا یہ جاتا ہے کہ انسان زندگی کے مسائل اور کائنات کے مسائل اپنی فکر سے حل کر سکتا ہے۔ طبعی قوانین کے تابع اس کی زندگی بسر ہوتی ہے، مقصدِ حیات ان طبعی مفادات کا حاصل کرنا ہے۔ کسی طریقے سے بھی یہ حاصل کیے جائیں، مقصد یہی ہے۔ ان میں مستقل اقدار کی کوئی حیثیت نہیں، انسانی مسائل کے حل میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ سیکولرازم کا ملخص ہے۔

میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ لوگوں کے ذہن سیکولرازم کے متعلق بھی صاف نہیں ہیں۔ سیکولرزم کا یہ Trend سیاسی دنیا میں عام ہو رہا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کنونشن میں میں اس کے متعلق بھی ذرا وضاحت سے بات کروں کہ یہ سیکولرازم کیا ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی عرض کرونگا کہ یہ نظریۂ حیات صرف طبعی قوانین، مادیت اور طبعی مفاد کو ہی اپنے سامنے بطور مقصودِ حیات رکھتا ہے۔ اس میں Permanent Values کا یا مستقل اقدارِ خداوندی، جو وحی کی رو سے ملتی ہیں، کا کوئی عمل دخل نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری طرف جب یہ مذہب کی دنیا میں آتا ہے تو یہ اس طبعی کائنات کے مصائب کو، یہاں کی زینتوں کو، یہاں کی زندگی کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ ان سے ترک، ان سے بے اعتنائی، ان سے لاپرواہی، ان سے دور دور رہنا، دور دور ہٹنا، مذہب کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ یعنی وہی ان سے نفرت کرنا ہے۔ وہ اسے حاصلِ زندگی سمجھتا ہے۔ تو دونوں طرف آپ یہ دیکھتے ہیں، یہ Extremities ہیں۔ آپ افراط و تفریط کی طرف جاتے ہے جب کہ قرآن اس باب میں اعتدال کا نقطہ بتاتا ہے، جس سے اس افراط و تفریط کی تردید ہوتی ہے۔ یہی تو قرآن کا اعجاز ہے۔ سابقہ درس میں قرآنِ کریم نے اس شخص کی مثال دی تھی جو اپنے مفاد حاصل کرنے کے لیے کلیتاً اور کاملتاً صرف ان طبعی اور مادی قوانین یا تدابیر یا اس کے ذرائع پہ ہی انحصار رکھتا تھا۔ اور درمیان میں مستقل اقدار کو کوئی دخل نہیں دیتا تھا اور اگر اس میں کوئی مذہب کی بات تھی تو قرآن نے اتنی سی بات بھی ذرا سے ٹکڑے میں بیان کر دی تھی کہ کس طرح سے دولت حاصل کرنے والے، اپنے آپ کو فریب دے لیتے

ہیں۔ یہ کہہ کر ہم جو خدا کے راستے میں کچھ چند ٹکے خیرات کر دیتے ہیں اور پھر مذہب کے اجارہ دار انہیں اس کا اطمینان دلا دیتے ہیں کہ اس سے جنت حاصل ہو جاتی ہے تو یاد رکھیے کہ بعینہ عیسائیت کا یہی مسلک ہے۔

جنت کے پروانوں کی لوٹ سیل (Sale)

عیسائیت میں گناہ معاف کرنے کے پروانے بکا کرتے تھے۔ ہر گناہ یا ہر جرم کے بدلے میں اسی طرح فیس مقرر تھی جس طرح ہر مقدمے کی نوعیت کے اعتبار سے کورٹ فیس مقرر ہوتی ہے۔ ان کی چھپی ہوئی لسٹیں ہوتی تھیں جو بازاروں میں بکتی تھیں۔ پادری انہیں لیے لیے پھرتے تھے۔ ان میں Concession بھی کیا جاتا تھا۔ گناہ معاف کرانے والا کہتا تھا کہ صاحب! مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے جھٹ سے اپنی وہ ٹیبل نکال لی اور اس میں بتایا کہ صاحب! اس کے تو اتنے پیسے ہونگے' تو اس نے اتنے پیسے دے دیئے' اس نے اس کے بعد چھپا ہوا Printed کورٹ کی طرف سے دستخط شدہ ایک سرٹیفیکیٹ ہوتا تھا' کورٹ ہی کا ایک نمائندہ ہوتا تھا' وہ اسے سرٹیفیکیٹ دے دیا کرتا تھا کہ اس نے وہ کورٹ فیس Pay کر دیا اس لیے یہ گناہ معاف ہو گیا۔ ہاں تو عزیزانِ من! یہ معافی نامے بکا کرتے تھے۔

ایک ہی سکے کا دوسرا رُخ۔ ہمارے اپنے افعال

ہم اس بات پر ہنستے ہیں۔ دراصل روح تو وہی رہتی ہے وہ صرف پیکر بدلتی ہے۔ آج بھی جب کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی مسجد بنوادے گا اُسے جنت میں گھر مل جائے گا۔ اُس شخص کے متعلق کبھی یہ نہیں ہوتا کہ یہ دیکھا جائے کہ اس کی آمدنی حلال کی ہے یا حرام کی ہے اور جسے ہم رزقِ حلال یا محنت سے کمانے والا کہتے ہیں' وہ بیچارہ تو اپنے گھر کی مرمت بھی نہیں کر سکتا' اُس کے پاس تو اتنا بچتا ہی نہیں ہے' وہ مسجد کہاں سے بنوادے گا۔ تو یہ کہنا کہ جو مسجد بنوادے گا اس کو جنت میں موتیوں کا گھر مل جائے گا۔ وہ جو صدقہ دیدیگا' اس کا گناہ معاف ہوجائے گا۔ یہ سب عیسائیت کی طرح گناہ معاف کرانے کے پروانے ہیں۔ اسی طرح سے حج میں بھی جا کے دیکھیے کہ اگر فلاں مناسکِ حج کی بات رہ گئی ہے' تو جھٹ سے وہاں کے "شریعت کے پابند" یہ کہتے ہیں کہ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ایک جان دینا ہوگی۔ جی! کیا کرنا ہوگا صاحب! ایک قربانی۔ دوسرا کہے گا کہ یہ تو ذرا کوئی بھاری جرم ہو گیا ہے' اس کے لیے دو قربانیاں ہوں گی۔ یہ حضرت جی وہاں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' ان کے پاس سارے حاجی جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ کرو ورنہ تمہارا حج قبول نہیں ہوگا۔ اب جس کے پاس اتنا دینے کے لیے نہیں ہے تو وہ غریب مارا گیا۔ تو بات وہی ہے کہ یہ بھی تو اسی کے گناہ دھلتے ہیں جو پیسا دیدیتا ہے۔ وہاں عیسائیت میں بھی تو یہی ہوتا تھا۔ تو اگر ادھر مذہب کی دنیا میں آتے ہیں تو مذہب کا اتنا ہی حصہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان سے چیزیں وصول کرے اور ان کو جنت کے پروانے دیدیتا ہے اور آگے جب اہلِ طریقت آتے ہیں تو وہ پھر سرے سے ان تمام چیزوں کو ہی قابلِ نفرت قرار دیدیتے ہیں صاحب!

یہ جو کچھ پچھلے رکوع کی آیات میں ہمارے سامنے آیا تھا' وہ ایک ایسا ہی Materialist تھا' آج کی اصطلاح میں سیکولرسٹ تھا کہ وہ مذہب کے ساتھ کچھ تعلق باقی نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے اس نے یہ کہا تھا کہ اول تو میں اس کا قائل ہی نہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہوگی' کوئی قیامت بھی ہوگی' کچھ پوچھا بھی جائے گا۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ جو بھی شخص اس طرح سے محض مادی اسباب کو ساتھ رکھے' اسے مرنے کے بعد کی زندگی یا مکافاتِ عمل کے اوپر ایمان ہی نہیں ہوتا۔ تو بات اس نے ٹھیک کہی تھی۔ اگلی بات یہ ہے کہ اگر ایسا بھی ہوگا تو وہاں بھی آپ دیکھیں گے ''کہ ہمیں انشاء اللہ جنت ہی ملے گی۔'' وہ یہ چیز تھی کہ یہ جو یہاں اس طرح سے جنت بکتی ہے تو وہ خرید لیتے ہیں اور دوسری طرف وہ خانقاہیت کے مسلک والے لوگ ہیں وہ ان چیزوں کو سراسر قابلِ نفرت ہی قرار دیتے ہیں۔

پچھلی مثال میں تو یہ چیز آئی تھی۔ اب یہاں قرآن آگے چلتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ حصہ ٹھیک ہے' یہ کچھ طبعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے لیکن اگر ان کی طرف سے آخر تک بے اعتنائی برتی جائے' ان کا خیال ہی نہ رکھا جائے' ان پر پوری توجہ ہی نہ دی جائے' جیسا کہ مسلکِ خانقاہیت میں ہوتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟ طبعی قوانین کے اس حصے تک تو ان کے ہاں کا سب سے بڑا بزرگ' سب سے بڑا صوفی' سب سے بڑا ولی جسے وہ اولیاء کہتے ہیں' وہ بھی زندہ رہنے کے لیے سانس لینے پہ مجبور ہوتا ہے' تو یہ تو خالص طبعی اور دنیاوی چیز ہے کیونکہ پانی اسے بھی پینا ہی پڑتا ہے' کچھ نہ کچھ اسے بھی کھانا ہی پڑتا ہے خواہ' بقول ان کے انہیں چالیس دن کے بعد ایک جو کا ٹکڑا ہی کیوں نہ کھانا پڑے' پھر بھی تو قابلِ نفرت چیز کا استعمال کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر قرآنِ کریم اس سے آگے جاتا ہے۔ جہاں تک آپ کو کرنا پڑتا ہے وہاں تک تو وہ ٹھیک ہے۔ اس سے آگے ہر شے قابلِ نفرت ہے' قابلِ ترک ہے۔ کیوں؟

آخر کار کائناتی قوانین کو ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے

اگلی مثال میں یہ کہتا ہے: وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا (18:45) اس شخص کا ایسا انجام کیوں ہوا؟ اس لیے کہ اس نے اپنی نگاہ صرف مفادِ عاجلہ (Immediate Gain) پر رکھی۔ اس طبعی زندگی کو منتہا سمجھ لیا اور ان قوانین خداوندی کو نظر انداز کر دیا' جن سے دنیا اور آخرت دونوں سنورتے ہیں۔ اس قسم کی روش اختیار کرنے والوں کی زندگی کی مثال یوں سمجھو کہ ان کے نظریے کے مطابق كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ (18:45) آسمان سے بنجر زمین یا بارانی زمین پر بارش برسی' پانی زمین میں پیوست ہوا اور اس میں خود بخود کچھ اگ آیا۔ یعنی زمین کی روئیدگی اس پانی کے ساتھ مل کر بڑھی' پھولی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اب یہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ اس کے لیے انہیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ یہ چیزیں خود بخود زمین میں سے اگ آئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے یہاں تک تو ہوا۔ اب اگر اس کھیتی کی طرف سے بے اعتنائی برتی جائے' اس کی حفاظت نہ کی جائے' اس اگ آنے کے

بعد جو باقی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں وہ نہ کی جائیں تو کہتا ہے: فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (18:45)۔تو کچھ دنوں کے بعد دیکھیں گے کہ وہ روئیدگی بالکل سوکھ کر گھاس ہو جائے گی اور اس کے بعد ذرا سی تیز ہوا آئے گی' اس خشک گھاس کو اڑا کر لے جائے گی۔ اس لیے یہ چیزیں' جو قانونِ طبعی کے مطابق حصہ دیتی ہیں' ان میں قوانین کی آخری حد تک پابندی کرنا پڑتی ہے پھر جا کر یہ اپنا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرتی ہیں' پھل دیتی ہیں کیونکہ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (18:45) یہ سب قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے جس پر اسے پورا پورا کنٹرول ہے۔اب اس مثال میں کسان نے تو کھیتی کے اگ آنے کو کافی سمجھا اور اس کے بعد قانونِ خداوندی کے مطابق کھیتی کی نگہداشت نہ کی تو اس کا انجام یہ ہوا۔اس مثال کے مطابق یہ سمجھو کہ اگر انسان صرف طبعی قوانین کے مطابق چلے اور خدا نے انسانی دنیا کے متعلق جو راہنمائی' وحی کے ذریعے دی ہے' اسے نظر انداز کر دے' تو اسے طبعی قوانین کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ تو مل جائے گا لیکن اس کی انسانی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے تو ایسے قوانین بنا دیئے ہیں جن کا ہر شے کے اوپر کنٹرول ہے۔

ہمارے ہاں کے عام تراجم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے عام ترجمے میں تو آپ وہی کچھ دیکھیں گے کہ صاحب! بارش ہوتی ہے' کھیتی اگتی ہے اور اس کے بعد خدا اس کھیتی کو مرجھا دیتا ہے اور اس کے بعد ہوائیں اڑا کے لے جاتی ہیں اور پھر دیکھیے کہ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (18:45)۔ اللہ ہر شے کے اوپر قدرت رکھتا ہے۔یعنی وہ خود ہی بارش برسا دیتا ہے اور جب وہ اُگتی ہے تو جھکڑ چلا دیتا ہے کہ ساری تباہ ہو جائے۔بھئی! یہ کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ جی! خدا ہر چیز کے اوپر قادر ہے۔غور فرمایا کہ بات کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے۔

اشیائے کائنات کے متعلق قرآن حکیم کی تعلیم

اب قرآن کے مطابق اسلام کا نقطۂ نگاہ دیکھیے۔میں نے کہا ہے کہ قرآن افراط و تفریط کی دونوں Extremes کی طرف جانے والوں کو کھینچ کر لاتا ہے اور کہتا ہے کہ اعتدال کا راستہ اپناؤ یعنی صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) ہے اور وہ یہ ہے کہ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (18:46)۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ طبعی زندگی (Physical Life) اور دنیاوی زیب و زینت کی چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان نفرت کرے۔بالکل نہیں۔دولت' اولاد' سب حیاتِ ارضی کی زیبائش کی چیزیں ہیں۔عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ قرآن نے مسلکِ خانقاہیت کو کاٹ کے رکھ دیا۔دنیا اور دنیاوی زندگی' اس کا مال' یہ بال بچے' یہ اہل و عیال کی زندگی' اس کی زیبائشیں' اس کی آرائشیں' یہ سب ایسی ہیں کہ جنہیں حاصل کیا جائے۔ان دنیاوی زیبائش و آسائش و زینت کی چیزوں کے بارے میں قرآن نے کس قدر واضح الفاظ میں کس قدر دھڑلے سے کہا ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7:32) کہ اے رسول! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے' وہ ایسا شخص کون ہوتا ہے' جو دنیاوی زندگی کی زینت و آرائش و زیبائش و

آسائش کے لیۓ، جو کچھ ہم نے بنایا ہے، حرام قرار دے۔ وہ کون ہے کہ جو یہ کہے کہ یہ حرام ہے۔ صاحب! ایک ہی فقرے میں قرآن کریم نے سارے مسلکِ خانقاہیت کے بنیادی تصور کو جڑ سے کاٹ دیا۔ جب کہ وہ صاحب شریعت وطریقت اسے قابلِ نفرت کہتے تھے اسے حرام قرار دیتے تھے۔ قرآن نے کس زور سے یہ کہا گیا ہے کہ پوچھو، ایسا کہنے والا کون ہے، کسے یہ قدرت حاصل ہے کہ جسے ہم نے قابل زینت بنایا، وجہ زیبائش بنایا، تو اسے قابلِ نفرت قرار دے، اس سے اوپر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ہم پہ حرف آتا ہے کہ جنہوں نے اسے قابل نفرت بنایا ہے۔ یہ ہم نے بنایا ہے۔ قرآن کا بات کہنے کا کیا انداز ہے۔ ان چیزوں سے نفرت اور نفرت کی تلقین کرنے والے کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ ان چیزوں کے بنانے والے کو ہدفِ تنقید کر رہے ہیں کہ اس نے قابلِ نفرت چیزیں دنیا میں پیدا کی ہیں۔ خدا ہی کے مقرب بنتے ہو اور خدا کے متعلق تم یہ تصور بیدار کرتے ہو۔ ان لوگوں نے کبھی نہیں سوچا کہ ان چیزوں کو قابل نفرت قرار دینے سے ان چیزوں کے بنانے والے کے متعلق دنیا میں کیا تصور قائم ہوتا ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7:32)۔ اے نوع انسانی! یہ غلط تصور ہے کہ خدا کی اطاعت کے لیے ترکِ دنیا، ترکِ لذت، ترکِ زیبائش و آرائش ضروری ہے۔ دنیاوی زیب وزینت خدا کی اطاعت کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اس اطاعت سے خود زیب وزینت کے پہلو ابھرتے ہیں کیونکہ خدا کے قوانین کی اطاعت کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہونا ہے۔ یہاں نہایت خوشگوار کھانے پینے کی چیزوں کو زینۃ اللہ کہا ہے۔ قرآن کریم نے زینت کا لفظ کہہ کے، طیبٰت من الرزق کہہ کے، اس کے اندر زندگی کے دونوں گوشے شامل کر دیئے: وہ چیزیں کہ جن پر صرف زیست کا دارومدار ہے اور وہ چیزیں کہ جو آرائش وزیبائش کی ہیں۔ انسانی زندگی کے دونوں ہی تو پہلو ہوتے ہیں۔ دونوں گوشوں کے متعلق یہ کہہ دیا کہ کون ہے جو ان کو حرام قرار دیتا ہے۔ تو یہ مسلکِ خانقاہیت تو یوں جڑ سے کٹ گیا۔

ضروریاتِ زندگی کے دو پہلو

اب Materialism آ گیا کہ ٹھیک ہے، یہ دنیاوی زندگی ہے، یہ اس کی متاعِ حیات ہے، یہ جن چیزوں کے اوپر زندگی کا مدار ہے یہ رزق ہے۔ وہ چیزیں، جن میں جمالیات کا پہلو ہے، تحسین کا پہلو ہے، آرائش وزینت کا پہلو ہے، وہ بھی اسی طبعی زندگی کے متعلق چیزیں ہیں۔ تو قرآن نے کہا کہ ہم یہی کچھ تو کہتے ہیں۔ پھر کہا کہ اگلی بات بھی ہے کہ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (18:46)۔ یاد رکھو کہ یہ تمام چیزیں تغیر پذیر ہیں، فنا آمادہ ہیں، وہ چیزیں جو باقی رہنے والی ہیں اگر انہیں اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے گا تو پھر یہی رزق کہا جائے گا کیونکہ خدا کے قوانین کے مطابق ملتا ہے۔ یہ وہ ہے کہ جو اس میں سے تمہیں بہترین حصہ ملے گا یا جو بہترین معاوضہ ملے گا۔ اسے آپ ثواب کے معنی میں کر لیجیے۔ اس طرح سے کہا کہ زیب وزینت کی اپنی چیزوں کو مقصود ومنتہیٰ نہ سمجھ لیا جائے۔ یہ سب تغیر پذیر چیزیں ہیں۔ نا قابل تغیر اور باقی رہنے والی، وہ متاع حیات ہے جس سے اللہ کے ربوبیت

کے قوانین کے مطابق انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ یہی وہ گراں بہا متاع ہے جس سے انسان کو اپنی بہترین توقعات وابستہ رکھنی چاہئیں۔ یہی ہیں وہ چیزیں کہ جن کے متعلق تمہارا انجامِ کار اچھا ہوگا۔ زندگی کا یہ نظریہ' یہ تصور' یہ مسلک کہ رزق کی وہ چیزیں جن پہ زندگی کا دارومدار ہے' زینت و آرائش کی وہ چیزیں جن کا تعلق انسانی ذوق کی تسکین ہے' یہ تمام چیزیں تمہیں ملیں لیکن ان کے ساتھ اقدارِ خداوندی کی حدود ضرور مقرر ہونی چاہئیں۔ یہ ہیں وہ چیزیں جن کا شمار صٰلحٰت میں ہوتا ہے' جن سے انسانی ذات کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں' جن سے کائنات کا حسن سنورتا ہے' جن سے خود انسانی زندگی (18:34) بہتر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو متاعِ حیات کو اقدارِ خداوندی کے تابع رکھنے سے ملتی ہیں: خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا (18:46) خدا کے ہاں سے تم جو بدلہ چاہتے ہو' جو معاوضہ چاہتے ہو' اس کے لیے تو یہ صورت ہوگی کہ زندگی کی تمام چیزیں' خواہ وہ زیست سے متعلق ہوں یا حسنِ ذوق سے متعلق ہوں' ان تمام کو حاصل کرو اور پھر ان کا استعمال قانونِ خداوندی یا اس قانون کی حدود کے تابع رہ کر کرو۔ یہ ہیں وہ جن کا بہترین بدلہ بھی ہوگا اور پھر یہی وہ چیز ہے جن کا مال نہایت اچھا ہوگا۔ اپنی بہترین توقعات انہی سے وابستہ رکھو۔

تغیر پذیر اور تغیر نا آشنا کی حقیقت

یہ جسے ہمارے ہاں فنا یا بقاء کا لفظ کہا جاتا ہے۔ تو عام تصور کی رو سے فنا تو وہ ہوتا ہے جو ختم ہو جائے' اور بقا ہم اسے سمجھتے ہیں جو باقی رہنے والا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ انجامِ کار تو یہی ہوتا ہے لیکن اس کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔ ''فنا'' وہ چیز ہوتی ہے جو ہر آن' ہر لمحہ' ہر لحظہ' تغیر پذیر ہو اور ''باقی'' وہ چیز ہوتی ہے' جو تغیر نا آشنا ہو۔ انسانی زندگی ہر آن تغیر پذیر ہے۔ یہ تو ابتدائی میڈیکل سائنس کا سٹوڈنٹ بھی جانتا ہے کہ اس میں (Change) کا پروسیس (عمل) جاری ہے۔ ہر سانس میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اس بدن کے سیل ضائع ہوتے رہتے ہیں اور اس میں نئے سیلز بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اندر اتنا تغیر واقع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر تین یا زیادہ سے زیادہ سات سال کے بعد' انسان کا جسم کلیتًا سارے کا سارا بدل جاتا ہے۔ یہ ہے جسے آپ کہیں گے فانی یا فنا ہونا' تغیر پذیر ہونا۔ اس کے بعد آج کی سائنس ہی اس بات پر پہنچی ہے کہ انسان کے اندر بیشک ایک ایسی چیز ہے جو شروع سے آخر تک تغیر نا آشنا رہتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے' جسے انسان آج ذات یا ''میں'' کہہ کر پکارتا ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے کی زندگی کے کسی واقعہ کو بھی وہ بیان کرتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ ''میں'' نے وہ کیا تھا' ''میں'' نے یہ کہا تھا۔ اگر یہ ''میں'' صرف اس کا جسم ہی ہوتا تو وہ اس دوران میں اگر بیس دفعہ نہیں تو کم از کم سات آٹھ دفعہ اور کا اور ہو چکا ہوا ہے۔ یہ ''میں'' کون کہہ رہا ہے کہ میں نے ہی یہ کچھ کیا تھا۔ وہ یہ کہتا ہی نہیں ہے بلکہ آج سے چالیس سال پیشتر اس کہنے کے عمل پر' اس کرنے پر' اس نے جو کیفیت محسوس کی تھی' وہ اس کی یاد تازہ کرتا ہے تو وہ ساری کیفیت بھی اسی طرح سے تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ جسے (Berg son: 1859-1941) برگسان Changelessness in change کہتا ہے' یہ ہے جسے

آپ بقاء کہہ سکتے ہیں یعنی باقی رہنے والی چیز' یعنی جس میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ دنیا' دنیا کی متاع' اس کی زینت کی چیزیں' یہ جتنے اسبابِ زندگی ہیں' یہ سارے کے سارے تغیر آشنا ہیں۔ ان میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں لیکن انسان کے اندر ایک شے ایسی ہے جس میں تغیر نہیں آتا۔ یہ اقدارِ خداوندی ہیں جن کی رُو سے وہ شے زندہ رہتی ہے' آگے بڑھتی ہے اور اس میں تغیر واقع نہیں ہوتا حتیٰ کہ جب جسمِ انسانی میں ایسا تغیر آ جائے گا جسے آپ کہیں گے' فنا ہو گیا' موت آ گئی' Disintiegrate ہو گیا' باقی نہ رہا' وہ شے (Entity) اس وقت بھی باقی رہتی ہے' آگے چلتی ہے بشرطیکہ صٰلحٰت یعنی اس میں اس کی صلاحیت پیدا کر دی جائے۔ اس میں آگے چلنے کا' باقی رہنے کا امکان ہے بشرطیکہ اقدارِ خداوندی کی رُو سے استحکام کی صلاحیت پیدا کر دی جائے۔

حیاتِ جاوداں کا تصور اور اس کا حصول

اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) کے الفاظ میں یہ حیاتِ جاوداں as of right' بطورِ حق' کے نہیں ملتی ہے۔ یونہی ہر انسان کو بطور اس کے حق کے نہیں مل جاتی' اسے اختیار کرنا پڑتا ہے' اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہی ہے وہ جسے خدا نے باقیات کے ساتھ' صٰلحٰت کے ساتھ' فراہم کیا ہے۔ اور عملِ صٰلحٰت سے تو سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ بہرحال یہ وہ چیز ہے جو تغیر نا آشنا ہوتی ہے اور یہی ہے وہ جسے آپ اپنے نشوونما دینے والے کی طرف سے بہترین معاوضہ قرار دیں گے۔ دیکھیے ثواب کا لفظ کہاں آیا ہے۔ اس کا اگلا حصہ ہے: **وَّخَيْرٌ اَمَلًا** (18:46) اور یہی ہے کہ جس کا مال اچھا ہو گا۔ آپ دیکھیے اس میں دونوں چیزیں آ رہی ہیں: دنیاوی متاع اور زیبائش اور آرائش کی چیزیں۔ دیکھیے یہ زیبائش و آرائش کی تمام چیزیں بھی قابلِ نفرت نہیں ہیں۔ ان کی تو حد ہی موجود ہے کہ کون ہے جو زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے لیکن اگر آپ خالصتاً مادیت کے اندر آ گئے' سیکولرازم کے اندر آ گئے کہ جس میں انسانی زندگی کا منتہیٰ ہی یہی روٹی' کپڑا' مکان ہے کہ کھایا پیا افزائشِ نسل کی اور اس کے بعد مر گئے۔ کہا یہ بات بھی غلط ہے۔ اگلی ساعت یہ چیز ہے کہ: **وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ** (18:46) اگر انہیں اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے' جسے ایمان یا اعمالِ صالح کہتے ہیں تو پھر یہ انسان تغیر نا آشنا ہو جاتا ہے اور یہی ہے جس کا مستقبل ''خیر'' کا مستقبل ہوتا ہے۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ واجب التکریم ہے

اب یہ سوال ہوا کہ جہاں سے یہ معاشرہ شروع ہوا تھا' اس میں تو یہ بڑے بڑے مفاد پرست تھے (اور ہیں) کہ جنہوں نے دنیا کے ان تمام ذرائع و سرچشمۂ زیست پر کنٹرول کر رکھا ہوتا ہے' ان پہ اپنا قبضہ جما رکھا ہوتا ہے' جس سے عوام کو غریب اور ضعیف بنایا جاتا ہے۔ یہ غریب اور ضعیف وہ نہیں ہیں کہ جو ہندو مت کی طرح برہما کے پیدا کردہ ہوتے ہیں کہ ''برہما سر سے پیدا کیا جاتا ہے اور شودر پاؤں سے پیدا کیا جاتا ہے۔'' قرآن کی رو سے پیدائش کے اعتبار سے ہر ابنِ آدم یکساں واجب التکریم ہے۔ اب جنہیں ہم یہ کہتے ہیں اور قرآن

بھی کہتا ہے کہ یہ وہ ہیں جو روندے گئے ہیں، دبائے گئے تو یہ نہیں ہے کہ خدا نے انہیں پیدا ہی اس طرح سے کیا تھا بلکہ بات یہ ہے انہوں نے انہیں ایسا بنا دیا ہے۔ وہ حضرتِ عمرؓ کا قول جو انہوں نے بناس کو لکھا تھا: "ماؤں نے تو اپنے بچوں کو آزاد جنا ہے، تم انہیں محکوم بنانے والے کون ہوتے ہو، کیونکہ میں نے یہ سنا ہے کہ تم مزے میں اندر بیٹھے ہوئے ہوتے ہو اور جو لوگ تم سے ملنے کے لیے آتے ہیں، تم انہیں باہر ڈیوڑھی میں انتظار کے لیے بٹھائے رکھتے ہو، ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا تم کون ہوتے ہو ان کو غلام بنانے والے؟ قرآن جہاں جہاں ان غریب وضعیف لوگوں کا ذکر کرے گا کہ جنہیں روندا گیا ہے تو وہ ہندومت کا نظریہ نہیں ہے کہ برہما نے شودر پیدا کیے ہیں، اس لیے انہیں روندا ہی جانا چاہیے۔ اور ہندومت ہی کیا، میں نے کہا ہے فکرِ انسانی تو ہمیشہ اسی طرح جھولے جھولتی رہی ہے۔ آپ نے داستانِ فرعون میں دیکھا کہ فرعون اپنے پروہتوں کی شکست پر غصے سے لال پیلا ہوا اور ان پر برس پڑا۔ انتہائی غیظ وغضب میں گرج کر بولا کہ تم میری اجازت کے بغیر ہی موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے۔ ان پروہتوں نے اس کڑک اور گرج کو دل کے پورے سکون کے ساتھ سنا اور نہایت اطمینان سے کہا کہ تم جو جی میں آئے کرو۔ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اب ہماری نگاہ کا زاویہ بدل چکا ہے۔ ہماری تمام توجہات اپنے نشوونما دینے والے کی طرف مرکوز ہیں۔ صحیح منزل آشکارا ہو کر ہمارے سامنے آچکی ہے اور ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔ تم ہمیں بے گناہ قرار دو یا مجرم اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم خدا کے حضور جائیں تو اس کے سامنے مجرم نہ قرار پائیں۔ (26:50)۔

افلاطون اور ارسطو کا نظریہ

دنیا کے مفکرین یا حکماء کے ابوالآباء یونان کے حکماء ہیں۔ ان کی طرف دیکھیے یہ ہیں: افلاطون، (Plato c. 428-347 B.C.) ارسطو (Aristotle- 384BC to 322 B.C.) یہ لوگ غلامی (Slavery) کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ غلام پیدائشی غلام پیدا ہوتا ہے۔ ان کا Belief یہ تھا کہ اگر غلام کو اچھا منصب دے دیا جائے تو وہ اس میں خوش رہ ہی نہیں سکتا، وہ اس میں فِٹ نہیں آتا۔ یہ تو علم منطق تھا، ارسطو تو منطق کا بادشاہ ہے اور اسی کے منطق نے تو دنیا کو ایک حد تک تباہ کیا ہوا ہے، جو منطقی دلیل ہے، عام طور پہ اس کا توڑ نہیں ملتا۔ بات یہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو پیدائشاً غلام ہوتے ہیں، انہیں اگر آپ اچھا مرتبہ دے دیں تو وہ بھی اس پہ خوش نہیں رہتے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے اگر پاؤں ٹیڑھا ہو اس کو جوتا سیدھا دے دیا جائے تو اسے پہننے سے پاؤں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اسے کہتے ہیں منطق۔ آپ نے دیکھا کہ پہلے خود مفروضہ قائم کیا ہے کہ غلام پیدا ہی غلام ہوتا ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کو غلام نہ رکھیں، اس کو آزاد کر دیں اور اس کے بعد منطقی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بتائیے، جو پاؤں ٹیڑھا ہوا گر اس کو سیدھا جوتا پہنا دیا جائے، تو کیا اس پاؤں کو تکلیف نہیں ہوگی؟ کہا: ضروری ہوگی۔ اب اگر جنابِ ارسطو کو آگے سے کہنے والا کوئی نہیں تھا کہ صاحب! آپریشن کر کے پاؤں کیوں نہ سیدھا

کر دیا جائے۔ یہ جو ٹیڑھا تھا' وہ خدا نے پیدا نہیں کیا تھا' وہ تمہاری عدمِ احتیاط کیوجہ سے تھا کہ وہ ٹیڑھا ہو گیا۔ اب اس میں اپنا یہ قانون رکھا ہے۔ اپنا کہ ٹیڑھے پاؤں سیدھے کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ جو ٹیڑھا پیدا ہو گیا' اس کو سیدھا جوتا نہیں دیا جا سکتا' اسے ٹیڑھا جوتا ہی دینا چاہیے۔ وہ تو بات میں بات آ گئی کہ قرآن جب اسطرح کا ذکر کرتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے تمہارے معاشرے نے ایسا بنا دیا ہے۔ اب وہ یہاں اس معاشرے کیطرف آتا ہے۔

قرآن حکیم کے آخری دو پاروں کی اہمیت

یہاں میں اتنا عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم میں یہاں تک تو نصفِ قرآن کریم کی یہ آیات آ گئی ہیں یا آئیں گی آخری پارہ کے اندر' تیسویں پارے کے اندر' آپ کو معلوم ہے' آیا ہے کہ ''یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں' زمین ٹوٹ جائے گی' ستارے تاریک ہو جائیں گے' آسمان پھٹ جائے گا'' یہ سب چیزیں' اس سے پیشتر پہلے دورِ درس کے دوران' ہم جب تیسویں پارہ پہ آئے تھے تو آئی تھیں۔ شاید یہ چھ مہینے میں ختم کیا تھا' اس میں تو قرآن کا نچوڑ آ گیا ہوا ہے' اس دورِ درس میں یہ تمام چیزیں آئی تھیں۔ اس ضمن میں ایک چیز تو یہ ہے کہ کائنات یا ہمارا کرہ ارض یا یہ جتنے مادی کرہ ہیں' یہ بہر حال ایسے تو ہیں نہیں کہ ابدالآباد تک رہیں گے جیسے کہ خدا کی ذات ابدی ہے' وہ تو ابد الآباد رہے گی' لہٰذا یہ صورت تو ہے نہیں۔ اب تو سائنس کی تحقیقات بھی کہہ رہی ہیں کہ رفتہ رفتہ ان کروں (Spheres) کے اندر بھی زوال آنا شروع ہو گیا ہوا ہے۔ انہوں نے تو ایک دن مٹنا ہی ہے۔ اس لیے اگر قرآن کی آیتوں کے ان الفاظ کو مجازی طور پر لیا جائے گا تو ان سے قوموں کے داخلی انقلاب یا حیاتِ اخروی کے کوائف کا تصور سامنے آتا ہے۔ اگر ان آیات کے الفاظ کو لغوی طور پر لیا جائے تو جبال سے مراد یہ پتھر کے پہاڑ ہیں' عرش سے مراد یہ زمین ہے' چاند اور ستارے یہی کرے ہیں۔ ان کا پھٹنا وہی طبعی طور پر ہے' ان کا ریزہ ریزہ ہونا روئی کے گالے کی طرح ہو جانا' طبعی طور پر ہے تو اگر کوئی ان کے وہی لغوی معنی لیتا ہے تو بھی اس مادی کائنات کا معاذ' انجام' یہی ہونا ہے۔ یہ خارجی کائنات میں انقلاب ہوگا جس میں ایسے حوادث ظہور میں آئیں گے جن سے یہ سارا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا۔

عزیزانِ من! اگر ان متعلقہ آیات پر غور و تدبر کیا جائے تو ذہن تین قسم کے انقلات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ایک خارجی کائنات میں انقلاب ہے جس میں طبعی حوادث ہوں گے' جن سے یہ سلسلہ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ دوسرا انقلاب وہ ہے جو اقوام کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ انقلاب خود رسالت مآب میں رونما ہوا اور اس کے بعد اس دور میں رونما ہو سکتا ہے جس میں باطل کے نظام کی جگہ قرآنی نظام قائم کیا جائے۔ اس سے اقوام کی تمدنی' سیاسی' معاشی' معاشرتی' زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے اور تیسرا انقلاب وہ ہے جس کا تعلق موت کے بعد کی زندگی سے ہے۔ اس زندگی میں انسانی تصور کی سطح بدل جائے گی اور زمان و مکان کا تصور اور ہو جائے گا۔

عربوں کے ہاں مجازی مفہوم کا استعمال

عربوں کے ہاں یہ الفاظ مجازی طور پہ استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح وہ اور معنوں میں بھی ان چیزوں کو لیتے تھے مثلاً پہاڑ یعنی

جبال سے مراد ان کی یہ ہوتی تھی ''کہ یہ بڑے بڑے سردارِ قوم ہیں جن کے پاؤں زمین میں بڑے گڑے ہوئے ہوں' جبال سے وہ قوت ہوتی تھی جس سے ہر وہ شے جو پاؤں کے نیچے آتی ہے تو وہ اسے روندتے چلے جاتے ہیں۔'' وہ عوام اور غریبوں کے طبقے کو ارض کہا کرتے تھے۔ ان پہاڑوں کا اپنی جگہ سے ہل جانا ان کی سرداریوں کا کا ختم ہو جانا ہوتا تھا اور ان کا ابھر آنا وہ ان عوام کے قیام کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ یہی الفاظ ان مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں' ان سے یہ دونوں ہی معنی لیے جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی ترتیب کا انداز نصابی کتب (Academic Books) کا سا ہے۔ ابتدائی پاروں میں' حقائق کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ پھر جوں جوں طالب علم آگے بڑھتا ہے' حقائق زیادہ اور تفصیل کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری پاروں خاص کر تیسویں پارے میں حقائق یوں اختصار سے سمٹ گئے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں آسمان سما جاتا ہے۔ دو دو تین تین الفاظ کی آیات ہیں لیکن اپنے اندر گنجینۂ معانی لیے ہوئے ہیں۔ یہ ارتکاز (Concentration) ان الفاظ کے مجازی معانی میں ہی کھل کر سامنے آسکتا ہے۔ میں نے قرآنِ کریم میں جہاں جہاں یہ الفاظ آئے ہیں وہاں میں نے اسی اعتبار سے ان کے معنی ''مفہوم القرآن'' میں بیان کیے ہیں۔ اب یہاں اس ٹکراؤ کا ذکر چلا آرہا ہے جس میں یہ دونوں نظریاتِ زندگی قرآن نے بتائے ہیں۔ کہا کہ اس ٹکراؤ میں سرداران قوم' جبال' ختم کیے جائیں گے' ان کا یہ نظام ختم ہو جائے گا اور ان کے بجائے ایک نیا نظام قائم کیا جائے گا۔ اس نظام کی پہلی چیز یہ ہوگی: وَيَـوْمَ نُسَيِّـرُ الْـجِبَـالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً. وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (18:47)۔ میں مجاز کے معنوں کی رُو سے یہ مفہوم بیان کررہا ہوں کہ وہ دور اب آنے والا ہے کہ یہ بڑے بڑے سردار' جو اس طرح سے اپنے پاؤں گاڑے بیٹھے ہوئے ہیں' اپنے مقامات سے ہلا دیئے جائیں گے' یہ پستی میں گرے ہوئے عوام کہ جو پاؤں تلے روندے جانے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ بارزۃً۔ ان کی نمود ہوگی۔ وہ ابھر کے اوپر آجائیں گے۔ اور یہ انقلاب کسی خاص مقام میں نہیں ہوگا یا یہ نہیں ہوگا کہ ان میں کچھ طبقے ایسے ہو جائیں جن کی نمود ہو جائے اور کچھ یونہی پاؤں تلے روندے ہوئے ہیں۔ رہ جائیں۔ یہ ایسی صورت نہیں ہوگی' یہ ایک کُلی انقلاب آئے گا۔ ان میں سے کسی کو بھی اس کی موجودہ حالت میں نہیں چھوڑا جائے گا۔ یہ انقلاب یہاں بھی آئے' جس مقام میں بھی آئے' اس کے متعلق کہا کہ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ ان بڑے بڑے سرداروں کو چھوڑ دیا جائے اور ان روندے ہوئے متبع عوام کو پکڑ لیا جائے۔ اب ہمارے ہاں تو جو اصلاحات بھی ہوتی ہیں ان میں اس قسم کی گنجائشیں رکھ دی جاتی ہیں کہ جنہیں درمیان سے چھوڑنا ہو' انہیں چھوڑ بھی دیا جائے۔ اور جنہیں گرفتار بلا رکھنا ہو' انہیں رکھ لیا جائے اس طرح ان میں کئی راستے رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہاں ایک جہانِ نو پیدا ہوگا

قرآن کہتا ہے کہ جو ہمارا لایا ہوا انقلاب ہوگا اس میں یہ کیفیت نہیں ہوگی۔ وَّحَشَـرْنٰهُـمْ فَلَـمْ نُـغَـادِرْ مِـنْهُـمْ اَحَدًا (18:47) یہ جو نیا نظام ہوگا اس میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہوگا' جو اس انقلاب کی زد سے بچ جائے' کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا۔ وہی ہیں یہ

جسے آپ آج کی اصطلاح میں سرمایہ دار، جاگیر دار، صاحبِ اقتدار کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ جو آپ کہتے ہیں، یہ جبال ہیں، یہ پہاڑوں کی طرح کھڑے ہیں۔قرآن نے کہا کہ اس قسم کا انقلاب ہوگا۔ایسا نہیں ہوگا کہ اس میں سے کچھ تو ہمارے قابو آجائیں اور کچھ اس میں سے چھوٹ جائیں یا الگ رکھ دیئے جائیں۔قطعاً نہیں۔ یہ بھی نہیں ہوگا کہ جنہیں ہم پاؤں تلے روندے جانے والے عوام کہتے ہیں، انہیں ہم اٹھائیں اور ان میں سے کوئی ایک خاص طبقہ جو ہمارے نزدیک مقرب ہو، صرف اسے اٹھا دیں اور باقی بیچارے پہلے سے بھی زیادہ عمیق گڑھے بن جائیں، یہ قطعاً نہیں ہوگا۔ بلکہ ہوگا یہ کہ: وَعُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا (18:48) یہ سب کے سب ہمارے حضور آ کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ ہے وہ مساوات جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کچھ ہوگا اس انقلاب میں۔عزیزانِ من! ہمیں تو تاریخ بتاتی ہے کہ حضور رسالت مآب کے دورِ ہمایوں میں یہ انقلاب آیا۔ پہلے تو، ان بڑے بڑے پہاڑوں کے متعلق، تاریخ بتاتی ہے کہ کہا جاتا تھا کہ ''ہمیں یہاں سے کون ہلا سکتا ہے''۔ ایران کی مملکت اور رومن کی مملکت کے اتنے اتنے جید، اور اُدھر خود عربوں کے اندر کے یہ قریش اور ان کی سرداریوں کو جڑ سے اکھیڑنا تو رہا، ایک طرف، ان کے حیطۂ تصور میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ ہمیں کوئی ہلا بھی سکے گا۔ لیکن ایسا کچھ ہوگیا۔تاریخ عالم میں اس انقلاب کے نقوش محفوظ ہیں۔

شہنشاہِ ایران یزدگرد کا انجام

میں کہتا ہوں کہ کوئی مفکر نہ سہی، عوامی ہی سہی، ایران کی ہزارہا سال کی تاریخ سامنے رکھ کے تصور میں بھی لا سکتا تھا کہ وہ جو ایران کا خسرو ہے، یزدگرد جیسا شہنشاہ جس کی ایک دنیا کے اوپر دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اپنی جان بچانے کے لیے مارا مارا پھرتا ہوا چھپتا پھرے گا اور بالآخر اس کو پناہ کی کوئی جگہ نہیں ملی۔عربوں کے ساتھ جنگ میں اس کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ ایک پن چکی میں جا کے چھپا، وہ پن چکی والا آیا۔اس نے دیکھا کہ کوئی چھپ کے بیٹھا ہوا ہے۔ پوچھا تو اس نے جھوٹ بول کے یونہی کہہ دیا کہ ''ایک مسافر تھا، راستہ بھول گیا، رات سردی تھی، میں نے رات بسر کی۔ پتہ نہیں اس نے کہیں اس کی تصویر دیکھی ہوگی یا ویسے ہی کہیں دیکھا ہوگا۔اس نے کہا کہ ''نہیں صاحب! یہ بات تو نہیں ہے، تم تو یزدگرد ہو، تم نے جو ہم پہ مظالم کیے ہوئے ہیں، آج ان کے بدلہ لینے کا وقت آ گیا، بس پھر کیا تھا اسے وہیں پن چکی میں مار دیا۔دیکھیے ایران کا شہنشاہ پہاڑ کی طرح اپنے مقام پہ مستحکم اور یہ انجام! قرآن اسے نسیر الجبال کہتا ہے۔قرآن کریم نے یہاں کیا لفظ استعمال کیا ہے! مارا مارا بھاگا بھاگا پھرے گا۔ پہاڑ کی طرح جو اپنے آپ کو آج مستحکم، محکم اور خود خزیدہ کہہ رہا ہے، کہیں بھی پناہ کی جگہ نہیں۔اسے کہتے ہیں کہ کسی کو بھی نہیں چھوڑا جائے گا۔

مساوات انسانی کی لازوال مثال

اب ذرا دوسری جانب مساواتِ انسانی کی ایک لازوال مثال بھی دیکھیے: عوام میں سے عوام ہی کا صہیب رومی رضی اللہ عنہ جیسا ایک

مزدور، انہی عوام میں سے بلالِ حبشی رضی اللہ عنہ جیسا ایک غلام۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ ''وہ چلے آ رہے ہیں گویا کہ یہ سردار آنے والا ہے۔'' اب جو وہ ادھر اسلام لائے تو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کہہ کے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا امیر المؤمنین وہ اپنی شہادت کے آخری وقت میں اس سوال پر کہ نمازِ جنازہ کون پڑھائے، یہ کہتا ہے کہ ''اب کیا بتاؤں صہیب رضی اللہ عنہ زندہ ہوتا تو امیر المؤمنین کے جنازے کی نماز وہ مزدور پڑھاتا۔ یہ ہے ایک صف میں کھڑے ہو جانا۔ **وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا** (18:48) اس وقت یہ سب خدا کے نظامِ ربوبیت میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں گے اور معاشرہ کی وہی کیفیت ہو جائے گی۔ **لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ** (18:48) کیا بات ہے اس آیت کی! اس آیت کے عام معنی تو کیے جاتے ہیں کہ جیسے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، ویسے ہی تمہیں پھر پیدا کریں گے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ پہلی مرتبہ زندگی قرآن نے بتائی ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں انسان کی تمدنی زندگی کا ابھی آغاز ہوا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے تمثیلاً قصۂ ابلیس و آدم کی شکل میں بیان کیا ہے۔ وہ جنت ہے کہ جس میں آدم کو رکھا گیا، وہ انسان کی ابتدائی تمدنی زندگی ہے، جہاں سے اس نے مل جُل کر رہنا شروع کیا تھا۔ ابھی ابتداء تھی۔ سامانِ رزق کی فراوانیاں ہے، ابھی میری اور تیری کی لکیریں نہیں پڑی تھیں۔ دو دو چار چار لفظوں میں قرآن حکیم یہ ساری بات کہہ گیا ہے۔ کہا: **وَکُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا** (2:35)۔ جہاں سے چاہو، جب بھی بھوک لگے، اس میں سے کھاؤ۔ کیا بات ہے **حَیْثُ شِئْتُمَا** اس میں کی کیا بات ہے۔ رغداً کی! وہ زندگی کہ ''جہاں کسی کو بھوک لگے وہاں کھانے کو مل جائے، لیکن صرف کھانے ہی کے لیے، ذخیرہ کرنے کے لیے نہیں۔'' یہاں قرآن نے لفظ رغداً استعمال کیا ہے: پیٹ بھرنے کے لیے۔ جہاں نہ تو یہ کیفیت ہو کہ بھوک لگی ہے تو کھانے کو کچھ ہے ہی نہیں، اور کھانے کو تو پھر وہ کسی اور کا ہے اس کا تو یہاں سوال ہی نہیں ہے۔ جہاں بھوک لگی، وہاں سامان کھانے کا موجود ہے، اور نہ ہی یہ بات ہے کہ کسی کی اولاد ہے تو وہ سارا کچھ اس نے ذخیرہ ہی کر لیا ہے۔ یہ وہ بہشت ہے، جس کے متعلق قرآن نے دوسری جگہ کہا کہ ''وہاں نہ بھوک کا خوف ہوگا، نہ پیاس ستائے گی، نہ لباس کے متعلق محتاجی ہوگی، نہ موسم کی شدت سے بچنے کے لیے مکانات کی قلت ہوگی۔'' انسان نے پہلی تمدنی زندگی تو یہاں سے شروع کی تھی۔ زندگی کے اس پہلو پر اتنی ریسرچ ہوگئی ہے کہ یہ تمام پہلو ابھر اور نکھر کر انسان کے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ لوگ خود انسان کی تاریخ کے متعلق اس دور تک پہنچے ہیں جہاں سے اب ہمارے ہاں اشتراک کا نظریہ شروع ہوا، تو اس سلسلہ میں خود ان کے ہاں کی تحقیق یہ ہے کہ پہلے دور کے انسان آج بھی قبائلی زندگی (Tribal Life) بسر کرتے ہیں۔ ان کی زبان اور ان کی لغت میں Possession کا لفظ ہی نہیں ہے، ملکیت کا لفظ ہی نہیں ہے۔ قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ''متاع'' کا لفظ ہے۔ اِن قبائلی لوگوں کے لغت میں صرف یہ ہے کہ ''فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔'' یہ لفظ تو ان کے لغت میں Possession کا لفظ ہی نہیں۔ یہ ہے اس دور کے قبائل جو ابھی تک وہی روایات لیے ہوئے ہیں، ان قبائل کے ہاں کوئی چیز بھی ذاتی نہیں ہوتی، Possession کی نہیں ہوتی۔ یہ وہی ''میری اور تیری'' کی تفریق سے پہلے کا تمدنی دور ہے۔

تیری اور میری کی تفریق سے پہلے کا دور

بہرحال' قرآن نے قصۂ آدم میں ابتدائی نقشہ جو کھینچا تھا وہ یہی نقشہ تھا۔ یہ جو کہا ہے کہ وَعُرِضُوا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا (18:48)۔ اس وقت یہ سب خدا کے نظام ربوبیت میں ایک صف میں چلے آئیں گے تو کہا یہ تھا کہ یہ سب محمود وایاز ہمارے اس حضور کیفیت کو لیے ہوئے کھڑے ہونگے۔ وہ انسان کی تمدنی زندگی کا جو ابتدائی دور تھا' وہ اس دور کو لیے ہوئے ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ جو ابتدائی دور تھا۔ قرآن نے Origin of Man کو بھی Common قرار دیا ہے۔ Community وہیں سے ہے۔ اور اسی طرح سے' قرآن اس انقلاب کے بعد جو اس کا مال بتاتا ہے' وہ بھی اسی اعتبار سے بتاتا ہے کہ یہ انفرادی نہیں ہے' اجتماعی زندگی ہے' جس میں ہر شے Common ہوتی ہے جس میں متاعِ زیست کی چیزیں دی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ یہ وہ دور ہے کہ وہ پھر وہ لوٹ آئے گا۔ عزیزانِ من! اس کے بعد وہ دور لوٹ کے آیا۔

قحط کے دنوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پہلا فرمان خلافت

اس دور میں کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ ایک دفعہ قحط پڑ گیا۔ جب شروع شروع میں قحط پڑا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو باہر کے سارے لوگ جنہیں وہاں کچھ نہیں ملتا تھا' ہجوم کر کے مدینے کی طرف آ گئے۔ اب یہاں مدینہ میں بھی اتنا ذخیرہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنوں کو وہ اس طرح سے کھلاتے چلے جائیں۔ انہوں نے کیا کیا ہے؟ اس کے لیے پہلا فرمانِ خلافت یہ تھا کہ مدینے میں کسی بھی گھر میں الگ سے چولہا نہیں جلے گا' جو جو کچھ ایک ایک وقت کے کھانے کے لیے کسی نے اپنے ہاں رکھنا ہے' وہ سارا یہاں باہر آ یا جائے گا اور یہ جتنا موجود ہو گا وہ سارا مل بانٹ کے کھایا جائے گا۔ اس کام میں سب سے پہلے امیر المؤمنین وہاں موجود تھے۔ ''جیسا ہے وہ ملے گا' جتنا ہے وہ بٹ جائے گا اور سارے ایک ہی صف پہ بیٹھے ہوئے ہونگے۔'' یوں وہ دور آتا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ یہ بھوکے ننگوں کا ہی دور تھا۔

ایک تو اشتراک کی شکل یہ ہے کہ ایک کرتا ہو اور دوسرا آدمی ننگا ہو تو جیسا وہ کہتے ہیں صاحب! اسے چاہیے کہ وہ اسے دیدے۔ اگر یہ اسے دیدے تو یہ خود ننگا ہو جائیگا۔ یہ سوال نہیں ہے۔ اس کے اندر تو دونوں کو کُرتا ملے گا۔ پھر ان کے ہاں وہ دور آیا کہ ہر ایک کو یکساں ملا' ضرورت کے مطابق ملا' یہی تھا پہلا دور رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35)۔ پیٹ بھرنے کے لیے جہاں سے جی چاہے۔ پھر کوئی بھوکا نہیں سویا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ ''جس بستی میں رات کو یہ ہو کہ باقی کھا کے سوئیں اور ایک شخص ایسا بھی ہو کہ رات کو بھوکا سو جائے تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔'' اسی لیے پھر کوئی بھی بھوکا نہیں سویا۔

نظامِ خداوندی کے بغیر آج دنیا بھر کی حالتِ زار

یہ خدا کی حفاظت کس کو ملتی ہے؟ وہاں ملتی ہے جہاں وہ نظام ہو۔ اگر وہ نظام نہ ہو تو دنیا میں کوئی بستی محفوظ نہیں رہتی۔ عزیزانِ من!

آپ کی بڑی سے بڑی مملکتیں' ساری دنیا جن کی مقروض ہے' وہاں کیا ہو رہا ہے؟ آپ جا کے پوچھیے کہ امریکہ میں آج کیا حال ہو رہا ہے' رشیا میں کیا حال ہے۔ جسے آپ خدا کی حفاظت کہتے ہیں وہ حفاظت اٹھ گئی ہے۔ وہاں ڈرا ہوا ہر شخص کانپ رہا ہے۔ آج دنیا میں ہر انسان سہا سہا پھر رہا ہے۔ آج ساری دنیا سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھ گئی کیونکہ وہ نظام کہیں قائم نہیں رہا۔ ہر شخص ڈر رہا ہے۔ جو طاقتور ہے' وہ بھی چھاتی پہ بیٹھا ہوا ڈر رہا ہے اور وہ جو نیچے ہے' وہ تو نیچے ڈرنے والا ہے ہی۔ جسے حفاظت کی ذمہ داری کہا گیا تھا' اٹھ جائے گی۔ یوں حفاظت کی ذمہ داری اٹھ گئی ہے کیونکہ انہی کے ہاں کی جو تحقیقاتی کمیٹیاں ہیں' جسے وہ WHO کہتے ہیں' جسے World Health Organization کہتے ہیں' ان کی رپورٹ ہے کہ آج دنیا میں رات کو آدھی آبادی بھوکی سو رہی ہے۔ ارے! جس بستی میں ایک بھوکا سو جائے' اس بستی سے حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور جس کرہ ارض پہ آدھی آبادی بھوکی سو رہی ہو تو وہاں کہاں پہ خدا کی طرف سے حفاظت کی ذمہ داری ہو گی؟ وہ ذمہ داری' وہ حفاظت کی ضمانت' آج اٹھ چکی ہوئی ہے۔ آج ہر شخص سہمے ہوئے پھر رہا ہے۔ سلطنتیں سہمی ہوئی پھر رہی ہیں' مملکتیں سہمی ہوئی پھر رہی ہیں' ان کے افراد سہمے ہوئے پھر رہے ہیں۔ اتنی عظیم مملکت کا سربراہ' صدر' اپنی فوج کی جان بچانے کے لیے سہمے ہوئے پھر رہا ہے۔ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا (18:48) یہ بزعمِ خویش سمجھے ہوئے تھے کہ ان سے جو کچھ زبانِ وحی سے کہا جاتا تھا' وہ وقوع میں نہیں آئے گا۔ یہ یونہی دھمکیاں ہی ہیں' ایسا تو کہیں واقع نہیں ہو گا۔ ان سے کہہ دو کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ دھمکیاں نہیں ہیں۔ ایسا ہو کر رہے گا۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ایسا ہوا۔

نظامِ خداوندی کی خصوصیات

وہ کیسے ہو گا؟ قرآن نے کہا کہ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ (18:49)۔ خدا کی کتاب کے مطابق وہ ضابطہ قوانین نافذ کیا جائے گا۔ دیکھیے عزیزانِ من! اگر مجرم کی تخصیص ہو جائے اور جس نے کوئی جرم نہ کیا ہو اس کو کوئی پکڑنے کی جرآت نہ کرے تو وہاں: لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:62)۔ نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامن گیر ہو گا' نہ منزل وجہِ افسردگی بنے گا۔ کیفیت کیوں نہ پیدا ہو گی؟ جب مجرم کی یہ کیفیت ہے کہ اسے نہ تو کہیں پناہ مل سکے' نہ وہ معمون ہی ہو' اور نہ ہی محفوظ ہی ہو تو کہا: فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (18:49)۔ اس ضابطۂ قوانین کے اصول و احکام کو دیکھ کر وہ لوگ لرزاں و ترساں ہوں گے۔ جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر لینے کے عادی تھے' وہ پکار اٹھیں گے۔ یا اللہ! یہ کس قسم کا ضابطۂ قانون ہے' جو بڑے سے بڑا گناہ تو رہا ایک طرف' یہ تو چھوٹے سے چھوٹے جرم کو بھی نہیں بخشتا' یہ تو چھوٹی اور بڑی ہر بات کو محیط ہے۔ یہاں کیا بات ہے یٰویلتنا کی! کیا لفظ ہے یہ! ہماری بدنصیبی' ہماری بدقسمتی' ہماری تباہی' ہماری ہلاکت اور کیا ہو گی کہ یہ ایسا ضابطۂ قانون ہے کہ جس کے تحت چھوٹا جرم ہو یا بڑا جرم ہو' اس پر بھی گرفت ہو اور اُس پر بھی جبکہ غلط معاشرے کے اندر تو

معاملات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ وہاں تو یہ جو غلطیاں ہیں جنہیں جرم بھی کہہ لیجیے جیسے کہ جو برف دو آنے کی بجائے اڑھائی آنے کی بیچتا ہے وہ تو مہنگائی فروشی میں آ جاتا ہے اور اُدھر جو آپ کے ہاں دوائی تک' Life saving drugs تک' جو پہلے دو روپے میں ملتی تھی' اب اس کے پچاس روپے مانگ رہا ہے' اس کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ اس میں تو ازن ہی بگڑ جاتا ہے۔

عزیزانِ من! غلط معاشرے میں یہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: نہ چھوٹا جرم چھوڑا جاتا ہے' نہ بڑا جرم۔ **وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا** (18:49)۔ یہ ضابطۂ حیات' یہ الکتاب کی رو سے قائم کردہ نظام ایسا ہے کہ جو کچھ کوئی کرتا ہے' وہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس میں یہ بھی نہیں ہے کہ کسی کا کوئی جرم' کوئی کام' چھپا ہوا رہ جائے' سامنے نہ آئے۔ وہاں تو ہر چھوٹا بڑا کام حاضر ہوگا' حاضرًا سامنے ہوگا۔ یہ ہے جی! اُس نظام الکتٰب کے تابع جو کچھ ہوگا۔ قرآن تو بتاتا ہے کہ جب یہ ضابطہ خداوندی نافذ ہوگا تو اس میں یہ کیفیت ہوگی: ہر مجرم کانپے گا: چھوٹا جرم ہو تو' بڑا جرم ہو تو' سب اس کی گرفت کے اندر ہونگے۔ **وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا** (18:49)۔ لیکن سن لو' یہ کانپنے والی بات ہم نے کہی ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ ہر ایک کو ڈرنا پڑے گا۔ قطعاً نہیں۔ تمہارا رب کسی پہ زیادتی نہیں کرے گا۔ مجرم کو چھوڑے گا نہیں' زیادتی کسی کے خلاف ہوگی نہیں' ہر ایک کو ہر جگہ بھوک ہوگی تو کھانے کو ملے گا' ذخیرہ وہ کر نہیں سکے گا۔ بڑے بڑے سردار اور صاحب اقتدار جو پہاڑوں کیطرح اپنے محکم پاؤں گاڑے ہوئے ہیں' سب اپنی جگہ سے اڑتے پھریں گے' روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ہر بات کا فیصلہ عین مطابق عدل ہوگا' کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔ اور وہ' جنہیں پاؤں تلے روندا جا رہا ہے (3:53) ان کی نمود کا زمانہ ہوگا۔ تاریخ بھی اس کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ذرا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ سامنے لایئے: ہوا یوں کہ وہ قوم جو جماعتوں مین بٹ گئی: ایک حق کی حمایت کرنے والوں کی اور دوسری اس کے مخالفین کی۔ مخالفین نے عیسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ ڈالنے کے لیے بڑے بڑے خفیہ طریقے اور تدابیر (Plans) شروع کر دیئے۔ اُن کے مقابلے میں خدا نے انہیں بچانے کے لیے پوشیدہ اسباب و ذرائع پیدا کر دیئے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے تجویز کردہ طریقے بہر نوع بہتر ہوتے ہیں (3:53)۔ کیا الفاظ ہیں قرآن کے!

قرآنی فہمی کے لیے تصریف آیات کی اہمیت

عزیزانِ من! ان عربوں کے ہاں باری اور مستتر دو لفظ ہیں۔ یہ ''برؤ' تو آپ نے سنا ہوگا: جو چیز ''بازغۃ'' (6:79) ہوتی ہے اس کی نمود ہوتی ہے۔ یعنی وہ موجود تو تھے لیکن پاؤں کے نیچے روندے ہوئے تھے۔ جب اوپر سے دباؤ اٹھ جاتا ہے تو خود بخود ان کی نمود ہو جاتی ہے۔ برو یہ لفظ ہوتا ہے جسے خود ہی دبایا ہوا' چھپایا ہوا ہو بلکہ اس میں دبانے کے معنی بھی آتے ہیں۔ **وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا** (18:49)۔ کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں۔ یہ انسان کی تمدنی زندگی کے پہلے دور کے متعلق تھا: **كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ** (18:48)۔ یہ کچھ انسانی تخلیق کے پہلے دور میں تھا۔ جس میں کوئی اختلافات نہیں تھے۔ میری اور تیری کا امتیاز نہیں تھا۔ یہاں وہ بات آئی

تو فوراً، ضمناً اس کا ذکر کیا: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (18:50)۔ یہ وہ دور تھا جس کا قرآن میں یوں ذکر آ رہا ہے۔ وہ دورِ اول ہے۔ وہ دور ہے جسے ''قصۂ آدم''، جنتی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ مختصراً یوں ہے کہ ہم نے کائنات کی تمام قوتوں (ملائکہ) کو حکم دیا کہ وہ آدم (نوعِ انسان) کے سامنے جھک جائیں چنانچہ وہ جھک گئیں۔ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لیکن اس کے حیوانی سطح کے جذبات (ابلیس) نے اس سے سرکشی اختیار کی۔ وہی بات وہ ہر جگہ دہراتا ہے۔ یہ تصریفِ آیات ہے: ہر جگہ وہ لوٹا لوٹا کے ان چیزوں کو لاتا ہے لیکن جس مقام پہ لاتا ہے، وہاں آپ دیکھیں گے کہ اس کے مفہوم کی وضاحت کے لیے وہ قصہ وہاں بیان کیا جاتا ہے اور اتنا سا ہی ٹکڑا وہاں بیان کیا جاتا ہے جتنا اس مفہوم کی وضاحت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ بات وہی تمثیلی آ گئی۔ یہ جتنی بھی کائناتی قوتیں ہیں، وہ سب ایسی ہوں کہ آدم کے سامنے سربسجود ہوں۔ البتہ ایک شے آدم کے اندر ایسی تھی کہ جو اس کے سامنے از خود جھکنے سے انکار کر گئی۔ یہ غیر مرئی، آنکھوں سے نظر نہ آنے والے، جذباتی محرکات، انسان کو خدا کے مقرر کردہ راستے سے بہکا کر دوسری طرف لے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں تفصیل سے پہلے بیان ہوتی چلی آ رہی ہیں، مجھے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

شیطان اور ابلیس کی حقیقت

آپ کو معلوم ہے کہ یہ ابلیس اور شیطان انسان کے اندر کے وہ جذبات ہیں جو وحی کے اقدار کے تابع نہیں رہنا چاہتے۔ یہ بے باک، سرکش اور حیوانی سطح کے جذبات ہیں، جو یا تو سرکشی پر یا مایوسی پر آمادہ کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن نے دو لفظ استعمال کئے ہیں: شیطان اور ابلیس۔ آج کی سائیکالوجی (Psychology) تو اس طرح سے انکا مفہوم بیان کر رہی ہے کہ اسے سمجھنے میں کوئی دقت ہی نہیں رہی۔ شیطان کے لفظی معنی ہیں کہ ''جو سرکش و شعلہ کی طرح بے باک ہو۔'' آج یہ کہا جا رہا ہے کہ انسان کے وہ تمام جذبات جنہیں حدود کے تابع نہیں رکھا جاتا، ان کی ابتداء ہمیشہ سرکشی سے ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ ماہرین علم النفس کہتے ہیں کہ ہر Aggression کی انتہاء Frustration ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اِس سرکشی اور تضاد کا دور ختم ہوتا ہے تو پھر مایوسی چھا جاتی ہے۔ ابلیس کے تو معنی ہی ''مایوسی'' کے ہیں۔ قرآن حکیم نے اِس ایک ہی مظہر (Phenomenon) کے لیے یہ دونوں چیزیں کہی ہیں۔ یہ کوئی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں اور پھر کہیں خارج میں نہیں ہیں۔ انسان کے اندر ہی کی واردات جذبات ہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہیں کہاں؟ کہا: كَانَ مِنَ الْجِنِّ (18:50)۔ جنوں میں ہے۔

جن کا تصور

اِس سے ہمارے ہاں ''جِنّ'' کا تصور دَر آیا۔ اب ہمارے ہاں تو وہی جن ہیں جنہیں ہم کہتے ہیں: جن بابا۔ یہ وہی تصور ہمارے ذہن میں آ گیا جیسے کہ وہ جن پہاڑوں میں تھا۔ اس کے بس یہی معنی ہوتے ہیں جو تصور ہمارے ذہن میں ہے۔ جہاں ہم نے یہ کہا کہ وہ

آدم میں سے نہیں تھا' وہ جنوں میں سے تھا' مصیبت پڑ گئی' مصیبت۔ ایک دفعہ یہ کہہ دیا کہ وہ ملائکہ کا استاد تھا۔ اس کو ابلیس معلم الملکوت کہتے ہیں: جو ملائکہ کا استاد تھا۔ دوسری جگہ یہ ہوا کہ وہ جن تھا۔ تیسری جگہ یہ ہوا کہ وہ کافر تھا۔ پھر اس کی تاویلیں ہونے لگیں۔ آؤ! ان عربوں سے پوچھو جن کی زبان کا یہ لفظ ہے۔ اس زبان سے پوچھو کہ وہ اس کا کیا استعمال کرتے تھے: ''ہر وہ شے جو نگاہوں سے چھپی ہوئی ہوتی تھی وہ اسے الجن کہتے تھے۔'' جن کے لفظی معنی ہی ''چھپا ہوا' پوشیدہ'' کے ہیں۔ اس سے پہلے تو ہم صرف جذبات ہی کو لیتے تھے کہ وہ مادی محسوس پیکروں میں نہیں ہوتے' چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی چیز صحیح تھی۔ لیکن اب تو اس سے ذرا آگے چلے گئے ہیں جنہیں انہوں نے Unconscious Mind غیر شعوری نفس کہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ اس کے خود جذبات میں بھی' تہوں کے اندر بھی' ہیں۔ اب تو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ Unconscions Mind (نفسِ غیر شعوریہ) تو انسان کے ادراک کے اندر بھی چھپا ہوا ہوتا ہے۔

انسانی جذبات سائیکالوجی کے آئینہ میں

میں نے پچھلی دفعہ آپ سے عرض کیا تھا کہ اب ان کے ہاں کی سائیکالوجی کی دو Terms ہیں ایک تو Suppression [1] ہے اور دوسری یہ Repression [2] ہے۔ یہ Suppressed اُن جذبات کو کہتے ہیں جو اُبھرے ہوئے تو ہوں لیکن اسکی عقل وفکر کا تقاضا' مصلحت کا تقاضا' یہ ہو کہ یہ ان کو بروئے کار نہ لائے مثلاً چوری کرنے کا جی تو بہت چاہتا ہے لیکن چونکہ سامنے مالک بیٹھا ہے یا بدنام ہو جانے کا خطرہ ہے' چوری تو نہیں کر سکا لیکن چوری کرنے کا جو خیال ہے' وہ اندر رہا۔ تو اس طرح شعور میں وہ بات رہتی ہے کہ یہ چوری تھی وہ اس چوری کے خیال کو باہر نہیں آنے دیتا تو کہتے ہیں کہ یہ اس کی Suppressed Feelings ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آہستہ آہستہ جب اِس کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر یہ ضمیر کو ذرا سا بھی Prick نہیں کرتا' یہ یاد بھی نہیں آتا۔ حافظہ اور ادراک یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ کوئی غلط بات تھی۔ یہ نہیں ہے کہ وہ بات بجائے خویش ٹھیک ہوگئی ہے بلکہ وہ اس کے Unconscious Mind کی تہوں میں چلی گئی ہے۔ اسے یہ Repressed کہتے ہیں تو اگر تو آپ کو جذبات کا احساس ہو' آپ احساس کے ان جذبات کو محسوس کریں کہ میں نے غلطی کی ہے تو اس کے لیے قرآن یہ کہتا ہے کہ جونہی احساس ہو' فوراً اپنی روش بدل لے' جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا' وہاں پہ فوراً آ جاؤ تو Suppression کا علاج جلدی ہو جاتا ہے لیکن جہاں قرآن کہتا ہے کہ یہ سب کچھ انہیں دلائل و براہین سے کہتے رہو لیکن یہ اس کے باوجود اُدھر نہیں آتے' یہ ہے وہ مظہر (Phenomenon) جو کَانَ مِنَ الْجِنِّ کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح ابلیس Repressed Mind میں چلا جاتا ہے۔ میں اس وقت تک کی بات کر رہا ہوں' آگے پتہ نہیں ابھی کیا کیا پردے اٹھنے ہیں۔

---

[1]

[2]

نفسِ انسانی کے متعلق تو تحقیق ہی ابھی شروع ہوئی ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ (18:50)۔ یونہی سمجھ لیجیے کہ نفسِ غیر شعوری کی پہنائیوں' اس نفسِ غیر شعوری کی تہوں کے اندر چھپے ہوئے' تمہارے وہ سارے کے سارے جرائم کے جذبات' وہ نیتیں' وہ ارادے' جو بروئے کار نہ آ سکے ''کان من الجن'' ہیں۔ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (18:50)۔ یہ تمام کچھ یعنی ''کان من الجن'' غیر مرئی جذباتی محرکات' انسان کو خدا کے مقرر کردہ راستے سے بہکا کر دوسری طرف لے جاتے ہیں۔ اس کی نشوونما جس Pattern میں ہونی چاہیے وہ اس سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو فسوق کے معنی بتائے ہوئے ہیں کہ ''کسی پھل کے کسی Pattern کے اندر رہ کر پکنے کے خول سے باہر نکل جانا۔ کہا: تم یہ بتاؤ کہ یہ ایک چیز ابلیس یا شیطان کرا دیتا ہے لیکن یہ ایک تو اصولی چیز ہے' جذبات تو بیشمار قسم کے ہوتے ہیں: کششیں' جاذبیتیں' آرزوئیں' خلشیں' تمنائیں' غلط کوشیاں' غلط کاریاں' ان کی بڑی نوعتیں ہوتی ہیں۔ قرآن انہیں ابلیس کی ذریت کہتا ہے' کبھی انہیں جنود کہہ کر پکارتا ہے۔ ''پنجابی اچ جناں نوں شتونگڑے کیندے ہیگے۔''[1] ذریتِ ابلیس ہیں۔

ابلیس کی ذریت اور لفظ عدو کی روشنی میں باہمی عداوت کی بنیادی وجوہات

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (18:50)۔ کہا کہ کیا تم اقتدارِ خداوندی یا قانونِ خداوندی کو چھوڑ کر' اس کی جگہ اپنے ہاں کے سرکش جذبات' خواہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہی کیوں نہیں ہوگئے' خواہ وہ Suppressed یا Repressed Mind میں بھی کیوں نہ چلے گئے ہوں' تم انہیں اپنا مددگار بنانا چاہتے ہو' انہیں اپنا سرپرست قرار دینا چاہتے' ہو ان کی پیروی کرنا چاہتے ہو' ان کا اتباع کرنا چاہتے ہو؟ حالانکہ وہ تو تمہارے دشمن ہیں' یاد رکھو' محض انہیں چھپا کر رکھ دینے سے تو وہ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ وہ تو دشمن ہیں۔ لہٰذا قرآن میں یہاں عدو کا لفظ آیا ہے اور ہر مقام پہ میں نے آپ کو بتایا ہوا ہے کہ بنیادی طور پر یہ کس کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب لکڑی پھاڑتے ہیں تو اس میں جو موٹی لکڑی ہو' اسے ایک دفعہ جب کلہاڑے سے پھاڑا جائے تو آگے سے تو پھٹ جاتی ہے لیکن اس میں اتنا زور ہوتا ہے کہ وہ اسی زور سے پھر مل جاتی ہے' اس میں پھاڑنے والے Wege دے دیتے ہیں تاکہ وہ زور سے بھی آپس میں ملنے نہ پائے' پھٹا رہے' ان میں وہ پھٹے ہوئے رہیں' وہ الگ الگ رہیں۔ یہ جتنی بھی آپ کے ہاں کی انفرادی نظام کی کیفیتیں ہیں اس میں ہر فرد دوسرے سے اس طرح سے الگ الگ رہتا ہے اور وہ الگ الگ رکھنے والی چیز کیا ہوتی ہے؟ وہ ذاتی مفاد آ جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیتا' انفرادیت تو ہوتی یہ ہے۔ لہٰذا یہ اس شے کو عدو کہتے تھے یعنی ''وہ شے جو بیچ میں چھوڑ دی جائے اور اگر اس چیز کو درمیان میں سے نکال دیا جائے تو یہ دونوں کنارے اپنے زورِ دروں سے مل جائیں تو یہ تو مل کر رہنا انسان کے اندر ہے لیکن قرآن نے تو کہا تھا کہ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (13:25)

---

[1] جنہیں پنجابی زبان میں ''شتونگڑے'' یعنی شرارتی بچے ہمیشہ شرارت پر آمادہ' کہتے ہیں۔

جنہیں ملانے کے لیے ہم نے حکم دیا تھا' تم انہیں الگ الگ کرتے ہو۔ تو یہ ساری الگ الگ کرنے والی مفاد پرستیوں کی wedges ہیں' جو درمیان میں آ جاتی ہیں۔ یہ اس لفظ کی بنیاد ہے۔ ہم نے تمہیں کہا تھا کہ یہ تو تمہیں ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیں گی اور تم انہی کو ہی اپنا سہارا قرار دے رہے ہو۔ اب تم اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے ہو لیے ہو تو یاد رکھو: بِئۡسَ لِلظّٰلِمِیۡنَ بَدَلًا (18:50)۔ یہ کیسی بری تبدیلی ہے! یہاں "ظلم" آ گیا ہے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ان کاوشوں کا اور محنتوں کا اور قارون [1] کے الفاظ میں "کاریگری' ہنرمندی" کا بدلہ بڑا ہی تباہ کن ہے۔ وہ اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اس دوست' ولی' سرپرست کی لسٹ میں زندگی کی بلندترین اقدار کو چھوڑ کر' جنہیں تم اپنا دوست بناتے ہو' ولی بناتے ہو' سرپرست بناتے ہو' اب اس میں یہ سب آ جائیں گے' سرمایہ دارانہ مفاد پرستیوں والے بھی ہیں' مذہب کی دنیا کے اندر کچھ خیرات لے کر' زکوٰۃ لے کر' بخشوانے کے پروانے دینے والے بھی ہیں' طریقت کی دنیا والے بھی ہیں' جو آپ کی ساری ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں گے' جس نے پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو کہتے ہیں کہ پیر کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اپنے ساتھ لے کے جائے' یہ جنت میں جب تک جائے گا نہیں۔ "انہاں نوں لنگاں ناں لیگا" [2] اندر۔ ٹکٹ والا تو اپنی ٹکٹ کے زور پہ جاتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے یہ دیکھا نہیں ہے کہ یہاں بھی ٹکٹ داری سے اتر کے دوست آ رہا ہوتا ہے' عملے میں سے اس کا ایک آدمی ہوتا ہے اور وہاں گیٹ کیپر آ گے کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ "اے رضوان دا یار اے لنگن دیو ذرا۔" [3] کیا کیا سناؤں جو ہم قصے پڑھا کرتے تھے۔ ان کے ہاں واقعی یہ صورت تھی کہ وہ کہنی ماریں گے کہ "لنگ جا لنگ جا۔" [4]

گدڑی والوں کے ذریعے جنت میں داخلہ

عزیزانِ من! وہ تو آپ کو پھر سے یاد ہوگا۔ اگر یاد نہ ہو تو سنا دوں۔ یہ ہے تو لطیفہ ہی لیکن ہم تو اس زمانے میں لطائف کو ہی حقائق سمجھ کر پڑھا کرتے تھے کہ تم سمجھتے ہی نہیں ہو "کہ ایہہ پیر جیہڑے ہیگے اے جیہڑی اتے لئی پھردے ہیگے نیں اے ہوندی کی اے' پوچھو ناں اے ایویں نئیں لئی پھردے اے جیہڑی اے' اے بڑی چیز ہیگی آ' اچھا جی بڑی چیز کی ہیگی آ۔" [5] قیامت میں جب ان مجرموں کو ڈھونڈ کے نکالا جائے گا' پکڑا جائیگا اور جہنم کی طرف لے جائیں گے اور ان کے لیے وہ رضوان بڑا سخت سا' نئی قسم کا' لگا دیا ہوگا تا کہ کوئی اس طرح سے اندر نہ آئے تو اس وقت یہ صاحب چلے جائیں گے' گدڑی اوپر لیے ہوئے' وہ سیدھے اندر چلے جائیں گے' وہ بھی جانے

---

1. دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' 2004ء ص۔ 124' فٹ نوٹ!
2. اپنے ساتھ انہیں پھلانگتا ہوا اندر نہ لے جائے۔
3. یہ رضوان کا جگری دوست ہے' اسے اندر جانے دیجیے۔
4. وہ کہنی کے اشارے سے کہہ دیں گے کہ اندر چلے جاؤ۔
5. پیر جو اپنے اوپر لیے پھرتے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ پوچھو ان سے۔ یہ اسے ایسے ہی نہیں لیے پھرتے۔ یہ بڑی اعلیٰ چیز ہے۔ اچھا جی! یہ بڑی اعلیٰ چیز ہے!

دے گا' سلام بھی کرے گا کہ یہ ٹھیک ہے۔ وہ اندر جنت میں پہنچ کے اپنی گدڑی کو جھاڑیں گے۔ اس کے ایک ایک بال میں ہزار ہزار مرید کی روحیں لپٹی ہوئی ہونگی۔ عزیزانِ من! کس دنیا میں ہم کو بسا دیا لا کے صاحب! کہاں لے آئے ہم کو قرآن تو یہ کہتا ہے کہ **فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ . وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ** (99:7-8)۔ ایک ایک ریت کے ذرے کے برابر بھی جو عمل ہے وہ اس کے سامنے آئے گا' اس کا مواخذہ ہوگا۔

مقامِ نبوت کی انقلابی ذمہ داریاں اور ہماری خود ساختہ روایات

یہ تو گدڑیاں پہننے والے ہیں۔ یہاں سے ہی آپ کا وہ کملی والا بنایا ہوا ہے۔ وہاں سے' اپنی گدڑی والوں کے ہاں سے' وہ کملی والا لاتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سمجھا کہ انہیں کملی والا کیوں بتایا جاتا ہے۔ وہ یہی گدڑی والے ہیں جنہوں نے اپنی کملیوں کے لیے' اپنے کو مسنون قرار دینے کے لیے' اسے کملی والا بنا دیا۔ خانقاہوں کے زاویوں میں' غاروں میں' بیٹھ کے ان کی اپنی جو عبادتیں ہیں' ان کی اپنی جو ریاضتیں ہیں' انہیں مسنون قرار دینے کے لیے انہوں نے حضور ﷺ کو غارِ حرا میں بٹھا دیا کہ وہ بھی انہی کی طرح وہاں جا کے عبادت کرتے تھے اور اپنے ساتھ ستو لے جایا کرتے تھے' پانی لے جایا کرتے تھے اور اندر غار کے رہا کرتے تھے۔ اللہ اکبر یا للعجب! جنہیں روم اور ایران کی سلطنتوں کے نظام کو الٹنا تھا' کائنات میں انقلاب برپا کرنا تھا وہ ان فقیروں کی طرح' غاروں میں جا کے' ستوؤں کے اوپر گزار کر کے' اس طرح سے پرستشیں کیا کرتا تھا۔ عزیزانِ من! پوچھو کارلائل سے (Carlyle: 1795-1881) وہ اس محمدؐ کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ یہ بات کہتا ہے کہ یہ ایک ان پڑھ شخص ہے جسے ہم دیکھتے ہیں۔ وہ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' اس کائنات کے قانون پہ غور کر رہا ہے' تخلیقِ ارض و سماوات پہ فکر کر رہا ہے' گردوپیش کی مملکتوں کے نظام کو دہرا رہا ہے۔ اور اسی کے بعد تو وہ Heroes & Hero worship کا باب پڑھنے کے قابل ہے۔ بڑا خوبصورت لکھا ہے۔ کہا: یہ اس کائنات اور رائج الوقت نظاموں پہ غور و فکر کا' اس کے مطالعہ کا' اس کے مشاہدے کا جو یہ چالیس برس تک کرتا رہا' نتیجہ تھا کہ اُس نے روم اور ایران کی اتنی بڑی سلطنتوں کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس کے الفاظ بڑے خوبصورت ہیں کہ پھر یہ اپنے اندر یہ کچھ بنا اور ایک برقِ ہدف کی طرح آسمان سے گرا اور خس و خاشاک کے سارے انبار کو آگ لگا کے رکھ دی۔ کیا: یہ کچھ کر کے دکھانے والا' غاروں میں جا کے' کملیاں اوڑھے ہوئے تھا؟ اس نے کہا کہ نہیں' قطعاً نہیں۔

کائناتی کنٹرول ذاتِ خداوندی کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے

بہر حال یہ کہا کہ پوچھو ان سے۔ خدا کے تجویز کردہ راستے کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا کے ساتھ اور ہستیوں کو بھی خدا کا ہمسر بنا لیتا ہے حالانکہ اس عقیدہ کے باطل ہونے کی سب سے پہلی دلیل یہ ہے کہ **مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ**

وَلاَ خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ (18:51)۔ یہ تمام ہستیاں مخلوق ہیں اور کائناتِ ارض وسما کی تخلیق کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ جو چیزیں خود مخلوق ہیں وہ خالق کے کاروبار میں کیسے شریک ہوسکتی ہیں؟ پوچھو ان سے کہ جب یہ ارض وسما کی تخلیق کی ہے تو کیا انہیں وہ تمام رازہائے پنہاں معلوم تھے؟ کیا وہ ان ساری چیزوں سے واقف تھے؟ یہ تخلیقِ ارض وسما تو ایک طرف رہا جب یہ خود پیدا ہوئے ہیں تو انہیں اس کا بھی علم نہیں ہے کہ یہ کیسے پیدا ہوگئے تھے؟ جنہیں تم اتنی بڑی بڑی قوتوں کا مالک سمجھتے ہو انہیں تو قرآن ابلیس کی ذریت کہہ رہا ہے۔ یاد رکھیے: وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (18:51)۔ خدا ایسا کمزور نہیں تھا کہ اُسے انہیں اپنا دوست وبازو بنانے کی ضرورت پڑ جاتی۔ یہ سب ذہن انسانی کی تراشیدہ ہستیاں ہیں جن کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ ان کی وجہ سے غلط راستوں پر چل نکلیں۔ اور تم یہ بتا رہے ہو کہ یہ مقربین بارگاہِ الٰہی ہیں۔ خدا کا یہ سارا نظام اس کے یہ نمائندے یہاں چلا رہے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ زیرِ زمین ہوتے ہیں' ایسے ان کی وہ تاریکی Underground ہوتی ہے۔ تو کیا یہ دنیا وہی چلا رہے ہوتے ہیں؟ اور کیا اس کے بغیر خدا کا کاروبار نہیں چلتا؟ کہا کہ سوچو تو سہی' یہ لوگ جو اس طرح سے دنیا کو گمراہ کر رہے ہیں اگر ہم نے کسی کو اپنا مددگار بنانا ہوتا تو کیا ہم انہیں مددگار بناتے؟ یہ تو خود مخلوق ہیں' یہ کیسے خدا کے کاروبار میں شریک ہوسکتے ہیں؟ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِ یَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ (18:52)۔ ان سے کہا جائے گا جنہیں یہ اس دھوکے میں رکھ کے لائے تھے کہ ہم تمہیں جنت میں پہنچا دیں گے' ان سے کہا جائے گا کہ آج انہیں پکارو: فَدَعَوْهُمْ (18:52)۔ وہ انہیں مدد کے لیے پکاریں گے۔ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ (18:52)۔ مدد کے لیے آنا تو ایک طرف رہا' وہ تو ان کی پکار کا جواب تک نہیں دے سکیں گے' خود منہ چھپائے پھر رہے ہونگے صاحب! وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا (18:52)۔ ان کے درمیان ایک روک ہوگی' دیواریں حائل ہو جائیں گی' دشمنی کے پردے پڑ جائیں گے' یوں ایک دوسرے کو چھوڑ جائیں گے۔ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا (18:53)۔ لیکن اس وقت تعلقات کے منقطع ہو جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اس وقت خدا کے قانون مکافات کی رو سے تباہی کی آگ اُن کی آنکھوں کے سامنے بھڑک رہی ہوگی اور ہر قرینے سے انہیں معلوم ہوگا کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔ وہ اس وقت اس تباہی سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ ہاں! عزیزانِ من! پھر وہ جواب تک نہیں دیں گے' سامنے شعلہ فشاں جہنم ہوگا۔

جیسا کہ میں کہتا آیا ہوں کہ اس قسم کے یہ سارے بیانات' جو قرآن نے بیان کیے ہوئے ہیں' تمثیلی ہیں۔ مثلاً وہ اسے ''بھڑکتا ہوا'' دیکھیں گے اور اس سے بچ جانے کی وہاں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔'' یہ وہ کتاب ہے جو زندگی کی کیفیات بتا رہی ہے جو یہاں اس دنیا میں ہوگی اور پھر آخرت میں بھی۔ آخرت پر تو ہمارا ایمان ہے۔ وہاں جو یہ تحت الضیاع میں چھپے ہوئے احوال وافعال ہیں جنہیں ہم نے مستِ غیر

شعوریوں کی پہنائیوں میں چھپا رکھا ہے' وہ بھی تو اس نظام کے تابع وارد ہوں گے' یہاں یہ کیفیت ہوگی۔ یوں سمجھو کہ مجرم اپنے سامنے بھڑکتے ہوئے جہنم کو دیکھیں گے اور کہیں بھی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے۔ یہاں سے بچ کے جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ یہ تو عزیزانِ من! مجرم ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا کہ ڈر سے کانپ رہے ہونگے۔ وہاں کے قانونِ مکافاتِ عمل اور خدا کے عدل کے متعلق تو اس کائنات کی عظیم ترین ہستی' اس رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن میں کہلایا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ ''اگر میں بھی خدا کے قانون اور حکم کی معصیت کروں تو میں خود اس عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔'' قرآن سے آپ کی زبان مبارک سے کہلوایا اور ادھر آپ اندازہ لگایئے یہ سارے قصے ہیں۔ حضور ﷺ کی صفات کے قصے تو خیر ہیں ہی مگر ان کے ساتھ یہ اِس قسم کے قصے اسلام کا کیا تصور پیش کرتے ہیں۔ آپ ان سے واقف ہیں کہ دراصل یہ ان کے قصے ہیں جنہیں مقربین کہا جاتا ہے' جنہیں پیرانِ طریقت کہا جاتا ہے۔ اِن سب بڑے بڑے ''پیرانِ طریقت'' اور ''پاسبانِ شریعت'' نے' ان قصوں کو لوگوں کے بخشوانے کے ذرائع بنا رکھا ہے۔ وہی جو کلیسا کے ہاں گناہوں کے بخشوانے کے پروانے بکا کرتے تھے' یہاں بھی وہی بکتے ہیں۔ دوسروں کے ہاں کے پروانے پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اسے مذاق کرتے ہیں اور بعینہ وہی کیفیت اب ہمارے ہاں ہوتی ہے تو اسے ہم تصوف اور طریقت گردانتے ہیں' اسے بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔

اس قدر تصریف آیات کے باوجود ذہنی طور پر جھگڑالو کیفیت

عزیزانِ من! گذشتہ چند آیات میں قرآنِ کریم نے ان چیزوں کو تمثیلی انداز میں بیان کیا' تشبیہات کے پیرائے میں بات سمجھائی۔ قرآنِ کریم بہت سی چیزیں دوبارہ بھی لایا' پھیر پھیر کے بھی لایا۔ کہا: **وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ** (18:54)۔ یہ باتیں' یہ مثالیں' یہ تشبیہیں' یہ داستانیں' ہم بار بار لوٹا کے لاتے ہیں۔ **وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا** (18:54)۔ وہ اس لیے کہ جب یہ بات اس سے کی جائے تو اس کا ذہن ہمیشہ جھگڑے کی طرف جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ بات واضح ہو جانے کے بعد اُسے تسلیم کرلے یہ اکثر جھگڑے نکالتا رہتا ہے۔ تو یہ جو جھگڑنے والی ذہنیت ہے' اسے بار بار سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اسلامی مکتب فکر کے عالمی فلسفی ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1938 - 1877) نے کہا ہے کہ:

بیاں میں نکتہء توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے؟

یہ جو جَدَلًا ہے یہ انسان کے ذہن کے اندر ''بُت خانہ'' ہوتا ہے' وہ اسے اس طرف نہیں آنے دیتا۔ اور یہ ہے وہ مظہر (Phenomenon)

جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ حقائق و واقعات کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ جھگڑالو کو سمجھانے کا یہی طریقہ ہوسکتا ہے' جو کہا گیا ہے۔ کہا: باتیں تو بڑی صاف ہیں' تکرار سے دہرائی جاتی ہیں تاکہ وہ افراط سے' تفریط سے پاک وصاف ہو کر' نکھر اور اُبھر کر' ہر گوشے اور ہر پہلو سے صاف اور واضح ہو جائیں۔ کہا: وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا (18:55)۔ ذرا سوچو کہ جب اِن لوگوں کے پاس اس وضاحت سے ہدایت آ گئی تو پھر وہ کون سی بات تھی جو انہیں اِس سے روکتی کہ وہ اس کی صداقت کو تسلیم کریں اور اپنے پروردگار کے قانون کی اِطاعت سے اپنے لیے سامانِ حفاظت طلب کریں! یہ بات اِس کے سوا کیا تھی کہ اِن کے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آئے جو اقوامِ سابقہ کے ساتھ پیش آتا رہا ہے' یہاں تک کہ ہمارا عذاب ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے۔

مؤرخ کے ذہن کی رسائی اور قرآن کا بیان کردہ فلسفۂ تاریخ

عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سمجھ میں آ سکتی ہے' اس کے باوجود یہ لوگ صحیح راستے پہ نہیں آتے' اِسے تسلیم نہیں کرتے حالانکہ خدا انہیں حفاظت کا سامان بہم پہنچاتا ہے' وہ ان کے لیے پناہ گاہ بتاتا ہے کہ ''یہاں آ جاؤ تو بچ جاؤ گے۔'' یہ وہاں بھی نہیں آتے۔ اب بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا حشر وہی ہو' جو اس سے پہلے تباہ ہونے والی قوموں کا حشر ہوا ہے۔ وہ مقام' عزیزانِ من! قوموں کے اندر آتا ہے جب وہ ہر روز دیکھتے ہیں کہ ہمارے قدم تباہی کی طرف اٹھ رہے ہیں اور اس کے باوجود ادھر ہی چلے جاتے ہیں' اسی طرف چلے جاتے ہیں' رخ نہیں بدلتے۔ مؤرخ کے ذہن وفہم میں یہ بات نہیں آتی کہ اس قوم کو ہوا کیا تھا۔ اس مقام پہ قرآن کہتا ہے کہ ساری باتیں تو صاف اور واضح ہیں' سمجھ میں بھی آ سکتی ہیں لیکن اب یہی کہو کہ جس طرح سے پہلے ہلاک ہونے والی قوموں کی روش تھی' ان کی بھی وہی ہے' یہ اسے نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس انتظار میں ہیں کہ جس تباہی کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے' وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہو۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا (18:56)۔ یہ جو ہم اپنی ہدایت کو' انسانوں کے ذریعے جنہیں رسول کہا جاتا ہے بار بار بھیجتے ہیں۔ ان کا مقصد بھی اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ آ کے بتائیں کہ یہ غلط روش ہے جو تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لیے جا رہی ہے۔ صحیح روش تمہیں خوشگواریوں اور جنت کی طرف لے جائے گی۔ وہ یہی کہنے اور بتانے کے لیے آتے ہیں۔ بتاتے اس طرح سے ہیں کہ بات صاف ہو' اس میں کوئی ابہام نہ رہے' بات کی وضاحت ہو جائے' اِس لیے مبشرین ومنذرین بار بار سمجھاتے ہیں' وہ لوٹا لوٹا کر باتیں بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ جنہوں نے تہیہ کر رکھا ہوتا ہے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں ہے' وہ اپنے باطل کو سامنے لا کر' اس کی رُو سے ان کے ساتھ جھگڑے نکالنا شروع کر دیتے ہیں' حق کی بات ان کے پاس نہیں ہوتی۔

حق کبھی حق کے ساتھ نہیں جھگڑتا

عزیزانِ من! حق تو حق کے ساتھ جھگڑ ہی نہیں سکتا۔ سچ اور سچ کا جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا۔ دو آدمی جن کا آپس میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اگر سامنے آئیں اور وہ دونوں سچے ہوں اور سچ ہی بولیں تو جھگڑا پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جھگڑا پیدا ہونے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ دونوں جھوٹے ہوں اور دوسری چیز یہ ہے کہ ایک سچ کے اوپر اڑا ہوا ہو اور دوسرا جھوٹ کو اپنے ہاں کا مسلک بتائے۔ ایک طرف سے تو سچ کی بات یا دلائل کی بات آتی چلی جائے گی اور دوسرا جھگڑے کی بات پیدا کرتا چلا جائے گا۔ جھگڑے کی یہ صورت ہوتی ہے۔ یہ باطل کے ساتھ جھگڑا ہوتا ہے جو حق کے مقابل میں ہوتا ہے اور یہی ہے حق و باطل کا باہمی تصادم جسے قرآن نے کئی دوسرے مقامات پر کہا ہے کہ حق باطل پہ ضربیں مارتا چلا جائے گا' لگاتا چلا جائے گا تا آنکہ باطل کا بھیجا توڑ کے رکھ دے گا اور یوں اس کے سامنے سے باطل بھاگے گا۔ یعنی یہ باطل سخت جان اتنا ہے کہ حق کی ایک دو ضربوں سے بھاگتا ہی نہیں ہے' مغز تڑوا کے بھاگتا ہے' اس سے پہلے مانتا ہی نہیں۔ اتنی سی بات ہے۔ وہ وہی ہے جسے ہم کہیں گے کہ وہ قوم خوش نصیب ہے جو پہلی دوسری ضرب کے اندر ہی بات سمجھ لے کہ میں غلطی پر ہوں' صحیح روش پہ آ جانا چاہیے۔ لیکن جو تباہ ہونے والی قوم ہوتی ہے' حق اس پہ ضربیں لگاتا چلا جاتا ہے وہ اسے نہیں مانتی' تا آنکہ وہ بھیجا توڑ کے ''زھوقا'' رکھ دیتا ہے۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81) اور یوں یہ باطل وہاں سے بھاگتا ہے۔ یہ ہے وہ جسے قرآن نے قوموں کی تباہیاں کہا ہے اور کہا ہے کہ ہم ان کی داستانیں بیان کرتے ہیں اور یہ ہیں کہ جھگڑا ہی جھگڑا نکالتے ہیں۔ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا (18:56)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ کبھی ہمارے قوانین پر سنجیدگی (Seriously) سے غور کیا' اور نہ ہی اُن تباہ کُن نتائج پر جو ان کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں اور جن سے انہیں متنبہ (Warn) کیا جاتا ہے۔ یہ انہیں ہنسی مذاق ہی سمجھتے ہیں۔ یہ جھگڑا ہی تو ہے۔

حق کے مقابلے میں کمینگی کی بات

اس جھگڑے میں قرآن ایک بات بتاتا ہے۔ یہی بات وہ ہر جگہ کہتا ہے کہ جھگڑا یہی نہیں ہوتا کہ صحیح دلیل کے مقابلے میں فریق مخالف نے غلط یا باطل دلیل دی۔ نہیں' ان کی تو کیفیت ہی یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی بات بن نہیں آتی تو استھزا کرتے ہیں' Redicule کرتے ہیں' تمسخر کرتے ہیں' مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ بڑی بناوٹ اور کمینگی ہے' عزیزانِ من! معقول بات کی جارہی ہو' انسانوں کی طرح کھڑے ہوئے گفتگو کی جارہی ہو' ٹھیک ہے' نہیں مانتے تو کہو: نہیں' میں نہیں مانتا۔ چلیے یہ بھی کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ اس کے فائدے کی بات کہیں اور وہ آپ کا منہ چڑانے لگ جائے' مذاق اڑانے لگ جائے' تو پھر اس کے پاس تو بڑی ہی کمینگی ہوتی ہے۔ اس کے لیے بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مقام پہ یا تو آدمی اشتعال میں آجاتا ہے' یا پھر مایوس ہو جاتا ہے۔ حق کو پیش کرنے والا تو ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی اختیار نہیں کرتا۔ یہ اشتعال میں بھی نہیں آتا' یہ سب کچھ اصولوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود ایک طرف تو شفقت کا یہ عالم تھا کہ قرآن کو کہنا پڑا کہ تو تو اس غم سے اپنی جان گھلالے گا کہ یہ صحیح راستے پہ کیوں نہیں آتے' کیوں تباہ ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف ان کے ہاں یہ صبر آزما منازل اتنی زیادہ شدت اختیار کرتے چلے جارہے تھے کہ قدم قدم پہ تکذیب ہی نہیں' استہزا کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اس پہ بھی کہا جارہا تھا کہ اس کے باوجود نظر یوں آتا ہے کہ ان مخالفین کی کیفیت پتھروں جیسی ہو گئی ہے مگر تو بات پہنچائے چلا جا' پہنچائے چلا جا' تا کہ کوئی ایک جان بھی اس لیے ضائع نہ ہو جائے کہ اس تک یہ بات پہنچ سکتی تھی اور تو نے نہیں پہنچائی۔ ان افراد پہ کتنی بڑی ذمہ داریاں تھیں: حق کے کہنے والے کی ذمہ داریاں اور یہ مراحل کس قدر صبر آزما تھے! ان کا کتنا بڑا جگر و حوصلہ ہوتا تھا اسی لیے تو ان کو منتخب کیا جاتا تھا اور جو بھی حق کو لے کر اٹھے گا' بہر حال' اس کے ساتھ یہی کچھ گزرے گی اور وہ یہی کچھ کرے گا' ابتدائے سنتِ رسل ﷺ کرنے سے ہی تو کچھ کام چلے گا۔ اگر یہ بھی کسی جگہ مشتعل ہو گیا' کہیں مایوس ہو گیا' تو یہ حق کو پہنچانے والا نہیں رہے گا صاحب! **وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ** (18:57)۔ تم سوچو کہ اس سے زیادہ ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ اُسے اِن باتوں کی' اُس کے نشو و نما دینے والے کے قوانین کی یاد دہانی کرائی جائے تو وہ ان سے منہ پھیر کے چلدے اور اِسے قطعاً بھول جائے کہ اُس کے تمام اعمال (ماقدمت یدٰہ) کے نتائج اُس کے سامنے آنے والے ہیں۔ اس بات کا اندازہ لگائیے کہ وہ اس بات کو فراموش کر دے کہ ''کس قدر تباہ کن باتیں وہ کر چکا ہے' ان کے نتائج سامنے آنے والے ہیں۔'' یہ نسـیـ ہے۔ یہ اس بات کو بھلا ہی دے کہ یہ چیزیں Suppresed میں تو آتی نہیں ہیں' یہ تو Repressed میں آتی ہیں۔ اس لیے یہاں قرآن نے اظلم کہا ہے' جو سب سے زیادہ ظالم ہے۔ یہ ہے ان کی کیفیت۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلی سٹیج یہ ہو سکتی ہے کہ وہ گریز کی راہیں نکالے لیکن یہ جو نَسِـیَ والی کیفیت ہے تو اِس میں یہ بات نظر آتی ہے کہ اُسے یاد ہی نہ رہے' وہ اُنہیں بُھلا ہی دے۔ وہ باتیں Suppressed Mind میں چلی جائیں۔ وہاں پہنچ کے کیفیت یہ ہوتی ہے: **اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا** (18:57)۔ کہ پھر دلوں کے اوپر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ سمجھ سوچ کی صلاحیتیں ہی سلب ہو جاتی ہیں۔ کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ جاتے ہیں کہ وہ سنی کو ان سنی کر دیتے ہیں۔ اُن کے کانوں میں ایسی گرانی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حق و صداقت کی کوئی آواز سن ہی نہیں سکتے۔ واقعی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ جب انسان کا کوئی ایک جذبہ بھی اتنی شدت اختیار کر جائے تو اس کے بعد اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نہ اسے کچھ نظر آتا ہے' نہ وہ بات سنتا ہے' نہ وہ کچھ دیکھتا ہے' نہ بات کرتا ہے۔ یہ ایک عجیب کیفیت ہے: **صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ** (2:171)۔ بہرا' گونگا' اندھا' **فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ** (2:171)۔ عقل و فکر سے عاری' اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے' پردے پڑ جاتے ہیں۔ دوسرے لوگ جن میں ابھی یہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت

ہوتی ہے ان کی سمجھ میں بات نہیں آتی کہ آخر یہ ہوا کیا؟ قرآن کہتا ہے کہ ان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اعراض کی راہیں نکالتے نکالتے‘ Suppression میں‘ یا نسیان کی حد تک پہنچ جائے۔ پھر Repression میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ قرآن کے نکتہ نظر سے‘ اس میں بتدریج سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں جن لوگوں کی حالت یہ ہو جائے تو **وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا** (18:57)۔ وہ کبھی بھی صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتے‘ خواہ تو انہیں لاکھ اس کی طرف بلائے۔

عزیزانِ من! میں پھر اسے دہرا دوں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ تو صحیح راستے کی طرف جتنا جی چاہے ان کو آوازیں دیئے چلے جاؤ‘ جنہوں نے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھے ہیں‘ جنہوں نے پردے میں لپیٹا رکھے ہیں وہ تمہاری آواز پہ کیا لبیک کہیں گے اور کس طرح سے اس راستہ کے اوپر آئیں گے۔ وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ آج ہم سورۃ الکھف کی آیت 57 تک آ گئے۔ 58 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀……❀……❀……❀

چوتھا باب: سورۃ الکہف (آیات 58 تا 82)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ
دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ۝58 وَتِلْكَ الْقُرٰۤى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝59 وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ
اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ۝60 فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي
الْبَحْرِ سَرَبًا ۝61 فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ؗ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ۝62 قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ
اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ؗ وَمَاۤ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖۗ
عَجَبًا ۝63 قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖۗ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۝64 فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ
عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝65 قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝66 قَالَ اِنَّكَ
لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝67 وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۝68 قَالَ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ
اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ۝69 قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝70 فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى
اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝71 قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ
لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝72 قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝73 فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَا
لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً ۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝74 قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ
اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝75 قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ ۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ
عُذْرًا ۝76 فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ۣ اسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا
يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝77 قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ
بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝78 اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ

اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴿٧٩﴾وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ
يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴿٨٠﴾فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا﴿٨١﴾وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ
لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا
وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴿٨٢﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1975 کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 58 سے ہو رہا ہے: (18:58)۔

بات وہی کشمکشِ حق و باطل کی چلی آ رہی ہے۔ اس سوال کا جواب دیا جاتا ہے' جو عام طور پر اس سلسلے میں ہمارے ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ ظالم ظلم کرتے چلے جاتے ہیں' قوموں کی قومیں دھاندلیاں مچاتی چلی جاتی ہیں' بے انصافیاں ہوتی ہیں' مظلوم مرتا' کمزور کچلا جاتا ہے' تو خدا جو ہر چیز پہ قادر ہے' یہ کیوں نہیں کرتا کہ فوراً انہیں پکڑے' فوراً ان کا ٹینٹوا دبا دے' فوراً ان کا گلا دبا دے۔ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ جونہی کوئی ہاتھ مظلوم کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لیے اٹھے' وہ ہاتھ وہیں پر کٹ جائے؟ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اس طرح مظالم پہ اتر آئے تو اسے اسی وقت نیست و نابود کر دیا جائے؟

عیسائیت کے مقابلے میں رحم اور سزا کا قرآنی تصور

اس سوال کے جواب میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَرَبُّکَ الْغَفُوْرُ ذُوالرَّحْمَۃِ** (8:58)۔ تیرا رب غفور ہے اور رحمت والا ہے۔ اتنے سے بات بظاہر اور الجھ جاتی ہے اس لیے کہ تیرا خدا غفور اور ذوالرحمۃ رحیم واقع ہوا ہے۔ یہ ظالموں کے لیے غفور بھی واقع ہوا ہے' رحیم بھی واقع ہوا ہے۔ ''غفور'' کا تو آپ کو پتہ ہے: وہ ''جو پناہ دینے والا ہے' حفاظت کرنے والا ہے۔'' وہ حفاظت کرتا ہے۔ ''رحمت'' کے معنی ہیں: وہ رحیم ہے' رحم ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ اس آیت کے اگلے ہی دو لفظوں یا چار لفظوں میں عیسائیت کے Mercy کے تصورِ (Concept) رحم کو اور قرآن کے تصور (Concept) رحم کے فرق کو واضح کر دیا۔ God is mercy , God is love یہ کچھ کہا: خدا محبت ہے' خدا Mercy (رحم) ہے۔ ان کے ہاں عدل کا تصور ہی نہیں ہے' اِن کے ہاں Justice کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے ہاں رحم ہی' رحم ہے یعنی یہ چیز ہے کہ مجرموں سے بھی رحم کرو' دشمن سے بھی محبت کرو' تمہارے ایک گال پہ کوئی طمانچہ مارے تو اپنا دوسرا گال آگے کر دو' اگر کوئی تمہارا اوا سکٹ اتار کے لے جاتا ہے تو کرتا خود ہی اتار کے دے دو۔ تمہارے ہاں اگر کوئی چور چوری کرتا

ہے اور وہ جوری کا سامان اتنا زیادہ وزنی ہوگیا ہے کہ اس سے اٹھایا نہیں جاتا تو خود اٹھا کے اس کے گھر چھوڑ آ ؤ۔ ادھر خدا کا بھی ان کا عقیدہ ہے جو سینٹ پال نے وضع کیا تھا کہ اعمال کے بدلے میں نجات نہیں مل سکتی۔ تو پھر کون ہے جو عمل کر سکتا ہے۔ اور کیونکر عمل کر سکتا ہے کیونکہ اعمال کے بدلے میں تو نجات ہے ہی نہیں۔ نجات تو صرف خدا کے رحم پہ منحصر ہے صاحب! تو رحم کے اس Concept کے متعلق ہم سے نہیں خود آج یورپ میں ان عیسائیوں کے نمائندوں سے پوچھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں دو ہزار سال سے ظالموں نے جو دھاندلی مچائی ہے' اُس میں نوے فیصد اثر عیسائیت کی اِس تعلیم کا ہے۔ ان کے جرائم کی باز پرس ان سے ہوگی۔ جب آپ ظالم کے متعلق بھی یہ تعلیم دینا شروع کر دیں تو ظلم کو کوئی نہیں روکے گا اور عدل والی بات دیکھیے یہ کتنی قابل قبول اور معقول تھی۔ بات بالکل صحیح تھی کہ عدل ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں جو قرآن نے الرحمۃ کہا ہے وہ کس لیے ہے؟ کیونکہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اور جو حالت ان کی ہو چکی ہے' اُس کا تو تقاضا یہ ہے کہ ان کی گرفت فوراً ہو جائے اور ان پر تباہی کا عذاب مسلط ہو جائے۔ اس لیے تم چاہتے ہو کہ ان کی فوری گرفت کیوں نہیں ہو جاتی۔ کہا: اس لیے ایسا نہیں ہوتا کہ خدا رحیم بھی واقع ہوا ہے تو پھر یہ رحمت اُس رحمت سے کیسے مختلف ہے جو عیسائیت کے ہاں ہے۔ اس کا فرق قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا (18:58)۔ ہم مہلت کا وقفہ دیتے ہیں اور اسے سمجھاتے ہیں کہ اب بھی تم باز آ جاؤ تو بچ جاؤ گے' حفاظت مل سکتی ہے' بچنے کا امکان ہے۔ وہ پہلی لغزش پہ پھانسی نہیں دیدیتا' وہ جرم کی اسی وقت سزا نہیں دے دیتا' مجرم پہ گرفت کرتا ہے' مقدمہ ہوتا ہے' سمجھایا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے کیے پہ نادم ہوتا ہے' یہ دیکھا جاتا ہے کہ فی الواقعہ اس میں اصلاح کے امکانات ہیں' اسے مہلت دی جاتی ہے۔ یہ جو مہلت کا وقفہ دینا ہے یہ قرآن کے' خدا کے تصور کا رحم ہے' یہ نہیں ہے کہ وہاں عدل نہیں ہوگا' وہ عدل تو ہوگا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ اِدھر کسی سے ذرا سی بھی لغزش ہوئی' اُدھر فوراً ہی جیسا میں نے کہا ہے' موت کی سزا دے دی۔ وہ انسان کی کمزوریوں کو جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بہت سی لغزشیں سہو و نسیان اور خطا سے ہوتی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسان میں اصلاح کی گنجائش اور امکان بھی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اس کے لیے ایک وقفہ دیتا ہے جسے مہلت کہتے ہیں۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ اگر یہ صورت ہو جائے کہ جونہی کسی سے کوئی لغزش ہو اور ہم اسے پکڑ کے فنا کے گھاٹ اتار دیں' تو اس کرۂ ارض پہ تو کوئی انسان باقی ہی نہ رہے۔ بات بھی ٹھیک ہے' صبح سے شام تک' کتنی کوتاہیاں' سہل انگیزیاں' لغزشیں' خطائیں' نسیان کی یہ چیزیں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے بعد اگر یہ وقفۂ مہلت کا نہ ملے تو باز آفرینی کی گنجائش ہی نہیں رہتی' اصلاح کا امکان نہیں رہتا۔ اس لیے کہا کہ یہ جو ہماری مغفرت ہے' رحمت ہے وہ اس لیے ہے کہ انہیں اصلاح کے لیے کچھ وقت ملنا چاہیے اور جب اس کے بعد بھی پھر ان کی یہی کیفیت ہو کہ اس وقفے میں بھی یہ اپنی اصلاح نہ کریں بلکہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اس لیے وہ اپنے مظالم اور دھاندلی' ناانصافی میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جائیں تو پھر وہ آخری وقت آ جاتا ہے۔ جب ان مظالم کا پلڑا اتنا جھک جاتا ہے کہ پھر خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے گرفت ہوتی ہے پھر اس وقت یہ مہلت کا وقفہ باقی نہیں رہتا۔ یہ ہے فرق عیسائیت کے

تصورِ رحم (Concept of Mercy) میں اور قرآن میں خدا کے دیئے ہوئے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے رحم کے تصور میں۔ قرآن کا تصورِ رحم یہ نہیں کہ عدل ہوتا ہی نہیں ہے۔ رحم یہ ہے کہ اگر باز آفرینی کا موقعہ ہے' اگر اصلاح کی گنجائش ہے' تو اس کے لیے موقعہ دینا چاہیئے یہ اس باز آفرینی یا اصلاح کے لیے موقعہ دینا ہے۔ قرآن کا تصورِ رحم یہ نہیں ہے کہ ظالم سے قطعاً کسی قسم کی باز پرس ہی نہ ہو' اُسے چھٹی دے دی جائے' یہ تصورِ رحم نہیں ہے۔

مہلت کے وقفے سے فائدہ حاصل نہ کرنے والی قوموں کا حال

کہا: یہ سارا کچھ کرنے کے بعد جن قوموں نے مہلت کے وقفے سے فائدہ نہ اٹھایا' اس وقفے (Respite) کو انہوں نے Abuse کیا اور وہ اپنے جرائم میں آگے ہی آگے بڑھتی گئیں تو ان کا انجام کیا ہوا؟ پھر انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکی۔ کہا: اس کے بعد جب فرصت کا وقت ختم ہوا' جب مہلت کا وقفہ ختم ہوا اور دیکھا گیا کہ وہ اپنی اصلاح کی بجائے اور زیادہ ظلم و تعدی اور سرکشی میں بڑھتی چلی جارہی ہیں تو پھر کیا ہوا؟ قرآن نے یوں نہیں بتایا کہ کیا ہوا؟ قرآن کا جو انداز ہے' اسی میں کہا: **وَتِلْكَ الْقُرٰىٓ اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا** (18:59)۔ جاؤ' جا کے پوچھو ان کھنڈرات سے' ان بستیوں کے کھنڈرات سے کہ جن میں یہ قومیں بستی تھیں کہ پھر کیا ہوا؟ قرآن کا بات کرنے کا یہ عجیب انداز ہوتا ہے: کہ ہم سے نہ پوچھو' ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھو کہ جنہوں نے مہلت کے وقفہ میں اپنی اصلاح نہ کی' آخر تک اپنے ظلم و تعدی میں گرتی چلی گئیں' اس کا انجام جا کے ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے پوچھو' اس لیے کہ پھر ان کا وہ مہلت کا وقفہ ختم ہو گیا تھا اور پھر تباہی اور ہلاکت آ گئی۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کا تصورِ عدل اور اس عدل کے اندر رحم کا تصور۔

اصل میں جو پچھلا درس تھا اس کی دو آیتیں باقی رہ گئی تھیں۔ یہ اسی کا تسلسل چلا آ رہا تھا جو یہاں بیان کیا۔ آگے ایک بات شروع ہوتی ہے کہ انسان کی طبیعت جلد باز واقع ہوئی ہے اور وحی کا پروگرام کچھ مہلت کا وقفہ چاہتا ہے' وہ برداشت چاہتا ہے' سہار چاہتا ہے' اسی لیے خدا کی ایک صفت ''حلیم'' بھی ہے۔ بہت سہار والا' ثقاہت والا جس کو ہم ثقہ کہتے ہیں: یونہی مشتعل نہ ہو جانے والا۔ ایسا ضبط رکھنے والا کہ غیظ و غضب کے موقعہ پر بھی بھڑک نہ اٹھے' متانت ہو سنجیدگی' فہم و تدبر' فرزانگی اور وقار والا۔ جسے نہ نافرمانوں کی نافرمانیاں بھڑکائیں اور نہ اسے غصہ جلد بازی اور اوچھے پن پر اُکسائے۔ یونہی جذبات میں نہ بھڑک اٹھے۔ اس صفت کے برعکس ہے: جلد باز' عجلت والا' ضبط نہ رکھنے والا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر کا افسانہ

ان دو طبائع کے تقابل کے لیے اگلا قصہ ہمارے سامنے آتا ہے جو عام طور پر ہمارے ہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات کا قصہ کہا جاتا ہے' جسے ہمارے ہاں عجیب و غریب افسانہ بنایا گیا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ جا کے ایک بزرگ سے ملتے ہیں اور ہمارے ہاں اس

بزرگ کا نام خضر رکھا جاتا ہے اور پھر ان کے نام کے ساتھ علیہ السلام بھی کہا جاتا ہے' انہیں نبی بھی شمار کیا جاتا ہے۔ جب کہ قرآن میں خضر کا نام ہی نہیں ہے۔ اور پھر ان کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ انہیں ہوا کا دوام حاصل ہے اور پھر ان کے ہاں یہ بھی منسوب ہے کہ وہ آبِ حیات جانتے ہیں یعنی جسے وہ آبِ حیات پلا دیا جاتا ہے وہ بھی ساری عمر زندہ رہتا ہے۔ تو یہ سارے افسانے ہیں جو اُن سے منسوب ہیں۔ پھر یہ چیز بھی ایک سوال کی صورت میں ابھرتی ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ایک نبی تھے' وہ تعلیم یا علم حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے نبی کے پاس جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ نہیں' وہ نبی نہیں تھے' وہ ہمارے آگے اربابِ طریقت آئے تھے۔ یہ تصوف والے آئے تو کہنے لگے: وہ اپنے زمانے میں قطب تھے اور وہ اب بھی زندہ ہیں' ان سے ملتے ہیں۔ حضرت صاحب روز ان کے ہاں ہوتے ہیں بلکہ یہ تو ان کے ہاں ہوتے ہیں (12:40)۔ انہیں پانیوں کا بادشاہ کہتے ہیں۔ سچ کہا تھا قرآن کریم نے کہ تم لوگ مختلف خداؤں کے سامنے جھکتے ہو' کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ اِن خداؤں کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے؟ بس اتنی ہی ہے کہ یہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں' ورنہ ان کی اپنی کوئی حقیقت اور پوزیشن نہیں ہے' خدا نے ان کے لیے کوئی سند نہیں بھیجی (12:40)۔

خدا حقائقِ دین بیان کرتا ہے لطائف نہیں

میں نے عرض کیا کہ عزیزانِ من! یہ کہانیاں ہیں۔ قرآنِ کریم ملاقات کی بات کرتا ہے لیکن اُس قصے کی نہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہے۔ پھر جب یہ کہانیاں اور افسانے شاعروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں تو پھر تو پوچھو ہی نہیں کہ اس قصے کو وہ پر سے ''ڈار''[1] کیسے بناتے ہیں۔ تصوف اور شاعری کے لیے افسانہ بڑا ہی کارگر ہوتا ہے۔ یہ بہت کام دیتا ہے۔ یہ حقائق نہیں ہوتے عزیزانِ من! یہ لطائف ہوتے ہیں۔ دین حقائق کا نام ہے' یہ سامریت نہیں ہے۔ سامریت کے معنی ہوتے ہیں: ''رات کو نانی اماں بچے کو کہانی سنایا کرتی ہیں تاکہ وہ سو جائے' قوموں کو سنانے کے لیے جو کہانیاں بیان کی جاتی ہیں' وہ سامریت ہے۔'' سامری کے معنی ''راتوں کو سلانے کے لیے کہانیاں سنانے والے کے ہیں۔'' اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) نے یہی کہا ہے:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے

دین یا اسلام تو بڑی مختصر سی بات تھی لیکن غیر قرآنی فکر نے' داستان کو دل خوش کُن بنانے کے لیے اسے خوب خوب سجا دیا ہے۔ عجم کے معنی ہی غیر قرآنی فکر کے ہیں اور یہاں اندیشہ کے معنی فکر کے ہیں۔ اب تو مجھے یہ اردو کے شعر کو بھی سمجھانا پڑتا ہے:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

---

[1] جانوروں کا جھنڈ

یہ جو سامریت ہے یہ درحقیقت زیبِ داستان ہے۔ مذہب میں عزیزانِ من! یہ سب زیبِ داستان آپ کے سامنے آتے ہیں' حقائق نہیں سامنے آتے۔ بات تو وہی ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ ایک نبی جو ملنے کے لئے' کسی دوسرے کے پاس جاتا ہے' وہ علم حاصل کرنے کو نہیں جاتا۔ اسے تو خدا براہِ راست علم دے رہا ہے' وہ اب دوسروں کے پاس علم حاصل کرنے کو کاہے کو جائے گا۔ اب جب اہلِ تصوف کو دیکھیے تو وہ تو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ہمارے نبی ان کے پاس آتے تھے۔ اللہ اکبر یاللعجب! ٹھیک ہے جو اور آگے بڑھے تو اللہ میاں بھی ان سے کچھ سیکھنے کے لیے ان کے ہاں آتے ہونگے!! معاذ اللہ!!

عجمِ باراں ہی ٹھہرا تو چلے پھر قصہ

مقامِ نبوت اور مفکر میں فرق

عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرتِ موسیٰ کی نبوت ملنے کے بعد کا ہے ہی نہیں۔ یہ نبوت ملنے سے پہلے کی بات ہے۔ قرآن نے نبی کی طبیعت کی کیفیت کا یہ بتایا ہے کہ اسے قبل از نبوت تجسس ہوتا ہے۔ وہ حاضر و موجود سے جو کچھ بھی اس دور کا موجود یا حاضر ہوتا ہے' مثلاً مروجہ معتقدات' روشِ معاشرہ' وہ ان تمام سے مطمئن نہیں ہوتا۔ از خود تجسس نام کی ایک چیز اس کے اندر ہوتی ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ سمجھتا یوں ہے کہ یہ بھی غلط ہے اور وہ بھی غلط۔ یہ تو اس کے اندر کی طبیعت کہتی ہے لیکن صحیح کیا ہے؟ اس کا اسے علم نہیں ہوتا۔ صحیح کیا ہے' کا علم تو وحی دے سکتی ہے۔ تجسس پیدا ہو سکتا ہے لیکن صحیح کیا ہے' اس کی پہچان نہیں ہو سکتی۔ یہ پہچان وحی سے ہوتی ہے۔ یہ فرق ہے ایک مفکر میں اور ایک نبی میں۔ مفکر کے اندر تجسس پیدا ہوتا ہے وہ مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ عقل و بصیرت کی رُو سے بات ٹھیک نہیں ہے' معقولیت کے پیمانے پہ بھی وہ بات ٹھیک نہیں اترتی' وہ بات انسانیت ساز بھی نہیں ہے۔ ''نہیں ہے' نہیں ہے'' یہ تو وہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ''ہے کیا'' کا اسے علم نہیں ہوتا۔ وہ ''کیا'' کی تلاش میں اِدھر اُدھر سرگرداں پھرتا ہے۔ یہ وہ ہے جو نبی اکرمؐ کے متعلق بھی کہا تھا کہ **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى** (93:7)۔ تو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھر رہا تھا تو اس نے بذریعہ وحی زندگی کے صحیح راستے کی طرف تیری راہ نمائی کر دی۔

نبی گمراہ نہیں ہوتا بلکہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ کر کے' پوچھو نہیں کہ اصل مقصد کا کس طرح کچومر نکال دیتے ہیں۔ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ہم نے' معاذ اللہ معاذ اللہ' تمہیں گمراہ پایا اور ہدایت دے دی۔ ''گمراہ'' نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: ''تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھرنا۔'' یہ کیفیت ہر نبی کی ہوتی ہے' سب سے بڑے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق بھی یہی چیزیں آتی ہیں۔ بہرحال یہ کیفیت قبل از نبوت کے زمانے کی ہوتی ہے کہ وہ **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا** (93:7) ہوتا ہے۔ اُسے تلاشِ حقیقت میں حیران و سرگرداں پایا

جاتا ہے۔ حقیقت بھی اُسی کے سامنے آ سکتی ہے ہدایت اور سچائی بھی وہی پا سکتا ہے جس کے اندر پہلے حقیقت معلوم کرنے کی یہ خلش اور تڑپ ہو۔ جو حاضر و موجود پہ مطمئن ہو کے بیٹھ جائے' سوال ہی نہیں کہ اس کے سامنے حقیقت آ جائے۔ وہ تو مطمئن ہے' جو کچھ بھی اس کے سامنے ہے اس سے مطمئن ہے۔ ہم سے زیادہ تو یہ یورپ کے مفکر بعض اوقات ایک بات کہہ جاتے ہیں۔ White Head ہمارے دور کا بہت بڑا افلاسفر ہے۔ حال میں اس کا انتقال ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''بت پرستی کیا ہے؟ حاضر و موجود پر مطمئن ہو جانا۔'' یہ بڑی عجیب چیز ہے لیکن اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) کے الفاظ میں جس کو تلاشِ حقیقت ہو اس میں تو پہلے یہ کیفیت پیدا ہونی چاہیے:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

یہ جو تڑپ اور خلش حاضر و موجود سے عدمِ اطمینان ہے اور یہ کہ ''یہ بھی غلط' ہے اور وہ بھی غلط' جب یہ چیز شدت اختیار کر لیتی ہے تو وہ جو ہونے والا نبی ہوتا ہے اس کے سامنے حقیقت خود اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ پہلے اس کے اندر اُس دَور (Age) میں یہ شدت پیدا ہوتی ہے جو نبوت سے پہلے کا زمانہ ہوتا ہے۔ نبوت سے پہلے صرف تڑپ' خلش' تلاش' تجسس کی ہی چیز ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ 'تو' تو کل تک یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ''کتاب کسے کہتے ہیں؟ اور ایمان کیا چیز ہوتی ہے؟'' یعنی اسے تو اس کا بھی علم نہیں ہوتا لیکن تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھر رہا ہوتا ہے۔ یعنی جو موجود ہے اس سے وہ مطمئن نہیں اور جو حقیقت ہے اسے وہ جانتا نہیں' وہ چیز ابھی اس کے ادراک میں نہیں آئی۔ اور جب وہ حقیقت اپنے آپ کو اس پہ ظاہر کر دیتی ہے قرآن کے الفاظ میں ''اور انہیں اپنے ہاں سے تمام نعمتیں عطا کیں اور ان کی زبانوں سے ایسی صدائیں بلند کرائیں جو صداقتوں اور رفعتوں کی علمبردار تھیں اور جن کی وجہ سے خود ان کا نام بھی دنیا میں روشن اور بلند ہے۔'' (19:50) ' حقیقت اس کے اوپر منکشف ہو جاتی ہے' وہ خود اس حقیقت کا پردہ نہیں اٹھاتا بلکہ وہ حقیقت خود اس کے سامنے بے نقاب ہوتی ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ پھر اس وحی کے ملنے پر وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

فرعونی سیاست سے بے زاری اور حقیقت کی تلاش میں سرگرمِ عمل

یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا نبوت سے پہلے کا زمانہ ہے۔ وہ تو آپ کو معلوم ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہوئے' فرعون [1] کے محلوں کے اندر پرورش پائی' کیونکہ انہیں بعد میں اتنی بڑی سیاست سے ٹکراؤ لینا تھا تو محلات کے اندر کے جو راز دار پردہ در تھے' ان سے بھی تو واقفیت ضروری تھی۔ یہ ایسے ہی نہیں آ کے ٹکر لے لی تھی۔ جو محکوم قوم کے اندر پیدا ہوتے ہیں' وہ محکوم قوم کو شریکِ حکم نہیں کرتے' کبھی بھی شریکِ حکم نہیں کرنے دیتے۔ حکومت کے اندر کے راز تو ان کے اوپر وہ کھولتے ہی نہیں ہیں۔ بنی اسرائیل کا

---

[1] ''فرعون'' کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور 2004ء ص 123 عنوان فرعون فٹ نوٹ۔

ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس کا امکان کیسے تھا کہ پتہ چلتا کہ سیاست کے اندرونِ پردہ کیا کیا سرائز اور کیا کیا رموز ہیں اور کیا کیا تدابیر اور مکاریاں ہوتی ہیں۔ اس کا علم کیسے ہوسکتا تھا؟ یہ تھی تدبیر جو مشیت کی تھی کہ بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں اور فرعون کے محلوں کے اندر پرورش کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں سب کچھ معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے بعد جب وہاں سے غیر مطمئن ہوتے ہیں تو پھر یہ نکلتے ہیں' بھاگتے ہیں۔ جب یہ واقعات آئیں گے' تو میں بتاؤں گا۔ ظالم اور مظلوم کی جو ایک کشمکش ہے وہ تو دل کے اندر وہیں سے شروع ہوگئی تھی' جبھی تو اس ظلم کرنے والے کے ہاتھ کو پکڑ کر اُسے ایک مکا مارا تھا۔ ضربِ کلیم جو تھے۔ بہرحال' وہاں سے یہ نکلتے ہیں اور حقیقت کی تلاش ہے۔ اسی تلاشِ حقیقت میں یہ چیز تھی کہ معلوم ہوا کہ کہیں دوسرے مقام پر کوئی ایک شخص ہیں' ان کی خاصی شہرت ہوگی' آگے چل کے معلوم ہوگا: صاحبِ علم بھی ہیں' صاحبِ حکمت بھی' تقویٰ شعار بھی ہیں' نیک سیرت بھی ہیں۔ اب ضروری نہیں کہ وہ نبی ہوں۔ قرآن نے بالخصوص' باصراحت' ان کو نبی کہہ کے نہیں پکارا۔ قرآن میں دو تین الفاظ آتے ہیں جس سے یونہی ذہن ادھر جاتا ہے۔ کہ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم وحکمت دی تھی۔ لیکن یہ بات تو قرآنِ کریم صرف نبی کے لیے کہتا ہے جبکہ ایسا عام علم جو انسان عام طریقوں سے حاصل کرتا ہے اس کے لیے بھی خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم اسے علم دیتے ہیں۔ وہ تو پہلے کہتا ہے: **عَلَّمَ الْاِنْسَانَ** (96:5)۔ ہر انسان کو ہم علم دیتے ہیں۔ **عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4)۔ اس کو لکھنا سکھاتے ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ انسان یہ چیزیں حاصل تو اپنے ہی طریق سے' اپنی ہی صلاحیتوں سے کرتا ہے لیکن چونکہ انسان کے اندر اس کی بنیادی صلاحیت خدا نے دی ہوئی ہے' اس لیے وہ اسے اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے۔ میں یہ باتیں پہلے درسوں میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ انسانوں کے اپنے اس قسم کے کاموں کو بھی خدا اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے۔

بہرحال جو میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن نے باصراحت یہ نہیں کہا کہ یہ نبی تھے' نہ ہی اس کے لیے خضر کا لفظ آیا ہے' نہ ہی وہ پانیوں کے بادشاہوں کی بات ہے' نہ ان کے ہمیشہ زندہ رہنے کا کہیں قصہ ہے' یہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک نبی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھر رہا ہے۔ وہ جو خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی یہ آتا ہے کہ ٹھیک ہے آپ ان کے پاس بھی جاتے تھے جو کہتے تھے کہ ''یہ شخص' اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طرف سے جھوٹی باتیں بناتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ ہم اس کی بات کبھی نہیں مانتے کے'' (23:38)۔ آپؐ ان کے پاس بھی جاتے تھے' جو یہودیوں کے مشائخ تھے' احبار تھے۔ ان کے ہاں آپ علیہ السلام جا کے سنتے تھے لیکن ہر جگہ سننے کے بعد پھر یہ کہہ کر غیر مطمئن اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ:

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ان ''بزرگ'' کے متعلق آگے بات آتی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی عمالِ حکومت میں سے تھے' صاحبِ مجاز تھے' کوئی افسر تھے' اختیار رکھنے والے تھے لیکن سیرت میں عدل تھا' پاکیزگی تھی' نہایت عمدہ علم وحکمت حاصل تھی۔ بہرحال' ان کی ایک شہرت تھی جن کے پاس

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام گئے۔ اب بات یہاں سے شروع ہوتی ہے: **وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِفَتٰهُ** (18:60)۔ حضرت موسیٰ اور آپ کے ساتھ ایک جوان ساتھی تھا تو اس طرح موسیٰ اپنے ایک نوجوان رفیق کے ساتھ مصروف جادہ پیمائی تھا۔ سفر لمبا تھا' اُس کا رفیق اکتا گیا لیکن موسیٰ نے کہا: **لَآ اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا** (18:60)۔ میں چلنا نہیں چھوڑوں گا' مسلسل و بدستور چلتا رہوں گا حتیٰ کہ دو دریاؤں کے سنگھم پر پہنچ جاؤں' اس مقام تک جا پہنچوں جہاں دونوں دریا ملتے ہیں' خواہ اس میں مجھے کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

قرآن کا انداز بیان

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم جب کوئی کہانی یا قصہ بیان کرتا ہے تو وہ ہمارے انداز سے کڑی در کڑی نہیں دیئے جاتا۔ اس کا انداز بڑا بلند' ادیبانہ' اور دلیلانہ ہے' وہ درمیان کی کڑیاں چھوڑتا جاتا ہے۔ یہ وہی کچھ ہے جسے ہم ایمائیت Suggestiveness کہتے ہیں۔ قرآن اشارہ کرتا ہوا' آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور ہماری فکر پہ چھوڑتا چلا جاتا ہے کہ ہم خود ان کڑیوں کو جوڑتے چلے جائیں۔ یہ بڑا پیارا انداز ہے۔ آپ کو بھی تو کچھ کرنا چاہیے: کڑیاں چھوڑے بغیر کہانی تو بچہ سنتا ہے' اس کا اپنا ذہن پورا نہیں ہوتا' وہ نانی اماں سے پوچھتا ہے پھر کیا ہوا۔ لیکن وہی کہانی جب بالغ سنے گا تو کئی کڑیاں خود ملا لے گا کہ پھر کیا ہوا۔ تو قرآن جو کہانی بیان کرے' جو کسی واقعہ کو بیان کرے' تو اس میں اس کیفیت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے کہ یہ کہانیوں کی یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ نے اپنے ساتھی کو ساتھ لیا اور ایک سفر کی طرف چل نکلے اور وہاں چلے گئے جہاں دو پانی ملتے ہیں۔ اب یہاں انہیں اس کی تحقیق کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ دو پانی کہاں ملتے ہیں اور وہ کہاں چلے گئے لیکن ہمارے ہاں تو جب ملکتیں تھیں' فراوانی سے کھانے کو ملتا تھا' یہ جنہیں ہمارے ہاں محققین کہا جاتا تھا' ان کے وظیفے لگے ہوئے تھے۔ انہیں اب کام تو کوئی اور تھا نہیں تو میں پھر پنجابی کا ہی محاورہ ہی کہوں گا: ''ویلی جٹی اون ویلے' ایہہ اون ویلدے رہندے سن'' [1] کہ جی وہ کونسا مقام تھا جہاں جا کے یہ دو پانی ملے۔ ارے اس سے خاص تاریخ کا کیا تعلق ہے۔ تو ہم نے صرف اتنی بات کہی کہ وہ کسی مقام پر جا کر ملے۔ بات ختم ہوگئی۔ ٹھیک ہے کہ یہ الگ ایک شعبہ علم ہوسکتا ہے جس میں ان چیزوں پہ بھی ریسرچ کی جاسکتی ہے۔ قرآن کی تفسیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ جب تک ہم وہ جگہ نہ معلوم کرلیں' بات آگے نہ بڑھے۔ قرآن تو خود جس چیز کو یوں چھوڑتا ہے ہمیں کیا ضرورت ہے۔ بہرحال انہوں نے وہاں سے بھی آگے جانا ہوگا' لمبا سفر ہے۔ کہا: **فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا** (18:61)۔ پھر وہ اُس مقام پر پہنچے جہاں دونوں دریا ملتے تھے۔ **نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا** (18:61)۔ پھر جب اُٹھ کر روانے ہوئے' تو اُنہیں اُس مچھلی کا خیال نہ رہا جسے انہوں نے اپنے ساتھ بطور توشہ رکھ لیا تھا۔

---

[1] فارغ ''جٹی'' جاٹ کی بیوی' نہ کام کی نہ کاج کی۔ بس اون ہی بیلے۔ یہ بھی اون ہی بیلتے تھے۔

اُس مچھلی نے دریا تک پہنچنے کا راستہ نکال لیا اور اس طرح پانی میں پہنچی۔ اس زمانے میں آپ دریا کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے پانی کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے، ندی ہوگی، دریا ہوگا۔ ساتھ سامانِ سفر کچھ زیادہ نہیں تھا۔ تازہ مچھلی پکڑی، اسے وہیں بھونا، کھالیا۔ مچھلی تو ایک بہترین غذا ہے۔ اور کسی ایک جگہ چٹان کے پاس قیام کیا، یہ آگے آتا ہے کہ مچھلی پکڑی اور وہیں کہیں چٹان کے قریب رکھ دی۔ مچھلی تھی زندہ، تھی بڑی مچھلی۔ قرآن نے تو ایک لفظ ''سربا'' کہہ کے بات ختم کردی۔ اس کے بعد کہیں یہ مچھلی رکھی، کام میں مشغول ہوگئے یا ستانے کے لیے کہیں سو ہی گئے ہونگے۔ مچھلی زندہ تھی وہ تڑپ تڑپ کے ''سربا'' میں اس قسم کی کیفیت ہوتی ہے، وہ پھر پانی میں چلی گئی۔ بات تو اتنی سی تھی۔ اس میں کونسی ایسی چیز ہے! یہ سفر کے لیے اٹھے، اٹھ کے، اپنا جو کچھ بھی تھوڑا بہت سامان تھا، وہ لیا اور لے کے چلے گئے، مچھلی لینا بھول گئے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ اٰتِنَا غَدَآءَ نَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا (18:62)۔ جب وہ اُس مقام سے آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا کہ سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا۔ لاؤ ناشتہ کرلیں۔ یعنی جس وقت صبح وہاں اٹھے، انہوں نے کہا کہ ہاں بھئی! وہ کھانے کے لیے لاؤ۔ اب نظر آتا ہے کہ دریا سے ذرا ہٹ گئے ہونگے، خشکی کی طرف چلے گئے، تو کہا: وہ مچھلی لاؤ، ہم نے اسی لیے رکھ لی تھی۔ اس ساتھی نے کہا ''اوہو یارا و تو سانوں بھل ای گئی، اتھے رہ گئی''[1] بڑی سادہ سی بات ہے، ہم بھول گئے۔ انہوں نے کہا: بھول میں بھی گیا، تو ٹھیک ہے اکٹھی بات تھی اسے بھول گئے۔ **قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ** (18:63)۔ تو ساتھی نے انہیں کہا کہ بھول تو گئے ہی تھے، راستے میں یاد نہیں آیا کہ مچھلی بھول گئے بس یونہی میں تم سے ذکر کرنا بھول گیا۔ جیسا وہ ہمارے ہاں کا قاعدہ ہے کہ اب اِس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ شیطان نے ایسا کیا کہ میں تم سے بات ہی نہیں کر سکا۔ **وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا** (18:63)۔ اور وہ جو مچھلی تھی وہ تو وہاں سے پتہ کیا، وہ تو تھی نہیں، وہ تڑپ کے، سرکتے سرکتے پانی میں چلی گئی تھی۔

تفاسیر میں مچھلی کی زیب داستان

عزیزانِ من! یہاں ''عجبا'' لفظ آتا ہے اور یہیں سے ہمارے ہاں کہانی شروع ہوتی ہے۔ اس مچھلی کا اندر جانا کوئی بڑی تعجب انگیز بات تھی اور پھر زیبِ داستاں کے لیے آیئے تفسیروں کی طرف۔ اس مچھلی کی لمبائی چوڑائی اور قسم گنی جا رہی ہے، کہا جا رہا ہے کہ بھونی ہوئی تھی، فلاں فلاں مسالہ لگایا ہوا تھا، تلی ہوئی تھی، وہاں رکھی ہوئی تھی اور پھر اس کے اندر خاص طور پہ جان ڈال دی۔ پتہ نہیں: کوئی کہے شیطان نے ڈال دی، کوئی کہے، کسی جن نے آکے ڈال دی کہ انکو کھانے کو نہ ملے، وہ پھر زندہ ہوگئی: تلی ہوئی، بھنی ہوئی، مسالے لگی ہوئی مچھلی اور پھر از سرِ نو زندہ ہو کے پانی کے اندر پہنچی اور پانی میں پہنچی تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھ لیا اور وہ ان کے پیچھے چلے، مچھلی آگے آگے، حضرتِ

---

[1] ارے دوست! صد افسوس، وہ تو ہم بھول ہی گئے تھے، وہ تو وہیں رہ گئی۔

موسیٰ علیہ السلام پیچھے پیچھے' جاتے جاتے کہیں سات سمندر پار وہ ایک جزیرہ میں پہنچی' یہ بھی وہاں پہنچے۔ یہ جو وہاں پہنچے تو وہ مچھلی جزیرہ میں ''گرم'' اور یہ اکیلے کھڑے رہ گئے۔ یہ ہیں تفسیریں آپ کے ہاں کی۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ ''اب کہو کہ جو لوگ ایسے واضح حقائق کو یوں جھٹلاتے ہیں انہیں راہِ راست پہ کس طرح لایا جاسکتا ہے؟ تو زندہ انسانوں کو تو بات سنا سکتا ہے' مردوں کو نہیں سنا سکتا(36:70) نہ ہی بہروں کو سُنا سکتا ہے جب کہ وہ سننا ہی نہ چاہیں' بلکہ منہ پھیر کر چل دیں۔(30:52)۔ کہیں تو اِن تفسیروں میں یہ بھی ہے کہ وہ مچھلی چلتی جاتی تھی' تو یہ پانی خود ہی پھٹ کے الگ ہوتا جاتا تھا۔ یہ اس مچھلی کے چلنے سے سمندر پھٹتا چلا جاتا تھا۔ آگے آگے وہ تھی پیچھے پیچھے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام چلے جارہے۔ یعنی یہ چیزیں' جو میں نے عرض کیا ہے کہ وعظ میں زیبِ داستاں ہے۔ لطف پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہ جو عجبا ہے' یہ اس کا قول ہے کہ ''عجیب تعجب کی بات ہے کہ میں آپ سے ذکر کرنا بھی بھول گیا۔'' محاورۃ باتیں کرتے ہوئے کہ صاحب! یہ تو عجیب ہے۔ بظاہر تو آپ کو نظر آئے گا کہ تمہیں معلوم ہوگیا تھا تو تم نے مجھے ذکر کیوں نہ کیا۔ کہنے لگے: یہ عجیب ہی بات ہے۔ یعنی یہ روزمرہ کا محاورہ ہے کہ صاحب! کچھ عجیب سی بات ہے کہ میں بھی آپ سے ذکر کرنا بھول گیا اور آپ بھی اٹھتے ہوئے مچھلی کی بات بھول گئے ہیں اور عجیب بات ہے کہ میں تو آپ سے ذکر کرنا ہی بھول گیا۔ چلیں بہرحال وہ مچھلی تھی' وہ تڑپ کے پانی میں چلی گئ' قصہ ختم ہوگیا۔ یعنی بات تو صرف اتنی تھی لیکن تفاسیر کی زیب داستان کا کیا کہیے۔ بہرحال انہوں نے کہا کہ واپس چلنا چاہیے۔ ایک تو یہ ہے کہ یہاں تو پانی میں کچھ کھانے کو نہیں ہے کہ کچھ اور مچھلی لیں۔ یہ کچھ انہوں نے کہا کہ چلو واپس چلتے ہیں۔ ممکن ہے' وہی جگہ ہو جس کی ہم تلاش میں تھے۔ ٹھیک ہے دو مسافر ہیں' نیا راستہ ہے' وہ چلے جارہے ہیں اور وہ اس قسم کے راہِ گم کردہ راہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

قَالَ ذٰلِکَ مَا کُنَّا نَبۡغِ فَارۡتَدَّا عَلٰۤی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا. فَوَجَدَا عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ اٰتَیۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا (18:64-65)۔ موسیٰ نے کہا کہ اب مجھے خیال پڑتا ہے کہ ہم جس مقام کی تلاش میں ہیں' وہ وہیں کہیں پر تھا۔ ہم غلطی سے آگے نکل آئے ہیں۔ سو وہ دونوں پچھلے پاؤں لوٹے۔ وہاں انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ مل گیا' جسے ہم نے اپنے ہاں سے' سامان رحمت یعنی (وحی کا) علم عطا کر رکھا تھا۔ اب یہ زیبِ داستاں کے لیے یہاں سے یہ سب کچھ لیتے ہیں۔

وہاں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ انہیں ملا۔ قرآن نے اس کا بھی متعین طور پر نہیں بتایا۔ نہ نام' نہ کنیت' نہ یہ کہ وہ کون تھا' کیسا تھا؟ اس قصے میں تو اس کا سوال ہی نہیں ہے قرآن تو اصل مقصد تک آتا ہے۔ اس قسم کی تاریخی تفصیلات Details نہیں دیتا۔ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے' قصوں کی کتاب نہیں ہے۔ بات تو اس نے یہ کہنی ہے کہ ایک شخص معلومات کی بنا پر کچھ کام کرتا ہے' جسے ان کا علم نہیں ہوتا اور طبیعت ہوتی ہے ذرا تیز سی کہ وہ صبر نہیں کرتا' وہ جھٹ سے پوچھتا ہے کہ تو نے یہ کیا کیا۔ وہ کہتا ہے: ذرا ٹھہر' تھوڑا سا انتظار کر' تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں نے یہ کیوں کیا ہے۔ یوں یہ ہوا کہ تمہیں اس بات کا علم ہے نہیں' یا تو یہ صورت ہو کہ انتظار کرو' مجھ سے پوچھو یہ کیسے ہوا' تم نے اعتراض کر دیا کہ یہ تم نے کیا کیا صاحب! تمہیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے تھا' ارے بھئی! پہلے سن تو لو۔ آپ دیکھیے

کہ ہمارے ہاں بغیر معلوم کیے ہوئے' بغیر اتنا انتظار کیے ہوئے' روزمرہ یہ کچھ ہوتا ہے۔ کہ وہ بتائے کہ یہ کیا بات ہے' خود ہی الزام بھی دھر دیتے ہیں' اعتراض بھی کر دیتے ہیں' جھگڑا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے بات تو سن لیں' معلوم تو کر لیں۔

انسان کے لیے نفسیاتی راہنمائی کی ضرورت

عزیزانِ من! بات ساری یہ ہے کہ ایک شخص جسے معلومات نہیں ہیں' اس کے ساتھ چلتا ہے جسے معلومات ہیں اور وہ معلومات کی بناء پہ کچھ کرتا ہے اور وہ اسے کہتا ہے کہ اس معاملے میں جلدی نہ کرنا' آرام سے بیٹھنا' میں تمہیں سب کچھ سمجھا دونگا۔ حضرتِ موسیٰؑ کی پوری سیرت دیکھ کے بھی یہ نظر آتا ہے کہ ذرا جلالی طبیعت کے آدمی تھے' یہ بہت جلدی تیزی میں آ جاتے تھے۔ تو ان کی وہی چیز یہاں بھی بتائی گئی ہے کہ اُن میں ذرا سے تحمل' تھوڑے سے سہارے' علم حاصل کرنے کے لیے جو تھوڑی سی برداشت کی ضرورت ہوتی ہے' کی کمی ہے۔ جوانی کا زمانہ بھی تھا' شاہکی کا عالم' محلوں میں پلے ہوئے چلے آ رہے ہیں' علم حاصل کرنے کا بھی شوق ہے' طبیعت اسی قسم کی ہے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ دو طبائع کے اندر اختلاف ہے اور بتاتا ہے کہ جس شخص نے علم حاصل کرنا ہو اس میں سہار اور برداشت کا مادہ ہونا چاہیے' اعتراض نہیں جڑ دینا چاہیے۔ پہلے پوچھنا چاہیے کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ اس قصے میں ساری بات جو قرآن بتانا چاہتا ہے یہی ہے اور یہ بات ہمارے اور آپ کے لیے بہت بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز ہے جو قرآن کہتا ہے۔

ہمارے ہاں آپ دیکھیں گے اسی نوے فیصد جھگڑے ہوتے ہی اسی طرح سے ہیں کہ وہ بغیر بات سمجھے' معلوم کیے کسی کے خلاف اعتراض کرنے' جھگڑنے کے لیے اٹھ پڑتا ہے اور پھر نتائج بھی اخذ کرتا ہے اور پھر روٹھ بھی جاتے ہیں اور ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: فساد ہو جاتے ہیں' بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ''او ہو گل تے اے سی وچوں' تے کیندا پوچھی کیوں نہ او کیندے تو دسی کیوں ناں چل اگے فیر جھگڑا''[1] طبیعت میں سہار کی ضرورت ہوتی ہے' برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور تعلیم حاصل کرنے والے کے لیے تو یہ بڑی ہی ضروری چیز ہے۔ آپ کے ہاں اس دور کے بعد آنے والا مؤرخ جو ہماری تباہی کے اسباب لکھے گا اُن میں پہلا یہی ہوگا کہ ہم میں ''سہار اور برداشت'' نہیں ہے۔ آج تو یہ اسباب و علل کوئی لکھ نہیں سکتا۔ چیز یہ ہے کہ انہوں نے طالبعلموں کے اندر اشتعال اور فساد کی ایک طبیعت پیدا کر دی ہے جبکہ علم حاصل کرنے کے لیے' جس برداشت کی ضرورت ہوتی ہے' اس کی نمود کو اُس کی نشوونما کو ختم کر دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ آج کے نوجوان میں سہار نہیں ہے' برداشت نہیں ہے' وہاں تعلیم گاہوں میں بھی نہیں ہے اور پھر وہی چیز گھر میں بھی نہیں ہے۔ باپ کے خلاف اعتراض' ماں کے خلاف اعتراض' او بابا! ذرا ٹھہرو' تھوڑا صبر کرو' کوئی تجربہ حاصل کرو' ہم سے پوچھو کہ کیا بات ہے صاحب! جواب ہوتا ہے کہ او! پوچھا ہوا ہے جی! آپ پرانے وقتوں کے لوگ' بات بات پہ ٹوکتے چلے جاتے ہیں' بات بات پہ روکتے چلے جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! آج سہار نہیں رہی۔

---

[1] ارے! اصل معاملہ تو یہ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''پوچھا کیوں نہیں؟'' اس کا جواب دیتا ہے کہ ''بتایا کیوں نہیں؟'' اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔

قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ جسے علم حاصل کرنا ہے، جسے سیکھنا ہے اس کے لیے کچھ برداشت اور سہار کی بڑی ضرورت ہے۔ بات جو بظاہر تمہیں نامعقول سی نظر آ رہی ہے، اس لیے کہ تمہارے پاس معلومات نہیں، یہ معلومات آ جائیں گی تو تم خود قائل ہو جاؤ گے کہ بات اس نے ٹھیک ہی کہی تھی: اعتراض نہ کرو، انتظار کرو کہ وہ سمجھائے گا کہ جی! سارا کچھ یہ ہے۔ قرآن نے یہاں کہا کہ وہ ہمارا ایک بندہ تھا۔ بس بات ختم ہو گئی۔ اسے یہ کہا ہے: **عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا** (18:65)۔ جسے ہم نے اپنے ہاں سے، سامانِ رحمت یعنی (وحی کا) علم عطا کر رکھا تھا۔ یہاں پر **من لدنا** کے معنی ہیں: ''اپنی طرف سے'' یعنی ہم نے اپنی طرف سے یہ دیا۔ تو جیسا میں نے ابھی یہ عرض کیا ہے اور مثالیں تو ایک طرف رہیں قرآنِ کریم میں سورۃ المائدہ ہی میں ہے کہ یہ جو کتے سے شکار کھیلتے ہیں، یہ ان شکاری کتوں کو شکار کھیلنا سدھاتے ہیں اور وہ شکار کو زندہ پکڑ کے لاتے ہیں۔ اس کام کے لیے ان کتوں کو بہت سکھانا پڑتا ہے، سدھانا پڑتا ہے۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ یہ اپنے کتوں کو اس علم کی بناء پر سدھاتے ہیں جو ہم نے انہیں دیا ہوا ہے یعنی کتوں کو سکھانے والے کو علم ہم نے دیا ہے۔ تو وہ تو خدا نے تو انہیں عام طور پہ یہ نہیں سکھایا ہوا ہوتا کہ شکاری کتوں سے کیسے شکار کیا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ انہیں جو علم ہم نے دیا ہے وہ اُس علم کی بنیاد پر ان شکاری کتوں کو سکھاتے ہیں اور ابھی میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ انسان کو ہم نے سکھایا، **عَلَّمَهُ الْبَيَانَ** (55:4)۔ ہم نے باتیں کرنا سکھایا۔ **عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4)۔ ہم نے لکھنا سکھایا تو خدا یہ سب کہتا ہے ہم نے ان شکاریوں کو سکھایا ہے، ہم نے یہ شکار کرنے کا علم دیا تو یہ جو **''من لدنا''** لفظ ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے علم دیا یعنی ضروری نہیں ہے کہ یہ وحی ہو، ہو سکتا ہے کہ وحی بھی ہو۔

اہلِ طریقت کا علم لدنی اور اس کی حقیقت

عزیزانِ من! آپ کے یہاں تو قصہ ہی اور چلا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اہلِ طریقت کے ہاں بھی ایک اصلاح ہے لیکن چونکہ آپ کبھی ان کوچوں میں گئے ہی نہیں ہیں، اس لیے آپ کو اس اصلاح کا علم نہیں ہے۔ وہ اصطلاح ہے: علمِ لدنی۔ یہ جتنے بھی اہلِ تصوف والے ہیں، ان کا جو علم ہوتا ہے، اسے یہ علمِ لدنی کہتے ہیں۔ یہ نہ کہیں پڑھا، نہ لکھا۔ یہ تو اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتا، ایک لفظ نہیں پڑھ سکتا تو پھر یہ کہاں سے علمِ لدنی ہوتا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے جی؟ وہ کہتے ہیں کہ جی! وہ خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ تو یہ جو ان کے ہاں لدنی ہے، یہ ان لوگوں نے یہاں سے لیا ہے۔ پوچھو نہیں کہ یہ کچھ یہ لوگ کہاں کہاں سے لیتے ہیں کہ صاحب! قرآن شریف میں ہے: **عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا** (18:65)۔ یہ علم لدنی ہو گیا جناب۔ انہوں نے دین کی حقیقت کو افسانہ بنا دیا۔ حقیقتیں جب اوجھل ہو جاتی ہیں، پھر افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے، بات سیدھی سی تھی کہ ہم نے جو علم اس کو دیا ہوا تھا، وہ اس علم والا ایک آدمی تھا۔ تو علم تو قرآن نے کہا ہے کہ ہم ہر انسان کو دیتے ہیں حالانکہ وہ خود ان علموں کو سیکھتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کچھ یوں نہیں ہے کہ میں انکار کرتا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ یہ صاحبِ وحی ہی ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ قرآن نے صراحت سے نہیں کہا کہ وہ صاحبِ وحی تھے۔ میں نے بھی ایک عرصے تک اس کے معنی یہی سمجھے کہ یہ صاحب وحی ہو سکتے ہیں لیکن مزید غور کے بعد میں نے جب باقی واقعات کو دیکھا تو نظر آیا کہ ضرور نہیں کہ یہ نبی ہوں، صاحب وحی ہوں۔ لیکن اگر نبی ہونگے بھی تو بہرحال یہ حضرتِ خضرؑ والی بات نہیں ہے۔ قرآن نے جس نبی کا نام نہیں لیا ہم اس شخص کا نام لے کے اس کو نبیوں میں کیسے شمار کر سکتے ہیں۔ اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن نے یہ نہیں کہا۔

قَالَ لَهُ مُوسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا (18:66)۔ جب وہ جانے لگا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آمادہ ہوں کہ اس علم میں سے جو آپ کو اس خوبی کے ساتھ دیا گیا ہے، مجھے بھی کچھ عطا فرما دیں۔ بہرحال، عزیزانِ من! یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس علاقے کا دورہ کر رہے تھے، کہیں بیٹھے ہوئے نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ''میں تو بھئی جا رہا ہوں۔'' تو انہوں نے کہا (حضرت موسیٰ نے) کہ ''اچھی بات، میں تو آپ سے کچھ سیکھنے کے لیے آیا ہوں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' کہا: ٹھیک ہے تو ساتھ ہی چلے جایئے گا۔ اب تو ہمارے ہاں کمروں کے اندر بھی بیٹھ کر اسٹوڈنٹ استادوں سے نہیں سیکھتے۔ ابھی ہمارے دور کی صورتِ حال ہے۔ میں نے بھی جو علم حاصل کیا ہے عزیزانِ من! میں بھی جو پڑھا ہوں مکتب میں، مسجد میں، پہلے وہاں بیٹھ کے ہی پڑھاتے تھے، سیر کرنے کے لیے جاتے تو شام کے وقت مولوی صاحب تو ساتھ انگلی لگا لیتے تھے اور چلتے تھے، سیر ہو رہی ہے اور ساتھ ساتھ وہ پڑھایا جا رہا ہے، گلستان پڑھائی جا رہی ہے، کوئی سبق دہرایا جا رہا ہے، وہ لوگ ایک منٹ فرصت کا ضائع نہیں کرتے تھے، تو ہم نے اس طرح سے ہی پڑھا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ''کوئی بات نہیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، چلتے بھی جائیں گے اور میں آپ سے پوچھتا بھی جاؤں گا، وہ جو رشد و ہدایت کی باتیں میں نے آپ کے متعلق سنی ہیں، میں ان میں سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔''

صاحب علم کی ہدایت اور حضرت موسٰی علیہ السلام کی جذباتی کیفیت

انہوں نے کہا کہ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا (18:67)۔ اِس تھوڑے سے وقت میں ہی تمہارے متعلق میں نے دیکھا ہے کہ تم مجھے بڑے جلد باز نظر آتے ہو جبکہ یہ علم حاصل کرنے کا مرحلہ ہے۔ اس میں بڑے سہارا اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سمجھتے ہو کہ تم میں اتنی برداشت کی قوت ہے تو پھر میرے ساتھ چلو اور وعدہ کرو کہ تم ضبط اور تحمل سے میرا ساتھ دو گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب! میں تو آیا ہی اِسی لیے ہوں: وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (18:68)۔ اُس صاحبِ علم نے خود ہی کہا کہ ''میں نے دیکھا یہ ہے کہ تو تو یونہی بات بات پر اتنی جلدی مچا دیتا ہے۔ جو بات تمہاری سمجھ سے باہر ہوتی ہے تو تم ضبط نہیں کر سکتے۔ فوراً ہی اس پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہو۔

خبر اور خُبر کے معنی میں فرق

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قرآنِ کریم اور عربی زبان عجیب زبان ہے۔ یہاں آیا ہے: خُبـرًا۔ ہمارے ہاں خبر تو عام ہے۔ جسے انگریزی میں نیوز (News) کہتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے اِس لفظ خبر کے اوپر پیش ہے۔ خبر تو ہر وہ نیوز (News) ہوتی ہے جو آ جائے لیکن ''خُبر'' اس نیوز کو کہتے ہیں جو علمِ بصیرت کے بعد، خود تجربے کے بعد، حاصل کی جائے۔ لہٰذا جو علمِ بصیرت سے، تجربے کے بعد، خبر (News) حاصل کی جائے، اسے خُبر کہتے ہیں۔ یہ عجیب زبان تھی اور قرآن کا انتخاب دیکھیے جو یہ کہتا ہے کہ اس کو ''خُبر کی ضرورت ہوگی'' جبکہ تیری کیفیت یہ ہے کہ جو بھی خبر تجھ تک پہنچے گی، تو اسی وقت چلا اٹھے گا۔ دیکھیے خُبر تک پہنچنے کے لیے تو تھوڑے انتظار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس میں علمِ بصیرت اور تجربہ درکار رہتا ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ یہ وہ زبان ہے جس نے خَبر اور خُبر کے لفظ میں ہی کتنا بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ قرآن ساری چیز بڑی ہی ایمائیت (Seggestiveness) سے کہہ جاتا ہے۔ اِس ایک لفظ خُبر سے ہی اس نے اس کو خبر سے الگ کر کے بتا دیا کہ جو علم حاصل کرنا ہوتا ہے اس میں خبر سے علم حاصل نہیں ہو جاتا۔ وہ خُبر ہوتا ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے اور اس طرح خُبر وہ ہوتا ہے جو تجربے کے بعد، بصیرت کے بعد، غور و تدبر کے بعد، جو خبر حاصل کی جائے، یا جب خبر پر غور و تدبر کر لیا جائے اور پھر وہ صحیح نکلے تو پھر اُسے خُبر کہیں گے۔ تو اُس صاحب علم نے کہا کہ یہ صرف خبر کی بات نہیں ہے، یہ خُبر کی بات ہوگی۔ اس پر حضرت موسیٰ نے کہا: قَالَ سَتَجِدُنِيٓ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعۡصِيۡ لَكَ اَمۡرًا (18:69)۔ انہوں (حضرت موسیٰ) نے کہا: میں تو بھئی! علم حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں مجھے حصولِ علم کی طلب ہے۔ ٹھیک ہے میں برداشت کروں گا، چلو تو سہی: ''کہ بھئی کیہڑا ہنیر پیا اے۔'' [1] اس پر اس صاحب علم نے کہا: قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِيۡ فَلَا تَسۡـئَلۡنِيۡ عَنۡ شَيۡءٍ حَتّٰٓى اُحۡدِثَ لَكَ مِنۡهُ ذِكۡرًا (18:70)۔ پھر ایک شرط یہ ہے کہ جو کچھ میں کرتا چلا جاؤں اُسے تم دیکھتے چلے جاؤ، اسی وقت اس پر اعتراض نہ کر دینا، انتظار کرنا، میں تمہیں بتاؤں گا، تو جب تک میں نہ بتاؤں اس وقت تک یونہی اعتراض نہ جڑ دینا، تمہاری طبیعت مجھے ایسی ہی نظر آتی ہے کہ تم ضبط نہیں کرتے، انتظار نہیں کرتے، فوراً اعتراض کر دیتے ہو۔ اور حقیقتاً ان کی طبیعت ایسی ہی نظر آتی ہے۔ وہ آپ نے دیکھا کہ وہ گئو سالہ پرستی میں بھائی کے گلے پڑ گئے تھے۔ فرعون سے مقابلے کے لیے انہیں ہونا ہی اس قسم کا چاہیے تھا۔ ان کی طبیعت کی یہ جلالیت وہاں جا کے نکھرتی ہے جب وہ فرعون کے دربار میں پہنچتے ہیں۔ صاحب! اس معرکے کی کیا بات ہے۔ خیر وہ آگے کی بات ہے، آئے گی۔ بہرحال انہوں نے کہا: ''لو دسو میں بالکل نئیں بولوں گا۔'' [2] فَانۡطَلَقَا (18:71)۔ تو بس وہ دونوں روانہ ہو گئے۔

---

[1] یہ کوئی اندھیر نگری اور چوپٹ راج تو ہے نہیں۔

[2] لو سنو جی! میں بالکل خاموش رہوں گا۔

کشتی کے سوراخ پر پہلا اعتراض

عزیزانِ من! وہ چل پڑے۔ حَتّٰۤی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیۡنَۃِ خَرَقَهَا (18:71)۔ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ اترتے وقت، انہوں نے ایک طرف سے کشتی کی ایک تختی اکھیڑ دی۔ انہوں (حضرت موسیٰ) نے یہ دیکھا ابھی ساحل پہ اترے بھی نہیں تھے: قَالَ اَخَرَقۡتَهَا لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا اِمۡرًا (18:71)۔ تو یہ حضرت موسیٰ کہنے لگے کہ ''توا ے کی کیتا اے ہیگا۔ تینوں پتہ ہے نئیں۔'' ❶ تو آگے چلے گئے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بدستور کہا: لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا (18:71)۔ اس کے بعد پانی بھرے گا، غرق ہو جائیں گے اور اعتراض یہ کہ تو نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا اِمۡرًا (18:71)۔ آپ نے یہ بڑا خطرناک کام کیا ہے۔ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّکَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا (18:72)۔ استاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کہا: میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم سے برداشت اور سہار نہیں ہو سکے گی، ہوئی یہی بات، کی تم نے وہی بات جو میں کہتا تھا۔ اور پھر جلد ہی اسے غصہ آتا ہے اور جلد ہی وہ ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں حلیم کا غصہ تو سخت ہوتا ہے۔ قَالَ لَا تُؤَاخِذۡنِیۡ بِمَا نَسِیۡتُ وَلَا تُرۡهِقۡنِیۡ مِنۡ اَمۡرِیۡ عُسۡرًا (18:73)۔ کہا: میں بھول گیا۔ یہاں آیا ہے نَسِیۡتُ۔ کیا بات ہے! یہیں ہے جہاں ندامت ہوتی ہے، جہاں ایک خطا ہوتی ہے یہ نسیان کی ہوتی ہے۔ کہا: میں بھول گیا، تو بھول چوک کے اوپر تو اتنی سختی نہیں کیا کرتے۔ معاف کیجیے: ''بُھل گیا معافی دیو۔'' ❷

دوسرا اعتراض

انہوں نے کہا کہ اچھا، آئندہ نہ بھولنا۔ فَانۡطَلَقَا (18:74)۔ چنانچہ پھر وہ آگے نکلے۔ حَتّٰۤی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ (18:74)۔ وہاں دیکھا کہ ایک نوجوان سا پھر رہا تھا، انہوں نے اس کو گرفتار کیا اور اسے قتل کر دیا۔ وہ حضرتِ موسیٰ تو کشتی کے اوپر ہی اتنے بیتاب ہو رہے تھے، کیا وہ یہاں یہ قتل سہار ہو سکتے تھے؟ قَالَ اَقَتَلۡتَ نَفۡسًا زَکِیَّةًۢ بِغَیۡرِ نَفۡسٍ (18:74)۔ اس پر پھر حضرت موسیٰ بے اختیار بول اُٹھے کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ ایک پلے پوسے جوان لڑکے کو یونہی قتل کر دیا۔ پلا پوسا ہوا! ایک پلا پوسا جوان آدمی صاحب! کسی کا جوان بیٹا لیا، اسے قتل کر دیا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو تو اس کے جرم میں ایسا کر دیا ہے۔ لَقَدۡ جِئۡتَ شَیۡئًا نُّکۡرًا (18:74)۔ کسی کو بلا جرم قتل کر دینا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ تو ناقابل معافی جرم ہے، جو تم نے کر دیا۔ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکَ اِنَّکَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا (18:75)۔ کہا: میں نے کہا تھا کہ تو نہیں سہار کر سکے گا، تم سے ضبط نہیں ہو سکے گا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ تم اس سے پوچھ لو کہ تم نے کیوں کیا ہے۔ وہ اس پر فردِ جرم ہی عائد کر دیتے ہیں۔ تو یہ جو تم نے کیا ہے یہ تو ناقابلِ معافی جرم ہے، وہ کشتی والی تو خیر چھوٹی سی

---

❶ تو نے یہ کیا کر دیا۔ اس صاحبِ علم نے کہا: تجھے تو معلوم ہی کچھ نہیں ہے۔

❷ بھول گیا ہوں، معاف کر دیجیے۔

بات تھی۔ قَالَ اِنْ سَاَلْتُکَ عَنْ شَیْءٍ ۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِیْ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا (18:76)۔حضرت موسیٰ نے کہا کہ دو دفعہ تو ہوگیا' ایک دفعہ کی مجھے اور مہلت دے دیں اگر میں پھر کوئی ایسی بات کروں تو پھر ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلنے کے قابل نہیں یہاں لفظ ہے: تُصٰحِبْنِیْ عجیب چیز ہے جی! ہم تو ''صحبت اصحاب'' کہتے ہیں۔عربی زبان میں جو چھوٹا آدمی ہے وہ یہ لفظ بڑے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ پھر ''میں آپ کی صحبت میں رہ سکتا ہوں'' تو اس سے استاد اور شاگرد کا تعلق نظر آتا ہے' یہ اس کی بزرگی کا تعلق ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اس وقت کوئی نبی نہیں تھے' جو برابر کے نبی کے ساتھ یوں تعلق رکھتے۔ میں نے کہا ناں کہ قرآن کے الفاظ پہ یوں ہی نہ گزر جایئے' ایک ایک لفظ جو قرآن استعمال کرتا ہے' اُس پر کھڑے ہو جایئے۔اس کے لیے سینکڑوں لفظ ہیں۔مگر قرآن نے یہاں کہا ہے کہ فَلَا تُصٰحِبْنِیْ (18:76)۔ تو پھر میں آپ کے اہل نہیں صاحب! پھر میں آپ کی صحبت کے قابل نہیں سمجھا جاؤں گا۔ٹھیک ہے۔بس یہ سمجھ لیجیے کہ جو اگر ایک دفعہ اور Repeat کروں تو پھر جو میری معذرت ہے وہ حد تک پہنچ گئی اس کے بعد' پھر وہی جو وہ جیسے کہتے ہیں کہ جو چور کی سزا سو میری سزا۔

تیسرا اعتراض

فَانْطَلَقَا (18:77)۔اچھا کہنے لگے: چلو۔ حَتّٰٓی اِذَآ اَتَیَآ اَهْلَ قَرْیَةِ ۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا (18:77)۔بستی میں گئے اور وہاں جا کے ان بستی والوں کو کہا: مہمان ہیں۔انہوں نے کہا: جاؤ جاؤ روز اس قسم کے مہمان آتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اہلکار[1] ہی ہوں۔ میں آگے جا کے بتاؤں گا۔نظر آتا ہے کہ یہ اہلکار' صاحبِ نواز تھے۔لیکن انہوں نے ان سے پوچھا تک نہیں' روٹی تک نہیں دی۔اس بستی والوں کے خلاف تو غصہ چڑھنا چاہیے تھے اور اگر یہ واقعی اہلکار تھے' سرکاری دورہ پہ گئے ہوئے تھے۔ ''اے سرکاری دورہ کی ہونداائے اے سارا پنڈ اگے لایا ہونداائے تے اونہاں نے روٹی داناں پوچھیا۔''[2] نکلے وہاں سے' اپنا انتظام کرلیا ہوگا۔وہاں دیکھا کہ فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ (18:77)۔ وہاں دیکھا کہ ایک دیوار ہے' وہ گرا ہی چاہتی تھی' وہ گر ہی رہی تھی۔انہوں نے کہا: ٹھہرنا میاں' آجاؤ' تم ذرا ''تگڑے''[3] آدمی بھی ہو' آؤ ذرا' اس دیوار کو بنالیں' کھڑی کرلیں۔اچھا! فَاَقَامَهٗ (18:77)۔ دیوار بنالی۔ یہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اُس صاحبِ بصیرت کو ایک بات کہتے ہیں۔اور میں سمجھا ہوں کہ وہ یہی مقام ہے جہاں اس صاحب بصیرت نے کہا تھا: هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ (18:78)۔بس اب انتہا ہوگئی۔اب ہم اکٹھے نہیں رہ

---

[1] کارندہ' عملہ' محرر وغیرہ

[2] سرکاری دورہ (Official Tour) کیا ہوتا ہے؟ اے! یہ تو وہ ہوتا ہے کہ تمام اہل گاؤں ان کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔مگر یہ ہیں کہ انہوں نے روٹی تک کا بھی نہیں پوچھا۔

[3] تنومند' طاقتور

سکتے' اب ہماری علیحدگی کا وقت آ گیا ہے۔ اس سے پہلے تو صرف اعتراض کیا تھا کہ تم نے یہ کیوں کیا' بڑا سخت جرم ہے: **قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا** (18:77)۔ کہا کہ دیوار تم نے بنائی اگر تو چاہتا تو اس دیوار کی مزدوری تو ان سے لے لیتا۔ تو جو اُس سے مزدوری لے لیتا تو بھی ہم کھانا کھا لیتے' ان کو بھی پتہ چل جاتا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ یہ کیا اور تم نے صرف یہی نہیں کیا کہ ایک گرتی ہوئی دیوار کو بنایا بلکہ بلا معاوضہ مزدو بنا دیا۔ اس کی مزدوری تک نہیں لی۔

بلا مزدو معاوضہ خدمت کا جذبہ

اب یہاں جو میں نے سمجھا ہے اسے میں نے اپنے ہاں لکھا بھی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ایک عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں میں یہ فرق ہوتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ تو ابھی تک نبوت تک نہیں پہنچے تھے' ابھی ان کے ذہن میں یہی تھا کہ اگر کسی کی گرتی ہوئی دیوار بنانی ہی پڑے تو مزدوری لے کے بنانی چاہیے اور یہ اس مقام پر تھا جس میں کہا تھا کہ گرتی ہوئی دیوار کو بنانا ہمارا فریضہ ہے۔ اگر مزدوری لے کے ہی بنانا ہو تو وہ تو ہر مزدور بنا دے گا۔ "**قَالَ**" (18:78)۔ اے بچے! اے جوان! **هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ** (18:78)۔ اب تیرا میرا ساتھ نہیں جڑ سکتا۔ یہ ہے' عزیزانِ من! وہ مقام جہاں یہ کہا ہے کہ اب ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے' تیرا میرا ساتھ نہیں جڑ سکتا۔ یہ قرآن ہے' کس مقام پہ کہتا ہے کہ اب تیرا اور میرا ساتھ ممکن نہیں۔ تیری ذہنیت یہی نظر آئی ہے کہ کسی کی گرتی ہوئی دیوار بناؤ تو مزدوری لے کے بناؤ۔ ابھی تو اس مقام پہ نہیں پہنچا ہے جہاں تیرا فریضہ بنتا ہے کہ تو انسانیت کی گرتی ہوئی دیواروں کو بنائے چلا جا۔ اور کہا کہ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9)۔ ہم تم سے اس کی مزدوری یا بدلہ تو رہا ایک طرف' ہم تو تم سے شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ یہ مقام ہونا چاہیے۔ مگر تمہارا یہ مقام نہیں ہے' تو تمہارا اور میرا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ دیکھا' عزیزانِ من! بظاہر تو قرآن ایک قصہ بیان کر رہا ہے مگر قصے میں کیا کیا بیان کر دیتا ہے۔

تینوں واقعات کی وجہ جواز اور مصلحت وحکمت

اس صاحبِ جہاں بیں نے کہا: جاؤ لیکن ٹھہرو۔ میں نے کہا تھا کہ **سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا** (18:78)۔ میں ہر بات بتاؤں گا۔ یہ ذہن میں لے کے نہ جاؤ کہ میں نے دھاندلیاں کی ہیں اور اس قسم کی غیر معقول چیزیں کر دیں۔ ٹھہرو' سنتے جاؤ۔ میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں وجہِ جواز اور حکمت بتاؤں گا کہ جس چیز کی تم میں سہار نہیں' برداشت نہیں تو میں نے کہا تھا کہ میں بتاؤں گا' تو وہ بات سنتے جاؤ: **اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا** (18:79)۔ برخودار! تم یہاں اجنبی ہو' میں یہاں کا رہنے والا ہوں' میں صاحبِ اختیار بھی ہوں' میری معلومات بہت زیادہ ہیں۔ یہ جو ملاح تھے یہ غریب آدمی ہیں۔ انہیں بھی اس بات کا علم نہیں کہ ذرا اگلی سٹیٹ (State) میں' ایک

راجہ ہے' ایک نواب ہے' وہاں کا ایک بادشاہ ہے۔ اس نے کشتیوں کو پکڑنا شروع کر دیا ہے۔ تو ایسے لوگ جن کی دو دو چار کشتیاں ہیں ان میں سے اگر ایک آدھ لے بھی جائے گا' تو ان کا گزارہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہ مسکین ہیں' یہ بیچارے ایسے ہیں کہ اگر ان کی کشتی پکڑی گئی' ان کی حرکت ساکن ہو جائے گی' کاروبار ٹھپ ہو جائے' ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں رہے گا اور وہ جو اس کے کارندے ہیں' وہ پکڑ رہے ہیں۔ کشتی کو دیکھتے ہیں' جو ناقص کشتی ہے اسے تو چھوڑ دیتے ہیں اور جو صحیح سالم کشتی ہے اسے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ تو میں نے اس کشتی کے اندر ایک نقص پیدا کر دیا ہے۔ ابھی یہ آنے والے ہیں تو وہ خود دیکھیں گے کہ جس کشتی کا تختہ ہی ٹوٹا ہوا ہے' اُسے لے کر کیا کرنا ہے' وہ چلے جائیں گے۔ تختہ تو یہ جوڑ لیں گے ان کی کشتی بن جائے گی۔ برخودار! یہ بات تھی۔ تمہیں اس کا علم نہیں تھا' مجھے اس کا علم تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ علم اُس صاحب بصیرت وجہاں بیں کو وحی کی بناء پہ حاصل ہوا ہو۔ ذرا زیادہ وسیع معلومات ہوں تو یہ چیزیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ آپ (حضرت موسیٰ) اس علاقے میں نو وارد ہیں اور وہ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ اور نظر آتا ہے کہ یہ آدمی صاحبِ بصیرت بھی ہیں' ان میں حکمت بھی ہے' سوچ سمجھ بھی ہے' غور و تدبر بھی ہے' سیاست بھی ہے اور پھر اتنی بلندی سیرت بھی ہے جو وہاں بلا مزد و معاوضہ دیوار بنانے کی بات ہوئی تھی۔

قتل کرنے کی وجہ

یہ جو تم نے قتل والی بات کہی ہے تو اس کی وجہ سنو! تمہیں اس کا علم نہیں ہے کہ **وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا** (18:80)۔ یہ جو جوان شخص تھا یہ کئی جرائم کا مجرم ہے اس کے ذمے کئی قتل تھے' **طُغْيَانًا وَّكُفْرًا** (18:80)۔ سرکش تھا' باغی تھا اور مصیبت یہ تھی کہ اس کے ماں باپ بڑے نیک اور شریف آدمی ہیں: **اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ** (18:80)۔ وہ ماں باپ بڑے نیک اور امن پسند ہیں۔ یہ مار دھاڑ کرتا تھا اور چوری ووری کا مال بھی گھر میں لے آتا تھا' اس کے پیچھے تفتیش لگی ہوئی ہے' یہ اشتہاری مجرم تھا۔ نظر یہ آتا تھا کہ اگر یہ اس طرح سے گرفتار ہوا' مقدمہ چلا' مجھے پتہ ہے کہ اس کے ماں باپ اس میں ملوث نہیں تھے لیکن اگر یہ چیز اس کے ساتھ آ گئی' تو **فَخَشِيْنَآ** (18:80)۔ خطرہ یہ تھا کہ اس کے جو جرائم ہیں' ان کا دھبہ ماں باپ کے سر پر بھی جا لگے گا اور وہ غریب' بے گناہ ہیں' خوامخواہ ساتھ دھر لیے جائیں گے۔ یہ مفرور مجرم تھا۔ اِس نے قتل کیے ہوئے ہیں' سرکش ہے' باغی ہے اور نظر آتا ہے کہ اِس دور کے قانون کے مطابق یہ یہاں کے عمالِ حکومت اس کے صاحبِ اختیار بھی تھے کہ خواہ مخواہ انہیں بھی ساتھ دھر لیں اور مقابلے میں لا کے' بغیر مقدمہ چلائے گولی مار دیں۔ اب بھی تو پولیس مقابلے میں لا کے بغیر مقدمہ چلائے ہوئے گولی مار دیتی ہے۔ یہ مفرور مجرم سامنے مقابلہ کرتے ہیں' جن کے خلاف اتنے بڑے جرائم ہوتے ہیں' جن کے خلاف عدالتوں نے بھی سزائیں دی ہوئی ہوتی ہیں' یہ بھی یہ کچھ کرتے ہیں۔ کہا: یہ چیز تھی جو اُس جوان کے قتل کی وجہِ جواز بنی تھی۔ یہ جو آگے ایک لفظ آتا ہے اس میں وہاں

Suggestiveness آتی ہے' ایمائیت آتی ہے۔ ویسے تو ایک آیت کے بعد وہ آئے گا' میں اُسے یہیں لے آتا ہوں۔ انہوں نے یہ کہا کہ تم نے اے موسیٰ! اعتراض کیا اور یہ اعتراض یوں پیدا ہوتا ہے کہ گویا کہ میں نے از خود ہی یہ کچھ کر دیا ہے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ **وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ** (18:82)۔ اس کے لیے ایک لفظ کے ترجمے کی غلطی نے بات دوسری طرف کر دی۔ اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے کہ ''میں نے اپنے اختیار سے یہ نہیں کیا۔'' یعنی اپنے امر سے نہیں کیا۔ تو اس سے بھی یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ کہا ہوا تھا کہ اِسے قتل کر دو' اُسے یہ کر دو اور پھر یہاں سے یہ سارے اعتراضات پڑتے تھے کہ صاحب! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ کسی کے خلاف کوئی جرم بھی نہ ہوا' اسے بتایا بھی نہ جائے' مقدمہ بھی نہ چلے' شہادت بھی کوئی نہ ہو' تو اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے کہہ دے کہ یہ مجرم ہے' وہ آئے گا تو جا کے اُسے مار دے۔ یہ غلط ہے۔ یہ واقعہ ہی غلط ہے۔ کیوں غلط ہے؟ یہ کہنا کہ اس نے کہا تھا کہ ''میں نے خود تو یہ نہیں کیا' مجھے تو اللہ تعالیٰ کہتا تھا' اس لیے میں کرتا چلا آیا۔'' اللہ اکبر! یعنی مطلب یہ کہ یہ کام تھے تو ایسے ہی' مجھے کرنے تو نہیں چاہئیں تھے' تمہارا اعتراض تو صحیح ہے لیکن صاحب! میں نے آپ خود تو یہ نہیں کیے۔ یہ کچھ خود تو نہیں کیا ہے' یہ مجھ سے کرایا گیا ہے۔ ایک حرف ہے' عزیزانِ من! یہ لفظ بھی نہیں ہے۔ یہ قرآن بڑی پل صراط ہے۔ یہ دو امری نہیں ہے۔ یہاں ''عن'' آیا ہے یعنی یہ عن امری ہے۔ ترجمہ جو ہے وہ دو امری کا عربی جاننے والے احباب اس کو تو Appreciate کریں گے۔ یہ تو عجیب زبان ہے۔ اس کے ہاں ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ میں نے اپنے اختیار سے یا اپنے حکم سے نہیں کیا۔ ''عن'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''مجھے جو اختیارات تھے' میں نے اُن سے تجاوز کر کے یہ کچھ نہیں کیا۔ یہ کچھ Within those powers کیا ہے۔ قرآن میں ایک حرف یہ کچھ کر جاتا ہے عزیزانِ من! یہ عربی زبان ہے۔ یہ ''امری'' وہ بات ہوتی کہ ''میں نے اپنے حکم' اختیار سے نہیں کیا' کسی نے مجھ سے یہ کہا ہے' اس کی وجہ سے میں نے یہ کیا تھا'' وہاں تو یہ چیز کہتے تھے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ ''مجھے جو اختیارات حاصل ہیں اِن کے تحت میں نے یہ کچھ کیا ہے۔'' یہاں سے میں نے کہا ہے کہ میری بصیرت اِدھر گئی تھی کہ یہ کوئی صاحبِ اختیار اہلکار ہے' یہ اس دور کے اندر' کوئی مجاز افسر ہے۔ اُس دور کے اندر اسی قسم کے افسر ہوا کرتے تھے۔ انہیں یہ Powers دی ہوئی ہوتی ہیں جیسے آپ کی اصطلاح میں ہم یہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ Powers حاصل ہیں تو انہوں نے کہا ہے کہ **مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ** (18:82)۔ میں نے اپنے Powers کے خلاف جا کے یہ کچھ نہیں کیا' یہ کچھ Within those powers کیا ہے' جو کچھ میں نے کیا ہے' مجھے اس کے لیے اختیارات حاصل ہیں۔ میں صاحبِ مجاز ہوں۔ اس کے لیے تو یہ نظر آتا ہے کہ ان کی پوزیشن ایسی تھی' انہوں نے Explain کیا۔

دیوار کو تعمیر کیوں کیا!

وہ جو دیوار والا قصہ ہے کہ **وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ**

اَبُوۡهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنۡ يَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسۡتَخۡرِجَا كَنۡزَهُمَا (18:82)۔وہ جو دیوار تھی' وہ گاؤں کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ بابا! سیدھی سی بات ہے یہ دو یتیم بچے رہ گئے ہیں' ان کا باپ میرا دوست تھا۔ وہ مجھے بتا گیا ہوا تھا۔ کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ سارا گاؤں دشمن ہے۔ '' ایتھے وسدا اے شریکا اینہاں دا تے ٹبراچ وڈ وڈیرا کوئی ہے نئیں'' ❶ وہ دوست بتا گیا ہے کہ '' میرے پاس ان بچوں کے لیے جو پونجی ہے وہ میں یہاں اس دیوار کے نیچے' بنیاد میں' رکھ دیتا ہوں۔ اوپر دیوار بنادی ہے۔ یہ میرے علم میں تھا' مجھے وہ بتا گیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہی ان یتیموں کے ولی بھی ہونگے لیکن یہ بات تو ٹھیک تھی کہ یہ دیوار گرا چاہتی تھی۔ اب یہ جو اُسے ذاتی علم ہے' یہاں اس کی بناء پہ یہ کہہ دیا گیا کہ صاحب! اوقطب تھے ناں اندر دیاں اکھیاں نال سارا کجھ ویکھ لیندے ہیگے نیں۔ پیر صاحب دی چور لگیئے نیں' کھوجیاں نوں سددے نیں۔ تہاڈے مال لئی لوٹا پواندے رہندے۔ (18:46) شہادت نہ تہاڈے کول مگر ایتھے' ایہہ تے علمِ لدنی اے۔'' ❷ وہ صاحب بصیرت کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کا منشاء یہ تھا کہ اُس پونجی کو گاؤں والے نہ لے جائیں بلکہ جب یہ لڑکے جوان ہوں تو اس وقت اسے خود نکال لیں۔ اور یوں یہ پونجی' اُن کے پروردگار کی طرف سے ان کے لیے سامانِ نشو ونما بن جائے۔

یہ بات نہیں ہے

عزیزانِ من! آج یہ علم لدنی کی بات نہیں ہے۔ یہ کتاب انسانوں کے لیے اُتری ہے' انسانوں کی زبان میں اتری ہے۔ اس Level پر آپ دیکھیں گے تو باتیں سمجھ میں آتی چلی جائیں گی۔ جونہی آپ نے اس کو افسانہ بنایا تو پھر اس کے بعد افسانہ' در افسانہ' افسانے سے افسانہ' نکلتا چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک ذرا سی بات پٹڑی سے اکھڑ کے ادھر گئی' اب ہر بات میں کہا: '' یہ میں نے اپنے آپ نہیں کیا' خدا نے حکم دیا۔ دیوار گررہی تھی' اللہ نے بتادیا تھا کہ نیچے اس کے خزانہ بھی ہے۔ اس لیے یہاں یہ دیوار بنادی۔ کیوں قتل کیا؟ خدا نے کہا سرکش ہے' قتل کردو۔ یہ صاحبِ بصیرت یہاں کا رہنے والا' آنے جانے والا آدمی ہے۔ ممکن ہے گرداور ❸ ہی ہو' یہاں کا تحصیلدار رہی ہو۔ دوست تھا' جانتا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا کہ کیا کریں؟ ممکن ہے کہ اس کے مشورے سے ہی یہ کیا ہو۔ کہ جب یہ لڑکے بڑے ہونگے تو اس کے بعد میں خود کھود کے ان کو دے دونگا' تو میں نے دیکھا کہ بارش وارش ہوئی ہے تو دیوار گرا چاہتی تھی۔ میں نے کہا اگر یہ دیوار گرگئی تو اس کے بعد تو نیچے سے وہ خزانہ نکل آئے گا' وہ جو شریکا ہے' وہ ابھی لینے آجائیں گے۔ ان بچوں کے پاس تو اتنی ہمت نہیں ہوگی۔ میں کہاں ثابت کرتا پھرونگا تو اس لیے یہ دیوار بنادی تھی' یہ میرے علم میں ہے۔ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ (18:82)۔ اور یوں یہ خزانہ ان کے

---

❶ یہاں اس گاؤں میں' تمام افراد شریکہ برادری کے ہیں مگران بچوں کے خاندان کا تو کوئی بھی بڑا چودھری نہیں ہے۔

❷ وہ قطب تھے اپنی باطنی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ لیتے ہیں دیکھو پیر صاحب کی چوری (Theft) ہوتی ہے۔ پاؤں دبانے والے (کھوجیوں) کو بلاتے ہیں۔ آپ کے گم شدہ مال کے لیے لوٹا گھماتے ہیں' مگر آپ کے پاس کوئی شہادت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ یہی تو علم لدنی ہے۔

❸ پٹواریوں کے حلقہ یا چنگی کے علاقے کا افسر گشت کرنے والا عہدے دار۔

پروردگار کی طرف سے ان کے لیے سامانِ رحمت بن جائے۔ یہ چیزیں ہیں۔ یہاں وہی رحمت کا لفظ آیا ہے۔ اس کی طرف سے یہ سامانِ نشو ونما ہوتا ہے، یہ اس کی بناء پہ میں نے سب کچھ کیا ہے۔

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا (18:82)۔ یہ ہے۔ ''مالم تاویل۔'' آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو ''تاویل'' کا لفظ ہی کسی برے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ہمارے ہاں تاویل کے معنی ہیں: ''بات تو کچھ اور ہو' مگر تاویل کر کے اس کو کچھ اور سے اور بنا دیا جائے۔'' ''مال'' کا لفظ تو اپنے ہاں ہم صحیح معنوں میں بولتے ہیں' لیکن ''تاویل'' کا لفظ اس معنی میں نہیں بولتے۔ زبانوں کے ساتھ عجیب چیز ہوتی ہے۔ مالِ کار' یا مال انجام کو کہتے ہیں تو تاویل کے معنی ہی یہ ہوتے ہے یعنی ''آخری حقیقت جو سامنے آجائے۔'' تو یہ ہے ان باتوں کی وہ اصل حقیقت' جس کے لیے تو صبر نہیں کر رہا تھا' جھٹ سے میرے خلاف اعتراض کر دیتا تھا' مجرم قرار دے دیتا تھا۔ کیوں! بتاؤ! اب وہ سارا واقعہ یوں ہے جو قرآنِ کریم نے بتایا ہے۔

بات وہی ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو' تو اس کے لیے تھوڑی سی برداشت کرو' تھوڑا سا انتظار کرو' تحمل کرو' سہار کرو' وقت پر پوچھو' پھر دیکھو: تمہارا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اس برداشت' انتظار' تحمل اور سہار کے عمل سے پہلے ہی اعتراض کرنا شروع کردو' بحثیں شروع کردو' اس کے بعد دوسرے کو مجرم قرار دے دو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ جو کچھ ہوا ہے' اس نے کیا ہے' اب اس کے لیے جو اس نے دلائل دیئے ہیں یا واقعات بتائے ہیں' نظر آ گیا ہے کہ واقعی ہر بات بڑی معقول تھی جو اس شخص نے کی تھی اور یہ تھی وہ حکمت' یہ تھے اس کے وہ اختیارات اور یہ تھی اس کی وہ سیاست یا یوں کہیے کہ یہ تھا اس کا فہم وفراست' یا اسے تدبر کہیے کہ ہر بات وہ جو کر رہے ہیں' وہ نہایت فہم وتدبر کی رُو سے کر رہے ہیں۔

یہ تھا نبوت سے پہلے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہونے والے نبی کا وہ واقعہ جسے خود علم نہیں کہ میں ہونے والا نبی ہوں۔ وہ اس طرح سرگرداں پھرتا ہے' حصولِ علم میں جگہ جگہ جاتا ہے۔ علم کے حصول کے لیے جو شرائط ہیں' قرآن اس واقعہ میں بیان کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ پوچھ لو' جس کے خلاف تم نے کچھ بات کہنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس اپنے اس کارنامے کا کوئی معقول عذر ہو' اُسے سننے کے بعد اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرو۔ پہلے ہی رائے قائم نہ کرلو۔ یہ ہے مال' اس سارے واقعہ کا۔

عزیزانِ من! سورۃ الکھف کی آیت 82 تک آ گئے۔ یہ قصہ یہاں ختم ہو گیا ہے۔ اس لیے میں بھی اسے ختم کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ذوالقرنین (سائرس یا کیخسرو) کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک الگ داستان ہے' اسے ہم بعد میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀......❀

پانچواں باب: سورۃ الکھف (آیت 83)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1975 کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 83 سے ہو رہا ہے: (18:83)۔

درس شروع کرنے سے پہلے ایک معذرت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ احباب کو معلوم ہوگا کہ مجھے کنونشن (Convention) کے دوران ہی' بلکہ اس سے بھی پہلے' فلو (Flue) کا حملہ ہوا تھا۔ کنونشن تو میں نے جوں توں کر کے گزار دیا۔ اس کے بعد اس کے اثرات کچھ زیادہ شدید ہو گئے۔ پچھلا ہفتہ میں بالکل بخار سے ہی لیٹا رہا۔ آج بھی اپنے میں اتنی سکت نہیں پاتا لیکن چونکہ درس کے ناغہ کا اعلان نہیں کیا تھا' آپ احباب تشریف لے آئے ہیں اس لیے جی نہ چاہا کہ آپ مایوس لوٹ جائیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فلو کا بڑا اثر ہے۔ آپ میری آواز کو تو دیکھ رہے ہیں جتنی بھی ہمت و سکت ہوگی' اتنے وقت کے لیے میں درس میں کچھ پیش کر سکوں گا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ درس کا آغاز 83 ویں آیت سے ہو رہا ہے اور وہ شروع ہوتی ہے: **وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ** (18:53)۔ تجھ سے (اے رسول!) یہ لوگ ذوالقرنین کے متعلق کچھ پوچھتے ہیں۔ **قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا** (18:83)۔ ان سے کہو: میں تمہیں اس کے متعلق کچھ باتیں بتاتا ہوں۔ عزیزانِ من! تمہیداً عرض کروں کہ دنیا کے کسی مذہب کو لیجیے' وہ صرف اپنے مذہب کے بانی یا اپنے بزرگوں' خدا کے رسول' فرستادہ' اوتار' بانی' کے متعلق کچھ بھی ان کے جی میں آئے کہتے ہیں۔ اپنے مذہب کے اِن بزرگوں کے متعلق تو وہ بہت کچھ کہتے ہیں لیکن دوسرے مذاہب کے متعلق یہ کچھ نہیں کہتے۔ یہ بھی ان کی عنایت ہے کہ ان کا احترام کریں' ورنہ عام طور پر آپ دیکھتے ہیں کہ جھگڑے ہی اسی بات پر اٹھتے رہتے ہیں کہ فلاں اہلِ مذہب نے ہمارے مذہب کے خلاف بری زبان استعمال کی' گستاخی کی۔ روز یہ کچھ ہوتا رہتا ہے اور پھر کتابوں میں تو آئے دن یہ جھگڑا نکلتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ کے خلاف کہا۔ اس نے یہ لکھا اور اُس نے وہ کہا۔

خدا کا عطا کردہ دین عالمگیر انسانیت کے لیے ہوتا ہے

قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ دین خداوندی کسی مخصوص قوم کا دین نہیں ہے' دینِ خداوندی کا رسول کسی مخصوص نسل کا رسول نہیں ہے' یہ عالمگیر انسانیت کے لیے ایک پیغام ہے۔ یہ پیغام بھی دنیا میں پہلی بار نہیں آیا۔ خدا نے کہا ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں رسول بھیجے ہیں' ہر قریہ میں رسول بھیجے' ہر ملک میں رسول بھیجے۔ اور ظاہر ہے کہ پھر خدا تو ہر زمانے میں رسول بھیجتا رہا ہے۔ اور یہ کہ ان رسولوں کی طرف سے جہاں تک دین کا تعلق ہے' ایک ہی دین تھا' جو ہر ایک کو دیا گیا۔ آپ وسعتِ نگاہ اور کشادِ قلب دیکھ رہے ہیں۔ زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے ان کی شریعت کے احکام میں تو فرق ہوتا تھا لیکن اپنے اصول اور اوصاف کی رُو سے دین ہر ایک کو ایک ہی دیا گیا۔ یہ غیر متبدل اصولِ حیات تھے۔ کتنی بڑی چیز ہے جسے قرآن نے تسلیم کیا۔

قرآن حکیم میں نام کے ساتھ تمام رسولوں کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا؟

پھر یہ کہا کہ ان میں سے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ جن کا نام ہم نے باصراحت قرآن میں دے دیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے قرآن کی سب سے پہلے مخاطب قومِ عرب پہلے سے آشنا تھی' انہیں جانتے تھے' ان سے واقف تھے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! کہ قرآن میں اسی علاقے کے رسولوں کا ہی ذکر کیا ہے' دنیا کے بڑے بڑے بزرگوں اور بانیانِ مذہب کا ذکر نہیں کیا۔ عزیزانِ من! کرنا ہی یہ چاہیے تھا۔ اگر مکہ میں بیٹھے' وہ قریش سے کہتے کہ کنفیوشس (Confucius. C.551-479 B.C.) نے یہ کہا تھا تو بات ہی یہاں سے شروع ہو جاتی کہ صاحب! یہ کنفیوشس کون تھا؟ اس نے کیا کہا تھا؟ پتہ نہیں کہا تھا یا نہیں کہا تھا؟ یا کیا وہ تھا بھی؟ تم یونہی کہہ رہے ہو؟ یعنی جھگڑا ہی اس بات پہ شروع ہو جاتا لیکن جب انہوں نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہا تو کسی نے یہ بات نہیں پوچھی کہ صاحب! یہ کون تھے یا کہاں تھے؟ وہ تو انہیں جانتے تھے' عیسائی بھی وہاں بستے تھے' یہودی بھی وہاں بستے تھے' علاقہ بھی وہی تھا اور وہاں ان کی آمد و رفت تھی' وہ ان شاہراہوں پر سے دن رات گزرتے تھے اور قرآن بار بار انہیں کہتا ہے کہ یہ اُن اقوام کے قصے ہیں' جن کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے' تم صبح شام قافلے کی شکل میں گزرتے ہو۔ تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ ان سے متعارف تھے' اس لیے باصراحت تو انہی کا نام لیا' باقیوں کے متعلق کہا کہ ہم نے ان کا باصراحت ذکر نہیں کیا لیکن دنیا کی ہر قوم میں رسول آیا اور وہ اتنا ہی نہیں کہا کہ یہ تذکرۃً کہہ دیا ہو کہ رسول آیا' ہمیں حکم دیا کہ پہلے ان تمام رسولوں کی رسالت پر ایمان لاؤ کہ وہ اپنے اپنے وقت میں خدا کے بھیجے ہوئے سچے رسول تھے' خواہ ہم نے ان کا نام باصراحت لیا ہے یا نہیں لیا۔ اس بات پہ ایمان لاؤ اور ایمان بھی اس شکل میں ہو کہ **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ** (2:285)۔ رسول ہونے کی حیثیت سے ہم' محمد رسول اللہ اور ان رسولوں میں جو دوسری اقوام میں تشریف لائے' کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اِن سب کو خدا کے سچے رسول مانتے ہیں اور منصب رسات کے اعتبار سے ایک دوسرے میں کوئی فرق نہیں

کرتے۔ کیا کسی اور مذہب میں کہیں اس کشادہ نگہی کی کوئی مثال ملتی ہے؟ یہ ہے دین کا سرچشمہ۔ ایک ہی خدا تھا اور ہے۔ وہی دین تھا' انبیا کی وساطت سے چلا آ رہا تھا اس لیے اس میں تنگ نظری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک حقیقت تھی جسے بیان کیا گیا ہے کہ آپ جو ایمان لاتے ہیں وہ یہ ہے: اٰمَنَ بِـاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ (2:285)۔ کہ میں ایمان لاتا ہوں اللہ پر' ملائکہ پر' اُس کی طرف سے بھیجے ہوئے قانونی ضابطوں پر' اور اُن رسولوں پر جن کے ذریعے یہ ضوابط دوسرے انسانوں تک پہنچتے رہے۔ عزیزانِ من! یہ وہی رسول نہیں ہیں کہ جن کا نام لے کر قرآن نے ذکر کیا ہے۔ ایمان اس بات پہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں رسول آئے اور خدا کی طرف سے ایک سچا دین لائے لیکن ان رسولوں کی طرف جو کتاب بھیجی تھی وہ اپنی اصلی شکل میں سوائے قرآن حکیم کے اب دنیا میں کہیں موجود نہیں رہی۔

قرآن حکیم تمام صداقتوں کا مجموعہ ہے

قرآنِ کریم ان تمام صداقتوں کا مجموعہ ہے' ان صداقتوں کا مہیمن ہے' اُن تمام سچی صداقتوں کو جو انبیاء کی طرف آئی تھیں اپنے اندر لے لیا ہے اور اس پہ ایڈیشن' اس پہ اضافہ یہ کیا ہے کہ قیامت تک کے لیے انسانیت کو' جس راہنمائی کی ضرورت ہے' یہ بھی اس میں داخل کر دی ہے۔ اب اسے مکمل کر دیا ہے اور سلسلۂ انبیا کو یہاں ختم کر دیا ہے۔ اب کسی دوسرے مذہب میں آپ کو اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے ان تمام انبیاء کرام کی نبوت اور رسالت پر ایمان نہ لائے۔ لہٰذا دنیا کا کوئی اہلِ مذہب ہو' اس مذہب کے بانی کے خلاف گستاخی کا کلمہ کہنا تو ایک طرف رہا' ہم تو اس کا نام بھی صلوٰۃ وسلام سے لیں گے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان انبیاء میں سے ہی ہو' جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے بھیجے تھے لیکن باصراحت ہم نے قرآن میں ان کا نام نہیں لیا لیکن ہم ان پر ایمان لانے کے لیے مکلّف قرار دے دیئے گئے' جب کہ عیسائی نبی اکرم ﷺ کے سامنے کتنی گستاخیاں کرتے ہیں لیکن ان کی گالیوں کے جواب میں' جب کوئی مسلمان' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے گا تو اس کے ساتھ علیہ السلام ضرور کہے گا اور یہ کچھ ہم انہی کی خاطر نہیں کر رہے' اپنی رواداری نہیں ہے' ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ ہم مسلمان رہ ہی نہیں سکتے اگر ان حضرات کو نبی اکرم ﷺ جیسا ایک رسول نہ مانیں۔ یہ تو بات رسول کی رہی اور اَب رسولوں سے بھی آگے چلیے۔ اور ان کی کتب کو دیکھیے۔ پہلے انجیل کو لیجیے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کے متعلق انجیل کا بیان

قرآنِ کریم کی کشادگیوں کا اندازہ لگائیے۔ انجیل عیسائیوں کی کتابِ مقدس میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کو صرف بارہ متبعین (Followers) ملے جنہیں وہ اِن کے بارہ شاگرد کہتے ہیں۔ اور انجیل ہی میں لکھا ہے کہ ان میں سے ایک نے تیس روپے لے کر گورنر سے حضرتِ عیسیٰؑ کی مخبری کی۔ بارہ میں سے ایک تو یہ نکلا اور اس کے بعد انجیل ہی میں لکھا ہے کہ جب حضرتِ عیسیٰؑ پہ حکومت نے اور یہودیوں نے ہاتھ ڈالا اور نظر آ گیا کہ اب یہ انہیں نہیں چھوڑیں گے تو گیارہ کے گیارہ ہی وہاں سے بھاگ گئے' اتفاق سے وہ ان کا سب

سے بڑا وہاں رہ گیا تھا۔ انہوں نے اُسے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں تو اس شخص' حضرت عیسیٰ علیہ السلام' کو جانتا ہی نہیں۔ انجیل حضرتِ مسیحؑ کے ان حواریوں کے متعلق یہ بیان دے رہی ہے۔ یہ بیان اس انجیل کے اندر موجود ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ یہ حواری تو بلندی سیرت و کردار کے حامل تھے۔ جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پہ ایسا وقت نازک آیا ہے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ: **مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ** (61:14)۔ تم بتاؤ کہ تم میں کون ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام میں میرا معاون و مددگار بنتا ہے؟ اس امتحان کے وقت میں خدا کے پروگرام کی تکمیل میں جو جان دینی پڑ رہی ہے' مجھے بتاؤ تم میں سے کون میرا ساتھ دیتا ہے؟ قرآن کہتا ہے: ان سب نے بیک زبان کہا کہ **نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ** (61:14)۔ ہم اس مقصد کے لیے خدا کے رفیق اور مددگار بنتے ہیں۔ ہم تمھارا ساتھ دیں گے' ہم چھوڑ کے جانے والے ہیں؟ عیسائیوں کی کتابِ مقدس تو اپنے متبعین (Followers) کے متعلق یہ کہے کہ ایک نے تیس روپے کے عوض بیچ دیا اور گیارہ چھوڑ کے بھاگ گئے۔

قرآن حکیم کی شہادت اور کشادہ نگہی

قرآن جو' ان کے علی الرغم' اُن کی مخالفت کے طور پر ایک کتاب ہے ایک دین لیا۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے' اس قدر پختہ ایمان و بلندیٔ کردار کے لوگ تھے کہ انہوں نے بیک زبان کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ان میں سے ایک بھی چھوڑ کے نہیں گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ کہاں تک حضرتِ عیسیٰؑ کے صحابہ کے متعلق قرآن کی شہادت مل رہی ہے۔ یہ بات ناگوار گزرے گی کہ خود مسلمانوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے متعلق بھی اس کشادہ نظری کا ثبوت نہیں دیا جو قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کے متعلق دے رہا ہے۔ اور آگے چلیے۔ جہاں جہاں کسی صاحبِ بصیرت نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کیا ہے قرآن نے اُس کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ نبی نہیں تھا یا کسی مذہب کا بزرگ یا بانی نہیں تھا' ایسے بھی ہیں جن کا کوئی نام تک نہیں جانتا تھا ان کا ذکر بھی قرآن میں آ گیا ہے تو قرآن نے اس شگفتہ انداز سے ان کا ذکر کیا ہے جیسا کہ وہ اپنے رسولوں کا ذکر کرتا ہے۔

سورۃ الکھف کے پچھلے درس کا حصہ آپ کے سامنے ہے۔ وہاں کسی بزرگ کا ذکر ہے جس سے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام' ہونے والے پیغمبر جا کر ملتے ہیں۔ اب دیکھیے روایات میں ان کا نام خضر مشہور ہے۔ قرآن میں یہ نام کہیں نہیں آیا۔ قرآن نے متعین بھی نہیں کیا کہ وہ کون تھے؟ وہ نبی تو نہیں تھے۔ انبیا کے زمرے میں اُن کا نام تو یقیناً نہیں آیا' خاص طور پر انہیں متعارف بھی نہیں کرایا اور متعین بھی نہیں کیا کیونکہ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کو اس سے غرض نہیں کہ وہ شخصیت کون سی تھی' وہ ذکر اس لیے کرتا ہے کہ تمہیں بتائے کہ اُس شخص نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے قرآن نے اپنے دامن میں اس کے نام کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر لیا۔ یہ کوئی چھوٹا سا تعارف نہیں ہے' جو یوں محفوظ ہو جائے۔

قرآن حکیم میں خضر کا نام تک نہیں

قرآن، جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے، نے اپنے دامن میں کسی کا نام لیے بغیر، جو کچھ اُس نے کیا ہے، حسنِ خوبی کے ساتھ اُسے محفوظ کر دیا ہے۔ مثلاً خضر کا نام تک قرآن میں نہیں ہے لہٰذا قرآن تو اس پہ بحث نہیں کرتا کہ اُس کا نام کیا ہے بلکہ اس کے جو کارنامے ہیں، صرف ان کا ذکر کرتا ہے۔ بات تو قرآن نے کی کہ اُس نے کیا کیا، نام نہیں لیا۔ پھر اس پر افسانے بنے۔ وہ تو پوچھو نہیں کہ ہمارے ہاں خضر کے کتنے مشہور افسانے ہو گئے مگر جو کچھ اس نے کیا تھا، آپ دیکھیے کہ ان کا کہیں کبھی ذکر نہیں آتا۔ کیا کیا تھا؟ ایک جابر اور مستبد بادشاہ جو مسکینوں اور غریبوں کو بازار میں پکڑ رہا ہے، ان کی کشتیوں کو بازار میں پکڑ رہا ہے، وہ صاحبِ بصیرت اس وقت حسنِ تدبیر سے، ان غریبوں کو، اس کے دستِ تظلم سے بچا دیتا ہے۔ بغیر کوئی معاوضہ لیے ان کی کشتی کو محفوظ کر دیتا ہے تو پہلی چیز تو یہ تھی کہ کوئی شخصیت ہو، ہم اس کا نام تک بھی نہیں لیں گے، دنیا جانے گی بھی نہیں کہ وہ کون تھا، ہمیں ان کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص، جو کسی مستبد اور ظالم آدمی کے دستِ تظلم سے، کسی مسکین اور غریب کو محفوظ کر دے گا، اُسے بچا لے گا تو وہ اِس قابل ہے کہ قرآن اس کی مدح اور ستائش میں اسے اپنے دامن میں جگہ دیدے۔ پھر اس کا اگلا کارنامہ بتا رہے ہیں کہ ایک باغی، جابر، سرکش نوجوان ہے، مجرم ہے، قاتل ہے، جس کو موت کی سزا کا حکم سنایا گیا تھا، روپوش ہوا ہے، مفرور ملزم ہے، اس نے اس علاقے کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا، قید کی سزا بھی اس کو سنائی گئی تھی، اور وہ بھاگ گیا ہوا تھا پھر وہ بھاگا ہوا جو کچھ کرتا ہے وہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہی ہے اور مصیبت یہ تھی کہ اس کے بیچارے نیک ماں باپ اس کی اِن حرکتوں کی وجہ سے عذاب میں آ رہے تھے، وہ پکڑا نہیں جاتا تھا۔ آج یہ تنہا شخص، یہاں ہمت کر کے اس شخص کو گرفتار کرتا ہے اور وہ، جو اس پر موت کی سزا تھی، وہ اُسے پورا کر کے یعنی اُسے قتل کر کے پورے علاقے کو اُس سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اس کے بے گناہ بیچارے ماں باپ کو بغیر انعام لیے ہوئے معمون کر دیتا ہے، اب یہ اس کا دوسرا کارنامہ وہ آ جاتا ہے، جس نے ظالم کے ظلم سے، مسکینوں اور غریبوں کو محفوظ کر دیا، سرکش، باغی، ظالم اور مجرم کو اُس کے کیے کی سزا دی۔ اور اُس مردِ بصیرت کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ وہ یتیم کہ جن کا کوئی نہیں، ان کی متاعِ حیات ایک دیوار کے نیچے چھپی تھی، دیوار گر رہی تھی، بستی والے ان کے کھانے وانے کا بھی ان سے نہیں پوچھتے، اُن کی مہمان نوازی سے انکار کر دیتے ہیں، دھتکار کے نکال دیتے ہیں، وہ جاتے ہیں اور جب وہ دیکھتا ہے کہ دیوار گرا چاہتی ہے اور یہ غریب یتیم ہیں، ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں، اس دیوار کے نیچے، ان کا باپ جو ان کے لیے کچھ متاعِ زندگی چھوڑ گیا ہے، وہ یہ ظالم اُن کے شریکا برادری والے لے جائیں گے تو یہ بھوکا پیاسا بستی کے اندر یتیموں کی دیوار کو کھڑا کر دیتا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کو ضرورت نہیں کہ بتائے کہ وہ یہ سب کچھ کرنے والا کون تھا۔ قرآن صرف یہ کہہ کے آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس نے کیا کیا تھا۔ اور ہم ہیں کہ اس کے نام کو اس طرح سے اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں۔

قندیلِ آسمانی کی روشنی میں نقطۂ نظر کی تبدیلی

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ دیکھیے: پہلے دو واقعات کے متعلق حضرتِ موسیٰؑ نے صرف یہ پوچھا تھا کہ تم نے یہ کیوں کیا تھا؟ یعنی وہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) اپنی معلومات میں اضافہ چاہتا تھا تو وہ تو انہوں نے بتا دیا۔ اس تیسرے واقعہ کے متعلق انہوں نے یہ کہا تھا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اس وقت نبی نہیں تھے' یہ قبل از نبوت کی بات ہے۔ اس تیسرے واقعہ پہ انہوں نے کہا تھا کہ بستی والوں نے تو ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا۔ اگر تم چاہتے ہوتو یہ دیوار جو تم نے بنائی ہے' ان سے اس کا معاوضہ لے لیتے تو ہم اس سے روٹی تو کھا لیتے۔ یہی وہ نکتہ تھا جس پہ انہوں نے کہا تھا کہ اس سے پہلے تو تم صرف اپنی معلومات کی کمی کو پورا کرنے کا کہہ رہے تھے' اب تم نے ایک اصولی ذہنیت کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ جس کی بناء پر تو میں کہہ رہا ہوں کہ: هٰـذَا فِرَاقُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنِكَ (18:78)۔ ہم اب اکٹھے نہیں رہ سکتے' اب ہماری علیٰحدگی کا وقت آ گیا۔ اس ذہنیت میں وہ انسان میرے ساتھ نہیں چل سکتا' جو یہ کہتا ہے کہ یتیموں کی گرتی ہوئی دیوار کو بلا معاوضہ کیوں بنا دیا؟ ابھی تمہارے ذہن میں یہ بات ہے۔ کہنے لگے: معاوضہ لے کے تو ہر ایک بناتا پھرے گا' کوئی تو دنیا میں ایسا ہو کہ جس کا کوئی نہیں رہ گیا' اس کو یتیم کہتے ہیں' تو وہ اس کی متاعِ حیات کو محنتِ شاقہ سے' بغیر مزدو معاوضہ کے محفوظ کرے۔ اس بستی والوں میں تو کوئی ایسا نہیں ہے جو ان یتیموں کی دیوار کو یوں بلا مزدو معاوضہ بنا دے۔ جنہوں نے اِن سے یوں سلوک کیا ہو ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان کے دل میں انتقام کا جذبہ بھی نہ آئے مگر ان کے ہاں یہ جذبۂ انتقام نہیں آیا۔ انہوں نے تو یہ دیوار بلا مزدو معاوضہ بنا دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے اس بزرگ کے تذکرہ کو اپنے دامن میں کیوں رکھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن نے اس شخص کا نام بھی نہیں لیا' یہ تعین ہی نہیں کیا کہ یہ کون تھا' قرآنِ کریم نے صرف واقعات بیان کیے ہیں اور وہ اس لیے کہ یہ واقعات ابدی طور پر آپ کے لیے شمعِ ہدایت بنتے ہیں:

جہاں یہ قصہ دیوارِ یتیم کا' غریبوں کی بلا مزدو معاوضہ مدد کرنے والے کسی ایک بزرگ کا ختم ہوا تو اس کے ساتھ ہی قرآن نے ذوالقرنین کا قصہ شروع کر دیا۔ یوں دیکھیے تو دونوں میں کوئی ربط ہی نظر نہیں آتا: کہاں حضرتِ موسیٰؑ کے زمانے کے کسی ایک بزرگ کا قصہ' کسی بستی کے یتیموں کی دیوار بنانے کا واقعہ' کہاں ذوالقرنین کا قصہ۔ زمانے کے اعتبار سے اتنا بُعد اور مقامات کے اعتبار سے بھی اتنا فاصلہ! دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے' کوئی رشتہ نہیں ہے مگر قرآن نے اسی سانس میں یہ قصہ شروع کیا۔ ٹھیک ہے' سطح بیں نگاہوں کو تو نظر نہیں آتا کہ اس میں ربط کیا ہے مگر اس کے اندر ایسا گہرا ربط تھا کہ جس کا اب ذکر کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ (22:14)۔ جو لوگ بھی قوانین خداوندی کی محکمیت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق ایسے کام کریں کہ جس سے ان کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور انسانی معاشرے کے

بگڑے ہوئے کام سنواریں تو خدا انہیں ایسی زندگی عطا کر دیتا ہے کہ جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ یہ سب کچھ خدا کے اس قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے جسے اس نے اپنے منشا اور ارادے کے مطابق ایسا بنایا ہے۔

ذوالقرنین (600-3500) کے قصے کا پس منظر

پہلے تو قرآن ایسے صاحبِ بصیرت بزرگ کو سامنے لایا جس نے افراد کی مدد کی تھی۔ اب یہ ایک ایسی شخصیت کو سامنے لاتا ہے جس نے قوموں کی قوموں کو، ظالم اور جابر قوموں کے حملے سے بچانے کے لیے، دیواریں کھڑی کی تھیں۔ آپ دیکھیں کہ دیوار یہ ذوالقرنین بھی کھڑی کرتا، اور دیوار اس بزرگ نے جس کا نام تاریخی طور پر حضرؑ نے بھی کھڑی کی تھی۔ میں عام رسم العامہ کے متعلق اُس کا یہ نام لے لیتا ہوں۔ اس نے دو یتیموں کے لیے دیوار بنائی، اس ذوالقرنین نے مظلوم قوم کے لیے دیوار بنائی۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک پوری کی پوری قوم اس ذوالقرنین سے یہ کہتی ہے کہ یہ روس کی حملہ آور سرکش قومیں، بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح اٹھتی ہیں، ان کے اپنے ہاں تو کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ان کا گزارہ ہی لوٹ مار پہ تھا تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہر سال محنت کر کے یہاں مر جاتے ہیں اور یہ دبڑ، دبڑ، دبڑ، دبڑ کر کے آجاتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ کے سب کچھ لے جاتے ہیں۔ ہم بڑے کمزور واقع ہوئے ہیں، نہ کہیں جاسکتے ہیں، نہ یہاں رہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمارا کوئی علاج کر دیجیے۔ یہ ہے ربط اُس بزرگ کی دیوار میں اور سدِ ذوالقرنین میں۔ اب یہ بات آگے آئے گی۔

جناب ذوالقرنین سے مظلوم قوم کا مطالبہ

عزیزانِ من! اس پر ذوالقرنین نے کہا کہ ٹھیک ہے میں یہ کام کر دیتا ہوں۔ اب قرآن کریم نے جس بات پہ زور دیا ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے کہا کہ نَجۡعَلُ لَکَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَہُمۡ سَدًّا (18:94)۔ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کر دیں، یعنی ہم تمہیں اس کے معاوضے میں خراج دے دیتے ہیں، ہمیں دیوار کھڑی کر دو۔ دیکھا آپ نے کہ یہ بات کہاں آئی ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میں مظلوم کو ظالم کی حفاظت اور ظالم کے ظلم سے محفوظ کرنے کے لیے معاوضہ لے کے دیوار بنا کے دوں گا تو پھر میں اللہ کا بندہ نہ ہوا۔ مجھ میں اور عام بادشاہ میں فرق کیا ہوا۔ قَالَ مَا مَکَّنِّیۡ فِیۡہِ رَبِّیۡ خَیۡرٌ (18:95)۔ مجھے جو کچھ میرے پروردگار نے عطا کر رکھا ہے، وہ بہت ہے۔ اس لیے مجھے تمہارے خراج کی ضرورت نہیں۔ تم پر ظلم ہو رہا ہے اور ظلم کی روک تھام میرا فریضہ ہے اس لیے میں اس کام کو بطور فریضۂ خداوندی سرانجام دوں گا۔ میں دیوار بناؤں گا۔ میرے پاس یہ سب کچھ وسائل بھی ہیں۔ فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّۃٍ (18:95)۔ مجھے تم صرف اپنی محنت (Labour) سے مدد دے دو، مزدور مہیا کر دو، مجھے صرف لیبر کی ضرورت ہے اور لیبر تمہارے پاس بہت ہے۔ بس تم صرف مجھے لیبر دو باقی میں سب کچھ بلا مزد و معاوضہ بناؤں گا۔ اَجۡعَلۡ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ رَدۡمًا (18:95)۔ میں تمہارے اور اُن کے درمیان دیوار بنا دوں گا۔ دو پہاڑیوں کے درمیان جو درہ

تھا' جس میں سے یہ اس طرح سے' اندر یورش کر کے در آتے تھے قرآن نے کہا تھا کہ اس شخص نے اس محنت (Labour) کے ساتھ اس درے کو کاٹ لیا' لوہے کی سلوں سے پگھلایا ہوا تانبا ڈال کے اتنی مضبوطی سے دیوار بنائی کہ اس کے بعد ان یاجوج و ماجوج کو جرآت ہی نہیں ہوئی۔ وہ علاقہ ان کی یورش سے محفوظ ہو گیا۔ قرآن یوں ذکر کر رہا ہے ایک ایسی شخصیت کا' جسے وہ ذوالقرنین کہہ کر پکار رہا ہے۔

ذوالقرنین کون تھا اور اس نے کیا کچھ کیا

وہ ذوالقرنین کون تھا؟ قرآنِ کریم نے یہاں بھی اس کا نام نہیں لیا ہے۔ وہ جس صفت سے موسوم تھا اس نے اسی صفت کا ذکر کیا ہے۔ ذوالقرنین عربی زبان میں بنیادی طور پر دو سینگوں والے کو کہتے ہیں۔ دنیا کی عام دوسری زبانوں میں واحد (Singular) اور جمع (Plural) دو صیغے ہوتے ہیں مگر عربی زبان میں درمیان میں ایک صیغہ تثنیہ بھی ہوتا ہے یعنی دو کے لیے الگ اس کے ہاں لفظ آتے ہیں تو ''قرن'' کا تثنیہ ''قرنین'' ہے: دو سینگوں والا۔ اور قرن' ان کے ہاں ایک عہد یا زمانہ کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں بھی قرنہا قرن مستعمل ہوتا ہے۔ یہ لفظ زمانہ معینہ کے لیے بھی آتا ہے جسے آپ Age کہتے ہیں۔ عام طور پر ایک سو سال (صدی) کی مدت کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ زمانہ کا کچھ حصہ قرن کہلاتا ہے جس کی حد تک مقرر نہیں کی جاتی۔ پھر ''قرن'' سینگ کے اعتبار سے کسی چیز کے بڑی مضبوطی سے تھام لینے کو بھی کہتے ہیں۔ القرن کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ باندھ دینے اور ملا دینے کو بھی کہتے ہیں' دو اونٹوں کو ایک رسی میں باندھ دینے کو بھی کہتے ہیں' جکڑ دینے کو کہتے ہیں۔ قرن مملکت کو بھی کہتے ہیں' سلطنت کو کہتے ہیں۔ ابھی میں آپ سے عرض کرونگا کہ یہ ذوالقرنین دو سلطنتوں کا بادشاہ تھا۔ یونانی مؤرخ اسے سائرس (Cyrus) کے نام سے پکارتے ہیں' یہودی اسے خرس ماخورس کہتے ہیں' عرب اسے کیخسرو کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ جو کیقباد اور کیقعوس کے نام ہیں' یہ قدیم پہلوی زبان کے الفاظ ہیں۔ ان کے ہاں یہ بڑے شہنشاہ کا لقب تھا اور خسرو تو وہ کہتے ہی شہنشاہ کو تھے۔ تو عرب اس کو یعنی خسرو بادشاہ کو کہتے تھے اور اس طرح کیخسرو شہنشاہ ہو گیا یعنی بادشاہوں کا بادشاہ۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہمارے ہاں پیرانِ پیر کہتے ہیں حالانکہ یہ غلط تشبیہ ہے۔ پیرِ پیراں ہو تو ٹھیک ہے۔ بہرحال عرب اس کو کیخسرو کہتے تھے۔ یہ وہی کیخسرو ہے جس کا اڑھائی ہزار سالہ جشن' چار سال پہلے ایران میں منایا تھا۔ یہ جشن 1971 میں منایا تھا۔ اس ذوالقرنین کا زمانہ قریباً 500 تا 600 ق م کا بنتا ہے۔

ایران والوں کی نسل پرستی

عزیزانِ من! ایران والوں نے جو یہ جشن منایا تھا' وہ اسی کا منایا تھا اگرچہ اُس تقریب کی نسبت اس سے منسلک تھی جو قرآن نے کہا ہے۔ ایران والے تو بڑے نسل پرست ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ ہم ان کی نسل میں سے ہیں حالانکہ یہ اسلام سے بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ اڑھائی ہزار سال پہلے کی بات ہے' جس کا انہوں نے جشن منایا ہے ابھی تو اسلام کو دو ہزار سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ تو یہ قبل مسیح کی بات

ہے، جب یہ کچھ ہوا تھا، تو گویا یہ اسلام کی نسبت سے نہیں ہے بلکہ اپنے نسلی مورثِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس کا جشن منایا۔

ایران میں جنابِ زرتشت پیغمبر کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ جسے آج مجوسی مذہب کہتے ہیں وہ انہی کی طرف منسوب ہے۔اس میں تو ''اہرمن'' اور یزداں دو مستقل بالذات قوتوں کو خدا مانتے ہیں یعنی یزداں، نیکی اور خیر کا خالق، خدا بھی اور اس کے مقابل میں اہرمن، آتش پرستوں کا بدی کا خدا یعنی ابلیس بھی۔ یہ مجوسی آگ کو پوجتے ہیں، مہترا کو اسی طرح کا خدا کا بیٹا مانتے ہیں، جیسے عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو، یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی، ورنہ میں عرض کرتا کہ یہ جو عیسائیوں کے ہاں بغیر باپ کے پیدا ہونے والے بیٹے کا عقیدہ ہے، زندہ آسمان میں چلے جانے والے کا عقیدہ ہے، یہ بعد کے عیسائیوں نے وہیں کے مجوسیوں کے ہاں سے لیا۔ان کے بعد جو تبعین ہوئے ہیں، ان میں یہ مہترا مشہور ہے۔ یہ ان کی تعلیم ہے۔اس تعلیم کے جو پابند ہیں، انہیں وہاں مجوسی کہتے ہیں۔اب ان میں سے وہاں کے جو پارسی ہیں وہ اب پاکستان میں بھی خال خال ہیں۔ ہندوستان میں یہ پارسی زیادہ تھے، اس مذہب کے پیراؤ کار ہیں۔انہیں آتش پرست کہتے ہیں۔لیکن اپنے زمانے میں زرتشتی مذہب کا بڑا ہی چرچا اور شہرہ تھا۔ یہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔سارا ایران تو اس کا حلقہ بگوش تھا۔

حضرتِ زرتشت کے پیراوؤں میں سے یہ شخص تھا، جسے خائرس یا سائرس (Cyrus) یا یہودی خرس یا خورس یا عرب کیخسرو کہتے ہیں۔ یہ وہ شخص تھا جس کی اس زمانے کے ایران میں دو [1] سلطنتیں تھیں: فارس اور میڈیا (مادیا) یا میبیا۔ایران کا جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمالی حصہ میبیا یا میڈیا (مادیا) کہلاتا تھا۔ پہلے یہ دو الگ الگ ایمپائر تھیں۔اس کیخسرو یا سائرس (Cyrus) نے ان دونوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا تو دو مملکتوں کا بادشاہ ہونے کی جہت سے اسے ذوالقرنین کہا گیا اور چونکہ اس زمانے میں مملکت یا سلطنت کی علامت سینگ ہوتی تھی، اس جہت سے اس کو دو سینگوں والا کہتے تھے۔

اصطخر کے مقام پر کھدائی کے دوران قرآن حکیم کی ایک شہادت

اصطخر کے مقام پر اسی صدی کے شروع میں کھدائی کرنے سے ایک مجسمہ [2] برآمد ہوا ہے۔ یہ برو کا تانبے کا بنا ہوا، بہت خوبصورت مجسمہ ہے۔اس کے ماتھے پہ دو سینگ ہیں اور آرکیالوجیکل تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ یہ اسی کا مجسمہ تھا جسے کیخسرو یا خرس یا خائرس کہا جاتا ہے اور اس جہت سے قرآن نے اسے ذوالقرنین کہا ہے۔ یہ مجسمہ ایران میں محفوظ ہے۔ جب ایران میں یہ جشن ہوا تھا تو آپ کو یاد ہوگا کہ ٹی وی

---

[1] چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کی مملکت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی: جنوبی حصہ فارس اور شمالی حصہ میں میڈیا (مادیا) کی سلطنت۔ 560 ق م کے قریب وہاں سائرس (Cyrus) نامی ایک بادشاہ ہوا۔اس نے ان دونوں (فارس اور میڈیا یا مادیا یا میبیا) کو ملا کر ایران کی وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد رکھی۔

[2] Sir Percy Sykes نے اپنی کتاب A History of Persia کی جلد اول کے شروع میں Cyrus /خرس/کیخسرو کے اس مجسمہ کا فوٹو دیا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ یہی میڈیا اور فارس کی دو سلطنتوں کا شاہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں، یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملی۔ چنانچہ یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور ہے۔

پہ اس کا مجسمہ بار بار دکھایا جاتا تھا۔ وہ تاج کے اعتبار سے، جس پر جھالر بھی تھی، بڑا خوبصورت مجسمہ ہے۔ اس کے سر کے اوپر دو سینگ موجود ہیں۔ یہ اس صدی کے شروع میں کوئی ایک سو سال کا عرصہ ہوا برآمد ہوا۔ ایران میں پہلے اس قسم کی کوئی شبیہ تک بھی نہیں تھی۔ قرآنِ کریم چودہ سو سال سے اس کو دو سینگوں والا کہہ کر پکارتا ہے اور آج وہ مجسمہ اس کی شہادت دے رہا ہے۔ ذوالقرنین دو سینگوں کی نسبت سے نام ہے۔ قرآن نے نبیوں کی فہرست میں اس کا نام نہیں لیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ مذہبی دنیا میں اس کا مقام کیا تھا۔

ذوالقرنین کا پہلا تعارف

ذوالقرنین کا پہلا تعارف اس طرح ہوتا ہے کہ یہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے یہ بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لیے قیامت صغریٰ تھا۔ بخت نصر کی وحشت و بربریت نے نہ صرف یروشلم کو برباد کیا بلکہ ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بے شمار یہودیوں کی آبادی کو قتل کیا اور باقی جتنے بھی یہودی تھے، سب کو ڈھور ڈنگر کی طرح ہانک کر بابل لے گیا، یہودی اجڑ گئے، ان کا کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ قریب سو سال تک یہ اس کی غلامی میں رہے۔ سو سال تک تو دو تین نسلیں آگے چلی آتی ہیں۔ تورات میں یہودیوں کے دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ، جو ان کے نبی کہلاتے ہیں، کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔ ان میں یہودیوں کے اسی زمانہ اسارت یعنی بابل کی قید کے زمانے میں، یہودیوں کی اِس زہرہ گزار مصیبت کی داستان بیان کی گئی ہے، اس میں دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آتا ہے۔ یہودیوں پر اس زمانے میں یہ بزرگ نظر آتے ہیں، اسی زمانۂ اسیری کے یہودیوں کے یہ بڑے ہی جانگداز اور دلخراش نوحے ہیں۔ وہاں کے مستبد حکمران (شازاد) کے جور و ظلم سے وہ خدا سے مدد مانگتے ہیں کہ کوئی ایسا بھیج کہ ہمیں کی اس غلامی سے، ذلت آمیز اسیری کی زنجیروں سے، نجات دلائے۔ اس زمانے میں یہ کیخسرو فارس میں بادشاہ بن کے آیا۔ اس زمانے کے یہودیوں، بابل کے باشندوں نے، اس کے حضور درخواست کی۔ جب اس تک یہودیوں کی یہ داستانِ مظالم پہنچی تو آپ اندازہ لگائیے جو بھی خدا کے دین کی صداقتوں کا پیرا ہوتا ہے وہ تعصّبات کی تنگ نظری سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ وہ جس دین کا پیراؤ، وہ علی الرغم تھا، وہ دین یہودیوں کے خلاف تھا، نسلی اعتبار سے بھی یہ دونوں متضاد اور متخالف تھے۔ یہ ایریل نسل کے ہیں، وطن بھی الگ ہے لیکن ایک قوم، جو ایک مستبد سلطنت کی غلامی میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے، اسی کے لیے یہ شخص، کیخسرو یا ذوالقرنین، نجات دلاتا ہے۔ یہ وہاں بابل پر حملہ کرتا ہے، یہودیوں کو ان کی قید سے چھڑاتا ہے، واپس لاتا ہے، پھر ان کو یہیں بیت المقدس میں لاکے، یروشلم میں آباد کرتا ہے، ان کا ہیکل بنواتا ہے، ان کی تورات کو از سرِ نو مرتب کرنے کے انتظامات کرتا ہے، ان کو یہاں بسا کر نہایت خوشحالی کی شکل میں بلا مزد و معاوضہ اپنے وطن واپس چلا جاتا ہے۔

یہودیوں کے سلسلہ میں ذوالقرنین کا حسن سلوک اور قرآن کی عظمت

کیا یہ شخصیت، یہ ذوالقرنین، اس قابل نہیں تھے کہ قرآن اس کو اپنے دامن میں محفوظ رکھتا؟ ہاں تھے، اسی لیے قرآنِ پاک نے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دامن میں جگہ دے دی۔ یہودیوں کے ہاں اس کی اسی اعتبار سے اتنی عزت اور عظمت تھی لیکن عجیب بات ہے

کہ یہودی کی بائبل میں یہ تو ملتا ہے کہ اس نے یہ کچھ کیا لیکن جس انداز سے قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے' یہ انداز بھی وہاں نہیں ملتا۔ پھر یہ ایک اور غور طلب اگلا نقطہ آ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ عبرانی ہے اور فرعون بہرحال عربوں کے ہاں کا دین ہے۔ اسے عربی اور عجمی دین کہنا ہی غلط ہے لیکن اس زمانے میں تو بہرحال یہ عرب ہی تھے جن کی طرف یہ دین نازل ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس اعتبار سے تو رسولِ عربی کہلاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہیں۔

ایرانیوں اور عربوں کے تعلقات کی صورت حال بھی عجیب ہے۔ ایران' ان اہلِ عرب کو اس قدر ذلت کی نگاہ' نفرت کی نگاہ' سے دیکھتا تھا کہ ان کے ساتھ دوستی تو ایک طرف' یہ ان کے ساتھ جنگ کرنے میں بھی اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس قدر تھی یہ کمینہ سی قوم۔ یہ شیر وشتر اردن وشیش وار۔ اس کے بعد بھی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربوں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ اونٹ کا دودھ پینے اور کھجور کھانے والی قوم کو یہ جرأت ہوگئی ہے کہ ایرانیوں کے مقابلے میں کھڑی ہو جائے۔ یہ کیفیت تھی ایرانیوں کی عربوں کے ساتھ۔ عین اس زمانے میں جب اہلِ ایران عربوں کے متعلق یہ تصور رکھتے تھے' قرآنِ کریم انہی ایرانیوں کے اس بزرگ کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے جیسے ایک نبی کا تذکرہ کیا جاتا ہے گو کہ یہ نبی نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کا تذکرہ ایسے انداز میں درج کیا ہے۔ ان کی معدلت گستری اور غربا پروری' خدا ترسی اور نیک کرداری ایسی تھی کہ انہیں عزت کا مقام عطا کیا جاتا۔ یہ اس سے بہت بلند ہے کہ نسلی اعتبار سے یہ کون ہے' وطنی اعتبار سے اس کا وطن کیا ہے' مذہب کے اعتبار سے اسلام کا متبع نہیں اور اس طرح آپکی اصطلاح میں آپس کی دشمنی کی یہ کیفیت ہے لیکن چونکہ وہ محسنِ انسانیت ہے' اس لیے قرآنِ کریم ان تمام تنگ ناؤں سے بلند ہو کر' اس کو ایک ادبی مقام عطا کر دیتا ہے۔

خدا کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا

عزیزانِ من! میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں اس زور و قیم سے کسی شخص کا نام آ جانا' وہ بھی اتنے حصہ قرآن میں' جو قرآن نے اس کے لیے مخصوص کر دیا' یہ کوئی چھوٹی سعادت نہیں' کسی کا کسی کے لیے کوئی چھوٹا شرف نہیں ہے' آپ سوچیے تو سہی کہ دنیا میں آج کیخسرو' خرس یا خارس کا نام لینے والے دو سو سال میں اتنی دفعہ نام نہیں لیتے ہونگے جتنی مرتبہ قرآن کے پڑھنے والے ذوالقرنین کا نام لیتے ہیں۔ ابھی ابھی تو ہم نے رمضان کے مہینے میں کروڑوں انسانوں نے اس نام کو دہرایا اور اسی حمد و ستائش کے ساتھ دہرایا جو قرآن میں مذکور ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم ہر اس شخص کو جو کچھ بھی انسانیت کے اوپر احسان کر جاتا ہے' عالمگیر انسانیت کے منصب کے لیے کوئی کام کر جاتا ہے' وہ اس کی خدمات کو کتنا Appreciate کرتا ہے کتنا دادِ تحسین و آفریں دیتا ہے' اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہودیوں کا ایک دوسرا واقعہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ قرآن کریم اس کے علاوہ یہ واقعات یہاں بیان کر رہا ہے

ذوالقرنین کی پہلی مہم

وہ کہتا ہے کہ پہلے یہ لیڈیا کی طرف گیا۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک قوم بہت سرکش ہوگئی ہے۔ لوگوں کو ستاتی ہے تو وہ جسے ایشیائے مائنر

(Asia Minor) کہتے ہیں جسے ایشیائے کوچک کہتے ہیں' اس سائیڈ پہ تھی۔ لیڈیا کی سلطنت اس زمانے میں [1] ساحلِ سمندر کے کنارے تھی اور قرآن نے جو Description دی ہے وہ بڑی دلچسپ ہے کہ جب یہ وہاں پہنچا تو شام کا وقت تھا' اسے یوں نظر آیا جیسے سورج کسی کیچڑ کی جھیل میں ڈوب گیا ہے۔ نظر آتا ہے کہ بحرِ اسود تھا' اسود کے معنی ہی کالا ہیں' تو یہ اس کے کنارے پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ اس وقت سامنے سمندر ہی سمندر نظر آتا ہے کہ جیسے یہ سورج سمندر میں گم ہو گیا ہے' اس کو وہاں یہ نظر آیا تو وہ جو سرکش قوم تھی پہلے اس نے ان کو مطیع وفرمانبردار بنایا اور ان کے مظالم سے وہاں کے علاقے کے لوگوں کو نجات دلائی۔ یہ اس کی پہلی مہم ہے۔

دوسری مہم

اس کی دوسری مہم بلخ کی طرف ہے۔ بلخ کو بکڑ یا بھی کہتے ہیں۔ یہ ایران سے مشرق کیطرف واقع ہے۔ یہاں کوئی ایسی خانہ بدوش سی قوم تھی اور وحشی قبائل نے اودھم مچا رکھا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قوم کی زبان بھی اس سے بہت مختلف تھی۔ وہ آپس میں بات بھی نہیں سمجھتے تھے۔ یہ وہاں گیا تو اس قوم کو بھی یہاں کے مستبد فرمانراؤں کے مظالم سے نجات دلائی' انہیں بھی آزاد کرایا۔ یہ اس کی دوسری مہم ہے۔

ذوالقرنین کی تیسری مہم

اب اس کی تیسری مہم آتی ہے۔ یہ جسے ہم کوہ کاف کہتے ہیں' کاکیشین پہاڑوں (Mountains) میں ایک قوم تھی۔ وہ قوم جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اس قوم نے اس سے فریاد کی' یہ ایرانی قوم نہیں ہے اور اس کی سلطنت کا حصہ بھی نہیں ہے' ہم مذہب بھی نہیں ہے۔ یہ مظلوم قوم ہے۔ یہ آواز دیتی ہے کہ ہم بہت کمزور اور ضعیف ہیں اور ادھر سے یہ وحشی قبائل ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ وہی ہلاکو اور چنگیز جنہیں آپ جانتے ہیں' اب تک ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں انسانوں کے کانوں میں ٹکراتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ جس طرح سے دنیا میں فرعون کا نام ایک نسب ہو گیا ہے چنگیز اور ہلاکو تو آپ جانتے ہیں: تباہی' بربادی' لوٹ مار کے اندر ان کا نام ایک ضرب المثل بن گیا ہوا ہے۔ یہ قومیں تھیں وہ ان کو لوٹنے کے لیے آجاتے تھے۔ چین نے تو اپنے گرد پوری کی پوری دیوار کھینچ لی۔ اچھے زمانے تھے کہ اگر ایک دیوار کھینچ لی جائے تو دشمن کے حملوں سے علاقہ محفوظ ہو جاتا تھا۔

یہ جو ہمارے ہاں فصیل شہر کہلاتی ہیں' یہ ساری' ہمارے جو پرانے شہر ہیں' ان کے باہر ایک فصیل ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ایک دیوار کھینچ لینے سے انسان محفوظ ہو جاتا تھا۔ وہ لوگ ایسے مقام پہ تھے جہاں

---

[1] لیڈیا کا علاقہ ایشائے کوچک کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ جہاں سے آگے سمندر آجاتا ہے۔ یہ غالباً بحیرۂ اسود کا کنارہ تھا۔ اُس زمانے میں لیڈیا کا دار الحکومت سارڈس تھا۔

پہاڑ تو تھا لیکن درمیان میں درہ (Pass) تھا۔ یہ درہ دانیال ہے۔ ❶ علمائے حشریات یعنی آرکیالوجسٹ کا اندازہ یہ ہے کہ اِس درہ' جس کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں' کے اس پار وہ قوم تھی۔ اِس نے اُس کے پاس فریاد بھیجی کہ ہمیں بھی ان کے ہاتھوں سے محفوظ رکھ تو اس کے لیے اسنے یہ تدبیر سوچی کہ اِس درے کو بھر دیا جائے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ دو پہاڑوں کے درمیان کا جو درہ ہے' وہ خاصا بڑا درہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا تو یہی علاج ہے کہ اس درہ کو کاٹ دیا جائے' پھر یہ لوگ ان کی یورش سے بچ سکتے ہیں ورنہ کون یہاں اتنی بڑی چھاؤنی ڈالے رکھے گا اور آئے دن جنگ ہوا کرے گی۔ تو اس شخص نے اس درہ کو جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' لوہے کی سلوں سے ایک دیوار کھڑی کی اور پھر اس نے قرآن کے الفاظ میں تانبا پگھلا کر اس کے اوپر چڑھایا اور اس طرح سے انہیں ان کے دستِ تظلم سے بغیر کوئی معاوضہ لیے محفوظ کر دیا۔ یہاں بھی قرآن نے ویسے ہی کہا جیسے وہ دیوارِ یتیم کے سلسلے میں بات کہی ہے کہ انہوں نے بلا معاوضہ یہ کام کر دیا۔ یہاں بھی قرآن نے اسی بات کو Stress کیا ہے کہ ان لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تمہارے باجگذار ہو جاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ کونسا شہنشاہ یہ نہیں چاہے گا کہ ایک قوم اس کی محکوم ہو جائے۔ اس نے یہ جواب دیا تھا کہ نہیں۔ ویسے' Otherwise' اگر تم یہ کچھ کہتے تو اور بات تھی لیکن اس دیوار بنانے کے معاوضے میں تم یہ کہتے ہو کہ ہم تمہارے باجگذار ہو جاتے ہیں تو مجھے تمہارے خراج کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو ایک مظلوم قوم کو ظالم قوم کے استبداد سے محفوظ کرنے کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ اس نے وہ فریضہ سرانجام دیا اور اپنی سلطنت میں واپس آ گیا۔ یہ ہے وہ خارس یا خرس یا کیخسر و جسے قرآن نے ذوالقرنین کہہ کر پکارا ہے۔ خود اہلِ ایران کو بھی اس سے پیشتر اس کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔

ایرانیوں کا آج کا جشن اور قرآن کی چودہ سو سال پیش کردہ تحریر

قرآن نے یہ ساری تفصیلات بتائی ہیں۔ اب جو وہاں عصر حاضر میں تحقیقات ہوئی ہیں تو جتنی قرآن نے اس سورۃ کی چند آیات میں یہاں یہ تفصیلات دی ہیں یہ نقشوں کے اوپر as a root متعین ہو گئے ہیں کہ یہ کس سمت کو گیا تھا؟ کہاں پہنچا تھا؟ کیا اس نے کیا تھا؟ اور اب اس کی تاریخ مرتب ہوئی ہے اور ایرانیوں نے پھر اِسے اپنے نسلِ مورثِ اعلیٰ کی حیثیت سے اس کا جشن منایا ہے۔ قرآن نے چودہ سو سال پیشتر اس کا جشن اس انداز سے منایا کہ بڑی سے بڑی سلطنت بھی اس انداز سے نہیں منا سکتی تھی۔ وہ اس طرح کہ اسے

---

❶ یہ علاقہ یوں سمجھیے کہ آرمینیا (Armenia) اور آذربائیجان (Azerbaijan) کے پہاڑوں میں گھرا ہوا خطہ تھا جہاں کی آبادی اہل ایران کی زبان سے بالکل ناواقف تھی۔ اس قوم نے پہاڑوں کے اُس پار سے بسنے والی قوم کے سیلاب بے پناہ کے خلاف فریاد کی جو ہر سال پہاڑ کے درہ میں سے امڈ آتا تھا اور انسانی جان و مال کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا تھا۔ اس حملہ آور وحشی قبائل کا نام یاجوج وماجوج تھا۔ یہی وہ وحشی قبائل تھے جن کی طوفان انگیزیوں سے بچنے کے لیے اہل چین نے وہ دیوار تعمیر کی جس کا شمار آج دنیا کے نوادرات میں ہوتا ہے یعنی دیوار چین۔

اپنے دامن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا ہے اور یوں تحسین وتبریک سے اس کا نام لیا ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من! ذوالقرنین کا وہ واقعہ جو قرآن میں آیا ہے۔

یہ جو کچھ میں نے آج کے اس درس میں عرض کیا ہے' اگلی آیات میں اسی کا ہی ذکر ہے' یہی اس کا تعارف ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے اس کا ذکر اسی بزرگ کی طرح کیوں محفوظ کیا جس کی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ملاقات ہوئی' جس کا ذکر اس سے پہلی آیات میں آیا۔ وہ مظلوموں کی حمایت' ظالموں اور سرکشوں کی سرزنش ایک انفرادی چیز ہے اور یہ کچھ قومی اعتبار سے کیا ہے۔ اس اعتبار سے بات دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ جو بھی انفرادی طور پہ یا اجتماعی طور پر نسل' وطن' قبیلہ' قوم' مذہب کی ان تنگ ناؤں سے بلند ہو کر محض انسانیت کی نسبت سے' کسی مظلوم کی مدد کرتا ہے یا کسی ظالم کی سرکشی کو توڑتا ہے' قرآن کے نزدیک وہ وجہِ حمد وستائش ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہاں قرآن نے ذوالقرنین کا یوں ذکر کیا۔

عزیزانِ من! میں نے پہلے ہی معذرت چاہی تھی کہ فلو اور بخار کی وجہ سے مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اب ایک گھنٹہ ہو گیا ہے' مجھے اجازت دیجیے' واقعی مجھے بیماری کا بہت اثر ہونے لگ گیا ہے۔ آج اتنے پہ ہی میں اکتفا کرتا ہوں۔ اب اِس ایک گھنٹہ کے تمہیدی کلمات کے بعد اگلی آیات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائیں گی' بات تو ساری ہو ہی گئی ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم ط

❀......❀......❀......❀

چھٹا باب: **سورة الکہف** (آیات 83-102)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ۭ٨٣ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ۙ٨٤ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝٨٥ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ
وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝٨٦ قَالَ اَمَّا مَنْ
ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝٨٧ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَۨ
الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝ۭ٨٨ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝٨٩ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا
تَطْلُعُ عَلٰي قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ۙ٩٠ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝٩١ ثُمَّ اَتْبَعَ
سَبَبًا ۝٩٢ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝٩٣ قَالُوْا يٰذَا
الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓي اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا
وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝٩٤ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ۙ٩٥ اٰتُوْنِيْ
زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ
عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ۭ٩٦ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝٩٧ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا
جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ۭ٩٨ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي
الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝ۙ٩٩ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَىِٕذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَۨا ۝ۙ١٠٠ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ
غِطَاۗءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝١٠١ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ
دُوْنِيْٓ اَوْلِيَاۗءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝١٠٢

ذوالقرنین کا یہودیوں جیسی ضعیف و ناتواں قوم کو غلامی سے نجات دلانے کی راوداد

عزیزانِ من! آج نومبر 1975 کی 23 تاریخ ہے۔ اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 83 سے ہو رہا ہے:(18:83)۔

میں سابقہ دو درسوں کے ناغہ کے بعد آج حاضر ہو رہا ہوں۔ پچھلا درس دو نومبر کو ہوا اور یہی آیت یعنی سورۃ الکھف کی آیت 83 ہے جس میں ذوالقرنین کا ذکر آتا ہے۔ میں نے اس کا تعارف کراتے ہوئے اس موضوع پر درس کا افتتاح کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اُس زمانے میں میری طبیعت ناساز تھی اس لیے بہتر ہے کہ تجدیدِ یاداشت کے لیے میں اسے چند الفاظ میں دہرا دوں کہ ذوالقرنین پر کی جانے والی تحقیق کچھ ایسا ہی بتاتی ہے' گو کہ قرآنِ کریم میں تو اس کی تشریح نہیں آئی' لیکن تاریخی اعتبار سے یہ وہی شخصیت ہے کہ جسے اہلِ یونان خائرس یا سائرس (Cyrus) کہتے تھے' یہودی خرس یا خورس کہہ کر پکارتے تھے اور عربوں کے ہاں یہ کیخسرو کے نام سے متعارف تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کی کشادگیوں کی یہ کیفیت ہے کہ ذوالقرنین گو کہ زرتشت مذہب یعنی مجوسی مذہب کا پیراؤ تھا' اہلِ ایران کا قدیمی ہیرو تھا اور اگر مجوسی مذہب کو الگ بھی کر دیا جائے تو اہلِ ایران کی عربوں کے ساتھ اس زمانے میں دشمنی ایک ضرب المثل کی صورت اختیار کیے ہوئے تھی تو اس قوم کا ہیرو' جو مجوسی مذہب کا پیراؤ تھا' قرآنِ کریم نے نہ صرف یہ کہ اس کا نام ہی اپنے ہاں محفوظ کر لیا بلکہ قرآن کا اسی سورۃ کا ایک حصہ اس کی سرگزشت کی نظر کر دیا۔ یہ کسی شخصیت کی کتنی بڑی سعادت ہے کہ قرآنِ کریم اس کے احوال و کوائف کو اپنے دامن میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر گیا۔ اہلِ ایران نے بھی اِسے اس انداز سے یاد نہ رکھا جس انداز سے قرآن نے یاد رکھا۔ انہوں نے تو ابھی حال ہی میں دو چار برس ہوئے ہیں' اس کی دو ہزار سالہ برسی کا جشن منایا تھا۔ ان کے ہاں تو یہی ہو سکتا تھا۔ یہ تو غالباً 500 تا 600 قبل مسیح کی بات تھی۔ لیکن قرآنِ کریم نے تو اس دور میں اس کی یاد کو محفوظ کیا ہے' جب اہلِ ایران بھی اسے اس انداز سے نہیں جانتے تھے۔

یہودی قوم کو سو سالہ غلامی سے نجات دلانے کی مہم

قرآنِ کریم نے ذوالقرنین کی یاد کو کیوں محفوظ کیا؟ محض اس لیے کہ اس شخص نے' اس بادشاہ نے' انسانیت کی کچھ ایسی خدمات سر انجام دی تھیں' جو قرآن کے نزدیک باعثِ تحسین تھیں۔ اس پہ آپ قرآن کی کشادہ نگہی دیکھ لیجیے کہ جو شخص بھی انسانیت کی کچھ خدمت کرتا ہے' وہ اسے اپنے دامنِ سعادت میں جگہ دے دیتا ہے۔ یہ وہی شخص تھا کہ جب بابل کے بخت نصر نے یروشلم پہ حملہ کیا' بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی' پوری کی پوری یہودی قوم کو ہانک کر' غلام بنا کر' بابل لے گیا' اسی نوے سال تک وہ وہاں رہے۔ یوں کہیے کہ قریب سو سال تک رہے اور پھر وہاں جو اس اسیری کی حالت میں ان کی کیفیت ہوئی بائبل میں آج بھی ان کے نبیوں کے نوحے اس کی

شہادت دیتے ہیں کہ ان پر کیا گذر رہی تھی: دنیا میں ان کا کوئی مددگار، والی وارث نہیں رہ گیا تھا۔ یہ ذوالقرنین وہاں سے اٹھا اور محض اس مظلوم، ضعیف، ناتواں قوم کی مدد کے لیے اس نے بابل پر حملہ کیا، یہودیوں کو ان کی غلامی کی قید سے چھڑایا۔ پھر بیت المقدس میں لا آباد کیا، ہیکل کی بلامزدو معاوضہ تعمیر کروائی۔

ذوالقرنین کی اور مہمات بھی ہیں جن کا قرآن میں ذکر آتا ہے۔ اِن میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اس نے مقہور و مظلوم قوموں کی کس انداز سے مدد کی تھی اور یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کے ذکر کو اس انداز سے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔ **وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ** (18:83)۔ اے رسول! تم سے یہ لوگ ذوالقرنین (سائرس کیخسرو یا خرس) کے متعلق دریافت کرتے ہیں، تم سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو گویا عربوں کے ہاں اِس کا لقب ذوالقرنین ہے۔ ''قرن'' سینگ کو کہتے ہیں، قرن Ear کو کہتے ہیں، اسے زمانہ بھی کہا جاتا ہے۔ دیکھیں جیسے ہم قرنہا قرن لفظ بولتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے ہم Age کہتے ہیں، جسے ہم دَور کہتے ہیں، جسے ہم عہد کہتے ہیں۔ تو یہ اس زمانے کی بات ہے جب مجسمہ بناتے تھے۔ اس قسم کے قرن کو عربی میں سینگ کہتے ہیں۔ تو اس طرح ذوالقرنین ہوا دو سینگوں والا۔ عربی زبان کے لفظی اعتبار سے، اس کے معنی ہوئے دو سینگوں والا۔ یہ اُس شخص کا لقب تھا۔ ویسے تو یہ دو مملکتیں تھیں، اُس زمانے میں ایران کی سلطنت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی: جنوبی حصے کو پارس (Persia) کہتے تھے اور شمالی حصے کو میڈیا (Media) کہتے تھے اور ''قرن'' مملکت کے معنوں میں بھی آتا تھا، سلطنت کے معنوں میں بھی آتا تھا۔ تو اس نے ان دونوں حصوں پارس اور میڈیا کو ملا کر ایک مملکت بنالی تھی۔ اس لیے عربوں کے ہاں یہ ذوالقرنین کہلاتا تھا۔ تو اس کا لفظی تعارف تو یہ تھا۔

ذوالقرنین کے مزید حالات کے متعلق یہاں سے بات ہوئی کہ یہ لوگ قصہٴ ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ **قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا** (18:83)۔ ان سے کہو کہ لو! میں اس کی بھی مختصر سرگزشت تم سے بیان کرتا ہوں: **اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا** (18:84)۔ اسے مملکت میں تمکن عطا ہوا تھا اور ہر قسم کا ساز و سامان، جو اس زمانے میں اس کے لیے اس کی سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری تھا وہ اس کو حاصل تھا۔ اب قرآنِ کریم نے اس کی تین Expeditions کا، مہمات کا، ذکر کیا ہے۔ پہلے وہ لیڈیا کی طرف گیا۔ یہ جو ایشیا مائنر Asia Minor ہے، جسے ہم ایشیائے کوچک کہتے ہیں، اسے اناٹولیا (Anatolia) بھی کہتے ہیں۔ اس کے شمالی اور مغربی حصے میں اس زمانے میں لیڈیا والوں کی مملکت تھی۔ پہلے یہ اس طرف گیا۔ یہ ساحلِ سمندر پر واقع ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آج جسے ہم Black Sea یا بحرِ اسود کہتے ہیں، اس کے کنارے کے اوپر جو حصہ یا رقبہ یا خطہ یا مملکت تھی یہ پہلے اس طرف، اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا۔ تو کہا ہے کہ **فَاَتْبَعَ سَبَبًا** (18:85)۔ اُس نے پہلے ایک مہم (Expedition) کے لیے تیاری کی، اس نے پہلے ایک راستے کی طرف رخ کیا۔ یہ مہم (Expedition) مغربی جانب لیڈیا کی طرف تھی۔ کہا: **حَتّٰى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا** (18:86)۔

چنانچہ وہ جانبِ مغرب چلتے چلتے ایک ایسے مقام تک جا پہنچا جہاں آگے پانی ہی پانی تھا' غالباً یہ بحرِ اسود (Black Sea) تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سورج سیاہ کیچڑ والے پانی میں ڈوب رہا ہے اس لیے کہ وہاں جہاں تک نگاہ جاتی تھی' سیاہ رنگ کا پانی تھا' جس سے اُسے ایسا دکھائی دیا گویا سورج پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اس کے قریب ہی اُس نے ایک قوم کو دیکھا۔ ہاں تو یہ وہاں جا پہنچا۔

اب قرآن کا انداز دیکھیے۔ سمندر تو ہم میں سے اکثر نے بھی نہیں دیکھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کراچی میں سمندر کے کنارے جہاں تاحدِ نگاہ پانی ہی پانی ہو' وہاں جب شام کو سورج غروب ہو رہا ہو تو ظاہراً ایسا ہی نظر آئے گا جیسا کہ وہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔ اب وہاں بحرِ اسود Black Sea پر پانی میں کیا رنگ تھا تو قرآن نے اسی انداز سے بات کی ہے کہ وہاں جو اس کی مہم تھی' وہ اس پر چلتا گیا تا آنکہ وہ سمندر کے کنارے جا پہنچا' جہاں اس نے محسوس کیا کہ گویا سورج اس میں ڈوب رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بحرِ اسود (Black Sea) کا ہی کنارہ تھا جہاں وہ گیا تھا کیونکہ اس آیت میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں: **عَیۡنٍ حَمِئَۃٍ** (18:86)۔ سیاہ بدبودار پانی یا دلدل کی جھیل۔ اسے ذرا کیچڑ والا پانی' سیاہ رنگ کا پانی کہا جاتا ہے۔ اس میں اس نے دیکھا کہ جیسے سورج اس میں ڈوب رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہاں سچ مچ سورج ڈوب گیا تھا یعنی اس نے سمندر کے کنارے کھڑے ہو کے جو سورج کو دیکھا تو اس نے ایسا محسوس کیا کہ سورج اس کے اندر ڈوب رہا ہے۔ وہاں ایک قوم تھی۔ اس قوم نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے اُس نے اس قوم پر حملہ کیا۔ وہ اس پر غالب آ گیا۔ اب از روئے قانون وہ حق بجانب تھا کہ اُسے اس کی سرکشی کی سزا دیتا۔ اس غالب آنے کے بعد قرآن کا اگلا فقرہ یہ ہے: **قُلۡنَا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِمَّاۤ اَنۡ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ تَتَّخِذَ فِیۡھِمۡ حُسۡنًا** (18:86)۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ کہ ''ہم نے اس سے کہا کہ اے ذوالقرنین! اب تیری مرضی ہے کہ دشمنوں کی حیثیت سے تم انہیں قید کرو' مغلوب کرو' سزا دو اور دوسرا یہ کہ چونکہ انہوں نے حملہ کرنے سے پہلے ہی ہتھیار نہیں رکھ دیئے تھے بلکہ انہوں نے مقابلہ کیا تھا اور تو ان پہ غالب آ گیا تو تم ان سے حسنِ سلوک سے پیش آ ؤ۔ اب دونوں صورتیں مختلف ہیں: یا تو دشمن کی سی حیثیت سے ان کے ساتھ سلوک کر' یا حسنِ سلوک سے کام لے۔ دونوں ہی چیزیں جائز ہیں۔ پہلا راستہ عدل کا ہے اور دوسرا احسان کا۔ اب کیا کرنا ہے یہ تمہاری مرضی پر موقوف ہے۔

ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق ایک ضروری وضاحت

میں یہاں یہ عرض کر دوں کہ یہاں یہ لفظ آیا ہے: **قُلۡنَا** (18:86)۔ ہم نے کہا کہ ''ذوالقرنین یہ کرو یا وہ کرو۔'' اس سے بعض لوگوں کی نگاہ اس طرف گئی ہے کہ غالباً ذوالقرنین بھی خدا کا ایک نبی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نبی ہوں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے جو یہ کہا ہے کہ ہم ہر قوم میں' ہر ملک میں' ہر زمانے میں' رسول اللہ ﷺ سے پہلے نبیوں کو بھیجتے رہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ بعض کا ذکر ہم نے قرآن میں کر دیا اور جو دوسرے ہیں' ان کا ہم نے تصریحاً ذکر نہیں کیا تو اس اعتبار سے اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ نبی تھے تو اس میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں

جو قرآن کے خلاف جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن صرف اس ایک لفظ ''قلنا'' سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن نے بالتخصیص' اس قلنا سے' بالوضاحت انہیں نبی ہی کہا ہے۔ ''قلنا'' کے معنی ہوتا ہے کہ ہمارے قانون کی رُو سے دونوں چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اِس سے اِنسان کے اختیار وارادہ کی استعداد کی طرف ہی اشاہ ہو۔ حضرتِ زرتشت کے متعلق تو اب یہ چیز ہے کہ وہ تو خدا کے نبی تھے چونکہ ہر قوم میں ہر ملک میں' ہر زمانے میں' رسول اللہ ﷺ سے پہلے اللہ تعالیٰ نبیوں کو بھیجتا رہا ہے مگر ان تمام کے نام قرآنِ کریم میں نہیں ہیں۔ اسی اعتبار سے ان کا نام بھی قرآن میں نبیوں کے زمرے میں نہیں آیا۔ لیکن یہ تو ہے کہ بہرحال ان کے ہاں کچھ قوانینِ خداوندی تو رائج تھے۔ ان قوانین کی رُو سے کہا گیا کہ تیرے لیے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ دونوں میں جونسی راہ تو چاہے اختیار کرسکتا ہے۔

لفظ قلنا کا استعمال

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا کہ ''قلنا'' سے یہ بات نہیں لے لینی چاہیے کہ ذوالقرنین بالتخصیص نبی تھے۔ قرآن میں یہ لفظ قلنا متعدد مقامات پر بھی ایسے ہی آیا ہے کہ جہاں یہ نہیں ہے کہ خدا نے براہِ راست ان پر وحی کی ہو اور اس اعتبار سے وہ نبی قرار پا گئے ہوں بلکہ نبیوں کی طرف جو وحی کی ہوئی تھی یا جو قوانین رائج تھے' ان کی رُو سے بھی اگر کوئی بات کہی جائے تو قرآن اُن سے بھی یہی لفظ قلنا کہتا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ جب بھی کسی سے یوں براہِ راست کہا جائے تو قرآن یہ لفظ استعمال کرتا ہے اور جب کسی نبی کی طرف وحی کی جائے' وہ وحی اس قوم کی طرف پہنچے' وہ اس کے مطابق عمل کرے تو اس کے لیے بھی قرآن کا یہ لفظ آجاتا ہے کہ ''ہم نے ان سے کہا''۔ اسی طرح ''ہم نے اس ذوالقرنین سے کہا'' کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے قانون کی رُو سے اس کے لیے دونوں ہی راستے کھلے تھے' اس کے لیے جائز تھا کہ خواہ وہ ان سے' مغلوب دشمن کی سی حیثیت سے' عدل کرے یا بطورِ احسان ان کو چھوڑ دے۔ تو ہم نے کہا کہ تیرے لیے کھلا ہے: جس قسم کا بھی تُو سلوک اس سے کرنا چاہے۔ اِس سے انسان کے اِسی اختیار وارادہ (Waill and Choice) کی استعداد کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت کے بعد ہے کہ قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكۡرًا (18:87)۔ ذوالقرنین نے اُس قوم سے کہا کہ جو کچھ اس سے پہلے ہو چکا ہے' میں اس سے تو درگزر کرتا ہوں۔ تو یہاں اِس درگزر کرنے سے بھی یہ نظر آتا ہے کہ یہ شخص کتنے بڑے Character کا' حسنِ سیرت کا مالک تھا اور قرآن نے یونہی اپنی دفتین میں اِسے جگہ نہیں دے دی۔ یہ شخص بلند خصوصیات کا حامل تھا۔ ہاں تو اس نے اس قوم سے کہا کہ جو کچھ تم پہلے کر چکے ہو' اس سے میں درگزر کرتا ہوں البتہ اس کے بعد سن لو: اگر تم نے ایسی سرکشی اور ظلم اور استبداد کی روش اختیار کی تو پھر تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ یہاں بھی تمہیں سزا ملے گی اور چونکہ تمہاری یہ سرکشی قوانینِ خداوندی کے خلاف ہوگی اس لیے جب خدا کے ہاں جاؤ گے تو تمہیں اس سے بھی زیادہ کڑی سزا ملے گی۔ وَاَمَّا مَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالۡحُسۡنٰى‌ وَسَنَقُوۡلُ لَهٗ مِنۡ اَمۡرِنَا يُسۡرًا (18:88)۔ اس کے برعکس تم میں سے جو خدا کی صداقتوں پر ایمان لے آئے گا اور پھر عملِ صالحہ کرے گا تو اُسے اس کا بدلہ بھی نہایت حسن کارانہ انداز سے ملے گا اور اس کے متعلق ہم

اپنی طرف سے بھی آسائشیں بہم پہنچائیں گے۔ تو گویا اس کی طرف سے یہ دونوں ہی چیزیں اس قوم سے کہہ دی گئیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص کفر اور ایمان کے راستے بیان کر رہا ہے' وہ خدا کی وحی کا تو پیراؤ تھا' خواہ وہ وحی اسے براہِ راست ملی تھی یا جو اس کے نبی کو وحی ملی تھی' وہ اس کا اتباع کر رہا تھا۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ زرتشت کا پیراؤ تھا اور ان دونوں میں وقت کا زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ بس ایسے ہی ہے جیسے کسی کا جانشین ہوتا ہے۔ زمانی اعتبار سے اتنا ہی فاصلہ ہے اور مکانی اعتبار سے تو فاصلہ ہی نہیں تھا کہ ذوالقرنین وہیں کا رہنے والا تھا۔ بہر حال جو بات اس نے کہی ہے' وہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو خدا کی وحی کا اتباع کر رہا ہو۔ بہر حال اُس کی پہلی مہم یہ ہے۔

ذوالقرنین کا مشرق کی جانب سفر (دوسری مہم)

اِس پہلی مہم کے بعد' اس کی مشرقی مہم کا ذکر آتا ہے۔ یہ اس کی دوسری مہم ہے۔ مہم کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ بکڑ یا یعنی بلخ کی طرف گیا جو ایران سے مشرق کی جانب واقع ہے۔ وہاں بھی وحشی قبائل بستے تھے۔ انہوں نے وہاں خلفشار اور انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ یہ امن قائم کرنے کے لیے اس طرف گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مہم اُن وحشی قبائل کی اصلاح کے لیے اختیار کی گئی۔ ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا (18:89)۔ تو اس کے لیے وہ دوسری طرف سے نکلا۔ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَطۡلِعَ الشَّمۡسِ (18:90)۔ یہ مہم مشرق (بلخ) کی طرف تھی۔ چلتے چلتے وہ مشرق کی طرف گیا۔ وہاں پہلی مہم میں گیا تو مغرب الشّمس تھا' سورج غروب ہوتا نظر آیا تھا۔ اب اِدھر گیا ہے کہ جہاں سورج چڑھتا ہوا نظر آیا تو گویا اب یہ ایران سے جانب شرق گیا' مشرق کی جانب گیا اسی لیے میں نے کہا ہے کہ غالبًا یہ بلخ کی مہم تھی جو تاریخ بتاتی ہے کیونکہ وہ علاقہ جہاں وہ گیا تھا ایران سے مشرق کی طرف واقع تھا۔ وَجَدَهَا تَطۡلُعُ عَلٰی قَوۡمٍ لَّمۡ نَجۡعَلۡ لَّهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهَا سِتۡرًا (18:90)۔ وہاں وہ ایسے وحشی قبائل' خانہ بدوش قبائل' تک پہنچا کہ جن کے پاس ایسے مکانات بھی نہیں تھے جو انہیں اس دھوپ سے ہی محفوظ کر رکھتے۔ یہ جھونپڑیوں میں بسنے والے' جو ہمارے ہاں کے بسنے والے خانہ بدوش ہوتے ہیں' وہ اس قسم کے کوئی Tribes تھے اور قرآن نے یہ کہہ کے ان کا تعارف کرایا ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسا سامان بھی نہیں تھا کہ جس سے وہ دھوپ سے بھی محفوظ رہ سکتے۔ یہ قبائل کھلے میدانوں میں رہتے تھے اور انہوں نے شہری زندگی' سورج کی گرمی سے چھپ کر مکانات میں رہنے کی زندگی اختیار نہیں کی تھی۔ اِن کی حالت ایسی ہی خراب تھی۔ كَذٰلِكَ وَقَدۡ اَحَطۡنَا بِمَا لَدَيۡهِ خُبۡرًا (18:91)۔ اس نے اس قوم کی سرکشی کو بھی دبایا' ان میں اصلاح بھی کی اور اس طرح وہ اُن کی شورش کو بآسانی ختم کر کے واپس آ گیا۔

ذوالقرنین کی ایک اور اہم مہم

عزیزانِ من! اب اس کے بعد اس کی تیسری مہم کا ذکر آتا ہے۔ یہ یوں نظر آتا ہے کہ یہ مہم کا کیشیا (Caucasia) کے پہاڑوں [1]

---

[1]

کی طرف تھی اور دراصل یہ ہے وہ مہم جس کی اہمیت کی بناء پہ اس کے تذکرے کو خود اتنی اہمیت دی ہے۔ کہا: ثم اتبع سبباً (18:92)۔ پھر اس نے ایک اور مہم اختیار کی جو کاکیشیا کی طرف تھی۔ حَتّٰی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِہِمَا قَوۡمًا لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ قَوۡلًا (18:93)۔ یہ مہم ایک ایسی وادی میں تھی جس کے دونوں طرف پہاڑوں کی اونچی اونچی دیواریں کھنچ رہی تھیں۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک ایسی قوم آباد ہے جو اس کی کوئی بات نہیں سمجھتی تو عزیزانِ من! وہاں اس نے جا کے دیکھا کہ دو پہاڑوں کے درمیان درہ (Pass) ہے۔ وہ اس درہ میں سے گزرا۔ جب دوسری طرف پہنچا تو وہاں ایک ایسی قوم پر اس کی نظر پڑی جو اس کی زبان بھی نہیں سمجھتی تھی تو گویا وہ ایران کی مملکت کے علاقہ کے باہر کی کوئی قوم تھی' جن کا کوئی واسطہ ان سے نہیں پڑتا تھا اس لیے وہ قوم اس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ یوں سمجھیے کہ یہ علاقہ آمینیا اور آذربائیجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا خطہ تھا جہاں کی آبادی اہل ایران کی زبان سے بالکل ناواقف تھی۔ بہرحال' ترجمانوں کے ذریعے آپس میں باتیں ہوئی ہونگی کیونکہ آگے قرآن نے یہ کہا: قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَمَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ (18:94)۔ انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین! ہماری مصیبت یہ ہے' کہ یاجوج وماجوج (Gog and Magog) کے قبائل' اس درہ میں سے گزر کر ہم پر حملہ کرتے ہیں' یورش کرتے ہیں اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ بڑے زبردست قبائل' سخت جنگجو قوم ہیں۔ عزیزانِ من! اب یہاں یاجوج ماجوج کا لفظ آیا ہے۔

یاجوج وماجوج کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی تفسیری داستانیں

عام طور پر یاجوج وماجوج کی قوموں کا یہ لفظ بھی ہمارے ہاں عام ہے اور جب ان کے افسانے ہماری تفسیروں میں ملتے ہیں تو وہ تو پوچھیے ہی نہیں کہ زیبِ داستان کے لیے اس میں بہت کچھ بڑھا دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اور آگے جا کے ان کا ذکر آئے گا کہ ایک دیوار بنادی گئی تھی' وہ اس دیوار کے اُس پار رہ گئے۔ وہ سارا دن دیوار کو چاٹتے رہتے ہیں' وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کے مالک ہیں۔ بڑے بڑے کوئی وحشی قبائل جو ہیں۔ وہ رات کو سوتے تھے تو اپنے ہاتھیوں کے ایک کان کو نیچے بچھا لیتے تھے دوسرا کان اوپر اوڑھ لیتے تھے یعنی یہ اپنے ساتھ ہی اپنے بستر لیے پھرتے تھے تو وہ سارا دن اپنی زبان سے اُس دیوار کو چاٹتے رہتے ہیں۔ جب وہ دیوار بس تھوڑی سی باقی رہ جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ''اچھا! اب تھک گئے' کل صبح اٹھیں گے تو باقی دیوار کو چاٹ کے ہموار کر دیں گے۔'' صبح اٹھتے ہیں تو دیوار اتنی کی اتنی بڑی ہوتی ہے۔ وہ پھر اسے چاٹنے لگ جاتے ہیں لیکن جب ان کے اپنے الفاظ میں ''قربِ قیامت کا زمانہ آئے گا تو پھر اس شام یہ کہیں گے کہ ہم کب تک یہ مصیبت جھیلتے رہیں گے کہ جو یہ دیوار باقی رہتی ہے اگلی صبح پھر اتنی بڑی ہو جاتی ہے'' تو پھر وہ کہتے ہیں کہ ''آج انہوں نے ارادہ کر لیا ہے کہ آج تو اس کو مٹا کے ہی چھوڑیں گے' سوئیں گے نہیں۔'' بس پھر جب وہ اُس رات کو اس دیوار کو چاٹ کر مٹا دیں گے تو وہ درہ (Pass) کھل جائے گا اور پھر وہ دبا دب کرتے ہوئے آجائیں گے اور پھر وہ قیامت آجائے گی۔ یہ ہے ہمارے ہاں کا یاجوج وماجوج۔ عزیزانِ من! یہ سارا کچھ آپ کے ہاں تفسیروں میں لکھا ہوا ہے۔

یاجوج اور ماجوج کون تھے؟ اور کیا کرتے تھے؟

اگر عربی زبان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یاجوج اور ماجوج کا مادہ ''أ ج ج'' ہے۔ وہاں سے یہ دو لفظ بنے ہوئے ہیں۔ اس مادہ کے معنی ہوتے ہیں: آگ کی طرح شعلہ مزاج، شعلہ صفت، بھڑک اٹھنے والے، جنگجو، سرکش۔ ان کی یہ خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ اس اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ یہ یہاں صحیح لفظ بنے ہوں لیکن تحقیق یہ کہتی ہے کہ نہیں، دراصل یہ جو وسط ایشیاء میں منگولیا کے علاقے میں بسنے والی قومیں جن کو تاتاری بھی کہا جاتا ہے، منگول بھی کہا جاتا ہے، ہلاکو اور چنگیز خان جن قبائل سے متعلق تھے، جو وہاں کے قبائل تھے، یہ وہ واقع ہے، جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا، یہ علاقے زرخیز نہیں ہیں، یا تو صحرا منگولیا کی طرح ہیں یا پھر خشک پہاڑ ہیں۔ تو جو ایسے علاقے ہیں، ان کے رہنے والے لوگوں کی زندگی کا انحصار ہی لوٹ مار پر ہوتا ہے۔ یہ خشک علاقے کے رہنے والے ہوتے ہیں اس واسطے بڑے تنومند اور توانا ہوتے ہیں، سخت مزاج ہوتے ہیں، مشقت بھی کر سکتے ہیں اور ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ آئے، اِدھر اُدھر علاقوں کے اندر مار دھاڑ کی، لوٹا، لوٹ کے لے گئے۔ جتنے دنوں تک کام چلا، بس اس سے گذارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد پھر اٹھے اور اٹھنے کے بعد پھر کسی دوسری طرف نکل گئے، لوٹ مار کی۔ ہمارے ہاں جو فرنٹیئر (Frontier) کے لوگ ہیں، اب تو یہ ذرا سا Settled Area ہوگیا ہے، ورنہ اس سے پیشتر ان کا بھی ذریعہ معاش یہی تھا کہ وہ ان پہاڑیوں سے اتر کے اِدھر اُدھر مار دھاڑ کرتے تھے، اب بھی وہی اغوا (Kidnap) کر کے پشاور تک لے جاتے ہیں اور وہاں جا کے پھر وہ تاوان مانگتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے کہ اگر وہاں گذارے کی کوئی اور صورت نہ ہو تو پھر مرتا کیا نہ کرتا۔ اگر وہ کمزور لوگ ہیں تو پھر تو وہ غلام بن جاتے ہیں اور اگر وہ تنومند، توانا ہیں، جنگجو ہیں تو پھر وہ مار دھاڑ کرتے ہیں۔ اُس دور میں تو یہ چیز عام تھی۔

ہلاکو اور چنگیز کے ہاتھوں سے بغداد کی تباہی اور عباسی سلطنت کا خاتمہ

یہ جو وسط ایشیاء کے منگول، مغل یا جن کو ہم تاتاری کہتے ہیں، ان لوگوں کا ذریعۂ معاش ہی یہ تھا۔ یہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح، شعلوں کی طرح لپکتے تھے، ہر سامنے آنے والی زندگی کو خس و خاشاک کی طرح بھسم کر جاتے تھے، لوٹ مار، قتل، سفاکی، فساد کرتے پھر واپس چلے جاتے تھے۔ یہاں یہ لوگ سیٹل (Settle) نہیں ہوتے تھے۔ یہی جو میں نے کہا ہے کہ لوٹ مار کا سامان کھاتے پیتے تھے۔ آخر میں ہمارے ہاں بھی، جنہوں نے بغداد کو تباہ کیا، عباسی سلطنت کا خاتمہ کیا، تو یہ ہلاکو اور چنگیز وہی قبائل ہیں جو یاجوج اور ماجوج ہیں۔ اب بھی جو تحقیق ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ جو ماجوج ہے، اس کا ابتدائی نام موگ پایا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی پہلے وہ ''مونگ'' کہلاتے تھے، یونانیوں نے ان کو اپنے ہاں میگاف لکھا ہے۔ تو چونکہ عبرانی زبان میں ''گ'' نہیں ہوتا ''گ'' کو ''ج'' سے بدل لیتے ہیں اس لیے عبرانی میں، یعنی وہ طہراق کی زبان آئی، تو اس زبان میں ان کو ''ماجوج'' کہنے لگ گئے۔ یہ وہی قبیلہ ہے۔ انہی کا ایک قبیلہ تھا، جن کا یونانی

میں پرانا نام یواشی یا یواچی تھا۔ اِس نے عبرانی میں آ کے ''یاجوج'' کی شکل اختیار کر لی تو جو میگاف تھے وہ تو ''ماجوج'' ہو گئے اور یہ جوان کے ہاں کا ایک الگ قبیلہ تھا اس نے ''یاجوج'' کی شکل اختیار کر لی۔ یہ کچھ آپ کو انگریزی کی ڈکشنریوں میں ملے گا[1] حتیٰ کہ وہ لندن کا جو Museum ہے اس میں ان کے مجسمے کھڑے کیے گئے ہیں۔ ان کو بھی جوگ اور میگاف کہا جاتا ہے۔ تحقیق کا رُخ اسی طرف ہے کہ یہ یاجوج اور ماجوج درحقیقت یہی جوگ اور میگاف تھے اور ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ آتے تھے لوٹ مار کر کے لے جاتے تھے۔ اس زمانے میں یہ قریب ترین علاقوں تک ہی رہتے تھے اور پھر جب ان کے قبائل کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تو ان کی یورشیں پھر آگے بھی آتی تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ان علاقوں کے قبائل کہاں تک مار دھاڑ کرتے تھے اور کس طرح اس زمانے کی Settled قوموں جنہیں مہذب قومیں کہا جاتا ہے کے علاقوں میں آ کے یہ قیامت برپا کیا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آخری دور میں یہ وہاں سے چل کے بغداد تک آ پہنچے بغداد انہوں نے تباہ کیا عباسیوں کی سلطنت کا خاتمہ کیا اور پھر چنگیز خان کی تو فلمیں تک بنی ہوئی ہیں۔ جیسے فرعون ضرب المثل ہو گیا ہے ویسے ہی چنگیز بھی ایک ضرب المثل ہو گیا ہوا ہے۔

اسلام کی بنیادوں پر ہر قسم کا نسلی تعلق ختم ہو جاتا ہے

اگرچہ یہ عجیب چیز ہے کہ نسلی تعلق کی بناء پر ہمارے ہاں اب بھی چنگیز نام رکھا جاتا ہے۔ یہ تو وہی نسلی تعلق ہے۔ یہ اسی بناء پر ہے جس پر ایران والوں نے کیخسرو کا یہ سالگرہ کا جشن منایا تھا۔ وہ نسلی اعتبار سے اپنے آپ کو اس سے متعلق سمجھتے تھے ورنہ اسلام آنے کے بعد تعلق کا یہ سلسلہ نہیں رہا۔ یہ ضمناً بات آ گئی۔ اسلام جب کفر کو طاغوت کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے جو پہلے رشتے ہوتے ہیں وہ

---

[1] وسط ایشیا میں ایک نسل تھی۔ اس کا انداز زندگی لوٹ مار تھا۔ سطح مرتفع پامیر کے گرد و پیش کا علاقہ جسے اب منگولیا کہا جاتا ہے اس نسل کا اولین مسکن تھا۔ ان کی یورش اور یلغار سے بچنے کے لیے مختلف تدابیر کی جاتی رہیں۔ اس کے لیے اہل چین کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانا پڑی۔ اسی طوفان کا رخ بدلنے کے لیے سائرس یا خرس یا کیخسرو یا ذوالقرنین نے دیوار تعمیر کی۔ انہی قبائلیوں کی ایک شاخ تاتاریوں کے نام سے مشہور تھی۔ دوسری شاک کا نام ستھین (Seythian) تھا۔ ایک اور شاخ یورپ میں میگر کے نام سے مشہور ہوئی۔ تاریخی انکشافات بتاتے ہیں کہ انہی منگولین قبائل کا ابتدائی نام موگ تھا۔ اسی سے منگولین بنا۔ یونانیوں نے اسی موگ کو میگاگ (Magog) کہا اور عبرانی میں یہی ماجوج بن گیا۔ انہی کا ایک قبیلہ یواچی کہلاتا تھا جس نے آخر الامر یاجوج کی صورت اختیار کر لی۔ یہ ہیں یاجوج و ماجوج (Gog and Magog)۔ یہی قبائل کاکیشیا کی راہ سے حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ روش (روس) مسک (ماسکو) اور توبال (بحرہ اسود کا شمالی علاقہ) سے متعلق تھے۔ یونانی مؤرخ ہیرڈوٹس کی شہادت ہے کہ یہی قبائل کاکیشیا (قفقاز) درہ (Pass) سے حملہ آور ہوتے تھے۔ سائرس نے اسی درہ کو بند کرا دیا۔ زمانہ حال کے انکشافات سے ظاہر ہے کہ سائرس نے دراصل دو دیواریں بنوائی تھیں۔ ایک بحر خزر سے مغرب کی طرف قریب 30 میل لمبی جہاں وہ کوہ کاکیشیا کے مشرقی کنارے تک پہنچ گئی ہے جہاں قدیم زمانہ سے ایک چاروں طرف دیوار سے گرا ہوا شہر آباد ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو وہ درہ (Pass) آتا ہے جو (Danial Pass) کے نام سے مشہور ہے اس درہ میں ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ یہی وہ دیوار ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔

سارے کٹ جاتے ہیں اور اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا رشتہ قائم ہوتا ہے' ایمان کی بنیادوں پر یہ ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام کے نقطۂ نگاہ سے آپ کے ہیروز (Heroes) بھی وہی رہ جائیں گے کہ جو اسلام کی اقدار کے پابند ہوں خواہ وہ اس سے پہلے کے ہوں یا اس کے بعد کے ہوں۔ نسلی اعتبار سے' وطنی اعتبار سے' کسی دوسری نسبت کے اعتبار سے' آتش قوم ❶ کی بنا پر' اپنے اسلاف سے کتنے ہی پہلے تعلقات کیوں نہ ہوں' اسلام لانے کے بعد' وہ وجوہ جو تعلقات کی ہیں' ساری ختم ہو جاتی ہیں اور پھر جو رشتہ ہے وہ ایمان ہی کا رہ جاتا ہے۔ وہ کشتی کے اندر حضرتِ نوح علیہ السلام آئیں یا اس کے بعد سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کیوں نہ آئیں یہ ایک ہی رشتہ میں پروئے جاتے ہیں۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے نزدیک ان کے والد کے نام کی نسبت

حضرتِ سلمان رضی اللہ عنہ جنہیں صحابہ کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے' کے نام کے ساتھ فارسی یا پارسی تو ہم لگا دیتے ہیں لیکن جب سلمان سے باپ کا نام بھی پوچھا گیا تھا' انہوں نے کہا: اسلام۔ یہ ہے ایمان۔ ان کا پہلا تعارف تو فارسی کا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری بڑی غلط نگہی ہے کہ اب ہمارے ہاں وہ نام ہی سلمان فارسی ہو گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے' میں کسی اور وقت بتاؤں گا کہ خاص طور پہ ان کے فارسی ہونے پر کیوں زور دیا جاتا ہے لیکن خود ان کے متعلق یہ بات ہمارے ہاں روایات میں موجود ہے اور ایمان کا تقاضا بھی یہی ہونا چاہیے تھا اور وہ اس لیے کہ اس زمانے میں فارس کے ساتھ نسبت بہت بڑی نسبت گنی جاتی تھی۔ یہ رومن ایمپائر اور Persian Empire' ایران کی مملکت دو ہی تو دنیا کے اندر بڑی بڑی تہذیبیں تھیں۔ اس لیے اس تہذیب سے جو فارس کی تہذیب تھی اگر اس کے ساتھ کسی کا رشتہ ملتا تھا تو وہ اپنے اہل فارس ہونے کا بڑے فخر ومباہات سے ذکر کرتا تھا۔ لیکن اسلام لانے کے بعد ایک بنیادی تغیر واقع ہوتا ہے' یہ روایت اس کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب ان سے باپ کا نام پوچھا گیا۔ نام تو انہوں نے اپنا وہ نام' جو اہلِ فارس کا سا نام ہوگا' وہ نام نہیں لیا' بلکہ انہوں نے کہا: باپ کا نام اسلام۔ اب اس کے بعد یہ جدی اور اسلافی اور نسلی نسبت منقطع ہو گئی۔ اب دین کی ہی نسبت باقی رہ گئی۔ کہا: میرا نام تو تم پوچھتے ہو' میں باپ کا کیا نام بتاؤں کہ جو مجوسی المذہب تھا' فارسی النسل تھا تو میں نے ان دونوں رشتوں کو قطع کر دیا ہے۔

تین ہزار سال پہلے کے آثار قدیمہ کو پاکستان کا کلچر بتایا جاتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو تغیر ہے' یہ بنیادی ہے اور اسی پر اسلام میں رشتہ استوار ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس اعتبار سے' یہ جو آپ کے ہاں بات میں سے بات نکلتی ہے' یہ رشتہ قائم ہونا چاہیے اور کرتے چلے جانا چاہیے کہ پتہ نہیں پھر یہ کچھ کہنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ آج جو کلچر کی ایک تحریک بڑے زوروں پہ چلی ہوئی ہے جسے ثقافت کہا جاتا ہے' کلچر کہا جاتا ہے' اس تحریک کی رو سے جو بھی آپ کے ہاں باہر سے آتے ہیں انہیں اسلام سے ہزاروں سال پہلے کا ''پاکستانی کلچر'' دکھانے کے لیے موہنجوداڑو لیجاتے ہیں اور وہاں جا کے

---

❶ آگ کی پرستش کرنے والی قوم۔

بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ صدیاں ہوگئیں یعنی آج سے تین ہزار سال پہلے کے جو وہاں آثار موجود ہیں' وہ آج اُس پاکستان کا کلچر بنے ہوئے ہیں جسے خود معرضِ وجد میں آئے ہوئے صرف پچیس [1] ہی سال ہوئے ہیں۔ ہم دنیا کو وہاں جا کر ہڑپہ میں دکھاتے ہیں' ہڑپہ لے جاتے ہیں' تین ہزار سال قبل مسیح یا اسلام سے تین ہزار سال پہلے کے جو آثارِ قدیمہ آپ کو نظر آتے ہیں' انہیں آپ پاکستانی کلچر بتاتے ہیں۔ ان باہر سے آنے والوں کو آپ ٹیکسلا لے جاتے ہیں' بدھوں کے' مہاتما بدھ کے مجسمے جو سارے وہاں رکھے ہوئے ہیں' وہاں جا کے انہیں بتاتے ہیں کہ یہ پاکستانی کلچر ہے یعنی وہی کہ بھارت کی اور پاکستان کی یہ تقسیم ایک اتفاق ہے کہ وہاں جو لکیر کھینچی گئی' اس لکیر سے اِدھر کے جو علاقے تھے' وہ پاکستان کہلا گئے اور اُدھر کا علاقہ بھارت رہ گیا۔ تو لکیر سے' اِدھر جو کچھ پہلے بھارت کا تھا' وہ اب سارے کا سارا پاکستانی ہوگیا۔ اب یہ آپ کے ہاں کا پاکستانی کلچر ہے۔ آپ نے غور کیا یہ کیا چیز ہے جو کہی جا رہی ہے حالانکہ اسلام آنے کے بعد' پہلے کی ساری نسبتیں' آثارِ قدیمہ ہو جاتی ہیں۔ ان نسبتوں کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے۔

ہم نے عبرت کی اِن طاغوتی قوموں کے کھنڈرات کو پاکسانی کلچر بنا دیا

عزیزانِ من! یہ جتنے بھی آپ کے ہاں کے ہڑپہ اور موہنجوداڑو اور ٹیکسلا وغیرہ کے کھنڈرات ہیں' یہ تو بس یوں سمجھیے جیسے یہ طاغوتی قوموں کے کھنڈرات ہیں۔ یہ تو ہمارے لیے باعثِ عبرت ہیں۔ عاد اور ثمود کی قوموں کی اجڑی ہوئی بستیوں کے وہ کھنڈرات ہیں کہ جن کا ذکر قرآن نے بار بار کیا ہے۔ انہیں مسلمانوں کے کلچر کی حیثیت سے متعارف کرایا جا رہا ہے' کہا: یہ قومیں ہیں' جنہوں نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اور آج ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات تمہیں بتا رہے ہیں کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا تھا۔ جو قومیں خدا کے قوانین سے سرکشی برتتی ہیں' قرآن انہیں طاغوتی قوموں کے کھنڈرات بتاتا ہے' یہ خدا سے سرکشی برتنے والی قوموں کے اجڑے ہوئے نشانات بتاتا ہے۔ یہی وہ قومیں تھیں جنہوں نے قوانین خدوندی سے سرکشی کی۔ یہ موہنجوداڑو میں آپ کے ہڑپہ میں اور آپ کے ٹیکسلا میں تھیں۔ آج ان کے اجڑے ہوئے کھنڈرات کو پاکستان کا کلچر بتایا جا رہا ہے۔ قرآن عاد اور ثمود کے اسی قسم کے کھنڈرات کو کہتا ہے: خدا سے باغی کاموں کا انجام یہاں دیکھو۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں' ہمیں جا کے تو ان کا یہ انجام دکھانا چاہیے تھا کہ یہ وہ قومیں ہیں کہ جنہوں نے اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتی اور اس طرح سے تباہ اور برباد ہوگئیں۔ اپنے دور میں یہ لوگ اتنے مہذب تھے کہ وہاں یہ نظر آتا ہے لیکن چونکہ' انہوں نے اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتی تھی' ان کا انجام ہمیں ان کھنڈرات میں ملتا ہے۔

اس ثقافت کے تحفظ پر کروڑوں کا خرچ

یہ ہے ان کا وہ حقیقی تعارف جو ہمیں اِن باہر سے آنے والوں کو کرانا چاہیے تھا۔ ہمارے ہاں اس قسم کے جو محکمے قائم ہوئے ہیں' جن

---

[1] یہ 1975ء کا ذکر ہے۔

پر ہم اس ثقافت کے تحفظ کے لیے لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کررہے ہیں' پاکستانی ثقافت اور کلچران کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ آپ غور فرمایئے کہ یہ جو آپ کے ہاں ایمان کا بنیادی نقطہ ہے اور اس کی جو معنویت ہے' جب وہ نگاہوں سے غائب ہوتی ہے' اور وہ صرف ایک Formalism رہ جاتی ہے' ایک رسم رہ جاتی ہے' جسے آپ ایمان کہتے ہیں' اس کے بعد یہ ساری چیزیں ہیں جنہیں مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا' وہ ساری آپ کے ہاں دوبارہ زندہ کی جاتی ہیں اور پھر وہ آپ کی بتائی جاتی ہیں۔ اور یہ صرف یہاں کی بات نہیں ہے۔ مسلمان کہلانے والی ہر قوم کے مسلک میں یہی کچھ ہے۔

اہلِ مصر کی سوچ

پہلے جو مصر کا کلچر بتایا جاتا ہے وہ دیکھیے: فرعونوں کے مقبرے اور ان کی ممی شدہ لاشیں۔ جب آپ نے ان مقبروں اور ممیائی ہوئی لاشوں کو اپنا کلچر کہا تو جس طرح اہلِ ایران نے کیخسرو کے ساتھ اپنا رشتہ ملایا اس پہ حیرت چہ معنی دارد! عزیزانِ من! وہاں بھی آپ کو معلوم ہے کہ وہ اہلِ ایران اپنا رشتہ فرعونوں کے ساتھ ملا رہے ہیں۔ حالانکہ یہاں مصر میں تو خیر نام لے کر قرآن نے نہیں کہا' ان فرعونوں کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے' فرعون کی داستانیں تو موجود ہیں' اہلِ مصر ہی کے ساتھ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ بھی ہمارے سامنے ہے جب بنی اسرائیل وہاں بستے تھے۔ بہرحال اس کا نام تو قرآنِ کریم نے خدا کے کھلے ہوئے باغی اور دشمن کی حیثیت سے لیا' اس کی تباہی پر جشن منانے کے لیے قرآن نے کہا ہے اور ہم ہیں کہ انہیں وہاں اپنے اسلاف گنتے اور ان کی جتنی یادگاریں ہیں انہیں مصری کلچر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے جب کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے۔

عالم اسلام کا کلچر صرف اور صرف قرآنی معاشرہ ہے اور بس!

عزیزانِ من! یہ لوگ نہ ہمارے اسلاف ہو سکتے ہیں نہ ان کی یہ علامتیں ہمارا کلچر ہو سکتی ہیں۔ ایمان لے آنے کے بعد تو نسبت ہی نئی ہو جاتی ہیں۔ ان میں تجدید ہوتی ہے اور پھر ایک ہی نسبت ہوتی ہے جس کی بناء پر نئی نسبتیں قائم ہوتی ہیں۔ وہ رشتہ صرف ایمان کا رشتہ ہوتا ہے۔ آج جو مسلمان دنیا کے کسی بھی خطے میں بستا ہے اگر آپ نے اس کی ثقافت کا رشتہ دیکھنا ہو تو وہ روبکارِ ہدایت کے اندر آپ کو ملے گا' قندیل آسمانی میں ملے گا۔ یہ رشتہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں نہیں مل سکتا۔ یہ تو کفار کی یادداشت اور باقیات ہیں۔ ٹھیک ہے' تاریخی اعتبار سے وہ چیز بھی ایسی چلی آ رہی ہے' اس کو اس اعتبار سے آپ دیکھیں گے۔ قرآن میں بھی تو عاد و ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات کا ذکر تاریخی اعتبار سے کیا ہے لیکن نتیجہ کیا ہے جس پہ وہ پہنچا رہا ہے۔ اس نتیجہ پہ وہ پہنچا رہا ہے کہ یہ وہ بستیاں تھیں جنہوں نے اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتی اور دیکھو کہ کس طرح سے وہ تباہ ہوئیں۔ اگر تم نے بھی ایسا کیا تو پھر تمہاری بستیوں کا بھی یہی حال ہو جائے گا۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ

ان کا صرف یہ مقصد ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر ان کو باقی رکھنا ہے تو رکھیے: عبرت کی داستان بنانے کے لیے رکھیے' اپنے کلچر کے

بت بنانے کے لیے نہیں' عزیزانِ من! یہ رشتہ جواب دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے' غلط ہے۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ قومیں اپنے اپنے زمانے میں کتنے ہی عروج کے اوپر کیوں نہ ہوں' تہذیب کے نظارہ پہ کیوں نہ ہوں۔ اسلام آنے کے بعد ہمارا ان کے ساتھ کچھ رشتہ نہیں رہتا۔ میں نے گزارش کی ہے کہ ہمارا رشتہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے تو جا کے مل جائے گا حالانکہ نسل' زبان' زمانہ' مکان' قومیت' ہر اعتبار سے وہ ہم سے مختلف ہوئے لیکن ملحود ❶ کے ساتھ ہمارا رشتہ نہیں مل سکتا' ان میں ہر وہ چیز موجود ہوگی جو اس دور کے بابل یا ان قوموں کے جہان میں موجود تھی۔ حضرتِ نوح علیہ السلام اس علاقے میں ہی ہوئے تھے۔ میں نے اس لیے ان کا نام لیا ہے کیونکہ یہ نینواں اور بابل کے گردو پیش کا جو علاقہ ہے' اسی علاقے کے' وہی زبان بولنے والے' شاید اسی نسل کے' نمرود قبیلوں کے' حضرتِ نوح علیہ السلام تھے۔ ان کے ساتھ تو ہمارا رشتۂ اسلام مقرر ہو جائے گا' نمرود کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے فرق۔ رشتہ ایک ہی باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے جسے ہم توحید کہتے ہیں۔

خونی رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ صرف زبانی طور پر خدا کو ایک مان لینے کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک واحد رشتے پر ایمان لانے کی بات ہے۔ یہاں ہم میں تو دو دو ہزار سال کا اتنا بُعد ہے اور ان کے اندر حضرت نوح علیہ السلام کا جو حقیقی بیٹا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے اہل میں سے نہیں۔ یہ اُن کے اہل ہونے کا یہ رشتہ غلط تھا کیونکہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (11:46)۔ عمل کے اعتبار سے وہ تمہارے نقشِ قدم پہ نہیں چلتا' اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ باقی نہیں رہتا عزیزانِ من! حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اٹھتے ہیں اور سب سے پہلے اپنے باپ کو یہ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ کیا تباہی لانے والا مسلک اختیار کر رکھا ہے۔ ان سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے یہی راہ اختیار کی تو یاد رکھو کہ میں تمہیں اس طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا: ظاہر ہے تمہارا اور میرا رشتہ ہی نہیں ہو سکتا۔ رشتے کے متعلق' انہوں نے جاتے ہوئے اپنی پوری قوم کو اعلان کر دیا: فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ (14:36)۔ جو میرے نقشِ قدم پر چلتا ہے' خدا کی وحی کے مطابق وہ میرا ہے۔ اس کے برعکس باپ بھی میرا نہیں ہے' بیٹا بھی میرا نہیں ہے کیونکہ وہ میرے نقشِ قدم پر نہیں چلتے۔ تعمیرِ کعبہ کے بعد جب آپ نے وہ دعا مانگی ہے اور کہا ہے کہ یا اللہ! میں نے اپنی قوم کو' اپنی ذات کے ایک حصے کو' یہاں وادیٔ غیر ذی زرع میں' تیرے اس گھر کی حفاظت کے لیے بسا دیا ہے تُو ان کی حفاظت کرنا' پرورش کا سامان کرنا' میں یہ تیری حفاظت میں دے رہا ہوں۔ پھر کہا کہ اے اللہ! آپ میری اس دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیے۔ کہا: یہ شرف قبولیت صرف ان کے لیے ہوگا جو تیری روش پر قائم رہیں گے' ان میں سے جو سرکشی کی روش اختیار کر گیا اس کے ساتھ ہمارا گزارہ نہیں ہے۔ جانِ من! اُن کے ساتھ یہ تعلق ہی نہیں ہے۔ حضرتِ لوطؑ کی بیوی ان نہ ماننے والوں کے ساتھ شامل ہے اس لیے وہ بھی ان میں سے نہیں ہے۔ جو فرعون کی بیوی ہے وہ اپنے خاوند کے مسلک سے الگ ذہن رکھتی ہے' قرآن نے اس کا ذکر حضرتِ مریم کے ساتھ ملا کر کیا۔ یہ ہیں سوچنے کی باتیں۔

---

❶ کافر' بے دین۔

خدارا سوچیے کہ ہمارے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے: سوچیے اور بار بار سوچیے

عزیزانِ من! اسے اسلام کہتے ہیں' اسے ایمان کا رشتہ کہتے ہیں۔ موہنجوداڑو کے' اور ٹیکسلا کے اسلاف' ہمارے اسلاف نہیں ہیں۔ گو بات دوسری طرف نکل جائے گی لیکن اب جو کچھ یہاں ان پردوں کے اندر ہو رہا ہے' اسے ذرا دیکھیے تو سہی: ہر سازش اس لیے ہے کہ آپ کے رشتے عرب کے ریگزار سے کاٹ دیئے جائیں گے۔ میں عرب کے ریگزار میں Physically اس ریت کو نہیں کہہ رہا ہوں اِس ریگزار سے ہمارا مقصد وہ سرچشمہ ہے جو ہماری تہذیب کا ہے' جو ہماری ثقافت کا ہے' جو ہمارے نظریات کا ہے' ہماری آئیڈیالوجی کا ہے۔ وہ سرزمین نہیں ہے بلکہ وہ منبع ہے جہاں سے قرآن ہم کو مل رہا ہے' جہاں سے ایمان' ہمیں ملا ہے' جہاں سے اسلام ملا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ رشتہ اب صرف قرآن کا رشتہ ہے' اس کے بعد باقی سارے رشتے کٹ جاتے ہیں۔ معیار صرف اور صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جس ایمان کے صدقہ سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں اور جن کی امت ہونے کا ہمیں شرف حاصل ہے' اس کے علاوہ ہر رشتہ کاٹ دیا جاتا ہے۔ آپ کا حقیقی چچا ابولہب تھا مگر ابوجہل' اپنا داماد، ابولھب' اپنا چچا عباس' ان سب سے رشتے کاٹ کے روم کا مزدور جو صہیب ہے اس سے رشتہ قائم ہو رہا ہے' جو حبش کا بلال ہے وہ اپنوں میں سے ہو رہا ہے' جو پارس کا سلمان ہے وہ گلے سے لگایا جا رہا ہے' جو ابوجہل ہے وہ خنجر کے تلے آ رہا ہے۔ ابولہب حقیقی چچا ہے۔ اس ساری قومِ قریش میں سے قرآن کے اندر ابولہب ایک ہی کا تو نام آیا ہے' چچا ہونا' بزرگ ہونا' ہم قوم ہونا' ہم نسب ہونا' ہم زبان ہونا' حقیقی چچا کے ساتھ سارے رشتے موجود تھے۔ ساتھ اور ذکر آ رہا ہے تو یہ کہہ کے: **تَبَّتۡ يَدَآ اَبِىۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ** (111:1)۔ ابولہب تباہ ہوا برباد ہوا۔ یہ ہے ایمان کا رشتہ عزیزانِ من! یہ تو ہر طرف سے کٹ کے آپ کو اس طرف آنا پڑتا ہے۔

ہمیں پوری قوم' پوری ملت کی نفسیات کو بدلنا ہوگا

عزیزانِ من! یہ جو میں نے بات کہی ہے' یوں ہی نہیں کہی کہ صاحب! کیا ہوا جو یہ رشتہ ملا لیا! نفسیاتی طور پہ اس کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ آج جو یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ ہم راجہ داہر کے ساتھ اپنی نسبت رکھنے والے ہیں۔ محمد بن قاسم کے ساتھ ہماری کوئی نسبت نہیں ہے تو یہ دو نام نہیں ہیں۔ اس طرح سے ہماری قومیت' نسل یا وطن کی بنیادوں پر بنے گی۔ اسلام کی بنیاد پہ نہیں بنے گی۔ اس اعتبار سے پنجاب یا سرحد کا بسنے والا مسلمان اور سندھ کا بسنے والا مسلمان' ایک قوم نہیں بن سکتے کیونکہ ہم نسلی اعتبار سے' داہر کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ رشتے اسی طرح نہیں ہیں کہ انہوں نے اگر اپنے ایک اسلاف میں سے ایک جو بڑا شخص ہے' اس کی طرف اپنی نسبت ملا لی تو اس میں کیا ہو گیا۔ یہ یونہی سلسلہ نسبی ملانے والا نہیں ہے۔

بات منگول' مغل' چنگیز اور ہلاکو سے چلی تھی۔ ہمارے رشتے ان سے قائم نہیں ہوتے۔ وہ تو خیر پھر بھی سفاکی کے اندر اور ظلم وانتشار میں بدنام ہیں۔ اگر یہ چیزیں کسی میں نہ بھی ہوں تو بھی سوال نسل اور نسل میں زبان کے اشتراک کا نہیں رہتا۔ سوال صرف ایمان کا رہتا

ہے جسے آپ دوقومی نظریہ کہتے ہیں جو آج صرف نسل کے اعتبار سے دہرایا جاتا ہے عملاً اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ قومیت کا مدار ہی اشتراکِ ایمان پر ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہی اشتراک تو تھا جس نے فارس کے سلمان رضی اللہ عنہ کو ہم قوم ہی نہیں، اپنا بھائی بنا دیا تھا، لیکن خود جو حقیقی چچا ہے اس کا غیروں میں شمار ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں دوقومی نظریہ۔ ابولھب اور محمد ﷺ دو قوموں کے افراد تھے۔ محمد ﷺ کی قوم ان پر مشتمل تھی جو بلال رضی اللہ عنہ اور سلمان رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی جو قوم تھی وہاں وہ ابولھب، ابوجہل اور ابوسفیان تک تھی۔ اِن میں سے ابوسفیان کٹ کے اِدھر آئے ہیں تو وہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہو گئے۔ اسے کہتے ہیں تہذیب۔ یہ نسبت ہے ایمان کی جس بناء پر مختلف نسل، قوم، زبان، ملک کے افراد ایک امت واحدہ بنتے ہیں، ورنہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کسی نے کہہ دیا "ہاں" اور کسی نے کہہ دیا "نہیں"۔ آگے جا کے عملاً فرق پڑتا ہے۔ توحید کا معنی یہ ہے۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ یاجوج اور ماجوج تاتاریوں کے، منگول کے، مغلوں کے، قبیلے تھے جن کا تعارف اب بعد میں آ کر ان چنگیز اور ہلاکو کی شکل میں ہمارے ساتھ ہوا۔ تو اسی زمانے میں اس قوم نے ذوالقرنین سے یہ کہا کہ یہ ہمیں بڑا ستاتے ہیں، یہ آ جاتے ہیں اور مار دھاڑ کر کے، لوٹ مار کر کے، چلے جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد ہم محنت مشقت کر کے کچھ تھوڑا بہت کماتے ہیں یہ پھر آ جاتے ہیں، پھر لوٹ کے چلے جاتے ہیں، ان کا کچھ علاج کر دیجیے۔ **فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا** (18:94)۔ اگر آپ ہمارے اور اِن کے درمیان اس درہ کو بند کرنے کے لیے ایک دیوار بنا دیں تو ہم آپ کو خراج ادا کر دیا کریں گے۔

قرآن حکیم میں ذوالقرنین کے تذکرے کی وجہ

یہ ہے وہ نقطہ، عزیزانِ من! جس کے لیے قرآنِ کریم نے ذوالقرنین کے تذکرہ کو اپنے دامنِ دوام میں جگہ دے دی ہے اور اُسے اتنی بڑی سعادت کا مالک بنا دیا ہے کہ ہر روز کروڑوں کی تعداد میں جب مسلمان قرآن پڑھتا ہے تو ذوالقرنین کا نام عزت واحترام سے لیتا ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے صاحب جو اس کے حصہ میں آ رہی ہے۔ اور یہ ہے اِس کا مقام! اس قوم نے ان سے کہا کہ ہمارے اور اُن کے درمیان، اِس درے (Pass) کو بند کرنے کے لیے ایک دیوار بنا دو۔ تم ہمارا یہ کام کر دو۔ اِس طرح اِس قوم سے روک تھام کا انتظام کر دو، اس درے کو کسی طرح سے پاٹ دو تا کہ وہ ہم پہ یورش نہ کر سکیں اور ہم محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد جیسا قاعدہ ہے، ہم تمہارے باج گزار [1] ہو جائیں گے، ہم تمہیں خراج دے دیا کریں گے۔ بظاہر یہ کوئی ایسی بری بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، خراج لے لینا یا کسی کا باج گزار بن جانا کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات جس بناء پہ نظر آتا ہے کہ یہ وحی کا اتباع کرنے والا ذوالقرنین ہے قرآنِ کریم میں اس کے تذکرے کی وجہِ جواز ہے: **قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ** (18:95)۔ کہا کہ اس خدمت کے معاوضے میں میں تم سے خراج نہیں لینا چاہتا۔ میرے خدا نے مجھے جو دے رکھا ہے، وہ میرے لیے بہت ہے۔ اس لیے مجھے تمہارے خراج کی ضرورت نہیں۔ تم پر ظلم ہو رہا ہے

---

[1] محصول دینے والے

اور ظلم کی روک تھام میرا فریضہ ہے اور یہ چیز کہ ایک ظالم اور سرکش قوم تم پہ حملہ کر کے تمہیں اس طرح سے تباہ کر دے' یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔ ان سے حفاظت دلانا میرے ذمہ فرض عائد ہو جاتا ہے اور ادائیگی فرض کا معاوضہ لینا ہمارے ہاں جائز نہیں ہے۔ یہ ہے وہ نقطہ عزیزانِ من! جس کے لیے قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر کیا۔ یہ ہے محاصل' یہ ہے فرق اس کا' کہ جو مملکت کا ایک شہنشاہ ہوتا ہے اور وہ کہ جو مملکت کو ایک بلند اقدار کے پورا کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے' اور وہ بلند قدر یہ ہے کہ جو ظالم اور سرکش' کسی دوسری کمزور اور ضعیف قوم پر ظلم کرے' اُسے اس کے ظلم سے اُسے محفوظ کرنا۔

اسلامی مملکت کا فریضہ معاشرے کو ہر قسم کے ظلم واستبداد سے محفوظ کرنا ہوتا ہے

معاشرے کو ظلم واستبداد سے محفوظ کرنا طاقتور حکمران کا فریضۂ خداوندی ہو جاتا ہے۔ مملکت حاصل ہی اس مقصد کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ یہی چیز تو قرآن نے دوسری جگہ کہی ہے جب مدینے میں مملکت قائم ہوگئی تھی۔ یہ مملکت ان مسلمانوں کی قائم ہوئی تھی جو مکہ سے ہی آئے تھے۔ اب جو لوگ مکہ میں پیچھے رہ گئے تھے' ان پر بڑے مظالم ہو رہے تھے تو قرآنِ کریم نے وہاں کے مسلمانوں سے یہ کہا ہے کہ تم نے مدینہ میں اپنی مملکت قائم کر لی تو اب سمجھ لیا کہ ہمارا جو مقصد تھا' وہ حاصل ہو گیا' ہم صاحبِ مملکت بھی ہو گئے' ہمیں تمکن بھی حاصل ہو گیا تو کیا مملکت کا یہی مقصد تھا؟ کہا: نہیں' یہ تو ذریعہ ہے جو تمہیں حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا ان مدینہ کے مسلمانوں سے کہا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان کی مدد کے لیے اٹھتے نہیں ہو حالانکہ وہاں کے مظلوم دہائی دے دے کر ہمیں پکارتے ہیں یعنی خدا کو پکارتے ہیں' کہ یا الہ العالمین! ہماری مدد کا کوئی ذریعہ بنا دے' اپنی طرف سے تو ہمارا والی وناصر ہو جا۔ خدا ان مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے' مدینے کی مملکت والوں سے کہتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے' سنتے نہیں ہو کہ وہ مظلوم کس طرح ہمیں پکار رہے ہیں اور تم ان کی مدد کے لیے کیوں نہیں اٹھ رہے۔

اب اگلی بات یہ آ گئی کہ مظلوم پکارتا تو خدا ہی کو ہے' خدا براہِ راست اپنی فوجیں لے کے نہیں آتا' خدا انہیں جنہوں نے خدا کے نام پہ مملکت قائم کی ہوئی ہوتی ہے' یاد دلاتا ہے کہ ہمارے نام پہ مملکت قائم کر کے سنتے نہیں ہو کہ وہ ہمیں کس طرح سے پکار رہے ہیں تم ان کی مدد کے لیے کیوں نہیں اٹھتے۔ قرآنی تعلیمات کے لحاظ سے یہ فرق ہوتا ہے مملکت اور مملکت میں۔ یہ ہے وہ مملکت جسے اسلامی کہلانے کا حق ہے' یہ ہے وہ مقام جہاں قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر چھیڑا ہے کہ یہ سرکش اور ظالم قبیلے آ کے ہمیں لوٹ کے لے جاتے ہیں' ہم میں اتنی قوت نہیں کہ اپنی حفاظت کر سکیں' ان کی مدافعت کر سکیں۔ پہاڑ کا یہ درہ (Pass) ہے اسے کاٹ دیجیے' ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ ہم تمہارے باج گزار ہو جائیں گے' ہم تمہیں خراج دیں گے۔ جواب میں ذوالقرنین کہتا ہے کہ اس کے بدلے میں میں تم سے کچھ نہیں لے سکتا۔ میرے خدا نے جو تمکن مجھے عطا کیا ہے' وہ تمکن تو عطا ہی اس لیے کیا تھا کہ میں تمہیں سرکش ظالم قبیلے کے لوگوں کی مار دھاڑ سے محفوظ رکھوں۔ اب تم صرف یہ کرو کہ فَاَعِیۡنُوۡنِیۡ بِقُوَّۃٍ اَجۡعَلۡ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ رَدۡمًا (18:95)۔ تم مجھے صرف اپنی Man Power دے دو اور میں یہاں ایسی دیوار کھڑی کر دیتا ہوں جو تمہیں محفوظ کر دے گی' باقی سب کچھ انتظام میں کر لوں گا۔ تمہارے ہاں جو مزدور ہیں'

کچھ کام وہ کریں' میرے ساتھ اتنے مزدور نہیں ہیں' بس تم اتنا سا کر دو۔ مجھے تم صرف اپنی محنت (Labour) سے مدد دے دو' مزدور مہیا کر دو تو میں تمہارے اور اُن کے درمیان دیوار بنا دوں گا۔

اب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قرآنِ کریم نے اس ''بادشاہ'' کا ذکر اس خصوصیت سے کیوں کیا ہے! اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ **اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ** (18:96)۔ لوہے کے یہ بڑے بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ یہ لوہا ان پہاڑیوں میں سے نکلتا ہوگا۔ تمہارا مزدور طبقہ جسے ہم افرادی قوت Man Power کہتے ہیں' لوہے کے ٹکڑے یہاں سے لے آئے۔ جب وہ سامان لے آئے تو **حَتّٰی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا** (18:96)۔ اس نے ان لوہے کے ٹکڑوں کو پتھر کے ساتھ ملا ملا کے ان پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دیا۔ قرآن تو اشارۃً بات کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ جو درہ تھا' چھوٹا سا درہ نظر آتا ہوگا' اس نے اس درے کو پاٹ کے رکھ دیا۔ اس کے بعد کہا کہ لو! اب اس کے اندر آگ جھونکو تا کہ یہ دیوار اتنی مضبوط ہو جائے۔ درمیان میں لوہا دیا ہوگا' ساتھ پتھر دیئے ہوں گے۔ **حَتّٰی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِیْٓ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا** (18:96)۔ جب وہ بالکل آگ کی طرح دہک گئی تو اس نے اس کے اوپر ابلا ہوا تانبا انڈیل دیا اور اس طرح سے اس کو مضبوط کر دیا۔ چنانچہ دیوار تیار ہوگئی۔ اس دیوار کو ایسا بنایا کہ **فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا** (18:97)۔ نہ تو وہ اس پر چڑھ سکتے تھے' نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد انہوں نے اس کا کچھ شکریہ بھی تو ادا کرنا چاہا ہوگا: **قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ** (18:98)۔ اُس نے کہا کہ نہ بھائی یہ تو میرے پرورش کرنے والے کی طرف سے سامانِ مرحمت ہے جو میرے ہاتھوں سے سرانجام پایا ہے۔ تمہارا بھی رابطہ اور میرا بھی رابطہ ہوا تو یہ کام مکمل ہوا یہ ایک مشترکہ کام تھا۔ تم Man Power رکھتے تھے' تم نے وہ دیا' میں یہ کچھ کر سکتا تھا' میں نے یہ کچھ کر دیا۔ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے: **لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (76:9)۔ ہم تم سے بدلہ تو ایک طرف رہا شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں۔ کہا کہ میں نے ایسی دیوار بنا دی ہے کہ یاد رکھو کہ اب اس کے اوپر نہ یہ چڑھ سکیں گے' نہ نقب لگا سکیں گے لیکن ساتھ ہی ایک عجیب بات کہی: **فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا** (18:98)۔ کہ ہاں! اگر میرے نشوونما دینے والے کے مقرر کردہ قانون کی بنا پر کوئی حادثہ رونما ہو جائے: مثلاً زلزلہ یا بے پناہ سیلاب یا کوئی اور تغیر (Change)' آ جائے تو اس کے سامنے اس دیوار کی ہستی کچھ نہیں ہوگی۔ اُس وقت یہ زمین کے ساتھ ہموار ہو جائے گی اس لیے کہ میرے نشوونما دینے والے کا قانون اپنی جگہ اٹل ہے۔

درہ دانیال کی یہ دیوار ہمیشہ کے لیے کام نہیں دیگی

عزیزانِ من! قرآن عجیب چیزیں کہہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اب یہ دیوار قیامت تک کے لیے کوئی نہ ڈھا سکے گا' نہ اس کے اوپر چڑھ سکے گا۔ کہا یہ کہ حالات بدلتے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد پھر ایسا زمانہ آ جائے کہ اس قسم کی دیواریں کچھ

حیثیت ہی نہ رکھیں۔ فوجوں کے یورش کے راستہ میں توپ کا ایک گولا اس دیوار کو ہموار کر دے۔ نقب لگانے کی یہ پہلی سی کیفیت ہی نہ رہے۔ ہوسکتا ہے کہ پہاڑوں کے اوپر سے ہوائی جہاز کا ایک حملہ ہو تو درے کی یہ دیوار بھک سے اڑ جائے۔ جہاز پہاڑ کے اوپر آ جاتے ہیں، تو درہ کی دیوار تو کچھ شے ہی نہیں ہے۔ ایسا نظر آتا ہے یہ جسے درہ دانیال کہتے ہیں، یہ وہ مقام ہیں، جہاں اس قسم کی دیوار کے اب بھی کھنڈرات ہیں جو پتھروں اور دھات کی ملی ہوئی بنی ہوئی تھی۔ اس کے باقی بڑے بڑے کھنڈر وہاں موجود ہیں۔ محققین کا اندازہ یہ ہے کہ غالباً یہ وہی دیوار ہوگی۔ آگے چل کے جب میں سورۃ انبیا کی 21 ویں آیت پر آؤں گا تو اس کی تفصیل بتاؤں گا۔ وہاں ان یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے۔ قرآن میں دو ہی جگہ ان کا ذکر ہے: یہاں (18:94) میں ہے اور وہاں (21:96) میں ہے۔ اور وہاں (21:96) کے ذکر میں قرآن نے خاص بات کہی ہے، جس سے فکر کا رخ اس طرف مڑتا ہے کہ یہ وہی نہایت شعلہ مزاج، تندخو، برق رفتار آندھی کی طرح امنڈ آنے والے قبائل تھے، جو پہاڑیوں کے اوپر سے، چٹانوں کے اوپر سے، اچھلتے کودتے شعلوں کی طرح آگے بڑھتے تھے۔

آنے والے دور میں طاقت وقوت کے مظاہر

بات تو لمبی ہو جائے گی، اس لیے اتنا سا ٹکڑا تو میں چھوڑتا ہوں، وہ میں وہیں بیان کرونگا۔ یہاں اس وقت یہی کہوں گا کہ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (21:96)۔ وہ دور آئے گا جس میں اس قسم کی رکاوٹیں کچھ معنی نہیں رکھیں گی، وہ رکاوٹیں (Impediments) یونہی ہموار ہو جایا کریں گی اور اس کے بعد یہی اس قسم کے جو قبائل ہیں مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (21:96)۔ ان بلندیوں سے، ان چٹانوں کے اوپر سے، وہ کودتے ہوئے، ناچتے ہوئے، اچھلتے ہوئے، اس طرح سے آگے آ جائیں گے کہ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِىَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (21:97)۔ خدا کے ٹھہرائے ہوئے سچے وعدہ کی گھڑی قریب آ جائے گی، تو اُس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ لوگوں کی آنکھیں، جنہوں نے سچائی سے انکار کیا تھا، دہشت اور حیرت کی شدت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

ان رکاوٹوں کا سہارا کب تک کام آئے گا؟

عزیزانِ من! یہ عجیب قسم کی جنگوں کا زمانہ ہوگا، جس میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی کہ ایسے ایسے سامانِ مدافعت، جو اس سے پہلے اس قدر قوی روک ثابت ہوا کرتے تھے، بے کار ہو جائیں گے۔ یہ آپ کے ہاں کی یہی اسی قسم کی رکاوٹیں تھیں مثلاً آپ کے ہاں درہ خیبر سے آگے حملہ آور آیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں دریائے اٹک پہلی رکاوٹ ہوا کرتی تھی لیکن دریا کا پار کر لینا تو کچھ مشکل نہیں تھا اس لیے وہاں ایک ایسا حصار قائم کرنا چاہیے تھا جو آنے والے کی روک کا سامان ہو۔ آپ نے اٹک کا قلعہ دیکھا ہے جو لوگ وہاں سے گئے ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ قلعہ کہاں سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی جو بڑی دیوار ہے وہ دریا کے اندر تک چلی گئی ہے تو اس زمانے میں تو یہ

دیواریں حملہ آوروں کی یورش کو روک دیا کرتی تھیں' آج تو پہاڑ بھی نہیں روک سکتا تو اسی لیے وہاں یہ کہا ہے کہ جب اس کے بعد زمانہ اور پلٹ جائے گا' دنیا آگے بڑھے گی' تو اس کے بعد جو دیوار میں نے تمہیں بنادی ہے وہ تو کچھ حیثیت نہیں رکھے گی لیکن آج تو بہر حال تمہاری حفاظت کردے گی۔ **فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا** (18:98)۔مگر یہ یادرکھو کہ اگر میرے پروردگار کے مقرر کردہ قانون کی بنا پر کوئی اور حادثہ رونما ہوجائے' کوئی بات ظہور میں آجائے مثلاً زلزلہ یا بے پناہ سیلاب' یا کوئی اور تغیر (Change)' تو اُس کے سامنے اس دیوار کی کوئی ہستی نہیں ہوگی۔وہ حادثہ' وہ بات' اُسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کردے گا' اُس وقت یہ دیوار زمین کے ساتھ ہموار ہوجائے گی مگر اس سے پہلے کوئی اسے ڈھا نہیں سکتا۔اس لیے کہ میرے نشو ونما دینے والے کا قانون اپنی جگہ اٹل ہے' میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے' ٹلنے والی نہیں ہے۔یہ بات ہو کے رہے گی۔یہ بات اس زمانے میں کہی جارہی ہے کہ ایسا ہوگا کہ یہ درہ (Pass) جو آج تم دیکھ رہے ہو' یہ دیوار جو میں نے اس میں کھڑی کی ہے' اتنی محکم دیوار ہے کہ تم مطمئن ہوگئے ہو کہ اب ہم محفوظ ہوگئے ہیں تو واقعی تم محفوظ ہوگئے ہو' مگر یہ یادرکھو کہ یہ حفاظت کے سامان ابدی طور پر نہیں رہیں گے۔وہ ادوار آئیں گے' جن میں یہ سامانِ حفاظت تار کی طرح ہوجایا کرتے ہیں۔اور یہ خدا کا وہ وعدہ' وہ قانون ہے' جو پورا ہو کر رہے گا۔

صور پھونکنے کا مقصد جنگ کے لیے اکٹھا ہونا تھا

اس وقت تم دیکھو گے کہ **وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا** (18:99)۔اِس قسم کے روک کے سامان' اسباب وذرائع کچھ حقیقت نہیں رکھیں گے۔یہ قومیں سمندر کی طلاطم انگیز موجوں کی طرح ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں گی۔تم دیکھو گے کہ ایک فوج دوسری فوج پر' کس سیلاب کی طرح امڈتی ہے' شعلوں کی طرح لپکتی ہے' جنگ کے بگل بجیں گے اور اِس قسم کی رکاوٹیں ان کے حملوں کے راستوں میں قطعاً حائل نہیں ہوسکیں گی۔اور تمام قومیں جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کے مقابلے میں اکٹھی ہوکر آجائیں گی۔

اب یہاں آکے ہمارے ہاں کی عام تفسیروں میں تو جہاں بھی لفظ صور آیا' اس کا ترجمہ ہوگیا کہ ''صور پھونکا جائے'' تو وہ بات قیامت تک کے لیے آگئی۔ٹھیک ہے قیامت کے صور تو پھونکے جائیں گے اور کچھ صور پھونکنا کی بات اور ہی ہے۔خیر جہاں قیامت کا ذکر آئے گا' تو میں وہاں عرض کرونگا لیکن اس صور پھونکنے کے معنی تو اور ہی ہیں۔وہ جو جنگ کا بگل بجتا ہے یہ ہے صور پھونکنا۔یہ آج کی بات نہیں ہے' بگل کی بات بہت قدیم زمانے سے ہے۔یہ نرسنگھے وغیرہ جو ان قوموں نے رکھے ہوئے تھے وہ یہی چیزیں تھیں۔یہ پھونکے جاتے تھے۔جنگ کے لیے یہ بگل علامت ہوتی تھی۔اُسے کہتے تھے: **نُفِخَ فِی الصُّوْرِ** (18:99)۔جنگ کے بگل بجیں گے۔یہ جنگ کے لیے تھے۔یہ وہی تھے جسے ہم اعلانِ جنگ کہتے ہیں۔یا اپنے ہاں کے افراد کو جنگ کی خاطر اکٹھا کرنا کہتے ہیں۔یہ اس کے لیے

اس زمانے میں ذرائع اور آلات تھے۔ جہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ صور پھونکا جائے گا تو اس کے معنی قیامت کا مفہوم ہی نہیں ہے بلکہ یہاں یہ جس طرح جنگیں ہوتی ہیں' اُن کی علامت کے طور پہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ پھر وہ دور آئے گا کہ یہ فوجیں شعلوں کی طرح لپک کے' ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچیں گی' ان کے لیے راستہ میں یہ رکاوٹیں سدِ باب نہیں ہو جائیں گی' جنگ کے بگل بجیں گے۔ دور وہ آئے گا کہ کسی ایک علاقے کی فوج' دوسرے علاقے کے اندر داخل ہو کے' اس پہ آمادہ بہ جنگ ہوگی: **فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا** (18:99)۔ دنیا بھر کی فوجیں اکٹھی ہو جایا کریں گی صاحب! اسے آپ ذوالقرنین کے دور کی بات نہ بھی کہیے تو بھی کم از کم چھٹی صدی عیسوی یعنی قرآنِ کریم کے نزول کے زمانے کی بات تو یہ ہے کہ جو قرآن کے اندر ہے۔ اس دور میں یہ بات کہنا عقلِ انسانی کے لیے کتنا حیرت زا ہے! اس دور کی بھی کیفیت یہی تھی کہ ایران والے رومن بازنطینی ایمپائر پر زیادہ سے زیادہ حملہ کر دیتے تھے' وہ ایران کے اوپر آ جاتے تھے اور ایران والے عرب پہ حملہ کر دیتے تھے یعنی یہ اس زمانے میں آس پاس کے علاقوں تک ہی جا سکتے تھے' کیونکہ انہیں پیدل یا گھوڑوں پہ تو جانا ہوتا تھا۔ لیکن اس دور میں یہ کہنا کہ پھر یہ فوجیں اپنے قریبی علاقوں کے ساتھ ہی آویزش میں نہیں آیا کریں گی: **فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا** (18:99)۔ تمام قومیں' جنگ کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں' اکٹھی ہو کر آ جایا کریں گی۔ اس میں تو عالمگیر جنگ ہوگی۔

یہ جنگ خدا کے قوانین سے اعراض برتنے والی قومیں ہوں گی

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَاۨ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا (18:100-101)۔ اُس وقت ان لوگوں کے سامنے جنہوں نے ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کیا تھا' جہنم کی عالمگیر تباہیاں نکھر اور ابھر کر آ جائیں گی۔ یہ کچھ ان لوگوں کے سامنے آئے گا جن کی آنکھوں پر ہمارے قوانین کی طرف سے پردے پڑ چکے تھے اور جن کے کانوں میں ان کی طرف سے گرانی آ چکی تھی اور وہ مملکتوں کا نظام' قوانین خداوندی کے بجائے اپنے اپنے خود ساختہ قوانین اور دساتیر کے مطابق چلاتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ تباہی اور بربادی کا جہنم تھا۔

عزیزانِ من! یہ اقوام جو آپس میں اس طرح سے میدانوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف ٹکرائیں گی' تو عالمگیر جنگ ہوگی۔ اس میں وہ قومیں ہوں گی جو خدا کے قوانین سے اعراض برتنے' کفر برتنے' والی ہونگی۔ خدا کے قوانین پر ایمان رکھنے والی قوموں میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے گلے پہ خنجر نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہ قومیں ہوں گی جو خدا کے قوانین سے اعراض برت کے اپنے لیے نئے نئے نظام قائم کریں گی' ان کی سیاست کی بنیادیں بالکل نئی ہونگی' قومیت کے دائروں میں بٹی ہوئی ہونگی' استحصال اور Exploitation ہر قوم کا مطمح نگاہ ہوگا۔ **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** (2:36)۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہوگا' ان میں مفاد خوش کی پچڑیں (Wedges) حائل ہوں گی۔ قرآن نے کہا ہے کہ انسان امتِ واحدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کا دشمن ہو جائے گا اور ایک دوسرے کے سامنے

کھڑا ہو جائے گا۔ یہ وہ قومیں ہونگی جن کی آنکھوں پر ہمارے قوانین کی طرف سے پردے پڑے ہوئے ہونگے۔ کیا انداز ہے بات کہنے کا! آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہونگے، لیکن جو یہ بات سنانے والا بھی ان کو سنائے گا کہ تمہاری یہ غلط روش ہے جس پہ تم چل رہے ہو۔ وہ اس کی بات کو بھی اَن سنی کر دیں گے۔ کہا: اس دور میں انسانوں کی یہ کیفیت ہوگی اور یہاں ذوالقرنین کی بات لا کر اُس کا یہ تذکرہ کر کے، ایک اصول کی وضاحت کر دی۔ اب یہ ایک Particular Individual، ایک خاص فرد کا ذکر نہ رہا، عام بات آگے آ گئی کہ پھر وہ دور آئے گا جب جنگ کے اسباب و ذرائع بھی ایسے ہو جائیں گے کہ اس قسم کی رکاوٹیں کچھ نہیں کر سکیں گی۔

قوموں کے مابین باہمی جنگ وجدل کی اصل وجہ

عزیزانِ من! پھر قوموں میں بھی ایک دوسرے کے قبائل کی طرح جنگ نہیں ہوگی، عالمگیر افواج کی جنگ ہوا کرے گی۔ وہ اس لیے ہوا کرے گی کہ انہوں نے انسانوں کو اس طرح مختلف دائروں میں تقسیم کر رکھا ہوگا کہ ایک دائرے کے اندر بسنے والا انسان، دوسرے دائرہ کے اندر بسنے والے انسانوں کے خون کا دشمن ہو جائے گا۔ یہ اس لیے ہوگا کہ وحدتِ انسانیت کا قانون، جو خدا نے دیا ہے، وہ نظر انداز کر دیا جائے گا، نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ قرآن نے سارا کچھ بعد میں عمومی تعلیم کی حیثیت سے بیان کیا ہے اور اس کے بعد ہمیں، آپ کو، قرآن کی مخاطب قوم کو، پھر Address کر کے، مخاطب کر کے، کہا: اَفَحَسِبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا عِبَادِیۡ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ اَوۡلِیَآءَ (18:102)۔ کیا وہ لوگ، جو ہمارے قوانین سے انکار کرتے ہیں، ان سے سرکشی برتتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان قوانین سے سرکشی برتنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ تو انسان کی بھول ہے کیونکہ قانونِ مکافات (Law of Requital) کا ترازو کسی کے عمل کو نظر انداز نہیں کرتا۔

نوعِ انسانی کی ہلاکت کا علاج وحدتِ انسانیت میں مضمر ہے

مختلف اقوام اگر خدا کے قوانین کے تحت آپس میں اتحاد و اتفاق کر لیں تو یہی چیز کارگر ہو سکتی ہے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ UNO کچھ نہیں کر سکا۔ تم نے خدا کے قوانین کو چھوڑ کے، ایک دوسرے کو اپنا مددگار، ایک دوسرے کو اپنا حلیف، قرار دیا۔ معاہدے تم آپس میں کر لیتے ہو، یہاں اقوامِ عالم بھی مل کے کچھ Resolutions پاس کر لیتی ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ کہا: اس سے ان میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ جو مِنۡ دُوۡنِیۡ (18:102) ہے، یعنی خدا کے قوانین کو چھوڑ کے، جو تم باہمی تولیت کا انتظام کرتے ہو، ایک دوسرے کی رفاقت کا، معاہدوں کا، اتفاق کا، متحدہ اقوام بھی بنا لیتے ہو، اس سے امنِ عالم نہیں ہو سکے گا۔ یہ تمام کچھ مِنۡ دُوۡنِیۡ (18:102) خدا کے قوانین کو چھوڑ کر نہیں ہو سکے گا۔ خدائے علیم کا یہ اعلان وہ اعلان ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔

سوال صرف باہمی اتحاد ہی کا نہیں' اس کی بنیاد کا بھی ہے

عزیزانِ من! قرآن کی آیت کے ایک ایک لفظ پر کھڑے ہونا چاہیے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ جو باہمی اتحاد ہے وہ کام نہیں دے سکے گا۔ یہ اتحاد تو بڑی چیز ہے' اختلافات کو رفع کرنے کی بھاگ دوڑ کرتا ہے اور وحدت تو اتحاد سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اتحاد کی بنیاد کیا ہونی چاہیے؟ اگر مِنۡ دُوۡنِیۡۤ (18:102) خدا کے قوانین کے ورے ہی اتحاد ہوا ہے تو کہا ہے: یہ اتحاد باہمی عداوتوں کو ختم نہیں کر سکے گا اور یہ چیز عملاً ہمارے سامنے ہے۔ عزیزانِ من! یہ دو ہزار سال پہلے کی کہی ہوئی بات ہے۔ آج ہمارے سامنے دنیا چیخ رہی ہے یعنی اس وحدتِ انسانیت کے لیے چیخ رہے ہیں لیکن اس کے لیے جو طریقے اختیار کرتے ہیں وہ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ (18:102) خدا کے قوانین کے ورے ہی اختیار کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہاں آئے گا لیکن قانونِ خداوندی وہاں نہیں آئے گا' وہاں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہونگے۔ یہ قوانین تو وہاں روز بنتے ہیں' روز ڈھے جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں وہ قراردادیں کیا کر رہی ہیں؟ کیا کبھی آپ نے سوچا؟ سنیے!

یہودی المذہب کے لیے اسرائیل کی نسل سے ہونا ضروری ہے

ایک قرارداد تو اب Recently' وہاں UNO کی Majority نے بھی پاس کی ہے کہ یہ جو اسرائیل کی حکومت ہے یا یہ جو اسرائیل کی صیہونی طاقت ہے' جو صیہونیت (Zionism) ہے' اس کی بنیاد نسل پرستی پر ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے ان کے خلاف کوئی اور الزام عائد نہیں کیا' ان کے خلاف کوئی جھوٹا جرم نہیں عائد نہیں کیا۔ اسرائیل کے لیے صرف یہ کہنا کہ یہ نسل پرستی ہے' ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تردید وہ کر ہی نہیں سکتے یعنی یہ بنیاد ہے کہ دنیا میں کوئی شخص یہودی مذہب اختیار نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ اسرائیل کے گھر میں پیدا نہ ہوا ہو۔ وہ یہودی مذہب اختیار نہیں کر سکتا' یعنی اتنی بڑی شرط دنیا کی کسی قوم میں آپ کو نہیں ملے گی۔ جب تک وہ اسرائیل کے گھر میں پیدا نہ ہو وہ یہ مذہب ہی نہیں اختیار کر سکتا۔ یہودیت جو مذہب ہے وہ اس نسل کے اندر محدود ہے' غیر از بنی اسرائیل یہودی مذہب اختیار نہیں کر سکتا۔ کیا کہیں بھی آپ کو یہ نسل پرستی ملتی ہے؟ یہ ہے وہ قوم جو یہ کہتی ہے اور فخر سے کہتی ہے۔ انہیں اگر آج UNO کی اکثریت نے قرارداد کی رو سے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ نسل پرست قوم ہے اور اُدھر امریکہ ہے۔ یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ جنہوں نے اس قرارداد کے حق میں رائے دی ہے ہم دیکھیں گے کہ ہم ان کے خلاف کیا کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! اسے بھی سن لیجیے کہ وہ کرتے ہیں؟

غریب قوموں کی مدد کرنا بند کر دی جائے گی: امریکہ کا کردار اور Aid کا جال

پہلی چیز جو وہاں تحریک کی صورت میں اٹھی ہے' وہ یہ ہے کہ ہم دنیا کی مفلس' محتاج' مظلوم اور غریب قوموں کو مدد دیتے ہیں جسے Aid کہا جا رہا تھا' کہا کہ ہمارا پہلا Step تو یہ ہوگا کہ ہم ان کی یہ ایڈ بند کر دیں گے۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے جو کہی جا رہی ہے!

دیکھا: مِنۡ دُوۡنِیۡۤ (18:102)۔کا جو اتحاد ہوتا ہے' وہ کیا رنگ لاتا ہے۔UNO کا سب سے بڑا ممبر' یہ امریکہ ہی اس کا بنیادی ممبر ہے' جسے Founder Member کہتے ہیں' وہاں سب سے زیادہ اثر اسی کا ہے۔اس کی یہ کیفیت ہے کہ اُس کی اپنی بنائی ہوئی کمیٹی' جوان کا ایک ادارہ ہے' اس ادارے میں جو قانونِ جمہوریت ہے کہ اکثریت کا فیصلہ سب کے لیے قابلِ قبول ہوگا' وہ فیصلہ وہاں ہوتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس کے خلاف اعلان کرتا ہے۔اور اعلان کیا کرتا ہے کہ جن قوموں کی مدد کیا کرتے تھے اگر انہوں نے ان کے حق میں یہ رائے دی تو ان کی مدد بند کریں گے۔یہ ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کیا جا رہا ہے!

عزیزانِ من! وہ مِــنۡ دُوۡنِـــیۡۤ (18:102) جو بھی کیا جائے گا' اس میں انسانیت کی مدد نہیں ہوگی' اپنے ہی مفاد ہونگے۔یہ مفادات Directly ہوں یا Indirectly بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ' اس قرارداد کی رو سے کوئی انسان محض انسان ہونے کی حیثیت سے کسی انسان کا احترام نہیں کرے گا حالانکہ خدا کا قانون یہ کچھ کہے گا کہ وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70)۔ ہر انسانی بچہ محض اس لیے کہ وہ انسانی بچہ ہے یکساں واجب التکریم ہے۔یہ خدا کا قانون ہے۔لہٰذا اگر آپ خدا کو درمیان میں لا کے اتحاد کرو گے تو اس کی بنیاد اس پہ ہوگی۔یہ اتحاد جو اُسے چھوڑ کے کرو گے' اس اتحاد کی بنیاد ہوگی' ان اپنے قوانین کی رو سے' Democracy کی رُو سے۔یہاں اس قرارداد میں اکثریت کا فیصلہ' UNO کا ہے' اقوامِ عالم کا فیصلہ ہے' امریکہ کے خلاف براہِ راست نہیں ہے۔یہ امریکہ جو مسلمانوں کے قلب کے اندر خنجر گھونپ کے بیٹھا ہوا ہے' اس کے خلاف ایک ریزولیشن UNO پاس کرتی ہے۔ارے بابا! یہ قرارداد مسلمانوں کی اقوام نہیں کر رہیں' عربوں کی قومیں نہیں کر رہی ہیں' UNO کی اتحادی قومیں کر رہی ہیں اور وہ بھڑک اٹھتا ہے یہ کیا ہے؟ مِــنۡ دُوۡنِـــیۡۤ اَوۡلِیَـــآءَ (18:102)۔کہا ہے۔کہ جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' کیا وہ اپنے ذہن میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اگر بہت سے لوگ ان کے رفیق اور کارساز (اولیاء) بن جائیں اور اس طرح اکثر قبائل اور عوام غلط نظام پر متفق اور متحد ہو جائیں' تو ہمارا قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔یہ ان کی بھول ہے۔

قوانین خداوندی سے ہٹ کر کسی بھی اتحاد کا نتیجہ قلبی جہنم ہوگا

عزیزانِ من! جہاں جہاں بھی تولیت' باہمی دوستی اور باہمی اتحاد کا مدار خدا کے قوانین کو الگ کر کے ہوگا' اس کا یہی نتیجہ ہوگا۔اس لیے قرآن کریم نے کہا: اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نُزُلًا (18:102)۔کہ ان ساری کوششوں کے باوجود ان کی زندگی جہنم میں ہی گزرے گی۔بظاہر یہاں نزلا عجیب لفظ ہے' بظاہر ایسے اکٹھے ہوئے ہوئے نظر آئیں گے جیسے اپنے ہاں مہمان بلائے جاتے ہیں تو مہمانوں کی تو خاص طور سے کچھ تواضع ہوتی ہے' احترام ہوتا ہے' عزت ہوتی ہے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ وہاں بلائے جائیں گے' انہیں بڑے

بڑے عظیم ہوٹلوں کے اندر بطور (Deligate) رکھا جائے گا۔ مہمانی کتنی بڑی ہوتی ہے۔ درحقیقت، جہنم کے اندر بسنے والوں کی مہمان نوازی **مِنْ دُوْنِیْ** کیجئے، اِن کی مہمان نوازی یوں کیجئے جیسے کہ ان کی کی جاتی ہے جو اپنی زندگی قوانین خداوندی کو ہٹا کر، الگ کر کے گزارتے ہیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیے کہ اگر یہ من دونی آ گیا ہے جو جہنم ہے وہ کبھی جنت میں نہیں بدل سکتا۔ اس سے آگے بات دوسری چلی اگرچہ اسی سلسلہ میں آگے ہے: **قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً** (18:103)۔ کیا انداز ہے قرآنِ کریم کا! رسول! ان سے کہو کہ تمہیں بتائیں یہاں سب سے زیادہ نقصان میں کون رہے گا؟ یہ بتانا بڑی چیز ہے۔ کہا: **بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً** (18:103)۔ چھوٹے چھوٹے نقصانات تو ہونگے شاید تم بھی ان کا پتہ لگا لو کہ یہ کیوں ہے، کون ہیں جو سب سے زیادہ نقصان میں، گھاٹے میں، تباہی میں ہیں؟ تمہیں بتائیں کہ یہ کون لوگ ہونگے جی چاہتا ہے کہ جلدی سے بتائیں لیکن جلدی نہیں۔ اس لیے کہ وقت ہو گیا ہے، آئندہ بتائیں گے۔ آپ اب ذرا انتظار کر لیں۔ سورۃ الکھف کی آیت 102 ہم نے کر لی، 103 سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمِ ط

❀......❀......❀......❀

ساتواں باب: سورۃ الکھف (آیت 103 تا 106)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ؕ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ
يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ
يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَاتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1975 کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 103 سے ہو رہا ہے: (18:103)۔

اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا (18:103)۔ باطل کے نظام پر جمع ہونے والوں سے کہہ دو کہ کیا ہم بتائیں کہ وہ کون ہیں جو اپنی سعی و عمل میں سخت نقصان میں رہتے ہیں؟ جیسا کہ میں متعدد بار عرض کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم میں سورتوں کی آخری آیات میں اس سورۃ کے مضمون کا ملخص پیش کر دیا جاتا ہے، اس کا نچوڑ ان کی آخری آیتوں میں آتا ہے

سب سے زیادہ خسارہ پہنچانے والے اعمال

اب ہم سورۃ الکھف کی آخری آیات پر پہنچ رہے ہیں اور اس میں آپ دیکھیے کہ کس طرح قرآنِ کریم نے اپنے نقطہ ماسکہ، اصل الاصول، اپنی تعلیم کے نچوڑ کو کس شکل میں پیش کیا ہے۔ اندازِ بیان یہ ہے کہ اے رسول! ان سے کہو کہ کیا تمہیں بتائیں کہ تم میں سے کس کے اعمال سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے ہیں؟ انسان اپنا ہر عمل اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے۔ یہاں اِس آیت میں عمل کی جمع اعمال لا کر بتایا گیا ہے کہ اعمالاً کا نتیجہ اخسرین ہے یعنی یہ اعمال نتائج کے لحاظ سے سب سے زیادہ نقصان رساں ہیں۔ جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ، جاتے جاتے، اس سوال کے اوپر کہ ہر شخص اس چیز کا آرزومند ہوگا، متمنی ہوگا کہ صاحب! جو کام ہم کرتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے یا نقصان دینے والے کام، کونسے ہیں اور اس کے بعد، جو جواب آیا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن نے ان اعمال

یا کاموں کی فہرست مرتب کر کے سامنے نہیں رکھ دی۔ وہ فہرست مرتب نہیں کیا کرتا۔ وہ تو ایک اصول دیا کرتا ہے ایک معیار دیا کرتا ہے اور اس کے بعد پھر انسانوں پہ چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود اس اصول و معیار و اقدار کے مطابق اپنے اعمال کو پرکھ کر دیکھ لیں کہ کون کون سے اعمال یا کام اس اصول و معیار و اقدار کے مطابق ہیں جو اِس کے مطابق ہوں گے وہ نفع بخش ہونگے اور جو اس کے خلاف جاتے ہیں وہ نقصان دینے والے ہونگے۔

انسانوں کے لیے دو نظریاتِ حیات

پھر اس کے بعد اس نے ایک اصولی بات کہی ہے اور وہ اصولی بات درحقیقت حیوان اور انسان میں مابعد الامتیاز ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ دین کا سارا مدار خدا پر ایمان وحی پر ایمان رسالت پر ایمان مکافاتِ عمل پر ایمان آخرت پر ایمان ہے۔ ان سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی کا نظریۂ زندگی کیا ہے؟ انسانوں میں دو نظریاتِ حیات چلے آ رہے ہیں۔ ایک نظریۂ زندگی وہ ہے کہ جسے عام طور پر Materialistic Concept of Life کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ مادی نظریہ حیات کیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح کچھ زیادہ واضح نہیں لیکن بہر حال اس کا ترجمہ اسی اصطلاح سے کیا جاتا ہے یعنی مادی نظریہ حیات۔ اور ایک دوسرا نظریہ حیات ہے جسے میں قرآنی نظریہ حیات کہونگا۔ مادی نظریہ حیات یہ ہے کہ انسان کی زندگی محض طبعی زندگی ہے یہی Physical Life ہے جس طرح دوسرے حیوانات کی زندگی ہے اسی قسم کی انسان کی زندگی ہے اور جب زندگی یہی ہے تو پھر اس زندگی کے مقاصد اس کی طبعی ضروریات کا پورا ہونا ہو گئے۔ عوام کی طرح اس طبعی زندگی کے تقاضوں کی فہرست کتنی ہی طول وطویل کیوں نہ لیجائیں یا اسے کتنا ہی کیوں نہ سمٹائیں تو طبعی زندگی کے تقاضوں میں پھر بھی دو ہی باتیں رہ جاتی ہیں: کھانا پینا اور افزائش نسل کرنا۔

حیوانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ

کھانا پینا جس سے یہ زندگی قائم رہے اور افزائشِ نسل کرنا اور اس کے بعد مر جانا۔ یہ ٹھہرا حیوانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ۔ اگر نظریہ زندگی یہ ہو کہ انسان کی زندگی یہی طبعی زندگی ہے تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اس میں نہ خیر و شر کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ گناہ و ثواب کا نہ ناجائز و جائز کا۔ خلاصہ زندگی اسی پر متفرح ہے۔ آپ کے ہاں کی اس دور کی ساری سیاست بھی اسی پر منتج ہے۔ اور انسان کی سیاست کا مقصد اپنے اِنہی بنیادی مفادات کو حاصل کرنا ہے خواہ جس ذریعے سے بھی یہ حاصل کیے جاسکیں۔ اگر یہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے تو جو ذریعہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ مستحکم سمجھا جائے گا۔ اگر اس مقصد کے حصول میں ناکامی ہوئی ہے تو ان استعمال میں لائے گئے ذریعوں کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ اچھے نہیں تھے۔ ذرائع کے متعلق جائز یا ناجائز کہنے کا معیار صرف اس بات پر ہے کہ ان سے مقصد پیشِ نظر حاصل ہو گیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ مقصد حاصل ہو گیا تو تمام ذرائع جائز و حلال تھے اگر مقصد حاصل نہیں ہوا تو وہ تمام ذرائع

ناجائز تھے۔اور حیوانی زندگی کا مقصد تمام ایسے سامانِ ذرائع حاصل کرنا جن سے یہ زندگی باقی رہے۔

انسان کی جسمانی زندگی میں تقاضے تو کھانے پینے تک آ جائیں۔آپ جہاں تک جی چاہیے اسے پھیلایئے سمٹ کر تو یہیں آنا ہوگا کہ طبعی جسم کھانے پینے سے تندرست و توانا رہے۔اور اس سے اگلی چیز یہ ہے کہ بقائے نسلِ انسانی کے لیے افزائشِ نسل ہو Persuation ہو۔حیوانی زندگی کا یہی منتہیٰ ہوتا ہے۔اگر انسان کی زندگی بھی یہی Preservation of Self تحفظِ خویش ہو اور زندگی سمجھی جائے اس کا منتہیٰ بھی یہی ہو جائے گا۔اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے لیے پھر خیر و شر، گناہ و ثواب، جائز و ناجائز کا سوال ہی باقی نہیں رہے گا۔یہ اتنا ہی رہے گا جتنا سوسائٹی اپنے اندر کوئی قوانین مقرر کر دے، وہ جیسا اس نے کہا keep to the left بائیں طرف چلو، ٹریفک کا اصول ہے، بائیں طرف چلنا جائز ہوگیا، صحیح ہوگیا، دائیں طرف چلنا جرم قرار پا گیا، کل کو دوسری قسم کی موٹریں یہاں آ جائیں جیسا کہ چند دن پہلے آئی تھیں تو یہاں یہ قانون بنا دیں گے کہ دائیں طرف چلنا قانوناً جائز، بائیں طرف چلنا جرم ہے۔ان کے ہاں یہی برا ہو جائے گا۔یہ سوسائٹی جو قوانین بنالے انہی قوانین کے تابع ہمیں زندگی بسر کرنا ہوگی۔مقصود و منتہیٰ وہی ہوگا: طبعی زندگی کے ذرائع کے سامان کا حصول۔جسے یہ حاصل ہوگیا، اس کی زندگی کامیاب ہوگئی، جسے یہ حاصل نہیں ہوا وہ نقصان میں رہا۔

زندگی کا معیار کاروبار میں نقصان! کاروبار میں گھاٹا!

اب یہاں اخسرین کا وہ لفظ آ گیا۔میں نے جو کہا ہے اور آپ نگاہ دوڑا کے دیکھیے آپ جب بھی آج لوگوں کا نفع و نقصان کہتے ہیں وہ یہی مالی دولت کا نفع نقصان ہوتا ہے۔یہ اسی زندگی کے مقاصد کے اصول کا نام ہے۔جو کامیاب ہوگیا وہ زندگی میں کامیاب رہا، جو ناکام رہ گیا، اُس نے نقصان کی زندگی گزاری، اسے زندگی میں بڑا نقصان ہوا وہ اپنے کاروبار میں بڑے گھاٹے میں رہا جو زندگی میں کامیاب ہوا اسے اس کاروبار میں بڑا افائدہ رہا۔اُس نے کہا کہ یہ بڑا منفعت بخش کاروبار ہے۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو آپ روزمرہ بولتے ہیں۔ان الفاظ کے بولنے سے مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ یہ بنیادی مقاصد یا تو حاصل ہوتے ہیں یا حاصل نہیں ہوتے۔اگر یہ مقاصد حاصل ہو گئے ہیں تو بڑا منفعت بخش کاروبار رہا۔اگر نہیں ہوئے تو گھاٹے کا سودا ہو گیا۔ایک نظریہ زندگی یہ ہوا۔

یہ نظریۂ حیات آج کی پیداوار نہیں، یہ تباہیاں ازل ہی سے ہیں۔انسانی فکر کی تاریخ میں یونان سرِ فہرست آتا ہے۔اُس زمانے میں بھی اس کا پیدا کردہ نظریہ تھا کہ انسان کی زندگی یہی مادی یا طبعی زندگی ہے یعنی کھاؤ، پیو، خوش رہو، لیکن اسی دور کے اندر جو اس کے برعکس نظریہ رکھنے والے حکماء تھے فلاسفر تھے، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ان کا Logic بھی بہت بلند تھا، وہ چھائے ہوئے تھے اس لیے کہ اُن کا یہ تصورِ حیات ایک نظریے کی حیثیت سے تو رہا لیکن یہ عملاً آگے نہیں چلا۔وہ نظریہ حیات یہ تھا کہ جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والی روش اختیار کرتے ہیں تو اس قسم کی ناہمواریاں خود ان کی اپنی ذات میں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس طرح اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔اور

ان کا معاشرہ بھی ذلیل اور سیاہ ہو جاتا ہے' انہیں اس رسوا کن عذاب سے' جو قانون خداوندی کی رو سے واقع ہوتا ہے' کوئی نہیں بچا سکتا۔ ان کی رسوائی کا یہ عالم ہوتا ہے گویا کسی نے رات کی تاریکی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کا نقاب ان کے چہرے پر اوڑھا دیا ہو۔ ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے جس میں یہ ہمیشہ رہتے ہیں (10:27)۔ اور اس کے بعد ہم یہاں اپنے دور میں آ جاتے ہیں تو اس دور میں اب یہ سمجھیے کہ ساری دنیا پہ زندگی کے صرف طبعی ہونے کی فکر چھا گئی ہے۔ آج اسے ہی مادی نظریۂ حیات کہتے ہیں۔

انسانی زندگی کے متعلق ہمارے دور کی ریسرچ

ہمارے ہاں مغرب کے Scientists (سائنسدان) نے' محققین نے' جو ریسرچز' تحقیقات کی ہیں' وہ ہمارے اس دور کی چیز ہے۔ اگر ان تحقیقات کو زیادہ پیچھے نہ لے جایا جائے بلکہ ڈارون سے ہی شروع کر دیا جائے تو نظریہ یہی ہے کہ انسان کی زندگی بھی حیوانات کی زندگی کی بڑھی ہوئی کڑی ہے۔ اور اس میں دماغ یا شعور تو آ گیا ہے لیکن ان سے زیادہ کچھ نہیں اور وہ بھی یہ کہ اس کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے اور بس۔ یعنی یہ حیوانات کی زندگی کی بڑھی ہوئی کڑی (Link) Qualitatively ان حیوانات سے مختلف نہیں ہے' کیفیت کے اعتبار سے مختلف نہیں' صرف Quantitavely مختلف ہے' کمیت کے اعتبار سے گوریلا کے اندر دماغ چھوٹا سا ہوتا ہے انسان میں بڑا ہوتا ہے یا اس کی ساخت اس سے ذرا مختلف ہو جاتی ہے۔ سیلز (Cells) کے اعتبار سے' نوعیت کے اعتبار سے وہی ہے' بس ذرا سا کیفیت اور کمیت میں کچھ فرق ہو گیا ہے۔ باقی سارا کچھ وہی ہے' جو ایک حیوان کی زندگی ہے۔ یہ نظریہ مغرب میں اس شد و مد سے پھیلا کہ یہ As a reality' وہاں ایک حقیقت بن گیا اور اس نظریہ کے تابع ان کے ہاں کی معاشرت بھی اسی پہ آ گئی' معیشت بھی اسی پہ آ گئی اور بالخصوص سیاست بھی اسی کے اوپر آ گئی۔ مقصد کا حاصل کرنا خواہ جس طریق سے بھی حاصل ہو' منتہیٔ حیات رہ گیا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس۔ جو قوت فراہم کر لے وہ دوسروں کو ہانکتا پھرے' جائز اور ناجائز کا تصور ہی ختم ہو گیا' خیر و شر کی تمیز ہی مٹ گئی۔ وہی قوانین رہ گئے جن کے تابع انسان نے زندگی بسر کرنی ہے۔

قرآن نے اس کے برعکس تصورِ حیات دیا ہے۔ **الٓمّٓرٰ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ** (13:1)۔ خدائے علیم و حکیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ کتاب زندگی (قرآن) کی آیات ہیں' نظریہ حیات ہے۔ یعنی یہ اُس ضابطۂ حیات کے قوانین' جو تیرے نشو و نما دینے والے کی طرف سے تجھ پر بذریعہ وحی نازل کیا جاتا ہے اور جو یکسر حقیقت پر مبنی ہے لیکن اکثر لوگ اس کے باوجود اس کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔ عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ جسمِ انسانی تو وہی ہے جیسا کہ حیوانات کا جسم ہوتا ہے۔ ذرا اس کی شکل Refine ہوئی ہے ورنہ کیفیت کے اعتبار سے یہ دونوں ایک ہی ہیں (13:41)۔ اسی لیے قرآن کریم نے للکار کر کہا: **اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا** (13:41)۔ کیا انہیں یہ نظر نہیں آتا کہ ہم

کس طرح زمین، وسائل پیداوار کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر ان کے مقبوضات کو کم کرتے چلے جاتے ہیں (21:44) ۔ اسی طرح ایک دن ایسا آجائے گا جب ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا بلکہ سب کچھ نوع انسانی کے لیے عام ہو جائے گا (41:10)۔

انسانی جسم کے اندر انسانی ذات کا اضافہ

اب یہاں انسانی زندگی میں آ کر ایک ایسی خصوصیت پیدا ہوتی ہے جو اس سے پہلے زندگی میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ زندگی کے اولیں جرثومے سے لیکر آخری گوریلا یا چمپانیز تک میں یہ شے کہیں نہیں ملتی یہ صرف انسانی زندگی کی خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے، جسے عام طور پر انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اس کا ترجمہ Person سے Personality کیا، پھر انہوں نے اس کا ترجمہ Self بھی کیا، ذات بھی کیا۔ قرآن اسے نفس کہہ کر پکارتا ہے، اقبال ؒ اسے خودی سے تعبیر کرتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ شے، طبعی قوانین یا Physical Laws، جن کے تابع جسمِ انسانی رہتا ہے، اس کی پیدا کردہ نہیں ہے نہ ہی یہ ان قوانین کے تابع رہتی ہے۔ جسے آپ انسانی اختیار و ارادہ کہتے ہیں یہ انسان کی خصوصیت ہے۔ اس اختیار و ارادہ کا تعلق اس شے سے ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا ایک اثر، ایک نقش، اُس کی اس ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور عمل میں انسان کا 'خیال' بھی آجاتا ہے، 'ارادہ' بھی آجاتا ہے، 'آرزو' بھی آجاتی ہے خواہ وہ عملی شکل میں سامنے آئے یا نہ آئے۔ مثلاً اگر میں خیال کرتا ہوں کہ میں کسی کی چیز چوری کر لوں تو اُس کا اثر بھی میری ذات پر مرتب ہوگا حالانکہ چوری کر لینے کا قانون کی رُو سے جرم اس وقت ہوتا ہے جب میں اس چیز کو چرا لوں لیکن اس نظریہ کی رُو سے صرف اس کا خیال کر لینا کہ میں یہ چراؤں، آپ اس میں عملاً کامیاب ہوں یا نہ ہوں، یہ بھی ایک عمل ہے جس کا اس کی ذات پر اثر مرتب ہتا ہے۔ تو یہ انسان کی ذات وہ ہے جس کے اوپر ان تمام اعمال کے نتائج منقوش ہو کر رہتے ہیں، ان کے تمام اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ کچھ اعمال وہ ہیں جن سے اس ذات کی نشوونما ہوتی ہے، انہیں آپ نیک اعمال کہتے ہیں، خیر کہتے ہیں، حسنات کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے وہ اعمال ہیں جس سے یہ کمزور اور مضمحل ہوتی چلی جاتی ہے، وہ شر ہیں، وہ گناہ ہیں، وہ جرائم ہیں۔

انسانی اعمال کا انسانی ذات پر اثر

عزیزانِ من! اس سے بھی اگلی چیز یہ ہے کہ موت سے انسان کا جسم تو یہاں فنا ہو جاتا ہے لیکن یہ "شے" اپنے ان اعمالِ انسانی کے تاثرات کو لیے ہوئے آگے چلی جاتی ہے۔ اسے حیاتِ بعدالممات کہتے ہیں، اسے آخرت کی زندگی کہتے ہیں۔ اور یہ جو اثرات یا نقوش یا نتائج ہیں یہ اس ذات پر مرتب ہوتے ہیں ان کی جگہ یا جسے ہمارے ہاں فضا کہتے ہیں یہ ذات انسانی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ جو نتائج ہیں یا یہ جو اعمال کے اپنے نتائج ہیں، یہ وہاں انسانی ذات پر جا کے مرتب ہوتے ہیں۔ ان نتائج کی آماجگاہ انسانی ذات ہے لہٰذا اب باقی رہی یہ چیز کہ وہ اعمال کس قسم کے ہوتے ہیں جو یا تو اس ذات کی نشوونما کا موجب بنتے ہیں یا اس کے اضمحلال کا موجب بنتے ہیں؟

اب یہاں سے ہمارا ایمان آیا کہ جس میں پہلی چیز یہ ہے کہ یہ اصول اور اقدار انسانوں کے ذہن کے پیدا کردہ نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ Values ہیں' وہ اقدار ہیں' جو وحی کے ذریعے سے انسان کو ملتی ہیں۔ اب یہاں وحی کی ضرورت آئی۔ اور جونہی وحی کی ضرورت آئی خدا پر ایمان کی ضرورت آئی۔ اگر کوئی شخص وحی کو نہیں مانتا تو اس کا خدا پر ایمان کچھ کام نہیں دے سکتا۔

ذاتِ خداوندی پر ایمان کا مفہوم

عزیزانِ من! یورپ کے اکثر Scientists (سائنسدان) خدا کے اُس تصور کو چھوڑ کر' جس کا تصور خدا نے خود قرآن میں پیش کیا ہے' خدا کو مانتے ہیں لیکن یہ خدا کا وہ تصور نہیں جو کائنات کے پیدا کرنے والے' اس کو چلانے والے اور (Purely) انسانی ذات کے لیے راہنمائی دینے والے' وحی والے' خدا کا تصور ہے۔ قرآن اس ایمان کو خدا پر ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ خدا پر ایمان کے معانی یہ ہیں کہ عملاً وحی کو تسلیم کیا جائے۔ اس لیے خدا پر ایمان کے ساتھ رسالت پر ایمان ضروری ہے۔ رسالت پر ایمان لانا مگر وحی پر ایمان نہ لانا تو ایسا ہی ہے جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خدا کو ماننا یا خدا پر ایمان لے آنا بے معنی چیز ہے۔ تو یہاں سے یہ آپ کے ہاں وحی پہ ایمان آ گیا' رسالت پہ ایمان آ گیا اور اس کے معنی ہو گئے ان اقدار پر ایمان جو خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ یہ اقدار غیر متبدل ہیں اور انسانی ذات کی نشو ونما یا اضمحلال کا معیار بنتی ہیں۔ یہ ہے وہ انسانی ذات جو یہاں اس دنیا سے آگے بھی چلتی ہے۔ یہ دوسرا نظریہ حیات ہے۔ سارا قرآن اسی امتیاز اور اسی تفصیل سے بھرا پڑا ہے۔ یہ دین میں بڑی بنیادی چیز ہے۔ دین میں عزیزانِ من! یہ دو نظریاتِ زندگی ہیں' اسی کو آپ کفر اور ایمان کہہ لیجیے۔

سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟

قرآن کہتا یہ ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ سب سے زیادہ نقصان دینے والے اعمال کس کے ہوتے ہیں: **اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا** (18:104)۔ یہ ان لوگوں کے ہوتے ہیں جن کی ساری کوششیں طبعی زندگی کی مفاد کوشیوں میں ضائع ہو جاتی ہیں' جن کا نظریہ حیات یہ ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی طبعی زندگی ہے اور بس۔ یہ وہی نظریہ ہے جو میں نے ابھی عرض کیا۔ کہا کہ وہ اس زندگی کے مقاصد اور مفاد کو حاصل کرنے کے لیے مصروفِ تگ وتاز رہتے ہیں' ان کی ساری کوششیں اسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں۔ یاد رکھیے قرآنِ کریم کی رُو سے دنیاوی مقاصد اور ان کا حاصل کرنا جرم اور گناہ نہیں ہے' یہ نہایت ضروری ہے۔ آپ تو مقاصد کہتے ہیں' جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' وہ تو تسخیرِ کائنات کو آدم کی خصوصیت بتاتا ہے' آدمی کی خصوصیت بتاتا ہے' انہیں کائنات کو مسخر کرنا ہے۔ لہٰذا جب یہ کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی زندگی کا منتہٰی اس دنیا کے مفاد ہی کا حاصل کرنا ہے' اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ترکِ دنیا کرو' راہبوں کی طرح جنگلوں میں چلے جاؤ' مادے سے نفرت کرو' ہر میٹریل شے کو گناہ سمجھو۔ قطعاً نہیں' یہ تو خانقاہیت کی زندگی ہے جس

کے خلاف اسلام اعلانِ جنگ ہے۔ یہ سب کچھ حاصل کرنا ہوگا۔ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ نظریہ حیات یہ ہو کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے' اس نظریۂ حیات کے تابع آپ جو بھی کاروبار کریں گے' منتہٰی آپ دیکھیے کہ کیا ہوگا' بڑے سے بڑے دولت مند کی موت کے بعد دیکھیے کہ ہوتا کیا ہے۔ وہ جو قرآن نے ایک لفظ میں بات کہہ دی ہے: جتنا جی چاہے' یہ حاصل کرتے چلے جاؤ' مرنے کے بعد تم ہمارے پاس فرداً فرداً آ ؤ گے' یہ سارا کچھ جسے تم کہتے ہو ''میرا ہے'' وہ یہاں رہ جائے گا۔ جسم سمیت یہ میرا جسم' میرا بدن' میری جان تک بھی یہاں رہ جائے گا' ہمارے پاس کچھ اور چیز آئے گی اور وہ وہ شے ہوگی جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر نظریہ زندگی یہی ہے کہ یہی زندگی ہے اور موت سے اس کا خاتمہ ہوتا ہے تو موت کے ساتھ اس زندگی کے اندر جتنا کچھ بھی آپ نے کیا ہوا ہے' آپ کے لیے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ مرتے ہیں تو پھر آپ کے لیے یہ ساری دنیا مر جاتی ہے' اس کا کچھ بھی آپ کے لیے باقی نہیں رہتا اور یہ اتنی بدیہی بات ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے کسی دوسری بات کی ضرورت نہیں رہتی ہے (22:46)۔ آپ نے دیکھا کہ ایک لفظ جو قرآن نے کہا: **ضَلَّ سَعۡیُهُمۡ** (18:104)۔ کہ آخر الامر ساری تگ و تاز جو یہ زندگی میں کرتا رہا اور یہ سارا کچھ سمیٹتا رہا' آخر الامر جا کے آپ دیکھیں گے کہ یہ سارے کا سارا بے معنی ہو کے رہ گیا' بے کار ہو کے رہ گیا' ضائع ہو گیا۔ اور اسے کہا: **اَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا** (18:103)۔ یہ سوچو تو سہی جس کاروبار کا مال اور انجام و منتہٰی یہ ہو کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے' اس کے بعد اس سے زیادہ گھاٹے کا سودا' اس سے زیادہ نقصان دہ کاروبار اور کون سا ہو سکتا ہے! آپ نے دیکھا قرآن کا انداز عزیزانِ من! دو لفظوں میں ساری بات سمجھا گیا: **ضَلَّ سَعۡیُهُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا** (18:104)۔ اسی دنیا کی زندگی میں ان کی سعی و عمل ضائع ہو گئی۔ اس نظریے میں آپ دیکھیے۔ کہ سب کچھ اکارت گیا۔

نظریاتی طور پر دو قسم کے گروہ

اب یہاں دو قسم کے گروہ آتے ہیں: ایک تو اُن کا ہے جو بالکل اعلانیہ انکار کرتے ہیں کہ نہیں صاحب! زندگی یہی زندگی ہے' نہ خدا ہے' نہ وحی ہے' نہ رسول ہے' نہ آخرت ہے' کچھ نہیں۔ یہیں پیدا ہوتے ہیں' مر جاتے ہیں اور بس۔ اور دوسرے وہ ہیں جو اس کا تو اقرار کرتے رہتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ وہ مذہب کی کچھ رسومات' کچھ Formalities بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو عملاً ان کا بھی یہی نظریہ ایمان ہوتا ہے جو ان اعلانیہ انکار کرنے والے لوگوں کا ہے۔ ان کے سامنے بھی اسی دنیا ہی کے مفادات ہوتے ہیں' انسانی ذات کے مفاد کا ان کو بھی کوئی خیال نہیں ہوتا۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے اگلے ہی الفاظ میں کہا ہے اور اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ جو اعلانیہ انکار کرنے والے ہیں' وہ تو بہت کم ہوتے ہیں' کبھی کبھار سامنے آتے ہیں اور کھلے بندوں وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں۔ یہ جو نظر بظاہر اقرار کرنے والا گروہ ہے یہ انسانوں کا 99% گروہ ہے جو مذہب کا پابند ہوتا ہے لیکن نظریہ حیات ان کا بھی وہی ہوتا ہے جو اُن اعلانیہ انکار کرنے والوں کا نظریہ حیات ہے۔ آج آپ اپنے معاشرے کے اوپر غور کر کے دیکھیے

ہم میں سے کتنے ہیں جو اعلانیہ یہ چیز کہتے ہیں کہ ہم خدا کو آخرت کی انسانی زندگی کو نہیں مانتے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کل کمیونسٹوں میں سے بھی کچھ ایسے نکل آئیں جن کی بھی یہ کیفیت ہو کہ وہ ابھی عبدالرحمٰن ہی کہلاتے ہوں' ان میں ابھی یہ جرأت نہ پیدا ہوئی ہو کہ وہ تھامس کہلانے لگ جائیں۔ ان میں ابھی یہ جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اعلانیہ یہ کچھ کہیں۔ یہ ابھی پرائیویٹ کمروں میں ہی یہ کچھ کہتے ہیں۔

مذہبی رسوم کے سلسلہ میں مسلمانوں کا ایک گروہ

عزیزانِ من! اگر انہیں چھوڑ دیا جائے تو یہاں باقی سارے مسلمان یہ مانتے ہیں' ان میں وہ بھی ہیں جو مذہبی Formalities مذہبی رسومات' انہیں مذہبی ارکان کہہ لیجئے کے پابند بھی ہیں' نماز روزہ کے بھی پابند ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ جہاں تک عملی زندگی کے پروگرام کا تعلق ہے ان میں اور ان اعلانیہ انکار کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں بھی جائز اور ناجائز کی حد اس امتیاز تک ہی ہوتی ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام۔ لیکن کاروبار کے اندر تو اس کا قطعاً تعلق نہیں ہوتا کہ یہ حرام ہے یا حلال۔ وہ تو کاروبار ہوا اس میں خدا کا اور حلال وحرام کا کیا دخل۔ آپ ان کے ہاں بھی دیکھیں گے کہ مذہبی رسومات کی پابندی کی یہ چیزیں مکینکل رہ جاتی ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جو ایک فریب میں رہتا ہے۔

عزیزانِ من! نسخہ ہائے قرآن کو سامنے رکھیے' الفاظ بڑے غور طلب آئے ہیں: **ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (18:104)۔ اِن کی ساری کوششیں اس دنیا کی زندگی کی مفادکوشیوں میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ہو گیا اسی دنیا کی زندگی اور اسی کے مفادات کا ایک مطمعِ نگاہ' نصب العین حیات۔ یہ اس زندگی کے ماوراء کسی اور زندگی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اب آیا اگلا گروہ۔ اِن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا: **وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا** (18:104)۔ یہ اپنے ہی زعم میں سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی کاریگری سے بنا رہے ہیں وہ بہت اچھا ہے۔ یہ عملاً وہی نظریہ حیات ہے۔

اب میں ایک ایک لفظ پہ آؤں تو بتاؤں کہ قرآن یہ کیا کہہ گیا ہے۔ کہا: **صُنْعًا** (18:104)۔ مصنوعی کا لفظ تو آپ سمجھتے ہیں' آپ مصنوعات بھی جانتے ہیں کہ یہ انسانوں کی بنائی ہوئی کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔ اب مصنوعی کا لفظ تو خیر ہمارے ہاں عام ہو گیا ہوا ہے' اس سے بات سمجھ آئے گی۔ یہ ''صنعًا'' وہ ہے جو مصنوعی طور پر' انہوں نے اپنے لیے یہ نیک کام تصور کر رکھے ہیں' تو گویا مصنوعی نیک کام ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس لفظ صنعًا کے ترجمے کے لیے یہ مصنوعی کی اصطلاح ٹھیک رہے گی۔ یہ مصنوعی کام ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے گمان میں نیک کام کہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس فریب میں رکھتے ہیں۔ **يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا** (18:104)۔ وہ مصنوعی چیزوں کو حسنات سمجھ لیتے ہیں اور اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں' بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ بڑا نیک عمل ہے جی! زاہد ہے' متقی ہے' پرہیزگار ہے اور یہ سب کچھ صنعاً ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ مصنوعی نیکیاں ہوتی ہیں: **يَحْسَبُوْنَ**

اَنَّھُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا (18:104)۔ وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کرتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو یہ چیز ایسی عام اور مشہور ہوگئی ہے کہ یہ نمازی ہیں اور یہ حاجی ہیں اور اِسی طرح کی ان کے متعلق یہ عام باتیں مشہور ہوگئی ہیں کہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں لیکن عملاً یہ حالت ہے کہ جب انہیں نظامِ خداوندی کے قیام کے سلسلہ میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو مخالفین کی طرف سے آئی ہوئی تکلیف کو یوں سمجھتے ہیں گویا وہ خدا کی طرف سے آیا ہوا عذاب ہے۔ چنانچہ ہر جگہ اس کی شکایت کرتے پھرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم اِن لوگوں کے ساتھ شامل ہوکر خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس گئے۔ لیکن اگر تمہیں خدا کی طرف سے فتح و کامرانی حاصل ہو جائے تو سب سے آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ ہم تو جان و دل سے تمہارے ساتھ ہیں (29:10)۔ ان کی حالت اس بیچاری، غریب عورت کی سی ہے جس کے پاس ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی اور وہ جا رہی تھی۔ کسی نے جھپٹا مارا اور گٹھڑی اٹھا کے لے گیا۔ اس غریب اندھی نے آواز دی: ''حاجیا! میری غریب دی گٹھڑی تے دے جا۔ اونوں پچھیا''[1] تو تو اندھی ہے، تجھے کیسے پتہ چل گیا؟ کہنے لگی: اتنا کوئی بے شرم حاجی ہی کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ غریب بڑھیا کی اتنی سی گٹھڑی اور وہ بھی جھپٹا مارا اور لے اڑا۔ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّھُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا (18:104)۔ اپنے گمان میں سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی کاریگری سے بنا رہے ہیں وہ بہت اچھا ہے۔ عزیزانِ من! یہ انتہائی درجہ ہے اور اس میں مذہب پرست طبقہ ہمیشہ فریب میں چلا آتا ہے۔ میں اُن فریب کاروں کی بات نہیں کرتا جو دانستہ فریب دیتے ہیں۔ میں ان کی بات کرتا ہوں: یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّھُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا (18:104)۔ جو اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ یہ جو کچھ مصنوعی نیکیاں ہیں، یہ بڑی حسین ہیں، جاذب ہیں، خوشنما ہیں۔

غلطی کا احساس انسان کی خوش بختی ہے

عزیزانِ من! قرآن نے کئی مقامات پر یہ کہا ہے کہ سب سے زیادہ بدبختی اس کی ہے کہ جس کے غلط کام اس کی نگاہوں میں خوشنما بن کر دکھائی دیں۔ غلطیاں انسان سے ہو جاتی ہیں، ہر ایک سے ہو سکتی ہیں۔ مگر خوش بخت ہے وہ کہ جسے اپنا غلط کام غلط نظر آئے۔ اس غلط کام کرنے والے کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے، وہ اصلاح بھی کر لیتا ہے، بہت کم ہوتے ہیں جو پھر اس غلط کام کے بعد اس پر مصر بھی رہیں لیکن وہ انتہائی شومئی بخت ہے کہ جو غلط کام کرے اور پھر اس فریب میں مبتلا رہے کہ ''میں بہت اچھا کام کر رہا ہوں''۔ اُسے غلط کام خوشنما بن کے دکھائی دیں۔ ایک آیت (35:8) کے اس ترجمہ میں دیکھو کہ حقیقت کیا ہے: اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا (35:8)۔ بتاؤ کہ غلط راستے پر چلنے والے کو محض اس لیے صحیح راستے پر سمجھ لیا جائے کہ اُس کے مفاد پرستانہ جذبات اسے اس کی روش کو نہایت خوش نما بنا کر دکھاتے ہیں اور وہ ان کے فریب میں آ کر یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس کی راہ فی الواقعہ بڑی حسین ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

---

[1] اے حاجی! مجھ غریب کی گٹھڑی تو دے جاؤ۔ اس اندھی غریب عورت سے پوچھا:

صحیح راستے کا معیار یہ نہیں کہ اِس راستے پر چلنے والا‘ اسے اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے۔ صحیح اور غلط راہ‘ ہدایت خداوندی نے متمیز کر کے رکھ دی ہے۔ اس لیے کہا کہ کیا یہ دو برابر ہو جائیں گے: زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8)۔ کہ سوءِ عمل ہو‘ بات تخریبی ہو‘ برائی ہو‘ گناہ کی ہو‘ ناجائز ہو مگر مزین بن کے‘ ایسی خوشنما بن کے‘ اس کے سامنے آئے کہ فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8)۔ وہ اِسے نیکیاں سمجھ رہا ہو۔ یہ وہ فریب ہے جسے نام نہاد خدا پرست اور آج کی نئی اصطلاح میں اسلام پسند‘ مذہب کے اندر فریب خوردہ ذہنیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ زُيِّـنَ لَـهٗ سُوْٓءُ عَـمَـلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8)۔ سوءِ عمل اس کے لیے خوش نما نظر آتے ہیں اس لیے وہ اسے نیکیاں سمجھتا ہے۔ پھر اس قسم کی فریب کاریوں کے لیے‘ دوسری طرف سے اس قسم کے عقائد انہیں دے دیئے جاتے ہیں: سارا سال یہ کچھ کرو‘ جتنا جی چاہے مال جمع کرو‘ سال کے آخر میں اڑھائی فیصد نکال دو باقی شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب ہو جاتا ہے: فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8)۔ کہ ہے تو تخریبی بات مگر وہ اسے حسنات سمجھ رہا ہے یہ سوءِ عمل ہے‘ آج سارا کاروبار اسی طرح ہو رہا ہے۔ یہی کچھ وہ مادہ پرست کرتے ہیں۔ اب آپ نے اصطلاح سمجھ لی کہ مادہ پرست کے معنی کیا ہیں۔ سارے کاروبار اسی طرح سے ہو رہے ہیں کہ ''جی! خدا نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے‘ بیع کو تو نہیں حرام قرار دیا‘ یہ ہمارا کاروبار تو بیع ہے۔'' آپ حیران ہونگے کہ یہ ان کی ٹرم ہے۔ اس دورِ حاضر کی تجارت چوری ہے‘ ڈاکہ ہے یہ کمیونسٹوں‘ جو کھلے بندوں خدا کے منکر ہیں‘ کی اصطلاح میں چوری اور ڈاکہ ہے۔

ربوٰ کی مختلف شکلیں

ہمارے یہاں کا جو خدا پرست ہے‘ وہ کہتا ہے کہ ''نہیں‘ ربوٰ تو حرام ہے مگر جو تجارت ہے وہ تو حلال ہے‘ بیع حلال ہے۔'' مگر یہ سارا کچھ جو تجارت کے نام پہ ہو رہا ہے‘ یہ ساری بلیک میلنگ‘ یہ ساری سمگلنگ‘ یہ آپ کے ہاں سارا کچھ جو تجارت کے نام سے ہوتا ہے‘ کوئی جرم نہیں ہے‘ کیونکہ یہ بیع ہے۔ سوسائٹی کے اخلاقی قانون کی نگاہوں میں اسے جرم قرار دینا الگ بات ہے۔ باقی رہا ربوٰ اسے یہ خدا پرست سمٹا کے صرف اس چیز پہ لے آئے کہ اگر کسی کو نقد روپے دیئے جائیں تو اُن میں اگر آپ اس کے ساتھ سو روپے پہ پانچ روپے اور لے لیں تو یہ ربوٰ ہے صاحب اور باقی یہ سارا کچھ‘ جو یہ کسی کو روپیہ دے کر خود گھر میں بیٹھے رہیں Sleeping Partner رہیں اور اس کی ساری منفعت میں حصہ دار ہوتے چلے جائیں تو یہ ربوٰ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! حقیقت یہ ہے کہ ابلیس نے جو عام انسانوں کے متعلق خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی کا اتباع نہیں کریں گے بلکہ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلا کریں گے (15:38-41)۔ تو آج کی اس قسم کی قوموں نے اس ابلیس کو بتا دیا ہے کہ وہ اپنے اس خیال میں سچا تھا۔ یعنی ان لوگوں نے اپنی روش (Coduct) سے ابلیس کے خیال کو سچ کر دکھایا ہے (34:20)۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا فَـاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ (35:8)۔ اس آیت میں یہاں ضَل آیا ہے یعنی یہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہمیشہ

گمراہی کے اندر رہنے والے۔ اس لیے رسول اللہ سے کہا گیا: فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَيۡهِمۡ حَسَرٰتٍ (35:8)۔ تو اے رسول! اِن لوگوں کی خاطر اپنی جان کیوں گھلاتے ہو جو غلط راستے پہ چل کر اپنے لیے تباہیاں مول لیتے ہیں۔ اس لیے تو ان کو دیکھ کے خوامخواہ اپنی جان نہ گھلاتا پھر' ان کا راہِ راست پہ آنا قریب قریب ناممکنات میں سے ہے۔ جو اپنی برائی کو برائی نہیں سمجھتا' اسے نیکی سمجھتا ہے' اس کی نگاہوں میں وہ فَرَاٰهُ حَسَنًا مزین بن گئی۔ وہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہمیشہ گمراہی میں رہتا ہے۔

جب کوئی برائی حسنات دکھائی دینے لگ جائے تو انسان فریب نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے

عزیزِ من! یہ فَرَاٰهُ حَسَنًا (35:8)۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔ وہ اسے دیکھتا ہی نیکی ہے' اسے سمجھتا ہی نیکی ہے' وہ اسے نظر ہی نیکی آتی ہے۔ کہا: تو ان کے پیچھے کیوں جان گھلا رہا ہے۔ برائی کو برائی سمجھنے والے کو اگر یہ بات بتا دی جائے کہ دیکھو' اس سے کس قدر نقصان ہے' وہ اِسے آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ مگر جسے برائی نیکی' حسنات نظر آئے تو یہ سب سے بڑا فریب ہے۔ یہ جو ہم مذہبی رسوموں اور کام کو مکینکل ادا کرنے کے بعد مطمئن ہو کے رہ جاتے ہیں' بیٹھ جاتے ہیں کہ یہ نیکیاں ہیں جنہیں ہم نے ادا کر لیا ہے' یہ سب سے بڑا فریبِ نفس ہے۔ یہ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ ۢ بِمَا يَصۡنَعُوۡنَ (35:8)۔ اللہ ان کے ساختہ پرداختہ (یصنعون) سے خوب واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسے جسے قرآن نے صنعًا کہا ہے یعنی یہ مصنوعی قسم کی نیکیاں ہیں۔

قرآن کی ایک اور آیت سامنے لائیے۔ یہاں بات صلوٰۃ کی آ گئی۔ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (29:45) اے رسول! اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو یہ قوانین تمہاری طرف وحی کیے جاتے ہیں' انہیں دوسروں کے سامنے پیش کرو یا ان کی پیروی کرو۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں کیونکہ تلاوت کے معنی پیروی کرنا بھی ہوتے ہیں' اس لیے ان کی پیروی کرو۔ آگے ہے وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (29:45)۔ اس آیت میں صلوٰۃ کا ہمارے ہاں جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے' وہ ہے نماز پڑھو۔ میں ابھی زیادہ تشریح میں نہیں جاتا۔ میں یہ عرض کیے دیتا ہوں اور میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ' اس نظامِ صلوٰۃ کا ایک نہایت ضروری حصہ ہیں' لیکن سوال یہ کہتے ہیں کہ کیا واقعی اس کے او پر صحیح عمل ہو رہا ہے؟ اگر یہ بتا دیا جائے کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو پھر انسان فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بتا دیا جائے کہ آگ پہ رکھنے سے پانی کھولے گا تو اس کے بعد یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ آگ پر پانی رکھ دیں اور وہ کھولے نہیں اور آپ کہیں کہ آگ جل رہی ہے۔ جب یہ بتا دیا جائے کہ آگ وہ ہو گی کہ جس پہ رکھنے سے پانی کھولے گا تو آپ دیکھ لیں کہ ''دو چار منٹ کے اندر'' یہ آگ ہے یا نہیں۔ اسے حکمت (Why of it) کہتے ہیں' یعنی احکام کے نتائج بھی بتا دینا کہ یہ ہو گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ صحیح نتیجہ نکلتا ہے تو وہ کام حسن ہے' نیکی ہے' خدا کی مشیت کے مطابق ہے' احکام کی صحیح تعمیل ہے' اور اگر وہ صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو اس پر عمل کیے جانا فریبِ نفس ہے۔ تو جو اپنے آپ کو' اپنے ذہن کو' فریب میں رکھ رہے ہیں' آپ دیکھیے کہ اسے قرآن نے

کیا کہا ہے۔ کہا ہے کہ وہ مصنوعی ہے۔ یہاں اقم الصلوٰۃ کا حکم آ گیا۔ یہ جو کچھ بھی ہے اس کی حکمت ونتیجہ یہ ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (29:45)۔ یہ نظام لوگوں کو ان کی اِس روش سے یقیناً روک دے گا جس کی رو سے ہر فرد سب کچھ اپنے لیے سمیٹنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور دوسروں کی پرورش کا خیال کسی کو نہیں آتا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے عقل خود بیں کی فریب کاریاں انہیں عجیب عجیب طریقے سمجھاتی رہتی ہیں (70:21-27)۔

صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ ہے وہ صلوٰۃ جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اسے قائم کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ ہر قسم کے فحشا اور منکر سے معاشرے کو روک دے گی' اس معاشرے کے اندر ہر قسم کے فحشا اور منکر ختم ہو جائیں گے۔ اگر فحشا اور منکر کا عام ترجمہ بے حیائیاں اور برائیاں بھی لے لیجیے تو ٹھیک ہے یہ جامع بات ہے۔ عقلِ فریب کار کی فسوں سازیاں اور بخل Greediness بھی لے لیجیے۔ یہ بھی ان الفاظ کا عربی زبان کی رو سے ترجمہ ہوسکتا ہے۔ تو بہرحال یہ جتنی چیزیں بھی ہیں جنہیں آپ برائیاں کہتے ہیں' بداخلاقیاں کہتے ہیں' کہا کہ جو صلوٰۃ ہے' وہ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ (29:45)۔ ان سب چیزوں کو بند کر دے گی' روک دے گی۔ معاشرے میں یہ چیزیں باقی نہیں رہیں گی۔ یہ صلوٰۃ کا نتیجہ ہوگا۔ یہاں بات صاف ہوگئی۔ یہ کیسے ہوگا؟ کہا: وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ (29:45)۔ یہ اس صورت میں ہو سکے گا کہ قانونِ خداوندی کی بالادستی ہو۔ یہ قیامِ صلوٰۃ جسے کہا گیا ہے' وہ اس نظام کا نام ہے جس میں "ذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ" ہو (29:45)۔ یہ نظام اُسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے کہ انسانی معاشرہ میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کے قانون کو حاصل ہو۔

اذان میں اللہ اکبر کے الفاظ' کوئی رسم نہیں

یہ جو آپ کو اذان کے لیے اللہ اکبر کہہ کے آواز دی جاتی ہے یہ یونہی کوئی ایک رسم نہیں ہے کہ کہہ دیا: وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ (29:45)۔ یہ اس بات کی آواز ہوتی ہے کہ یہ سارا نظام ہی اس کے لیے تھا کہ جو اللہ کا قانون ہے' انسانی زندگی کے اندر اس کی کبریائی مسلط ہو جائے' Sovereignty اُسے حاصل ہو' اقتدارِ اعلیٰ اُسے حاصل ہو' دنیا میں اکبر یہ ہو' کبریائی اسے حاصل ہو۔ یہ تھا وہ نظام جسے قائم کرنے کے لیے کہا۔ اس نظام میں یہ کہا کہ یہ جو اجتماعات ہونگے یا یہ جو نظام ہوگا' اس کے قیام (Establishment) سے معاشرے میں سب بے حیائیاں' بداخلاقیاں' برائیاں ختم ہو جائیں گی' یہ کچھ باقی نہیں رہیں گی۔ یہ تو وہ کہا اور اس کے بعد کہا کہ اب ذرا مذہب پرست طبقہ کی طرف' ہماری موجودہ زندگی کی طرف' آؤ کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

صنعاً کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! دیکھیے کہ اب آگے قرآنِ کریم کی یہ آیت ہے: وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ (29:45)۔ یہاں یہ "تصنعون"

وہی آ گیا جو پہلے میں نے لفظ صنعًا کہا تھا: مصنوعی۔ جو کچھ تم مصنوعی طور پر کر لو گے ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا ہو گا۔ **مَا تَصْنَعُوْنَ** یعنی جو کچھ تم مصنوعی طور پر کرتے ہو۔ تو گویا کوئی نظام' کوئی صلوٰۃ' کوئی حج' کوئی زکوٰۃ کہ جس کا نتیجہ یہ نہ نکل رہا ہو کہ جو معاشرے سے فحش و منکرات کو ختم کر دے' وہ قرآن کے یا خدا کے بتائے ہوئے حکم کی تعمیل نہیں ہے۔ لہٰذا جان لو کہ وہ تمہاری مصنوعی چیزیں ہیں جو تم کر رہے ہو۔ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ** (29:45)۔ اور اللہ جانتا ہے کہ وہ تمہاری مصنوعی چیزیں ہیں۔ وہ تمہارا خود ساختہ نظام ہے' وہ تمہارے خود ساختہ قوانین ہیں۔ عزیزانِ من! دیکھتے ہیں کہ کس مقام پر یہ لفظ آیا ہے۔ یہ جو آپ آج کل دیکھتے ہیں' اسے تو چھوڑ دیجئے' پہلے اس طبقہ کو چھوڑ دیجیے جو اسے مانتا ہی نہیں' اس طبقہ کو بھی چھوڑ دیجیے جو مانتا ہے لیکن وہ یہ کچھ کرتا نہیں' یعنی نماز نہیں پڑھتے' روزہ نہیں رکھتے۔ آپ انہیں بھی چھوڑ دیجیے۔ اس طبقے کو لے لیجیے' جو بڑی شدت سے اس پر پابند ہے۔ کیا اس طبقے کے اندر یہ کیفیت ہے کہ ان کے ہاں فحشا اور منکرات ختم ہو چکی ہیں؟ کیا اس طبقے میں یہ جو خدا کا قانون ہے' اس کو بالادستی حاصل ہوتی ہے؟ کہیں' ان کے ہاں بھی یہ کچھ تو نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ طبقہ اور وہ دوسرا طبقہ دونوں اس لحاظ سے یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جو طبقہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے اس کے ہاں فحشا اور منکرات ختم نہیں ہوئے۔ قرآن کریم کے مطابق انہوں نے اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہی ہے **مَا تَصْنَعُوْنَ** (29:45)۔ انہوں نے ان حرکات و سکنات و عرفان سے' جو وہ مکینیکلی' عادتاً کہہ لیجیے' رسماً کہہ لیجیے' مکینیکلی پرفارم کرتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں قرآن کہتا ہے کہ **فَرَاٰهُ حَسَنًا** (35:8)۔ ان کو وہ چیزیں بڑی حسین اور دلکش نظر آتی ہیں۔ پھر کہا: **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ** تمہارے خود ساختہ نظام اور قوانین کیا کرتے ہیں' خدا کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ اللہ اکبر۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔

قرآن فریب نفس کا پردہ چاک کر دیتا ہے

اب آپ نے یہ سمجھا کہ یہ لوگ کیوں قرآن کی آواز کو بلند نہیں ہونے دیتے۔ یہ اس فریبِ نفس کا پردہ چاک کر کے رکھ دیتا ہے' کسی کو مبتلائے فریب نہیں رہنے دیتا' وہ حقیقی میں اور مصنوعی میں فرق بتا دیتا ہے۔ حقیقی وہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ **تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** (29:45)۔ فحشا اور منکر سے رکنا تھا' مصنوعی وہ ہے کہ جس میں یہ سب کچھ کرتے چلے جایئے ان کے فساد اور زیادہ ہوتے چلے جائیں گے۔ تو یہ "**ذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ**" ہوا۔ اب یہ جو مصنوعی چیزیں ہیں وہ دیکھ لیجیے۔ میں نے عرض کیا ہے نماز کی ادائیگی کی صورت میں ایک نماز پڑھنے والے سے کہا جاتا ہے کہ "اوئے نکے پڑھ تیری نماز نئیں ہوئی ہالی"[1] میرے عزیز ترین دوست بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ کہا کرتے ہیں: چلے جاؤ تیری مت ماری گئی' پتلون ایسی' گٹے ٹکے ہوئے سن' کھلو گئے جماعت

---

[1] اومنے! پھر نماز پڑھ۔ ابھی تمہاری نماز نہیں ہوئی۔

اچ' نال جیہڑا کھلوتا ہویا ہیگا سی' جناں تیر تکر تے اوکھڑا رہیا اونی تیر تے نگاہ نہیں گئی' جس ویلے رکوع اچ گیا ہے ناں کہ بجائے اس دے کہ ہور اللہ ول تیان جاندا' تیان چلیا گیا اوہدی پتلون ول' اونے کیا اے بھئی! ہن کھلوتیاں اویاں بڑا مشکل ہوجائے گا وہ جو آواز آتی ہے ناں تیری نماز نہیں ہوئی۔''❶ ان کے ہاں ہوتا یہ ہے کہ رکوع میں تو اتنا نہیں جھکا' تیرے ہاتھ اللہ اکبر کہتے ہوئے یہاں تک نہیں پہنچے تو نے ہاتھ وہاں نہیں باندھے' سجدے میں ان کی یہ پانچ شرطیں ہوتی ہیں کہ سر اس طرح زمین پہ لگنا چاہیے یہ نہیں ہوا' میں اتنا وقت نہیں بیٹھا' اس لیے نماز نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس سمجھ لیا ہے کہ وہ ٹخنے ننگے تھے اس کے ہاں یہ سارا کچھ جو ہو گیا تو اس کی نماز ہو گئی الحمدللہ' اور اگر اس میں کچھ فرق رہ گیا ہے' یعنی پتلون ذرا نیچے چلی گئی ہے تو تیری نماز نہیں ہوئی۔ اس **تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** کے اعتبار سے ان دونوں کی نمازوں میں کیا فرق ہے۔

لاؤڈ سپیکر پر اللہ کا ذکر

یہ آپ سوچیے کہ نماز میں تو یہ سب کچھ ہے۔ اب رہ گیا ذکر اللہ اکبر (29:45)۔ اللہ کا ذکر بہت بلند ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ ذکر پہلے تو خفی ہوتا تھا کیونکہ لاؤڈ سپیکر نہیں ہوتے تھے' اب وہ جلی ہو گیا ہے کیونکہ چار چار لاؤڈ سپیکر پر ہے اور پھر اس کے بعد ضربیں لگتی ہیں۔ یہ ذکر اللہ جس طرح سے ہوتا ہے یہ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ** (29:45)۔ نہیں ہے تو اور کیا ہے! عزیزانِ من! یہ صلوٰۃ' یہ ذکر' یہ **تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ**۔ اب یہ سوال ہی نہیں ہے کہ قرآن تو اس کو کہتا تھا۔ یہ کچھ اب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ جو قرآن نے بات کہی تھی کہ **وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا** (18:104)۔ وہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی کاریگری سے بنا رہے ہیں' وہ بہت اچھا ہے۔ یہ درحقیقت ایک فریب میں مبتلا رہتے ہیں' یہ سب کچھ مصنوعی طور پر کرتے ہیں اور فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ یہ حقیقت ہو رہی ہے۔

اللہ اکبر کا معنی خدا کے قانون کی بالادستی ہے

عزیزانِ من! جو کچھ یہ کرنا ہے' اسے مذہب کہتے ہیں۔ دین اسے کہتے ہیں کہ جس میں یہ ارکان **یصنعون** یا مصنوعی نہیں ہوتے بلکہ حقیقی صلوٰۃ ہوتی ہے کہ جس کا عملاً نتیجہ معاشرے میں یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے فحشا اور منکر ختم ہو جاتے ہیں۔ حقیقی ذکر ہوتا ہے کہ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بالادستی Sovereignty صرف قانونِ خداوندی کو حاصل ہوتی ہے' کسی دوسرے قانون کو نہیں ہوتی۔ یہ وہ ہوتی

---

❶ تمہاری عقل کا ماتم ہے کہ ایسی پتلون پہنی ہے جس میں تمہارے ٹخنے چھپے ہوئے تھے' تم جماعت کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اس کے ساتھ جو کھڑا تھا جب تک وہ کھڑا رہا اُس وقت تک تو اس کی نگاہ نہیں گئی۔ جب وہ رکوع گیا تو بجائے اس کے کہ اس کی توجہ خدا کی طرف ہوتی اس کی توجہ اس کی پتلون پر چلی گئی۔ اس نے کہا: اے بھائی! اب کھڑے رہنا مشکل ہو جائے گا۔ تو آواز آئی کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔

ہے کہ جسے حقیقی نیکی آپ کہتے ہیں اور اگر صورت یہ ہو کہ آپ اس کے پیکر' اس کی شکلیں' باقی رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ' اس کا جو مقصد ہے وہ آپ کے ذہن میں نہیں رہتا ہے' یہ سارا کچھ ماتصنعون کے اندر آ جاتا ہے عزیزانِ من!

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل ' وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

یہاں' اس دنیاوی زندگی میں بے شمار پسندیدہ اور خوش نما چیزیں ہیں جو انسان کے لیے وجہِ جاذبیت ہیں۔ مثلاً بیوی بچوں کی محبت' چاندی' سونے (مال و دولت) کے ذخیرے' چنے ہوئے عمدہ گھوڑے' مال' مویشی' کھیتی باڑی وغیرہ۔ انسان ان کی طرف کھنچتا ہے۔ یہ بری بات نہیں۔ لیکن انہی چیزوں کو مقصودِ حیات اور منتہائے زندگی سمجھ لینا غلط ہے۔ یہ صرف انسان کی طبعی زندگی کا ساز و سامان ہے۔ جو لوگ انہی کو مقصود حیات سمجھ لیتے ہیں وہ کسی بڑی قدر اور اصول کی خاطر جان دینا تو ایک طرف' ذرا سی تکلیف گوارا کرنا بھی پسند نہیں کرتے (3:13)۔

اس آیت کے اندر تو وہ مادہ پرست' خدا کا منکر' وحی کا نہ ماننے والا اور یہ سب' یکساں ہیں عزیزانِ من!

خرد نے کہہ بھی دیا 'لا الہٰ' تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104)۔ وہ اپنے گمان میں سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنی صنعاً سے' کاریگری سے' بنا رہے ہیں' وہ بہت اچھا ہے۔ وہ اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنی مصنوعی نیکیوں کے متعلق سمجھ لیتے ہیں کہ ہاں ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں' ہم بڑی نیکیوں کا کام کر رہے ہیں۔ کہا: **قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً** (18:103)۔ اِن باطل کے نظام پر جمع ہونے والوں سے کہو کہ کیا ہم بتائیں کہ وہ کون ہیں جو اپنی سعی و عمل میں سخت نقصان میں رہتے ہیں؟ آ ؤ تمہیں بتائیں کہ وہ کون ہے جن کے اعمال ان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اللہ اکبر! کہا: اعمال کے اعتبار سے نقصان!

اس کے باوجود ہماری سوچ آج بھی یہی ہے

عزیزانِ من! یہ امت آج بھی بیچاری حامل دین نہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو ظلم اور ناانصافی سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں۔ اُن کے

متعلق یوں سمجھو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں جس سے ان کے جذبات حرص وہوس اور بھڑک اٹھتے ہیں۔ اُن کی نیت نہیں بھرتی اور وہ ناجائز دولت کے پیچھے مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اس سے اُن کی صلاحیتیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں (4:10)۔ ان کے سال بھر کی محنت اور مشقت اور جو کچھ وہ خدا کے نام پر یا نیکیوں کی خاطر خرچ کرتے ہیں اس کو ذرا ایک جگہ اکٹھا کر کے دیکھیے' دنیا کا کوئی پراجیکٹ اتنا کچھ نہیں کراتا جتنا یہ کرتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دن بدن ہر قسم کی ذلت وخواریوں کے اندر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا ہوا؟ یہ ہوا یہ کہ یہ جو "ما یصنعون" تھا اسے حقیقت سمجھ کے زیادہ سے زیادہ شدید ہوتے چلے گئے۔ جب اِن ذلت خواریوں اور تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر آتا ہے تو اب بھی اس منبر سے یہی آواز گونجتی ہے کہ یہ سب اس لیے ہے کہ انہوں نے نمازیں چھوڑ دیں' روزے چھوڑ دیئے یہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو اِن ارکان کو کرنے والے ہیں انہوں نے کیا کر کے دکھا دیا۔ کہا: **اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ** (18:105)۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے انکار کرتے ہیں اور سرکشی برتتے ہیں۔ عزیزانِ من! سوچیے' قرآن کہاں کفر کا لفظ لا رہا ہے' یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قانونِ خداوندی کا درحقیقت عملاً انکار کیا ہے۔ دیکھا کفر کا لفظ کہاں آیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ سارا کچھ کیوں کہاں ہے؟ کہا:

لقا کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! **اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ** (18:105)۔ کے بعد **وَلِقَآئِہٖ** اگلا لفظ ہے۔ ان کے دل میں یہ ایمان نہیں ہے کہ قوانین خداوندی سے انکار کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ ان کے ہاں وہی انسانی ذات کا اِنکار ہے۔ لقاءَ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا سے' اس کی ملاقات کا' انکار کرتے ہیں۔ ملاقات کے لفظ سے ذہن تو کسی اور طرف چلا جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں قیامت کا' حشر کا تصور دیا جاتا ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ عدل کرنے کے لیے تخت پر بیٹھے ہوں گے۔ یہ سچ مچ یوں بیٹھے ہوئے ہونگے' ساری دنیا وہاں جا کے اکٹھی ہوگی' پھر اس کے سامنے پیش ہونگے' وہ وہاں پھر یہ حکم دے گا کہ اس کو جہنم میں لے جاؤ' اس کو جنت میں لے جاؤ۔ پھر بتاتے ہیں کہ یہ سارا کچھ ہونے کے بعد عدالت برخاست ہو جائے گی۔ جیسے وہ اللہ میاں اپنے گھر چلا جائے گا' یہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے تو میدان خالی کا خالی رہ جائے گا' سمجھانے کے لیے کچھ ایسا تصور دیتے ہیں' بات یہ نہیں ہے۔ یہ جو **لقائہ** ہے' یہ ہمارے ہاں کی ایک اصطلاح ہے: جیسے آپ کہتے ہیں کہ ''حاضرِ عدالت ہو'' بڑی سیدھی اصطلاح ہے۔ وہ اس جج کے سامنے کرسی پہ بیٹھا ہے' اس کے سامنے پیش ہو جانے کے معنی نہیں ہوتے' بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اپنے مقدمہ کے فیصلہ کے لیے جو نظام مقرر ہے' تم اس کی اطاعت کرو۔ یہ جو قرآن نے خدا کے متعلق لقاء رب (6:54;13:2;18:110;30:8;32:10) کہا ہے اِس کے معنی قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کے ہیں۔ یہ عدالتِ خداوندی میں ضرور حاضر ہونا ہے' مجرم بھاگا ہوا ہو' مفرور ہو' کتنا ہی اشتہاری کیوں نہ ہو' وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت

قرآن کہتا ہے تم کہیں چلے جاؤ، تمہیں اس عدالت خداوندی میں ایک دن ضرور حاضر ہونا ہے۔ تمہیں ہمارے سامنے ضرور آنا ہے تم قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ اس لیے کہ اسے تم مانو یا نہ مانو ہمارا یہ قانونِ مکافاتِ عمل اپنا اثر کیے چلا جا رہا ہے، وہ قانون انسانی ذات پر اثر مرتب کیے چلا جا رہا ہے۔ یہ اثرات تو تمہارے سارے اعمال کے ہوتے ہیں خواہ وہ ارادہ ہی کی صورت میں بھی کیوں نہ اور خواہ اس میں تمہاری معیت بھی کیوں نہ ہو۔ یہ سب کچھ، تمہارے اعمال، تمہارے ارادے، خواہ وہ تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات ہوں یا نگاہ کی خیانت ہو، وہ اس قانون کے دائرے سے باہر نہیں رہیں گے۔ ان کے نتائج مرتب ہو کے رہیں گے۔ لقاء کے یہ معانی ہوتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ جو لوگ ہیں یہ سارا کچھ کرتے ہیں لیکن اگر ذرا کرید کے دیکھیے تو نیچے یہ بات نظر آ جائے گی کہ ان کا اِس بات پہ یقین نہیں ہوتا کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ان کا نتیجہ مرتب ہونا ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ وہی جسے حیات الدنیا کہا ہے، وہ نظریۂ زندگی یہ ہے کہ وہ لقاءرب پہ ایمان نہیں رکھتے، ان کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان باقی نہیں رہتا۔ بس اب اس میں دو گروہ ہو گئے: ایک تو وہ جو اعلانیہ یہ کچھ کہنے والے ہیں اور دوسرے وہ جو اس فریبِ نفس میں مبتلا رہنے والے ہیں۔ جہاں تک منتہٰی کا تعلق ہوتا ہے، نتائج کا تعلق ہے، یہ دونوں ہی یکساں ہوتے ہیں: **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105)۔ ان کی تمام تگ و تاز، سعی و عمل، رائگاں چلی جاتی ہے۔ یہ وہی ہے جو پہلے بھی آیا تھا کہ **اَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً** (18:103)۔ ان کے اعمال انتہائی خسارے میں ہیں یعنی کام تو ہو رہا ہے، لیکن اس کام کا نتیجہ **حبطت** ہے یعنی وہ کام رائیگاں چلے جانے والے ہیں۔

یہاں بھی قرآن نے یہ بات بڑی عجیب کہی ہے۔ یہ جو حبطت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں یہ ایک مویشیوں کو بیماری ہو جاتی ہے، یہ انسانوں کو بھی ہوتی ہے جس میں غذا جزوِ بدن نہیں بنتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ نشو و نما اس غذا سے ہوتی ہے جو انسان کھائے اور پھر وہ غذا جزوِ بدن بنے۔ لیکن ایک ایسی بیماری ہے، جو انسانوں میں بھی ہوتی ہے، جس میں کہتے یہ ہیں کہ صاحب! وہ جو غیر ہضم شدہ غذا ہے، وہ اسی طرح سے باہر نکل جاتی ہے، مویشیوں کی صورت میں تو یہ غذا ان کے گوبر وغیرہ میں پورے کے پورے دانے نظر آ جاتے ہیں جو نکل جاتے ہیں، یعنی وہ غذا جسم کا جزو نہیں بنتی۔ لیکن اس سے ایک اپھارہ (Distention of the Stomach) ہو جاتا ہے۔ اگر اپھارہ والا جانور کہیں قریب نہ ہو، آپ کو معلوم نہ ہو کہ اسے اپھارہ ہے، تو دور سے وہ جانور یوں نظر آئے گا کہ ''گاما پہلوان بن گیا اے۔''[1] یہ کیا بات ہے؟ یہ جو کیفیت ہوتی ہے، کہ جس میں وہ غذا جزوِ بدن نہ بنے، یعنی اعمال نتائج تو نہ پیدا کریں لیکن وہ نظر ایسے آئیں کہ جیسے ''بڑا

---

[1] یہ گاما پہلوان بنا ہوا ہے۔ یعنی یہ جانور خاصا موٹا ہو گیا ہے۔

موٹا ہوندا تریا جاندا پیا اے"[2] وہ عرب اسے "حبطت عمل" کہا کرتے تھے۔ یہ قوم بڑی بلا تھی۔ قرآن کہتا ہے: **فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105)۔ ان کے اعمال سے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو ان کے پیشِ نظر ہیں۔ اس طرح وہ مالک اس فریب میں مبتلا ہوتا ہے کہ جانور موٹا ہو رہا ہے حالانکہ اُسے اپھارہ ہوتا ہے وہ جتنا دانہ کھلاتا ہے' وہ ویسے کا ویسا ہی باہر چلا جاتا ہے' وہ جزوِ بدن نہیں بنتا۔ اِسی طرح کے یہ مصنوعی اعمال ہیں۔ اِن مصنوعی اعمال کی نیکیوں کی کیفیت یہ ہے عزیزانِ من! کہ یہ نیکیاں جزوِ بدن نہیں بنتیں' یہ کچھ کرنے والے کو فریب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ اس لیے کہا: **وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105)۔ ان کی تگ و تاز رائیگاں چلی گئی' ان کے اعمال سے وہ نتائج مرتب نہ ہوئے جو ان کے پیشِ نظر تھے۔

ترازو بھی کھڑا نہیں کیا جائے گا

عزیزانِ من! ایسے لوگوں کے لیے قرآن نے کہا: **فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا** (18:105)۔ کہ ظہورِ نتائج کے وقت اِن کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے میزان تک نہیں کھڑی کی جاتی۔ یہ تو ایسی دبی ہوئی نقصان کی چیز اور گھاٹے کا سودا ہے کہ اس کے لیے کسی کھاتے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی' حساب کتاب کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ان کے لیے تو وہ ترازو اور میزان بھی کھڑا نہیں کیا جائے گا' جس میں ان کے اعمال تولے جائیں۔ ان اعمال کی تولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی' کیا بات ہے! یہ بات تو ڈاکٹر پوچھے کہ بھئی! تم کس قسم کی غذا کھاتے ہو؟ وہ تو اس غذا کے متعلق پوچھے گا جو غذا اس کے جسم پہ اثر کر رہی ہو۔ وہ اسی غذا کے متعلق کہے گا کہ اِسے نہ کھاؤ' اس غذا کو زیادہ کردو۔ تو عزیزانِ من! جس غذا کی صورت یہ ہے کہ ادھر سے کھائی اور ادھر اسی طرح سے چلی گئی تو پھر جیسی بھی کھاؤ اس منع کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے تو وہاں کہا ہے کہ ہم "موازین" (21:47) کھڑی کریں گے۔ **وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ** (21:47) ہم ظہورِ نتائج کے وقت عدل کی میزانیں کھڑی کردیں گے۔ اور اس طرح **فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ** (99:7-8)۔ جو ذرہ برابر بھی قانونِ خداوندی کا اتباع کرے گا' اس کے حسنِ عمل کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا اور جو ذراہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا' اس کی سزا پائے گا۔ اِس طرح عمل کا جو ذرہ ذرہ ہے وہ سامنے آئے گا۔ یہاں ان کے لیے یہ کہا جارہا ہے کہ تمہارا مطمعِ نگاہ تو تمہاری زندگی کے مفادات تھے۔ تم نے ان کے لیے تگ و تاز کی۔ ہم نے تم پہ کوئی زیادتی و ظلم نہیں کیا۔ تم نے اس کے نتائج پالیے۔ اب کیا مانگتے ہو؟ یہ ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ یہ لوگ یہاں کی زندگی کے مفادات چاہتے تھے' ان کے لیے کام کیا' وہ مفادات انہیں یہاں مل گئے۔ یعنی جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ جب جسونت سنگھ بھی ہل چلاتا ہے اور عبدالرحمٰن بھی ہل چلاتا ہے' تو ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ جسونت

---

[2] یہ بڑا موٹا ہوتا چلا جارہا ہے۔

سنگھ تو ہمیں مانتا نہیں ہے یہ سنگھ ہے' یہ جٹ ہے' اس واسطے اس کی زمین میں جو بویا ہے وہ جھاڑ و ہو جائے' اس کے خوشے میں دانہ ہی نہ پڑے' سبحان اللہ ٹھیک ہے جی! لیکن خدا کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہاں تو صورت یہ ہے کہ اگر جسونت سنگھ اور عبدالرحمٰن نے صحیح زراعت کے طریقے سے' قوانین فطرت کے مطابق' اپنی کھیتی کی تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کی کھیتی میں دانے نہ پڑیں اور اگر دونوں نے یا دونوں میں سے کسی ایک نے زراعت کے اصولوں کے مطابق کام نہ کیا تو انہیں یا اسے کاشت کے وقت کچھ حاصل نہ ہو گا۔

عزیزانِ من! اسی لیے قرآنِ کریم نے برملا کہا کہ جو ایمان کی بنیاد کو نہیں مانتے' وہ یہ لوگ ہیں جو اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین زندگی سے عملی طور پر انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں' اور اس کا یقین ہی نہیں رکھتے کہ انہیں اُس کے قانون مکافات کا سامنا کرنا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی غلط روش سے کامیاب زندگی بسر کر لیں گے۔ ان کا یہ خیال خام ہے۔ ان کی تمام تگ وتاز رائیگاں جائے گی۔ یعنی ان کے اعمال سے وہ نتائج کبھی مرتب نہیں ہوں گے جو ان کے پیش نظر ہیں۔ حتیٰ کہ ظہور نتائج کے وقت ان کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے میزان تک نہیں کھڑی کی جائے گی اور وہ اپنے بے مائیگی کی شہادت آپ ہوں گے۔ اس طرح **ذٰلِکَ جَزَآؤُھُمْ جَھَنَّمُ بِمَا کَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَرُسُلِیْ ھُزُوًا** (18:106)۔ یہ ہو گا تباہیوں کا وہ جہنم جو ان کے سامنے نمودار ہو جائے گا۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ ہمارے قوانین سے انکار کرتے تھے...... انکار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ان قوانین کی' اور ان کے پیش کرنے والوں کی' ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ زندگی کے عمل کو کبھی بھی Seriously نہیں لیتے تھے۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ الکھف کی آیت 106 تک ہی آ سکے۔ اگلی آیت نمبر 107 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ ط

❀......❀......❀......❀

آٹھواں باب: **سورۃ الکھف** (آیات 107 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا
حِوَلًا ﴿١٠٨﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ
مَدَدًا ﴿١٠٩﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ
عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

اعمال کے بے وزن ہونے کی وجہِ جواز

عزیزانِ من! آج دسمبر 1975 کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الکھف کی آیت 107 سے ہو رہا ہے: (18:107)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں ان لوگوں کا ذکر تھا جن کے اعمال رائیگاں چلے جاتے ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ ہیں جنہوں نے بہت کچھ کیا ہوتا ہے لیکن جو کچھ کیا ہوتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے منشاء کے مطابق نہیں ہوتا۔ وہ اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بہت اچھے کام کر رہے ہیں، نیکیوں کے کام کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق ایک ہی لفظ "**مَا تَصْنَعُوْنَ**" میں اس نے یہ کہا تھا کہ **وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ** (29:45)۔ یہ جو تمہاری مصنوعی نیکیاں ہیں، ہم انہیں خوب جانتے ہیں کہ ان کا کتنا وزن ہوگا۔ یہ جتنی چیزیں وہ کرتے ہیں اس کے لیے اگر سمجھنا ہو تو آپ مذہب کی دنیا پہ نگاہ ڈالیے۔ مذہب پرست طبقہ میں ایک فرد سال بھر میں جتنی مشقت اٹھاتا ہے وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتا ہے کہ میں واقعی منشاء خداوندی کے مطابق یہ کچھ کر رہا ہوں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ اس ایک ایک شق پہ غور کیجیے کتنی مشقت طلب چیزیں ہیں، کس قدر محنت کی جاتی ہے، وقت اور توانائی اور دولت بھی کتنی صرف کی جاتی ہے۔ انہیں چھوڑ دیجیے کہ جو یہ کچھ محض دکھاوے کی خاطر کرتے ہیں، متقی پرہیزگار بننے کی خاطر کرتے ہیں۔ انہیں دیکھیے جو نیک نیتی سے یہ سب کچھ کرتے ہیں اور زعمِ باطل میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بہت کام کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے

کہ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104)۔اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم واقعی سارے نیک کام کرتے ہیں جب کہ خدا نے اس معاملہ میں یہ فرمایا تھا کہ ان اعمال کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ظاہری طور پر ان کی شکل وصورت تو ایسی ہوتی ہے' وہ مکینکلی پرفارم تو اس طرح سے کرتے ہیں جسے قرآن نے مصنوعی کہا ہے۔ بناوٹ کی چیز تو وہ ہوتی ہے جس کی شکل وصورت ویسی ہوتی ہے لیکن وزن کے اعتبار سے' Value کے اعتبار سے' ان کے بے وزن ہونے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:105)۔ظہورِ نتائج کے وقت' اِن کے اعمال کا وزن معلوم کرنے کے لیے میزان تک نہیں کھڑی کی جائے گی۔ وہ اپنی بے مائیگی کی شہادت آپ ہوں گے۔ وہ مصنوعی اعمال اس قدر کھوکھلے ہوں گے کہ ان کے تولنے کے لیے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ عزیزانِ من! یہ چیز بڑی عبرت آموز ہے۔

میں عرض کرونگا کہ بہرحال میں نے تو مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے' یہ قرآنِ کریم کا امتیاز ہے اور شرف ہے کہ وہ یہ کچھ بتاتا ہے کہ اگر ان چیزوں کے اندر سے روح اور مقصد اور جو محاصل ہیں وہ گم ہو جائیں اور یہ وہ نتائج پیدا نہ کریں جو ہم نے کہا ہے کہ یہ پیدا کریں گے تو یہ اعمال بالکل بے وجہ رہ جاتے ہیں' بے مقصد رہ جاتے ہیں اس لیے اپنے آپ کو اس فریب میں مت مبتلا رکھیے کہ ہم یہ جو سب کچھ کر رہے ہیں اس سے اللہ کا منشاء پورا ہو رہا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ہم پہ یہ چیز نہیں چھوڑتا کہ خود کوئی اس کا فیصلہ کرے کہ اب یہ کام ٹھیک ہو رہا ہے یا کہ نہیں۔ اس نے احکام کے ساتھ حکمت کو بھی منزل من اللہ کہا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود بتاتا ہے کہ فلاں کام کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ تمہارے سامنے برآمد ہو جائے گا' اسے روز دیکھتے اور پرکھتے جاؤ کہ اس کام کا وہ نتیجہ نکل رہا ہے یا نہیں۔ اگر وہ نتیجہ نکل رہا ہے جو ہم نے بتایا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو پھر یہ سمجھ لیجیے کہ خدا کے احکام کی اطاعت ہو رہی ہے اور اگر وہ نتیجہ نہیں مرتب ہو رہا تو پھر اپنے آپ کو اس فریب میں مت مبتلا رکھیے۔ کھڑے ہو جایئے' سوچیے کہ کہاں غلطی ہے' وہیں تصحیح کیجیے ورنہ ساری عمر اس فریب میں مبتلا رہو گے اور آخر میں تمہاری کیفیت یہ ہوگی کہ تم سب وہاں بہت جھومتے جھامتے آؤ گے اور کہو گے کہ ہم نے اتنے نیک اعمال کیے اور وہاں ظہورِ نتائج کے وقت آ کے کھڑے ہو کے دیکھو گے کہ تمہارے اعمال کو تولنے کے لیے وہاں ترازو تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔ کیسا عجیب نقشہ ہے جو قرآن یہ کہہ کے کھینچ رہا ہے! عزیزانِ من! اور یہ ہے دین اور مذہب وہ فرق جو میں پہلے دن سے کہہ رہا ہوں۔ دین اس نظام کا نام ہے جس کے اندر خدا کے یہ احکام وہ نتائج مرتب کرتے ہیں جو اس نے کہا ہے کہ یہ مرتب ہوں گے۔ اور مذہب میں ایسا نہیں ہوتا' وہاں صرف فریبِ نفس ہوتا ہے۔

ہر عمل اپنی نتیجہ خیزی سے پہچانا جاتا ہے

عزیزانِ من! میں نے پچھلی دفعہ قرآن کی آیت سے ہی تو اس کی مثال دی تھی کہ اس نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے' اقامت صلٰوۃ کرو اور اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا تھا کہ خود ہی اپنے ذہن میں فیصلہ نہ کرلو کہ ہاں صاحب! ہم اقامتِ صلٰوۃ کر رہے ہیں۔ کہا تھا کہ اِنَّ

الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (29:45)۔ صلوٰۃ وہ ہوگی جو ہر قسم کی بے حیائیوں سے‘ فحاشیوں سے‘ منکرات [1] سے‘ برائیوں سے روک دے گی۔ اگر صلوٰۃ یہ کچھ کر رہی ہے تو پھر تو صلوٰۃ کا منشا پورا ہو رہا ہے جو قرآن نے کہا ہے۔ یہ عمل تو اپنا ایک وزن رکھے گا۔ وزن کے معنی نتیجہ ہے اور اسی کے ساتھ آگے تھا کہ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ (29:45)۔ جو کچھ تمہارے مصنوعی اعمال کرتے ہیں‘ جو کچھ تمہارے خودساختہ نظام اور قوانین کرتے ہیں‘ خدا کو اس کا اچھی طرح علم ہے۔ اگر تمہاری صلوٰۃ وہ نتیجہ پیدا کرتی ہے تو پھر یہ وہ صلوٰۃ ہوگی جو ہم نے کہا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا اور اگر ایک صلوٰۃ‘ وہ تمہاری نماز ہوگی کہ اسے نہایت احتیاط کے ساتھ‘ تمام ارکان پورے کر کے تم پڑھو گے‘ اسے پڑھتے چلے جاؤ گے‘ ساری عمر پڑھتے چلے جاؤ گے لیکن نتیجہ وہ نہیں نکلا‘ جو ہم نے کہا ہے تو یہ چیز تصنعون میں آئے گی‘ یہ تو مصنوعی سی چیز ہوگی‘ اس کے لیے تو ترازو بھی نہیں کھڑا کیا جائے گا‘ اس کا وزن ہی کچھ نہیں ہوگا۔

ضمناً یہ بات کروں کہ ہمارے ہاں اکثر یہ بحثیں چلی رہتی ہیں کہ قرآن میں کون سی صلوٰۃ ہے؟ کہا کہ قرآنی صلوٰۃ ہے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے جی! اِدھر ان لوگوں نے یہ کہا کہ ہاں جناب! یہ پانچ وقت کی نماز اور ایک نماز میں اتنی رکعتیں‘ پھر ایک رکعت کے اندر یوں یہ رکوع‘ یہ سجدہ‘ یہ کچھ کرنے کی چیز‘ کیا یہ سب کچھ اِس کے اندر ہے؟ اب دوسرے فرقے بھی ہیں‘ انہوں نے کہا: نہیں صاحب! ہاتھ یہاں نہیں باندھنے چاہئیں‘ ہاتھ یہاں تک نہیں اٹھانے چاہئیں‘ سنتیں یوں نہیں یوں پڑھنی چاہئیں‘ وتر اس طرح سے ادا کرنے چاہئیں۔ انہوں نے یہ کچھ کہا کہ یہ ہے منشاء خداوندی۔ یہی کچھ تو پہلے فرقے میں بھی کم نہیں تھا۔ ہمارے ہاں سے اس دور میں ایک اور فرقہ اٹھا۔ اس نے کہا: یہ سب باطل ہے‘ یہ سب غلط ہے صاحب! امت کی ساری تباہیاں اس لیے آ رہی ہیں کہ انہوں نے پانچ نمازیں پڑھنی شروع کر دیں صاحب! قرآن کی جو نماز ہے اس میں تین وقت کی نماز ہے اور دو رکعتیں اور ایک سجدہ ہے صاحب! یہ قرآنی صلوٰۃ ہوگی یعنی ساری امت کی تباہیاں جتنی آئی ہوئی ہیں وہ اس لیے ہیں کہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور ایک نماز کے اندر اتنی اتنی رکعتیں ہیں۔ یہ قرآنی صلوٰۃ نہیں ہے۔ قرآنی صلوٰۃ یہ ہے کہ تین وقت کی پڑھو‘ دو رکعتیں‘ ایک سجدہ کے ساتھ پڑھو۔ جیسا کہ مثلاً انہوں نے کہا: یہ قرآنی صلوٰۃ ہوگئی اور وہ قرآن کہتا ہے کہ قرآنی صلوٰۃ وہ ہے جو فحشا اور منکر سے روک دے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ پانچ کی بجائے تین کرنے سے کیا پھر یہ نتیجہ نکل آیا؟ یہ تو سوال ہی نہیں تھا عزیزانِ من۔ معیار تو یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (29:45)۔ یقیناً صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دے گی۔ یقیناً یہ ہوگا کہ الصلوٰۃ جو ہم نے کہی ہے وہ اگر صلوٰۃ قائم ہوگی تو وہ فحشا اور منکر سے روک دے گی اور اگر یہ نہیں ہے تو وہ مَا تَصۡنَعُوۡنَ (29:45)۔ ہوجائے گا صاحب! باقی جو کچھ بھی ہے وہ تمہاری بناوٹ ہے‘ مصنوعی پن ہے کیونکہ وہ صلوٰۃ یہ نتیجہ پیدا نہیں کرتی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے‘ عزیزانِ من! مذہب اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کو رسمی طور پر‘ مکینیکلی فارم کے اندر کرتے رہو گے تو پھر ان کے وزن کے لیے ترازو بھی کھڑا نہیں کیا جائے گا۔ اور پھر انہیں رسمی طور پر

[1] فاحش اور فحشا کے قرآنی مفہوم کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل‘ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور‘ 2003‘ ص:178

کرنے کے لیے جیسا کہ ابھی میرے منہ سے Performance کا لفظ نکلا ہے تم انہیں میکانکی طور پر Perform کرتے رہو گے' تو اس کے لیے تو ترازو بھی کھڑا نہیں کیا جائے۔ یہ اس قدر بے وزن شے ہوگی کہ اسے پرکھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس کا وزن ہے بھی یا نہیں۔ جس گیہوں کے پودوں کے اندر کسان دیکھتا ہے کہ ان میں جسے ہم سٹہ کہتے ہیں' خوشہ کہتے ہیں' وہ نہیں آ رہا تو وہ اس گیہوں کے پودوں کو' بیلوں کو چرا دیتا ہے' اس لیے کہ اسے دیکھنے کے لیے میزان ہی نہیں کھڑی کی جائے گی کیونکہ اس گیہوں کے پودوں میں دانہ ہی نہیں پڑے گا۔ یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔

سوچا کرو

عزیزانِ من! جب تک یہ قوم اس فریب سے نہیں نکلے گی' اس کا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ خواہ آپ انہیں جتنا جی چاہے اس مذہب کی پرفارمنس میں زیادہ سے زیادہ شدید بھی کرتے چلے جایئے اور وسعت بھی دیتے چلے جایئے۔ یہاں کھڑے ہو جایئے۔ آخر میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم نے نماز روزہ چھوڑ دیا ہے۔ یہ احکامِ قرآنی چھوڑ دیئے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ انہیں چھوڑنے کا یہ نتیجہ ہے لیکن جو کچھ تم کہتے ہو کہ یوں کرلو تو وہ منشاء خداوندی پورا ہو جائے گا۔ تو کیا اس سے وہ کچھ ہو گیا؟ اگر ہاں تو پھر یہ تباہیاں' یہ زوال' یہ نکبت' یہ زبوں حالی' جس میں یہ پوری قوم مبتلا ہے' ساری دنیا مبتلا ہے کیوں آتی ہیں؟ ارے بھئی! یہاں یہ چھوڑنے والے تمہیں کچھ تھوڑے سے ملے اور یہ بھی کہ اس دور میں وہ اب زیادہ عام ہو رہے ہیں ورنہ اس سے پیشتر تو ہمارے ہاں کی بہت بڑی اکثریت نماز روزہ کی پابند ہوا کرتی تھی۔ ابھی ہمارے ہاں کل کی بات ہے تو گویا یہ تباہیاں' یہ بربادیاں' یہ زوال اور یہ نکبت و زبوں حالی' اُس دور میں نہیں تھی۔

یہ نکبت و زبوں حالی تو آپ کے ہاں ہزار سال سے چلی آ رہی ہے۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟ مذہب تو کھڑے ہو کے سوچنے نہیں دیتا' سوچ ہی سے تو اسے ڈر ہوتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا کہ ایک ہی آیت کے اوپر کھڑے ہو کر اگر یہ سوچ لیا جائے کہ قرآن کہتا ہے کہ الصلوٰۃ تو وہ ہوگی جو منکر اور فحشا کو روک دے گی۔ لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں اس کی ضرورت تھی کہ ہم اس کی اس ایک آیت کے اوپر ہی کھڑے ہو کے غور کر لیتے کہ یہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے نہیں روک رہی تو پھر معاذ اللہ یا تو ایک طرف وہ بات لے آیئے' جواب ہمارا نیا نوجوان طبقہ کہتا ہے' وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ صاحب! یہ جو کچھ کہا گیا ہے' معاذ اللہ یہ سب غلط ہے۔ یا پھر دوسرے طبقہ کا نقطۂ نظر دیکھیے۔

دوسرے طبقہ کی سوچ

یہ جو دوسرا طبقہ ہے وہ یہ کچھ کہنے کی جرآت تو نہیں کرتا لیکن کھڑے ہو کر سوچتا وہ بھی نہیں ہے کہ دیکھ ہی لیا جائے کہ اس صلوٰۃ کا وہ نتیجہ کیوں پیدا نہیں ہو رہا جس کی نشاندہی خدا نے کی ہے کیونکہ خدا نے تو ٹھیک کہا تھا کہ صلوٰۃ یہ کرے گی لیکن جو ہم کر رہے ہیں اس سے پھر وہ نتیجہ کیوں پیدا نہیں ہو رہا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری یہ صلوٰۃ وہ صلوٰۃ نہیں۔ یہ کچھ کہنے کے لیے وہ طبقہ تیار نہیں بلکہ سمجھا یہی جا رہا

ہے کہ یہ سارا کچھ جو اس طرح سے جاری ہے تو اس کے متعلق یہ کہہ دیا کہ الحمدللہ جی تمہاری صلوٰۃ بڑی ٹھیک ہوگئی اور پھر وہاں گئے تو وہاں وہ جو چودہ پندرہ لاکھ ہر سال اکٹھے ہوتے ہیں' انہوں نے ایک دوسرے کو مبارک دی صاحب! کہ الحمدللہ حج قبول ہوگیا اور اگر وہ جمعہ کے دن آ پڑے تو صاحب! پھر تو پوچھیے ہی نہیں' راوی عیش لکھتا ہے۔ یہ حجِ اکبر ہے جی! عزیزانِ من! ہیں تو یہی چیزیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اِن کی جگہ جو کچھ اور تھا' وہ کیا ہے؟

دین کی صلوٰۃ اور مذہب کی صلوٰۃ میں فرق

یہی صلوٰۃ' زکوٰۃ' حج اور جو دوسری چیزیں آپ کہتے ہیں' یہ سب ارکان ہیں۔ دین کے نظام کا پروگرام تو یہی تھا۔ یہ مذہب کی پرستش کا پروگرام نہیں تھا۔ پرستش میں اپنے اپنے خیال کے مطابق آدمی کچھ رسوم ادا کرآ تا ہے اور نتائج کی طرف سے' اپنے آپ کو' فریب میں مبتلا رکھ لیتا ہے اور جب یہاں کچھ نہیں بنتا تو پھر کہتا ہے کہ اِس کے نتائج اُس دنیا میں جا کر نکلیں گے حالانکہ اس نے الصلوٰۃ کے متعلق جو کہا تھا کہ وہ فحشا اور منکر سے روک دے گی تو کیا یہ کہا تھا کہ قیامت میں روک دے گی؟ یعنی یہاں تو وہ پھیلتے چلے جائیں' وہاں جا کے دیکھ لینا کہ قیامت میں روکتی ہے یا نہیں۔ غور کیجیے یہ جو اس نے صلوٰۃ کا نتیجہ بتایا ہے' کیا اس دنیا کے اندر بتایا ہے یا یہ بتایا تھا کہ قیامت میں جا کے یہ نتیجہ برآمد ہوگا؟ یہاں تو فحشا اور منکر عام ہو رہے ہیں۔ رکنا تو ان کا یہاں تھا۔ اگر قوم کی کہیں خوش بختی ہوتی تو اس مقام پہ کھڑے ہو کے سوچتے کہ صاحب! یہ صلوٰۃ تو یہ نتیجہ پیدا نہیں کر رہی' آ ؤمل کے سوچیں۔ اسی سے پوچھیں جس نے یہ کہا ہے کہ الصلوٰۃ یہ کرے گی اور وہ یہ بتائے گا کہ وہ کونسی الصلوٰۃ ہے جو یہ کچھ کرے گی۔ معاذ اللہ نہ تو خدا کے یہ دعوے اور وعدے جھوٹے ہیں کہ یہ ایسا کرے گی' نہ ہی اس نے ایسا چھوڑا ہے کہ وہ بتائے نہیں۔ بتانے کے لیے جو ہمارے ہاں زور دیا گیا وہ یہی ہے کہ صاحب! وہ تین اوقات بتا دیتا ہے اور رکعتیں بتا دیتا ہے تو رکعتیں اور اوقات بتانے سے کیا یہ صنعاً تنھٰی عن الفحشاء والمنکر ہو گیا ہے؟ اگر یہی مقصود تھا کہ یہ نہیں ہے اور یہ ہے جو ہم کہہ رہے ہیں تو Touch Stone اور کسوٹی تو یہ تھی' وہ کچھ بھی کیا' یہ تبدیلیاں بھی کیں' فریب بھی دیا کہ یہ قرآنی صلوٰۃ ہو رہی ہے اور نتیجہ یہ کہ پہلے سے بھی زیادہ بدتر حالت ہوتی چلی گئی۔ اس تبدیلی سے کیا ہوا؟ کیوں فریب میں مبتلا رکھتے ہو کہ یہ قرآنی صلوٰۃ ہے؟ وہ قرآنی صلوٰۃ نہیں ہے۔ قرآنی صلوٰۃ تو ایک ہی ہے کہ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فحشا اور منکر معاشرے سے ختم ہو جائیں گی۔

یہ قرآن سے پوچھو کہ کونسی صلوٰۃ' وہ صحیح صلوٰۃ ہوگی؟ پوچھو کہ صیام' جو اس نے صوم کہا ہے' جو اس نے روزوں کا بتایا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا اس سے پوچھو اور پھر دیکھو کہ کیا وہ نتیجہ نکل بھی رہا ہے۔ اگر نہیں نکل رہا تو وہ صوم ہے ہی نہیں جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ اسی طرح قرآن نے بتایا ہے کہ حج کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس لیے اس نے کہا: لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28)۔ وہ یہاں اس لیے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام نوعِ انسان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ الناس کو بلاؤ۔ وہ یہاں حج پر الناس کو دعوت دینے کو کہتا ہے۔

حج کا مقصد، پروگرام اور اہمیت

قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ آئیں: لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28)۔ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نوع انسان کے لیے کس قدر منافع بخش ہے۔ اس میں صرف اپنے ہی نہیں، عوام الناس بھی آئیں اور اپنی آنکھوں سے نوع انسان کی منفعت دیکھیں۔ تم یہ سوچو کہ ہماری امت کے، ہماری قوم کے لیے اس میں کیا کیا منفعت کی چیزیں ہیں۔ لوگوں کو بلا کے دکھاؤ کہ ہم نوعِ انسانی کی منفعت کا کیا کام کر رہے ہیں۔ اس نے حج کے لیے یہ کچھ بتایا تھا۔ اگر اِس کی بجائے حج میں یہ ہو جاتا ہے کہ صاحب! شیطان کو کنکریاں سات کی جگہ چھ ماری ہیں تو وہ بتا دیتا ہے کہ تم پر دم لازم آ گیا۔ کیا دم لازم آ گیا صاحب؟ وہ بتا دیتا کہ ایک اور بکرا ذبح کرو، پانچ سو روپے بدو کو اور دو۔ یعنی یہ کچھ کرنے یاد دینے کو اس لیے کہتے ہیں کہ ارکانِ حج پورے پورے طور پر ادا نہ کرنے، شیطان کو سات کی بجائے چھ کنکریاں مارنے سے حج ناقص رہ گیا۔ آج اس قسم کی چیزیں، وہاں روز ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً یہاں تین دن کا قیام تھا، تم نے پونے تین دن کیا، اس لیے ایک ''دم'' اور دو یعنی اس کے متعلق وہ یہاں تک احتیاط برتتے ہیں تا کہ حج ہو جائے اور یہ جو رسومات رائج طریقہ کار کے مطابق وہاں ہو رہی ہیں تو ''الحمدللہ'' مبارکباد ملتی ہے: جی! حج قبول ہو گیا، ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے: لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22:28)۔ نوعِ انسان کو دعوت دو کہ آ کے اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ تم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کر رہے ہو کیونکہ تمہیں امت کے طور پر شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضۂ زندگی یہ ہو کہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کے محاسب و نگران ہو۔ یہ اس لیے کہ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:109)۔ تم وہ بہترین قوم ہو جو نوعِ انسانی کی بہتری کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ قرآن حکیم نے تو حج میں ان کے اجتماع کی غرض ہی یہ بتائی ہے لہٰذا اگر یہ کچھ وہاں ہوتا ہو تو پھر تو وہ حج قبول ہو گا لیکن وہاں تو یہ ہے کہ ''احرام اس قسم کا باندھ لیا، طواف یوں کر لیا، عرفات میں یوں چلے گئے، منا میں یوں ٹھہر گئے۔'' اگر یہ سارا کچھ اُسی طرح ادا ہو گیا تو الحمدللہ حج قبول ہو گیا۔ اور اس کے بعد وہاں دعائیں مانگ کے آ گئے کہ ''یا اللہ! ترکی کی توپوں میں کیڑے پڑیں، اسرائیل کو تباہ کر دو، برباد کر دو، **اللھم الغفر عن حذرا دینھم** جس نے تیرے دین کو ذلیل کیا یا اللہ! اس کو تو ذلیل کر، تو ہی کر۔'' ''ہمیں نہ کچھ کرنے'' [1] اور یہ کچھ کہتے گھروں کو چلے آئے۔ اپنی زبوں حالی اور نکبت تو ایک طرف رہی، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (3:139)۔ تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، تم سے اونچا تو دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ یاد رکھو: کبھی بھی کافر مومن پہ غالب آ ہی نہیں سکتا۔ مجھے معاف رکھیے گا، جیسے کچھ ہم نے کیا ہے اب یا تو ایک دم اسے عملاً پٹک کے رکھ دیجیے گا کہ یہ سارا جو کچھ کہا گیا ہے، یہ سب کچھ اس پرانے زمانے کے لیے کہا گیا تھا، اب نہیں ہے اور اگر آپ کا اس پہ ایمان ہے تو پھر کھڑے ہو کے سوچیے، اور برملا کہیے کہ نہ ہم مؤمن ہیں، نہ ہمارے اعمال ہی وہ

---

[1] ہم کچھ بھی نہ کریں۔ (یہاں یہ طنزیہ کہا گیا ہے)

اعمال ہیں جو قرآن کہتا ہے۔ اور آج اِن اعمال کی جانچ کا ایک ہی Touch Stone ہے' ایک ہی کسوٹی ہے کہ ہمارے اعمال وہ نتیجہ پیدا کریں جو قرآن نے کہا ہے کہ دینِ خداوندی پر عمل کرنے سے یہ نتائج پیدا ہوں گے۔

آخر کار ہمیں کھڑے ہو کر سوچنا پڑے گا

عزیزانِ من! اگر وہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا تو آپ دوائی کی دوسری خوراک نہیں پیتے۔ اگر دوائی کی خوراک (Doze) سے وہ نتیجہ برآمد نہ ہو جو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ شام تک ٹمپریچر اتنا کم ہو جائے گا' نہیں ہوتا' تو بھاگے ہوئے جاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! یا نسخہ غلط ہے یا دوائی غلط ہے یا میرے پرہیز میں کوئی غلطی ہوگئی۔ تو خدا کے بندو ایک دن کے مرض کے متعلق تو اس قدر بھاگ دوڑ کرتے ہو' ساری زندگی کے امراض جو تمہیں لگے ہوئے ہیں' ان کے متعلق کبھی نہیں سوچتے کہ کیا کر رہے ہیں:

نہ دکھ جائے ' نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے ' اور میں ہوں

اس لیے عزیزانِ من! قرآن نے کہا: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا (18:106)۔ یہ تباہیوں کا وہ جہنم ہوگا جو ان کے سامنے نمودار ہو جائے گا۔ یہ اِس لیے کہ یہ لوگ ہمارے قوانین سے انکار کیا کرتے تھے۔

خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی مذاق نہیں ہے

عزیزِ من! ان آیتوں میں اس کفر کے متعلق کہا تھا: وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (18:106)۔ یہ انکار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اِن قوانین کی اور ان کے پیش کرنے والوں کی' ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ یعنی یہ ہمارے قوانین سے مذاق کرتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ بھی مذاق کرتے تھے جو ان قوانین کو پیش کر رہے تھے۔ یہ لوگ مذاق کرتے ہیں اور پھر انہی کا ایک گروہ تھا جس کے متعلق قرآن نے کہا: يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104)۔ وہ بزعم خویش سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے بہت اچھا ہے۔ یہ ایک گروہ تھا عزیزانِ من! پچھلے درس میں یہ چیز آئی تھی اور اب' اس کے بعد' اس پس منظر میں' ایک دوسرا گروہ یہ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (18:107)۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور ایسے کام کریں گے جن سے نظامِ کائنات اور خود ان کی سیرت و کردار سنور جائیں' تو ان کی مہمانی کے لیے فراخیوں اور کشادگیوں کا جنتی معاشرہ ہوگا: اِس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جو ایمان لے آئیں گے اور اُن کے ایسے اعمال ہونگے جن سے صلاحیتیں بیدار ہونگی' جو ان کی اپنی زندگی کو بھی سنوار دیں گی اور حسنِ کائنات میں بھی مشاتگی کا کام کریں گے۔ اس عملِ صالح کے اندر' عزیزانِ من! ان کے لیے سارے معنی آ گئے ان کا نتیجہ کیا ہوگا؟

جنت کسی مقام کا نام نہیں بلکہ قرآنی نظامِ حیات کی خصوصیات کا نام ہے

یہاں جنت کے متعلق' جنت کی صفت' فردوس بتائی ہے۔ اس فردوس کے معنی ''وسعت اور فراخیاں اور کشادگیاں'' ہوتا ہے۔ اور مختلف مقامات پہ قرآنِ کریم نے خدا کی ربوبیت کا جو نظام ہے' اس میں بتایا ہے کہ اِس میں کتنی خوشحالیاں ہونگی اور کتنی کشادگی اس کے اندر ہوگی' کتنی وسعت اس کے اندر ہوگی۔ تو جنت کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ اس کی وسعت ارض وسما پہ پھیلی ہوئی ہوگی۔

جنت کسی مقام کا نام نہیں ہے عزیزانِ من! اگر جنت کسی مقام کا نام ہوتو جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ ارض وسما پر پھیلی ہوئی ہے تو پھر تو بات پوچھنے کی ہوگئی کہ صاحب! پھر وہ جہنم کہاں ہوگی' جبکہ ارض وسما تو ساری جنت نے ڈھانپ لی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مقام کی بات نہیں ہے۔ اس دنیا کے اندر ایک نظام کا بتایا ہے جس کی یہ خصوصیات بتائیں: کہ اس میں یہ فراخیاں ہوں گی' یہ کشادگیاں ہوں گی' یہ وسعتیں ہوں گی اور پھر یہ بھی کہ زندگی میں اور ہر قسم کے آلام وابتلا میں مرتبت کی کیفیت کے لحاظ سے یہ ہوگا کہ وہ نظام **لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ** (9:33)۔ تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ جائے گا۔ یہ نظام دنیا کے تمام نظاموں کے اوپر' زندگی کے تمام خود ساختہ نظاموں کے اوپر' غالب آئے گا۔ یہ سارا کچھ قرآن دے رہا ہے۔

جنت بخشش کے طور پر نہیں ملتی یہ تو انسان کے حسنِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ ساری خرابیاں' یہ ساری کشادگیاں' یہ ساری وسعتیں جو لے گا' اس کے لیے لفظ **نـزلًا** آیا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو یہی ہے کہ جنت کا یہ سارا کچھ بخشش کے طور پر ملتا ہے۔ اِسی لیے تو ہم کہتے ہیں: یا اللہ! بخش دے۔ میں نے کہا ہے کہ ایسا کچھ کہہ کر ہمارے ذہن میں بھیک منگوں اور گداگروں کا تصور دیا ہے کہ ہم یہ چیز بھی بخشش کے طور پہ مانگتے ہیں۔ اِس نظامِ زندگی' جسے قرآن نے دین الحق (9:33) کہا ہے' میں اس کا سوال ہی نہیں۔ اس نظام میں عزتِ نفس تو سب سے بلند چیز ہے جو قرآنِ کریم یا خدا قائم رکھنا چاہتا ہے۔

اگر بہشت بخشش' خیرات کے طور پر ملتی ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بخشش کی بات نہیں' خیرات کی بات نہیں' اس میں تو تذلیل ہوتی ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ **بِـمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (7:43) تمہارے اعمال کا ہی فطری نتیجہ ہے' تم نے محنت کی اس کی کمائی کا جو بدلہ (Reward) ہے' یہ فطری طور پہ تمہیں مل رہا ہے۔ بخشش کا سوال نہیں۔ اس کے کہنے کی کیا بات ہے! اگر تمہارے اعمال کا بدلہ ہے تو پھر وہ اس قابل ہے کہ اسے لیا جائے' اس پر فخر کیا جائے۔ یہاں قرآن نے نزلا کہہ کے ایک لطیف انداز میں یہ بات کہی ہے: آپ کے گھر میں مہمان آتا ہے' آپ اس کی بڑی تواضع کرتے ہیں۔ وہی کھانا ہے جو آپ اس مہمان کے سامنے رکھتے ہیں اگر باہر سے کوئی گداگر آواز دیتا ہے کہ بھئی! کچھ خدا کے نام پہ دیں تو آپ اسی کھانے میں سے ایک روٹی یا چپاتی کا ایک حصہ اسے بھی دیتے ہیں۔ یہ اس کے دینے اور یہ جو مہمان بیٹھا ہوا ہے' اس کو دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ دیکھتے ہیں' قرآن نے کہا ہے کہ یہ جو کچھ ملے

گا' یہ تو تمہاری مہمان نوازی ہوگی۔ یہ اس کا انداز ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہیں پیچھے ہی اِسی سورۃ (الکھف) کی 102 آیت میں ہی اس نے جہنم کے متعلق بھی یہ کہا ہے: **اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا** (18:102)۔ ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ان کے لیے جہنم کا عذاب تیار ہوتا ہے جو ان کی ''مہمان نوازی'' کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا ایک انداز اور بھی ہوتا ہے۔ وہ بہت سی چیزیں کہتا ہے جیسے وہ کہتا ہے کہ اہلِ جہنم کو جو رزق ملے گا تو اس کے لیے اس نے کہا ہے: **ذُقۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡكَرِيۡمُ** (44:49)۔ اُس سے کہا جائے گا کہ تو اپنے آپ کو بڑا واجب التکریم اور صاحب غلبہ واقتدار سمجھا کرتا تھا۔ اب اپنے اعمال کا مزہ چکھ' کھا اسے۔ **لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ** (56:52)۔ شجرۃ الزقوم تمہارا رزق ہے۔ کہا: جی! وہاں تو بہت بڑا His Excellency بنا پھرتا تھا' Most Respective Personality بنا ہوا تھا۔ اس نے ذلت کی روٹی کے متعلق کہا ہے کہ وہ حلق میں پھنس جاتی ہے' نہ اگلتے بنے' نہ نگلتے بنے۔ تو ایک جہنم کی تو یہ چیز تھی۔

شرفِ انسانیت قرآنِ حکیم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے

عزیزانِ من! دوسری طرف اس جنت والوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ چیز خیرات اور بخشش نہیں ہے' یہ مہمان کی عزت افزائی ہے۔ یعنی خدا کے ہاں یہ بندے مہمان ہونگے اور خدا خود میزبان ہوگا اور انہیں مہمان کہہ کے پکارتا ہے' عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ وہ شرفِ انسانیت کو قائم کرتا ہے۔ کہا: **خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا لَا يَبۡغُوۡنَ عَنۡهَا حِوَلًا** (18:108)۔ وہ اس جنت میں رہیں گے اور ایسی اطمینان کی زندگی بسر کریں گے کہ وہ وہاں سے منتقل ہونا نہیں چاہیں گے۔ جب تک ان میں ایمان واعمال صالحہ کی کیفیت رہے گی یہ جنت نہیں چھنے گی' دوام کی جنت ہوگی۔ دوام کے معنی یہ ہیں کہ ''جب تک یہ کیفیت رہے گی اُس وقت تک وہی رہے گا۔'' وہ یہ نہیں ہے کہ جیسا میں نے سوال کیا تھا کہ ''کیا اسلام چلا ہوا کارتوس ہے؟ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اب یہ اپنے نتائج نہیں دے سکتا۔ پھر میں نے بتایا تھا کہ نہیں' یہ ایسا نہیں ہے جب تک یہ ایمان واعمال صالحہ کی کیفیت رہے گی اُس وقت تک بعث ارضی کا معاشرہ یہاں قائم رہے گا اور مرنے کے بعد کی زندگی کے اندر بھی یہ کیفیت رہے گی اور یہ اس قدر اطمینان بخش چیز ہوگی کہ یہ نہیں ہوگا کہ تھوڑے سے عرصے کے بعد انسان بور ہو جائے اور کہے کہ صاحب! اس میں کچھ تھوڑی سی تبدیلی بھی آنی چاہیے' تنوع بھی آنا چاہیے' کچھ چینج ہونا چاہیے۔ عام معمولاتِ زندگی میں تو یہ کچھ ہو جاتا ہے' دو تین چار دن کے لیے ہی سہی' بس اُسے دو وقت کے لیے' خواہ مرغی ہی کیوں نہ دے دیجئے' پلاؤ ہی کیوں نہ دے دیجئے' تیسرے چوتھے دن آدمی یہ کہہ دیتا ہے: سر! تھوڑا سا اچار ہی دیؤ ہور کجھ نئیں تے۔''[1] تھوڑی سی تبدیلی کے لیے جی چاہتا ہے ورنہ انسان تو بور ہو جاتا ہے۔ مہمان کو ذرا دو تین ٹائم ''اکو جہیا''[2] کھلایئے۔ وہ

---

[1] عالی جاہ! اگر اور کچھ نہیں تو تھوڑا سا اچار ہی دے دیجیے۔ [2] ایک ہی طرح کا۔

چوتھے دن کہے گا کہ صاحب! تھوڑی سی دال ہی لگا دیجیے۔

خدا کے ہاں مہمان داری کا نہ ختم ہونے والا سلسلۂ دراز

قرآن کا عجیب انداز ہے کہ اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ وہ یہ نہیں کہیں گے: صاحب! اس میں کچھ تبدیلی کر دینی چاہیے۔ یہاں قرآن نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ مہمانی کس طرح سے کیا کرتے ہیں اور مہمان کیا چاہتا ہے' وہ سارا کچھ اس انداز سے ملے گا۔ یہاں جنت کے ساتھ ''فردوس'' کا بھی لفظ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس لفظ میں کشادگی' فراخی' وسعت' کی سب چیزیں موجود ہیں اور اسی کی تفسیر میں اگلی ہی آیت کے اندر محاورۃً چار ہی لفظ کہے کہ خدا کی ربوبیت کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو تو سنو۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (18:109)۔ یہ سب کچھ خدا کے اس نظام کے مطابق ہوگا جس کی وسعتوں' فراخیوں اور کشادگیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر سمندر' روشنائی بن جائے اور زمین کے تمام درخت قلمیں (31:27)۔ تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے لیکن میری نشوونما دینے والے کے سامانِ ربوبیت کی حدود فراموش تفاصیل اور اِن سے متعلق قوانین ودساتیر ختم نہ ہوں اور اگر ان سمندروں کے ساتھ اور سمندروں کا اضافہ ہو جائے تب بھی وہ اس مقصد کے لیے کافی نہ ہو سکیں۔

خدا کا نظام ربوبیت تو اپنے اندر نہ ختم ہونے والی وسعت لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! خدا کے نظامِ ربوبیت کی وسعت کا پوچھتے ہو تو سنو: اگر یہ سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور دوسرے مقام پہ ہے کہ اگر یہ سارے درخت قلم بن جائیں (31:27)۔ وہاں ساتھ ہی بات سمجھانے کے لیے یہ بھی کہا ہے کہ اگر یہ دنیا بھر کے سمندر روشنائی ہو جائیں' دنیا بھر کے درخت قلم بن جائیں تو پھر بھی تم خدا کی وسعتوں کا احاطہ اور شمار نہ کر سکو۔ یہ جو میں نے اس کی وسعتوں کے بے کنار ہونے کا عرض کیا ہے' یہ بات سمجھانے کے لیے کہا ہے۔ آج سے پہلے دور میں تو یہ بات کم ہی سمجھ میں آتی تھی۔ اس زمانے میں تو ایک گاؤں والا دوسرے گاؤں تک نہیں جا سکتا تھا' آج جو کچھ تھوڑا بہت کائنات کا علم حاصل کر رہے ہیں اِس کے متعلق ان سے پوچھیے کہ وہ اس کی وسعتوں کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

جیمز جینس کی نظر میں کائنات کی وسعت

ہمارے دور میں جیمز جینس (James Jeans) علم الافلاک (Astromony) کا ماہر ہے۔ کتابیں تو اس کی بہت ہیں' مگر اس کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کا نام ہے: Mysterious Universe اس میں وہ کہتا ہے کہ اور چیزیں تو ایک طرف رہیں اس کائنات کے اندر جو آپ کو کرے Spheres یا تارے Stars نظر آتے ہیں' انہیں دیکھیے۔ ان کروں یا تاروں میں بھی اسے دیکھیے جسے آج گلیکسی (Galaxy) یا کہکشاں کہتے ہیں۔ اِن کہکشاؤں کے ایک انچ کے اندر کائناتیں (Universes) پنہاں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

جتنی عمر اس کرۂ ارض کی ہے اگر آپ اتنی ساری عمر میں ان کو گننا شروع کر دیجیے تو ان کی گنتی ختم نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ حیرت سے سر پہ ہاتھ مارتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے بعد بھی یہ Disexpanding Universe نہیں ہے' یہ جامد نہیں ہو گئی۔ خدا کی یہ کائنات بدستور پھیل رہی ہے۔ عزیزانِ من! آپ جانتے ہیں کہ قرآن نے تو چودہ سو برس پہلے یہ کہہ رکھا ہے کہ **یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ** (35:11)۔ ہم ان کائناتوں میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ آج اس دور میں آ کے' یہ چیز پہلی دفعہ ان کی زبان سے نکلی ہے ورنہ اِس سے پہلے تو یہ سارے اس کرہ ارض کو ہی تمام کائنات سمجھتے تھے۔ ٹھیک ہے کہ انسان کا علم محدود تھا' ابھی معلومات بھی اتنی زیادہ نہیں تھیں۔ انہوں نے اتنا ہی سمجھا تھا اور وہ بھی انہیں اگر ویدوں (Vade)[1] کے رُو سے لیا جائے تو صورتِ حال یہ ہے کہ یہ کرہ ارض بھی ایک بیل کے سینگوں کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ یہ بیل ایک مچھلی پہ براجمان تھا۔ پھر مچھلی اس کرہ ارض کو کہاں بھی لے جائے۔ یہ مچھلی پانی پہ تھی۔ اب اگر اس کے آگے پوچھا جائے کہ صاحب! پانی کس چیز پہ تھا۔ یہ کہنے لگے: ''جا تو تے ایویں مذاق کرنا پیا ایں۔''[2] اِدھر قرآن ہے کہ علی الاعلان کہتا ہے: **تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (32:02)۔ یہ ضابطہ قوانین جس میں نہ کوئی بات شک وشبہ پیدا کرنے والی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی نفسیاتی الجھن کا موجب' اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو تمام اقوام عالم اور کائنات کا نشوونما دینے والا ہے۔ ٹھیک ہے اس کی بڑی وسعتیں ہیں۔

کائنات کی وسعتوں کی حقیقت

آج بھی ہم سمجھتے ہیں کہ صاحب! علم کی بڑی وسعتیں ہو گئی ہیں' نیوٹن (Sir Isaac Newton: 1642-1727) نے تو پھر بھی دو سو سال' تین سو سال' پہلے یہ کہا تھا کہ آپ لوگوں کے ذہن میں تو یہ ہے کہ ہم معلومات کے بڑے وسیع سمندروں میں چلے جا رہے ہیں۔ مگر ہماری کیفیت تو یہ ہے کہ جیسے یہ بچے علم کے سمندر کے کنارے گھونگے اور سیپ اکٹھی کرتے ہیں ہم تو اسی طرح سے یہ گھونگھے اور سیپ اکٹھے کرنے والے لوگ ہیں۔ علم کا سمندر تو ابھی آگے ہے' ہم تو اس کے کنارے کھڑے ہوئے بچوں کی طرح یہ سیپ اکٹھے کر رہے ہیں۔ نیوٹن تو یہ کہہ رہا تھا اور آج جو یہ جینس (Jeans) جیسے ہیں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ تم ان کائنات کی وسعتوں کے متعلق سمجھتے ہو تو یوں سمجھو کہ صرف وہ ایک کہکشاں اس ناریل میں سما جائے گی اور اس طرح کی کئی کہکشائیں ہیں اور اُن کے اندر کئی کائناتیں ہیں۔ کبھی ذہن میں بھی نہیں آتا کہ اس کے اندر بھی کئی کائناتیں وابستہ ہیں۔ یہ پوری کہکشاں تو ایک طرف رہی' اس کے اتنے حصے کے متعلق بھی تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ تم اس کی وسعتیں پوچھنا چاہتے ہو تو سنو۔ اب یہاں پھر اسی آیت میں رب کا لفظ بھی آیا ہے۔ کہا:

---

[1] وید سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی علم (Knowledge)' کے ہیں۔ ہندومت کے چار وید یہ ہیں: رِگ وید (Rig- Veda)' یجروید (Yajur Veda)' ساوید (Sama- Veda) اور اتھروید (Atharva- Veda)۔

[2] جاؤ تم تو یونہی مذاق کر رہے ہو۔

كَلِمٰتُ رَبِّيْ (18:109)۔ یہ جو اس نے سارا کچھ کر رکھا ہے یہ ربوبیت کے لیے ہے۔ اگر تم اس کے متعلق صرف اس کے قوانین معلوم کرنا چاہو تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ سارے سمندر روشنائی بن جائیں، سارے درخت قلم بن جائیں، پھر بھی یہ قوانین ختم نہ ہوں۔ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (18:109)۔ خواہ تم اس کے لیے اتنے ہی اور بھی لے آؤ۔ ان قوانین کی یہ کیفیت ہے۔ تو اس لیے وہ جنت ہے جس کے متعلق ہمیں کہا ہے کہ یہ الفردوس ہے۔ اِسی لیے کہا ہے کہ یہ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ (18:107)۔ ارض و سماوات کو محیط ہو جائے گی۔ تو اس طرح ارض و سماوات سے کائنات مراد ہوتا ہے۔

قرآن کے نزدیک تو کائنات کی کیفیت وہی ہے جو جیمز جینس تمہیں بتا رہا ہے۔ سوچیے کہ پھر وہ جنت کہاں ہے اور اس کے اندر کتنی وسعتیں ہیں۔ اسی لیے تو کہا ہے کہ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ تم بور ہو جاؤ گے، وہاں تنوع نہیں ہوگا۔ جس کی وسعتوں کا یہ عالم ہو، اس میں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اور کیا کچھ ہوگا، کتنا ہوگا۔ اور پھر اسی لیے تو قرآن میں ہے کہ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ (29:20)۔ ان سے کہو کہ اس دنیا میں چل پھر کر دیکھو اور غور کرو کہ مختلف اشیائے کائنات کی پیدائش کی ابتدا کیسے ہوتی ہے اور پھر وہ کس طرح خدا کے قانون ربوبیت کے مطابق نئی نئی زندگیاں اختیار کیے جاتی ہیں۔ کہا کہ چلو پھرو، تمہیں معلوم ہو۔ کچھ تھوڑے سے، چھوٹے سے پیمانے پہ ہی سہی، تمہیں معلوم تو ہو کہ اس کائنات کی وسعتیں کتنی ہیں۔ اس لیے ذرا چلو پھرو: سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (29:20)۔ قرآن کا حکم ہے۔ یعنی اس نے یہ حکم کے طور پہ کہا ہوا ہے کہ یہ کرو۔ ہم نے اس کا کیا کیا؟

حجرہ میں مصلے پر بیٹھے، کرۂ ارض کی سیر کی

عزیزانِ من! جب دین مذہب بنا ہے تو اس سلسلہ میں ایک واقعہ ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ایک پیر کو ملنے کے لیے گئے اور انہوں نے کہا کہ صاحب! وہ تو چالیس دن تک نہیں مل سکتے۔ ارے، کیوں نہیں مل سکتے؟ خیریت تو ہے، کیا آپ بیمار ہیں؟ کہنے لگے: نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ وہ حجرے کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوچھا: حجرے کے اندر کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کا چالیس دن کا وظیفہ کر رہے ہیں۔ اس کے لیے ورد ہوگا جی! وہ باہر صحن میں بھی نہیں کہ کہیں کچھ نظر آ جائے۔ حجرے میں مصلے پہ بیٹھے ہوئے چالیس دن باہر نہیں نکلنا۔ کیا کر رہے ہیں؟ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ بہرحال، وہی ہے کہ حجرے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ''وہ'' کہتے ہیں کہ حضرت صاحب تو عصر کی نماز کعبے میں پڑھتے ہیں۔ کہا: ''روز تے اتھے بیٹھے رہندے ہیگے نیں۔''[1] ان تشہیر کرنے والوں نے یہ فرمایا: کعبہ خود یہاں چلا آتا ہے۔ ''اوتھوں والے دیکھدے رہ جاندے نیں۔''[2] عزیزانِ من! ہر مذہب میں یہی ہوتا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں۔

---

[1] وہ تو روزانہ یہیں براجمان ہوتے ہیں۔

[2] خود وہاں (کعبہ کے رہنے والے) انہیں دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں لیکن مجھ پر وحی ہوتی ہے

اب یہ سارا کچھ کہنے کے بعد یہ چیز ذہن میں آئی کہ صاحب! اتنی وسعتیں' یہ جنت' یہ کائنات اور یہ سارا کچھ' یہ شخص کہہ رہا ہے! اور اس پر طرہ یہ کہ یہ شخص کہتا ہے کہ یہ کچھ ہم کر دیں گے۔ کہا: قُلْ (18:110)۔ یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اے رسول! ان پر اس حقیقت کو واضح الفاظ میں واشگاف کر دو کہ یہ سب خدائے بلند و برتر کی کارفرمائی ہے' میری نہیں۔ دراصل یہ کچھ ہم نہیں کر دیں گے۔ میں اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔

لہٰذا ابھی سے انہیں کہہ دو کہ یہ جوان کے ذہن میں بات آ رہی ہے کہ یہ اتنی بڑی وسعتوں کی جنت ہے یہ میں انہیں دے رہا ہوں۔ ان سے کہہ دو کہ یہ جنت میں نہیں دے رہا۔ ان سب کا وجود اس حقیقت کبریٰ کی عملی شہادت ہے کہ اقتدار و اختیارات صرف ایک خدا کا ہے اور کسی کا نہیں۔ انسانوں کو صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیے اور کسی کی نہیں (37:40)۔ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110)۔ میں تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110)۔ میری تو یہ کیفیت ہے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ اس آیت میں "انما" دیکھیے کتنا زور (Emphasis) کے لیے آتا ہے۔ کہا: میں تو اس کے سوا کچھ اور ہوں ہی نہیں' میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں لیکن يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110)۔ مجھ پر وحی ہوتی ہے' فرق صرف یہی ہے۔ اس کے علاوہ میں منکم ہوں' میں تمہارے جیسا ہوں۔ یہ چیز بھی نہیں ہے کہ ہاں صاحب! بشر تو ہوتے ہی ہیں لیکن وہ بھی بشر تو ہوتے ہیں جو خدا کے ہاں مقرب ہوتے ہیں۔ یہاں کہا کہ میں مثلکم ہوں' تمہارے ہی جیسا بشر ہوں۔ باقی رہا یہ کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110) ہے: یہ تو ایک وحی ہے جو خدا کی طرف سے مجھے ملتی ہے' وہ میں تم تک پہنچا رہا ہوں' یہ وہی ہے جو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ کچھ کرو گے تو تمہیں یہ ملے گا۔ اگر میں بھی وہ کچھ کرونگا تو یہ کچھ مجھے بھی ملے گا۔ اس منکم میں یہ بات ہے' اس میں میری بھی کوئی Exception نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (18:110)۔ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے۔

صاحب اقتدار و اختیار صرف ذات خداوندی ہے

عزیزانِ من! یہ اس سورۃ کی آخری آیت ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس میں پوری سورۃ کا سارا ملخص اور نچوڑ آ جاتا ہے۔ کہا کہ میری طرف کیا وحی ہوتی ہے؟ ایک لفظ ہے صاحب! کہا: اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (18:110)۔ کہ تمہارے لیے صاحب اقتدار و اختیار صرف خدا کی ذات ہے۔ بس یہ ایک بات ہے جو میری طرف وحی ہوتی ہے: تمہارے لیے صاحبِ اقتدار صرف وہ خدا کی ذات ہے' کسی اور کا اقتدار نہیں' کسی اور کی حکومت نہیں' کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے۔ میری طرف یہ وحی ہوتی ہے' لہٰذا میں بھی اپنا حکم نہیں چلا سکتا۔ یہ ہے "بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ"۔ آپ نے دیکھا' مساوات اسے کہتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ بھی یہی کہا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ

دُوْنِ اللّٰہِ (3:78)۔ محکومیت خدا کے قانون کے سوا اور کسی کی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اِس باب میں اُس کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں کہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے، اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ کسی بشر کے لیے یہ جائز ہی نہیں ہے، خواہ اسے نبوت ہی کیوں نہ ملی ہو، خواہ اسے حکومت ہی کیوں نہ مل جائے کہ وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہے کہ ''تم میرے محکوم ہو'' یہ کسی بشر کے لیے بھی جائز نہیں اور کہا: میں بھی تو بشر ہوں۔ منکم ہوں، میرے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے صاحب! **قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ**(39:14)۔ اس لیے میں قوانین خداوندی کی اطاعت اِس طرح کرتا ہوں کہ اس میں کسی اور کی اطاعت کا شائبہ تک نہ ہو۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ بس میں یہ کچھ کہنے کے لیے آیا ہوں صاحب! اگر یہ ہو جائے تو وہ سارا کچھ ہو جائے گا جو پیچھے کہا گیا ہے۔ پھر یہ دین کے ارکان وہ نتائج پیدا کریں گے جو قرآن نے کہے ہیں۔ یہ اس کی بنیاد ہے کہ کسی انسان کے ہاتھ میں اقتدار نہ رہے۔ یہ اقتدار (Savereignty) صرف اللہ تعالیٰ کی قائم ہو۔ عزیزانِ من! یہاں اِس دنیا میں تو کم از کم دوہرے دوہرے اقتدار ہیں۔

دین کی ساری بنیاد ہی صرف اور صرف اس پر ہے کہ اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہے

مذہب میں یوں مانتے ہیں کہ حکومت والوں کے الگ قوانین (Public Laws) ہوتے ہیں اور اہل شریعت کے ہاں شریعت کا ایک الگ ضابطہ (Personal Laws) ہوتا ہے، یہ ضابطہ بھی انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اور حکومت والوں کا بھی انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے، خدا کی اطاعت تو کہیں آتی ہی نہیں جو وہ نتیجہ پیدا کرے گی جو اس نے کہا ہے۔ پھر اسی آیت کا اگلا حصہ ہے: **فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ** (18:110)۔ تم میں سے جو کوئی خدا کے قانون مکافات کا سامنا کرنے کی امید رکھتا ہے اسے چاہیے کہ...... یہاں پر ''لقاء'' کا لفظ آ گیا۔ یہ لفظ پہلے بھی (18:105) میں آیا تھا تو یہ سارا اس لیے ہے کہ **فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ** (18:110)۔ تو میں نے کہا تھا کہ اس کے معنی ملاقات کے معنی نہیں ہوتے کہ آپس میں ذرا اسلام علیکم ہو جائے۔ اس کے معنی ہوتا ہے: حاضرِ عدالت ہونا یہ وہی ہے جسے میں نے مثال کے طور پر ''حاضرِ عدالت ہونا'' کہا ہے۔ یہ اعمال کی جزاء (Reward) کے لیے ہے۔ یہ مکافاتِ عمل ہے۔ قرآن کی رُو سے اس کے معنی اعمال کی جزاء یا مکافاتِ عمل کے ہوتے ہیں۔ تو یہاں، اس آیت میں یہ کہا کہ جو اس چیز کی توقع رکھتا ہے کہ مکافاتِ عمل برحق ہے اور مثال کے طور پر خدا کی عدالت کے اندر حاضر ہونا ہے قرآن کا یہ اندازِ بیان تشبیہاً ہے، اور وہاں یہ دیکھنا ہے کہ آیا میں ملزم ہوں یا بے گناہ ہوں تو اس کے لیے لقاء کی اصطلاح ہے۔ اگر کوئی شخص جو یہ کرتا ہے تو اس کے لیے کرنے کی ایک ہی بات ہے۔ سنیے عزیزانِ من! کیا کرنے کی بات ہے؟ کہا: **فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا** (18:110)۔ اُسے چاہیے کہ ایسے کام کرے جو نظامِ عالم کو سنواریں اور خود اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما کا ذریعہ بن جائیں۔ یعنی وہ کام کرے جسے قرآن نے کہا کہ یہ صلاحیت بخش کام ہیں۔ قرآن کے بتائے ہوئے پروگرام کے مطابق وہ یہ کچھ کرے اور اس عمل (Process) میں: **وَلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ**

رَبِّہٖٓ اَحَدًا (18:110)۔ اطاعت اور محکومیت صرف اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین کی اختیار کرے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اس عمل میں یہ سب سے بڑی اور بنیادی بات ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں عبادت کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب یہاں لفظ عبادت آیا ہے۔ ''اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔'' تو اب یہی ہے وہ مقام جہاں سے یہ لوگ عبادت سے مراد نماز لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے سجدہ ہم صرف خدا کے لیے کرتے ہیں' جس میں سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں تو اس میں ہم شریک نہیں کرتے۔ عبادت کو تو یہ کہا۔ تو میں نے کہا ہے کہ عبادت کے اس تصور (Concept) میں کہیں دور جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' اس میں بھی کہیں لمبے چوڑے ورق پلٹنے کی ضرورت نہیں۔ اسی سورۃ الکھف میں ذرا پیچھے چلے جایئے' 26ویں آیت نکا لیے الفاظ یہی ہیں: وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ اس میں یہ شرک والی بات ہے اور وہاں یہ کہا ہے: وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ اس آیت میں یہاں لفظ حکم آ گیا۔ باقی الفاظ وہی ہیں۔ یہاں ہے: لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) وہاں ہے: وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26)۔ خدا اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں حکم ہے اور اسی کے لیے یہاں عبادت کا لفظ ہے۔ تو قرآن نے تو اپنے معنی آپ واضح کر دیئے۔ اوپر کہا تھا: اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (18:110)۔ تمہارے لیے صاحبِ اقتدار و اختیار صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ صاحبِ اقتدار ایک ہی ہے۔ تو جس کا ہم نے خدائے واحد ترجمہ کر کے اپنے ذہن میں کہہ دیا کہ ہم تو دو خدا نہیں مانتے۔ اس نے کہا کہ توحید کے معنی یہ ہیں لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110)۔ اپنے رب کی ''عبادت'' میں کسی کو شریک نہ کرو۔ میں یہاں لفظِ عبادت لیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ اب عبادت کے لیے قرآن نے کہا: وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) وہ اپنی حکومت میں' اپنے حکم میں' اپنے اقتدار میں' کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہ معنی ہو گئے عبادت کے۔ تو بات وہ ہو گئی۔ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (18:110)۔ تمہارا الٰہ' تمہارا صاحبِ اقتدار' ایک ہی ہے۔ اب جو یہ سمجھتا ہے کہ اپنے اعمال کے نتائج کے لیے اس کی عدالت میں حاضر ہونا ہے' اس کے لیے کرنے کی ایک ہی بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18:110) اس کے حکم یا محکومیت یا حکومت یا اقتدار میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔

''معاشرہ میں قانون انسانوں کا ہو اور عبادت خدا کی۔'' یہ ممکن ہی نہیں

عزیزانِ من! اگر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی کہیں حکومت ہوتی ہے تو یاد رکھیے! اس نظام میں خدا کی عبادت نہیں ہو سکتی۔ جسے ہم ''عبادت'' کہہ کے اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے: مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45)۔ یہ مصنوعی عبادت ہے جو تم کر رہے ہو۔ عبادت کے معنی محکومیت ہیں۔

اب آپ نے دیکھا کہ وہ قرآنی صلوٰۃ کیا ہوتی ہے جس میں کھڑے ہو کر سب سے پہلے یہ کہا جاتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) خدا کے حکم کے سوا کسی کی محکومیت قبول نہیں کرتے۔ مسجد میں باوضو کھڑے قبلے کی طرف منہ کئے ہوئے ہمارے تو یہی الفاظ ہوتے ہیں۔ ''وڈی قسم چکنی ہووے تو اونوں ایہہ کیندے ہیگے نیں تے باوضو مسیتے کھلو کے قبلے ول منہ کر کے کہو کہ''❶ یہ ساری شرطیں پوری ہوتی ہیں تو یہ کہتا ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُوْا (1:4) عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ''ایاک'' کیا ہوتا ہے: ''صرف اور صرف ایک۔'' یہ شخص کھڑا ہو کر خدا سے اقرار کر رہا ہے۔ آپ اور چیزیں تو چھوڑ دیئے کہ اس میں وہ غیرِ خداوندی اقتدار کتنا ہوتا ہے۔ اب تو یہ ہے کہ یہ اس نماز کا اہتمام بھی جو ہو رہا ہوتا ہے وہ انسانوں کے بنائے ہوئے ایک پروگرام اور نظام کے تابع ہوتا ہے۔ اوقاف والوں سے پوچھ لو اور یہ وہاں کھڑا ہوا یہ کہہ رہا ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) عزیزانِ من! بتایئے کہ یہ ماتصنعون ہے یا نہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ الفاظ ہمارے حلق سے مصنوعی طور پر نکل رہے ہیں۔ ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کہا: اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہنے والوں میں کوئی حقیقت ہے؟ بہرحال لفظ صلوٰۃ کی تو پوری تفصیل ہوگی۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر وہاں کھڑا ہوا یہ کہنے والا ایماندار ہو تو انقلاب کا یہ کتنا بڑا اعلان ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کہ ہم تیرے سوا کسی کی حکومت نہیں مانتے۔ تیرے سوا' تیرے اقتدار کے سوا' تیرے قوانین کے سوا ہم کسی کی محکومیت نہیں مانتے۔ پھر دیکھیے کتنا ہی کہنے والا ہو تو اس معاشرے سے تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ❷ (29:45) ہوتا ہے یا نہیں؟ عزیزانِ من! اس صلوٰۃ کے بعد ہر بے حیائی اور ہر قسم کی برائی ختم ہوتی ہے اگر کسی جگہ اِیَّاکَ نَعْبُدُوْا کی یہ بات ہو جائے اس کی یہ عبودیت' یہ محکومیت' یہ حاکمیت' قائم ہو جائے تو پھر معاشرے کے اندر فحشا اور منکر کو نہیں چلنے دے گی۔

میں نے عرض کیا ہے عزیزانِ من! صلوٰۃ کا یہ پروگرام تو بہت بڑا ہے۔ آج ہمارے مروجہ نظام صلوٰۃ میں اس کا ایک جزو بھی نہیں۔ اس جزو میں سے ایک لفظ یا ایک آیت کے یہ دو لفظ ہیں جو میں کہہ رہا ہوں کہ اگر یہ ماتصنعون کے تحت نہ کہے جائیں' انہیں Formally نہ دہرایا جائے' یا یونہی مکینکلی ان الفاظ کو وہاں نہ دہرا لیا جائے' یا مذہب کے دیئے ہوئے فریب کے ماتحت پھر اس کا ترجمہ ''پرستش'' نہ کر دیا جائے تو پھر صحیح معنوں میں خدا کی محکومیت آتی ہے۔ تو قرآن کی طرف آؤ قرآن نے لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) کہہ کر خود ہی عبادت کا یہ ترجمہ کر دیا کہ اس کی محکومیت یا حکومت میں کسی کو بھی شریک نہ کرو اور اُدھر صلوٰۃ کے اجتماعات میں کھڑے ہو کر ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ'' کہے تو ایاک نعبد کے معنی ہو گئے کہ ''تیری حکومت میں ہم کسی کو شریک نہیں کر سکتے۔''

کعبہ کے اندر 365 بتوں کی جمہوریت

عزیزانِ من! پھر ہمارے ہاں یہ بحثیں چلتی ہیں کہ کس کی حکومت اسلام کے مطابق ہے: ملوکیت کی' یا آمریت کی' یا ڈکٹیٹر شپ

---

❶ اگر کسی کو کوئی بڑی قسم اٹھانی ہو تو اسے کہتے ہیں کہ باوضو مسجد میں قبلہ رو ہو کر کہو کہ

❷ (یقیناً یہ نظام صلوٰۃ) لوگوں کو اُن کی اس روش سے روک دے گا جس کی رو سے ہر فرد معاشرہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور دوسروں کی پرورش کا خیال کسی کو نہیں آتا اور یہ سب کچھ سمیٹنے کے لیے عقل خود بیں کی فریب کاریاں انہیں عجیب عجیب طریقے سمجھاتی رہتی ہیں۔

کی؟ آخر میں سمٹ سمٹا کر اس نتیجہ کے اوپر آیا جاتا ہے کہ نہیں صاحب! جمہوریت کی حکومت اسلام کی حکومت کے مطابق ہے۔ یعنی جو ایک انسان ہے وہ تو غیر اللہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ اکاون اکٹھے ہو جائیں تو وہ پھر غیر اللہ نہیں رہتے۔ یہ صرف تو اکاون ہوتے ہیں' وہ کعبہ کے اندر تو 365 بت رکھے ہوئے تھے' وہ سب ایک ہی مقصد' یعنی پرستش کے لیے تھے تو اس لیے سب سے بڑی جمہوریت تو وہ تھی۔ آپ نے دیکھا ہے کہ پھر کس طرح سے انسان کے اعمال مزین ہو جاتے ہیں۔ وہ جو قرآن نے ابھی کہا تھا کہ اس کے اعمال اس کے سامنے مزین ہو کر اسے نظر آنے لگتے ہیں اور پھر سب مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہاں صاحب! یہ جو مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے یہ اسلام کے مطابق ہے۔ اقامتِ دین کے مدعی بھی اس پر چراغاں کرتے ہیں کہ ہاں صاحب! ہم نے مملکت کو مسلمان کر لیا۔ کیا کر لیا ملک میں؟ کہ جی! یہ جو جمہوریت ہے اسے بحال کر دیا۔ پھر یہ اعلان کرتا ہے کہ میں مسلمان کے مقابلے میں ایک ہندو کو ترجیح دوں گا کیونکہ وہ نظامِ جمہوریت کا قائل ہے' اس پر Believe کرتا ہے۔ ہندو نظامِ جمہوریت میں Believe کرتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ وہ نظامِ جمہوریت اسلامی ہے۔ یہ کتنے بڑے بڑے فریب ہیں جو یا تو ہم کھائے ہوئے ہیں یا دوسروں کو' دنیا کو' دے رہے ہیں۔ قرآن اسے ماکنتم تصعنون کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے میزان بھی نہیں کھڑی کی جائے گی صاحب! یہ جسے تم اقامتِ دین کہہ کے فریب کھاتے ہو یا دوسروں کو فریب دیتے ہو' سوال اس جمہوریت کا نہیں ہے۔ سوال تو اس کا ہے کہ فیصلہ ایک کا ہو یا فیصلہ کثرتِ رائے سے' اتفاق رائے سے' سو کے سو (سو فیصد) کا ہو' اگر وہ جا کے خدا کے احکام سے ٹکراتا ہے تو یہ ملعون و مردود ہے' یہ غیر خداوندی ہے' غیر اسلامی ہے۔ اگر اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہے تو جو ایک فرد کا فیصلہ ہے' وہ بھی خدا کا فیصلہ ہے۔ فیصلہ تو ان افراد کا ہونا ہی نہیں ہے' وہ تو خدا کے قوانین کے نافذ کرنے کی ایک مشینری قائم کرنی ہے صاحب! یہ ہوگا: وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا [1] (18:110)۔ کہنے لگے کہ جو یہ کرتا ہے اس کے اعمال کے لیے میزان بھی کھڑی کی جائے گی' جس کے وہ اعمال' یہاں وہ جنت الفردوس پیدا کرے گی' جس کی پہنائیوں اور وسعتوں میں کوئی کنارہ تک نہیں' وہ ارض و سماوات پہ چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ' عزیزانِ من! سورۃ الکھف کی آخری آیت آ گئی' تو یہاں یہ آیت ختم ہو گئی۔ آج وقت ہو گیا۔

اس کے بعد 19 ویں سورۃ سورۃ مریم آتی ہے اُسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀......❀

[1] تمہارے لیے صاحبِ اقتدار و اختیار صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں۔

سورۂ مریم

نواں باب: سورۃ مریم (تمہیدی نکات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ مریم قرآن کریم کے سولھویں پارے کی 19 ویں سورت ہے۔ سورۂ الکھف کے شروع میں بات اُن چند نوجوانوں سے شروع ہوئی تھی جو خدا کی عبادت کرتے تھے' خدا کی ہی محکومیت میں Believe کرتے تھے۔ مگر عملاً مملکت ان لوگوں کی قائم ہوگئی تھی جو اس تصورِ محکومیت کی مخالفت کرتے تھے۔ اُن نوجوانوں کا ان سے ٹکراؤ تھا۔ یہ انقلابیوں کی جماعت تھی۔ انہوں نے ایک Strategy کے طور پہ یہ سمجھا کہ کچھ وقت کی تیاریوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہاں سے کسی دوسری جگہ جا کر تیاری کریں' اس دوسری جگہ کو قرآن نے کہف یا غار کہا ہے' وہ وہاں چلے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے اپنی تیاریاں کیں اور ان کے جو ساتھی باہر رہ گئے تھے انہوں نے بھی اپنی جگہ یہی کچھ کیا۔ ❶

---

❶ (دراصل ہوا کچھ یوں تھا) کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے متبعین (Followers) پر سخت آزمائش کا دور آیا۔ مخالف قوتیں چاروں طرف سے سیلابِ بلا کی طرح ہجوم کر کے اُمڈ آئیں۔ حضرت عیسی کے یہ متبعین (Followers) دنیا کی نگاہوں سے چھپے چھپے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ حکومت کی سختیاں تھیں اور یہودیوں کی دسیسہ کاریاں۔ انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بستیوں سے دور جنگل اور ویرانوں میں کہیں چھپ چھپا کر زندگی کے دن بسر کریں۔ اس خلوت گزینی اور گوشہ نشینی نے رفتہ رفتہ منظّم رہبانیت کی شکل اختیار کر لی۔ خانقاہیت (Monasticism) کے خطوط وآثار عیسائیت سے پہلے بھی موجود تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان عیسائیوں میں بعض ایسے بھی ہوں جن کے رگ وپے میں خانقاہیت کے جراثیم پہلے سے موجود ہوں۔ درمیان میں یہ جراثیم دب گئے اور سازگار فضا ملی تو انہوں نے پھر سے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔ اس تصورِ زندگی نے آہستہ آہستہ ایک ایسی متعین صورت اختیار کر لی کہ اس کے قواعد وضوابط مرتب ہونے لگے اور خانقاہیت ایک خاص شعارِ زندگی اور مسلکِ حیات قرار پائی۔ قرآن کریم نے' جہاں یہود ونصاریٰ کے اور غلط معتقدات ورسوات کی تردید کی ہے' وہاں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے کہ رہبانیت کی یہ زندگی حضرت مسیح علیہ السلام (یا کسی اور رسول) کی تعلیم نہ تھی جو منجانب اللہ لوگوں تک پہنچائی گئی ہو بلکہ یہ ان لوگوں کا خود ساختہ مسلک تھا۔

شروع شروع میں یہ زاویہ نشینی اور خلوت گزینی مستبد قوتوں کے جور وستم سے بچنے کے لیے اختیار کی گئی تھی' اس لیے ان غاروں اور تہ خانوں میں بڑے بڑے عمدہ گہرِ تابدار چمکتے نظر آتے تھے۔ لیکن جب اس نے ایک منظّم رسم کی صورت اختیار کر لی تو یہی خانقاہیں ان تمام انسانیت سوز مصائب وجرائم کے مرکز بن گئیں جن کے تصور سے روح کانپ اُٹھے۔ قرآن کریم نے اس ابتدائی دورِ خلوت نشینی کا ایک واقعہ اپنے درخشندہ اوراق میں محفوظ کر لیا ہے جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ مستبد طاغوتی قوتیں اللہ کا نام لینے والوں پر کس طرح گوشہ عافیت تنگ کر دیتی ہیں لیکن بالآخر فلاح وفوز انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو حق واستقامت پر جمے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ اصحاب کہف یا اصحاب رقیم کے نام سے متعارف ہے۔ (پرویز' شعلۂ مستور ۱۹۹۴ء ص ص۔ ۱۵۹، ۱۵۸)

اصحاب الکہف ❶ کی قبروں کو خانقاہوں میں بدل دیا گیا

قرآن کے اشارات کے مطابق ایک وقت ایسا آیا جب انقلابیوں کی جماعت کے یہ لوگ باہر آئے اور باہر آ کر انہوں نے دیکھا کہ حالات بدل چکے ہیں۔ انہوں نے ایک جھٹکا دیا اور پورا انقلاب لے آئے۔ انقلابیوں کی یہ جماعت خدا کے احکام کو لے کر آگے بڑھی۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ مجاہدین تھے' انقلابی تھے' جنہوں نے یہ کچھ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد' جیسا کہ دنیا کرتی چلی آئی ہے' وہاں کچھ لوگ فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ جو ہمارے بزرگ یہاں دفن ہوئے ہیں یعنی اب وہ مجاہدوں سے بزرگ بنے' ان کے مزاروں کے متعلق کیا کیا جائے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے مزاروں کو بڑے بڑے مقبرے بنایا جائے۔ ان مقبروں کی چھتیں مرفع ہونی چاہئیں' ان کے اوپر غلاف چڑھنے چاہئیں' غسل دینے چاہئیں۔ ٹھیک ہے فیصلہ کر لیا کہ ہاں صاحب! ان قبروں کو عبادت گاہ بنا دیا جائے' پرستش گاہ بنا دیا جائے۔

یہ جو یہاں ذکر آیا ہے' یہ ایک انقلابی جماعت کا ذکر ہے جو دورِ اول میں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کو لیے ہوئے تھے۔ پھر ان کے بعد' ان کے جو نام لیوا آئے تو انہوں نے ان بزرگوں کے مزاروں کو پرستش گاہ بنا لیا اور وہ جو کہف تھے' جو غار تھے' انہیں خانقاہ بنا لیا۔ اس طرح جو سارا دین تھا' اسے رہبانیت میں تبدیل کر لیا۔ اب حجروں اور خانقاہوں میں درود' وظیفے' اور چلّے کرنا کام رہ گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت میں جو سینٹس (Saints) ہوا کرتے تھے' انہیں اپنے ہاں ولی اللہ کہا جاتا ہے۔ سینٹس (Saints) کی یہ اصطلاح انہی کے ہاں کی ہے۔ عیسائیت' رہبانیت کا مذہب ہو گیا اور یہ جو آپ کے ہاں کا پہلا انقلابی دور ہے جسے آپ صدرِ اول کہتے ہیں' جب ختم ہوا یا یوں کہیے کہ ختم کر دیا گیا ہے' تو یہی خانقاہیت یہاں بھی در کر آئی۔

---

❶ اصحاب الکہف والرقیم: وہ نوجوان جنہوں نے آسمانی انقلاب کے سلسلہ میں ایک غار (Cave) میں جا کر پناہ لی اور وہاں اس انقلاب کی تیاریاں کرتے رہے۔ قرآن کریم میں ان کا ذکر سورۂ کہف میں آیا ہے۔

زمانہ قدیم میں نبطی (Nabataeans) حکومت کا دارالسلطنت (Capital) رقیم کا شہر تھا۔ جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا علاقہ فتح کیا تو اس شہر کو شہرت حاصل ہوئی لیکن رقیم کے نام سے نہیں بلکہ پیٹرا (Petra)' جسے عربوں نے اپنے ہاں بطرہ کہہ کر پکارا۔ دورِ حاضر کی اثری تحقیقات نے اس شہر کے کھنڈرات (Ruins) کا سراغ لگایا ہے' جہاں سے پرانے غاروں کے اندر خانقاہوں کے آثار ملے ہیں۔ یہ شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ اس لیے نزولِ قرآن کے وقت عرب' اصحاب کہف (غار والوں) یا اصحاب الرقیم (بطرہ والوں) کے قصے سے آشنا تھے لیکن انہی تفصیلات کے ساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔ قرآن کریم نے (جزئیات میں گئے بغیر) اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ ان نوجوانوں کے پیش نظر مقصد کیا تھا اور بعد میں لوگوں نے کیا سمجھ لیا۔ اور انہیں کیا سے کیا بنا دیا۔ (پرویز' لغات القرآن (جلد اول) ۱۹۶۰ء ص ص۔ ۲۳۳-۲۳۲)

تصوف کی پہلی خانقاہ 153 ہجری میں قائم ہوئی

آپ کے ہاں خانقاہیت عیسائیوں کے ہاں سے آئی ۔شام (Syria) میں تو ان کی بڑی بڑی خانقاہیں (Monastries) تھیں ۔''جزیرہ طابینہ(Tobenna) کی سب سے پہلی خانقاہ کے بارے میں تاریخ میں درج ہے کہ خانقاہیت ترکِ دنیا کا درس دیتی تھی ۔اس غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہوت پرستی' جنون' یاس انگیزی اور خودکشی عام ہونے لگی ۔راہبوں کی جہالت مذہبی اور جنون سے بہت سے خود غرض لوگوں نے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنا آلۂ کار بنایا۔ان کے بارے میں مسیحی دنیا کے بہت بڑے مستند مؤرخ موشیم (Mosheim) نے لکھا ہے کہ وہ راہبہ عورتوں سے جو عمر بھر مجرد رہنے کی قسم کھا کے آتیں' ناجائز تعلقات قائم کرتے' ان خوبصورت عورتوں کو اپنا شریک بستر بنا لینا' ان کے معمولات میں داخل ہو چکا تھا۔(پرویز' شعلہ مستور' ۱۹۹۴ء' ص ۱۷۲'۱۷۱) آپ کے ہاں تصوف کی سب سے پہلی خانقاہ' جو ڈیڑھ سو صدی ہجری یعنی 153 ہجری کے قریب قائم ہوئی ہے' وہ شام میں ہی قائم ہوئی تھی' موشیم ان مذہبت پرستوں کے متعلق مزید لکھتا ہے کہ' ارضِ فلسطین اور دوسرے ولیوں کی قبروں کی زیارتوں کے لیے اطراف واکناف عالم سے لوگ چلے آتے' یہ سمجھ کر کہ حقیقی نیکی اور یقینی نجات صرف وہیں مل سکتی ہے۔(پرویز' شعلہ مستور' ۱۹۹۴ء' ص ۔۱۷۲) اسی ارضِ فلسطین کے کنارے پر' عثمان نامی سب سے پہلا شخص تھا' جس نے تصوف کا پہلا بیج بو دیا اور اس طرح عیسائیوں کی خانقاہوں کے اندر آپ کے ہاں کی ایک خانقاہ قائم ہوئی تھی ۔وہاں تصوف کا پہلا بیج بویا گیا تھا۔وہاں سے آپ کے ہاں رہبانیت آئی اور پھر وہ ''مغزِ دین'' بن گئی۔''علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ''تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے۔'' (پرویز' شعلہ مستور' ۱۹۹۴ء' ص۔۱۷۴)۔

سورۃ الکہف دین کو مذہب میں بدلنے کے طریق سے آگاہ کرتی ہے

قرآن کریم نے سورۃ الکھف میں بتایا ہے کہ دین کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ یہ اس لیے انہیں بتایا تھا کہ تم بھی اپنے ساتھ یہ کچھ نہ کر لینا۔ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔بہر حال بات عیسائیت کی صحیح تعلیم کی تھی اور اس کے بعد جو اس کا بگڑا ہوا نقشہ تھا قرآن کریم کی سورہ الکھف کے شروع میں اسے پیش کیا گیا ہے۔اب اس کے ساتھ اگلی سورۃ' سورہ مریم آ رہی ہے۔اس میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے کوائف کی بات کی ہے۔اب ہمارے ہاں' اس میں آپ کو اس طرح کی خانقاہیت کی چیزیں نظر آئیں گی۔ہم خود تو وہ کچھ ہوئے ہی تھے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے' اس کے مصداق ہم نے ان انبیاء کرام علیہم السلام کے کوائفِ حیات بھی دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیے کہ گویا وہ ہمارے ہی جیسے بزرگ تھے' ہمارے ہی جیسے افراد تھے جنہیں ہم اولیاء کرام کہتے ہیں۔

انجیل میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی جو سوانح حیات پیش کی جاتی ہے' آپ کو معلوم ہے کہ وہ ایک تارکِ دنیا' فقیر آدمی کی ہے جن کے

کل دس ساتھی ہیں، وہ بھی ایسے ہیں کہ جب ان پر کڑا ہاتھ پڑا، تو ان میں سے ایک نے تو آپ کو تیس روپے کے عوض بیچ دیا اور آخر کار بقیہ گیارہ کے گیارہ ہی آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہ اکیلے رہ گئے، اور پھر بقول انجیل انہیں صلیب دے دیا گیا اور وہ چلاتے رہے کہ یا اللہ! تُو نے مجھے چھوڑ دیا، چھوڑ دیا، کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ آپ اندازہ لگائیے کہ ان کے ہاں کے یہ دیئے ہوئے قصے، ہمارے ہاں آ کر دین بن گئے لیکن کسی نے قرآنِ کریم سے نہیں پوچھا کہ آیا خدا کے نبی یہ کچھ کیا بھی کرتے ہیں؟ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے کیا انقلاب برپا کیا تھا، کسی نے قرآن کریم میں اس انقلاب کو دیکھا تک نہیں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق آپ کی شخصیت تو ایک عظیم انقلابی شخصیت تھی۔

ہر نبی کی زندگی بڑی مجاہدانہ زندگی ہوتی ہے

عزیزانِ من! ہر نبی ایک انقلابی شخصیت ہوتا ہے۔ نبی وعظ کہنے کے لیے نہیں آیا کرتے، نبی تسبیحیاں کرنے اور مصلے بچھانے کے لیے نہیں آیا کرتے، وہ تو ان کی تسبیحوں اور مصلوں کو الٹنے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ یہی کیفیت حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ سورۃ الکھف کے ابتداء میں ذرا سی اشارتاً بات آئی تھی کہ کائنات کا ہر حسین نقشہ اور تعمیری پروگرام اس ذاتِ خداوندی کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے جس نے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے اپنے بندے پر یہ ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔ وہ ضابطۂ قوانین جس میں کسی قسم کا پیچ و خم نہیں۔ اس کے بعد ان عیسائی انقلابی نوجوانوں کی بات کی تھی جنہیں "اَصۡحٰبَ الۡکَهۡفِ وَ الرَّقِیۡمِ" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اب قرآن کریم نے سورہ مریم میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی داستان شروع کی ہے لیکن حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی داستان شروع کرنے سے پہلے قرآن کریم حضرتِ یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذرا سا پس منظر دکھاتا ہے۔ یہ وہی نبی ہیں جنہیں انجیل میں یا عیسائیت کے ہاں یوحنّا نبی کہا جاتا ہے اور جون (John The Baptist) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہی ہیں جنہیں یوحنّا یعنی بپتسما[1] دینے والے کہتے ہیں، یہ وہی نبی ہیں جنہوں نے قریہ قریہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی منادی کی۔ ان کے متعلق بھی عیسائیت نے اور انجیل نے جو کچھ کر کے دکھایا ہوا ہے وہ تو بڑا ہی ذلت آمیز ہے۔ بہر حال وہ بات اپنے مقام پہ آئے گی اور جب میں اُس مقام پہ آؤں گا تو عرض کرونگا۔

قرآنِ کریم یہ تھوڑی سی بیک گراونڈ (Background) ہمیشہ دیتا ہے۔ بات اس نے حضرت زکریا علیہ السلام کے حوالے سے حضرتِ یحییٰ علیہ السلام سے شروع کی ہے۔ وہ پہلے ان کی پیدائش کے متعلق ذکر کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد تھوڑی سی بات حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بھی تو آنی تھی۔ تو پہلے چند آٹھ دس آئتیں ہیں جن میں حضرتِ یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے اور پھر حضرتِ مریم علیہا السلام کا قصہ آتا ہے۔

---

[1] یہ انگریزی حرف Baptism سے مورد ہے۔ یہ عیسائی مذہب کی ایک رسم (Ritual) ہے جس میں بچے کے پیدا ہونے پر اس کے سر پر مقدس پانی کے چھینٹے ڈالتے ہیں اور اسے عیسائی مان لیا جاتا ہے۔ اسے اصطباغ بھی کہتے ہیں۔

دسواں باب: سورۃ مریم (1 تا7)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ﴿۵﴾ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ﴿۶﴾ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿۷﴾

حروفِ مقطعات کی حقیقت

عزیزانِ من! درسِ قرآن کریم کا آغاز **سورہ المریم** سے ہوتا ہے: (كٓهٰيٰعٓصٓ) (19:1)۔ اللہ الکریم، الہادی، الحی، العلیم، البصیر کا ارشاد ہے کہ...... یہ وہی حروفِ مقطعات ہیں۔ آپ کو معلوم کہ میری بصیرت کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات (Attributes of God) کی ایبریویشن (Abbreviations) ہیں، جو ان صفات (Attributes) کے ایک ایک حرف کو اکٹھا کر کے بنائی گئی ہیں۔ قرآن نے خود بھی یہ کہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو عربوں کی زبان عربِ مبین میں نازل کیا ہے۔ جو اسلوب اس زبان کا تھا وہی اسلوب قرآن کے اندر اختیار کیا گیا ہے اور وہی اسلوب عربوں کے ہاں بھی رائج تھا۔

قرآن سے پہلے عربی میں نثر کی کوئی بھی کتاب نہیں تھی۔ یہ عجیب چیز ہے کہ یہ زبان اتنی وسیع، اتنی گہری اور اتنی Managed تھی لیکن نثر میں کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ ان عربوں کی ساری زبان شاعری ہی پر منحصر تھی۔ وہ عرب جو ابتداء کرتے تو وہ یا تو شعر کے اندر اسے لاتے یا پھر اپنے ہاں اس قسم کے مقطعات لاتے ہیں یا Abbreviated چیزیں لاتے تھے۔ یہ ان کا اسلوب تھا۔ ان کے ہاں عبرانی (Hebrew) میں بھی یہی اسلوب تھا۔ یہاں تک کہ عبرانی کی تورات میں بھی یہی اسلوب ہے۔ عربوں کے ہاں تو یہ اسلوب عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کوئی گیارہ مرتبہ **یسئلونک** کی بات آئی ہے کہ ''اے رسول! تجھ سے یہ پوچھتے ہیں۔'' تو وہ جو پوچھنے والی بات ہے، اس میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ وہ مقطعات کے معنی پوچھتے ہیں، ورنہ ہمارے ہاں تو سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! یہ کچھ یونہی حروف سے اکٹھے کیے ہوئے ہیں۔ اس کے معنی کیا ہیں اور پھر اس کے بعد جو وہ زیبِ داستاں شروع ہوتی ہے تو پھر وہ تو باطنی معنی آجاتے ہیں تو پوچھیے نہیں۔ حضرت صاحب کی تفسیر میں جو لکھا ہوا ہوتا ہے!! ہم سے پوچھو کہ اس کے کیا کیا معنی ہم نے

پڑھے تھے یا سیکھتے تھے۔

عزیزانِ من! یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے یہ قرآن عربوں کی زبان میں' عربیٔ مبین میں' نازل کیا ہے۔ عربوں کی زبان سے تو پوچھ لیا جائے کہ وہ کیا چیز کیا کرتے تھے اور اس سے کیا مفہوم لیا کرتے تھے' بات صاف ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان عربوں میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے نہیں پوچھا کہ حضور ﷺ آپ یہ الم (الف۔ل۔م) سے جو بات شروع کرتے ہیں' یہ الم (الف۔ل۔م) کیا ہوا؟ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ان عربوں نے آپ سے ان حروفِ مقطعات کے بارے میں پوچھا ہو۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کیا ہے۔ میں اس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ وہ چیز یہیں دیکھنی چاہیے کہ وہ جو Abbreviations ہیں' یہ خدا کی کون کون سی صفات ہیں جن میں سے ایک ایک حرف لیا گیا ہے' انہیں اکٹھا کیا گیا ہے اور اسی لیے انہیں حرفوں ہی کی طرح پڑھا بھی جاتا ہے۔

كٓهٰيٰعٓصٓ (19:1)۔ خدائے کریم و ہادی والحئ و علیم و بصیر کا ارشاد ہے کہ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا (19:12). یہ اس رحمت ونوازش کا بیان ہے جو تیرے نشوونما دینے والے نے' اپنے بندے' زکریا علیہ السلام پر کی تھی۔ خدا کے عبد زکریا پہ' جو خدا کی رحمت ہوئی تھی' یہ اس کا ذکر آ رہا ہے۔ خدا نے کہا یہ ہے کہ اب ہم اپنی اس رحمت (Nourishment and Bounty) کا ذکر کر رہے ہیں جو ہم نے اپنے بندے ''زکریا'' پر کی تھی۔ اب دیکھیے' سب سے بڑا شرف' جو کسی بھی نبی کے لیے قرآن بیان کرتا ہے' وہ اسے خدا کا بندہ ہونا کہتا ہے: عبده اور خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی عبد (72:19) کا لفظ قرآن نے کہا ہے۔ کسی کے لیے یہ سب سے بڑا شرف ہے۔ اس عبد کے اندر یہی شرف و مجد کی چیز آ جاتی ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ''میں کسی اور کا عبد نہیں ہوں سوائے تمہارے' اے اللہ!'' وہ کہتا ہے: تم نے ٹھیک کہا' تم صرف ہمارے ہی عبد ہو۔ انسان کے لیے اس سے بڑا کوئی دوسرا مقام نہیں ہے۔

عبدہ کا مقامِ بلند

عزیزانِ من! جس کی کیفیت زندگی یہ ہو کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرے۔ یہ ہے عبدہ اور یہ ہیں اس عبد کے معنی۔ نبی سب سے پہلے اس مقام پر ہوتا ہے اور اسی لیے نبی کی زندگی باقیوں کے لیے اسوہ بنتی ہے۔ وہ عبدہ ہونے کی زندگی ہوتی ہے۔ تو خدا نے انبیاء کے متعلق جہاں انہیں خاص شرف کے الفاظ سے پکارنا ہوتا ہے وہاں عبد کہہ کے پکارتا ہے۔ اس ایک کا عبد ساری دنیا کا آقا ہو جاتا ہے' عزیزانِ من!

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات !

جس کی زندگی یوں اس خدا کے ہاں سجدہ گزار کی ہو جائے' پھر آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے کتنے بڑے بڑے آستانوں سے' وہ مستانہ وار سرفرازی سے گزر جاتا ہے۔ یہ ہے عبد اور یہ ہے ''عبدٌ'' کا مقامِ بلند جس کا استعمال قرآن نے زکریا علیہ السلام کے متعلق کیا ہے۔

عزیزانِ من! بنی اسرائیل کے انبیاء کا ذکر قرآنِ کریم میں چلا آ رہا ہے' میں یہاں عرض کر دوں کہ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے دنیا کے ہر قریہ' ہر بستی' ہر ملک' ہر قوم اور ہر زمانے میں رسول بھیجے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ انبیاء کرام اسی خطۂ ارض' جو شام' فلسطین اور علاقہ عرب پر مشتمل تھا' میں بھیجے تھے۔ قرآن کریم نے اسی خطۂ ارض میں جو ان کا ذکر کیا ہے وہ اس لیے ہے کہ قرآن کریم کی یہ پہلی مخاطب قومِ عرب ان سب کو جانتی تھی: کچھ ان کے نام بھی جانتی تھی' ان کے واقعات بھی جانتی تھی۔ وہ ان قوموں سے واقف تھی جن کی طرف یہ انبیاء کرام مبعوث ہوئے۔ ان کے ساتھ اس قومِ عرب کا ملنا جلنا' اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا تھا' یہ اپنی شاہراہوں پر سے گزرتے تھے۔ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات ان کے سامنے تھے' ان کی داستانیں ان کے ہاں عام چلتی تھیں۔ اس لیے قرآن نے انہی کا ذکر کیا ہے اور ان میں بھی بنی اسرائیل کا خاص طور پہ ذکر کیا ہے۔ یہ انبیائے بنی اسرائیل تھے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ❶ کے متعلق ملتِ عزیز ابراہیم علیہ السلام اس لیے کہا ہے کہ یہ جو اسرائیل ہے یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اور بنی اسماعیل تھے۔ ان کے جدِ امجد' مورثِ اعلیٰ' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ وہاں سے یہ بات شروع ہوئی ہے۔ ان کے چھوٹے بیٹے حضرتِ اسحاق (حضرت سارہ کے بطن سے) اور بڑے بیٹے حضرتِ اسماعیل (حضرت ہاجرہ کے بطن سے) تھے۔ یہ ان کے دو بڑے بیٹے تھے۔ ان کے باقی بیٹے بھی تھے جن میں' تورات کے بیان کے مطابق' مدیان تھے جو حضرت قطورا کے بطن سے تھے۔ یہ حجاز کے قریب بحرِ احمر کے ساحل کے پاس متمکن ہوئے اور نام پایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے کنعان یعنی فلسطین و شام میں حکومت قائم کی اور اس طرح وہاں کی جو سرداریاں تھیں' وہ ان کے حصے میں آئیں۔ یہ بھی نبی تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وادی غیر ذی زرع میں کعبہ کی تولیت کیلیے چن لیا گیا

ادھر حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بادیہ فاران میں آ کے بسایا۔ یہ وادی غیر ذی زرع تھی۔ اس میں کعبہ کی تولیت کے لیے یہ بہت بڑی قربانی تھی' جو ان سے مانگی گئی۔ بڑے بیٹے ہونے کی حیثیت سے ساری سرداریاں ان کے حصے میں آتی تھیں۔ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ وہ وادی غیر ذی زرع' جہاں کچھ اگتا تک نہیں تھا' وہاں کھانے پینے تک کو کچھ نہیں تھا (14:35) کعبہ کی تولیت کے لیے انہیں وہاں بسا دیا اور یہ بڑی عظیم قربانی (37:106) تھی جو اسماعیل علیہ السلام سے مانگی گئی اور اس نے برضا و رغبت یہ قربانی پیش کی (37:102)۔ یہ وہی قربانی

---

❶ آپ کا زمانہ قریب ۲۲۰۰ ق م کا ہے۔ آپ دجلہ و فرات کی شاداب (لیکن خزاں در آستیں) وادیوں اور بابل و نینوا کی پرشکوہ (لیکن فنا در آغوش) آبادیوں سے ہجرت کر کے فلسطین کے علاقے میں سکونت پذیر تھے' جہاں عام ذریعۂ معاش گلہ بانی تھا۔ (پرویز' جوئے نور' ۱۹۹۴ء ص ص ۱۲ اور ۲۱۴)

ہے جواب آپ کے ہاں بھی ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر ہوتی ہے۔ یہ ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے حضرت اسحاق کی اولاد میں سے حضرتِ یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ان یعنی حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ ان سے جو اولاد آگے چلی ہے، وہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے تو جدِ امجد کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی یہ ساری نسل آ گئی، لیکن انہیں حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے اس لقب کی نسبت سے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے ساتھ ان کے بیٹے حضرتِ یوسف علیہ السلام نبی ہوئے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان میں آنے والے انبیاء کا کچھ Gap ہے۔ اس Gap میں قرآن نے تصریحاً ان انبیاء کا کچھ ذکر نہیں کیا جو حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان آئے۔

بنی اسرائیل کا شجرونسب

عزیزانِ من! جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (قطورا) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں ایک بیٹے کا نام ''مدین'' تھا۔ وہ حجاز کے قریب بحر احمر کے ساحل کے پاس شمال میں، شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ جو قافلہ حضرت یوسف علیہ السلام کو چاہ کنعان سے بازار مصر میں لے گیا تھا، وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ اسی قوم میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قبل از نبوت مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اسی بنی اسرائیل میں سے تھے جو حضرتِ یوسف علیہ السلام کی اولاد تھی یعنی وہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھی جو مصر میں سیٹل (Sttele) ہو گئی تھی۔ تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ ہارون علیہ السلام وہاں آتے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔ ان میں پھر جو دو نمایاں ہستیاں آتی ہیں: ایک حضرتِ داود علیہ السلام اور دوسرے حضرتِ سلیمان علیہ السلام، وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے آتے ہیں اور اس کے بعد پھر کچھ درمیان میں Gap آتا ہے۔ پھر بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے (حضرت یونس علیہ السلام کے بعد) حضرتِ زکریا علیہ السلام کا ذکر آتا ہے اور پھر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو شجرہ نسب دیا گیا ہے، اس میں وہ بھی انہیں حضرتِ داود علیہ السلام تک ملا دیتے ہیں اور وہاں انہیں ابن اللہ بھی کہا جا رہا ہے یعنی خدا کا بیٹا اور خود انجیل میں شجرہ نسب حضرتِ داود علیہ السلام سے جا کے مل جاتا ہے۔ آپ بھی انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے اور آپ کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام بھی بنی اسرائیل میں سے تھیں۔ اصل تو یوں ہے کہ یہ قصہ ہی بنی اسرائیل کا ہے۔

نبوت کا انتخاب قوانین خداوندی کی رو سے ہوتا تھا

ایک بات میں یہیں واضح کر دوں، آگے چل کر بھی وہ بات آئے گی۔ بات یہ نہیں ہے کہ یہ نبوت ایک خاص نسل کے اندر محدود و مختص ہو کے رہ گئی تھی اور یہ بھی نہیں ہے کہ نبوت باپ سے بیٹے کی طرف وراثت میں ملتی تھی اگرچہ ایسی صورت بھی ہے کہ باپ بھی نبی

ہے اور بیٹا بھی نبی ہے' لیکن وہ بیٹا ہونے کی حیثیت سے نبی نہیں ہو جاتا تھا۔ نبوت کسی کو وراثت میں نہیں ملتی' نبوت تو انتخابِ خداوندی کی رُو سے ملتی تھی۔ اب انتخاب خداوندی کی رُو سے' خدا کے معیار کے مطابق اگر کسی نبی کا بیٹا اس قابل سمجھا گیا کہ اسے نبوت دی جائے تو اس نبی کے بیٹے ہونے کی جہت سے وہ نبوت کا وارث نہیں ہوا ہے بلکہ یوں کہیے کہ وہ اتفاقاً ایک بات ایسی تھی کہ وہ اس معیار پر پورا اترا اور اسے منصب نبوت سے سرفراز کر دیا گیا۔

منصب کے انتخاب کا اصول

اب' عزیزانِ من! یہیں سے ایک سوال آ گیا اور وہ بڑا اہم سوال ہے کہ اگر کسی قابل باپ کا بیٹا قابل ہے اور کسی خاص منصب کے لیے وہ اہل ہو سکتا ہے تو اسے اس لیے اس منصب سے محروم نہیں کر دینا چاہیے کہ باپ بھی نبی تھا' بیٹا بھی نبی ہے' یہ بات تو وراثتاً ہو گئی۔ کسی کو وراثتاً یہ چیز نہیں مل سکتی۔ قرآن کی رُو سے تو ہر منصب اس کے اعمال' میرٹ' صلاحیتوں' اہلیتوں' قابلیتوں کی رُو سے ہر شخص کو ملے گا' وراثت میں کوئی چیز نہیں آئے گی۔ قرآن کریم میں تو یہ ہے کہ **لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** (6:132). اعمال کے مطابق درجات مقرر ہونگے۔ خود حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بھی جب خدا سے کہا اور اللہ نے اتنی نعمتوں کا ان سے وعدہ کیا تو آپ نے ان سے کہا کہ میرے ساتھ تو یہ ہو رہا ہے کہ میں نوعِ انسان کی لیڈر شپ (Leadership) کا مستحق قرار پا رہا ہوں۔ تو کیا میری ذریت' میری نسل' میری اولاد میں بھی یہ ساری چیزیں برقرار رہیں گی؟ تو وہیں کہہ دیا کہ **لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ** (2:124). یہ بات نہیں ہے اگر تمہاری اولاد میں سے ہی کوئی اس معیار پہ پورا نہ اترا اور وہ ظالمین میں سے ہوا تو اس سے ہمارا یہ وعدہ نہیں ہے۔ اس سے یہ نظر آ گیا کہ یہ جو چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان انبیاء بنی اسرائیل میں باپ بھی نبی اور اس کے بعد بیٹا بھی نبی تھا تو وہ بیٹا ہونے کی جہت سے نبی نہیں ہو گیا تھا' نہ نبوت وراثت میں ملا کرتی ہے۔ اس میں تو رشتہ داری کا کوئی سوال ہی نہیں' عزیزانِ من! رشتہ تو صرف طبعی چیز ہے' انتخابِ خداوندی میں تو یہ چیز ہے ہی نہیں۔ محض رشتے کی بناء پہ یہ بات ہوتی تو حضرتِ نوح علیہ السلام کا بیٹا کیوں نبی نہ ہوتا۔ وہ کفار میں رہا' اور دوسری طرف ایک بت ساز' بت تراش باپ آذر کا بیٹا ابراہیم نبوت سے سرفراز کیسے ہوتا؟ یہاں سوال رشتے کا ہے ہی نہیں۔ رشتے میں نبی اکرم ﷺ کے والد تو پہلے فوت ہو گئے تھے' والد کی بجائے' بہرحال یہ چچا تو موجود تھے' اسی دادا کے حقیقی بیٹے' ابولہب بھی تو حقیقی چچا تھا' ابوطالب بھی تو حقیقی چچا تھا' اس میں رشتہ کی بات ہے ہی نہیں کہ:

اندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

لیکن اس سے آگے ایک دوسری چیز بھی ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اگر کسی باپ کا بیٹا قابل ہے تو اسے اس سے اس لیے محروم نہیں کر دیا جائے گا کہ نہیں صاحب! پھر اس طرح سے تو یہ وراثتاً ہو جائے گا کہ دیکھو! باپ کے بعد بیٹا ہی نبی ہو گیا۔ یہ جو اتفاقی

چیزیں ہیں' یہ الگ ہو جائیں گی۔ ہر شخص کو عام میرٹ پر پرکھا جائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اس معیار پورا نہیں اتر رہا تو نبوت کا مسئلہ تو رہا ایک طرف وہ منعم بھی نہیں ہوسکتا لیکن اگر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا اس قابل ہے کہ وہ نبی ہو سکتا ہے تو انتخاب خداوندی کی رُو سے اسے نبوت مل جائے گی۔ لیکن حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا ہونے کی جہت سے اسے نبوت نہیں ملے گی۔

میں نے یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ یہ جو آتا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کے اندر باپ کے بعد بیٹا بھی نبی تو کسی کے ذہن میں کہیں یہ نہ آ جائے کہ نبوت اس طرح سے وراثت میں آیا کرتی تھی۔ نبوت تو ایک طرف' عزیزان من! وراثت تو کوئی شے ہی نہیں۔ ایم اے پاس باپ کا بیٹا بھی جب پیدا ہوتا ہے تو اسی قسم کا جاہل ہوتا ہے جیسا کہ اَن پڑھ مزدور کا ہوتا ہے۔ اِسے بھی الف ب پ پڑھانی پڑتی ہے اور اُسے بھی الف ب پ پڑھانی پڑتی ہے' ورنہ وراثت میں یہ چیزیں آ جاتیں تو پیدا ہوتے ہی ایک ڈگری ہاتھ میں لے کے آیا کرتا۔ اگر یہ چیز ہوتی تو بیٹے کو پیدائشی طور پر ایم اے ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو بالکل اسی طرح سے کورا ہوتا ہے' تو یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ انبیائے بنی اسرائیل میں جو یہ چیز آ رہی ہے' وہ وراثت کے اعتبار سے نہیں ہے۔ وہ معیار خداوندی کے مطابق انتخاب خداوندی ہے۔

یہاں اس آیت میں عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا (19:2) کا ذکر یوں آ رہا ہے کہ ذِكۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّكَ عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا (19:2) یہ اس رحمت ونوازش کا بیان ہے جو تیرے نشوونما دینے والے نے اپنے بندے' اپنے عبد' زکریا علیہ السلام پر کی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (19:3) ۔ زکریا علیہ السلام نے اپنے نشوونما دینے والے کو انتہائی خاموشی سے پکارا تھا۔ (3:37)

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل کی آرزو

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اسے ''ندآء خفیا'' کہا: زبان تک لفظوں کو نہ آنے دیا' دل کے اندر ایک خواہش پیدا ہوئی۔ وہ تو دلوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ ایک آرزو پیدا ہوئی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ آرزو ایسی نہیں کہ اسی بناء پہ کہا جائے کہ لو صاحب! ایک نبی ہے وہ بھی آرزو یہ کہہ رہا ہے کہ صاحب! میرے ہاں ایک بیٹا ہونا چاہیے۔ ارادہ یا نیت تو یہاں نہیں ہے۔ خدا نے تو کہا ہے کہ نبی کے بال بچے بھی ہوا کرتے تھے بلکہ وہ تو ان کی بشریت کے متعلق یہاں تک کہتا ہے کہ وہ بازاروں میں سودا سلف لینے بھی جایا کرتے تھے۔ لوگ روز اعتراض کیا کرتے تھے کہ لو صاحب! اچھا نبی ہے' ہمارے ہاں کے جو حضرت صاحب ہیں' وہ تو اپنی مکھی بھی آپ نہیں اڑاتے' ان کے تو ایک پیچھے کھڑا ہوتا ہے' وہ یہ کام کرتا ہے۔

ہمارے ہاں تو حضرت صاحب اپنی مکھی کو بھی خود نہیں اڑاتے

عزیزان من! ہمارے ایک دوست ہوتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بڑا مزاح ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ہوا یہ کہ ایک بہت بڑے حضرت صاحب

وہاں تشریف لائے۔ان سے بھی کہا کہ جی !چلیے ان کی ذرا زیارت کرآ ئیے۔وہ زیارت کرنے وہاں گئے۔آپ جانتے ہیں کہ ایک چیز ''تولی'' ہوتی ہے۔وہ جو حضرت صاحب کے تولی کرتے ہیں' وہ تو یہاں آپ نے نہیں دیکھا ہوگا۔وہ آپ نے ٹی وی پہ دیکھا ہوگا۔''مکھی ہووے ناں ہوئے' اوہنے ایں کردے ترے جاناایں' اور وہ اس لیے کہ اونوں ثواب ہونداناں ایہہ کرن اچ''۔ [1] حالانکہ وہ ''تولی'' اس لیے تھی تاکہ مٹی اڑادی جائے۔وہ ''تولی'' ویسے ہی گرنتھ [2] کے اوپر کرتا رہتا ہے۔حضرت صاحب کے ہاں بھی وہ اس قسم کے ہوتے ہیں جو یہ کچھ کرتے ہیں۔ہاں' تو میں اپنے دوست کی بات بتا رہا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے حضرت صاحب کی زیارت کو گئے۔وہاں سے واپسی پر اس حضرت صاحب کے آدمی کہنے لگے: جی! دیکھا۔وہ کہنے لگے! جی ہاں' بڑے بزرگ ہیں۔پھر کہنے لگے: ''منوں تے افسوس ہویا ایس گل دا' پئی اللہ تعالیٰ دے نزدیک اونہاں دی کھوتے جنی وی قدر نئیں ہیگی۔کہن لگا: کھوتے نوں اللہ میاں نے دم دے دتی کہ اپنی مکھی آپ ہلاوے۔پیچھے بندہ کھلوتا ہویا سی' دم ہلوندا سی پیا''۔ [3] وہ بڑے مزاح والے آدمی تھے۔

عزیزان من! بات ہو رہی تھی حضرت زکریا علیہ السلام کی کہ انہوں نے انتہائی خاموشی سے اپنے نشوونما دینے والے کو پکارا۔ان کے دل میں ایک آرزو پیدا ہوئی تھی۔ رہبانیت نہیں تھی کہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو۔خدا کہتا ہے کہ وہ کون ہے جو دنیا کی زیب و زینت جو ہم نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں' حرام قرار دے؟ خدا تو یہ کہتا ہے کہ نبی تو بال بچے والے ہو کر' عام لوگوں کی طرح' سودا لینے بازار جایا کرتے تھے۔وہ حضرت صاحب نہیں ہوتے تھے کہ ''اونہاں دیاں مکھیاں کوئی دوجا چلے'' [4]

حضور ﷺ کے اسوہ کی عظمت کی ایک روشن مثال

حضور ﷺ کے متعلق جو اسوہ حسنہ' جو سیرت' ہمارے سامنے آتی ہے' اس کی کیا بات ہے صاحب! ذرا دیکھو تو دیوار کے سائے تلے بیٹھے ہوئے اپنا جوتا بھی آپ گانٹھ رہے ہیں' بڑھ کے ایک دوست کہتا ہے کہ لائیے' یہ میں مرمت کردوں۔انہوں نے کہا کہ نہیں: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (6:164)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔مجھے اپنا کام آپ ہی کرنے دو۔یہ اس وقت کی بات ہے جب پورے عرب کی مملکت بھی اپنے ہاتھ میں آ گئی تھی صاحب! یہ ہے وہ اسوہ' عزیزانِ من! وہ مثال دے کے بتاتے ہیں۔اس میں نہ کسی

---

[1] (حضرت صاحب کے اوپر) مکھی بر اجمان ہو یا نہ ہو' انہیں تو بس مورچھل کرتے چلے جاتا ہے۔وہ اس لیے کہ ایسا کرنے سے انہیں ڈھیروں ثواب ملتا ہے۔

[2] سکھوں کی مذہبی کتاب۔

[3] مجھے تو اس بات کا افسوس ہوا کہ خدا تعالیٰ کے ہاں ان کی تو گدھے کی سی بھی قدر و منزلت نہیں ہے۔کہنے لگے کہ گدھے کو تو اللہ تعالیٰ نے دم دے رکھی ہے تاکہ اور کچھ نہیں تو اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھیاں تو خود اڑا تا رہے۔اس صاحب کے پیچھے تو ایک کھڑا تھا جو اس کی دم ہلا رہا تھا۔

[4] کہ ان پر بیٹھنے والی مکھیوں کو بھی کوئی دوسرا اڑائے۔

ندامت کی بات ہے' نہ کوئی جرم کی بات ہے۔ آج کہیےتو سہی انہیں جو آپ کے ہاں کے بڑے بڑے مقرب بنے پھرتے ہیں کہ یہ کچھ کیجیے۔ اپنا جوتا گانٹھنا تو ایک طرف رہا' اگر وہ اٹھتے ہیں تو اپنا جوتا بھی آپ نہیں سیدھا کرتے۔ وہ جوتا سیدھا کرنے والے دوسرے ہی ہوتے ہیں۔

بڑھاپے کے احساس کے ساتھ ساتھ ایک وارث کی آرزو

ہاں' تو بات ہو رہی تھی حضرتِ زکریا کے اپنے نشوونما دینے والے کو انتہائی خاموشی سے پکارنے کی۔ کسی نبی کے دل میں' اس خیال یا اس آرزو کا پیدا ہو جانا کہ ''بیٹا ہونا چاہیے'' شرفِ نبوت یا خدا کے ہاں کے مقرب ہونے کے شرف کے خلاف نہیں جاتا۔ یہ کوئی بُری بات نہیں ہے کہ ایسا خیال پیدا ہو جائے لیکن آگے جا کے ہم یہ بتائیں گے کہ ان کے دل میں یہ خیال کس مقصد کے لیے پیدا ہوا تھا۔ میں یہ بات وہیں عرض کرونگا' وہ چوتھی آیت ہے۔ وہ آرزو' وہ خیال ''نداءً خفیا'' تھا۔ ابھی حروف کے تانے بانے سے ثوب نہیں بنا تھا۔ زکریا علیہ السلام نے کہا: قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْ ۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا (19:4)۔ اے میرے پروردگار! بڑھاپا طاری ہو گیا' آرزو یہ رہی کہ کوئی وارث ہونا چاہیے' بیٹا ہونا چاہیے' ساری عمر نہیں ہوا تو میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ جوانی کے زمانے میں' جب اس کا امکان تھا' اولاد پیدا نہیں ہوئی' تو اب اس بڑھاپے کے زمانے میں جب کہ میرے سر کے بال بالکل سفید ہو گئے' دل میں یہ کچھ خیال آتے ہی کچھ ایسا آتا ہے' کہ...... عزیزانِ من! کیا انداز ہے قرآن کا! زکریا علیہ السلام نے کہا: خیال بھی دل میں پیدا ہو رہا ہے' ساتھ یہ بھی احساس ہو رہا ہے کہ جوانی میں نہیں ہوا تو اس بڑھاپے میں کہاں سے اولاد ہو جائے گی۔ لیکن کہا کہ یہ ایک ہی چیز ہے جس سے کچھ ڈھارس بندھتی ہے یا کچھ امید پیدا ہوتی ہے کہ تو اے پروردگار! اتنا بڑا ہے کہ اس سے پہلے میں نے جو مانگا' تو نے دیا۔ اس اعتبار سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آج یہ بھی مانگ لوں تو کوئی بعید نہیں کہ تو دیدے' میرے مانگنے والے ہاتھوں کو تو نے کبھی خالی نہیں لوٹایا' جب بھی میں نے تیرے دروازے پہ دستک دی ہے' جو مانگا ہے' تو نے دیا ہے تو جب عمر بھر میرے ساتھ تیری یہ روش رہی ہے' پھر اس سے یہ ڈھارس بندھتی ہے کہ ہاں! یہ ماہ و سال کتنے ہی کیوں نہ ہوں تیرے ہاں اس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ صاحب! یہ دیکھا آپ نے کہ بشر کی کیفیت کیا بتائی جا رہی ہے۔

کہا: یہ کیوں مانگ رہا ہوں۔ دو لفظوں میں بات آ گئی عزیزانِ من! وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا o یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ صلے وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا (19:5-6) میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اس لیے نظر بظاہر اب مجھے اولاد کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔ اور اولاد نہ ہونے کا غم اس لیے ہے کہ ہمارے جدامجد حضرت یعقوب علیہ السلام کی برکات اور خصوصیات' اس گھرانے میں' نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہوئی مجھ تک پہنچی ہیں۔ میرے بھائی بندوں میں کوئی اس قابل نہیں جو ان کا اہل ہو سکے اس لیے مجھے ڈر ہے کہ وہ میرے بعد انہیں ضائع کر دیں گے اور یہ سلسلہ

آ گے نہیں چل سکے گا۔اس لیے میری دعا یہ ہے کہ تو اپنی جناب سے مجھے کوئی ایسا وارث عطا کر دے جوان برکات ونعماء کا اہل بن سکے تا کہ میں انہیں اس کے سپرد کر جاؤں۔وہ ایسا ہونا چاہیے جو اس منصب جلیلہ کے لیے ہر طرح سے موزوں اور تیری نوازشات کا صحیح طور پر مستحق ہو۔عزیزانِ من! آپ خاص طور پر بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس دور کو دیکھیے جواب آ گیا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں وارث ہونے کی آرزو کیوں؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل میں اتنی برائیاں عام ہوگئی ہوئی تھیں کہ ان سے کسی خیر کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔وہ دیکھ رہے تھے کہ کیفیت یہ ہوگئی ہوئی ہے۔خودان کے اپنے بھی بھائی بند تھے' بھتیجے بھانجے کہہ لیجیے۔ آپ' انہیں عزیز رشتہ دار کہہ لیجیے۔اس کے بعد آنے والے بنی اسرائیل میں خیال یہ تھا کہ سلسلۂ رشد وہدایت کی یہ چیز شروع سے بنی اسرائیل میں ہی آتی گئی ہے' خدا کے ہاں کی یہ برکات' یہ نبوت بھی' یہ جو کچھ بھی حضرتِ یعقوبؑ سے لے کے اس وقت تک ان گھرانوں کے اندر چلا آ رہا ہے ان کی جو تعلیم چلی آ رہی ہے' جوان کے سارے کے سارے صحیفے چلے آ رہے ہیں' میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ جو حالی موالی ہیں' ان میں کوئی اس قابل نہیں ہے کہ تیرے اس نام کو آگے پہنچا سکے' صحیح معنوں میں ان کا وارث ہو سکے۔عزیزانِ من! کوئی جائیداد نہیں جس کا فکر ہو کہ ''ہائے کروڑاں دی جائیداد اے شریکے لے جانگے سارے''۔ ❶ ہمارے ہاں تو بڑھاپے میں اس لیے یہ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں کہ وہ جائیداد دوسرے لے جائیں گے۔وہاں یہ سوال نہیں ہے۔وہ کہہ یہ رہے ہیں کہ یہ جو میرے حالی موالی ہیں' ان میں تو اس کا دم خم نہیں ہے۔ اور یہ کچھ رہنا ہے بنی اسرائیل کے اندر۔تیرا یہی انداز چلا آ رہا ہے اور مجھے ان میں کوئی اس قابل نظر نہیں آتا تو مجھے یہ غم مارے جا رہا ہے کہ

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد ❷

کیا بات ہے اس مرثیے کی' صاحب! جو یہ سچ کہہ گیا ہے:

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تولیتِ مہر و وفا میرے بعد ❸

کچھ یہ بات تھی' جو حضرتِ زکریا علیہ السلام کے دل میں گزری' کہ غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی' کہ کرے مہر و وفا میرے بعد۔ کہا: وَ اِنِّیۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِیَ مِنۡ وَّرَآءِیۡ (19:5)۔ڈرتا ہوں کہ اب یہ رہے ہیں سارے کے سارے' ان کے ہاتھوں سے یہ جو

---

❶ ہائے افسوس! (کوئی وارث نہیں) یہ کروڑوں کی جائیداد شریکے اور برادری والے لے جائیں گے۔

❷ آئے ہے بیکسئ عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد (غالب)

❸ غالب مرزا اسد اللہ خان' دیوانِ غالب' جہانگیری بک ڈپو لاہور' ۲۰۰۲ء' ص ۶۵ پر یہ شعر آیا ہے۔
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

اتنا بڑا اسرمایہ، یہ اتنا بڑا اثر کہ جو اتنی صدیوں سے یوں محفوظ چلا آ رہا ہے، اجڑ جائے گا۔ ان میں مجھے ایک بھی ایسا نظر نہیں آ تا جو تیرا نام لے کے آگے آئے۔ یَّرِثُنِیۡ وَیَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ (19:6) یہ ہے وہ بات کہ یہ جو بنی اسرائیل کے وقت سے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقت سے اس گھرانے کے اندر یہ جو کچھ چلا آ رہا ہے مجھے اس کا کوئی اہل نظر نہیں آ تا تو اس لیے میرے دل میں یہ خیال بار بار گزرتا ہے کہ میرا بیٹا ہوتا تو میں اس کی تعلیم وتربیت اس طریق سے کرتا کہ وہ ان چیزوں کا وارث بن سکتا، نبی نہ صحیح ان کا وارث تو بنتا۔ بات اور آگے کردی صاحب! کہ یہ سب کچھ جو کہہ رہا ہوں، جائیداد کے لیے نہیں، اپنے کسی جذبے کی خاطر نہیں بلکہ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا (19:6) کے لیے ہے۔ یعنی چاہتا یہ ہوں کہ تیرے ارشادات سے ہم آہنگ زندگی بسر کرنے والا ایک دیدے۔ یہ ہے وہ جو اس کی خصوصیت بتائی گئی ہے۔

قرآن میں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا استعمال

یہی خصوصیت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب نبوت ختم ہوئی ہے تو یہ جتنے برکات اور سحاباتِ ❶ کرم کے لیے چیزیں آتی تھیں، ان کے لیے آگے آپ کہیں گے کہ ان کا کوئی وارث ہو جو ان سے رضی ہو، جو ان سے ہم آہنگ ہو۔ خدا نے ان مؤمنین کے لیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے لیے کہا: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تو یہ سلسلہ نبوت ان کی اولاد میں یا نسل میں نہیں چلنا تھا اور نبوت بھی ختم ہوگئی ہوئی تھی تو پھر یہ کون ہونے تھے؟ زکریا علیہ السلام نے تو کہہ دیا کہ "مجھے بیٹا دے تاکہ وہ رضی ہو"۔ یہاں ختم نبوت کے بعد تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ بیٹا رضی ہو۔ یہاں تو کہا کہ اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی کا باپ نہیں ہے"۔ یہ دیکھیں وہ آیت کہاں آ گئی ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، کوئی بات نہیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، نبوت تو ختم ہوگئی۔ بنی اسرائیل کے گھرانے کی طرح یہ نہیں ہے کہ آگے بیٹا ہوتا، شاید وہ نبی ہو جاتا لیکن یہ سوال ہی نہیں ہے صاحب! ہونا تو وہ چاہیے جیسے زکریا علیہ السلام نے کہا تھا کہ رضی ملنا چاہیے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کوئی ایک بیٹا ہوتا شاید وہ رضی ہوتا۔ یہاں تو پوری کی پوری امت اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا: رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ۔ یہ سارے رضی ہیں، کوئی بیٹا نہیں ہے تو کیا ہو گیا، یہ سب تیرے بیٹے ہیں، رضی یہ ہونا چاہئیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں آرزو ابھری۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آرزو شاید ابھی لفظ بن کر زبان پہ بھی نہیں آئی ہوگی۔ مانگنے والے نے یوں مانگا اور جس نے کہا تھا کہ میری کوئی دعا، کوئی آرزو آج تک ایسی نہیں جو تو نے نہ پوری کی ہو، میں تو تیرا بڑا ہی لاڈلا ہوں، اس کی زبان تک ابھی بات نہیں آئی تھی کہ پیغام آ گیا: يٰزَكَرِيَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۣاسۡمُهٗ يَحۡيٰى (19:7)۔ اے زکریا علیہ السلام! ہم نے

---

❶ سحاب کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں: بادل، ابر، گھٹا

تمہاری دعا سن لی۔اے زکریا علیہ السلام! اب سن لو' ہم تمہیں ایک بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری دیتے ہیں۔ جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام یحییٰ علیہ السلام رکھنا۔ ہاں! ٹھیک ہے تمہارے ہاں بیٹا ہوگا' اس کا نام یحییٰ علیہ السلام رکھنا' ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں۔ وہ سورۃ العمران میں جہاں یہ چیز آئی ہے' وہاں یہ ہے کہ ''ملائکہ نے آواز دی''۔ یہاں یہ ہے: اِنَّا نُبَشِّرُکَ (19:7)۔ ''ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں۔'' وہ خدا کی بشارتیں ہیں جو وہ اپنے ملائکہ کی وساطت سے بھی دیتا ہے۔ خدا اسی کو براہِ راست اپنی کہتا ہے۔ یہ ان ملائکہ کی بشارتیں نہیں ہیں' وہ ملائکہ صرف پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ چٹھی رساں (Postman) جو چٹھی (Letter) لاتا ہے وہ چٹھی رسان (Postman) کی چٹھی (Letter) نہیں ہوتی' وہ چٹھی (Letter) تو بھیجنے والے کی ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں ''نُبَشِّرُکَ'' کہا: ہم ایک بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔ اور بیٹا بھی بڑھاپے کے زمانے کا بیٹا ہے۔ عام طور پر بڑھاپے کی اولاد کمزور ہوتی ہے۔ بڑھاپے کی اولاد کے متعلق تو پوچھو نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے' کمزور پیدا ہوتا ہے۔ کہا: تو یہ غم نہ کر کہ بڑھاپے کے زمانے میں یہ اولاد پیدا ہوگی تو اس کا پتہ نہیں کہ کیسی ہوگی' اس کا غم نہ کر۔ اس کا یہ لفظ ہی آیا ہے جسے ہم نے پھر بعد میں کہا کہ ان کا نام ہی یحییٰ ہوا' ''ایدا ترجمہ ہی جیونا''۔ ❶ تو ہمارے ہاں ایک نام جیونا ہوتا ہے۔ ''جناں دے بچے عام طور تے مرجاتے ہوں ناں تو اوفیر اونوں جو بچہ پیدا ہوندا اے تو اوہدا ناں ای جیونا رکھ دیدنے ہیگے' جیوندا جاگدا رہن والا''۔ ❷ یہ لفظ یحییٰ کا لفظی ترجمہ ہے۔ یہ حیات سے ہی تو ہے' حیّ سے تو ہے یعنی ''جیوندے جاگدا رہن والا' تے جیون والا' وڈی عمر والا' برکت والا ہووے''۔ ❸ بشارت دی کہ ایہو جیا بچہ تینوں دیواں گے۔ ❹ کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہوگئی اس بیٹے کی زندگی کے متعلق کہ یحییٰ ہوگا' جیتا جاگتا ہوگا۔ پھر کہا: لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِيًّا (19:7) تمہارے خاندان میں اس بیٹے کی مثل و نظیر کہیں نہیں ملے گی۔ وہ بیٹا ایسا ملے گا صاحب! تمہیں یہ ڈر ہے ناں کہ اس قسم کے یہ جو سارے بھتیجے بھانجے پیدا ہوئے ہیں یہ بنی اسرائیل وراثت ضائع کر دیں گے۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ بیٹا ایسا ہوگا کہ تمہیں اس کی مثال نہیں ملے گی۔

یہ کیسے ہوا تھا' آگے چل کے یہ بات آجاتی ہے۔ اس میں بھی' کوئی اس قسم کا خلافِ فطرت' جسے ہم معجزہ کہتے ہیں' نہیں تھا۔ خدا نے قرآن میں خود بتا دیا ہے کہ یہ کیسے ہوا تھا تو یہ ہم آئندہ چل کے بیان کریں گے کیونکہ آج وقت ہوگیا۔ سورۃ مریم کی پہلی سات آیات تک ہی ہم آسکے ہیں' آٹھویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

---

❶ اس کا ترجمہ ہی ''جیتا رہنے والا'' ہے۔

❷ جن کے بچے عام طور پر پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں' ان کے ہاں پھر جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کا نام ہی جیونا رکھ دیتے ہیں یعنی جینے والا' نرم و ملائم رہنے والے۔ دل گداز والا۔ جاگتے رہنے والا۔

❸ جیتا رہنے والا' جاگتا۔ زندہ و سلامت۔ رکھنے والا' بڑی عمر والا' خیر و برکت لانے والا۔

گیارھواں باب: سورۃ مریم (8 تا 15)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿٨﴾ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ
هُوَ عَلَیَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴿٩﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ
النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿١٠﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً
وَّعَشِيًّا ﴿١١﴾ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا
بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (19:8)۔ انہوں (حضرت زکریا علیہ السلام) نے یہ کہا کہ یا اللہ! اب میرے ہاں اولاد ہونے کا یہ کونسا وقت ہے' تمنا تو میرے دل میں ضرور ہے لیکن طبعی طور پر بھی اگر دیکھا جائے تو میری بیوی تو بانجھ چلی آ رہی ہے- اور میری عمر بھی بڑھاپے میں پہنچ رہی ہے۔ عام حالات میں تو ایسے وقت میں اولاد نہیں ہوتی' مجھے بیٹے کی بشارت دی جا رہی ہے تو یہ کیسے ہوگا؟

قرآن ہمیشہ حقائق سے بحث کرتا ہے' لطائف بیان نہیں کرتا

ہمارے ہاں تو آپ کو معلوم ہے کہ ہر حقیقت کو افسانے میں بدل دیا جاتا ہے۔ اس سے کچھ لطف پیدا ہوتا ہے۔ جب تک مذہب میں کوئی چیز افسانہ نہ بن جائے' اسمیں کوئی جاذبیت اور کشش پیدا نہیں ہوتی۔ قرآن تو حقائق سے بحث کرتا ہے' لطائف نہیں بیان کرتا۔ مگر ہمارے ہاں لطائف پیدا کرنے کے لیے بھی تفسیروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ پوچھیے نہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے طبعی موانعات کے خیال کے پیش نظر' اپنے اطمینان کی خاطر پوچھا تھا کہ میرے ہاں اب لڑکا کس طرح پیدا ہوگا؟ تو اس کے جواب میں یہ بات کہی گئی کہ **قَالَ كَذٰلِكَ** (19:9۔ کہا: ''جس طرح ہوا کرتا ہے' اسی طرح سے ہوگا۔'' اسی طرح ہوگا جس طرح لوگوں کے ہاں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی اگر ہم پہلے سے اپنے ذہنوں کے اندر کوئی تصورات قائم کر لیں تو پھر تو ذرا فہم قرآن دشوار ہو جاتا ہے۔ دشوار یہ نہیں ہوتا کہ قرآن مجھ سے کچھ لے جاتا ہے' دشواری یہ ہے کہ ہم اپنے تصور کے مطابق قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں' وہ ڈھلتا نہیں ہے اس لیے وہ مشکل

مشکل ہو جاتا ہے۔ ''تے ریتی نال رگڑ دے نیں اونوں' کہ فِٹ بیٹھ جائے''۔ [1] یاد رکھیے! قرآن نے پہلی شرط یہ قرار دی ہے: لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ (56:79)۔ قرآن سے تمسک اسے ہو سکے گا جو پہلے اپنے دماغ کو غیر قرآنی تصورات سے پاک کر لے' اس کی طرف Clean Slate لے کر آئے' پھر دیکھیے یہ کیسے بولتا ہے۔ تو لڑکے کے پیدا ہونے کی بات صاف تھی۔ کہا تھا: کَذٰلِکَ (19:9)۔ جس طرح سے ہوتا ہے' اسی طرح سے یہ ہوگا۔ یہ تمہیں کچھ دشوار نظر آتا ہے۔ قَالَ رَبُّکَ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ (19:9)۔ کہا: ہمارے قانون کی رُو سے یہ کچھ مشکل بات نہیں ہے جو تمہیں اس قدر مشکل نظر آ رہی ہے۔ باقی رہا یہ کہ ہمارے قانون کی رُو سے کیا کچھ ہوا کرتا ہے' تم تو یہی کہہ رہے ہو' مرد بھی موجود ہے' عورت بھی موجود ہے' میاں بیوی تم دونوں موجود ہو' اس کے بعد آگے بات چلنی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کے سمجھانے کی! وَقَدۡ خَلَقۡتُکَ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ تَکُ شَیۡـًٔا (19:9)۔ ہمارے جس قانون نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا حالانکہ تیری ہستی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ہمارا قانون تو یہ ہے کہ جب یہاں کچھ بھی نہیں تھا' اس سے یہ اتنی بڑی کائنات وجود میں آ گئی۔ تم خود اسی طرح سے وجود میں آ گئے تو اس قانون کی رو سے تو یہ کچھ ہو سکتا ہے اور یہ کہ تمہارے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کیسا انداز ہے سمجھانے کا! اب یہاں جو کہا ہے کہ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ وَّقَدۡ خَلَقۡتُکَ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ تَکُ شَیۡـًٔا (19:9)۔ یہ کچھ ہمارے قانون کی رو سے مستبعد نہیں اور ہمارے قانون نے خود تجھے بھی پیدا کیا ہے۔ جیسے طبعی قانون کے تابع ہوتا ہے' ویسے ہی ہوگا۔ یہ کچھ ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ وہ کونسی آسان بات تھی جو قرآن نے بتائی؟ وہ کیا طریق تھا جس کے لیے کہا کہ جیسے ہوا کرتا ہے ویسے ہی ہوگا؟ میں نے کہا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ ایک بات جو یہاں کہی گئی ہے' دوسرے مقام یا مقامات پہ بھی دیکھیے کہ اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے' وہ اس کی تشریح کر دے گا' دونوں کو ملانے سے بات صاف ہو جائے گی۔ دوسرے مقام پہ جہاں یہ داستان آئی ہے وہاں یہ کہا ہے کہ اس کے بعد وَاَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ (21:90)۔ اور اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی میں کوئی طبعی نقص تھا

عزیزانِ من! یہ جو کہا ہے کہ یہ کچھ کرنا زیادہ مشکل بات نہیں ہے تو اس کے لیے یہ کہا کہ اس کی بیوی میں نقص تھا' اصل میں طبعی نقص تھا' کوئی بیماری تھی تو اس کا علاج ہوا' وہ بیماری دور ہو گئی' وہ اولاد کے قابل ہو گئی یعنی اس طرح: وَاَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ (21:90)۔ کیا عجیب لفظ ہیں! ''لہ'' کے معنی ''اس کے لیے'' یعنی وہ تو ٹھیک تھا' اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت تھی تو بیوی میں کوئی بیماری تھی۔ اَصۡلَحۡنَا کا لفظ بتا رہا ہے کہ وہ نقص دور ہو گیا اور وہ اس قابل ہو گئی کہ آگے اولاد پیدا کر سکے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس کے لیے کہا: ہُوَ عَلَیَّ

---

[1] اسے ریتی کے ساتھ رگڑتے ہیں تاکہ وہ اس کے ساتھ فٹ ہو جائے۔

هَیِّنٌ (19:9)۔ یہ کرنا میرے لیے سہل اور آسان ہے۔ اسی آسان و سہل کے لیے فوراً کہا تھا کہ قَالَ كَذٰلِکَ (19:9)۔ ''ایسے ہی ہوگا' جیسے ہوتا ہے''۔ یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہی تھا کہ اس وقت وہ علاج نہیں ہو سکا تھا' اس کے بعد وہ علاج ہوگیا اور قرآن نے بتا دیا کہ اس کی بیوی کو اس قابل بنا دیا' اس کی اصلاح کر دی' جو نقص تھا دور کر دیا اور وہ اس کے قابل ہوگئی کہ اولاد ہو' اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگیا۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً (19:10)۔ زکریا علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے پروردگار! اس باب میں میرے لیے کوئی خاص حکم ہو تو بتا دیجئے' کوئی علامت ہو تو ارشاد فرما دیجیے۔ یہاں قرآن نے ایک نفسیاتی سی بات بیان کی ہے کہ اس بات کے اوپر Concentrate کردو' اسے اطمینان حاصل ہو جائے: قَالَ اٰيَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (19:10)۔ خدا نے کہا کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم مسلسل تین دن اور رات کا روزہ رکھ لو (3:40)۔ اور جیسا کہ روزے میں ہوتا ہے لوگوں سے بات چیت نہ کرو۔

یہودیوں کے ہاں چپ کا بھی روزہ رکھا جاتا تھا

یہودیوں کے ہاں روزوں میں بھی بولا نہیں کرتے تھے تو چپ کا روزہ بھی ہوتا تھا۔ یہ کہا کہ مسلسل تین دن رات ایسا روزہ رکھو جس میں بولا بھی نہیں کرتے۔ اس چیز کے اوپر Concentrate کرو۔ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (19:11) کہ (حضرت زکریا علیہ السلام) وہ ہیکل' عبادت گاہ' یا قربان گاہ' جسے اس زمانے میں کہا کرتے تھے' سے نکلے اور جو لوگ ان کی اقتداء میں خدمات انجام دینے کے لیے ہیکل' عبادت گاہ یا قربان گاہ میں جمع تھے' ان سے اشارہ سے کہا کہ (میری ہدایات کا انتظار نہ کرو بلکہ) معمول کے مطابق صبح و شام' اپنے فرائض کی ادائیگی کرتے رہو۔ نظر آتا ہے کہ حضرت زکریا وہاں ایک بلند منصب رکھتے تھے' ان کے زیر ہدایت وہاں بہت سے اور لوگ بھی کام کاج کرتے تھے' تو وہ آئے اور انہوں (حضرت زکریا علیہ السلام) نے ان لوگوں کو حکم دیا۔ یہاں لفظ اَوْحٰى آیا ہے۔ یعنی وحی کا لفظ ہے۔ وحی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جہاں بھی یہ لفظ آئے' اس کے معنی ہوتے ہیں' خدا کی طرف سے' جبریل کی وساطت سے' کسی پر کسی حکم کا آنا۔ یہ وحی کا صرف ایک گوشہ ہے۔ قرآن نے وحی کے معنی یا وحی کا استعمال صرف انہی معنوں میں نہیں لیا کہ کسی نبی کی طرف' خصوصیت سے جو وحی آئے ''رسالت کہلائے گی۔ اس کے بنیادی معنے ہوتے ہیں'' لطیف طریقے سے کوئی بات کہنا'' اور استعمال کی رُو سے' خود عربوں کے ہاں ''کسی کی طرف کوئی حکم بھیجنا' کسی سے کوئی اس قسم کی بات کرنا'' یہ سارا کچھ وحی کہلاتا تھا۔ [1] وہ جو ہمارے ہاں ''پنجابی نبوت'' تھی۔ ''انہوں'' [2] نے اپنی خود ساختہ نبوت کے دلائل دیئے تھے صاحب! کہا تھا کہ ان کی طرف وحی ہوتی ہے تو اس نے یہ بھی کہا

---

[1] اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن النحل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' ۲۰۰۳ء' ص ص۔ ۱۲۱ تا ۱۲۲' ۲۷۳ تا ۲۷۹۔

[2] مرزا غلام احمد آف قادیان (۱۹۰۸۔۱۸۳۵ء) کی طرف اشارہ ہے۔

تھا کہ صاحب! دیکھیے وحی نبی ہی کی طرف نہیں ہوا کرتی ' اُمّ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن نے کہا ہے کہ اس کی طرف وحی ہوتی تھی ' حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے متعلق بھی تو ہے کہ ان کی طرف وحی کی تھی ۔ اب کیا کیا جائے صاحب! جن بڑے بڑے لوگوں نے بھی اس طرح کے باطل کے دعوے کیے لیکن جہاں تک میری نگاہ نے میری یاوری کی ہے یا جہاں تک میرا مطالعہ ہے ' میں سمجھتا ہوں کہ اتنا بڑا جاہل کوئی بھی مدعی نہیں ہوا۔ وہ شخص عربی زبان کے مبادیات تک سے ناواقف ہے ' اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ وحی کا لفظ عربی زبان میں کس کس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عربی زبان میں لفظ وحی کا مختلف انداز میں استعمال

عربوں کے ہاں یہ بات ہے کہ اگر کسی کی طرف کوئی اپنا حکم ' اپنی ہدایت ' اپنی بات ' دوسرے سے ' کسی طریقے سے ' پہنچائی جائے بشرطیکہ اس کا ذرا لطیف پیرایہ ہو یا جسے ہم کہتے ہیں پہچانے کا خفیہ انداز ہو ' وہ اسے وحی کہتے ہیں۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف خدا کی طرف سے وحی آئی جو خدا کی رسالت ہے۔ انہوں نے اس حکم کو اپنے حواریوں تک پہنچایا ' یہ بھی عربی زبان میں وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی مامور کو ' اپنے کسی نبی کو ' ایک پیغام دیا کہ امِ موسیٰ علیہ السلام کو یہ پیغام دے دو ' وہ پیغام دے کے آیا ' یہ بھی وحی ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ شہد کی مکھیوں کی طرف بھی خدا وحی کرتا ہے۔ یہاں اس آیت میں بھی وہ لفظ ''اوحیٰ'' آیا ہے۔ حضرتِ زکریا علیہ السلام نے اپنے ماتحتوں کو وحی کی ' تو آپ سوچیے تو سہی کہ اگر وحی کے معنی وہی ہیں ' ایک ہی معنی ہیں تو یہاں اس کے کیا معنی ہونگے۔ اس کے معنی ہیں کہ ان کو زبانی بات نہیں کہی کیونکہ اس چپ کے روزے میں بولنا نہیں تھا ' لکھ کے حکم دے دیا ' اشارے سے کوئی بات سمجھا دی۔ تو انہیں یہ کہا کہ تم اپنے کام میں حسبِ معمول صبح شام لگے رہو۔ میں ذرا تم سے تخلیے میں رہونگا۔ انہوں نے انہیں یہ Instructions یا Directions دے دیں۔ کتنی صاف بات چلی آ رہی ہے ' کوئی چیستاں نہیں ' کوئی معمہ نہیں ' اور اس کے بعد پھر قرآنِ کریم ' جیسا میں نے عرض کیا تھا ' کہ وہ ایک داستان کی اُن کڑیوں کے جو نمایاں گوشے ہوتے ہیں انہیں سامنے لاتا ہے ' درمیان میں جو Gaps ہوتے ہیں ' ان کے لیے خود کہتا ہے: Fill in the Gap وہ ایک انسانی عقل و شعور و فکر کو یہ کہتا ہے کہ اب درمیان کی جو چیزیں ہیں ' انہیں تم خود درمیان میں رکھ لو ' داستاں بن جائے گی ' میں بچوں کی درسی کتاب تو نہیں دے رہا کہ تمہیں یہ سارا کچھ بتاؤں۔ یہاں تک کہا۔ اس کے بعد بیٹا پیدا ہوا ' بڑا ہوا ' یحییٰ اس کا نام رکھا۔ اور وہ صاحبِ کتاب ہوا۔

قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ ہوتا ہے

اسے کہا گیا کہ یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (19:12)۔ اے یحییٰ علیہ السلام! قانونِ خداوندی کو لو اور اسے قوت کے ساتھ نافذ کرو۔ اب اس آیت میں دیکھیے کتاب تو قانون ہوتا ہے اور ''بقوۃٍ'' قانون کے ساتھ اگر قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ وعظ بن کر رہ جاتا ہے ' اس کا کوئی

مصرف ہی نہیں رہتا۔ قانون کے پیچھے قوت ہونی چاہیے جو اس کو نافذ کر سکے۔ دیگر انبیائے کرام کی طرح یحییٰ علیہ السلام سے بھی یہ کہا گیا کہ ''کتاب'' کو لو‘ قانونِ خداوندی کو لو اور اس کو قوت کے ساتھ پکڑو‘ عمل کرو‘ عمل کراؤ: وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا (19:12)۔ یہاں دو چار باتیں ایسی کہی ہیں کہ جس سے نگاہ کا رخ دوسری طرف جا سکتا تھا۔ عام طور پر بڑھاپے کی اولاد یا ایک عورت جو عمر بھر اس طرح سے بانجھ رہی ہو‘ اس کے ہاں کا یہ بچہ‘ عموماً‘ عام طور پہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا کمزور سا پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس میں کئی نقائص بھی رہ جایا کرتے ہیں۔ عام طور پر ایسے بچے کی قدم قدم پہ احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی کسی قسم کا نقص ہو مگر قطعاً نہیں‘ قرآن نے تو یہ بتایا کہ یہ بات بھی نہیں تھی: ''وہ بچہ بڑا ہونہار تھا‘ بچپن میں ہی بڑی دانشمندی کی باتیں کیا کرتا تھا۔''

پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے‘ اس زمانے میں ان لوگوں کے ہاں نوجوان یا اولاد بڑی سرکش پیدا ہوتی تھی‘ اخلاقی طور پر ساری قوم ہی تباہ ہو گئی ہوئی تھی‘ ماں باپ کے ساتھ سختیاں کرنا‘ سرکشی اختیار کرنا‘ ان کا عام معمول تھا اور یہ چیزیں انجیل میں بھی ہیں۔ خود حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی غلط انجیل‘ جو محرف انجیل ہے‘ میں اس کی بات کر رہا ہوں یہ چیز ہے کہ وہ کس طرح سے ایک دوسرے کو ڈانٹا کرتے تھے‘ ماں کو بھی جھڑکیاں دیا کرتے تھے‘ تو گویا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں یہ عام روش ہو گئی تھی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی عادات‘ عقل و شعور اور خصائل

تو یہ جو حضرتِ یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں‘ انہیں نبی بننا تھا۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ آپ کی عادات و اطوار اس زمانے کے عام نوجوانوں کے بالکل برعکس تھیں۔ ان کا کیریکٹر‘ ان کی سیرت‘ اس زمانے کے عام نوجوانوں سے بالکل مختلف تھی۔ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِیًّا (19:13)۔ ان کی نشوونما بھی نہایت اچھی ہوئی تھی (زکٰوۃ)۔ ان کے دل میں گداز تھا‘ سوز تھا‘ ہمدردی تھی۔ ہم نے اسے‘ اپنے ہاں سے رقتِ قلب‘ سوز و گداز اور ماں کی سی محبت کرنے والا دل عطا کیا تھا (حناناً)۔ یہ جذبات تھے تو گویا نظر آتا ہے کہ اس زمانے کے عام نوجوان ان جذبات سے عاری تھے مگر وہ ان پابندیوں کی‘ جو عائد کی گئی تھیں‘ کی نہایت نگہداشت (تَقِیًّا) کرنے والے تھے۔ وَبَرًّاۢ بِوَالِدَیْهِ وَلَمْ یَكُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا (19:14)۔ اور وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لیے اپنے دل میں بڑی کشادگی رکھتا تھا۔ ان سے حسنِ سلوک سے پیش آتا تھا اور سخت گیر یا سرکش نہیں تھا۔ یہ تھیں وہ خوبیاں جن کا مالک وہ بچہ تھا۔

دیکھیں کہ یہ باتیں خاص طور پہ کہنی پڑیں کہ وہ باقی نوجوانوں کی طرح نہیں تھا‘ جو ماں باپ کو ڈانٹا کرتے تھے‘ سرکشی اختیار کیا کرتے تھے‘ ان پہ جبر کیا کرتے تھے۔ مگر یہ ایسا نہیں تھا‘ یہ نہایت دانشمند‘ ہونہار‘ سیرت و کردار کے اعتبار سے بلند‘ سینے میں ایک ہمدرد دل رکھنے والا بچہ تھا۔ اس قسم کا وہ بچہ یحییٰ پیدا ہوا۔ وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا (19:15)۔ سلامتی کے ساتھ‘ ہر قسم کے نقص سے مبرّیٰ‘ اس کی پیدائش ہوئی حالانکہ عام حالات سے ذرا ہٹ کے ہوئی تھی۔ عمر بھر بھی وہ اسی طرح سے سلامتی کے

ساتھ رہا۔موت بھی سلامتی کے ساتھ ہوئی۔اور حیاتِ اخروی میں بھی اس کے لیے سلامتی ہی سلامتی ہوگی۔اس قسم کا وہ بچہ یعنی یحییٰ تھا جو خدا نے ان کو دیا۔اس سے زیادہ یہاں حضرتِ یحییٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں ہے۔

حضرت مریم کی داستان کا آغاز اور غلط عقائد

اس کے بعد آگے حضرت مریم کی اصل داستان آ گئی۔ کہا: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ (19:16)۔اے رسول!اب تو اس کتاب (قرآن) میں لوگوں سے حضرت مریم کی داستان بیان کر۔پہلے تو میں تمہیدی طور پر یہ عرض کر دوں کہ پراپیگنڈے کا اثر کتنا گہرا ہوتا ہے۔عیسائیوں کے ہاں کا یہ عقیدہ پہلے سے چلا آ رہا ہے کہ ہر انسانی بچہ'اپنے اولیں ماں باپ' آدم اور حوا' کے گناہ کی آلائش' اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آتا ہے تو گویا انسان پیدائشی طور پر' فطری طور پر' گناہ گار ہوتا ہے۔اگلا عقیدہ یہ کہ انسان اپنے کسی بھی عمل سے یہ گناہ دھو نہیں سکتا۔چلیے یہ اس کی مجبوری کا دوسرا اقدم ہوا۔پہلی چیز یہ ہے کہ وہ گناہ اس کے اپنے کسی عمل کا نتیجہ نہیں'اس کے ماں باپ نے جنت میں جو گناہ کیا تھا' اس گناہ کا اثر لیے ہوئے' ہر بچہ دوسرے جنم میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں جبر (Determinism) کے پہلو کیسے نکل رہے ہیں!اس میں انسان کا اختیار و ارادہ تو ہے ہی نہیں۔پیدائش کے ساتھ ہی اپنے ماں باپ کے گناہ کا اثر لیے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔اگلی کڑی (Link) وہی جبر کی' Determinism کی' چیز ہے کہ یہ اپنے کسی عمل سے اس گناہ کی آلائش کو دھو ہی نہیں سکتے۔یہ عقیدہ باطل علی الباطل چلا آ رہا ہے۔آپ دیکھیے!آپ ذرا بھی عقل و فکر کی رُو سے سوچنا شروع کیجیے تو یہ عقائد ٹھہر ہی نہیں سکتے' چنانچہ اب خود یورپ کے ہاں جب انہوں نے بھی عقل و فکر سے کام لینا شروع کیا ہے تو ان عقائد کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دی ہیں۔خود عیسائی مفکرین اور دانشوروں کے ہاں تو وہ بات چل ہی نہیں سکتی تھی۔یہ تو بہر حال دوسرا گوشہ ہے۔وہ تو خود ہی اس سے انکار کرتے چلے جاتے ہیں۔

انجیل کے بیانات کے ساتھ ساتھ ہماری اپنی کم مائیگی

اب اس کے بعد اگلا عقیدہ یہ ہے کہ انسان تو جہنمی پیدا ہوتا ہے' گناہگار پیدا ہوتا ہے' اپنی کسی سعی و کاوش سے اس گناہ کے اثر کو مٹا ہی نہیں سکتا' اسی طرح سے مر جاتا ہے' مرنے کے بعد جہنم میں چلا جاتا ہے۔عزیزانِ من!یہ تمام انجیل کے بیانات ہیں۔ اس صورتِ حال پہ خدا کو بڑا ہی افسوس ہوا کہ یہ کچھ ایسا کیوں ہو گیا۔اب پھر خدا مجبور ہے کہ اپنے اس کیے ہوئے کو خود نہیں سلجھا سکتا۔معاف رکھیے میں انجیل کے انداز میں گفتگو کر رہا ہوں۔میں معاذ اللہ خود نہیں کہہ رہا۔ تو انجیل کے بیان میں یوں نظر آتا ہے جیسے وہاں باپ بیٹا بیٹھے مشورہ کر رہے ہوں۔بیٹے نے باپ سے پوچھا کہ ''ابا جی تسی بڑے اداس نظر آوندے او' کی گل اے آج؟''[1] وہاں بالکل یہی انداز ہے۔تو باپ نے یہ کہا کہ بیٹا!یہ کچھ ہو گیا ہے۔اب بات اپنی بھی میں سمجھ میں نہیں آتی۔مجبوریاں اتنی ہیں کہ وہ انسانوں کو پیدا بھی کیے جا رہا ہے

---

[1] ابو جان!آپ بڑے اداس و مغموم نظر آ رہے ہیں۔آج کیا معاملہ ہے؟

اور اس گناہ کے ساتھ پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔ تو یہ افسوس بھی ہو رہا ہے کہ وہ تمام جہنم میں چلے جا رہے ہیں' لہٰذا بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ''ہتھاں نال دتیاں ہویاں دنداں نال کھولنا پین ڈیاں ہویاں نیں''[1] تو بیٹے نے یہ کہا کہ ابا جان! کوئی بات نہیں' اولاد اور کس کام کی ہوتی ہے۔ اگر میں آپ کے اس کام نہ آ سکا تو پھر اولاد کے ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ تو ایسا کیجیے: مجھے دنیا میں بھیج دیجیے' مجھے وہ لوگ پکڑ کر صلیب دے دیں' میرا جو خون ہے اور خون بہا' جو اس کی قیمت لینی ہے' وہ آپ ان انسانوں کی بخشش کی صورت میں لے لیں۔ اس پر باپ بیٹا بہت خوش ہوئے ''اونے کیا ہونا اے شاباش جیندا رہ گل ہوئی ناں کم آیا ناں اے''[2]

عزیزانِ من! آپ دیکھیے مذہب کی دنیا میں کھلے دل کے ساتھ میں یہ کہہ رہا ہوں' آپ سن رہے ہیں تو مسکرا رہے ہیں اور جب میں نے آگے یہ بات کہی کہ یہ سارے عقائد آپ کے ہاں موجود ہیں تو پھر کیا بنے گا۔ پھر ہنسیے گا یا روئیے گا۔ تو ہوا یوں کہ وہ حضرتِ عیسیٰؑ آئے' انجیل کے بیان کے مطابق' انہیں صلیب دیدیا۔ اب صلیب دیدیا تو اس کے بعد یہ وہی بات ہوئی کہ اپنے ہی بیٹے کو وہاں صلیب پہ بھیجا' اگر صلیب پہ موت واقع ہو جائے' ایک ہی بیٹا تھا' وہ اس طرح سے گیا۔ اس انداز سے ان کا خون بہا' تو خدا نے انہیں کو زندہ ہی آسمان پہ اٹھالیا۔ آپ غور کیجیے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن ذہنوں کے اوپر مذہب کی گرفت دیکھیے کہ دو ہزار سال سے یہی کچھ کہتے اور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ وہاں کے کچھ دانشور ہیں جو اس کے خلاف یہ کچھ کہہ رہے ہیں' ورنہ یہ کروڑ ہا کروڑ کی تعداد' میں عیسائیت تو غالباً اسلام سے بھی زیادہ ہے' یہ اس کے متبع ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا' تو دو ہزار سال سے یہ سارے عقائد چلے آ رہے ہیں۔ آج بھی کروڑوں انسان ان عقائد کو مانتے ہیں۔ ساری دنیا کے عیسائی ان چیزوں کو مانتے چلے آ رہے ہیں' جن کو ہم آپ سن کے مسکرا رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پہ اٹھالیا۔ اب یہ دیکھ لیجیے' کام بھی بن گیا' مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ بیٹے کو مرنے بھی نہیں دیا' اپنے پاس بلا بھی لیا۔ اور حضرتِ مسیح علیہ السلام کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

اب ایک دوسرا عقیدہ تھا کہ یہ خدا کا بیٹا ہے۔ تو اس عقیدے کے مطابق اس کا کیا کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ تو ایک ماں کے پیٹ سے اسی طرح پیدا ہوا تھا جس طرح سے کہ عام بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے تو یہ چھپا نہیں سکتے تھے۔ اب یہ حصہ تو ظاہر ہے' سامنے ہے کہ وہ اسی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اب وہ ابن اللہ کیسے بنے؟ پھر انہیں خدا کا بیٹا کیسے بنایا جائے؟ تو یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا ان کا باپ خدا تھا' ماں مریم علیہا السلام تھی۔ اس طرح بن باپ کی پیدائش کا عقیدہ عیسائیت میں آیا۔ یہ بنیادی عقیدے عیسائیت میں آئے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے' وہ یہاں مرے نہیں' وہ زندہ آسمان پہ اٹھا لیے گئے۔ تو آپ نے غور کیا کہ یہ عقائد عیسائیت کے مذہب کی بنیاد تھی۔ اگر یہ نکال دیئے جائیں تو باقی کچھ نہیں رہتا۔ وہ اسے لیے

---

1. ہاتھوں سے دی ہوئی گانٹھیں دانتوں سے کھولنی پڑ رہی ہیں۔
2. اس نے یہ کہا ہوگا کہ ''شاباش! صد بار شاباش! جیتے رہو' بات ہوئی ناں یہ آیا نہ پھر کام!''

چلے آرہے ہیں۔ یہ عقائد عقل وفکر کی رو سے عاری تھے۔ اگر ان کے ساتھ مناظرے میں یہ قرآن کی حامل قوم کے سامنے آتے تو کہیں بار نہیں پاسکتے تھے کیونکہ قرآن تو قدم قدم پر عقل وفکر اور شعور اور بصیرت اور علم کو دعوت دیتا چلا جارہا ہے۔

عیسائیت کے ان عقائد پر مسلمانوں کا ایمان

جس قرآن کی کیفت یہ ہے کہ وہ مومن کی Definition 'مومن کی تعریف' یہ بیان کرتا ہے کہ ''مومن تو وہ ہوتا ہے' کہ اور تو اور اگر خدا کے احکام بھی اس کے سامنے پیش کیے جائیں تو وہ انہیں بھی بہرہ' گونگا' بن کے نہیں مانتا۔ اس قسم کے وہ مومن ہوں اور مقابل میں اس قسم کے وہ عقائد ہوں' تو قدم قدم پر انہیں شکست ہوگی۔ یہ ٹھہر ہی نہیں سکیں گے۔ یہ اُس زمانے میں ٹھہر سکتے نہیں تھے' آج نہیں۔ اب آگے آیئے کہ پھر انہوں نے کس طرح سے اس کے متعلق پراپیگنڈہ کیا' اسے تو چھوڑ دیجیے کہ کس طرح سے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی یہ دونوں عقیدے ایمان کا جزو ہوگئے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اور آسمان پہ زندہ ہیں۔ اب عیسائیوں کو ضرورت ہی نہ رہی کہ کسی مناظرے' کسی مباحثے' میں ان کے خلاف کوئی دلیلیں پیش کریں کہ ہم اسے کیسے مانتے ہیں' یہ تو خود ماننے لگ گئے۔

عیسائی دانشوروں کی تحقیقات لیکن ہماری صورت گری

عیسائیت تو خود اس سے منحرف ہورہی ہے۔ عیسائی دانشور تو ان عقائد کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ آج کل جو خاص طور پہ وہاں کی تحقیقات کی کتابیں آرہی ہیں' پوچھیے نہیں کہ وہ کس طرح سے ان چیزوں کو بکھیر رہے ہیں۔ انہوں نے ساری انجیل کو محرف بنا کے رکھ دیا ہے۔ تو ایسے ہی ایک کتاب میرے ہاں آئی ہے۔ اس کتاب کی رو سے تو یہ دانشور کہہ رہے ہیں کہ اس انجیل کی رو سے یہ سارا ہی افسانہ نظر آتا ہے۔ مسیح نام کی کوئی شخصیت ہی تاریخ میں نہیں تھی۔ وہ وہاں تک پہنچ رہے ہیں۔ وہ دانشور تو وہاں تک پہنچ رہے ہیں' انہیں چھوڑ بھی رہے ہیں' ان کے ہاں ایسے فرقے بھی موجود ہیں جو عیسائی ہونے کے باوجود یہ عقیدہ نہیں رکھتے' لیکن مسلمانوں میں اگر کسی کے متعلق کہہ دیا جائے کہ صاحب! یہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کو بن باپ نہیں مانتے یا وفاتِ مسیح علیہ السلام کے قائل ہیں تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ یعنی عیسائی اگر دونوں عقیدوں کو یوں ماننے لگ جائے تو وہ عیسائیت سے خارج نہیں ہوتا' لیکن مسلمانوں کی صورت یہ ہے کہ جو مسلمان عیسائیت کے اس عقیدہ کو نہ مانے' وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے' اور پھر جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس پراپیگنڈے کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کے تحت یہ کچھ آپ کے ہاں بھی ہزار برس سے بطور مسلک یہی چلا آرہا ہے۔ اسے اتنی اہمیت حاصل ہے کہ کسی اور عقیدے کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ پہلی چیز ہی حیات و وفاتِ مسیح آجاتی ہے صاحب! غور کیجیے کہ آپ کا مذہب دنیا میں کیا کچھ کرتا ہے' مگر دین یہ کچھ نہیں کرتا۔ میں بار بار مذہب کہتا ہوں کہ یہ کس طرح سے غلط عقائد کو منواتا ہے۔ یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ ساری چیز

ان عیسائیوں کے پراپیگنڈے کی ہوئی تھی جس نے آپ کے ہاں آ کے اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ یہ عقیدے آپ کے ایمان کا جزو قرار پا گئے اور پھر آخر کار مسلمانوں کا یہ عجیب عقیدہ بن گیا کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمان پہ ہیں اور مسلمانوں ہی کا یہ عقیدہ کہ پھر وہ نازل ہونگے' یہاں آئیں گے اور پھر اس عقیدے کی بڑی اہمیت ہے کہ وہ آئیں گے۔ اب صاحب! یہ دیکھیے کہ اس عقیدے کے مضمرات کیا نکلے؟

پنجابی نبوت کا دعویٰ

یہاں ہمارے ہاں جو "پنجابی نبوت" نے دعویٰ کیا تو ہاں عزیزان من! عجیب عجیب دعوے ہیں۔ ان میں کا ایک یہ بھی ہے کہ وہ "آنے والا جو مسیح ہے' وہ میں ہوں۔" مرزا غلام احمد کا دعویٰ ہے۔ مسیح موعود اس کا نام رکھا ہوا ہے۔

وفاتِ مسیح کے متعلق دو مختلف متضاد عقائد اور بن باپ کا تصور

عقیدہ یہ ہے کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے اور انہوں نے واپس آنا ہے"۔ بھئی! یہ دو چیزیں کیسے اکٹھی ہو گئیں۔ "وفات پا گئے" یہ چیز تو وہ قرآن سے ثابت کر دیتے ہیں' اور "انہیں واپس آنا ہے" یہ چیز وہ احادیث سے ثابت کرتے ہیں۔ ان دو باتوں میں تدویق [1] کیسے ہو گئی: وفات پا گئے اور واپس آنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' جو وفات پا جاتا ہے وہ تو واپس نہیں آتا۔ اور وہ جو واپس آنا ہے اس کی تو آپ کے ہاں حدیثیں موجود ہیں' جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ جو مر چکا ہے' وہ تو واپس نہیں آئے گا' اس کی مثل کوئی ایک مسیح آئے گا۔ لہٰذا وہ "مسیح آئے گا اور وہ میں ہوں"۔ یعنی وفاتِ مسیح کا عقیدہ یوں ثابت کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ پھر یہ ایسا کیوں کیا گیا؟ ذہن میں تو یہ ایسے آتا ہے کہ نہیں' چونکہ مرزا صاحب [2] اور مرزائی عقل و فکر کی رو سے Rational انداز میں "اسلام" پیش کرتے تھے' اس لیے انہوں نے کسی شخص کے زندہ آسمان پر رہنے کے اس Irrational یا Non-rational عقیدہ سے انکار کیا تو اس سے یہ نظر آیا کہ انہوں نے واقعی یہ کچھ Rational سی بات کی۔ پہلے تو یہ سوچ لیجیے کہ جہاں تک Rational یا Irrational اندازِ فکر کا تعلق ہے' اس میں مسیح کے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے' بن باپ کے پیدا ہونے کا عقیدہ ہے تو وہ تو مرزا صاحب کے ہاں بھی موجود ہے۔ اس طرح سے تو وہ تو وہیں کے وہیں رہے۔ اب یہ جو وفات کا مسئلہ تھا' اسمیں انہوں نے یہ بات کیوں پیدا کی؟ یہ ہے سوچنے کی چیز۔ وہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر زندہ تصور کرنے والے ہیں' اس عقیدے کی رُو سے انہیں زمین پر نازل ہونا ہے تو اس نازل ہونے میں بات یہ ہے کہ وہ اسی طرح' جسم کے ساتھ' آسمان پہ ہیں اور اسی طرح آسمان سے جسم کے ساتھ اتریں گے اور دنیا اترنے والے کو دیکھے گی' پھر وہ آ کر دمشق کے منارے کے اوپر کھڑے ہونگے' پھر وہاں سے یہ نیچے آئیں گے۔

---

[1] باریک بات نکالنا' غور و فکر کرنا۔

[2] مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸۔۱۸۳۵)

یہ ساری چیزیں حدیث میں تھیں۔ وہ تو اترتے ہوئے سامنے نظر آنے تھے۔ اب اگر کوئی شخص یہاں یہ دعویٰ کرے کہ ''وہ آنے والا مسیح میں ہوں''۔ تو احادیث کی رُو سے تو وہ اترتا ہوا نظر آئے گا۔ کہنے والا تو کہے گا کہ بھئی! اس نے تو آسمان سے اترنا ہے اور یہ تو اس طرح سے آسمان سے نہیں اترے تھے۔ تو ''اس مسیح'' نے مسیح ہونے کے دعویٰ کے ثبوت کی یہ صورت پیدا کی کہ پہلے وفاتِ مسیح ثابت کر لی کہ وہ آسمان پہ اس طرح سے زندہ موجود نہیں ہیں۔ پھر جب آنے کی بات ہوئی تو مثیل کا تصور ہو گیا کہ وہ ایسے اتر کے نہیں آئے گا۔ وہ ایسے ہی انسانوں کی طرح سے ہوگا اور مثیلِ مسیح ہوگا۔ اس لیے اپنے مثیلِ مسیح ہونے کا عقیدہ منوانے کے لیے انہوں نے وفاتِ مسیح کا عقیدہ اپنے ہاں داخل کر لیا۔ دیکھتے ہیں آپ کہ اس نے وہ عقیدہ اسی طرح سے کیوں رکھا۔

مرزا غلام احمد آف قادیان کا اعلانِ عام

لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ جناب ختمِ نبوت کے بعد جب آپ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا آنا مانتے ہیں تو وہ تو نبی تھے' نبوت کے ساتھ آئیں گے تو پھر رسول اللہ ﷺ آخری نبی کیسے ہوئے؟ بعد میں تو ایک اور نبی آ گئے' لہٰذا انہیں تو چھوڑ دیجیے ان سے واسطہ نہیں ہے۔ وہ جو ''آنے والا مانتے'' اور ''نبی مانتے ہیں'' اسے دیکھیے۔ نبی کے معنی تو یہی ہیں کہ اگر اس کی نبوت کو نہ مانا جائے تو انسان مسلمان نہیں رہتا' کافر ہو جاتا ہے۔ خود مرزا صاحب نے یہ چیز کہی ہے کہ جو مجھے مسیح موعود نہیں مانتا' وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ تو بات تو وہی ہو گئی' ختم نبوت تو توڑ دی۔ یہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔

آج دنیا بھر کا مسلمان ذہنی الجھنوں کا شکار بھی ہے اور ذلیل وخوار بھی۔ آخر کیوں؟

عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مسلمان کس مقام پہ کھڑا ہے' کیا کیا مان رہا ہے' کن کن الجھنوں میں گرفتار ہے' کن کن مسائل میں اس کی توانائیاں' وقت اور دولت ضائع ہو رہی ہیں اور آج اسے دنیا میں ذلیل سے ذلیل قوم کی حیثیت سے جانا جا رہا ہے' یہ ہر جگہ اپنا مرثیہ پڑھتا ہے اور ہزار برس سے ان مسائل کی دھن کے اندر لگا ہوا چلا ہوا ہے۔ آج بھی آپ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں خاص طور پر کتنے زور شور سے یہ مسئلہ آ رہا تھا اور یہاں جو ابھارا گیا ہے تو اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ یہاں جہاد کی آواز انگریزی مملکت کے خلاف اٹھی تھی اور اس نے اس مملکت کی بنیادیں تک ہلا دی تھیں۔ انگریز کو اس بات کی ضرورت تھی کہ یہاں مسلمان کو صحیح عقائد سے بیگانہ کیا جائے اور جو کچھ یہ مانتے ہیں' انہیں اس پہ مطمئن کیا جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ گہری سازش

مسلمانوں کے ہاں' حضرتِ مسیح علیہ السلام کے آنے کے متعلق یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ حضرتِ مہدی آئیں گے' حضرتِ مسیح علیہ السلام آئیں گے' وہ اسلام کو دوبارہ عروج پہ پہنچائیں گے اور اس طرح ساری دنیا میں اسلام کی سلطنت قائم کریں گے۔ اِس عقیدہ سے انگریز تزلزل

آ تا تھا تو یہاں کیا یہ گیا کہ ''مسلمانوں کو مسیح بھی دے دو، مسلمانوں کو مہدی بھی دے دو، اور ان کے ہاں سے یہ اعلان کرا دو کہ اب جہاد منسوخ ہو چکا ہے۔'' عزیزانِ من! اس لیے یہ مسئلہ چھیڑا گیا اور آپ کے ہاں جسے انگریز غدر (Mutiny) کہتا ہے، دراصل یہ اس کے خلاف بغاوت ہوئی تھی اور یہاں پاک و ہند میں جہاد کی ایک تحریک چلی۔ اگر وہ تحریک اسی صورت میں قائم رہتی تو انگریز بہت پہلے یہاں سے بوریا بستر اٹھا کے بھاگ گیا ہوتا اور یہاں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی مملکت قائم ہو چکی ہوتی۔ اس نے انہیں ان مسائل کے اندر الجھا کے رکھ دیا۔ اب یہ جتنے لوگ، مجاہدین بننے والے تھے، وہ زیادہ تر اہلحدیث تھے۔ سارے اہلحدیث حیات و وفات مسیح کے اندر اسی مسئلے میں الجھ گئے۔ آج تو وہ دور چلا گیا ہے انگریز کو بھی ضرورت نہیں رہی، انگریز ہی نہیں رہا تو اسے ان مسائل کی ضرورت کیا رہی!

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں ابلیس کی مجلس شوریٰ

ان مناظروں اور مباحثوں میں ہم نے، بلکہ خود میں نے، اپنی آدھی عمر ضائع کی، وہ اس لیے کہ ہم تو بدقسمتی سے بٹالہ کے رہنے والے ہیں جو قادیان کے ساتھ واقع ہوا ہے۔ ہماری خدمتِ اسلام ہی یہ تھی کہ حیات و وفاتِ مسیح مناظرے ہو رہے ہیں، ہم ان میں شامل ہیں۔ اگر آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی اس سو سالہ تاریخ کو دیکھیں تو اس میں آپ کو نظر آ جائے گا کہ خدمتِ اسلام کے لیے یہی مناظرے ہیں، انہی موضوعات پر مباحثے ہیں اور انہی کے متعلق ارمغانِ حجاز (اردو) اقبال رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۷۷۔۱۹۳۸) کی آخری چیخ و پکار ہے۔ اپنی اس نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ابلیس سے لے کر پانچویں مشیر تک کا احوال دیا ہے اور پھر آخر میں ابلیس نے کہا:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے

مشیروں نے پوچھا: کیا کریں؟ ابلیس نے کہا: اس کو ان مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟

اُسے ان مسائل میں الجھاؤ۔ اب یہ سچ ہے کہ اسے ان مسائل کے اندر الجھا دیا۔ آج اسلام کی سب سے بڑی خدمت یہ ہو رہی ہے کہ جو حیاتِ مسیح کو ثابت کر دے وہ اسلام کا سب سے بڑا محسن اور قابل مانا جائے گا۔ جی! پھر اس خدمت سے کیا ہوا چلیے، یہ کچھ نہ ماننے والے تو کہیں کوئی دو چار دس بیس، سر سید نما، پرویز نما، یا اقبال نما قسم کے کافر ہوں گے یہ سارا ستر کروڑ [1] مسلمان تو بہر حال یہ مان ہی رہا ہے۔ اس ماننے

[1] یہ 1975ء کا تذکرہ ہے۔

سے کیا اس قوم کی حالت سنور گئی؟ سُدھر گئی؟ اقبال کو پہنچ گئے؟ یا مزید تباہیوں کی طرف چلے گئے صاحب!

دین کو مذہب میں بدلنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے جب دین مذہب میں بدل جاتا ہے۔ صدرِ اول کی جو تاریخ بھی ہمارے ہاں موجود ہے، خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ ہے، وہاں کہیں بھی آپ کو اس قسم کے مناظرے و مناظرے نظر نہیں آتے۔ یہاں تو ساری بات ہی قرآن سے صاف ہو جاتی ہے۔ وہ عیسائی، جو وہاں رہتے تھے، بات کرنے کے لیے آتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ باتیں تو ہوتی ہونگی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا حضرتِ مسیح خدا کے بیٹے ہیں؟ اگر ہیں تو یہ جو بھی مباحثے ان کے ساتھ ہیں، کیا وہ سب قرآن ہی میں ہیں؟ عزیزانِ من! ایک طرف تو آپ اس ہزار برس میں جو مسلمانوں کی طرف سے دلائل دیئے جاتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بن باپ پیدا ہوئے تھے، انہیں لے لیجیے اور دوسری طرف قرآن کا ایک فقرہ لے لیجیے آپ دیکھیں گے کہ سو سنار کی بجائے ایک لوہار کی پڑتی ہے یا نہیں۔

خدا کی تو کوئی بیوی ہی نہیں

عزیزانِ من! سنیئے قرآن کے ایک فقرے نے کس طرح سارا مباحثہ اور مناظرہ ٹھپ کر کے رکھ دیا۔ کہا: یہ کہتے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ **اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ** (6:101)۔ جب خدا کی بیوی نہیں ہے تو اس کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ بیٹا، سلسلۂ تولید (Procreation) کا نتیجہ ہوتا ہے، جس کے لیے بیوی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے خدا کی بیوی کا عقیدہ عیسائیوں کے ہاں بھی ہے۔ قرآن یہاں یہ کہہ کیا گیا ہے کہ خدا وہ ہے: **بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (6:101)۔ جس نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو، ارض و سما کو، Originate کیا ہے۔ یعنی وہ اسے بغیر کسی ذریعہ اور واسطہ کے براہِ راست عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں لایا ہے۔ پھر سنیئے کہ خدا وہ ہے، جس نے اس تمام سلسلہ کائنات کو Originate کیا ہے۔ جو **فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (39:46) ہے یعنی وہ عدم سے کائنات کو وجود میں لے آیا۔ وہ اتنی بڑی قوتِ کاملہ کا مالک ہے کہ اس سلسلۂ کائنات کو (عدم) Nothingness سے Being (وجود) میں لے آیا۔ جب کچھ بھی نہیں تھا تو اس نے اتنی عظیم کائنات بنا دی۔ پھر اس نے کچھ قوانین مقرر کیے اور ایک قانون یہ مقرر کیا کہ اولاد اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ایک مرد ہو اور اس کی ایک بیوی ہو اور اس نے کہا کہ یہ قانون مجھ پہ بھی لاگو ہوتا ہے۔ جب میری بیوی نہیں ہے تو میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ یہ ہے قرآن کا جواب۔

اندازہ لگایئے عزیزانِ من! یہ ہے قرآن۔ کسی فلسفیانہ بحث میں نہیں الجھا۔ یہ کوئی فزکس نہیں، مابعد الطبیعاتی دلائل نہیں ہیں، روزمرہ کی ایک محسوس چیز ہے، ذرا بھائی سوچو تو سہی کہ یہ ہے ناں ہمارے ہاں کا قانون، یہ ہے ناں تمہارے ہاں کا مشاہدہ کہ بیٹا ہونے کے لیے بہو کی ضرورت ہے، مرد کی اور اس کے ساتھ عورت کی، میاں کی اور بیوی کی۔ تو تم جو اسے خدا کا بیٹا کہتے ہو، خدا کی تو بیوی نہیں، تو بتاؤ یہ

کیسے ہوگا؟ پھر تم خود بھی مانتے ہو جب بیوی نہیں تو بیٹا کیسے؟ کتنی عظیم چیز ہے کہ خدا Nothingness سے' عدم سے' کائنات کو وجود میں لاتا ہے' لاسکتا ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' ہم وہ ہیں جو کائنات کو عدم سے وجود میں لائے' ہم بن بیوی کے بھی اپنے ہاں بیٹا پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے کہ اگر وہ یہ کہتا تو برحق تھا لیکن اس نے یہ کہا کہ ہم نے یہاں جو یہ قانون بنا دیا ہے' ہم خود بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ جب قانون یہ ہے کہ اولاد میاں اور بیوی کے باہمی اختلاط سے ہوگی۔ ہم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر ہمارے ہاں بھی تم نے بیٹے کا تصور قائم کرنا ہے یا ہم سے کہلوانا ہے کہ فلاں ہمارا بیٹا ہے' تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے خدا کی بیوی ہے اور جب بیوی نہیں ہے' تو بیٹا نہیں ہے صاحب! غور کیا کہ قرآن کا بات کرنے کا انداز کیا ہوتا ہے!

عزیزانِ من! کیسی سیدھی بات ہے کہ جب قرآن خود کہہ رہا ہے کہ اب اولاد پیدا ہونے کے لیے قانونِ فطرت یہ ہے کہ ایک میاں اور ایک بیوی ہو' ان دو سے ہی بیٹا پیدا ہوگا تو حضرتِ مسیح علیہ السلام بن باپ کے کیسے پیدا ہوگئے؟ دونوں میں سے ایک نہ ہو' تو خدا کے ہاں اولاد تو نہیں ہوسکتی۔ چونکہ یہ مانتے تھے کہ اللہ کا بیٹا ہے' تو اس نے دلیل دی کہ بیوی ہی نہیں ہے تو بیٹا کیسے؟ اور اگر عورت ہو اور مرد نہ ہو تو وہی قانون اس پہ لاگو ہوگا۔ وہاں تو کہتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت ہونگے تو بیٹا ہوگا۔ تو جب یہ مان لیا جائے کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام بن باپ تھے مگر خدا تو اپنے لیے بھی اس قسم کے قانون میں استثنا نہیں چاہتا تو ان کے لیے یہ کیسے کہے گا۔ ایک فقرے میں خدا کے بیٹے والا سارا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔

بات سمجھنے کے لیے میں ذرا پیچھے سے حضرت مریم علیہا السلام کی اس داستان کے ٹکڑے بیان کردوں اگرچہ جب اٰلِ عمران کی سورۃ ہمارے سامنے آئی تھی' تو میں نے بڑی تفصیل سے یہ چیزیں بیان کی تھیں لیکن ایک تو یہ کہ اس میں ایک عرصہ ہوگیا ہے' وہ تیسری سورۃ ہے' ہم اب انیسویں سورۃ پہ ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس میں شاید چھ سات سال کا عرصہ ہوگیا ہوگا اور پھر نئے نئے احباب بھی درس میں آتے ہیں' ان کے لیے بھی میں عرض کردوں۔ یہودیوں میں یہ طریقہ چلا آتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی ٹیمپل (Temple)' ہیکل یا عبادت گاہ یا جسے قربان گاہ کہتے ہیں میں منت مانتے تھے اور پیدائش پر اپنے ان بچوں کو خدمت کے لیے ان میں وقف کردیتے تھے۔

حضرتِ مریم بطور راہبہ (Nun) ہیکل کی نذر

حضرتِ مریم کی والدہ نے منت مانی کہ میرے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا' میں اسے ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کردوں گی۔ میں اتنا عرض کردوں' معاف رکھیے' شاید آپ کو یہ گراں گزر رہا ہو کہ میں آج آنکھیں بند کرکے یہ درس دے رہا ہوں۔ میری آنکھ میں تکلیف ہے' چشم میں آشوب ہے روشنی کی وجہ سے آنکھ کھلتی نہیں' ورنہ یہ بات نہیں کہ میں آج کچھ ''حضرت جی'' بننا چاہتا ہوں۔ یہ تو ''حضرت جی'' کا انداز ہوتا ہے۔ ہاں تو ان کی والدہ نے منت مانی' بہرحال' میں مختصراً یہ بات عرض کرتا ہوں۔ بیٹی پیدا ہوئی' وہ انہوں نے ٹیمپل کی نذر کردی۔ وہ بیٹی ہیکل میں آ گئی۔

ہیکل کی خودساختہ شریعت

آج بھی آپ یہ دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں راہبات (Nuns) ہوتی ہیں' جنہیں کنواریاں کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ان راہبات کی ساری عمر شادی نہیں ہوتی۔ پہلے تو یہودیوں کے ہاں صرف لڑکے یا مرد ہی ہیکل میں بطور راہب دیئے جاتے تھے' پھر ان کی شریعت میں ترمیم ہوئی تو لڑکیاں بھی ہیکل میں بطور راہبہ آتی تھیں۔ اب ان لڑکیوں کے متعلق پہلی چیز یہ تھی کہ وہ ہیکل میں بالغ ہونے کی عمر تک رہ سکتی تھیں۔ اس کے بعد یہ صورت پیدا ہوتی تھی کہ ان کی شادی ہیکل کے جو پجاری تھے' ان میں سے کسی کے ساتھ ہونی ہوتی تھی اور اگر اس کے ساتھ شادی نہ ہو' تو پھر انہیں عمر بھر کے لیے مجرد (Unmarried) رہنا پڑتا تھا۔ وہ شادی نہیں کرسکتی تھیں۔ دوسری جگہ' کسی ہیکل کے پجاریوں کے حلقہ کے علاوہ' وہ کہیں شادی نہیں کرسکتی تھیں۔ یہ اس وقت ان کے ہیکل کی شریعت کا قانون تھا۔ حضرتِ مریم علیہا السلام وہاں ہیکل میں رہیں اور وہ حضرتِ زکریا علیہ السلام' جو خدا کے نبی تھے' کی کفالت میں رہیں۔ اب یہ نظر آتا ہے کہ یہودیوں کی شریعت میں یہ پابندیاں تھیں کہ ایک تو یہ کہ ان لڑکیوں کو ہیکل کے لیے وقف کیا جائے پھر ان کو راہبہ (Nun) بنایا جائے پھر یہ پابندی ہو کہ وہ یا تو ان راہبوں ہی میں شادی کرے اور یا پھر ساری عمر اس طرح سے بغیر شادی کیے گزار دے' Unmarried رہ جائے۔

ہیکل کی خودساختہ شریعت کے خلاف حضرتِ مریم کا جہاد

یہ ساری چیزیں انسانوں کی شریعت کی پیدا کردہ تھیں' خدا کے دین کی نہیں تھیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ حضرتِ زکریا علیہ السلام کی تعلیم نے حضرتِ مریمؑ کے اندر اس خیال کو پیوست کردیا تھا کہ یہ خدا کی شریعت نہیں ہے اور انہوں نے اِس خودساختہ شریعت کو توڑنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ یہ بہت بڑا جہاد تھا۔ وہ یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن نے حضرتِ مریمؑ کی اتنی بڑی عظمت بیان کی ہے۔ آج ہم سوچ نہیں سکتے کہ ہیکل میں ان یہودی پجاریوں کے اختیارات کی کیفیت و نوعیت کیا تھی۔ ان کی اپنی ایک مملکت تھی۔ اگرچہ اُس زمانے میں' جس کا اب ذکر ہو رہا ہے' رومیوں کی سلطنت تھی۔ یروشلم یا فلسطین کا علاقہ اس کے ماتحت آچکا ہوا تھا۔ جس طرح آج روم کے اندر ایک الگ آزاد مملکت ہے' جسے ویٹیکن (Vatican) کہتے ہیں' یروشلم میں یہودیوں کی اپنی مملکت تھی' ان کا اپنا قانون تھا' اپنی عدالتیں تھیں' جتنے یہودی تھے ان پر ان یہودیوں کا ہی قانون نافذ ہوتا تھا' ان کے اختیارات کی وسعت کی یہ کیفیت تھی کہ صرف سزائے موت کے لیے ان کو رومی گورنر کے Approval کی ضرورت پڑتی تھی' اس سے کم درجے کی ہر سزا یہ خود دے سکتے تھے۔ یہ تھی ان کے اختیارات کی کیفیت۔ اب یہ سوچیے کہ ہیکل کے اندر ایک لڑکی ہو' ہیکل کا قانون یہ ہو اور قانون بھی جسے قانونِ شریعت کہتے تھے کہ وہ لڑکی یا تو ان راہبوں کے اندر شادی کرے گی یا پھر وہ مجرد رہے گی' شادی نہیں کرے گی۔ یہ انسانوں کا خودساختہ قانون تھا' اس قانون کو توڑنے کے لیے کتنی بڑی جرأت کی ضرورت تھی اور یہ وہ چیز تھی جو حضرتِ مریم علیہا السلام نے کی۔ کہا کہ میں توڑ کے دکھاؤں گی۔ یہ بہت بڑی چیز تھی۔

ان عبادت گاہوں کی ہوسنا کیاں

پہلی چیز تو یہ کہ ہیکل کے اندر رہتے ہوئے حضرتِ مریمؑ نے ان پجاریوں کی جو نگاہوں کو دیکھا تو انہیں بڑی ہی آلودہ پایا۔ مندروں میں، گرجوں میں، جہاں جہاں بھی عبادت گاہیں کہی جاتی ہیں، ان کے اندر کس قسم کی ہوسنا کیاں، کس قسم کا کھیل کھیلتی ہیں، ہم سے نہ پوچھیے، جاننے والوں سے پوچھیے۔ ایک چھوٹی سی کتاب ہے: Twelve Years in a Monastry۔ ''ایک خانقاہ میں میرے بارہ سال''۔ لکھنے والے کے اپنے بارہ سال خانقاہ کے اندر گزرے۔ اس کتاب کے اندر وہ شیطنت کی ان کرتوتوں کو دکھا رہا ہے جو ان مجاوروں اور راہبوں کی ہیں، جو ان خانقاہوں میں بزرگ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سے، جو کچھ وہ اندر کرتے ہیں، روح کانپ اٹھتی ہے اور اس کی ضرورت نہیں، عزیزانِ من! کونسی ایسی خانقاہ اور کون سا ایسا مزار ہے جن کے مجاوروں کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ ہمیں اس کتاب کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کھلی ہوئی کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہی کیفیت وہاں تھی اور قرآن نے تو وہاں کا ایک واقعہ چند لفظوں میں بیان کر کے ساری حقیقت بیان کر دی۔ قرآن اسے بڑی ہی ایمائیت سے بیان کرتا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ادب (Literature) میں ادبِ لطیف کی بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے اور شاعری کی یہ بڑی جان ہوتی ہے کہ اس میں ایمائیت ہو: بات لفظوں میں کھول کے نہ کہی جائے، اس انداز سے کہی جائے کہ بات بھی کہی جائے، الفاظ بھی اس میں نہ کہنے پڑیں۔

مجاوروں کی قرعہ اندازی

قرآن نے کہا یہ ہے کہ جب یہ لڑکی بالغ ہوگئی تو اس وقت مجاوروں میں یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ یہ کس کے حصے میں آئے اور جھگڑا یہاں تک پہنچ گیا کہ معاملہ یوں نہیں طے ہوتا تھا۔ انہوں نے قرعہ اندازی شروع کی۔ ہیکل کی یہ خادمہ جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، اس کے متعلق مجاور باہمی قرعہ سے یہ طے کر رہے ہیں کہ یہ کس کے حصے میں آئے گی۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہاں اندر کیا ہوتا ہوگا اور حضرتِ مریمؑ جیسی لڑکی، جن کی تربیت اس انداز سے ہوئی تھی کہ حضرتِ زکریا علیہ السلام جیسے پیغمبر کے زیرِ کفالت اور زیرِ تربیت تھیں وہ ان آلودہ نگاہوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس لیے پہلی چیز تو یہ تھی کہ میں ان کے اندر زندگی بسر نہیں کرونگی اور ان میں سے کسی کے ساتھ شادی نہیں کرونگی۔ چنانچہ یہ نہ کرنے کے بعد وہ ہیکل کو چھوڑ کے چلی آئی۔ یہاں تک تو اجازت تھی۔ یہاں آنے کے بعد اگلا مرحلہ تو یہ تھا کہ وہ کسی جگہ شادی نہیں کرے گی۔ اس نے کہا: یہ بھی غلط ہے، یہ بات خدا کے قانون کے خلاف ہے، اس معاملے کے اندر کسی پہ جبر نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ میں شادی کرونگی، ان زنجیروں کو جو انہوں نے انسانیت کو پہنا رکھی ہوئی تھیں، توڑ دوں گی۔ وہ بڑی مجاہدہ عورت تھی، بڑی مشکل یہ تھی کہ شادی بھی تو انہی بنی اسرائیل یہودیوں میں ہونی تھی۔ وہ تو ایک ایسے گھرانے کی لڑکی تھی جو اتنے زیادہ مذہب پرست متشدد تھے کہ ان کی ماں نے اپنی لڑکی کو وہاں چڑھاوا چڑھا دیا تھا، اسی لیے یہودی ان کو یہ طعن دیتے تھے کہ تیرا باپ تو اس قسم

کا نہیں تھا کہ جو شریعت سے سرکشی برتتا' تو کس قسم کی لڑکی پیدا ہوگئی۔ عزیزانِ من! وہ کیا کر رہی تھی؟ وہ ان کی اس خود ساختہ شریعت کی پابندی کی جو زنجیر تھی وہ اسے توڑ رہی تھی اور اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ جو لڑ کا تیار ہوا ہے اس نے بھی بڑی ہمت کی۔

انجیل میں حضرتِ مریم کے خاوند کا نام یوسف نجّار بتایا گیا ہے

میں نے کہا ہے کہ ذرا سوچیے' پورا ماحول انہی کا ہے۔ اسی برادری میں' انہی کے اندر رہتے ہوئے' اس قسم کی سرکشی! عزیزانِ من! آج تو پھر بھی داؤ پیچ کچھ کم ہو گیا ہے۔ مُلّا کا کفر کا فتویٰ تو سولی چڑھا دیتا تھا اور جہاں مُلّا وہ ہوں جن کے ہاتھ میں' جن کے اختیار میں' قانونِ شریعت سزا دینا ہو' برادری انہی کی ہو' اسی برادری میں یہ ''چیز'' کرنے والی ہو' تو وہ کیا کچھ نہ کرتے ہونگے۔ لیکن خود انہی کے ہاں کا ایک چچا زاد' یوسف نجّار تھا۔ [1] انجیل خود بتاتی ہے کہ وہ حضرتِ مریم علیہا السلام کا شوہر تھا۔ اور انجیل یہ بھی بتاتی ہے کہ ان کے بچے بھی تھے مگر وہ کہتے صرف یہ ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اس شادی سے پہلے پیدا ہوئے تھے' شادی بعد میں ہوئی ہے' یہ بعد کے بچے تو یوسف نجار کے ہی ہیں لیکن حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام یوسف نجار کا نہیں ہے' یہ خدا کے بیٹے ہیں۔

عزیزانِ من! بات کہنے کی نہیں ہے' کہے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا۔ معاذ اللہ معاذ اللہ' سینے پہ ہاتھ رکھ کے میں کہتا ہوں کہ معاشرے میں جوان بالغ لڑکی ہو' شادی اس کی ہوئی نہ ہو اور اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو جائے۔ سوچیے تو سہی' اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ یا یہ ہو کہ وہ شادی ہونے سے پہلے حاملہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ تو آپ پہلے بات یہاں سے شروع کیجیے۔ آج اس دور میں بھی جب کہ ابھی عفت و عصمت کی وہ اقدار نہیں رہیں تو اس کے باوجود' آج بھی عزیزانِ من! ہمارے ہاں کٹی پھٹی ہوئی بھی روایات (Rituals) آ رہی ہیں۔ ان کی رُو سے بھی یہ صورت ہے کہ اگر کہیں شومئی قسمت سے کسی بچی کے ساتھ یہ حادثہ ہو جاتا ہے' وہ اس بچے کو مار کے پھینک دیتی ہے' کبھی خود کشی کر لیتی ہے کہ یہ بدنامی مجھے سمیٹنی پڑے۔ اب اس کے متعلق یہ کہنا کہ نہیں یہ بچہ کسی اختلاطِ جنسی کا نتیجہ نہیں ہے' خدا کا بیٹا ہے۔ سوچیے کہ وہ لڑکی ہزار قسمیں کھا کے بھی یہ کہے' اس کے لیے کوئی ماننے کو تیار ہوگا؟ کہے گا: تم کہتی کیا ہو!! وہ ہزار کہے کہ صاحب! میں نے کسی سے کسی بھی قسم کی تخلیط نہیں کی تو پھر کیا وہاں کوئی شخص مانے گا؟ اور اگر وہ کہے کہ میں نے کسی بھی قسم کی تخلیط نہیں کی' مجھے اب خود ہی حمل ہو گیا ہے' تو کیا کوئی شخص یہ کچھ ماننے کو تیار ہوگا؟ اس کے گھر والے بھی نہیں مانیں گے۔ بہرحال تو اس خود ساختہ یہودی شریعت کی پابندی کو توڑنے کے لیے یہ لڑکی تیار ہوئی اور یوسف نجّار جوان کے چچا زاد بھائی تھے' اِن کے ساتھ ان کی شادی ہوئی۔

حضرت مریم کی ربوا کی طرف نقلِ مکانی

قرآن یہ کہتا ہے کہ پھر انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ وہاں سے کسی دور علاقے میں چلے جائیں۔ یہ بڑی فطری سی کڑی نظر آتی ہے'

---

[1] بڑھئی ترکھان

جہاں کوئی میاں بیوی کی حیثیت سے اس بات کو جانے ہی نہیں' چنانچہ خود انجیل بتا رہی ہے کہ وہ بچہ پیدا ہوا اور انہوں نے جوان کا عرصہ حیات تنگ کیا تو پھر وہ میاں بیوی اسے لے کر کہیں دور چلے گئے۔کہاں چلے گئے؟ قرآن نے کہا: وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (23:50)۔ہم نے ان دونوں کو 'ان کی دستبرد سے محفوظ کر کے ایک مرتفع مقام میں پناہ دی' جوان کے اپنے لیے ہر طرح موزوں تھا۔اس میں صاف اور شفاف پانی کے چشمے رواں تھے جن کی وجہ سے وہ جگہ نہایت سرسبز وشاداب تھی۔قرآنِ کریم نے اس جگہ کو ربوا(23:50) کہا ہے۔ربوا کے معنی ہوتا ہے وہ زمین جس کی سطح مرتفع ذرا اونچی ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ مصر کی طرف چلے گئے۔

مرزا غلام احمد صاحب کا آسمان سے مینار پر اور مینار سے زمین پر اترنا

اب یہ مرزا غلام احمد صاحب جو قادیاں سے نکلے تو انہوں نے یہ ربوا بنایا اور یہ نام وہیں سے اخذ کیا ہے۔پھر وہ جو روایت میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ آسمان سے دمشق میں' جامع مسجد کے مینار سے' جو بہت اونچا ہے' اتریں گے خیر آ گئے تو اور بڑی دلچسپ بات ہے' وہاں آ کے وہ کہیں گے کہ سیڑھی لاؤ' میں نیچے اتروں۔کہیں گے کہ صاحب! آسمان سے تو آپ اتر آئے' اسی طرح سے اب یہاں آنے کے بعد سیڑھی لائیں سبحان اللہ' سبحان اللہ۔وہ کہیں گے کہ صاحب! ٹھیک ہے' وہاں تک تو قانونِ خداوندی تھا' اس کے مطابق میں آیا۔اب میں شریعتِ محمدی کے تابع ہوں اور شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ کوٹھے سے اترو تو سیڑھی کے راستے اترا کرو۔اب میرے لیے تم سیڑھی لاؤ تو یہاں سے میں اتروں گا۔

قادیان کو پہلے دمشق قرار دیا اور پھر مینار کی تعمیر کی

میں اس مینارے کی بات کہہ رہا تھا جو دمشق میں جامع مسجد کا ہے۔اب جو یہ مثیلِ مسیح [1] وہاں قادیان میں آ گیا اور قادیان کو انہوں نے کہا کہ یہ اصل میں دمشق ہی ہے۔حقیقت میں یہ جو کچھ بھی ہے وہ آخر میں ہے تو مینارے کی بات۔وہ مینارہ انہوں نے بعد میں بنا دیا۔میں نے کہا کہ ہم تو وہاں بٹالہ میں اس کے قریب ہی تھے۔وہاں اس مسجد میں کوئی مینارہ وغیرہ نہیں تھا۔ ''مسجد مبارک'' اس کا نام ہے۔اب یہاں انہوں نے مسجدِ اقصیٰ بنائی ہوئی ہے' جتنی چیزوں کے یہ پرانے نام ہیں وہ سب انہوں نے یہاں رکھے ہوئے ہیں' ہاں تو وہاں ایک مینارہ بنایا ہوا ہے۔اگرچہ وہ ان کے بعد بنایا ہے تاہم اس پہ بہت بڑا' موٹے حروف میں' جلی حروف میں' مینارۃ المسیح لکھا ہے۔آپ دیکھیں کہ تاریخ کیسے بنتی ہے؟ آنے والی نسل میں تاریخ کی رو سے یہ دو چیزیں دیں گے۔اس میں وہ یہ نہیں لکھیں گے کہ یہ مینارۃ المسیح بعد کا بنا ہوا ہے۔وہ یہی کہیں گے کہ یہ مینارہ وہی ہے جو حدیثوں میں حضرتِ مسیح موعودؑ کا بیان فرمودہ تھا' جن میں لکھا تھا کہ وہ یہاں آ کے اترے تھے' وہاں مینارۃ المسیح بن گیا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی حضرت مریم اور یوسف نجّار کی۔اس طرح سے حضرتِ مریم اور یہ یوسف نجار وہاں سے آ گئے' انکی والدہ مسیح

---

[1] مرزا غلام احمد آف قادیان کی طرف اشارہ ہے۔

کو لے کے، وہاں اس جگہ چلی گئی جسے قرآن نے ربوا کہا ہے تو ان مرزئی حضرات نے اس کا نام ربوا رکھ دیا۔ خیر میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ وہ وہاں چلی گئیں۔ اِن کی انجیلوں میں یہ ہے کہ وہاں جب حضرت عیسیٰؑ تقریباً جوان ہو گئے، وہ کہتے ہیں کہ تیس سال کی عمر تھی، تو اس وقت وہ وہاں سے واپس آئے ہیں۔ اس وقت انہیں نبوت مل چکی تھی۔

انجیل کے مطابق مجاوروں کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وعظ

وہاں سے آنے کے بعد انہوں نے پھر وہی جہاد کیا جس کی ابتداء اِن کی والدہ ماجدہ حضرتِ مریم نے کی تھی جو اتنی بڑی حریت و جرأت کی عورت تھی۔ یہ انہیں ساتھ لے کے آئے تھے اور پھر یہاں آ کے، انہوں نے اسی ہیکل کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کے، ان پجاریوں کو مخاطب کر کے، جو وعظ کہے ہیں، جو سرمن (Sermon) کہے ہیں، عزیزانِ من! وہ انجیل جیسی بھی ہے، انہوں نے جس طرح سے وہاں کھڑے ہو کے ان پجاریوں کے کچے چٹھے کھولے ہیں، ان کے وہ وعظ پڑھنے کے قابل ہیں۔ انہوں نے انہیں ''اے سانپ کی اولاد و اور بھیڑیوں کی نسل کے بچو!'' کہہ کر مخاطب کیا۔ ان کی کیفیت یہ کہی۔

یہ ہے حضرت مریمؑ کی داستان کا وہ بیک گراؤنڈ یا پس منظر! اسی لیے قرآنِ کریم ان کی عظمت بتا رہا ہے کہ بڑی عظیم عورت تھیں اور یہ کچھ بتانے میں کیا لفظ ہیں قرآن کریم کے! کہ ''اس نے اپنے گریبان کو چاک نہیں ہونے دیا، اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔'' وہ عصمت کی یہی حفاظت تھی کہ وہاں اس نے دیکھا کہ یہ آلودہ نگاہوں والے قرعوں کے ذریعے سے لڑکیوں کے فیصلے کرتے ہیں، اس نے ان سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔

حضرتِ مریم کے متعلق یہودیوں کا الزام لیکن قرآن کی گواہی

ہیکل سے باہر آنے کے بعد حضرتِ مریم نے جو شادی کی تو یہودیوں کے علماء نے فتویٰ لگا دیا کہ یہ شادی شریعت کی رو سے شادی نہیں ہے اور جب یہ علماء جس شادی کو شرعی شادی یا نکاح ہی قرار نہ دیں تو وہ بہرحال گناہ ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی یہودیوں کا یہ الزام منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح سے وہ فعلِ شنیع کی مرتکب ہوئی تھی کیونکہ اس نے شادی کی تھی، وہ ان کی شریعت کے مطابق شادی ہی نہیں تھی۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس نے خدا کے احکام کے مطابق اپنا نکاح کیا تھا، اس لیے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ یہ مجاور، راہب، پجاری بکتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اس نے شادی نہیں کی تھی صاحب! عزیزانِ من! اب بات صاف ہو گئی۔ اب یہ جو چیز ہمارے ہاں ہے کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی تو یہودی کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کسی مرد کے ساتھ اختلاط کیا ہی نہیں تھا اور بیٹا پیدا ہو گیا تھا۔ دراصل عصمت کی حفاظت کا یہ سارا واقعہ یہودیوں کے الزام کا جواب ہے جو قرآن دیتا ہے کہ انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو کیا اس کے بعد بھی اور کہنے کے لیے کوئی بات باقی ہے، عزیزانِ من! کہ یہودیوں کی ایک لڑکی ہے، ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس باب میں قرآن کریم کی یہ تعلیمات ہیں۔

حضرت مریم کے متعلق عیسائیوں اور یہودیوں میں فرق

عزیزانِ من! قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی کسی کی عظمت دیکھتا ہے تو اس کی تحسین و داد دیتا ہے۔ حضرتِ مریمؑ کی عصمت کی حفاظت عیسائی تو نہیں بیان کر سکتے کیونکہ یہ تو مانتے ہیں کہ وہ شوہر کا بیٹا نہیں تھا۔ اب شوہر کا بیٹا نہیں تھا عزیزانِ من! تو بات تو وہیں جا پہنچی جو یہودی کہتے تھے۔ یہودی تو پھر بھی ان عیسائیوں سے کچھ نیچے کے درجے تک ہی رہے۔ انہوں نے تو بس اس شادی کو شرعی شادی نہ مانا' شادی کو تو مانا' مگر یہ عیسائی تو ان کی شادی ہی نہیں مانتے اور اس سے پہلے بچہ پیدا کر دیتے ہیں۔

قرآن ان یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ وہ ٹھیک ہے کہ اس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ اس کے ہاں بچہ اسی طرح پیدا ہوا جیسا ایک جائز نکاح سے بچہ پیدا ہوتا ہے لیکن اس نے کن حالات میں یہ کچھ کیا' تم سوچو گے تو تمہیں پھر اس کی داد دینی پڑے گی کہ واقعی یہ بڑی برگزیدہ عورت تھی۔ یہ ہے عظمت عزیزانِ من! یہ ہے وہ پس منظر جس میں یہ مسئلہ حل ہوا۔ کہیں کوئی چیز خلافِ فطرت نہیں ہے۔ خلافِ قانون کوئی بات نہیں ہے صاحب! جہاں تک ہمارے ہاں کا یہ مطالبہ ماننے کا تعلق ہے کہ صاحب! حضرت مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے اور حیاتِ مسیح کا کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے اور پھر وہ آسمان سے اتریں گے یہ کچھ آپ کے ہاں اب ایمان کا جزو بن چکا ہے۔ یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ قرآنِ کریم نے انبیاء کی نبوت پر ایمان لانے کے لیے ہمیں مکلّف کیا ہے نہ کہ اس کے ساتھ یہ کچھ بھی ماننے کا۔

قرآن حکیم کی تعلیم کا تقاضا

عزیزانِ من! ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پہ ایمان لاتے ہیں۔ قرآن نے ان چیزوں کو جزوِ ایمان قرار ہی نہیں دیا کہ اس ایمان کے ساتھ یہ کچھ بھی مانو کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے اور حیات مسیح یہ کچھ تھی' پھر جا کر تمہارا ایمان قائم ہوتا ہے۔ میں نے یہ تو عرض کیا کہ قرآنِ کریم نے مختلف انبیاء کرام کی داستانیں بیان کی ہیں' قریباً قریباً ہر نبی کی داستانِ حیات بیان کی ہے' ان کی زندگی بیان کی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بھی داستانِ حیات بیان کی ہے' زندگی بیان کی ہے۔ قرآن کی رو سے ان کی جو زندگی بیان ہوئی ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے' قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ وہ زندہ آسمان پہ اٹھا لیے گئے اور پھر آئیں گے۔ جب قرآن نے یہ نہیں کہا تو جتنا کچھ قرآن نے کہا ہے ہم اتنا ہی ماننے پر مکلّف ہیں۔ اب آگے چلتے ہیں۔ تو لیجیے ایک مسئلے کی حیثیت سے اِسے ایک ڈھنڈورچی کی طرح سے ڈھونڈتے رہیے۔ آپ کے ہاں یہ بات ایمان کا جزو تو نہیں بنتی۔ ایمان کا جزو تو ان کی نبوت پر ایمان لانا ہے اور بس۔ یہ ہے عزیزانِ من! وہ پس منظر جس سے یہ چیز آپ کے سامنے آ گئی اور اسی سے دیکھیے کہ یہ جتنا کچھ بیان ہوا ہے اس کی کس قدر اہمیت ہے۔

آخر ہمارے ہاں ان عقائد کو اتنی اہمیت کیوں؟

میں نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی داستانِ زندگی اور سیرتِ طیبہ کے اس رخ کے متعلق تو اتنی اہمیت نہیں جتنی آپ کے ہاں حیات و وفاتِ مسیح کے مسئلہ کو ہے۔ آپ کے ہاں بحثیں اس قسم کی بھی چلتی ہیں کہ ''آپ نور تھے یا بشر تھے''، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اس پہلو کو بھی اتنی اہمیت نہیں دیتے، جتنی اہمیت حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و وفات کو دی جاتی ہے۔ آخر یہ کیوں؟ تمام انبیاء کرام میں سے انہی کو کیوں چن لیا گیا؟ ان کے انہی دو مسئلوں پر، کہ ان کی پیدائش بن باپ کے تھی اور انہیں زندہ آسمان پہ اٹھا لیا گیا' کیوں ان کو اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ یہ ہمارے لیے جزوِ ایمان بن گیا؟ میں نے کہا ہے کہ یہ عقیدے تو عیسائیوں کے تھے۔ انہوں نے ان دونوں مسائل کو آپ کے ایمان کا جزو بنا دیا۔ آپ ان پہ اعتراض ہی نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ کچھ آپ تو پہلے ہی مانتے ہیں۔ یہ ہے ان چیزوں کی اہمیت! یہ ہے جس طرح سے کہ ایک مذہب دوسروں سے مانگے ہوئے خیالات اور عقائد سے متاثر ہوا کرتا ہے! اور اس حد تک متاثر ہوتا ہے! یہ بھی تو میری جرأت ہے جو یہاں یہ چیزیں میں آپ کو بیان کر رہا ہوں۔ ٹھیک ہے یہ کچھ کہنے سے مجھ پہ بھی کفر کے فتوے لگے۔ ان چیزوں کو اس حد تک اہمیت دے دی۔ نظر آتا ہے، عزیزانِ من! کہ یہ ان کے ہاں عیسائیوں کی اور یہودیوں کی اسلام کے خلاف سازش کہاں کہاں تک گئی ہوئی ہے۔ یہودیوں کو یہ ثابت کرنا تھا کہ ان کے پیغمبر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اونچے درجے پہ تھے۔ انہوں یعنی مسلمانوں نے تو انہیں یعنی حضرت موسیٰؑ کو اپنا پیغمبر مانا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ بھی ہمارے پیغمبر ہیں اور وہ اس طرح ہمارے پیغمبر ہیں کہ قرآن کی رو سے جب تک ہم رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے انبیاء کرام کی نبوت پہ ایمان نہ لائیں، نبوتِ محمدیہ پہ اکیلے' تنہا' ایمان لانے سے ہم مسلمان ہی نہیں ہو سکتے' تو اس کی' ان انبیاء کی' ہمارے ہاں کتنی اہمیت ہے!

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تقابل

عزیزانِ من! یہودیوں کے نزدیک تو حضرت محمد ﷺ نبی نہیں ہیں۔ وہ اپنا پیغمبر حضرت موسیٰؑ کو ہی مانتے ہیں' رسول اللہؐ کو وہ مانتے نہیں۔ اب جب اسلام اور یہودیت کے مقابلے میں' مناظرے میں' آتے تھے تو اسلام تو اتنا اونچا جاتا ہے کہ وہ اس کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے ان دونوں کا کیا تقابل کیا؟ نبی اکرم ﷺ معراج پہ تشریف لے گئے' وہ خدا کے ہاں گئے' واپس تشریف لائے تو حضرتِ موسیٰؑ بھی ایک آسمان پہ موجود تھے' آپ سے ملے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے کہا: فرمائیے' اللہ کے ہاں سے کیا چیز ملی؟ کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے نمازوں کا حکم دیا ہے۔ کہنے لگے: کتنی نمازوں کا حکم دیا جی؟ کہا: خدا نے پچاس نمازوں کا حکم دیا ہے' کہا: اور آپ اسے لے کے یونہی چلے آئے!

نبی اکرم ﷺ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی !!

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا کر رہے ہو؟ یہ ناممکن ہے' یہ نہیں پڑھی جائیں گی۔ آپ نے کہا: کیا کروں؟ انہوں نے کہا: جاؤ' جا کے خدا سے کہو۔ عزیزانِ من! سنتے جایئے جو میں کہہ رہا ہوں کہ ''نہیں پڑھی جائیں گی۔'' خدا نے حکم دیا ہے' رسول اللہ ﷺ اس حکم کو لے کے چلے آ رہے ہیں' رسول اللہ ﷺ کو خود احساس نہیں ہوا کہ ''نہیں پڑھی جائیں گی''۔ حضرتِ موسیٰ بتا رہے ہیں۔ آپ وہاں چلے گئے' جا کے عرض کیا۔ پھر آدھی رہ گئیں۔ کہتے چلے جاؤ کہ آدھی معاف ہوئیں۔ پھر آ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا ہوا۔ کہنے لگے: آدھی رہ گئیں۔ حضرت موسیٰ کہنے لگے: ''نہیں پڑھی جائیں گی۔'' پھر گئے' پھر جا کے خدا سے یہ کہا۔ پھر اس نے معاف کر دیں۔ پھر آ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: کتنی رہ گئیں؟ شاید پندرہ یا دس رہ گئیں۔ کہنے لگے: ''یہ بھی نہیں پڑھی جائیں گی۔'' بات سن لو جو میں کہتا ہوں۔ آپ حضور اکرم ﷺ پھر چلے گئے۔ پھر آئے۔ حضرت موسیٰ نے دریافت کیا: کتنی رہ گئیں؟ کہنے لگے: اب پانچ رہ گئیں۔ انہوں نے کہا: ''یہ بھی نہیں ہو سکے گا''۔ جاؤ۔ آپ ﷺ کہنے لگے: مجھے تو بار بار جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہنے لگے: اچھی بات' تم اپنی شرم میں رہو' دیکھ لینا' ''نہیں پڑھی جائیں گی۔''

عزیزانِ من! یہ کچھ یہودیوں کی کسی تورات میں نہیں لکھا ہوا' یہ سارا جو کچھ میں نے بیان کیا ہے آپ کے ہاں بخاری شریف میں لکھا ہوا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کا معاذ اللہ تقابل کیا ہے صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک واقعہ یا یہ ایک بخاری کی حدیث یہودیوں کی ساری سازش کو بے نقاب کر رہی ہے کہ وہ ایک چیز بیان کر دینے سے کیا کہتے ہیں کہ آپ خود سوچ لو کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا مقام کیا ہے اور ان ﷺ کا مقام کیا ہے۔ اب آئی عیسائیت۔ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ' جو میں نے آپ سے عرض کیا ہے' وہ یہ ہے کہ ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہگار رہتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صلیب پہ جان دینا اس پیدائشی گناہ کا کفارہ ہے۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ عقل و فکر کے میدان میں ایک قدم نہیں ٹھہر سکتا۔ اسلام کے مقابلے میں وہ آ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ نہیں کرتے۔ وہ جب بھی ان کے سامنے آتے' ان سے یہ کہتے کہ صاحب! حضرتِ مسیح علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے۔ یہ انسان کے لیے کائنات میں ایک Exception ہے۔ رسول اللہ ﷺ باپ کی اولاد تھے۔ اب ان دونوں میں سے افضل کون ہوا؟ ان سے پہلے منوا لیا گیا تھا کہ جی ہاں! وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کے متعلق' ابنِ عبداللہ کے متعلق' سب کو معلوم تھا۔ انکار کیسے کر سکتے تھے؟ مُلّا سے پوچھیے کہ یہ کیا ہوا؟ اب آگے بڑھیے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں پر زندہ ہونا

بقول عیسائیت کے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے زندہ آسمان پہ اٹھا لیا اور آج تک وہ زندہ موجود ہیں۔ آپ کے ہاں رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے۔ ان کا مقبرہ موجود ہے' کہو: دونوں میں سے کون اونچا ہوا؟ یہ ان سے پہلے منوا لیا کہ ''ہاں جی! وہ آسمان پہ

ہیں۔'' سوچ رہے ہیں آپ کہ یہ کیا کہا جا رہا ہے؟ انہوں نے آپ کے ہاں حیات النبی کے یہ عقائد تو وضع کر لیے' کہ رسول اللہ ﷺ بھی زندہ ہیں لیکن جب وہ یہ بات کہیں کہ پھر یہ مقبرہ' یہ روزہ مبارک کس کا ہے؟ بات نہیں بن سکی۔ دیکھتے ہیں آپ کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو تقابل میں لا کے وہ کس طرح سے انہیں اونچا لے گئے۔ یہ ہیں عزیزانِ من! جو سازشیں ہوتی ہیں اور یہ سازشیں کامیاب کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ امت نے قرآن کو چھوڑ دیا۔ عزیزانِ من! آج بھی یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے' جو میں کہہ رہا ہوں اور یہاں کہنے کی کیا بات ہے۔ میری تو حضرتِ عیسیٰؑ کی سیرت پہ پوری کتاب ''شعلہ مستور''[1] موجود ہے۔ ان سے کہیے کہ اللہ کا احسان ہے کہ ان کے ہاں عیسائیوں کے جو بڑے بڑے فلاسفر ہیں' ان کی تمام کتابیں میری نظر سے گزری ہوئی ہیں۔ یہ سارا کچھ کر چکنے کے بعد میں کتاب لکھا کرتا ہوں۔ ان سے کہیے کہ آئیں' ان کے یہاں کے Saint ' Thomas تک بھی کیوں نہ آئیں' میں خالص قرآن سے بات کرونگا اور اس کے بعد یہ کسی طرح سے ثابت کر دیں کہ اسلام کے مقابلے میں دنیا کا کوئی اور مذہب اونچا ہو سکتا ہے۔ میں جب بھی ان سے بات کرتا ہوں' قرآن خالص سے بات کرتا ہوں۔ وہاں کے مفکر' جن میں وہاں کے بڑے بڑے لاٹ پادری بھی ہوتے ہیں' میرے ہاں آتے ہیں۔ قرآنِ خالص کی پہلی شرط میں ان سے بیان کر دیتا ہوں۔ شطرنج کے گھوڑے کی چال کی طرح ڈھائی گھر ہی چل سکتے ہیں' تین بھی پورے نہیں کر پاتے۔ قرآن کے مقابلے میں' عزیزانِ من! ان کا علم نہیں ٹھہرتا۔ ان سے تو یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے بعد وہ مطمئن ہوتے ہیں لیکن وہاں' ہمارے ہاں کے مُلّاؤں سے فتویٰ آ رہا ہوتا ہے کہ یہ صرف قرآن سے بات کرنیوالا کافر ہے جی۔

کفر اور اسلام کا معیار صرف قرآن ہے

عزیزانِ من! کفر اور اسلام کے فیصلے تو ان فتویٰ گاہوں میں نہیں ہوتے۔ اس کا معیار تو صرف خدا کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ یہاں سے فیصلہ ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا یہ ہے کہ آج عیسائیت اپنے بنیادی عقائد چھوڑ رہی ہے۔ یہ بات سن کر آپ حیران ہونگے۔ میں کبھی کبھی مغرب کے محققین کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔ اس وقت بلند ترین مقام پہ وہ ایک Psychologist ہے' اس کا نام ہے ایرک فرام Erich Fromm (1900-1980) ہے۔ اس کی جو Latest کتاب آئی ہے' اس میں ایک Chapter ہے کہ: عیسائیت کے Original Sin (اوّلین گناہ) کا عقیدہ۔ یعنی یہ کہ ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ اس عقیدے نے Psychologically' نفسیاتی طور پر' انسانیت کو کتنا تباہ کیا ہے۔ اس کی تحقیق و تدقیق یہ ہے کہ اس عقیدے نے ہر انسان کے اندر ایک Inferiority Complex' احساس کمتری' پیدا کیا۔ وہ ماہر نفسیات (Psychologist) ہے' بات ہی نفسیات (Psychology) کی کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس عقیدے سے انسان خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا ہے۔

---

[1] پرویز: شعلہ مستور: حضرت زکریا علیہ السلام' حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکار جلیلہ' سلسلہ انبیاء کرام پر نگہ بازگشت اور اقوام عالم کے عروج وزوال کے ابدی اصول۔ شائع کردہ طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/ بی گلبرگ ۲۔ لاہور پاکستان صفحات ۲۸۸' ایڈیشن ۱۹۹۴۔

احساس کمتری کے مہلک مرض نے قوموں کی قومیں تباہ کر دیں ہیں

اریک فرام (Erich Fromm 1900-1980) نے کہا کہ یہ جو Inferiority کا یا کمتری کا کمپلیکس (Complex) پیدا ہوتا ہے اس نے بتایا ہے کہ اس سے کتنے ہی زیادہ اعصابی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ گزشتہ دو ہزار سال سے انسانیت جو قسم قسم کی اعصابی بیماریوں کے اندر مبتلا چلی آ رہی ہے اس میں بیشتر حصہ یورپ کی اُن قوموں کا ہے جو عیسائیت لیے ہوئی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ احساسِ کمتری ہے جو اس Original Sin (اولین گناہ) کے عقیدے نے پیدا کیا تھا۔ جب تک یہ عقیدہ نہیں نکلتا' انسان انسانیت کی سطح پہ نہیں آ سکتا۔ وہ شخص یہ کچھ لکھ رہا ہے۔ وہ تو اپنے ہاں کے بنیادی عقائد کو اس طرح سے چھوڑ رہے ہیں' قرآن کی طرف آ رہے ہیں۔ یہ تو قرآن تھا جس نے یہ کہا کہ ''انسان کا اس طرح سے' کسی ماں باپ کے گناہ کی آلائش کو لے کے یوں آنا اور پھر گناہ بھی ایسا ہو کہ مٹ نہ سکے' قطعاً غلط ہے''۔ قرآن کریم نے تو کہا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (6:164)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ماں باپ کا گناہ' ماں باپ کے ساتھ' بیٹا کلین سلیٹ (Clean slate) لے کے دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس سے پوچھیں گے کہ ''تم نے کیا کیا' یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ تمہارے ماں باپ نے کیا کیا؟'' آیئے قرآن کی طرف' تو دیکھیے کہ یہ نوع انسان کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ مغرب کے یہ مفکر اس طرف آ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! آج میں حضرتِ مریم کی داستان کا صرف وہ پس منظر بیان کر سکا ہوں جو قرآن کریم میں' اب یہاں' سورۃ مریم علیہا السلام کی آیت 16 سے شروع ہوتا ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ (19:16)۔ ''قرآن میں مریم کی داستان بھی ذرا بیان کرو۔'' اب وقت ہو گیا ہے۔ ہم اس داستان کو اب اگلے درس میں لیں گے۔ سورۃ مریم کی آیت 15 تک ہو چکا ہے' آیت 16 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀......❀

بارھواں باب: سورۃ مریم (16 تا 21)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ مَرۡیَمَ ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَہۡلِہَا مَکَانًا شَرۡقِیًّا ﴿ۙ۱۶﴾ فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِہِمۡ حِجَابًا ۟ۚ
فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡہَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَہَا بَشَرًا سَوِیًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ
تَقِیًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّکِ ٭ۖ لِاَہَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتۡ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّلَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ
بَشَرٌ وَّلَمۡ اَکُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ ۚ وَلِنَجۡعَلَہٗۤ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَۃً مِّنَّا ۚ
وَکَانَ اَمۡرًا مَّقۡضِیًّا ﴿۲۱﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1975 کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (19:16)۔

حضرتِ مریم علیہا السلام کی داستان اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا پس منظر پوری وضاحت کے ساتھ پچھلے ایک دو درسوں میں سامنے آ چکا ہے۔ اب اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اسے اگر آپ اپنے ذہن میں رکھیں گے تو یہ آیات جواب آگے آ رہی ہیں' جن میں اس سرگزشت کی کچھ تفصیل دی گئی ہے' اس کے سمجھنے میں آپ کو کوئی دشواری لاحق نہیں ہوگی اور اگر وہ پس منظر ذہن میں نہیں رہے گا تو پھر وہ ساری الجھنیں پیدا ہونگی' جو اب تک پیدا ہوتی چلی آ رہی ہیں اور جن کا حل اس کے سوا اور کچھ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ محرف تورات میں جو افسانہ نگاری کی ہے' وہی یہ اپنے ہاں روایات کی تائید کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے چلے جائیں۔ ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہی ہے۔ دراصل وہ سارا قصہ تورات کا ہے اور ہمارے ہاں تفاسیر میں آ رہا ہے۔

مروجہ تفاسیر کے سلسلہ میں بنیادی کمزوری

وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ان میں بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان تفاسیر کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ آیا وہ مفسرین کے اپنے خیالات ہیں' یا انہوں نے تورات سے لیے ہیں۔ ہر تفسیر سے پہلے روایت لکھ دی جاتی ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایسا فرمایا۔ ہمارے ہاں سب سے بنیادی دشواری' جو مذہب کو دین کی طرف لانے میں ہے' وہ یہی ہے کہ پرانی محرف کتابوں کے اندر جس سند کے ساتھ یہ غلط

تصورات، نظریات بیان کیے جاتے ہیں، اگر کوئی تفسیر لکھنے والا انہیں اپنے خیالات کی رو سے بیان کرے تو بڑی آسانی سے ان کی تردید کی جاسکتی ہے، ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ انہیں بھی سمجھنے کا حق تھا، ہمیں بھی حق ہے۔ لیکن جب وہ ان پرانی محرف کتابوں کی قصے یا اپنے خیالات کے ساتھ یہ کہے کہ حضور ﷺ نے یہ کچھ فرمایا، تو اس کے سامنے دشواری پیش آجاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے تو کونسا مسلمان ایسا ہے جو یہ جرأت کرے کہ نہیں صاحب! میں اسے نہیں مانتا، میں اس سے اختلاف کرتا ہوں، میں معاذ اللہ اس کی تردید کرتا ہوں، تو وہ مسلمان ہی نہیں رہ سکتا، رسالتؐ پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں۔ اب جتنے آپ کے ہاں مروجہ غلط خیالات، نظریات، اعتقادات پھیلے ہوئے ہوں، ان کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ ان کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ صاحب! آیئے سب سے پہلے انہی کو پرکھ کے دیکھ لیں کہ یہ ارشادات رسول اللہ ﷺ کے ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اس بات کے کہنے پر کہا جاتا ہے کہ رسالت کا انکار ہے۔

منکرِ حدیث کی ڈگڈگی بجانے والوں سے التماس: جرح وتعدیل حدیث

ہمارے ہاں حضور ﷺ کی احادیث کے متعلق جو منکرِ حدیث، منکرِ حدیث، کی ڈگڈگی سنتے ہیں، کیا بات ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو چیزیں آپ حضور ﷺ کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں کہ یہ مانیے کہ یہ حضور ﷺ کے ارشادات ہیں، تو آیئے ذرا پرکھ کر دیکھتے ہیں کہ آیا یہ ارشادات حضور ﷺ کے ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں اور اس پرکھنے میں بھی کوئی نئے اصول نہیں جو وضع کئے جائیں گے۔ ان کے ہاں یہ اصول پہلے سے وضع شدہ ہیں۔ خود ان کے ہاں کے وہ لوگ جنہوں نے حدیث کے متعلق جرح وتعدیل کا ایک علم جاری کیا، انہوں نے احادیث پرکھنے کے معیار، اصول، مقرر کیے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ''کوئی روایت جو قرآنِ کریم کے خلاف جائے، وہ صحیح نہیں ہوسکتی''۔ دوسرے نمبر پہ یہ اصول ہے کہ ان میں سے کسی کے ہاں دیکھیے احادیث کے پرکھنے کی یہ فہرست دی ہوئی ہے کہ ''کوئی روایت جو عقل اور فکر کے خلاف جائے، وہ حدیث صحیح نہیں ہوسکتی''۔ تیسرے نمبر پہ یہ ہے کہ جو ''روایت واقعات کے خلاف ہو یا جس کو مشاہدہ یا معائنہ کہتے ہیں، اس کے خلاف جائے، وہ حدیث صحیح نہیں ہوسکتی''۔ اگلا نمبر یہ ہے کہ ''جو روایت تاریخی واقعات کے خلاف جائے، وہ صحیح نہیں ہوسکتی''۔ انہوں نے یہ ساری فہرستیں خود دی ہوئی ہیں تو اب آپ کو واقعی تعجب ہوگا کہ اگر انہوں نے یہ دیا ہوا ہے تو اگر آج کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف جاتی ہے، اسے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں مانا جاسکتا، وہ حدیث صحیح نہیں ہے تو پھر یہ اس کے خلاف کفر کے فتوے کیوں صادر کرتے ہیں؟

کفر کے فتوے صادر ہونے کی وجہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ اس معیار کے مطابق حدیثوں کے مجموعے پرکھے جاچکے ہیں۔ لہٰذا آج کوئی شخص، انہی

اصولوں کے مطابق موجودہ روایات کو، جو آج بھی ان کتابوں میں درج ہیں، انہیں دوبارہ نہیں دیکھ سکتا شاید اس لیے کہ وہ لوگ ہم سے زیادہ صاحبِ علم تھے، زیادہ صاحبِ بصیرت تھے تو گویا اب ان احادیث کی رو سے ایمان رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر نہیں بلکہ ان لوگوں کی بصیرت، ان لوگوں کے علمی تدبر پر ہے۔ اس کے خلاف آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ انکار اس بات سے ہے کہ بھئی! جس طرح ان معیاروں کے مطابق انہیں یہ حق پہنچتا تھا، انہی کے مطابق اگر امام بخاری نے چھ لاکھ میں سے پانچ لاکھ ترانوے ہزار حدیثوں کے متعلق کہہ دیا کہ یہ وضعی ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، اگر اسی میں سے ہم یہ کہہ دیں کہ صاحب! ٹھیک ہے، انہوں نے بڑی محنت کی لیکن بہرحال ایک انسان تھے، انسانی کوشش تھی، انہی کے قائم کردہ معیار کے مطابق ان میں کچھ ایسی نظر آتی ہیں جو اس پہ پوری نہیں اترتیں، انہوں نے اس میں سے پانچ لاکھ ترانوے ہزار مسترد کیں تو اگر پانچ لاکھ ترانوے ہزار کے بعد دو کا اور اضافہ ہو جائے تو کیا قیامت آ جائے گی۔ کہتے ہیں: نہیں صاحب! یہی نہیں کہ اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا، آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ عقیدہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک روایت کا انکار، انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ وہ کوئی مبالغہ والی بات نہیں۔ یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔ یہ ایمان ہے، یہ عقیدہ ہے۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ کفر کا فتویٰ، ان کے اس معیار کے مطابق تو بالکل صحیح ہو گیا۔ جب عقیدہ یہ ہو جائے، تو کم از کم بخاری اور مسلم کی یہ دو کتابیں جو ہیں ان کے متعلق اہلحدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ ان میں جو کچھ بھی آ چکا ہے، ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

اہلحدیث کے نزدیک حنفی کافر اور حنفیوں کے نزدیک اہلحدیث کافر

یہ جو ان کے آپس میں کفر کے فتوے چلے آ رہے تھے آپ کو اس کے متعلق معلوم ہے کہ جنہیں حنفی کہتے ہیں یہ تھا کیا؟ آپ کے ہاں کے کثیر التعداد فرقہ حنفیوں کا ہے۔ یہ بخاری اور مسلم کی دو سو حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں، ان کے اپنے ہاں ایک اور مجموعہ ترمذی کا ہے اور وہ اس کی حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہیں لیکن یہ اہلحدیث ان ترمذی کی حدیثوں کو صحیح نہیں مانتے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بخاری اور مسلم کی ایک دو نہیں دو سو حدیثوں کے متعلق یہ کچھ کہتے ہیں۔ اس لیے یہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے ہاں یہ چیز چلی آ رہی تھی۔

قربانی کا مشترکہ بکرا: پرویز

ان سب نے مل کے قربانی کا ایک بکرا چن لیا۔ اب ان کے نزدیک کافر صرف پرویز ہے۔ یعنی آج وہ حنفی جو دو سو حدیثوں کا انکار کرتے تھے، وہ بھی کافر نہیں رہے کیونکہ یہ متحدہ محاذ ہے۔ اس محاذ میں اقامتِ دین والے بھی شامل ہیں اور سیکولرازم والے بھی شامل ہیں۔ وہ تو ہے متحدہ محاذ۔ اب یہ ان کا بھی ایک متحدہ محاذ ہے کہ جنہیں حدیث کے انکار کی بنا پر کافر کہتے تھے۔ اب ان کے ساتھ دو سو حدیثوں کو نہ ماننے والے بھی شامل ہو گئے۔ تو یہ متحدہ محاذ پرویز صاحب کے خلاف بنا کہ جی! یہ منکرِ حدیث ہے۔ ارے حنفیوں سے پوچھو کہ آپ ان

اہل حدیث کے نزدیک کیوں کافر نہیں ہیں: کہ جی اسے چھوڑ یئے' آپ بتایئے کہ فتویٰ پہ دستخط کرنے والوں میں اہلحدیث اور حنفی دونوں شامل ہیں یا نہیں۔ کیا بات ہے؟ اہلحدیث سے پوچھیے کہ یہ جو آپ کے نزدیک پورا گروہ کافر ہے' اس کافر کو بھی حق حاصل ہے کہ یہ کسی کے اسلام کے متعلق فتویٰ دے دے' کون سنتا ہے؟ ان کے ہاں Broadcasting Station ہر محلے کے اندر موجود ہیں' چار چار لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے۔

میں بات یہ کہہ رہا تھا عزیزانِ من! کہ سارا نقطہ یہاں اس میں موجود ہے: احادیث پرکھنے کے معیار کتابوں کے اندر موجود ہیں' نظریے موجود ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ پرکھے جا چکے ہیں' اب انہیں پرکھا نہیں جا سکتا۔ سوال یہ نہیں' عزیزانِ من! اگر حضور نبی اکرم ﷺ اپنے ارشاداتِ گرامی کا بھی ایک مجموعہ مصدقہ طور پر' مکمل طور پر' امت کو اسی طرح سے دے جاتے جس طرح سے حضور ﷺ نے قرآن دیا تھا تو کس مسلمان کی جرأت تھی کہ وہ یہ کہہ دیتا کہ صاحب! یہ غلط ہیں' صحیح نہیں' میں ان سے اختلاف کرتا ہوں۔

پتہ ہے اس اختلاف کا جواب کیا دیتے ہیں؟ کہتے ہیں اس طرح سے رسول اللہؐ نے قرآن بھی امت کو نہیں دیا تھا۔ چلیے صاحب! معاملہ ہی ختم ہوا۔ حدیث کے مجموعے نہیں دیئے تھے' اس کا انہیں بھی اقرار ہے۔ جواب یہ ہے کہ صاحب! حضور ﷺ نے قرآن بھی اس طرح سے نہیں دیا تھا۔ اچھا جی پھر کیا؟ کہا کہ جس طرح حدیث کے مجموعے مرتب ہوئے' اسی طرح سے آپ کا قرآن جمع ہوا۔ اگر آپ ان کی صحت کو نہیں مانتے تو پھر قرآن کی صحت کو کیسے مان سکتے ہیں؟ اب آپ کے پاس کون سی دلیل ہے؟ قصہ ختم' اصل ہی غائب!! یہ تو وہی ہوا جو قوم عاد نے کہا: قَالُوۡا یٰـهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِىۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ (11:53)۔ انہوں نے ہودؑ سے کہا کہ تم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جسے ہم واقعی محکم دلیل سمجھیں۔ ہم اپنے معبودوں کو محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لیے ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔

بات اصل حقائق پر غور کرنے اور انہیں جاننے کی ہے

عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز' یہ ہے وہ اصل' جس کے خلاف میں نے یہ آواز بلند کی تھی اور کیے چلا جا رہا ہوں۔ زندگی کے چند دن اگر باقی ہیں تو میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ بات اصل میں کیا ہے اور یہ کفر کے فتوے کیا ہیں؟ اور پھر یہ کیا چیزیں ہیں جو منوائی جا رہی ہیں؟ یہ ہیں وہ جو منوائی جا رہی ہیں' حضرتِ مریم علیہا السلام کے قصے میں یہی دو چیزیں آپ کے ہاں ان تفاسیر میں لکھی گئی ہیں اور پھر وہی ہماری دقت کہ اس کے ساتھ پہلے ''قال رسول'' کہا گیا ہے اور پھر جو کچھ کہا وہ میں کسی شریف مجلس میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات پہ آپ کو حیرت تو ضرور ہو گی لیکن خود اٹھا کے' پڑھ کے' دیکھ لیجیے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو تفاسیر میں جو کچھ درج ہے وہ تو ایک طرف رہا' وہ بخاری شریف کا پہلا ہی باب ''باب الغسل اور باب الوضوٗ'' وغیرہ ذرا پڑھ کر دیکھ لے' اصل معلوم ہو جائے گی۔

مسلمانوں کے ہاں عیسائیت کے دو بنیادی عقائد کی پیروی

بہر حال بات حضرتِ مریم علیہا السلام کے قصے کی آ گئی۔ پس منظر میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ یہ خالص عیسائیت کے عقیدے تھے کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے اور ان عقیدوں کے لیے ایک بنیاد تھی کہ انہوں نے انہیں (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو ابن اللہ قرار دینا تھا۔ اگر انہیں کسی انسان کا بیٹا قرار دیدیتے تو انہیں خدا کا بیٹا نہیں بتا سکتے تھے۔ اس عقیدے کے ماتحت انہوں نے یہ چیز وضع کی۔ ابن اللہ کو پھر موت آ جاتی' یہاں تو وہ ابن اللہ نہیں رہ سکتا تھا۔ انہوں نے اس کی حیات کا عقیدہ وضع کیا کہ وہ آسمان پہ چڑھ گئے۔ ان کے بنیادی عقیدے کی رُو سے اس کی ضرورت تھی' اس کے بغیر ابن اللہ کا وہ عقیدہ باقی نہیں رہتا تھا۔ آپ کے ہاں بھی بعینہ یہی دو چیزیں ہیں جو جزوِ ایمان ہو گئیں۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ صاحب! اچھا اس کے متعلق یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے' یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ اب اگر کوئی یہ مانتا ہے کہ ان کی پیدائش اسی طریق سے ہوئی جیسی عام انسانوں کی ہوتی ہے' ان کی وفات بھی ایسی ہوئی جیسے عام انسانوں کی ہوتی ہے تو وہ ان کے کہنے کے مطابق مسلمان نہیں رہ سکتا۔

سوچیے کہ آج کا مسلمان کہاں کھڑا ہے؟

یہ دو عقیدے ماننے سے یہ شخص' یہ مسلمان' عیسائی تو ہو نہیں سکتا۔ عیسائی اسے اپنے میں شمار ہی نہیں کرتے۔ کیوں نہیں شمار کرتے؟ کہتے ہیں کہ آپ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک اور پیغمبر کو مانتے ہیں تو عیسائی ہونے کے لیے وہ پہلے اِن عقائد سے نکلے' تب عیسائی ہو۔ اور یہاں ہم نے یہ دونوں عقیدے رکھے ہوئے ہیں اور پھر مسلمان ہونے کے سلسلہ میں انہوں نے اسے لازمی شرط قرار دے دی ہے۔ لہٰذا اس حالت میں ہم یہاں کھڑے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

عیسائی اسلام کے مقابلے میں' ایک ایک مباحثہ اور ایک ایک مناظرے میں مات کھا جاتا تھا۔ دونوں چیزیں اس نے منوالیں' منہ بند کر دیا۔ اسے کہتے ہیں پراپیگنڈہ۔ عیسائی ان دونوں عقیدوں کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی تحقیقات وہاں تک پہنچی ہوئی ہیں جہاں ان عقائد کو چھوڑنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ خود عیسائی بھی انہیں کچھ نہیں کہتے۔ مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص بدبختی سے یہی چیز کہہ دے کہ نہیں صاحب! قرآن ایسا نہیں کہتا تو اس کے خلاف یہ ڈگڈگی بج جاتی ہے کہ صاحب! یہ کافر ہو گیا۔ یاد رکھیے' قرآنِ کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ بات صاف ہو گئی۔ کہیں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ زندہ آسمان پہ موجود ہیں۔ قرآن میں بھی یہ کہیں نہیں ہے تو پھر یہ کچھ ہے کہاں؟ وہی ان روایات میں یہ کچھ موجود ہے۔ کہ صاحب! پھر قرآن کی ان آیتوں کی تشریح ان روایات کی رو سے کی جاتی ہے۔ قرآن یہ ہو گیا۔

سورۃ مریم کی آیت سولہ (16) میں پس منظر کے تحت میں نے کہا تھا۔ آپ ان آیتوں کو لیے چلے جائیے۔ اب مجھے ضرورت نہیں

رہے گی کہ میں ایک ایک آیت کی پھر وہ ساری تفسیر دہراؤں جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔قصہ حضرتِ مریم علیہاالسلام سورۃ ال عمران قرآنِ کریم کی تیسری سورۃ میں دیا ہے۔ یہ قریباً 40ویں 41ویں آیت کے بعد شروع ہوتا ہے۔وہاں بھی اس کی تفصیل ہے اور اس کے بعد سورۃ مریم میں بھی اس کی تفصیل ہے۔آپ ان دونوں مقامات کو ملائیے گا تو یہ پوری داستان سامنے آجائے گی۔

ہیکل میں بالغ لڑکیوں کی شادی بذریعہ لاٹری......قرعہ

اس سورۃ الِ عمران میں قرآن نے حضرتِ مریم علیہاالسلام کی داستان کا وہ حصہ دیا جو انہوں نے خانقاہ میں ایک نن (Nun)، ایک راہبہ کی حیثیت سے ہیکل میں گزارہ تھا، وہ یہاں سورہ مریم میں نہیں دیا گیا، اس کی تفصیل وہاں ال عمران میں آئی۔اور میں عرض کر چکا تھا کہ اس کے معنی کیا تھے، وہاں یہودیوں نے، ہیکل کے پجاریوں نے، راہبوں نے، یہ شرط لگائی ہوئی تھی جیسا کہ ہر مزار کے پجاری ہوتے ہیں تو لڑکیاں بھی وہ وہاں ہیکل کی خدمت کے لیے دے دیتے، بالغ ہوتی تھیں تو شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ یا تو ہیکل کے مجاوروں میں سے کسی کے ساتھ شادی کریں اور شادی بھی ان کی کسی مرضی سے نہیں، قرعہ ڈالا جائے اور اس کے بعد جس کے نام یہ قرعہ، یہ لاٹری، نکل آئے اس سے شادی کرے۔ معاذ اللہ اس شادی کا بھی اندازہ لگائیے۔ وہ پاک دامن حضرتِ مریم تھیں، جن کی پاک دامنی، عفت وناموس کی شہادت قرآن پاک نے ان کے ضمنی تذکرے تک میں دی ہے۔کہا: وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (21:91)۔اور ان کے ساتھ ہی اس عفت مآب خاتون (حضرت مریمؑ) کا معاملہ بھی یاد کرو۔شادی کا یہ معاملہ قرعہ اندازی سے طے ہوتا تھا اور اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو پھر وہ کسی سے شادی نہیں کر سکتی۔ یہ یہودیوں کے اس ہیکل کی شریعت تھی۔

حضرتِ مریم علیہاالسلام کی تربیت وپرورش حضرتِ زکریا علیہ السلام جیسے نبی کے زیرِ نگرانی ہوئی۔نظر آ رہا ہے کہ خدا کا یہ نبی ان تمام چیزوں کے خلاف ہوگا۔ ان کی تربیت یافتہ ہیکل کی اس بچی نے یہی خیالات اپنے ذہن میں رکھے کہ یہ سب باطل کے عقیدے ہیں، خدا کی شریعت ایسی نہیں ہوسکتی۔ یہ ہے حضرتِ مریم علیہاالسلام کی وہ عظمت جو قرآن نے ان حالات میں بیان کی ہے جبکہ یہودیت میں ہیکل کے پجاری موت کے علاوہ ہر سزا دے سکتے تھے۔عزیزانِ من! آج اس دور میں جب کہ یہ اتنا کچھ زیادہ سا آزاد ماحول ہوگیا ہے، مذہب کی گرفت بھی اتنی سخت نہیں رہی ہے، اس کے عکس اگر آج بھی آپ کا یہ مذہب پرست طبقہ، یہ آپ کے احبار ورہبان، کسی کے خلاف کہیں پراپیگنڈہ شروع کر دیں تو اُسے کافر بنا کے رکھ دیتے ہیں۔اس کے عزیز ترین دوستوں تک کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے ذرا بچ کے چلتے ہیں، اس سے ہٹ کے چلتے ہیں۔ مجھ سے پوچھیے۔ یہ تو پھر بھی اس دور میں ہوا تھا جب یہودیوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ہیکل کے دائرہ کار میں صرف سزائے موت کے لیے انہیں رومی گورنر سے استصواب کی ضرورت تھی، ورنہ وہ ہر سزا دے سکتے تھے۔اگر یہ جیل خانہ کی یا ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ بھی دیں تو بھی معاشرے کے اندر ان کی دی جانے والی سزا تو سخت ترین سزا ہوتی ہے، اپنے گھر والے تک اسے باہر نکال دیتے ہیں۔ یہ ہے کیفیت ان کی دی جانے والی سزا کی۔

اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کے درمیان میری حیثیت

عزیزانِ من! میں کسی کا گلہ نہیں کرتا، نہ مجھے اس چیز پر کوئی Regret یا ندامت ہے۔ میرے عزیز رشتہ دار مجھے اپنی تقریبوں میں نہیں بلاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جی! کافر ہے، نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔ آج میں یہ صرف مثال دینے کے لیے عرض کر رہا ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ میرا کوئی گلہ نہیں ہے۔ مجھے اس پہ فخر ہے۔ لیکن سوچیے کہ وہ لڑکی جو اس خانقاہ یا ہیکل کے اندر ان کی گرفت میں تھی، ماں باپ کا بڑا سخت مذہبی گھرانہ تھا، جنہوں نے بچی کو ہیکل میں نذر کے لیے دے دیا۔ یہ اتنا بڑا مذہبی معاشرہ تھا۔ وہیں پھر اس نے گاؤں میں جانا تھا، جہاں وہ سارے یہودی، بڑے مذہب پرست تھے، یہاں ہیکل یا خانقاہ میں رہے تو ان کی آلودہ نگاہوں کا شکار بن کر، یہاں سے نکلے تو کہاں جائے؟ اس گھر میں، ماں باپ ہی کے ہاں ہی وہ بے چاری جائے گی اور گھر میں وہاں یہ کیفیت! لیکن اس کے باوجود، جب یہ چیز طے ہوگئی کہ یہ خدا کی شریعت نہیں ہے، انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت ہے، اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ہے اور یہ کچھ عملاً کرنا ہے تو سماجی اور نفسیاتی خطرات دور ہو گئے۔

حضرتِ مریم کے عظمتِ کردار پر قرآن حکیم میں اِصْطَفٰی کا لفظ

عزیزانِ من! یہ کچھ کرنے کے لیے ہر جہت سے بڑے ہی جہاد کی ضرورت ہے۔ یہ خاتون بڑی بلند پایہ تھی اور پھر اس سے آپ سوچیے کہ کیا قرآنِ کریم نے ایسے ہی سرسری طور پر حضرتِ مریمؑ کی داستان بیان کی ہے؟ قرآن حکیم میں اِصۡطَفٰی کا لفظ نبیوں کے لیے آیا کرتا ہے جب کہ یہاں اِصۡطَفٰی (3:33) کا یہ لفظ حضرتِ مریم علیہا السلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن کے اندر دو ہی عورتوں کا ذکر ہے: فرعون کی بیوی کا اور حضرتِ مریم علیہا السلام کا۔ یہ تو جب وہاں بات آئے گی تو میں عرض کروں گا۔ فرعون جیسے کی بیوی ہو، گھر کے اندر ہو اور وہ ہو بھی مومنہ، یہ کچھ کم بات نہیں تھی اور یہاں، قصۂ حضرت مریم میں، اس ہیکل کے نرغے میں گھری ہوئی بیچاری یہ لڑکی ہے، جس کے ماں باپ اسے چھوڑ گئے تھے، ہیکل کی نذر کر گئے تھے۔ واپس جاتی ہے تو اس ماحول میں، اس معاشرے میں، اس ماں باپ کے گھر، جانا پڑتا ہے۔ وہاں رہتی ہے، تو یہ ماحول ہے۔ اس میں سرکشی کرنا، اس کے خلاف بغاوت کرنا، بہت بڑے ایمان کی ضرورت ہے۔

عزیزانِ من! قرآن یونہی کسی کو شرفِ دوام نہیں بخش دیتا۔ قرآن کے اندر کسی کو اِصۡطَفٰی کا لفظ دے دینا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ سورۃ مریم میں جو بات کی ہے، وہ پہلے ہیکل کی زندگی کی ہے، اس نے اس زندگی کو چھوڑ دیا ہے، وہ سورۃ آلِ عمران میں ہے۔ یہاں سورہ مریم سے جو ذکر کیا ہے تو وہ وہاں سے بات شروع ہوتی ہے کہ جب یا تو وہ ہیکل کو چھوڑ کے اپنے ہاں واپس گئی ہے، وہاں سے بات شروع کی ہے اور یا بعض کا خیال ہے کہ وہ ہیکل کو چھوڑ کے گئی اور وہاں سے جانے کے بعد چچا زاد بھائی یوسف کا جو کردار آتا ہے، وہاں سے بات شروع کی ہے۔

چچازاد بھائی یوسف کا کردار

پھر یہ جو ان کا چچازاد بھائی تھا' یوں سمجھو کہ ''یوسف'' تھا' اس نے بھی اس معاشرے کے اندر بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ اپنے آپ کو اِس ماحول میں شادی کے لیے پیش کر دینا یا اس کام کے لیے آمادہ ہی ہو جانا' بہت بڑی جرأت اور ایمان کی بات تھی۔ اور یہ جو آگے' آپس میں ان باتوں کی یا اس معاملے کی کشمکش سی آتی ہے' وہ بتا رہی ہے کہ یہ ایسی ہی بات تھی۔ خود اس کے دل میں بھی بڑی کشمکش تھی۔

عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کا مقام

اس نکاح کو یہودیوں نے شریعت کی رو سے نکاح تسلیم ہی نہیں کیا تھا' اسی لیے یہودی نصاریٰ معاذ اللہ حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق افراط وتفریط میں ہیں۔ عیسائی انہیں ابن اللہ کہتے ہیں' حضرتِ مریمؑ کی پرستش کرتے ہیں۔ یہودی معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ ان کو حرامی بچہ کہتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ وہ اس نکاح کو شرعی نکاح ہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا معاذ اللہ کہ یہ کہیں جسے آپ معاذ اللہ معاذ اللہ حرامی بچہ کہتے ہیں۔ یہ بات نہیں تھی' یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ صاحبِ شریعت' اربابِ شریعت' جس نکاح کو شرعی نہ مانیں' اسے تو وہ حرام کا ہی کہتے ہیں۔ یہ تھا سارا قصہ۔ یہودی یہ کہتے تھے اور عیسائی انہیں ابن اللہ بنا رہے تھے صاحب!

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق وحیِ خداوندی کا بیان

عزیزانِ من! یہ خدا کی وحی اور دین ہی ہے جو صحیح مقامات کو مقرر کرتا ہے۔ لہٰذا یہودیوں کا وہ جرم جو وہ ان پر عائد کرتے تھے اور عیسائیوں کا یہ مبالغہ بھی قطعاً غلط ہے۔ خدا کے رسول عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں' ان کی پیدائش عام انسانوں کیطرح ہوتی ہے' ان کی موت عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے ان دونوں الزامات کو کاٹ کے رکھ دیا کہ یہودیوں کا یہ الزام حضرتِ مریم علیہا السلام کے خلاف تھا جب کہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ معاذ اللہ انہوں نے چوری چھپے کچھ اس قسم کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ اس نکاح کو نکاحِ شرعی نہیں مانتے تھے۔ آج اس کی مثالیں موجود ہیں۔

طلوعِ اسلام پڑھنے والے کے نکاح کے متعلق مولوی صاحب کا فتویٰ

عزیزانِ من! ہمارے حلقہ کے اندر' ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ شریعت کے مطابق جوڑے کے کیے گئے نکاح کو مولوی صاحبان فتویٰ لگا رہے ہیں کہ یہ نکاح شریعت کے مطابق نہیں۔ ''کیوں نہیں جی!''؟ کہا کہ جی! وہ طلوعِ اسلام پڑھتے تھے۔ میں یہ افسانہ نہیں بیان کر رہا' یہ واقعات بیان کر رہا ہوں اور اس کے بعد یہ ہمارے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے' اب مرحوم ہو گئے ہیں۔ بہرحال یہ ہماری بیٹی تو موجود

ہے۔یعنی جب وہاں چھوٹی سی بستی کے اندر' باقاعدہ شریعت کیمطابق' جیسے مسلمانوں کا نکاح ہوتا ہے' یہ نکاح ہوا تھا تو انہوں نے متحدہ طور پہ مسجد میں اعلان کردیا کہ یہ نکاح' نکاح ہی نہیں ہے۔سوچیے کہ اس بچی پہ کیا گزری۔بڑی ہمت' سے ہمارے اس دوست نے' جوان کے بھی معیار کے مطابق پابندِ شریعت' نہایت متقی' پرہیزگار تھے اِن کے حالات کا مقابلہ کیا۔انہوں نے مجھے یہ کہا کہ بھائی صاحب! بچی کی کیفیت یہ ہے کہ گھر میں دن رات رو رہی ہے' وہ خودکشی کرنے پہ آمادہ ہو رہی ہے' اس لیے کہ سارے گاؤں یا بستی کے اندر' عزیز رشتہ دار تو ایک طرف' انہوں نے ہر طرف اتنا چرچا کردیا کہ بچی جہاں بھی بیٹھے' سب یہ کہیں کہ ''یہ ہے وہ بچی جس کا نکاح ہی نہیں ہوا اور خاوند کے ہاں بس رہی ہے۔'' ایک شریف زادی کے لیے اس سے زیادہ کوئی اور چیز جاں گداز [1] نہیں ہوسکتی۔انہوں نے یہ چیز کہی۔وہ شہادت پیش کرتے تھے کہ پہلے اسے تسلیم کرو کہ یہ حرام کا نکاح ہے پھر ہم نئے سرے سے انکا نکاح کریں گے۔کیسے نکاح کرو گے؟ جیسے پہلے ہوا ہے۔تم ویسے ہی کرو گے۔وہ کیوں نہیں ہوا؟ اس لیے کہ ''ہم نے نہیں پڑھایا'' بات تو ساری یہ ہے جی! وہاں بھی یہ یہی کچھ آ کر کریں تو شریعت کے مطابق ہو اور اگر کوئی دوسرا یہی کچھ اسی طرح شریعت کے مطابق کرے' تو یہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔آج اس دور میں بھی یہ کیفیت ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک حضرت مریم کے قصے کی اہمیت کیوں؟

میں بار بار یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کے سوا یہ بات آپکی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ یہ حضرتِ مریم علیہا السلام والا قصہ کیا ہے' قرآن نے اسے اس تفصیل سے کیوں بیان کیا ہے؟ بیان ہی اس لیے کیا ہے کہ خدا کو معلوم تھا کہ احبار و رہبان کی طرف سے' مذہبی پیشوائیت کی طرف سے' ہر دور میں یہ کچھ ہوگا تو قرآن نے ان واقعات کو ہمیشہ کے لیے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تاکہ وہ کچھ سب کو معلوم ہو جانا چاہیے۔بہرحال یہ چیز ضرور ہے کہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ وہ اس کی جزئیاتی کڑیاں بھی بیان کرتا چلا جائے۔اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔اس نے تو اصل بات بیان کی ہے کہ خدا کی یہ شریعت نہیں ہوتی کہ پہلے تو ہیکل کے اندر نذر دے دی جائے' بالغ ہوجائے تو قرعہ اندازی سے اسکے فیصلے کیے جائیں۔اگر وہ وہاں اپنی مرضی کے مطابق شادی نہیں کرنا چاہتی تو پھر ساری عمر شادی نہ کرے۔اگر شادی کرلے تو یہ لوگ اس کو شریعت کے مطابق نکاح قرار نہ دیں۔اس کی اولاد کو جائز اولاد قرار نہ دیں۔یہ چیزیں ہیں جن کی تردید کے لیے قرآن کریم میں یہ قصہ بیان ہوا ہے اور میں نے عرض کیا ہے کہ خدا تو قیامت تک کا علم جاننے والا تھا۔اسے معلوم تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے احبار و رہبان ہی یہ کچھ نہیں کریں گے' امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احبار و رہبان بھی یہی کچھ کریں گے۔انہوں نے کہا کہ ہم اسے شرعی نکاح ہی نہیں تسلیم کریں گے اور جب یہ شرعی نکاح ہی تسلیم نہ کیا جائے گا تو جو کچھ کم از کم لڑکی پر بیتے گی' قرآن اس کی محافظت چاہتا ہے۔

---

[1] جان کو گھلانے والی

حضرتِ مریم کی قدم قدم پر مخالفت کے باعث ان کی مصر کی طرف روانگی

میں نے عرض کیا ہے کہ اس قصے میں بعض کا خیال تو یہ ہے کہ یہ واقعہ وہاں سے شروع ہوا ہے جہاں سے حضرتِ مریمؑ ہیکل سے نکل کے بغاوت کر کے اپنے گاؤں کیطرف آئی ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ہیکل سے نکلنے سے پیشتر ہی ان کی شادی ہو چکی ہوئی تھی۔ اس شادی کے بعد جب وہ خاوند کے گھر یا یوں کہیے کہ سسرال کے گھر میں تھیں وہاں اس بے چاری کو اس مولویّت (Priesthood) نے تنگ کیا اور پھر شاید وہ جو گاؤں والے یا گھر والے یا خاوند تھے انہوں نے بھی شاید یہ چیز کی ہو۔ پھر میں نے کہا کہ یہ چیز قرآن نہیں بتاتا یہ تو قیاسات ہیں اور ہمیں معلوم ہے ان حالات میں ایسا ممکن ہے کہ وہاں بھی اس پر عرصۂ حیات اتنا تنگ کر دیا گیا ہو کہ وہ وہاں سے اپنے سسرال کو بھی چھوڑ کے ماں باپ کے گھر آ گئی ہو۔ یہاں دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔

جہاں سے قرآن نے یہ قصہ شروع کیا وہ یہ ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (19:16)۔ اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں لوگوں سے، مریم کا قصہ بیان کر، اور سلسلۂ کلام کا آغاز اس وقت سے کر جب وہ خانقاہیت کی زندگی کو چھوڑ کر اُس مقام پہ چلی گئی جو (وہاں سے) مشرق کی سمت واقع تھا۔ یہاں کہا کہ جب وہ اپنے ''اہل'' سے الگ ہو کر چلی گئی۔ اب یہاں قرآن نے لفظ اہل کہا ہے۔ اِس میں ''اہلِ خاندان'' تو وہ سسرال بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ نہیں، یہ ''اہلِ خاندان'' سسرال نہیں۔ یہ دونوں میاں بیوی اپنے ہاں کی بستی سے الگ ہو گئے تھے، جب کہ یہ بچہ ابھی بطن ہی میں تھا۔ یہ ان کو لے کے الگ ہو گئی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ پہلے ہی اس کے اوپر کچھ کم قیامت نہیں گزری ہو گی۔ جب استقرارِ حمل ہوا ہو گا تو پھر اس بچے کے متعلق بھی معاذ اللہ ایسی باتیں شروع ہو گئی ہونگی جس سے حالت ناقابلِ برداشت ہو گئی ہو گی تو انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ تم بسو اس دیس میں، ہم سے بسا نہ جائے۔ تو یہ دونوں وہاں سے چلے، دُور نکل گئے۔ فلسطین کو چھوڑ کے بے چارے مصر چلے گئے تھے۔ یہ تھے وہاں کے حالات جہاں سے اس نے یہ بات شروع کی۔

قرآن نے کہا کہ جب وہ اپنے اہلِ خاندان سے الگ ہو کر ادھر چلی گئی، مقام شو نہیں کیا، صرف یہ کہا ہے کہ اس علاقے، اس بستی کی طرف گئی جو وہاں سے شرق کی طرف واقع تھا۔ جغرافیہ میں دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ یہ ناصرہ، جو ان کا گاؤں تھا، یہ جانبِ مشرق تھا۔ چونکہ ان کا گاؤں ناصرہ تھا تو محسوس یہ ہوا کہ اس گاؤں کی نسبت سے انہیں ناصری کہا جاتا ہے، اسی لیے جہاں کی رہنے والی حضرتِ مریم علیہا السلام ناصرہ کہلاتی ہے۔ اور وہ گاؤں یروشلم سے، جہاں یہ ہیکل واقع ہوا ہے، وہ بھی اتفاق سے جانبِ شرق ہی واقع ہوا ہے۔ شاید یہی ہو۔ یا یہ کہ ان کے سسرال کا جو خاندان تھا، وہاں سے وہ اپنے میکے میں، ناصرہ میں، آئی ہیں۔ تو یہ جانبِ شرق ہو۔ کچھ بھی ہو، ہمیں اس تفصیل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل بات تو وہ ہے کہ یہ چیز، یعنی خانقاہ چھوڑنا اور نکاح کرنا، نہ خلافِ شریعت تھی، نہ دینِ خداوندی کے خلاف تھی۔ یہ تو ان مذہبی پیشواؤں کی شریعت کیخلاف ایک چیز تھی کہ وہ وہاں جانبِ شرقیہ آ گئیں۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا (19:17)۔

(خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آئندہ واقعات نے اُس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ اب یہاں سے ساری بات صاف ہوگئی کہ خواہ وہ میکے میں ہی آئیں' اپنوں ہی میں آئیں' جہاں بھی آئیں' اُن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بڑی محدود رہ رہی تھی: سب سے الگ تھلگ' بے چاری تنہائی میں' کہیں کال کوٹھڑی میں! آہ ہا' اپنوں سے بھی حجاب ہے اور زندگی بھی پوری گزارنی ہے:

کس قیامت سے شبِ ہجر مری گزری ہے
کہیں میری شبِ ہجراں کی سحر ہو تو کہوں

اس کی سحر نہیں ہوتی۔

بچے کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی پریشانی

شادی تھی' گود میں بچہ تھا۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا (19:17)۔ خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آئند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ان حالات میں' اب آگے بات آئی کہ اسے تسکین کی بڑی ضرورت تھی۔ کون تسکین دے سکتا تھا؟ خدا ہی کی طرف سے تسکین مل سکتی تھی' اس سے کم درجے کا تو وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ اتنی بڑی اتھارٹی کی طرف سے' یعنی خدا کی طرف سے براہِ راست تو انہیں وحی آ نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ نبی نہیں تھیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان کی رو سے' خود قرآن میں استعمال ہونے کی رو سے بھی' وحی [1] کے معنی یہ نہیں کہ خدا کی طرف سے جبریل کی معرفت کسی نبی پہ کوئی علم آئے۔ وحی کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی کی طرف سے' کسی دوسرے کی طرف' کوئی پیغام بھیج دینا' خواہ وہ وحی کا پیغام ہو یا اس شخص کا اپنا پیغام ہو لیکن اس میں ایک ہی شرط ہے کہ وہ پیغام یا بات ذرا سا اخفاء میں ہو' پردہ داری سے کوئی بات کی جائے' بلکہ اس میں لطافت ہوتی ہے کیونکہ وحی کے بنیادی معنی سلیس اشارے کے ہوتے ہیں۔ کوئی بات جب تیز سے اشارے سے کی جائے اسے وحی کہتے ہیں''۔ عرب اپنے ہاں یہ لفظ استعمال کرتے تھے' ایک دوسرے کی طرف پیغام بھیجتے تھے خواہ تحریری ہو خواہ زبانی ہو لیکن ذرا سے رازدارانہ انداز سے ہوتا تھا۔ وہ اسے بھی وحی کہا کرتے تھے۔ اب حضرت زکریا علیہ السلام نبی موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اور بھی اس زمانے میں انبیاء ہوں' اور نبی تو قریہ قریہ میں' بستی بستی میں ہوتے تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف قرآن نے کہا ہے کہ وحی کی۔ وہ کیا تھی؟ کسی رسول کو' کسی نبی کو' خدا نے یہ کہا اور کہا کہ ہمارا یہ پیغام حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف پہنچا دو' انہوں نے یہ پہنچا دیا۔ گویا قرآن حکیم نے وحی کا تصور دیا۔

اب پنجابی نبی' مرزا غلام احمد (1835-1908) نے بھی کہا کہ اس پر وحی آتی ہے تو اس نے اس پر وہ پل بنا کے ہاتھی گزارے۔ کہا کہ

---

[1] وحی کی اس تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورہ النحل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ ۲۵ بی گلبرگ ۲' لاہور' 2003ء' ص ص۔ 121 تا 123

نبی ہوں: دیکھیے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی ہوگئی: (28:7)۔ ''نئیں جی تسی کیوں کہٹ ہیگے او'' [1] مگر وہ یہ بھول گئے کہ اس کی طرف وحی ہوئی، تو اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں نبی ہوگئی ہوں۔ وہ (مرزا غلام احمد) کہیں: دیکھیے حضرتِ مریم علیہا السلام کی طرف بھی تو ملائکہ آ گئے اور وہ رسول آ گئے صاحب! دیکھیے آ گے خدا کی طرف سے حضرتِ مریم علیہا السلام بھی نبی ہوگئیں جی! ان کی طرف وحی آ گئی۔ اب عزیزانِ من! اسے کہیے کہ جی! شہد کی مکھی کی طرف بھی وحی آ گئی تھی۔ کیا خیال ہے جناب کا؟ اسے کیوں نہ نبی تسلیم کیا جائے۔ میں نے عرض کیا ہے، عزیزانِ من! کہ وحی کا وہ تصور ہے ہی نہیں۔ وہ تو یہ کہا تھا کہ جب حقیقت نظر نہیں آتی تو افسانے بنتے ہیں، یہ جانتے بوجھتے افسانے بنائے جاتے ہیں بہر حال: **فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا** (19:17)۔ وہ اپنوں سے بھی الگ رہنے لگ گئی۔

انڈیا کے اندر مسلمانوں کی طرف سے مجھ پر کفر کا فتویٰ

زندگی کے عجیب واقعات یاد آ جاتے ہیں۔ جب میں نے پہلی دفعہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی داستان، قرآنِ کریم کی روشنی میں (اور تحقیقات حاضرہ کی روشنی میں بھی) ''شعلہ مستور'' لکھی تو آپ حیران ہونگے کہ مجھ پر مسلمانوں کی طرف سے کفر کا فتویٰ لگا۔ میں اس زمانے میں ابھی انڈیا میں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس میں دی جانے والی چیز پہلے معارف القرآن کے حصوں میں بھی غالباً آ گئی تھی یا نہیں۔ بہر حال میں وہاں انڈیا میں تھا یا یہاں پاکستان میں تھا، مجھے سن تو یاد نہیں۔ مدراس کا ایک بہت بڑا پادری تھا۔ اس کا خط آیا کہ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے اور ہم آپ کے احسان مند ہیں کہ آپ نے ان الجھنوں کو اس طرح سے صاف کیا ہے کہ بات بالکل واضح ہو کے ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ان کے ہاں ایک فرقہ ہے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ نہیں مانتا، شاید یہ پادری اُس فرقے سے متعلق ہو۔ یعنی پادریوں تک نے اسے تسلیم کیا کہ قرآن نے بات صاف کی ہے۔

عزیزانِ من! جب خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے نامساعد واقعات نے حضرت مریم علیہا السلام کے دل پر ایسے اثرات چھوڑے تو وہ اپنوں سے بھی الگ تھلگ رہنے لگی (19:17)۔ اس کے بعد قرآن نے کہا: **فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا** (19:17)۔ ہم نے تقویت بخش اشارہ کیا جو ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔ عزیزانِ من! اب یہاں سے ان کے ہاں افسانے شروع ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی طرف سے فرشتہ آیا، فرشتہ آیا تو پھر کیسے بات ہوئی؟ وہ فرشتہ انسان کی شکل میں آیا، ہاں! انسان کی شکل میں فرشتہ! اب وہاں سے یہ عقیدہ وضع ہوا کہ فرشتے انسان کی شکلوں میں بھی یہاں پھرتے رہتے ہیں۔ شیطان کا انسان کی شکلوں میں ہونا تو ہمیں پتہ ہے۔ کہتے ہیں جی! فرشتے بھی انسانوں کی شکل میں پھرتے ہیں۔ جسے جو جی چاہے کہیے صاحب! یہ فرشتہ تھا، وہ خواہ رشوت کا روپیہ لے کے آیا ہو اور جب وہ وہاں سے جائے تو وہ کہیں کہ کون تھا جی؟ یہ جبریل امین تھے جی! انسان کی شکل میں ہمارے سامنے آئے تھے۔

---

[1] نہیں جی! آپ یہ کاہے کو کہتے ہیں۔

اے رسول! تُو ملائکہ کونہیں دیکھ سکتا

اب ہمارے ہاں یہ جتنے قصے مشہور ہوئے ہیں' آپ انہیں سنتے ہیں۔ 1965ء کی جنگ میں' وہ سبز عماموں والے' سفید گھوڑیوں والے' جی یہ سارے کے سارے قصے مشہور ہیں' ان میں یہی کہا تھا کہ انسانوں کی شکل میں فرشتے آئے ہوئے تھے۔ یعنی خود ہی ایک عقیدہ بنایا' پھر اس پر چل نکلے۔ کم از کم کوئی ایک شخص تو ہو جوان سے اتنی سی بات پوچھ لے کہ قرآنِ کریم تو کہہ رہا ہے کہ بدر کے میدان میں جو فرشتے آئے تھے' قرآن نے انہیں ملائکہ تو کہا۔ لہٰذا ان کے ملائکہ ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں' صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود تھے' قرآنِ کریم میں دو دفعہ ان ملائکہ کا ذکر کرتے ہوئے' دونوں ہی بار قرآن نے یہ ٹکڑے ساتھ ساتھ بڑھا دیئے کہ وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا (9:26);(9:40)۔ وہ لشکر اُتارے جنہیں تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے' مدد کے ان فرشتوں کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ قرآن ملائکہ کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ''کیا ویکھیا جی کی کردے سن' اتوں جیہڑا بم کرداسی ناں' تھلّے کسی نوں ایدر کسی نوں ایدر کٹو کی مار کے پیچ دیندے سن'' [1] ٹھیک ہے یہ کچھ انہوں نے محض اس لیے کیا کہ ان کے خلاف یہ اعتراض ہوتا تھا کہ یہ سارے جنگ کے دوران اپنے حجروں میں اور مسجدوں میں بیٹھ کے یہ کچھ کرتے رہے۔ کسی کو اتنی توفیق نصیب نہ ہوئی کہ میدان جنگ میں بھی جائے۔ یہ اس اعتراض کا جواب تھا۔ ان افسانوں سے ان کا جواب یہ تھا کہ یہ جنگ لڑی گئی' اس میں فتح نصیب ہوئی' یہ جو گولے اِدھر اُدھر گئے' یہ جو گولیاں برسیں' یہ ان خاکی وردی والے سپاہیوں' مجاہدین نے یہ کچھ نہیں کیا' یہ تو خدا کے فرشتے تھے جو کر گئے۔ اسلیے ہمیں خود میدان جنگ میں جا کر لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ کچھ انہوں نے اس لیے کیا کہ کہیں انہیں اس جنگ کا کریڈٹ نہ مل جائے۔ ان کی تدبیریں بڑی دور کی ہوتی ہیں۔ کہا یہ گیا کہ انسانوں کی شکل میں وہ فرشتے آئے تھے اور اس سے آگے جو کچھ لکھا گیا ہے' اگر میں اس کی تفسیریں بیان کروں' جو روایات کی رو سے لکھی ہوئی ہیں تو برادران عزیز! وہ کچھ میں نہیں بتا سکتا' نہیں بیان کر سکتا' نہیں کہہ سکتا۔ کہتے ہیں فرشتہ جبریل آیا تھا اور مرد کی شکل میں تھا اور آگے بات پھر نہیں کہی جا سکتی۔ بات کچھ اور ہے۔ قرآن کہتا ہے: فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا (19:17)۔ ہم نے اپنی روح اس کی طرف بھیجی' یہاں روحنا [2] کا لفظ ہے۔ اس روح نے کہا: اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ (19:19)۔ میں تمہارے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ اب جہاں بھی رسول کا لفظ آیا تو انہوں نے فوراً اس سے مراد ''وہ رسول لیا جس پر خدا کی وحی آتی ہے''۔ عربی زبان تو ان سب کے ہاں ختم ہو گئی۔ عزیزانِ من! آج بھی عرب رسول کا لفظ ''پیغامبر'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

---

1. جی! کیا دیکھا آپ نے؟ وہ کیا کرتے تھے؟ کہا: اوپر سے جو بم بھی گرتا تھا' وہ نیچے سے جھپٹ کر کسی کو ادھر اور کسی کو اُدھر پھینک دیتے تھے' ٹارگٹ پہ نہیں لگنے دیتے تھے۔
2. روح کے قرآنی مفہوم کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورہ النحل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ ۲۵ بی گلبرگ ۲' لاہور' ۲۰۰۳ء ص ص: 4 تا 7

لفظ ''رسول'' کا استعمال

آپ کو یاد ہوگا کہ شاید ایک اعتراض ہوا تھا۔ جواہر لال نہرو پہلی دفعہ عرب ممالک میں دورے پر گیا تھا تو انہوں نے وہاں رسولِ امین' پیغامبرِ امن کہا تھا۔ رسول کا لفظ تو عام ہوتا ہے۔ یہاں پہ اعتراض ہوا تھا کہ یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ عرب آج بھی اپنے ہاں اس زبان میں ''قاصد'' کے لیے رسول کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور قرآنِ کریم میں تو یہ لفظِ رسول کئی دفعہ آیا ہوا ہے۔ یہ بھی ہے کہ مراسلے تک تو ہم ٹھیک کہہ دیتے ہیں' وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن وہ جو مراسلہ والا ہے اُسے رسول کہہ دیا جائے تو پھر اس سے مراد وہی رسول ہو جاتے ہیں صاحب! جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ یعنی یہ ایک الگ بات ہے کہ خود میں نے بھی اپنے ہاں یہی بات کہی تھی کہ چونکہ ہمارے ہاں رسول کی یہ اصطلاح اب انہی معنوں میں استعمال ہوتی ہے' ہمیں یہ لفظ اب کسی اور معنی میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اپنے ہاں یہ لکھا تھا' احتیاط برتی تھی۔ لیکن زبان کے اعتبار سے تو ان چیزوں کو عرب استعمال کرتے ہیں۔ اب اگر وہ کتاب کو کتاب کہیں اور ہم کہیں کہ نہیں صاحب وہ تو قرآن شریف ہی ہوسکتا ہے تو وہ تو زبان ہی ختم ہو جائے گی۔ وہ استعمال کرتے ہیں۔ اب اِسی آیت میں' یہیں پہ رَسُوْلُ رَبِّکِ آیا ہے۔ اور رب کا لفظ یہاں آیا تو انہوں نے کہا کہ اس کے معنی خدا ہیں۔

ہمارے ہاں کے وضع کردہ افسانے

اب قرآنِ کریم میں یہ ''رب'' کا لفظ' عربی زبان کی رو سے' مربی کے لیے آتا ہے: جس کے زیرِ سایہ کسی کی تربیت ہو۔ گھر کے سربراہِ خاندان کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یوسفؑ جس گھر میں' غلام کی حیثیت سے' گئے تھے وہ گھر کے آقا کو اپنا ''رب'' کہتے تھے۔ ''رب'' مال واسباب کے نگران کو کہا جاتا ہے' جس کے کنٹرول میں کوئی چیز دی جائے اُسے کہا جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں آج بھی یہ لفظ انہی معنی میں استعمال میں آتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ان معانی میں استعمال ہوئے ہیں لیکن یہاں تو پھر جب تک کوئی قصہ افسانہ نہ بنایا جائے' لطف نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ اب یہاں سے فرشتہ آیا تو کہا کہ وہ انسان کی شکل میں آیا تھا۔ اس نے آن کے کہا تھا کہ ''میں تیرے اللہ کی طرف سے رسول ہوں (19:19)۔ اِس آیت میں رب یہاں مربی کے لیے آیا ہے۔ اب بات یوں ہوئی کہ حضرتِ زکریا علیہ السلام جن کے زیرِ نگرانی حضرتِ مریم علیہا السلام نے تربیت پائی' نے ایک قاصد بھیجا' پیغام بر بھیجا۔ ٹھیک ہے اگر حضرتِ زکریا علیہ السلام کی طرف خدا کی طرف سے یہ وحی آئی ہوگی تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں۔ وہ تو نبی تھے' انہوں نے یہ پیغام پہنچایا اور ان کا حق بھی تھا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے ان کی زیرِ نگرانی تربیت پائی تھی' یہ بیٹیوں کی طرح تھیں۔ وہ نبی بھی تھے ان کے اوپر فریضۂ خداوندی بھی عائد ہوتا تھا کہ یہ بچی جو اس کشمکش میں گرفتار ہوئی ہے' وہ اس کی مدد کے لیے جائے اور جا کے اُسے تسکین دے کہ اگر یہ استقرارِ حمل ہو چکا ہے تو گھبراؤ نہیں۔

حضرتِ زکریا علیہ السلام کی طرف سے پیغام رسانی

اگر یہ استقرارِ حمل سے پہلے' شادی کے وقت کی' بات ہے' تو کہا: ایسے حالات سے گھبراؤ نہیں' میں تمہیں اُس کی طرف سے بشارت دینے کے لیے آیا ہوں۔ جو تمہارا مربی ہے۔ حضرتِ زکریا علیہ السلام نے انسانی پیغامبر بھیجا ہوگا۔ اس نے آ کے یہ بات کہی اور اگر خدا کی نسبت کی کہ تیرے خدا نے یہ کہا ہے تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ خدا نے حضرتِ زکریا علیہ السلام سے کہا ہوگا لیکن ان کی طرف تو بہر حال حضرتِ زکریا علیہ السلام کا ہی کوئی قاصد ہے' جو نظر آتا ہے کہ وہ آیا' اور اس نے آ کے یہ کہا۔ یہ ہے: **رُوْحَنَا** (19:17)۔

روح کا لفظ وحی کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا (19:17)۔ ہم نے اُس کی طرف اپنی روح بھیجی۔ تو اب جو یہاں اس آیت میں روح کا لفظ تھا اس کے لیے انہوں نے اسے فرشتہ بنایا جبکہ قرآن حکیم کی رو سے وحی کو روح بھی کہتے ہیں۔ تو یوں کڑیاں ملنے سے نظر آتا ہے کہ اُسے اس کشمکش سے نکالنے کی ضرورت تھی کہ اسے بتایا جاتا کہ تیرا یہ فیصلہ خدا کے منشاء کے خلاف نہیں ہے' اس کے دین کے خلاف نہیں ہے۔ یہ تسکین کون دے سکتا تھا؟ صرف ایک نبی دے سکتا تھا جو کہتا کہ خدا نے مجھے کہا ہے کہ اس بیٹی کو پیغام پہنچا دو کہ گھبراؤ نہیں' یہ فیصلے اور جو کچھ تم کر رہی ہو ہماری منشاء کے خلاف نہیں ہیں' یہ سب کچھ ہمارے دین کے مطابق ہے۔ ایک نبی ہی اُسے تسکین دے سکتا تھا۔

جبرئیل ایک انسان کی شکل میں؟

عزیزانِ من! شریعت کے نام پر اتنا بڑا ہجوم تھا کہ انہوں نے اس بیچاری کی عافیتِ حیات تنگ کر رکھی تھی چنانچہ اس کے خلاف ایک نبی یا خدا کی وحی ہی ایسا کر سکتی ہے۔ آج اگر کوئی ایسی کشمکش میں گرفتار ہو اور ہم اُسے قرآن کی آیت سنائیں کہ نہیں بھئی! خدا نے یہ کہا ہے' یہ وہی بات ہو جائے گی جو حضرتِ مریمؑ کے ساتھ ہوئی۔ خدا کی بات اس تک پہنچائی گئی کہ گھبراؤ نہیں: **فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا** (19:17) یہاں اِس آیت میں **فَتَمَثَّلَ** کا لفظ آیا۔ **فَتَمَثَّلَ** کے معنی کر دیئے کہ صاحب! اس نے ایک تندرست انسان کا پیکر اختیار کر لیا' ایک اچھے بھلے انسان نے فرشتہ کا روپ دھار لیا۔ یعنی جبرائیل انسان کی شکل میں آ سامنے کھڑا ہوا۔

حضرت مریم علیہا السلام کو پیغام

عزیزانِ من! سنیئے' ان کے بقول خدا کا ایک فرشتہ جبرئیل انسان کی شکل میں سامنے آ گیا اور اسی لیے انہوں نے کہا: **قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا** (19:18)۔ انہوں نے جھٹ سے' گھبرا کے' اس سے کہا کہ اگر تو ایک نیک بخت آدمی ہے تو میں تیرے خلاف تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں' یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ یہ بھی ساتھ کہا جا رہا ہے کہ اگر تو نیک بخت ہے تو سوال تو یہ

ہے کہ اگر وہ نیک بخت ہے تو نیک بخت سے خدا کی پناہ مانگنا' نیک بختوں کے تو انسان سائے میں آ جاتا ہے۔ سوال یہ تھا۔ **فَتَمَثَّلَ لَهَا** (19:17)۔ تمثّل کا معنیٰ' عربی لغت کی رو سے' کسی سے کوئی واقعہ بیان کرنا' کوئی داستان بیان کرنا' کوئی کہانی کہنا' کوئی بات کہنا ہے۔ مثال تک تو یہ بات لے آئیں گے' ٹھیک ہے۔ مثلاً تک بھی لے آئیں گے صاحب! وہیں سے اگر فعل تمثّل بنا دیا جائے تو پھر ان کے ہاں اس کے معنی مجسمہ انسان کا بن جائے گا۔

یہاں وہ بیان کرنے والی بات کیوں نہیں ہوئی؟ یہ بات یوں سمجھیے کہ وہ پیغامبر آیا اور اس نے آ کے یہ بات بیان کی۔ اب یا تو یہ انسان تھا' خواہ وہ اس کے خاوند کی بات ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف نجّار نے یہ بات حضرتِ زکریا علیہ السلام سے ہی کہی ہو کہ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ حضرتِ مریمؑ کو پیغام بھیج کے دیکھیے کہ آیا وہ اس کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ حضرتِ زکریا علیہ السلام کا پیغامبر آیا ہو' اس نے آ کے کہا ہو کہ جو کچھ تم کر رہی ہو خدا کی Approval اس کے ساتھ ہے۔ خدا نے حضرتِ زکریا علیہ السلام کے اوپر وحی بھیجی ہے کہ گھبراؤ نہیں اور پھر اگلی بات اس کے لیے یہ بھی ہے کہ نہ گھبراؤ۔ تو اب کیا ہوگا؟ کہا کہ یہیں تم میں سے ایک نوجوان ہے جو اس کے لیے آمادہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں یہ ہمت کرتا ہوں۔ یہ ہوگا اور اسی کے بعد یہ بھی ہے کہ خدا نے یہ کہا ہے کہ یہ سارا سلسلہ ایک بڑے اہم معاملہ کا ہے جس کی یہ ساری کڑیاں آ رہی ہیں۔ **قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا** (19:19)۔ کہ خدا تجھے نہایت عمدہ نشو ونما یافتہ بچہ عطا کرے گا۔ اس پیغامبر نے یہ بھی کہا ہے کہ شادی بھی ہوگی' بچہ بھی پیدا ہوگا: غلام ذکیہ۔ کہا کہ یہ پاکیزہ لڑکا پیدا ہوگا۔ ہر لڑکا تو پاکیزہ ہوتا ہے' ہر بچہ پاکیزہ ہوتا ہے لیکن وہ تو عیسائیت میں چونکہ کہہ دیا کہ ہر بچہ اپنے ازلی ماں باپ کا گناہ ساتھ لے کے آتا ہے تو انسان کا کوئی بچہ بھی ان کے ہاں' عیسائیوں کے ہاں' پاکیزہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ تو ان عیسائیوں نے کہا: یہ دیکھیے۔ عزیزانِ من! یہ انہی کے کیے ہوئے معنی ہیں اور عیسائیت ان سے فائدہ اٹھا رہی ہے کہ دیکھیے صاحب! کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو خدا نے کہا کہ ''یہ بچہ پاکیزہ پیدا ہوگا'' تو اس کے معنی ہیں کہ ہر بچہ پاکیزہ نہیں پیدا ہوتا' اس اکیلے کے لیے کیوں؟ کہا: اس لیے کہ وہ انسانی بچہ نہیں تھا' وہ تو خدا کا بیٹا تھا۔ عیسائی یہ دلیل لاتے ہیں اور آپ کے ہاں ذکیہ بڑی عجیب چیز قرآن نے کہی ہے۔

عزیزانِ من! ذرا کھڑے ہو کے دیکھیے' پوچھو نہیں انسان وجد میں آ جاتا ہے' یہ جو ایک نفسیاتی کشمکش ہوتی ہے کہ یہ جو کچھ اس قسم کا نکاح' آگے اختلاط' پھر یہ حمل' کہیں واقعی شریعت کے خلاف نہ ہو۔ اس سے واقعی انسان کے اندر ایک سائیکلوجیکل کشمکش پیدا ہو جاتی ہے' اچھا بھلا سمجھدار انسان بھی اس کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ بات جو شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے تو آپ دیکھیے کہ اس کے اندر ایک تذبذب پیدا ہو جاتا ہے کہ واقعی اگر جائز نہ ہو تو یہ تو ایک ناجائز فعل ہو گیا۔ اس ناجائز فعل کے مضمرات کے متعلق آج' عزیزانِ من! علم النفس (Psychology) کے ماہرین سے پوچھیے۔ سائیکالوجسٹ (Psychologists) میرے پاس آتے ہیں' ان کے ہاں کی تحقیقات کی کتابیں ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں' انہیں پڑھیے' صورت حال کچھ اور نظر آئے گی۔

باہمی طور پر نفسیاتی کشمکش کی بنا پر پیدا ہونے والے بچے کی کیفیت

عزیزانِ من! ان ماہرینِ نفسیات کی تحقیق یہ ہے کہ اگر دورانِ اختلاط ان میاں بیوی میں' جنہیں یہ مرد اور عورت کہتے ہیں' کوئی نفسیاتی کشمکش پیدا ہوئی ہوتی ہے تو بچہ Defective پیدا ہوگا۔ اور عجیب عجیب تحقیقات ہو رہی ہیں۔ ہر تحقیق قرآن کے ایک دعویٰ کی صداقت کی شہادت بنتی چلی جا رہی ہے۔ اِس آیت میں لفظ زَكِيًّا (19:19) آیا ہے۔ ذکیہ کے معنی ہیں: نشوونما یافتہ۔ ''نا ستمایا' تے ناں ایہو جیا پئی او بیچارہ جیہڑا ناں اوہدی ہڈیاں کمزور رہ جان''[1] جسے Defective یا Deformed کہتے ہیں۔ وہ بچہ Deformed نہیں ہوگا۔ یہاں لنجا[2] 'لولا'[3] اندھا' کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس لیے کہ وہ کشمکش میں گرفتار تھی۔ اسے اس کشمکش سے نکالنا تھا۔ اس لیے جہاں بشرًا (19:17) کہا تو ساتھ ہی سویًا (19:17) کہا۔ اور اُدھر وہاں اُس بچے کو تندرست' توانا' متوازن غُلٰمًا (19:19)۔ یعنی بچہ کہا تو ساتھ ہی ''زَكِيًّا'' کہا۔ اس زکیاً کا ترجمہ ہے: Developed fully' (مکمل نشوونما یافتہ)۔ یہ نفسیاتی کشمکش کی چیز کیا کرتی ہے؟ اسے بیان کرنے سے پہلے ایک حقیقت کشا واقعہ سنیے۔

ایک حقیقت کشا واقعہ

میرے ساتھ دفتر میں ایک اینگلو انڈین (Anglo Indian) سپرنٹنڈنٹ ہوتا تھا۔ وہ کیتھولک عیسائی تھا جو ان کے ہاں کا قدامت پسند فرقہ ہے' وہ عیسائی تھا۔ ان کے ہاں فسٹ کزنز (First Cousins) میں شادی نہیں کرتے۔ شریعت تو عیسائیوں میں ہوتی نہیں لیکن ان کے ہاں جو ایک روایتی چیز چلی آتی ہے وہی ان کے ہاں شریعت بن چکی ہوئی ہیں۔ فسٹ کزن میں یعنی وہ چچا کی لڑکی' ماموں کی لڑکی' خالہ کی لڑکی' آپس میں یہ شادی نہیں کرتے۔ یوں کہہ لیجیے کہ یہ ان کے ہاں جائز نہیں۔ وہ بڑا اچھا شریف النفس تھا۔ وٹلے اس کا نام تھا۔ میرے ساتھ اس کے بڑے اچھے مراسم تھے اس لیے کہ وہ بھی مذہبی تھا۔ اُس دور میں' میں بھی اس کے معیار کے مطابق مذہبی تھا' تو بہر حال ہم سے بڑی دوستی تھی۔ اس کی ایک چچا کی لڑکی تھی' وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ان کی آپس میں محبت تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بڑا ہی نیک کردار لڑکا تھا۔ تجویز ان کے ذہن میں یہ تھی کہ ہم شادی کر لیں' مانع یہ چیز تھی کہ یہ شادی جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں میں تو یہ شادیاں جائز ہی نہیں بلکہ انہیں Preference' ترجیح' دی جاتی ہے اگر یہ رشتے آپس میں ہی' چچا کی لڑکیوں سے' ماموں' خالہ کی لڑکیوں سے مل جائیں۔ اس نے مجھ سے یہ کہا کہ آپ کے ہاں تو یہ شادیاں عام ہوتی ہیں' یہ بتاؤ کہ اس قسم کی شادی سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں' کچھ ان پر اثر وثر تو آپ کے ہاں نہیں ہوتا۔ اب میرے ذہن میں آیا کہ انہیں ان کے مُلّاؤں نے ڈرایا ہوا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ہمارے

---

[1] نہ ساتویں مہینے کا ہو نہ ہی وہ ایسا ہو کہ اس بے چارے کی ہڈیاں ہی کمزور و ناتواں رہ جائیں۔

[2] لنجا: لنگڑا۔ ہاتھ پاؤں سے معذور۔ [3] لولا: ٹنڈا' جس کے ہاتھ نہ ہوں۔ اپاہج' ٹنڈا اور لنگڑا۔

ہاں تو نوے فیصد شادیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ اگر اس کا کوئی اثر ہونا ہوتا تو سارے مسلمانوں کی نسل ہی لولے لنگڑوں کی پیدا ہوتی۔ یعنی میں نے اُسے سمجھانے کے لیے کہا کہ یہ بات غلط ہے' اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بہرحال اس نے مجھ سے یونہی بات کی' مگر تذبذب میں وہ ضرور رہا۔

اس جرأت پر پادریوں کی طرف سے طوفانِ مخالفت

اس نے جرأت کی اور شادی کر لی۔ ان کے ہاں کے مولویوں' پادریوں نے' وہ جیسے یہ ہوتا ہے' طوفان برپا کر دیا۔ تو کبھی کبھی وہ کہا کرتا تھا کہ بھئی! میں نے تو جرأت کی ہے' میرا دل تو قوی ہے۔ میں نے تم سے بھی پوچھا تھا۔ وہ میری جو بیوی ہے' وہ کبھی کبھی ضرور یہ بات کرتی رہتی ہے اور میں اس سے کہا کرتا تھا کہ بھئی! اُسے بھی اطمینان دلاؤ کہ یہ کوئی ناجائز بات نہیں ہوئی۔ وہ کہنے لگا: تمہارے کہنے سے کیا ہوگا' وہ جو گرجے میں جاتی ہے' وہ مولوی صاحب اس سے روز یہ کہہ دیتے ہیں۔ اس کشمکش میں گرفتار آپ حیران ہونگے کہ بچہ پیدا ہوا اور وہ بہرہ اور گونگا تھا۔ یہ اس قسم کے اتفاقات ہیں جو انسان کو مار مار کے پھر انہی تاریک وادیوں میں لے جاتے ہیں۔ اور وہ تو وٹلے تھا' مجھے اب تک یاد ہے۔ بچپن میں تو پتہ نہیں چلا' ابھی جب وہ بچہ ذرا بڑا ہوا تو پتہ چلا اور معلوم ہوا کہ وہ گونگا اور بہرہ ہے' وہ سر پکڑے ہوئے تھا اور اس نے مجھ سے یہ کہا کہ تم نے تو مجھے اطمینان دلایا تھا۔ میں نے کہا: میں نے تو شہادت پیش کی تھی کہ ہمارے ہاں یہ نہیں ہوتا۔ ہم خود تمہارے سامنے موجود ہیں۔ ہمارے ماں باپ کی شادیاں' ہماری شادیاں اسی طرح سے ہوئی ہیں۔ کہنے لگا: لیکن نہیں' میرے ہاں تو یہ ہوا۔ میں نے کہا کہ اس کی وجہ صرف وہی ہے کہ اس دوران میں وہ جو روز تمہاری بیوی کے کان میں یہ آواز پڑتی چلی جارہی تھی اور وہ اس کشمکش میں گرفتار تھی' یہ اس کا اثر ہے' حالانکہ میں نے ابھی اُس زمانے میں اتنی سائیکالوجی (علم نفسیات) نہیں پڑھی تھی۔ یہ سائیکالوجی اتنی زیادہ آگے بھی نہیں بڑھی تھی۔ اب جو میں ان کے ہاں کی Latest تحقیقات دیکھتا ہوں تو حیرت میں پڑ جاتا ہوں کہ قرآن کتنی دور تک جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قصہ حضرت مریم کے اس موقع پر قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس کے دل سے' اس لڑکی کے دل سے' اس خیال کو زائل کیا جائے کہ تمہارا کوئی قدم خلافِ شریعت نہیں ہے۔ تذبذب میں' کشمکش میں' گرفتار نہ ہو۔ قرآن کتنی دور تک جاتا ہے!

ہمارے ہاں کے معاشرتی حالات کا آنے والی نسلوں پر اثر

عزیزانِ من! یہیں سے یہ چیز ہے جس کی بنا پر ہمارے ہاں معاشرے کے اندر' گھروں کے اندر' اس کی پیدا کردہ ہزاروں قیامتیں ہوتی ہیں' ہزاروں مشکلات' پرابلم (Problems)' ہزاروں امراض اِس نفسیاتی کشمکش کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں۔ حمل کے استقرار میں جو کچھ اس کا حشر کیا جاتا ہے یا اوپر تلے کسی کے ہاں دو تین لڑکیاں پیدا ہو جائیں' اس کے بعد اس کی زندگی جہنم بنا دی جاتی ہے۔ ان سائیکالوجسٹ (ماہرین نفسیات) نے تحقیق کر کے اب یہ بتایا ہے کہ یہ جو جینز (Genes) ہوتے ہیں' یہ وہ ابتدائی موالید ہیں جن سے جنین (Fetus) متشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ کسی ایک عقیدے کا یا کسی ایک اظہارِ خیال کا کس قسم کے جینز (Genes) پہ کس قسم کا اثر پڑتا ہے۔ یا اللہ! بات کہاں سے کہاں جارہی ہے۔ سنیے اور معاف رکھیے گا کہ پرانی باتیں بھی ذہن میں آ کر

اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان (ماہرین نفسیات نے بھی عمر بھر کے تجربے کے بعد یہ بتایا تھا کہ وہ بچے ایب نارمل (Abnormal) ہوتے ہیں۔

حضرت مریم علیہاالسلام کو تذبذب سے دور رہنے کی ہدایت

کہا کہ تیرے خدا کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا (19:17)۔ آیت کے اس ٹکڑے میں اس سے یہ ساری بات بیان کی اور کہا یہ ہے کہ اس کشمکش سے نکل جاؤ' یوسف اس شادی کے لیے تیار بھی ہے۔ حضرتِ زکریا علیہ السلام نے کہا ہے: اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو خلافِ شریعتِ خداوندی ہو۔ یہ شادی بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد جو اولاد ہوگی' اس میں بھی اس تذبذب میں نہ رہنا کہ پتہ نہیں کہ کس قسم کا وہ بچہ لولا لنگڑا پیدا ہو جائے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ وہ بچہ غُلٰمًا زَكِيًّا (19:19)۔ Fully grown up, Fully developed baby پیدا ہوگا تو کیوں گھبراتی ہو؟ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (19:20)۔ اس پر مریم نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تک میں ہیکل میں رہی' پاکباز راہبہ کی زندگی بسر کی۔ وہاں کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں۔ وہاں سے نکلی ہوں تو میں نے شادی نہیں کی کیونکہ یہ چیز ضابطۂ خانقاہیت کے خلاف ہے۔

عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ یہ واقعہ استقرارِ حمل سے پہلے کا ہے کیونکہ کہا یہ ہے کہ میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا؟ ابھی تک تو صورت یہ ہے کہ ہیکل میں تھی تو وہاں کوئی ایسی بات مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔ اب بھی' یہاں' بعد میں بھی کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوئی۔ یہاں جو کہا ہے' اسے عربی مبین میں سمجھیے۔ عربی زبان میں ''بشر خاوند کے لیے بھی آتا ہے'' اور یہ زبانوں کے استعمال میں یوں ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو ہمارے ہاں پنجابی بھی نہیں رہی' ورنہ ہمارے ہاں گاؤں کے اندر عورت خاوند نہیں کہا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی: ''میرا آدمی آیا تے اونیں فیر اینج کیا مینوں''[1] ٹھیک ہے ''ایہہ کون سی؟ کیندی: میرا آدمی''[2] حالانکہ ہر ایک آدمی ہوتا ہے۔ یہ بشر کا لفظ انہی معنوں میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ پاک دامن یا باحیا' یا یوں کہیے کہ شرمیلی عورتیں' اپنے خاوند کو اپنا میاں بھی کہتی ہیں۔ ذرا میاں تو خیر یہاں بھی کہہ دیتی ہیں یہاں بھی لیکن وہ ہمارے ہاں آدمی کہا کرتی تھیں۔ وہاں عربی زبان میں بشر کہتی تھیں۔ لڑکی ہے' ہیکل میں تربیت یافتہ ہے' مذہبی بھی ہے۔ ابھی حجاب بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اگر یہ بات نکاح کے بعد کی ہے تو نظر آتا ہے کہ وہاں جو کشمکش جاری تھی اس کشمکش کی وجہ سے ان کے ہاں زناشوئی کے تعلقات وابستہ نہیں ہوئے تھے اور یہ ہیکل چھوڑ کر چلی آئی تھی اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر بات یہ ہوئی کہ ''ہیکل کی زندگی میں تو میں نے کوئی اس قسم کا غلط اقدام نہیں کیا تھا۔'' اس کے لیے قرآنِ کریم میں لفظ بَغِيًّا (19:21) آیا ہے' یعنی میں نے کوئی حدود شکنی نہیں کی ہے اور اس کے بعد ابھی تک تو مجھے خاوند بھی نہیں ملا' اور ان حالات میں خاوند ملنے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ہے اگلی چیز۔ تو یہی مرحلہ طے نہیں ہوا' تم یہ کہہ رہے ہو کہ یہ بھی ہوگا' بچہ بھی پیدا ہوگا' وہ لولا لنگڑا نہیں ہوگا' بڑا صحیح سلامت بچہ ہوگا۔ تو گھبراؤ نہیں۔

---

1. میرا ''آدمی'' آیا تو اس نے پھر مجھے یوں کہا۔
2. ''یہ کون تھا؟'' عورت نے کہا: میرا ''آدمی'' تھا۔

اس مقام پر قال کذا لک کا لفظ غور طلب ہے

عزیزانِ من! حضرتِ مریم نے پوچھا تھا کہ میرے ہاں یہ لڑکا کیسے ہوگا؟ قرآنِ کریم کے الفاظ دیکھیے' کہا: **قَالَ كَذٰلِكِ** (19:21) پوچھا: یہ ہوگا کیسے؟ اور اسی آیت کے اگلے ہی الفاظ دیکھیے: **قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ** (19:21)۔ اُس کے رب نے کہا تھا کہ یہ اُس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ یہی ساری آیت حضرتِ زکریاعلیہ السلام کے سلسلہ کی بھی ہے۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ اس بڑھاپے کی عمر میں بیوی بانجھ ہے' میں کچھ بوڑھا ہو چکا ہوں اور مجھے بیٹے کی بشارت دیجا رہی ہے۔ حضرت زکریا نے پوچھا تھا: **قَالَ كَذٰلِكَ** (19:9)۔ کیسے ہوگا؟ آپ دیکھیے وہ لفظ ہیں **قَالَ كَذٰلِكَ** (19:9)۔ اور اسی آیت (19:9) کے اگلے ہی الفاظ ہیں: **قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ** (19:9)۔ اُس کے رب نے کہا تھا کہ یہ اُس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ تو کیا حضرتِ زکریاعلیہ السلام کے ہاں بھی جو بیٹا پیدا ہوا تھا وہ بن باپ کے ہوا تھا؟ تو یہ ''کذٰلک'' کا لفظ تو دونوں جگہ (19:21) اور (19:9) ہے۔ بابا! اس قرآنِ کریم کی کتاب کو چیستاں نہ بناؤ۔ جس زبان میں یہ نازل ہوا ہے اِسے اسی زبان کی رو سے پڑھو' آگے کہنے کی بات یہ تھی۔ یعنی آگے اور تفصیل نہیں بتائی۔ ایک لڑکا ہے' وہ جوان لڑکی سے باتیں کر رہا ہے۔ کہا: وہ اسی طرح سے ہوگا جس طرح ''دنیا وچ ہوندا ہیگا وے' ایہوای ہے ناں اے لفظ جیہڑے نیں' کذٰ لک دے معنی اے نیں''[1] جس طرح سے ہوا کرتا ہے یہ بچہ اسی طرح سے ہوگا' اور **هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ** (19:21)۔ ان حالات میں یہ چیز واقعی کچھ عجوبہ سا نظر آتی ہوگی' خدا نے یہ کہا: کچھ مشکل نہیں۔ وہی الفاظ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ زکریاعلیہ السلام سے کہے تھے: اللہ تعالیٰ نے **قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ** کہا تھا۔ یہ آیت نمبر 9 ہے اور اسی سورۃ کی یہی آیت نمبر 21 ہے۔ وہ جو کہا ہے کہ جیسے ہوا کرتا ہے یہ اُسی طرح ہوگا اور ہمارے لیے یہ کچھ کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔

ہمارے لیے کے کیا معنی ہیں؟ کہا: ہمارے قاعدے' ہمارے قانون کی رو سے' یہ کچھ کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ حضرت زکریاعلیہ السلام کے سلسلہ میں آگے جا کے کیا قانون بتایا؟ کہا ہم نے کیا کیا: **اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ** (21:90)۔ اس کی بیوی میں کسی قسم کا ایک مرض تھا' کوئی بیماری تھی' Defect تھا' اس کا علاج کر دیا اور اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ وہاں' حضرت زکریاعلیہ السلام اور حضرت مریم' دونوں کے سلسلے میں یہی کہا تھا: **قَالَ كَذٰلِكَ ج هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ** (19:9;19:21)۔ کہا کہ اُسی طرح سے ہوگا جس طرح ہوتا ہے اور یہ تو ہمارے لیے کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ "کذٰلک" اور "ھین" کی تو قرآن نے تشریح کر دی: **اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ** (21:90) اس کی بیوی کا Defect دور کر دیا' وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوگئی۔ ''کذٰ لک'' اور ایسا ہوا کرتا ہے اور ہمارے ہاں عمر بھر کی بانجھ عورتوں کے ہاں اس قسم کے واقعات روز ہوتے ہیں' وہ عورتیں علاج کراتی ہیں' بچہ پیدا ہوتا ہے تو کوئی مشکل بات نہیں۔

---

[1] (جس طرح) دنیا میں ہوتا ہے۔ یہی ہیں ناوہ لفظ جو وہاں ہیں۔ کذلک کے یہ معنی ہیں۔ (کہ یہ اُسی طرح ہوگا' جس طرح ہوتا ہے)۔

علامہ اقبالؒ نے سچ کہا تھا کہ ہم نے قرآن کو چیستاں بنا رکھا ہے

بابا! اس قرآن کو اس طرح سے پڑھو، اس کتابِ عظیم کو افسانہ اور چیستاں نہ بناؤ۔ کیوں بار بار قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمہاری زبان میں اس قرآن کو اتارا اور بڑا آسان بنایا۔ یہ ''تمہاری زبان'' بار بار کیوں کہہ رہا ہے؟ وہ کہہ رہا ہے کہ اِسے عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ جو میں کہا کرتا ہوں کہ کوئی اردو کی کتاب لکھے اور بار بار اس میں لکھے کہ ہم نے یہ اردو زبان میں لکھی ہے، ہم نے اردو میں لکھا ہے۔ وہ کہے گا کہ ''اردو زبان اچ سانوں پتہ سامنے پئی ہوئی ہیگی'' [1] یہ بار بار قرآن نے اس لیے لکھا تھا کہ اس زبان کو کوئی چیستاں نہ سمجھ لینا۔ یہ عربوں کی زبان ہے۔ تم عربوں سے پوچھو کہ وہ ان الفاظ کے کیا معنی لیتے ہو۔ یہ ''صاحبانِ شریعت'' کہتے ہیں: نہیں صاحب! اس زبان پہ اعتبار نہیں، ہمارے خلاف اتنی بڑی بڑی کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ عربی لغت کی رو سے قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا تو کیا سنسکرت کی رو سے یہ سمجھ میں آئے گا؟ تو یہ لسان عربی مبین ہے، کہیے تو صحیح۔ پھر یہ کیوں بار بار اس نے کہا ہے کہ یہ عربی، واضح عربی، زبان کی ایک کتاب ہے۔ پھر کہا کہ ہر نبی کو وحی ہم اس قوم کی زبان میں دیتے ہیں تاکہ وہ قوم اسے سمجھ لے۔ جب وہ ان سے کہے ''پانی'' وہ سمجھ لے کہ اس سے مراد یہ ''پانی'' ہے۔

مرزا غلام احمد کی ایک مشکل کا تذکرہ

عزیزانِ من! اب زبان کی بات کو سمجھانے کے لیے یوں کہتا ہوں کہ اگر وہ نبی [2] قادیان میں ہو اور وحی انگریزی زبان میں ہو تو آپ کو پتہ ہے پھر مصیبت کیا آئے گی؟ مصیبت یہ آئے گی اِس سلسلہ میں ایک چٹھی موجود ہے۔ میری کتاب اٹھا کے دیکھیے ''احمدیت اور ختم نبوت''۔ ان نبی صاحب کی ایک چٹھی (Letter) اپنے ایک دوست کے نام ہے، کہ ''یار یہ وحی آ گئی زبان پر ایہدے وچ گرائمر دیاں غلطیاں نیں، اوہ ٹھیک ہے اللہ نے گرائمر کتھے پڑھی ہوئی اے۔ معاذ اللہ جئی روح تے اہو جئے فرشتے'' [3] اور وہ کہتے ہیں کہ میری دشواری یہ ہے کہ مجھے انگریزی نہیں آتی، یہ مجھے سمجھ میں نہیں آتی۔ کہنے لگے: یہاں ایک مجی کالڑکا ہے، دیوان داس یا کچھ اسی قسم کا اس کا نام ہے۔ یہ ہندو ہے۔ اس سے میں نے پوچھا ہے۔ اس نے کچھ بتایا ہے تو میرا اطمینان نہیں ہوتا۔ ذرا مجھے بتا دیجیے گا کہ یہ جو وحی میری طرف میرے خدا نے کہی ہے، اس کے معنی کیا ہیں؟ اندازہ لگائیے معیارِ زبان اور فہم وحی کا!

---

[1] یہ اردو زبان میں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کتب سامنے پڑی ہوئی ہے۔

[2] مرزا غلام احمد آف قادیان (1835-1908) کی طرف اشارہ ہے۔

[3] اے دوست! زبان پر وحی آ گئی مگر اس میں گرائمر کی غلطیاں ہیں۔ او، ٹھیک ہے، اللہ میاں نے کہاں گرائمر پڑھی ہوئی ہے۔ معاذ اللہ جیسی روح، ویسے فرشتے۔

مذہب گرویدہ انسانوں کی رسائی

عزیزانِ من! مذہب کی گرفت دیکھیے کہ اس شخص کو بھی لاکھوں کی تعداد میں متبع (Followers) مل جاتے ہیں یعنی اندازہ لگائیے! اور وہ غیر مسلموں میں سے نہیں ملتے۔ ''مسلمانوں'' ہی سے ملتے ہیں۔ اوکم بختو ''تہاڈے اچوں ملدے ہیگے'' ❶ وہ مسلمان جس کے پاس یہ قرآن تھا' اب وہی مسلمان انہیں نبی مان رہا ہے۔ اس لیے کہ اس کے پاس قرآن تھا ہی نہیں۔ جلد میں قرآن رکھنے سے تو قرآن نہیں آ جاتا۔ عزیزانِ من! اس قرآن کی تعلیم کے بغیر تو آپ یہ الہام اور یہ اس جیسی چیزیں کہتے ہیں۔ اب جن میں یہ چیزیں ہیں انہیں وحی آ رہی تھی' جنہیں اردو کے دو فقرے بھی صحیح لکھنے نہیں آتے ورنہ اگر معنوی اعتبار سے بھی چھوڑ یئے' محض ادبی ذوق کے اعتبار سے بھی دیکھیے تو عزیزانِ من! ادبیت کے اعتبار سے بھی اس دنیا کے اندر قرآن سے اونچی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔

شخصیتِ اقبال اور پرویزؒ کی شاعری

ہمارے ہاں کے بلند ترین ادیب اور شاعر ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) نے مجھ سے بار بار کہا تھا۔ وہ بات یاد آتی ہے وہ دہرا دوں' پھر پتہ نہیں یہ باتیں آئیں یا نہیں۔ دہرا اس لیے دوں تاکہ یہ محفوظ بھی ہو جائیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں یونہی اتنا چھوٹا سا بچہ ہی تھا عمر کچھ بھی ہو' بات علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کر دیا کرتے تھے۔ مگر ان کی بزرگی یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے بڑا نہیں کرتے تھے۔ بچہ ہوتا تھا تو بچہ ہو جاتے تھے۔ بڑے انسان کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ انہوں نے جو یہ سنا کہ ہم بھی کبھی کبھی تک بندی ❷ کر دیتے ہیں' کہنے لگے: ''اوئے تو نے آپ کدی اپنا شعر کوئی نئیں سنایا۔ او پنجابی اچ گلاں کر دے ہوندے سن ٹھیٹھ' پلواناں ورگی پنجابی ہوندی سی''۔ ❸ عجیب انسانیت تھی۔ میں نے کہا: جی! وہ اس زمانے کے اندر جو کچھ ہم نے لکھا تھا' وہ میں نے ''جی! میں اک دن چولہے اچ پھوک دتا ہیگا سی سارا کچھ ای۔ کہن لگے او کس دن؟ میں کیا: جی! جس دن تہاڈا شعر سمجھ اون لگ پیا سی۔ کہن لگے: کیوں؟ میں کیا: فیر اپنے شعر پھیکے پیگے ہوسن''۔ ❹ میرا جواب سننے کے بعد ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب سوچنے لگ جاتے تھے تو ایک فکر میں ڈوب جاتے تھے۔ فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ اقبال کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں گے۔

---

❶ اے کم بختو! وہ تمہی میں سے مل جاتے ہیں۔

❷ مراد شعر کہنا

❸ ارے تو نے اپنے آپ اپنا کبھی کوئی شعر نہیں سنایا۔ وہ ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی پہلوانوں جیسی پنجابی ہوتی تھی۔

❹ جی! میں نے ایک دن یہ سب کچھ چولھے میں جلا دیا۔ وہ کہنے لگے: ارے کس دن؟ میں نے کہا: جس دن آپ کے شعر سمجھ میں آنے لگے کہنے لگے: کیوں؟ میں نے کہا: پھر اپنے شعر پھیکے پڑ گئے تھے۔

''ایک وقت آئے گا کہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں گے

عزیزانِ من! جذب وفکر سے نکلے تو کہنے لگے کہ ایک دن آئے گا جس دن ''اقبال دے شعروی تینوں پھیکے لگن لگ پین گے۔'' اس دور''اچ اقبال دے شعر پھیکے لگن لگ پین'' ❶ یعنی ہمارا تصور بھی وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک انسانی کلام کا تعلق ہے' اقبال کے شعر سے زیادہ شیریں شعراب بھی کوئی نہیں کہہ سکا۔ ایک ممتاز شاعر شہادت دے رہا ہے کہ خدا کی قسم! یہ صحیح بات ہے۔ واقعی اس کی یہ بات صحیح ہے' وہ تو آپ سوچیے کہ اس دور میں میرے سامنے یہ بات آجائے کہ ان کے شعر پھیکے لگنے لگیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا: ''اوتو پوچھ کہ کس دن اے پھیکے لگنے سن' میں وی ایہہ دہرادنا' اک دن آئے گا جس دن اقبال دے شعروی تینوں پھیکے لگن لگ پین گے میں آکھیا: جی! او کس دن؟ کہن لگے: جس دن قرآن سمجھ اچ اون لگ پیا'' ❷

عزیزانِ من! اس شخصیت کا مجھ پہ بڑا احسان ہے۔ اس نے اس دور میں یہ کچھ کہا۔ میں وہاں سے چلا تو آیا' کئی دن اس ذہن میں رہا۔ میری تو پہلی ساری عمر' قرآن پہ ہی تو گزری ہوئی تھی لیکن وہ وہی قرآن تھا' جو مسجد میں پڑھایا جاتا ہے۔ اُسے ہی پڑھتا تھا۔ اس زمانے کا ہی مجھے یہ قریب قریب حفظ ہے۔ میں نے قرآن کو اتنا پڑھا تھا لیکن اس میں تو معاف رکھیے گا اس دور تک' کبھی اتنی لذت بھی نہیں ملی تھی جتنی اپنی تک بندی میں ملی تھی۔ یہ بات کہ تمہیں اقبال کے شعر پھیکے نظر آنے لگ جائیں گے جس دن قرآن سمجھ میں آیا۔ ذہن میں آیا کہ آخر یہ سمجھ میں آنے والی بات کیا ہے؟ کچھ نہ کچھ عربی جانتا ہی تھا اور قرآن کو سمجھتا بھی تھا' جیسے وہ پرانے زمانے میں سمجھا کرتے تھے۔

سب کچھ پڑھنے کے باوجود آخر سمجھنے والی کون سی بات باقی ہے؟

عزیزانِ من! بات سمجھ میں نہ آئی کہ پھر قرآن سمجھ میں آئے گا کے کیا معنی ہیں۔ ساری تفسیریں پڑھ چکا تھا' ساری حدیثیں پڑھ چکا ہوا تھا' تو اب اور قرآن میں کیا باقی رہ گیا جو سمجھ میں نہیں آتا۔ کئی دن اس کشمکش میں گرفتار رہا' پھر جرأت کی تو پوچھ بیٹھا کہ ''جی! پھر وہ قرآن سمجھ میں کیسے آئے گا؟۔''

قرآن کو سمجھنے کا طریقہ

کہنے لگے: قرآن کو براہِ راست قرآن سے سمجھو' قرآن سمجھ میں آجائے گا۔ ان کے ہاں یہ دو فقرے' محاورۂ عرب اور تصریفِ

---

❶ تجھے اقبال کے شعر بھی پھیکے لگنے لگیں گے اس دَور میں اقبال کے شعر بھی پھیکے لگنے لگیں۔

❷ ارے تم پوچھو تو کہ یہ کس دن پھیکے لگنے لگیں گے۔ میں بھی اسے دہرا دیتا ہوں ایک دن آئے گا کہ اقبال کے شعر بھی تجھے پھیکے لگنے لگیں گے۔ میں نے کہا! جی! کس دن؟ کہنے لگے: جس دن قرآن سمجھ میں آنے لگے گا۔

آیات تھے۔ کہنے لگے اس کی رو سے قرآن کو سمجھو۔ یہ دیکھو' یہ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہوا تھا۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب اس زبان کو کیا سمجھتے تھے اور اس کے کیا معنی لیتے تھے۔ پہلے تم اس کی تحقیق کرو۔ کہا: یہ تحقیق تصریفِ آیات سے خود کرنی پڑے گی' یعنی قرآن میں جہاں ایک بات آئی ہے' سارے قرآن میں دیکھو' اس کے متعلق کیا کہا گیا ہے' ان سب آیات کو اکٹھا کرو' قرآن ان دو چیزوں سے واضح ہو جائے گا۔ ان کا بیان تھا قرآن روشنی ہے' روشنی اپنے وجود کے لیے کسی دوسرے کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔ اور اس دن سے میری گاڑی کی پٹڑی کا کانٹا بدل گیا۔

مذہب کے چھٹکارے کے لیے دس سال کا طویل سفر

عزیزانِ من! جو کچھ پڑھیا سی میں ٹھپ دتا'' [1] لیکن عزیزانِ من! ''اے ٹھپنا جیہڑا سی رام جاندا ای جاوے تے رحیم اُودھ دا ای آوے'' [2] دس سال لگ گئے تھے' عزیزانِ من! اس کو محو کرنے کے لیے جو اس سے پیشتر ذہن پر نقش ہوا تھا۔ بہرحال' اب اس کے سوا کیا کہوں کہ اس کا فضل تھا' جو کچھ آگے کرنے کے لیے انہوں نے بتایا تھا وہ تو شاید آسان تھا کہ وہ تو محنت ہی تھی۔ دوسری یہ بات کہ جو کچھ پیچھے ذہن کے اندر آیا ہوا تھا اسے دھوڑالنا آسان نہ تھا۔ بہرحال مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ توفیقِ ایزدی تھی' اس کے بغیر میں کبھی بھی قرآن تک نہیں آ سکتا تھا۔ قرآن نے کہا ہے: **وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى** (2:256)۔ جو شخص پہلے سے قائم شدہ غلط اعتقادات سے کفر برتے گا یعنی ان سے کافر ہو جائے گا۔ اور اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گا اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے گا تو سمجھ لو کہ اس نے محکم سہارے کو تھام لیا۔

مجھے فخر ہے کہ میں کافر بالطاغوت ہوں

میں نے کہا تھا کہ مجھے اس پہ فخر ہے جو کفر کا فتویٰ لگتا ہے۔ فخر یہ ہے کہ یہ تصدیق کی گئی کہ میں کافر بالطاغوت ہوں۔ **مَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ** (2:256)۔ یہ سب طاغوتی اعتقادات تھے' جن سے انکار کی بناء پر کفر کا فتویٰ صادر ہوا۔ اب میرے پاس تو اِس **يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ** کا سرٹیفکیٹ موجود ہے۔ یہ ہزار عالموں کا فتویٰ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ میں نے کہا: تمہیں اللہ خوش رکھے' قرآن کی آدھی آیت کے متعلق تو سرٹیفکیٹ پیش کر دوں گا جی! **يَكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ** تو یہ موجود ہے۔

---

[1] میں نے جو کچھ پڑھا تھا' اسے بند کر کے رکھ دیا۔

[2] یہ جو بند کر کے رکھنا ہے' وہ تو ایسا ہی ہے جیسے رام جاتے جاتے ہی جاتا ہے اور رحیم آتے آتے ہی آتا ہے' نہ رام جلدی جائے اور نہ رحیم جلدی آئے۔

میری چالیس سالہ محنت کا ماحصل

اگر نظامِ خداوندی میں مومن نہ بھی بنا تو کم از کم اس کی نگاہ میں کافر تو نہیں رہونگا کیونکہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اس نے طاغوت سے کفر کیا ہے۔ اور پھر اگلی بات یُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (2:256)۔ اللہ کے نظام کی صداقت پر ایمان لے آنے کی ہے۔ اقبال ؒ نے یہی کہا تھا کہ یہ بات پہلے کرلو یعنی طاغوت سے انکار کرو اور پھر محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کی طرف آؤ۔ اس کے بعد کا قریباً تیس چالیس سال کا عرصہ، عزیزانِ من! اسی میں گزرا۔ محاورۂ عرب سمجھا، اس کا ثبوت میری تحریر کردہ کتاب لغات القرآن (چار جلدوں میں) موجود ہے۔ تصریفِ آیات سمجھیں، رجسٹروں کے رجسٹر بھرے پڑے ہیں اور اب جو "تبویب القرآن" ہے، جس کی اب کتابت ہو رہی ہے۔ اللہ کرے میری زندگی میں وہ شائع بھی ہو جائے،❶ وہ تو بڑی ضخیم چیز ہے کہ اس کی اتنی جلدیں ہیں اور اس میں میں نے کیا ہی یہ ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں Headings دی ہیں اور پھر اس کے ہر عنوان کے تابع قرآن میں جو کچھ، جہاں جہاں آیا ہے، وہ سارا ایک جگہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد قرآن کو میں نے یوں سمجھا۔

کہہ میں یہ رہا تھا کہ اسے یوں سمجھو۔ جب وہ کہے "کَذٰلِکَ" تو پوچھو ان عربوں سے کہ وہ اپنے ہاں اِسے کیا کہتے ہیں، تو میں نے کہا ہے کہ وہ بہر حال چونکہ اپنی زبان پنجابی تھی اس میں جھٹ سے بات سمجھ میں آ گئی۔ "ایوں جیویں ہوندا ہیگا وے، تے گل صاف ہو جائے گی"❷: هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (19:21)۔ "تہانوں اوڈا اوڈا مشکل جیا نظر آندا ہووے گا اگر صحیح طریقے تے تسی علاج کراؤ تے کچھ مشکل نئیں ہیگی"،❸ "ہر حکیم اے کئے گا تہانوں۔"❹ اگر وہ علاج کے قابل مرض ہے تو وہ کہے گا: "کوئی مسئلے آلی گل ای نئیں۔"❺ آپ کہیں گے کہ صاحب! مجھے تو یہ کراتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا، وہ کہتے: پہلے علاج صحیح نہیں ہوا تھا۔ کچھ زیادہ مشکل والی بات نہیں (هين) اس کے بعد اِسی آیت میں کہا: وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا (19:21)۔ وہ بچہ ہماری طرف سے لوگوں کے لیے موجب رحمت اور حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی ہوگا۔

عزیزانِ من! کتنی تسلیاں دی جا رہی ہیں! کہا جا رہا ہے کہ جو شخص اس کی نبوت پر ایمان لائے گا وہ حق پر سمجھا جائے گا۔ جو اس سے انکار کرے گا، وہ باطل پر ہوگا۔ یہ ہے رحمتِ خداوندی۔ اس لیے کہ اس بچی، حضرتِ مریمؑ نے جو اتنی مجاہدانہ جرأت کا اعلان کیا، خدا کے نظام

---

❶ پرویز صاحب کی زندگی میں یہ کتاب شائع ہو چکی تھی۔

❷ ایسے جیسے کہ ہوتا ہے تو بات صاف ہو جائے گی۔

❸ تمہیں وہ خاصا مشکل لگتا ہوگا۔ اگر آپ صحیح طریقے پر علاج کرائیں تو چنداں مشکل نہیں۔

❹ ہر حکیم آپ کو یہی کہے گا۔ ❺ کوئی مسئلے والی بات ہی نہیں ہے۔

میں اس کا وزن اتنا بڑا تھا کہ خدا خود تسکینِ خاطر کررہا ہے۔ اِصطَفٰی والوں کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے' عزیزانِ من! یہ تو ہمیں پتہ نہیں ہے کہ اِس کی تسکین ان الفاظ سے تھی۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ ملائکہ آ گئے: **اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ** (41:30)۔ جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو ونما دینے والا اللہ ہی ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

کامیاب زندگی کے لیے ''میرا رب اللہ ہے'' کہنے کے بعد اس پر جم کے کھڑے ہونا ہوگا

عزیزانِ من! جو لوگ کہہ دیں کہ میرا رب اللہ ہے اور اس کے بعد اس پر حضرتِ مریم کی طرح جم کر کھڑے ہوجائیں تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ جو لوگ بھی یہ کہہ دیں کہ میرا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم کے کھڑے ہوجائیں تو ملائکہ انہی پر اترتے ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ ''میرا رب اللہ ہے'' کہنا کچھ آسان بات نہیں۔ آسان ہوتی تو آگے یہ شرط کیوں لگائی جاتی کہ پھر استقامت سے کھڑا ہوجاؤ۔ نظر آیا کہ اس میں ایسی بڑی گھاٹیاں آتی ہیں جن میں لغزشوں کے امکانات ہیں۔ کہا کہ پھر جم کے کھڑا ہوجاؤ۔ کس بات پہ؟ صرف یہ بات کہنے کے لیے کہ ''میرا رب اللہ ہے''۔

جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ میں ''لا الٰہ'' کی مشکلات کو جانتا ہوں۔ ''**رَبُّنَا اللّٰہُ**'' کہنا کوئی آسان نہیں ہے' دنیا کے ہر رب کی چوکھٹ سے مستانہ وار گزرنا ہوگا' ہر ایک کی ربوبیت کا انکار کرنا ہوگا' یہ **یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ** ہوگا۔ یہ ہوگا **ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا** (41:30)۔ اس پر استقامت سے کھڑے ہوجاؤ۔ کہا: اس کا نتیجہ یہ ہے کہ **تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ** (41:30)۔ ان کے اوپر ملائکہ کا نزول ہوجاتا ہے۔ وہ آ کے کیا کرتے ہیں؟ کہتے ہیں: **اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا** (41:30)۔ مت خوف کھاؤ' مت افسردگی میں مبتلا ہوجاؤ۔ تو گویا نظر آیا کہ یہ اس قسم کی سنگلاخ وادیاں آتی ہونگی کہ جن میں خوف بھی ہوگا' حزن بھی ہوگا' وہاں وہ استقامت سے کھڑے رہیں تو خدا تسکینِ خاطر کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگلی جو بات ہے وہ تو محض شاعری ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ ہو جس میں شاعر نے کہا ہے کہ: وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں' مگر دل ہے کہ ڈوبا جارہا ہے۔'' یہ خدا نہیں کیا کرتا۔ جب خدا تسکینِ خاطر کردے تو پھر دل نہیں ڈوبتا' وہ تو ڈوبتے ہوئے دلوں کو ابھار دیتا ہے۔ **لَا تَحۡزَنۡ** کے یہی معنی ہیں۔ اِس سے کیا ہوتا ہے؟ قرآنِ کریم نے کہا: **وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ** (41:30)۔ کہ تمہارے لیے اس جنّتی معاشرہ کی خوش خبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (46L13 ; 8:10-12 ; 3:124-125)۔

آخر فرشتے نازل ہوکر کرتے کیا ہیں؟

عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ اس خوشگوار مستقبل کی بشارت لو جس کا خدا نے تم سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ فرشتے نازل ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فرشتے نازل ہو کے کیا کرتے ہیں؟ اس کی کچھ کچھ جھلک آج کی سائیکالوجی دیتی ہے لیکن قرآن تو وہاں

واضح کہتا ہے۔ یہ کہا ہے کہ فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ بدر کے میدان میں کہا ہے کہ انہوں نے آن کے کیا کیا؟ ان کے قلوب میں تسکین پیدا کردی، اوراس سے یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (8:11)۔ان کے پاؤں میں اثبات آ گیا۔تسکینِ خاطر سے تو ثباتِ قدم ہوتا ہے صاحب! فرشتے یہ کچھ کرتے ہیں صاحب! یہی تھا جو وہاں بدر کے میدان میں کیا! یہاں حضرت مریم کو کس طرح سے تسلیاں دی جا رہی ہیں؟ گھبراؤ نہیں جو کچھ تم کر رہی ہو، وہ خلافِ شریعت نہیں، اس نکاح کا، اس اختلاط کا نتیجہ بچہ پیدا ہوگا۔گھبراؤ نہیں، یہ بچہ Deform نہیں ہوگا، نشوونما یافتہ، نہایت اچھا بچہ ہوگا! پھر یہ جو تمہارے خلاف الزامات عائد کیے چلے جا رہے ہیں کہ یہ خلافِ شریعت ہے، یہ کافر ہوگئی، یہ منکرہ ہوگئی، یہ ہوگیا، وہ ہوگیا، یہ سب کچھ صحیح نہیں ہے، یہ تمام بے بنیاد ہے۔ بچہ صحیح وسلامت ہوگا۔یہی نہیں کہ وہ Physicaly، طبعی طور، پہ صحیح وسلامت ہوگا، وہ تو ایسا ہوگا کہ لوگوں کے سامنے ہماری صداقتوں کی نشانیاں بن کے آ جائے گا۔اور یہ سارا پیغام دینے کے بعد، کیا بات ہے صاحب! تسکین ان الفاظ میں کیا کرتے ہیں۔ سب کچھ کہنے کے بعد، تسکین دینے کے بعد، جاتے ہوئے، آپ دیکھیے یہ کس طرح روزمرہ کا واقعہ ہے کہ جاتے ہوئے، دروازے میں کھڑا ہو کے، مڑ کے، اس سے وہ کہے کہ ''جیہڑی گل میں تینوں کئی، اے سولہ آنے پکی ہیگی پکی ہے انشاءاللہ تے سمجھ لا ہوای گئی ہیگی اے، ہے ناں انتہاء تسکین کی''[1] ہے نا روزمرہ کی بات، انتہائی تسکین کی۔

یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (19:21)۔بس یوں سمجھو کہ جیسا یہ سارا کچھ ہو ہی گیا ہوا ہے، تو تسلی رکھ یہ بات طے شدہ ہے: وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (19:21)۔ یہ یونہی نہیں ہے کہ میں باتیں کر چلا ہوں۔بس تم یہ سمجھو کہ خدا کا یہ فیصلہ ہو ہی چکا ہوا ہے۔ یہاں قرآن کریم نے کہا ہے: مقضیًا ''بس یہ کچھ ہو ہی چکا ہوا ہے۔قضا کے تو معنی عربی مبین میں ''پورے ہو جانے'' کے ہوتے ہیں۔بس یوں سمجھو کہ ہو ہی چکا ہوا ہے، اور یہ سارا کچھ کرنے کے بعد شکوک رفع ودفع ہو گئے، شبہات زائل ہو گئے، کشمکش دور ہو گئی، سکون حاصل ہو گیا۔نکاح ہو گیا۔نکاح کے بعد فَحَمَلَتْهُ (19:22)۔استقرارِ حمل بھی ہو گیا۔دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں چیستاں اور داستانیں دہرائی جاتی ہیں۔اور قرآن کس طرح سے بات بیان کر رہا ہے۔دیکھتے ہیں کہ یہ جو عام، یونہی سا واقعہ، افسانوں کا سا واقعہ ہے، اس کے اندر بھی، اس اتنے سے واقعہ کے اندر، کتنی عظمتیں جھلک رہی ہیں۔ آپ کے ہاں قرآن ان الفاظ میں کیا کیا کہہ جاتا ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

---

[1] جو بات میں نے آپ سے کہی ہے۔وہ بالکل پکی، طے شدہ، اور صحیح ہے۔خدا کی مشیت کے مطابق بس یوں سمجھو کہ ہو ہی چکی ہے۔ ہے نا یہ بات انتہائی تسکین وطمانیت کی!

قرآن نے کہا: فَحَمَلَتۡهُ (19:22) چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع (Impediments) دُور ہوتے گئے۔ اِدھر حضرت مریم کے دل سے خانقاہیت کی غلط رسم کی خلاف ورزی کا خوف دُور ہو گیا۔ اُدھر ایک شخص، ہیکل کے احبار و رہبان کی تنبیہ و تخویف [1] کے باوجود، حضرتِ مریم کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ حضرتِ مریم کو ہونے والے بچے کا حمل قرار پا گیا۔ کیا بات ہے صاحب! یوں ہوئی وہ حمل والی بات! اتنا کچھ کرنے کے بعد مریم کو ہونے والے بچے کا حمل قرار پا گیا۔

وقت ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ اگلی آیتوں میں آئے گا۔ ہم سورۃ مریم کی آیت 21 تک آئے عزیزانِ من! 22 ویں سے اگلی دفعہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀......❀

[1] خوف، دھمکی

تیرھواں باب: سورۃ مریم (22 تا 40)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا
وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ
النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ
نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْــــًٔا
فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ
مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۣ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠
وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ
وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ
لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ
عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ
قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٤٠﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1976 کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 22 سے ہو رہا ہے: (19:22)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ میں جیسا کہ اس کا نام بھی بتا رہا ہے' حضرتِ مریم علیہاالسلام کی داستان چلی آ رہی ہے۔ پچھلے درس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ حضرتِ مریم علیہاالسلام ہیکل کی زندگی میں انسانوں کی خودساختہ شریعت کے بندھنوں کو توڑنے کے بعد باہر آ گئی۔ یہودی مذہب ہی نسلی ہے لہٰذا جب ہم کسی کے متعلق کہیں گے کہ بنی اسرائیل کے خاندان یا نسل سے تھی تو وہ لازماً یہودی المذہب تھی اور جب ہم

کہیں گے کہ وہ یہودی یا یہودیہ تھی تو اس کے معنی ہونگے کہ بنی اسرائیل اُس کا خاندان تھا۔ جب وہ وہاں، ہیکل سے نکل کے باہر آئی ہے تو نہ کسی دوسرے ملک میں گئی، نہ کسی دوسرے مذہب میں گئی، نہ کسی دوسرے خاندان میں گئی۔ وہی یہودی خاندان، وہی بنی اسرائیل کی نسل، وہی اپنا گاؤں جہاں اس نے جانا تھا۔

جب اس نے ہیکل کی زندگی چھوڑی ہے ان ہیکل کے مولوی صاحبان نے فتویٰ عائد کردیا۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ اب وہ باہر آ کر شادی کرنے کی فکر کر رہی ہے تو انہوں نے کہا: یہ تو کفر ہے، یہ نکاح نکاح ہی نہیں ہوسکتا یہ تو خلافِ شریعت ہے۔ تو وہ بیچاری جو اپنے گاؤں آئی تو وہاں بھی یہ آوازیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ بہر حال یہ تھی وہ کشمکش جس سے وہ گزر رہی تھی۔ ایک طرف حضرتِ زکریا علیہ السلام جیسے نبی کے زیرِ تربیت ہونے کی وجہ سے یہ چیز اس کے ذہن میں تھی کہ یہ سب کچھ خدا کی شریعت کے خلاف ہے جس کا تقاضا یہ یہودی، یہ احبار و رہبانِ ہیکل، یہ سارے مجاور کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اُس ماحول کا یہ اثر تھا کہ اس کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہوگیا۔ اس کشمکش میں وہ بچی گرفتار تھی۔

پھر حضرتِ زکریا علیہ السلام نے اس کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ تمہیں اب اس کرب اور اذیت سے نکل جانا چاہیے۔ دل کڑا کرو، جس مؤقف پہ تم اس وقت قائم ہو، اسی پر قائم رہو۔ یہ خدا کی شریعت کے مطابق ہے۔ اِس کے برعکس جو ہیکل کے راہب کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ تو اس سے اسنے حوصلہ لیا۔ عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اس کا یہ بہت بڑا انقلابی اقدام تھا، بہت کم لوگ اس قسم کی جرأت کر سکتے ہیں۔

انسانی ذہن پر ہپناٹزم (Hypnorism) کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے

عزیزانِ من! پھر وہ بھی ایک لڑکی تھی۔ اعتقادات انسان کے قلب و نگاہ کی گہرائیوں میں کس قدر زیادہ پیوست ہوتے ہیں اس کے متعلق، شاید آپ کو یاد ہو، میں نے بتایا تھا۔ ہپناٹائز❶ (Hypnotize) کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ وہ (Hypnotist) خود کہتا ہے جسے معمول کہا جاتا ہے، جس پہ ہپناٹزم کا اثر ہوتا ہے، وہ اِسے Repeat کرتا ہے۔ ہپناٹزم والے (hypnotists) جب کسی کو ہپناٹائز کرتے ہیں تو ہپناٹزم کرنے والا شخص جو کچھ کہتا ہے، وہ معمول وہی کچھ کہتا چلا جاتا ہے۔ اس معمول کا اپنا ارادہ، اپنا اختیار، اپنا شعور معطل ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ وہ ہپناٹزم کرنے والا (Hypnosist) جو بات کہتا ہے، وہ معمول اُسے Repeat کرتا ہے، کہتا چلا جاتا ہے، تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہپناٹزم کرنے والا (Hypnosist) کوئی ایسی بات کہہ دے جو اس معمول کے عقیدے کے خلاف ہو تو وہ اُسے کبھی Repeat نہیں کرتا، اسے کبھی تسلیم نہیں کرتا، اُسے کبھی نہیں دہراتا۔ یہ عقیدے کی چیز تو اتنی گہری چیز ہوتی ہے، پھر عورتوں میں

❶ It is an artificially induced sleeplike cindition in which an individual is extremly responsive to suggestions made by the hypnotist (Reader's Digest, 1990, P.75 9).

تو وہ عقیدے کی چیز اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ اِن کی تو کیفیت یہ ہے کہ عقائد تو ایک طرف رہے' ان کے ہاں تو جو رسم و رواج چلے آتے ہیں' یہ اِن کے بھی خلاف نہیں کر سکتیں' اِن کے خلاف کرنے کی اپنے اندر جرأت نہیں کر پاتیں۔

مذہبی اعتقادات سے نجات پانا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے

عزیزانِ من! مذہب پرست طبقہ' عورت ہو یا مرد ہو' اُس کے اعتقادات کتنے ہی باطل کیوں نہ ہوں' ان اعتقادات کا دل کی گہرائیوں سے نکالنا بڑا ہی جرأت کا مرحلہ ہے۔ تو اس کشمکش میں یہ بچی' حضرت مریم علیہا السلام گرفتار تھی۔ بہرحال اس نے ہمت کی' جرأت کی' یہ وہاں سے نکلی' شادی کی۔

بات پیچھے سے چلی آ رہی تھی کہ انہوں نے' یعنی حضرتِ زکریا علیہ السلام نے' پیغام بھیجا کہ جو مؤقف تم نے اختیار کیا ہے' یہ منشاء خداوندی ہے' یہی شریعتِ خداوندی ہے' اس پہ قائم رہو۔ اس سے آگے قرآن کہتا ہے: فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (19:22)۔ اسے استقرارِ حمل ہوا' اور وہ پھر وہاں سے الگ ہو کر' کہیں دور' چلی گئی تاکہ بچے کی ولادت کہیں ایسی جگہ ہو جہاں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو اور یوں وہ احبار و رہبان کے طعن و تشنیع کے نشتروں سے محفوظ رہیں۔ یہاں میں ایک چیز عرض کروں کہ یہ جو ہمارے ہاں حقائق کو افسانہ بنانے والے ہیں' ان میں ایک چیز یہ ہے کہ یہ جو فَحَمَلَتْهُ میں ''ف'' آتا ہے' وہ اس کا ترجمہ then کرتے ہیں: ''پھر یہ ہوا''۔ اب یہاں واقعات کی کیفیت یہ ہے کہ پیچھے سے قرآن کی جو بات آ رہی تھی کہ وہ پیغام آیا' انہوں یعنی حضرتِ زکریا علیہ السلام نے بتایا کہ کوئی بات نہیں ہے' تم شادی کرو' یہ بالکل شریعتِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ تو پیچھے سے یہ بات اتنی ہی آئی ہے' ان کا پیغام پہلے آ گیا۔ اس کے بعد اگلی ہی آیت میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: فَحَمَلَتْهُ ہمارے ہاں کے مفسر یہ کہتے ہیں کہ یہ پیغام آیا اور اس کے بعد اسے حمل قرار پا گیا یعنی بس اُس پیغام سے یہ سب کچھ ہو گیا' کیونکہ بقول ان کے یہ آیت ساتھ آ گئی ہے اور یہ ''ف'' سے شروع ہوتی ہے' اِسے ہم ''پھر'' کہتے ہیں یا عربی زبان میں ''ف'' کہتے ہیں یا انگریزی میں then کہتے ہیں یعنی ان مفسرین کی کیفیت یہ ہے کہ ''پیچھے سے جو فقرہ آیا ہے اس کے بعد فَحَمَلَتْهُ آیا ہے''۔ تو وہ کہتے ہیں کہ بس یہ بات ہوئی ہے تو اُسے حمل قرار پا گیا حالانکہ ہم روزمرہ یہ چیز بولتے ہیں کہ ''ان کی شادی ہوئی' پھر ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا' پھر بچہ کی شادی ہوئی۔ تو یہاں یہ ''پھر'' جو ہم کہہ رہے ہیں تو وہ یہ نہیں ہے کہ ''پھر'' شادی ہوئی اور اسی رات بچہ پیدا ہو گیا' پھر بچہ اسکول جانے لگا تو وہ صبح اٹھا تو مدرسے چلا گیا' پھر مدرسے سے واپس آیا تو شادی ہو گئی' پھر اس کے ہاں بچے پیدا ہوئے اسی شام اس کے ہاں دو تین چار بچے پیدا ہو گئے۔ یعنی یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ جب آدمی چیستاں بنانے پہ تُل جائے تو پھر اسے کون روک سکتا ہے۔ وہ ''ف'' یہاں آیا اور انہوں نے کہا کہ صاحب! وہ دیکھیے وہاں سے پیغام آیا۔ اور پھر اُسی سے یہ سب کچھ ہو گیا۔ ہمیں زبان کا عام اندازِ بیان دیکھنا ہوگا۔

زبان کا عام انداز

قرآن میں ہے کہ **فَحَمَلَتۡهُ** (19:22)۔اس کو حمل قرار پا گیا۔ ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے کہ جب ''پھر'' کہا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''وہ قاعدے' قانون' طریقے' کیمطابق جیسا ہوا کرتا ہے' اس کے مطابق یہ کچھ ہوا''۔ اب یہاں ہے کہ پیغام آیا' دِل کھڑا کیا' شادی کی۔ شادی کے بعد پھر جب استقرارِ حمل ہوا تو شادی کے دوران سے ہی یہ اِدھر اُدھر سے ان پر جتنے طنز و تشنیع کے تیر آ رہے تھے' وہ انہیں جھیل رہے تھے۔ اِن طنز و تشنیع کے تیر برداشت کرنے والوں کو میاں بیوی سمجھو یا وہ تنہا بیچاری لڑکی سمجھو' بہر حال انہیں اس قسم کا طنز و تشنیع کا سامنا تھا۔ لیکن جب استقرارِ حمل بھی ہو گیا تو اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ''اب یہاں نہیں رہا جا سکتا۔'' یہ بڑی Matching سی بات ہے۔ پھر میاں بیوی نے مشورہ کیا کہ اب ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ معلوم نہیں کہ اس کے بعد یہ طنز و تشنیع کے تیر برسانے والے کیا کریں' وہ وہاں سے دُور چلے گئے' وہاں سے نکل گئے۔ پھر دُور چلے جانے کی بات تھی' اور دُور ہی چلے جانا چاہیے تھا' قریب نہیں رہنا چاہیے تھا۔

وہ چلے گئے۔ معلوم نہیں کہ کہاں پہنچے تھے مگر راستے میں ہی وضعِ حمل کا وقت آ گیا: **فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ‌ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا** (19:23)۔ وضعِ حمل کا وقت آیا تو دردِ زہ (Throes of labor) کا اضطراب مریم کو ایک کھجور کے درخت کے پاس لے گیا۔ آئین خانقاہیت کے خلاف مُتَاھِل زندگی[1] پہلے بچے کی ولادت' پردیس کا معاملہ' بے سروسامانی کا یہ عالم کہ سر پر چھت تک نہیں' مریم گھبرا گئی اور کہنے لگی اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور بالکل بھولی بسری ہو چکی ہوتی! کیا بات ہے قرآن کی! ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بول حضرتِ مریم علیہا السلام کے ہی منہ سے لے لیے گئے اور انہیں راستے ہی میں نقل کر لیا گیا۔ آپ سوچیے کہ گھر بار والوں کو چھوڑ کے چلی آئی۔ کہیں ویرانے ہی میں وہ میاں بیوی ہیں۔ دردِ زہ (Throes of Labor) شروع ہوا۔ وضعِ حمل کا وقت آیا۔ کوئی پاس نہیں: نہ اپنا' نہ بیگانہ۔ پھر ان حالات میں' گھر سے نکلی ہوئی ہے کہ معلوم نہیں کہ اس بچے کی پیدائش کے بعد کیا کیا باتیں سننی پڑیں گی' بچے کا کیا بنے گا' اس کے بعد کہاں جاؤنگی۔ ویسے یہ وضعِ حمل کا وقت ہے' اس وقت تو عورتوں کے پاس کسی نہ کسی عورت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایسے میں کوئی نہ کوئی تو پاس ہو۔ اس بچی پہ یہ پہلا وضعِ حمل کا وقت ہے۔ وہ حالات سامنے رکھیے' اور پھر اس بچی کی پوزیشن کو سامنے رکھیے پھر پتہ چلتا ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے' بجز اس کے کہ وہاں کوئی دو چار کھجوروں کے درخت ہونگے۔ ان کے سائے تلے' ان کا سہارا لیکر' وہ بیٹھ گئی۔

پریشانی کی انتہا

یہ وضعِ حمل کا وقت آ پہنچا۔ اس وقت میں' اب قرآن کہتا ہے کہ منہ سے بے ساختہ نکلا کہ **يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ**

---

[1] Married life

نَسْيًا مَّنْسِيًّا (19:23)۔ ''اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر چکی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی''۔ عزیزانِ من! اس ساری داستان میں اس بچی کی بات کو قرآن چار لفظوں میں کہہ گیا۔ ان حالات میں وہاں نہ کوئی مونس، نہ غم خوار، نہ کوئی ہمدرد۔ دل میں یہ کہ جس نے بھی یہ قصہ سن لیا، تو وہ تو ملک ہی یہودیوں کا ہے۔ وہ خود کہے گا کہ ''ہاں صاحب! یہ جو کچھ تم نے کیا ہے، معاف رکھیے، ہم وہ الفاظ کہہ نہیں سکتے جو کچھ وہ کہیں گے۔ لیکن نظر آتا ہے کہ دُور نکل آئے تھے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن ساری کڑیاں خود نہیں بیان کرتا، وہ ہماری عقل وفہم پہ بھی چھوڑتا ہے۔ یہ قرآن بنا ہی صاحبِ فہم لوگوں کے لیے تھا۔

اب وہاں یہ نظر آتا ہے کہ وہ تو اس حالت میں تھیں اور وہاں کہیں پاس ہی کھجوروں کا باغ تھا، اس باغ کا مالک یا رکھوالا، پرے کوئی ایک مرد تھا۔ تو وہ ایک مرد نظر آیا تو اس کا خاوند یقیناً اس کے پاس بیٹھا ہوگا۔ تو اس نے پوچھا ہوگا، بالکل فطری چیز ہے، عزیزانِ من! کہ تم لوگ کون ہو؟ اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ اور وہ اس طرح تم سے الگ بیٹھ گئی۔ کراہنے کی آواز، درد کی آواز آئی تو اس نے اِس سے یہ کہا ہوگا کہ ہم اس طرح سے آئے ہیں۔ یہ اکیلی ہے، میری بیوی ہے اور حمل کا وقت تھا۔ ہمارے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔ ایسے میں یہ کچھ ہوگیا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے تھا، یہودی تھا، اور تھا ایسا جس کے سینے میں برف کی کاش نہیں، دلِ دردمند تھا۔ اس نے یہ بات سنی: فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ (19:24)۔ اِس کرب و یاس کے عالم میں اُسے اُس مقام کے نشیب کی طرف سے آواز آئی کہ اے مریم! گھبراؤ نہیں۔ اب ہمارے یہاں وہ مفسرین آ گئے اور انہوں نے وہ ''ف'' والی شرط لگا دی فَنَادٰىهَا (19:24)۔ پس آواز آئی۔ مِنْ تَحْتِهَآ (19:24)۔ کیا بات ہے! میری بیٹیاں، بچیاں، معاف رکھیں۔ بات کہنی پڑتی ہے، الفاظ نہیں مل رہے۔ ''اس کے نیچے سے آواز آئی۔'' بس میں یونہی کہہ دیتا ہوں اور پھر یہ آواز کس کی آئی؟ یہ ان افسانہ نویسوں سے پوچھیے۔ یہ کہتے ہیں کہ بچے کے پیٹ سے آواز آئی۔ ارے، سیدھی سی بات ہے کہ وہ باغ کا رکھوالا یا مالک ایک غیر مرد تھا، اگر اس کا خاوند بھی تھا تو بھی اس کے پاس تو اس نے آنا ہی نہیں تھا کیونکہ یہ وضعِ حمل کا وقت تھا۔

وضعِ حمل کے وقت پریشانی کا عالم

عزیزانِ من! یہ دونوں، اُس کا شوہر اور باغ کا مالک یا رکھوالا، اس سے ذرا نشیب میں تھے کہ وہ بیٹی سامنے نہ آئے۔ تو بھئی! یہ نشیب یعنی اس سے ذرا نیچے کی طرف کی بات ہے۔ حضرتِ مریم کو جہاں سے ذرا وہ اوٹ ہوگئی تو وہاں سے دوسرے شخص یعنی باغ کے مالک، یا رکھوالے نے آواز دی: لَا تَحْزَنِىْ (19:24)۔ بیٹی غم نہ کر۔ کیا بات ہے! ہر دلِ دردمند، یہ داستان سن کے آواز دے گا۔ پاس نہیں آ رہا۔ یہ ہے قرآن کا انداز! کس انداز میں قرآن باتیں کرتا چلا جاتا ہے، عزیزانِ من! اس نے وہاں سے آواز دی: بیٹی، یہاں حزن کا لفظ ہے، غم نہ کر، مت غمگین ہو، افسردہ خاطر نہ ہو، کوئی بات نہیں ہے۔ ایک چیز تو یہ ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد قرآنِ کریم نے کہا: قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (19:24)۔ اس طرف ایک خوش گوار پانی کی ندی ہے اور اوپر کھجور کے درخت میں پکی ہوئی

کھجوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں۔ باغ کے مالک یا رکھوالے نے کہا: پانی کا چشمہ یہاں سے تیرے قریب ہی بہہ رہا ہے۔ اس کے بعد اُسے پانی کی ضرورت ہوگی۔ کہا: وہ یہ بہہ رہا ہے۔ باقی ان علاقوں کے اندر سب سے بہترین تقویت کی جو غذا ہے' وہ کھجوریں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہا: وہ اوپر' کھجور کے درخت میں پکی ہوئی کھجوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں۔

باغ والے کی طرف سے عملی اور نفسیاتی سہارا

عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ یہ تو اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس اتنا بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا: کچھ غم نہ کھا۔ وَهُزِّيٓ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّا (19:25)۔ تو اِس پیڑ کی شاخ کو زور سے ہلا۔ تازہ اور پکی ہوئی کھجوریں تیرے قریب جھڑ پڑیں گی۔ کیا انداز ہے قرآن کریم کا! کہا: اور یہ کھجور' اس کے شاخے' تم دیکھ رہی ہو کہ خوشوں سے بھرے پڑے ہیں' ان کے زور سے یہ جھکے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بڑی پاکیزہ' پاکباز ہو۔ تمہارے ذہن میں یہ ہوگا کہ کسی دوسرے کی کھجوریں ہیں۔ میں ان سے نہیں کھا سکتی۔ یہ تو چوری ہو جائے گی۔ ناں ناں' غم نہ کرو۔ یہ کسی دوسرے کی نہیں ہیں۔ میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں' یہ میری ہیں۔ ٹھیک ہے' ضرورت پڑے' ذرا زور سے ہلاؤ' تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ فَكُلِيۡ (19:26)۔ تم یہ کھجوریں کھاؤ' وَاشۡرَبِيۡ (19:26)۔ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے' پی پی! یہ پیو۔ وَقَرِّيۡ عَيۡنًا (19:26)۔ اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچاؤ۔

قَرِّيۡ عَيۡنًا کیا الفاظ ہیں قرآن کے! فَكُلِيۡ وَاشۡرَبِيۡ وَقَرِّيۡ عَيۡنًا (19:26)۔ ہاں' تو ان تازہ کھجوروں کو کھاؤ' ندی کا ٹھنڈا پانی پیو' پھر بچے کے نظارے کو دیکھو' اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرو۔ عزیزانِ من! ایسے میں اس کے جو یہ چار لفظ بھی ہونگے' اس نے اس بچی کو نئی زندگی دیدی ہوگی: غم نہ کھا' بیٹی! تم تنہا نہیں ہو۔ ابھی اس دنیا کے اندر انسان باقی ہیں' ٹھیک ہے' میں یہاں اس سے زیادہ تو نہیں کچھ کر سکتا لیکن یہ جو کچھ موجود ہے' وہ تیرے لیے موجود ہے۔ کھاؤ پیو' آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچاؤ۔ باقی رہا بچے کی پیدائش کے متعلق تیرا یہ اضطراب کہ لوگوں کی باتوں کا کیا جواب دوں گی' تو اِنِّيۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا (19:26)۔ تم منت کا روزہ رکھ لینا۔

بچے کی پیدائش کے متعلق اگر کوئی سوال کرے تو؟

عزیزانِ من! واقعات کو ذرا پھر پیچھے کی طرف لے جایئے۔ حضرتِ مریم علیہا السلام کے خاوند نے اس باغ کے مالک یا رکھوالے کو یہ بھی بتایا ہوگا کہ یہ اس قسم کا واقعہ ہے۔ یہ بھی کہا ہوگا کہ بچہ پیدا بھی ہوا ہے تو بنی اسرائیل والے یا یہودی یا اسی طرح کے خیالات کے جو لوگ ہیں اگر جنہوں نے پہلے ہی عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے ان میں سے کوئی آیا تو اس بچے کو بھی یہ جو کچھ کہیں گے وہ اس کے لیے مزید موت کا موجب ہو جائے گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل میں سے ہی یہودی تھا' وہ غمگسار تھا' تو اس نے یہ کہا کہ اس کے بعد اگر کوئی تمہارے پاس سے گزرے' اس بچے کے متعلق تم سے پوچھے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے لیے کچھ

جواب دینا بڑا دشوار ہوگا' اس کے لیے تو وہ سیدھی سی بات ہے کہ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (19:26)۔اگر کوئی آدمی تجھ سے پوچھے تو اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لیے اپنے اوپر روزہ واجب کر رکھا ہے' اس لیے میں آج کسی شخص سے بات چیت نہیں کر سکتی۔

عزیزانِ من! یہ وہی ہے جیسا حضرتِ زکریا علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ تم روزہ رکھ لو اور روزے میں یہ بات بھی نہیں کیا کرتے تھے ان کے ہاں نہ بولنے کا بھی روزہ ہوتا تھا' تو اِدھر سے کوئی گزرے تو اُسے اشارہ سے یہ کہہ دینا کہ میں روزے سے ہوں' بات ختم ہوگئی یا پھر تمہیں کوئی جواب ہی نہیں دینا پڑے گا۔ یہ بھی اسے سمجھا دیا کہ اس کا بھی غم نہ کرو کہ کوئی ادھر سے گزرا' اس نے کچھ دیکھا کہ یہاں تنہا ایک عورت ہے اور وہ اس حالت میں ہے' نومولود ہے' تو ممکن ہے کہ وہ پوچھے اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہودیوں میں سے ہی ہو۔ اور اسے یہ معلوم ہو کہ تو کس حالت میں ہے تو تمہارے لیے ایسے حالت میں عام باتیں کرنا بھی دشوار ہوگا اور پھر ان حالات میں جواب دینا بھی دشوار ہوجائے گا' تو اس کے لیے سیدھی سی بات ہے کہ یہ کہہ دو: ''میں نے خدا کے لیے منت مانی ہوئی ہے اور روزہ رکھا ہوا ہے۔'' اور روزہ بھی رکھ لو تو یہ مرحلہ بھی طے ہوجائے گا۔ تمہیں کوئی جواب' کوئی Explanation بھی نہیں دینا پڑے گا۔ اس داستان میں کتنی ہی کڑیاں فطری چلی آ رہی ہیں۔

یہاں کے بعد اگلی آیت آئی اور اس میں پھر وہی ''ف'' آ گیا۔ پھر ان افسانہ نویسوں کو ایک اور کڑی ہاتھ آ گئی' جس پر انہوں نے افسانوں کا ایک محل تعمیر کر دیا اور درمیانی فطری کڑیوں کو یکسر فراموش کر دیا۔ قرآنِ کریم کی اگلی آیت یہ ہے: فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ (19:27)۔ (اس طرح عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی' میاں بیوی اس بچے کو لے کر کسی دُور مقام میں جا بسے تھے۔ وہ بڑا ہوا۔ شرف نبوت سے سرفراز کیا گیا) تو اس کی والدہ اُسے ساتھ لے کر اپنے وطن میں واپس آئی۔

بچے کی پیدائش کے بعد گھر والوں میں واپسی

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ (19:27)۔ پھر وہ اس بچے کو لے کر' تیار کرا کے' قوم کے پاس آ گئی۔ یعنی وہ اس لیے یہاں سے گئی تھی کہ یہ جو قوم میں' برادری میں' گھر میں' ایک حادثہ ہونے والا ہے' یہ ان میں نہ ہو۔ اور جب وہ بچہ پیدا ہو گیا تو وہ اُسے لے کر انہی کے پاس واپس آ گئی۔ عزیزانِ من! یہاں کوئی کھڑا ہو کر سوچنے والا ہو تو وہ سوچے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا ہوا ہے یہ افسانہ نویس عربی کے حرف ''ف'' سے یہ کچھ یوں کر رہے ہیں کہ ''بچہ پیدا ہوا' پھر وہیں اس کی شادی ہوئی۔'' یہی میں نے پہلے کہا تھا کہ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوگئے کہ ''بچہ پیدا ہوا اور وہیں اس کی شادی کر دی۔'' یہ جو درمیان کی کڑیاں ہیں' انہیں کوئی نہیں ملا رہا۔ اِن درمیان کی کڑیوں ہی کے سلسلے میں قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ وہ ربوا (23:50) چلے گئے تھے۔ اس دن پچھلے درس میں میں نے کہا تھا کہ لفظ ربوا ایسی سرزمین ہے جس کی سطح مرتفع ذرا بلند ہوتی ہے۔ انجیل میں یہ داستان موجود ہے۔ اگرچہ اس میں

بھی کچھ رنگ آمیزیاں ہیں لیکن جو واقعہ ہے' وہ موجود ہے کہ وہ مصر کی طرف چلے گئے تھے اور وہاں ایک عرصے تک رہے' انہوں نے کہا کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام دس گیارہ برس کے تھے' جب وہ واپس آئے ہیں۔ لیکن ان کے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ 30,31 سال کے تھے جب وہ واپس آئے۔ یہ عرصہ زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔ انجیل میں بھی یہ چیز ہے کہ انہوں نے اکتیس سال کی عمر میں وعظ کہنا شروع کیا[1] اور اس کے بعد پھر تھوڑا سا عرصہ ہی وہ اِن میں رہے تھے کہ اگلا واقعہ پیش آ گیا جسے صلیب کا واقعہ کہا جاتا ہے۔ تحقیق (Research) یہی ہے کہ وہ قریب تیس برس کے تھے جب وہ واپس آئے۔

وطن واپسی پر حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ بدزبانی

جب وہ واپس آئے تو **قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا** (19:27)۔ اب اس آیت کی وضاحت سے پہلے اگر میں ذرا سی اگلی بات بھی کہہ دوں تو بات بہتر طور پر سمجھ میں آ سکے گی۔ اِسی آیت سے اگلی آیت ہے **يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا** (19:28)۔ وہ لوگ' وہ احبار و رہبان' اس سے کہتے کہ اے اُختِ ہارون! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا' نہ ہی تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین وضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔ تو تم ایک شریعت' مذہب پرست' پابند شریعت گھرانے کی لڑکی تھیں' تم نے کیا کیا' اور اپنے بیٹے کو کس قسم کی تعلیم دلائی؟

ہاں تو عزیزانِ من! بات یہ ہو رہی تھی کہ وہ اپنے وطن واپس آ گئے۔ وہ لڑکا ساتھ تھا۔ اب پھر وہی بات چل پڑی کہ اے مریم! تُو تو بڑی متقی' پرہیزگار' مذہب پرست گھرانے کی لڑکی تھی' ماں باپ بھی تیرے بڑے مذہب پرست تھے' نیک تھے' پارسا تھے۔ پہلی چیز تو وہی نکاح والی بات تھی۔ اسے اب دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تو بیٹا ساتھ تھا اور ایک بیٹا ہی نہیں' خود انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور بھائی بہنوں کے نام بھی تھے۔ تیس سال کی عمر کے بعد یہ یہاں آئے ہیں۔ لیکن بہر حال' حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام آئے تو اب یہاں سے بڑی دلچسپ بات شروع ہوتی ہے۔ تو انہوں نے کہا: یہ تم نے کیا انوکھا سا کام کیا اور یہ فتنہ سا عجوبہ ساتھ لے کے چلی آئی ہو' تم تو بڑے مذہب پرست گھرانے کے لوگ تھے۔ تم نے کبھی مسلکِ شریعت کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ اب یہ کیا طوفانی سا بچہ تم لے آئی ہو؟

سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہوا تھا؟ یہ ان لوگوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہی ہیکل والے لوگ تھے۔ اگلا فقرہ سنیے تو بات صاف ہو جائے گی کہ انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ مریم نے یہ کیا انوکھی چیز دیکھی۔ یہ تو شریعت کے خلاف تھی' ان کے مسلک کے خلاف تھی تو مریم نے کہا ہے: **فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ** (19:29)۔ مجھ سے نہیں اس سے پوچھو۔ تو گویا نظر یہ آیا کہ کچھ ایسی باتیں تھیں جو 30,31 برس کا جوان' حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام' کر رہا تھا۔ اس نے کہا: میں ابھی بتاتی ہوں کہ میں نے یہ کیوں کہہ دیا کہ یہ چیزیں

---

[1] لوقا کی انجیل میں مذکور ہے کہ آپ نے یوحنا سے بپتسمہ لیا اور تیس برس کی عمر میں خود تعلیم دینے لگے (3:23)۔ یہ سلسلہ دو تین برس تک جاری رہا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں یہودی آپ کے سخت مخالف ہو گئے۔ (پرویز' شعلہ مستور' 1994ء' ص 17)

اس سے پوچھو۔ تو گویا یہ نظر آ رہا ہے کہ کچھ کہہ رہے تھے اور کچھ یہ کر رہے تھے تو انہوں نے تو مریم علیہا السلام سے یہ کہا کہ پہلے تم نے یہ کچھ کیا: ہیکل سے بھاگی' شادی کر لی' وہ بھی سب کچھ خلافِ شریعت' بچہ جن کے لے آئی وہ بھی خلافِ شریعت اور اس قسم کا بچہ جو یہ کچھ کہہ رہا ہے' کر رہا ہے' سنو تو سہی: کیا کر رہا ہے' کیا کہہ رہا ہے۔ تو مریم نے کہا کہ یہ بات مجھ سے نہ پوچھو' اسی سے پوچھو۔

ہمارے ہاں کی افسانہ نویسی

اب یہاں پھر ہمارے افسانہ نویسوں نے کہا کہ حضرتِ مریمؑ نے کہا کہ ''مجھ سے نہیں' اس بچے سے' جو دو تین دن کا' یا دو چار مہینے کا وہ لیکے آ گئی تھیں' اس بچے سے ہی پوچھو کہ یہ کیا بات ہو گئی''۔ وہ تھا ہی بچہ' لہٰذا انہوں نے کہا کہ اس سے ہم کیا پوچھیں؟ اب **قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا** (19:29)۔ بوڑھے احبار و رہبان' اپنی پیشوائیت کے گھمنڈ میں' نہایت نخوت و تکبر سے کہنے لگے کہ کیا ہم اس سے بات کریں جو ابھی کل تک جھولا جھولتا تھا! عزیزانِ من! ہیکل کے بزرگ' بڑے بوڑھے' یہ مذہبی بزرگ ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ویسے ہی بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ وہ جو چھوٹا ہوتا ہے' اس سے تو وہ بات کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اور یہ پھر ویسے عمر کے اعتبار سے بھی ان کے سامنے کل کا بچہ تھا۔ وہ ہیکل کے بزرگ' عمر کے اعتبار سے' اپنے منصب کے اعتبار' انہیں انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تو جب مریم نے ان سے کہا کہ اس سے پوچھو؟ انہوں نے کہا: کیا کہہ رہی ہو؟ اس کل کے بچہ سے پوچھیں؟ ''جے پنجابی سمجھے تے گل سمجھ آندی اے' کہ ہجے تے ایہدے کن دے وال وی گلے ہیگے نیں' کدی سنی ایہہ گلاں''؟ ❶ یہ بڑے بوڑھے' کسی بڑے دادا' یا گاؤں کے بوڑھے کے سامنے کوئی بچہ' جوان بچہ' خواہ وہ بیس پچیس تیس چالیس سال کا ہی کیوں نہ ہو' ان کے سامنے وہ بات کرنے لگے تو وہ کہتے ہیں: ''چپ اوئے بچیا۔ جمعہ جمعہ کل آٹھ دن دی پیدائش ہیں ٹکے ٹکے دیاں گلاں کرنڈیا ہیگا ایں ساڈے سامنے' کل ہجے ایناں جناں ہوندا سیں تیرے تے کن تے وال وی گیلے ہیگے نیں''۔ ❷

ہیکل کے پجاریوں کا غرور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب

عزیزانِ من! کس قدر Natural ہے! انہوں نے کہا کہ اوئے! یہ کل کا بچہ' ہم اس سے شریعت کی یہ بات پوچھیں کہ یہ کچھ خلافِ شریعت کیوں ہوا؟ کیا ہم اس سے یہ کچھ پوچھیں؟ سنیے کہ اُدھر سے انہوں نے کیا کہا؟ آپ کی ساری تفاسیر یہ بتا رہی ہیں کہ وہ دو دن کا بچہ تھا یہ جو سارا کچھ کہہ رہا تھا۔ اور وہ جو میں نے کہا ہے اُسے ذہن میں رکھیے کہ انہوں نے کس طنز سے یہ بات کہی تھی کہ ہم اتنے بڑے

---

❶ اگر پنجابی سمجھو تو ان کی بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کہا: ابھی تو اس کے (پیدائش کے وقت کے) کان بھی گیلے ہیں۔ کیا کبھی یہ باتیں بھی آپ نے سنیں؟

❷ او بچے! خاموش ہو جاؤ۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہے تمہاری پیدائش۔ خوب باتیں کرنے لگے ہو ہمارے آگے۔ ابھی کل ہی تم اتنے سے تھے' تمہارے تو ابھی پیدائش کے وقت کے کان سوکھنے بھی نہیں پائے۔ اور لگے ہو ہمارے سامنے باتیں بنانے!

بڑے ہیکل کے پجاری، احبار و رہبان، عمر کے اعتبار سے بھی اتنے بڑے، اور یہ کل کا بچہ! اس سے یہ پوچھیں؟ یہاں قرآن کہتا ہے: قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ط اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا (19:30)۔ اس پر عیسیٰ علیہ السلام اِن سے کہتے کہ یہ بھی کوئی انصاف کی بات ہے کہ چونکہ تم عمر میں بڑے ہو اس لیے تمہاری ہر بات کو سند تسلیم کر لیا جائے اور میں عمر میں چھوٹا ہوں اس لے تم مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرو۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے بگوش ہوش سنو: ''میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے۔''

عزیزانِ من! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ یہ بات مت کہو، عمر کے اعتبار سے یقیناً میں تم سے چھوٹا ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ ''میں خدا کا عبد ہوں۔ اس نے مجھے نبوت [1] دی ہے۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے، جو کچھ میں کہتا ہوں، خدا کی کتاب اور نبوت کی بنا پہ تم سے کہہ رہا ہوں۔'' عزیزانِ من! کیا یہ دو برس کا بچہ کہے گا کہ خدا نے مجھے کتاب دی ہے؟ مجھے نبی بنایا ہے؟ جو کہہ رہا ہوں، خدا کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔ ذرا اس پہ غور تو کریں۔

مذہب میں عقل کو دخل نہیں ہوتا

لیکن افسانہ نویسی کو کیا کہیں!! آپ کے ہاں کے اہل شریعت نے کہا کہ ٹھیک ہے جی! وہ دو دن کا بچہ تھا، وہ وہاں یہ کچھ کہہ رہا تھا۔ نظر آ رہا ہے کہ وہ جوان کا انجیل کا بیان ہے کہ ان کی تیس سال کی عمر تھی اور اس عمر میں انہوں نے وعظ کہنا شروع کیا، وہ ٹھیک ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے۔ آپ وہاں آئے ہی اسوقت تھے جب انہیں نبوت مل گئی تھی اور وحی نے یہ حکم دیا تھا کہ اب اسی ہیکل میں واپس جاؤ اور وہ جو صحیح شریعتِ موسوی اور شریعتِ خداوندی ہے، جسے وہاں کے احبار و رہبان نے مسخ کر کے رکھ دیا ہے، وہ اُن کے سامنے لاؤ، انہیں اُس شریعت کا بتاؤ۔ اب تمہارا وعظ، تمہاری تلقین، تمہارا صحیح دین، اس مرکز سے شروع ہوگا۔

عزیزانِ من! یہ ہیکل ہی یہودیت کا مرکز تھا۔ وہاں سے یہ سارے شاخسانے نکلا کرتے تھے۔ تو وہاں سے نظر آتا ہے کہ انہیں خدا کی طرف سے کتاب ملی، وحی آئی اور انہیں کہا گیا کہ یہاں، مصر میں نہیں، یہاں تو کوئی یہودی تھا ہی نہیں، جاؤ، وہیں واپس جاؤ اور وہاں جا کے صحیح شریعت موسوی، شریعتِ خداوندی کی تلقین کرو۔ اب آیئے، خواہ موجودہ انجیل بھی مسخ شدہ ہی ہے لیکن اس میں بھی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات ہیں۔ سنیئے کہ یہ آ کر کیا کرتے تھے اور پھر پتہ چلے گا کہ یہ سوال و جواب کیا ہوئے تھے۔ ہیکل کے پجاریوں نے، اس کے احبار و رہبان نے، حضرتِ مریم علیہا السلام سے کیا کہا تھا کہ پہلے تُو یہ کچھ کرتی آئی تھی، اب یہ جو ساتھ لے آئی ہے یہ دیکھ تو سہی، کیا کرتا ہے، کیا کہتا ہے۔ اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ مجھ سے اس کی بابت نہ پوچھو، اسی سے پوچھو کہ یہ کیوں کہتا ہے۔

---

[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بارہ برس سے تیس برس تک کی زندگی کے کوائف و احوال سے متعلق اناجیل خاموش ہیں۔ لوقا (کی انجیل) سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اکتیس (31) برس کی تھی جب آپ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تیس (30) لکھا ہے۔ (پرویز، 1994۔ ص 40)

ہیکل کی سیڑھیوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریر

سنیے عزیزانِ من! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیا کہتے تھے۔ اناجیل میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام جاتے' ہیکل کی سیڑھیوں کے اوپر کھڑے ہوجاتے۔ وہاں یہ احبار ورہبان' یہ ان کی شریعت کے یہ سارے حامل' انہیں سنتے تھے۔ جب یہ یہودی' یہ پرستش کرنے والے یا پوجا کرنے والے' یہ قربانیاں دینے والے' ہمارے ہاں جیسے مسجدوں میں جاتے ہیں' جانے والے ہوتے تو یہ ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوجاتے اور کھڑے ہونے کے بعد کیا آپ کو معلوم ہے کہ کیا وعظ دیتے؟ یہ وہی وعظ دیتے جو ہر خدا پرست خود ساختہ مذہب اور مذہب کے خود ساختہ احبار ورہبان کے خلاف دیتا ہے' وہ جو مفتی اور قاضی اور مہدی تھے ان کے سامنے وعظ کہتے۔

وعظ سنیے' انجیل کے اندر کیا الفاظ لکھے ہیں۔ اس وقت انجیل میرے سامنے ہے۔ وہ کھڑے ہوتے اور ان سے کہتے: ''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس!'' فقیہو اور فریسیو میں علما اور مشائخ دونوں آجاتے ہیں۔ کہتے: اے پیرانِ طریقت! تم حاملانِ شرع بنے پھرتے ہو۔ کہتے: ''اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو' کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا[1] جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔''

عزیزانِ من! آپ سنتے ہیں کہ یہ کیا کہتے تھے؟ اب بات سمجھ میں آرہی ہے کہ وہ احبار ورہبان' وہ علماء اور مشائخ کیوں چیخ اٹھے تھے کہ مریمؑ پہلے تو نے یہ کچھ کیا' اب اِدھر یہ لے آئی' تیرا گھرانہ تو بڑا مذہبی ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے ہمارے خلاف' ہمارے مذہب کے خلاف' کبھی لب کشائی نہیں کی تھی۔ یہ تو کیا لے آئی؟ اسے قرآن شَيْـًٔا فَرِيًّا[2] (19:27) کہتا ہے۔ ہاں تو عزیزانِ من! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوتے اور کہتے: ''اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔'' مقدس کے سونے کی قسم کی بات نہ کرو۔ بے شک برہما کی بات کرتے جاؤ' ہر جگہ یہی قصے ہیں عزیزانِ من! کہتے: ''اے احمقو اور اندھو! کون سا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو' اگر اس کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔'' چڑھاوے چڑھانے والے' ''اے اندھو! کون سی بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ' جو نذر کو مقدس کرتی ہے۔ پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی جو اس پر ہیں قسم کھاتا ہے۔ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور اُس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے۔ اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔ اے ریا کار فقیہو اور

---

[1] دُگنا [2] خود بھی عجیب وغریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا انوکھا بیٹا لے کر آ گئی!

فریسیو،تم پرافسوس! کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر تو تم اتنی احتیاطیں برتتے ہو اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔'' زیرا حلال ہے، سونف حرام ہے، کوا حلال، گدھا حرام ہے، اس کے اوپر ہی چلے جا رہے ہو، تمہارے لیے ٹخنوں کے نیچے پاجامہ نہیں ازار بند ہونا چاہیے۔ یہ سب کچھ کہتے ہو اور وہ جو شریعتِ دین کا معاملہ تھا، اسے بھی چھوڑ دیا اور ادھر انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا۔ کہتے: ''لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔'' میں یہ نہیں کہتا کہ جو جزئیاتِ شریعت ہیں انہیں چھوڑ دو۔ یہ بھی ٹھیک ہیں لیکن صاحب وہ بھی تو کرتے۔ ''اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو، مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔'' انہیں اس طرح سے چاٹ کے پی جاتے ہو۔ ''اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کر تو تا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو، جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مرُدوں کی ہڈیاں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطل میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔''

عزیزانِ من! یہ وعظ ہیکل کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو کے ہو رہا ہے۔ یہ ان سب کے سامنے ہو رہا ہے۔ کہتے: اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو۔ اے سانپو! اے افعی ❶ کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟'' ❷

یہ تھے، عزیزانِ من! وہ وعظ۔ سوچو تو سہی کہ اس پر ان کا کیا ردِعمل ہوگا، وہ کیا کچھ نہ مریم کو کہتے ہوں گے۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ انہوں نے مریم علیہا السلام سے یہ کچھ کیوں کہا تھا، اب قرآن کی اُس آیت پہ آیئے جو ہم پہلے چھوڑ کر آگے بڑھ آئے تھے۔ وہ آیت ہے: **قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا** (19:27)۔ ایک تو لوگوں کے نزدیک حضرت مریم کی یہ حرکت ہی کچھ کم قابل اعتراض نہ تھی کہ اس نے راہبہ (Nun) بن جانے کے بعد، ہیکل کے ضابطہ کے خلاف، اس طرح متاہل زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے احبار و رہبان کی خود ساختہ شریعت اور ان کی سیرت و کردار کے خلاف سختی سے نکتہ چینی ہوتی تھی چنانچہ ''وہ لوگ مریم سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب و غریب حرکت کی اور اس کے بعد اس قسم کا انوکھا بیٹا لے کر آ گئی۔''

عزیزانِ من! وہ لوگ کہتے تھے کہ اے مریم! یہ تُو اپنے ساتھ کیا فتنہ لے آئی۔ **يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا** (19:28)۔ وہ اس سے کہتے تھے کہ اے اختِ ہارون! تیرے ماں باپ تو ایسے نہیں تھے، وہ تو بڑے مذہب پرست لوگ تھے، وہ تو ہماری بڑی عزت و احترام کرتے تھے، نہ ہی تمہاری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین سے سرکشی اختیار کی تھی۔ تم

---

❶ ناگ، سانپ ❷ متی 1-23/36، مزید حوالہ پرویز، 1994، ص ص 115 تا 117۔

ایک شریف، مذہب پرست، پابندِ شریعت گھرانے کی لڑکی تھیں۔ تم نے یہ کیا کیا؟ پہلے تو نے یہ کچھ کر دکھایا اور اس کے بعد یہ جو ساتھ لے کے آ گئی اب یہ دیکھو کیا کر رہا ہے؟ تو نے اسے کس قسم کی تعلیم دی ہے؟ تو اس کے جواب میں حضرتِ مریمؑ نے یہی کہنا تھا کہ فَاَشَارَتۡ اِلَیۡہِ (19:29)۔ کہ یہ مجھ سے نہ پوچھو اسی سے پوچھو جو یہ کچھ کہتا ہے۔ اپنی بات کا جواب اس سے لو۔ اور اس کے جواب میں وہ پھر اور بھڑک اٹھتے کہ ہم اِن مقدس داڑھیوں والے ہیں اور اتنے اتنے لمبے پٹے والے ہیں۔ ہم نے یہ سب کچھ سنا۔ قَالُوۡا کَیۡفَ نُکَلِّمُ مَنۡ کَانَ فِی الۡمَہۡدِ (19:29)۔ کہتے: کیا ہم اس سے بات کریں جو ابھی کل تک جھولا جھولتا تھا! اب پھر اس کل کے بچے سے پوچھیں جو ہمیں کوئی جواب نہیں دے گا تو اسے لے کے آئی ہے۔ ان کے یہ الفاظ کتنے Typical ہیں۔ یہ سارا سلسلۂ کلام جو نظر آ رہا ہے، آپ کسی لکھنے والے سے کہیے کہ وہ جو اس کے تمام خدوخال ہیں، وہ ذرا ان کی تفصیل تحریر کر دے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ تو وہ اس کی تفصیل اور کیا بیان کرے گا بس یہی کہ تو ہم سے یہ کہتی ہے کہ ہم اس سے پوچھیں۔ تُو خود کیوں نہیں بتاتی کہ تُو نے یہ کچھ کیا کیا تھا اور یہ جسے تو لے آئی ہے وہ یہ کیا کر رہا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وضاحت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں اس کا جواب دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ (19:30)۔ میں خدا کا عبد ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ وہی بات ہے جو ہر نبی کہتا ہے۔ اس کائنات میں عبدیتِ خداوندی بلند ترین مقام ہے۔ وہ انسان اس ایک کا عبد ہو کے، ساری دنیا کا حاکم ہو جاتا ہے۔ میں نہ تمہارا عبد ہوں، نہ تمہاری شریعت کا عبد ہوں، نہ تمہارے ہیکل کا عبد ہوں، نہ تمہارے گورنروں کا عبد ہوں۔ میں صرف خدا کا بندہ ہوں، اس لیے مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اب دیکھا کہ یہ عبد کے معنی کیا ہو گیا؟ یہ تو جب انسانوں کی عبدیت آتی ہے تب ڈر آتا ہے۔ میں نہ تم سے ڈرتا ہوں، نہ تمہاری خودساختہ شریعت سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے کہ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا (19:30)۔ اس نے مجھے خود کتاب دی ہے، مجھے نبی بنایا ہے۔ تمہاری شریعت کی میں کیا پرواہ کرتا ہوں۔ یہ انسانوں کی خودساختہ شریعت ہے، یہ شریعت خود بناتے ہو۔ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (2:79)۔ پھر کہتے ہو کہ یہ سب ارشاداتِ خداوندی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡہِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ (2:79)۔ ان کے علماء کرتے یہ ہیں کہ شریعت کے احکام خود اپنے ذہن سے، اپنی مرضی کے مطابق، وضع کر لیتے ہیں اور ان اَن پڑھ لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب ارشاداتِ خداوندی ہیں۔ خود فتویٰ لکھتے ہو اور ان سے کہتے ہو کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ کیا تم مجھ سے یہ منوا سکتے ہو؟ تم مجھ سے نہیں منوا سکتے۔ میں تمہاری تورات لے کے نہیں آیا جو تمہاری یا تمہارے بزرگوں کی اپنی لکھی ہوئی ہے۔ میں خدا کی کتاب لے کے آیا ہوں۔ میں اس کا عبد ہوں، کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھے نبوت ملی ہے۔ باقی رہے تمہارے الزامات کہ میری ماں کا نکاح شریعت کا نکاح ہی نہیں تھا، میں، معاف رکھیے گا، بے نکاحی عورت کا بچہ ہوں۔ یہ تم نے خودساختہ فتوے لگا رکھے ہیں: وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ (19:31)۔ ''اُس نے مجھے زندگی کے ہر گوشے میں بابرکت بنایا ہے۔'' مجھے تمہارے کہنے کی قطعاً پرواہ نہیں ہے۔ اس نے مجھے بابرکت بنایا ہے، اور کہا ہے کہ ''جہاں بھی تم

ہو گئے سادات و برکات تمہارے ساتھ ہونگی۔'' اس نے مجھے تو یہ کہا ہے اور تم ہو کہ مجھے حرامی بچہ قرار دے رہے ہو معاذ اللہ۔

مجھے خدا کی طرف سے مشن عطا ہوا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: وَاَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَادُمۡتُ حَیًّا (19:31)۔اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہاری خودساختہ شریعت کی جگہ صلوٰۃ وزکوٰۃ کا صحیح نظام قائم کروں اور عمر بھر میرا یہی شعار رہے۔عزیزانِ من! خدا کا یہ مشن کس قدر واضح ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ پھر تم جا کر دینِ خداوندی کا نظامِ صلوٰۃ وزکوٰۃ قائم کرو' اس نے یہ کہا ہے کہ تمہارا یہ مشن زندگی بھر رہے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ جب میرا یہ مشن ہے تو میں اسی مشن کو لے آیا ہوں۔باقی رہی یہ مظلوم عورت' میری ماں' جس کا کلیجہ تمہارے طعن و تشنیع کے تیروں نے چھلنی کر کے رکھ دیا ہے۔کم بختو' سانپ کے بچو! آج بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں آتے' تم نے اس مظلوم و معصوم کی زندگی اجیرن بنا دی۔کیا گناہ کیا تھا اس نے؟ تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے جیسا بنوں۔نہیں' میں ایسا نہیں بن سکتا۔

تم میری والدہ کے خلاف اس طرح زبان درازی کرتے ہو' یاد رکھو: وَبَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَلَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا (19:32)۔میں اُس سے ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آ ؤں گا۔میں (معاذ اللہ) ایسا شقی و بد بخت نہیں کہ تمہارے پیچھے لگ کر ایک بے گناہ خاتون سے سختی سے پیش آؤں کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے خدا کی سچی شریعت کے عین مطابق کیا ہے۔عزیزانِ من! اب یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ وعظ کہتے کہتے پھر ماں کا ذکر کیوں آ گیا؟ آپ وہاں کھڑے ہوئے' اپنے آپ کو اس پس منظر میں رکھیے تو بات صاف سمجھ میں آتی ہے۔میں اپنی ماں کا احترام کرونگا۔میں اس کی خدمت کرونگا۔میں کشادہ ظرفی سے اس کے ساتھ پیش آونگا۔میں تمہارے جیسا ظالم اور شقی نہیں ہوں کہ جنہوں نے ایک بے گناہ عورت کو اس طرح سے چھلنی کر کے رکھ دیا ہے۔مجھ سے یہ توقع نہ کرو کہ میں اپنی ماں کے ساتھ وہ برتاؤ کروں جو تم کرنا چاہتے ہو۔مجھے خدا کی شریعت نے' خدا کی کتاب نے' یہ بتایا ہے کہ اس نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا ہے۔میں یہ کچھ جو تم کہتے ہو' اپنی ماں سے نہیں کہوں گا۔

عزیزانِ من! بات بالکل صاف ہے۔بتا دیا کہ میں تمہاری کیوں مخالفت کرتا ہوں۔میں ایک کتاب لے کے آیا ہوں' نبی ہوں۔ بتا دیا کہ اسی کتاب نے مجھے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس نے بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا۔اس لیے میں تمہارے کہنے کے مطابق اِسے نہیں چھوڑ سکتا۔ باقی رہا تم لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ اس قسم کی خودساختہ شریعت کے مطابق حرامی بچہ ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ معلوم نہیں کہ اس کی زندگی میں کیا کیا امراض اور کیا کیا نفسیاتی کیفیات ہونگی' مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھ پہ کیا بیتے گی' کیا گزرے گی' لیکن اتنا جانتا ہوں کہ خدا کی شریعت کے خلاف کرنے والوں پر خدا کا عذاب آیا کرتا ہے اور تم دیکھو گے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

وہ غرّا کر کہنے لگے: کیا کہہ رہے ہو؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم میری پیدائش کو قابلِ اعتراض قرار دیتے ہو! یہ تمہاری خودساختہ شریعت کا فیصلہ ہے۔میں جس خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں' اس کے نزدیک: وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَیَوۡمَ اَمُوۡتُ وَیَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا (19:33)۔میری پیدائش بھی سلامتی کی مظہر ہے' میری ساری زندگی بھی سلامتی کی حامل ہے' میری ساری زندگی' آخری دم تک سلامتی کی

حامل ہوگی، میری موت بھی سلامتی پر ہوگی اور حیات اخروی میں بھی میں امن وسلامتی میں ہوں گا۔ تم اپنی خودساختہ شریعت کو لے کر، جہاں تک جاسکتے ہو جاؤ، لیکن قرآن کہتا ہے کہ **ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ** (19:34)۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم کی صحیح صحیح سرگزشت جس کے بارے میں یہ لوگ، یہ احبار و رہبان، یہ اہلِ شریعت' اس قدر اختلاف کر رہے ہیں۔

یہودیت اور عیسائیت کے مابین چپقلش کی وجہ جواز

عزیزانِ من! کچھ تھوڑا سا لطف اٹھائیے۔ کیا کہتا ہے قرآن؟ کہا: **ذٰلِکَ عِیۡسٰی** (19:34)۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یہاں ذٰلک کہا ہے: عزیزانِ من! ایک طرف تو یہودیت کی یہ جتنی بھی تفریط تھی کہ یہ کس قسم کی ماں کا، کس قسم کا بچہ تھا یعنی اس کی پیدائش تک کو قابل اعتراض ٹھہرایا گیا تھا۔ قرآن نے چار ہی لفظوں میں اس کی ساری تردید کردی۔ اور دوسری طرف یہ جو عیسائیت کا عقیدہ تھا کہ وہ ابن اللہ تھا، خدا کا بیٹا تھا۔ "**اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ**" میں خدا کا عبد ہوں، کہہ کر اس کی بھی تردید کردی۔ اس طرح یہودیت کی تفریط (کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش قابل اعتراض ہے) اور عیسائیت کی افراط (کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے) دونوں کو یکسر ختم کردیا۔ بس بات ہی ختم کردی۔ اس **ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ** (19:34)۔ کے بعد کہا: **قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ** (19:34)۔ "یہ ہے وہ حقیقی بات کہ جس میں یہ دونوں گروہ یہود [1] اور عیسائی آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ اُن میں کا ایک گروہ، گروہ یہود اسے، معاذ اللہ، زنا کی پیدائش قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ، گروہ عیسائی' اسے خدا کا بیٹا بناتا ہے۔ اور دونوں آپس میں جھگڑتے ہیں۔ بات نہ وہ ہے، نہ یہ ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ ہے سچی بات، جو ہم نے بتائی ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی بتائی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی زندگی کی داستان۔ اسی کے بارے میں کہا کہ یہ **قَوۡلَ الۡحَقِّ** (19:34) ہے۔ یہ صحیح صحیح سرگزشت ہے۔ یہودیوں کی بات قطع کرنے کے بعد، عیسائیت کی طرف آئے تو وہاں بھی یہی مذہب تھا۔ یہودیت تو بنی اسرائیل ہی کے اندر رہی۔ وہ آگے زیادہ پھیلی ہی نہیں۔ ان کا کام تو بس سازشیں کرنا ہی رہ گیا تھا، لیکن انہوں نے عیسائیت کا عقیدہ بہت عام کردیا تھا کیونکہ وہاں جو سلطنت تھی وہ عیسائی ہوگئی تھی۔ میں آگے چل کر جب ان کی تاریخ آئے گی، تو بیان

---

[1] اس زمانے میں یہودیوں کے چھ بڑے بڑے فرقے تھے: ۱۔ نذریّین یا منذوریّین۔ ان میں ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو خدا کی نذر کردیتا تھا یا اس کے اہل خاندان اُسے نذر کردیتے تھے۔ ۲۔ صدوقی۔ یہ حکومت وقت کے حامی اور صاحبِ حشمت وجاہ تھے۔ ہیکل کے احبار و رہبان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ ۳۔ فریسی: ان میں تکبر وغرور تھا۔ یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ۴۔ ایسینی: انقلابیوں کی مؤثر جماعت تھی۔ سلطنت روما کے خلاف تھی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ مسلکِ رہبانیت اختیار کیا۔ ۵۔ غالیین: اسے جلیلی بھی کہتے ہیں اور غالی بھی۔ یہ شروع میں ایسینی (Essenes) فرقہ سے تعلق رکھتے تھے بعد میں الگ ہوئے۔ یہ قیصر کی اطاعت کے خلاف تھے۔ ۶۔ سامری: یہ فرقہ یہودیوں اور اشوریوں پر مشتمل تھا۔ قدیم یہودی مذہب کے خلاف تھے۔ چنانچہ انہوں نے بیت المقدس کے ہیکل کے علی الرغم اپنا ہیکل الگ تیار کر رکھا تھا۔ یہ ہمیشہ دوسرے یہودیوں کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے اور اس وجہ سے ملک میں فساد اور خونریزی کرتے۔

کروں گا کہ یہ بے چارے پھر کس طرح سے جان بچا کے فلسطین سے بھاگے تھے' روپوش ہوئے تھے' دوسری جگہ چلے گئے تھے' ہجرت کر گئے تھے۔ وہ بڑا سخت زمانہ آیا تھا اس لیے کہ Virtually یہودیوں کی حکومت تھی اور جو زندگی کا مذہبی دائرہ تھا' اس میں بھی یہودیوں کی حکومت تھی۔ اور جو سیاسی دائرہ تھا' اس میں رومن کی حکومت تھی اور یہ دونوں' یہودی اور رومن' حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کے خلاف تھے۔

میں آگے چل کر بیان کروں گا کہ یہ جو یہودیوں نے کہا ہے کہ یہ ہماری شریعت کے خلاف جاتا ہے' اس لیے فتویٰ دیا' گورنر سے دستخط کرا لیے' یہ بات تھی ہی نہیں۔ اور پھر یہ بات بھی نہیں تھی جو یہ لوگ ان کی زندگی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ایک درویشِ بے نوا' بے چارہ آدمی تھا۔ چار پانچ آدمی اپنے ساتھ لیے تھا یہ یونہی موٹا چھوٹا کھاتے تھے' کنبل پہنے ہوئے ہوتے تھے' جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرتے تھے' تعلیم یہ دیتے تھے کہ ایک گال پہ طمانچہ مارے تو دوسرا گال آگے رکھ دو' یہ قطعاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی نہیں ہے۔ یہ تو محض افسانہ نویسی ہے۔

زمین و آسمان پر خدا کی حکمرانی کا نام قرآنی انقلاب ہے

انبیاء کرام علیہم السلام تو عظیم انقلابی شخصیت ہوتے تھے۔ یہ دعویٰ ہر نبی کا تھا کہ دنیا میں آسمان کی بادشاہت ہو۔ جیسی اے خدا! تیری بادشاہت آسمان پہ ہے وہی زمین پہ ہو۔ یہ ہے وہ انقلاب جو وہ لانا چاہتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے تھے کہ جیسے خارجی کائنات میں اے بارِ الٰہی! تیرے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا' اسی طرح سے میں یہ انقلاب لے کے آیا ہوں کہ اس کرۂ ارض پہ بھی خدا کے سوا کسی کا حکم نہ چلے۔ یہ فقرے ابھی تک موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تفسیریں اور تعبیریں کسی دوسری طرح کی ہونے لگ گئی ہیں جیسی آپ کے ہاں قرآن کی تعبیریں ہوتی ہیں۔ تو نظر آتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ اقوال ہونگے۔ یہی چیز ہے کہ جیسی تیری مرضی آسمانوں پہ چلتی ہے' وہی تیری مرضی زمین پہ چلے تو بڑی چیز ہے۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44)۔ یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے' وہ کافر ہے' خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا بھی مدعی نہ ہو...... کافر و مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے۔ تو اس طرح اگر خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوتی تو اسی کو تو کفر کہتے ہیں۔ یہ تھے انبیاء کرامؑ جو آئے تھے' یہ انقلاب تھا جو وہ لائے تھے۔

اس انقلاب کی دعوت دینے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے اور یہ تحریک' یہ آسمانی انقلاب بڑے زوروں پہ آ گیا ہوا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ یہودیوں نے محض شریعت کی رو سے ان کے خلاف فتویٰ دیا تھا اور گورنر سے دستخط کرا لیے تھے۔ یہودیوں نے تو یقیناً فتویٰ دیا تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس آسمانی انقلاب سے یہودیت ختم ہوتی تھی' احبار و رہبان ختم ہوتے تھے' مذہبی پیشوائیت ختم ہوتی تھی' ہیکل ختم ہوتا تھا' اِن احبار و رہبان کے یہ تمام مناسک ختم ہوتے تھے۔ یہ ان کا بالکل وہی انداز تھا جس طرح آج آپ کی مذہبی پیشوائیت کر رہی ہے۔ آج اس مذہبی پیشوائیت کی منظم کوشش اور سازش یہ ہے کہ خدا کی حکومت قائم نہ ہونے پائے بلکہ اس کی جگہ تھیا کریسی قائم و دائم رہے۔

مذہبی پیشوائیت کا مطالبہ

عزیزانِ من! اِن کی کوشش یہ تھی کہ مذہبی پیشوائیت کی وہ حکومت قائم ہو جو یہودیوں کی حکومت تھی۔ حضرتِ عیسیٰؑ والی حکومت نہ قائم ہونے پائے۔ اس بات کے ثبوت کے لیے آپ انجیل برنباس (1:39) دیکھیں۔ یہودی علماء ومشائخ اس خوف وہراس میں مبتلا تھے کہ کہیں ''خدا کی بادشاہت'' قائم نہ ہو جائے۔ خدا کی اس بادشاہت میں نہ قیصریت کا کچھ کام ہے، نہ پاپائیت (Priesthod) کا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس ملک عظیم سے ان دونوں طاغوتی طاقتوں کو نکالنا تھا۔ اس لیے یہودی احبار ورہبان بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ پھر بھی ان کی تعلیم بہت قریب نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس میں یہ چیز ہے کہ وہاں کے احبار ورہبان نے ''کاہنوں'' نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ ہیکل کی اس تحریک کو کچل دو۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ تحریک زور پکڑ گئی تو ہمارے بچے جو آج عیش اڑا رہے ہیں، بھوکے مار دیئے جائیں گے اور ہمیں محنت کر کے کھانا پڑے گا۔ [1] ''وڈی گل تے ایہہ ہوندی اے، محنت کر کے کھانا پے گا، ہڈ حرام ہو جاندا اے آدمی''۔ [2] وہ ہے یہ بات! اور اس کے بعد انہوں نے یہ کہا کہ اب تو ہماری کیفیت یہ ہے کہ دنیا کے کاروبار رومن ایمپائر کے مطابق چلتے ہیں اور اللہ ان کا بھلا کرے وہ ہمارے معاملوں میں دخل نہیں دیتے اور ہم ان کی سیاست میں دخل نہیں دیتے اور ہماری جو شریعت کے فیصلے ہیں ان میں وہ مداخلت نہیں کرتے۔ یہ بالکل سیکولر قوم ہے۔ عزیزانِ من! یہ بالکل اسی طرح آج آپ کے ہاں بھی کہا جا رہا ہے اور وہ ہندوستان والی تحریک، جو وہاں تھی، اب یہاں بھی دہرائی جا رہی ہے۔

تحریک پاکستان کی مخالفت کی وجہ

تحریکِ پاکستان کا مسئلہ یہ تھا کہ سارے علماء کرام حضرات یہ کہتے تھے کہ ہندو گارنٹی دیتا ہے کہ ''یہاں تمہیں اعتقادات کی، عبادات کی اور پرسنل لاز کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اس لیے جب یہ آزادی حاصل ہوگی تو پھر تم اور کیا چاہتے؟ اس طرح اگر دیکھا جائے تو اس سے اسلام تو آزاد نہیں رہتا گو وہ تو آزادی دیتے ہیں۔ باقی رہے دنیا کے معاملے تو وہ کہتے تھے کہ وہ تمام معاملات یہاں کی جمہوری حکومت کے ماتحت ہوں گے، اس کے مطابق طے ہونگے۔ اس میں کونسی بات خلافِ شریعت ہے؟'' عزیزانِ من! یہاں پاک

---

1. بڑی بات تو یہ ہوتی ہے کہ (انہیں) محنت کر کے کھانا پڑے گا۔ بغیر محنت کیے آدمی حرامخور ہو جاتا ہے، سہل پسند ہو جاتا ہے۔
2. تب ان لوگوں نے، کاہنوں کے سردار کے ساتھ، مشورہ کیا اور کہا: ''اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پہ بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ ہماری تقالید (رسومات) باطل سے اس کی نبھ نہیں سکتی۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے اس لیے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ (انجیل برنباس کی فصل ص۔ 142)

و ہند میں یہی ٹکراؤ تھا۔ یہ جو بڑے بڑے نام آپ کے سامنے آتے ہیں‘ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد‘ مولانا حسین احمد مدنی‘ مفتی کفایت اللہ‘ احمد سعید‘ علمائے دیو بند‘ یہ تمام کے تمام یہی موقف رکھتے تھے‘ اور اِدھر کہنے والا [1] یہ کہتا تھا کہ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

یہ ہے فرق جو وہ یہودی وہاں کہتے تھے۔ یہ بعینہٖ سیکولرازم والی بات تھی کہ حکومت دنیاوی امور طے کرتی ہے اور شریعت کے امور ہم طے کرتے ہیں۔ وہ نہ ہمارے معاملے میں دخل دیتے ہیں‘ نہ ہم ان کے معاملے میں دخل دیتے ہیں۔ اور اب یہ‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ‘ کہنے کے لیے آ گیا ہے کہ وہ بھی غلط ہے‘ تم بھی غلط ہو۔ انسان پہ انسان کی حکومت ہو ہی نہیں سکتی‘ حکومت خدا کے قوانین کی ہوگی۔ اس میں نہ احبار و رہبان باقی رہیں گے‘ نہ رومن کا گورنر باقی رہے گا۔ یہ تھی وہ تحریک۔

یہودی یعنی ہیکل والے احبار و رہبان اس لیے اس کی مخالفت کرتے تھے کہ ان کی ساری چودھراہٹ ختم ہوتی تھی۔ سلطنت کو بھی اس سے ایک دھڑکا پیدا ہو گیا تھا‘ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ تھی وہ چیز جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی جماعت کے خلاف تھی۔ چنانچہ آج بھی ان کی تحقیق اور ان کی انجیل یہ دونوں کہہ رہی ہیں کہ جب انہیں بقول ان کے صلیب دیا گیا تو وہاں قاعدہ یہ تھا کہ جسے صلیب پہ چڑھاتے تھے‘ پھانسی دیتے تھے‘ یا جس پر سزائے موت وارد کرتے تھے‘ اس کے نیچے تختی لگاتے تھے جس پہ اس کا جرم لکھا ہوتا تھا‘ جس کی پاداش میں اسے سزائے موت دی جا رہی ہے۔ تو یہاں سوال یہ ہے کہ اس تختی پہ پر کیا لکھا تھا؟ اس تختی کی عبارت کیا تھی؟

صلیب کے سلسلہ میں تختی کی عبارت

عزیزانِ من! انجیل بھی یہ کہہ رہی ہے اور آج کی تحقیق بھی یہ کہہ رہی ہے کہ (بقول اس کے کہ) حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب دیتے وقت ان کے پاؤں کے نیچے جرم کی جو تختی لٹکائی گئی تھی‘ اس میں گورنر کی طرف سے یہ لکھا تھا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ یہ جرم تھا جس کی پاداش میں بقول ان کے یہ کچھ کیا گیا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ آسمانوں کی بادشاہت زمین پر بھی قائم ہو تو گویا ان کا جرم یہ تھا۔ اس کے بعد جب یہودیوں کی سازش سے یہ تحریک ناکام بنائی گئی تو یہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں آگے چل کر یہ بات بیان کرونگا۔ اس کے بعد جب رومنز کا بازنطینی بادشاہ ہوا ہے تو اس نے عیسائیت قبول کی‘ اور اسے اپنی مملکت کا مذہب قرار دیا۔ یہ اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔ اس نے ان سب کو بلایا۔ اس نے وہاں عیسائیت کا یہ نیا مذہب رائج کیا‘ اسے سلطنت کا مذہب بنایا اور سلطنت کے اس مذہب کی بناء پر عیسائیت پھیلی۔

---

[1] ڈاکٹر محمد اقبالؒ (۱۸۷۷-۱۹۳۸): ضربِ کلیم

سینٹ پال کا وضع کردہ عقیدہ

عزیزانِ من! ابن اللہ کا عقیدہ اس زمانے میں سینٹ پال (St. Paul :c AD.5-67) نے وضع کیا اور خوب پھیلایا۔ قرآن کو ضرورت تھی کہ یہودیوں کے احبار ورہبان کی سازشوں اور مکروفریب کو بے نقاب کرے اور عیسائیوں کے اس عقیدۂ باطل کی تردید کرے چنانچہ جہاں یہ کہا: ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡہِ یَمۡتَرُوۡنَ ۝ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ (19:34-35)۔ یہ ہے عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کی صحیح صحیح داستان جس کے بارے میں یہ لوگ اس قدر اختلاف کر رہے ہیں کہ ایک گروہ یہودی' اگر تفریط کی طرف اس کی پیدائش تک کو قابل اعتراض ٹھہرا رہا ہے تو دوسرا گروہ عیسائی افراط کی طرف اسے خدا کا بیٹا قرار دے رہا ہے۔ یہ بات خدا کے شایان شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

عزیزان من! کہا یہ گیا کہ جسے تم خدا کہہ کے پکارتے ہو' ذرا خدا کا تصور تو ذہن میں لاؤ۔ کیا اس تصور کے ماتحت یہ اس کے شایانِ شان بھی ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ بیٹے کی ضرورت تو عصائے پیری کے لیے ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں یہ مددگار ہوگا۔ ''مرجاؤں گا تو یہ بڑھاپے میں میرے نام کو زندہ رکھے گا۔'' جس خدا نے مرنا ہی نہیں' اس کے لیے محض نام کو زندہ رکھنے کی بات کیا! باقی رہا یہ حصہ کہ یہ میرا مددگار رہے گا تو یہاں پہلی بات یہ کہی کہ سبحان اللہ' یہ ان کے تصور سے بہت دور ہے۔ خدا کا تصور اس سے ارفع واعلیٰ ہے جو ان کے ذہن میں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی کام دنیا میں رکا ہوا تھا' اس لیے اس نے دنیا میں اپنا ایک بیٹا بھیجا اور پھر دوسری رہی یہ چیز کہ وہ اس کا مددگار رہے گا۔ قرآن کریم نے اس سلسلے میں کہا کہ سُبۡحٰنَہٗ (19:35)۔ وہ تو اس سے بہت دور ہے۔ اس کی قوتوں کا تو یہ عالم ہے کہ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (19:35)۔ جب وہ کسی بڑی سے بڑی مہم کا بھی ارادہ کر لیتا ہے' کسی بھی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ حکم کرتا ہے کہ ہو جا' اور وہ ہو جاتا ہے تو وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ اسے اپنے ارادے اور احکام کو بروئے کار لانے کے لیے کسی مددگار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اب بقول اِن کے اسے بیٹوں کی ضرورت پڑی ہوئی ہے: ''جاویں جاویں ایہہ پاھنڈا تو چک لیائیں ایتھوں ذرا میں ہن بڈھا ہو گیا ہیگاں ذرا کم کار کریا کر''۔ [1] ان قوتوں کے مالک خدا کے متعلق تم یہ کہتے ہو کہ اس کو بیٹے کی ضرورت تھی۔ کہاں آئی ہے یہ بات جناب؟ اس نے تو قرآن کریم میں کہا کہ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (19:35)۔ اس کی قوتوں کا تو یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ حکم کرتا ہے کہ ہو جا' اور ہو جاتا ہے۔ یہاں عزیزانِ من! ہمارے ہاں والے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کہا تھا کہ یہ جو تم تعجب کرتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے ہی کیسے پیدا ہو گئے؟ اور یہ کہ اس کا بیٹا ہوا' اس فَیَکُوۡنُ [2] والے سے جب یہ پوچھا گیا کہ یہ کہتے ہیں: یہ آپ کا بیٹا ہے کیا یہ حقیقت ہے؟ تو آپ کو معلوم ہے

---

[1] جانا ذرا' یہ برتن تو وہاں سے اٹھا لانا۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں' تم اب ذرا کام کاج کیا کرو۔

[2] وہ (کام) ہو جاتا ہے۔

اس نے کیا جواب دیا۔ اللہ نے یہ نہیں کہا کہ ''میں جاندا ہیگا''۔ ❶ بلکہ یہ کہا ہے: سُبۡحٰنَهٗ (19:35)۔ وہ اس سے بہت پاک ہے' وہ اس سے بہت بلند ہے' کچھ ہونا اس سے بہت بعید ہے۔

کن فیکون صفات کی حامل ہستی کا جواب

عزیزانِ من! اس نے جواب دیا کہ میرے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ میری تو بیوی نہیں ہے۔ یعنی اس نے یہ نہیں کہا کہ ہمارے ہاں مشکل کیا ہے' میں تو وہ ''کن فیکون'' ہوں جس سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ کہا کہ جس قاعدے اور قانون کے مطابق جہاں یہ بیٹا اور اولاد ہوتی ہے' اُسی قاعدے اور قانون کی رُو سے اولاد ہوگی اور اس قاعدے کی رو سے تو صورت یہ ہے کہ جس کی بیوی نہیں' اس کے بیٹا کیسے ہوگا۔ تو سیدھی سی بات ہے جس بیوی کا خاوند نہیں' اس کے ہاں جائز بیٹا کیسے ہوگا؟ اور ادھر ہمارے ہاں کے مفسرین ہیں کہ جو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! خدا نے کہہ دیا تھا: ''کن فیکون''۔ اس لیے یہ ہو گیا۔

عزیزانِ من! اب یہ جو سامنے مخاطب ہیں یہ عیسائی ہیں۔ یہ ان کے متعلق ہے کہ تم یہ کہتے ہو: باپ' یہ بیٹا روح البلد' وہ ابن اور وہ اس کا باپ یعنی خدا۔ قرآن نے فوراً ہی اگلی ہی آیت میں کہا: وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبُّكُمۡ (19:36)۔ میرا اور تمہارا' سب کا نشوونما دینے والا' اللہ ہے۔ یاد رکھو! نہ باپ یہ، نہ اس کا بیٹا' یہ اس کے ہاں اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ میرا رب بھی وہی' تمہارا رب بھی وہی' لہٰذا کرو کیا؟ کہا: فَاعۡبُدُوۡهُ‌ؕ (19:36) اس کی محکومیت اختیار کرو' اس کی عبدیت اختیار کرو۔ یہ اس کے بیٹے کی پرستش نہ شروع کرو۔ اپنے ذہن میں جسے تم یہ کہہ رہے ہو' وہ بیٹا نہیں ہے۔ وہ بھی اس کا ''عبد'' تھا' تم بھی ''عبد'' بنو' اور آگے کیا آپ کو معلوم ہے کہ کیا کہا؟ کہا: هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ (19:36)۔ یہ ہے سیدھا' متوازن' سچا راستہ۔ کہا: راستہ تو یہی تھا جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ہر نبی کی طرح بتایا تھا۔ اس کی تعلیم تو یہ تھی لیکن اس کے بعد اس کے متبعین میں سے فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَيۡنِهِمۡ‌ (19:37)۔ مختلف فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے تو اس کے بعد جیسا کہ ہر دین کے ساتھ ہوا' دین مذہب میں بدل گیا اور امتِ واحدہ فرقوں کے اندر تبدیل ہو گئی' مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات شروع ہو گئے۔

دینِ خدا تو فرقوں کی موجودگی میں کبھی باقی رہ ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! آپ دیکھیں گے کہ جو امت بھی فرقوں میں بٹ گئی ہے' اس میں خدا کا دین باقی نہیں رہا اور رہتا بھی نہیں ہے۔ دین کی بنیادی شناخت امتِ واحدہ ہونا ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پہ ایک مملکت پاکستان ہے۔ اس کا Constitution (آئین) ہے۔ اس Constitution (آئین) کے سارے ماننے والے پاکستانی نیشنل کہلاتے ہیں۔ ان میں اگر کوئی ایسے ہوں جو اس میں اختلاف کریں کہ ہم اس Constitution (آئین) کا یہ حصہ نہیں مانتے' اس حصے سے اختلاف کرتے ہیں' وہ پاکستانی نیشنل نہیں

❶ میں جانتا ہوں۔

رہتا۔ اسے آپ الگ کردیتے ہیں۔ اگر وہ نیشنل ہونے کا مدعی ہوتا ہے تو اس پر بغاوت کا مقدمہ کیا جاتا ہے۔ یہ بغاوت ہے۔ کسی Basis' کسی اساس' پہ ایک قوم' قوم بنے یا' امت بنے' ایک قوم یا امت اس کے اندر کوئی ایسی چیز Introduce کرنا' داخل کرنا' جس سے اس میں اختلاف پیدا ہو جائے یا اس میں فرقہ بن جائے تو اس سے وہ دین باقی نہیں رہتا' وہ دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

فرقہ بندی کی ایک پختہ نشانی: مسجد الگ' نماز الگ

عزیزانِ من! اکثر مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ فرقے کی کوئی بڑی سی پہچان بتائیے کیونکہ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ پرویزی فرقہ بھی ہے۔ آپ کہتے رہیے کہ نہیں ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ نہیں جی! وہ فرقہ ہے' تو کوئی موٹی' بدیہی سی مثال' جلی سی نشانی بتائیے کہ جس سے فرقے کو پہچانا جائے۔ سیدھی سی بات ہے' عزیزانِ من! کہ جو لوگ بھی دوسروں سے الگ نماز پڑھتے ہیں' وہ الگ فرقہ ہے۔ یہ اس کی پکی نشانی ہے۔ امت کی وحدت کا نشان صلوٰۃ تھی۔ اسی لیے قرآن نے کہا تھا: اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝ مِنَ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ (30:31-32)۔ صلوٰۃ کا قیام کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے امت میں فرقے پیدا کر لیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی فرقہ اپنی نماز الگ تو نہ بنائے لیکن باقیوں سے نماز الگ پڑھے' مسجد الگ بنائے' جیسے یہ مرزائیوں نے کیا تھا۔ یہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا فرقہ کہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی الگ نماز نہیں ایجاد کی تھی۔ یہ حنفی طریقے سے نماز پڑھتے تھے' لیکن یہ حنفیوں سے بھی الگ اپنی نماز پڑھتے تھے' مسجد الگ تھی' اپنی نماز الگ پڑھتے تھے حتیٰ کہ حرمِ کعبہ میں بھی مرزا بشیر الدین نے کہا کہ میں نے نماز الگ پڑھی تھی۔ جو باقیوں سے بھی اپنی نماز الگ پڑھتے ہیں' یاد رکھیے! وہ الگ فرقہ ہو جاتے ہیں اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے۔

مسجد ضرار کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں' آپ کو معلوم ہے' کہ مدینے میں ایک مسجد بنائی تھی۔ قرآن میں اس کا ذکر مسجد ضرار (9:107) کے نام سے ہے۔ سورۃ التوبہ دیکھ لیجیے۔ مسجد' بت خانہ نہیں۔ جنہوں نے یہ مسجد بنائی تھی' انہوں نے اپنے نئے نئے عقائد بھی وضع نہیں کیے تھے' عقیدے بھی وہی تھے۔ انہوں نے الگ مذہب بھی نہیں اختیار کیا تھا۔ اسلام چھوڑ کر کفر نہیں اختیار کر لیا تھا' بالکل کچھ اور نہیں کیا تھا' کوئی بات اختلافی نہیں تھی۔ مسجد الگ بنائی تھی۔ قرآنِ کریم نے اس مسجد کا ذکر کیا ہے۔ کہا ہے کہ انہوں نے جو یہ الگ مسجد بنالی ہے تو اس کے متعلق پہلی چیز یہ کہی کہ یہ مسجد نہیں' یہ ان لوگوں کی کمین گاہ ہے جو خدا اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ کریں گے۔

ایک دفعہ پھر دہرا دوں کہ یہ مسلمان تھے' انہوں نے اسلام چھوڑ کر کفر نہیں اختیار کیا تھا' انہوں نے کوئی نئے عقائد وضع نہیں کیے تھے۔ صرف مسجد الگ بنائی تھی۔ قرآن اسے کفراً کہتا ہے۔ وَتَفۡرِیۡقًا (9:107) او بابا! خدا کے لیے پرویز کو کافر قرار دینے سے پہلے کھڑے

ہو کے سوچ تو لو: تم اس سے موحد مومن نہیں بن سکو گے۔ قرآن اس مسجد کی تعمیر کے متعلق کہتا ہے کہ اس مسجد سے درحقیقت ان کی غرض یہ تھی کہ اس سے اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے (9:107)۔ پھر دہرا لیجیے کہ اس مسجد کے بنانے والے یہ مسلمان تھے' کافر نہیں تھے' انہوں نے کفر اختیار نہیں کیا تھا' کوئی نئے عقائد وضع نہیں کیے تھے۔ کفراً مسجد بنائی۔ اسے قرآن نے کیوں کفرً اکہا: تَفْرِيقًا ۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (9:17)۔ اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ اس تفرقے کی بات یہاں سے چلی تھی۔

الگ نماز کا پڑھنا بھی فرقہ بندی ہے

عزیزانِ من! تفرقے کی پہلی نشانی ''فرقہ بندی کی مسجد'' ہے' مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے انہوں نے الگ مسجد بنائی۔ اور اگر الگ مسجد نہ بھی بنایئے' میں نے کہا ہے کہ اگر تم نے الگ نماز پڑھی' اگر تم نے باقیوں کے ساتھ مل کے نماز نہیں پڑھی' نماز الگ پڑھنی شروع کر دی' تو یاد رکھیے! الگ فرقہ بن گیا۔ یہ ہے نشانی۔

عزیزانِ من! پرویزی فرقہ کہنے والوں سے پوچھیے' یہ جو پرویزی فرقہ کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ کہیں تم نے ان کی کوئی الگ مسجد بھی دیکھی ہے۔ انہیں کہیں اکٹھے' باقیوں سے الگ' نماز پڑھتے بھی تم نے دیکھا ہے۔ ان کی احتیاط کا تو یہ عالم ہے کہ جب ان کی کنونشن ہوتی ہے تو لوگوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ ہم نماز پڑھنے کے لیے باہر جاتے ہیں' کچھ وقت اس میں آنے جانے کے اندر صرف ہو جاتا ہے' تو کیوں نہ یہیں' اسی پنڈال میں' اکٹھے ہی نماز پڑھ لیں۔ لیکن میں نے شدت سے تاکید کر رکھی ہے کہ نہ جلسہ گاہ میں الگ نماز پڑھنے کی اجازت ہے' نہ تمہارے قیام گاہ میں الگ نماز پڑھنے کی اجازت ہے' ہر نماز تمہیں ساتھ کی مسجدوں میں جاکے' آس پاس کی مسجدوں میں جا کر' پڑھنی ہوگی۔ آج یہ کچھ کرو گے تو کل اسی بناء پر ممکن ہے کہ کل کوئی فرقہ بن جائے۔ میں نے ہی تو یہ آواز بلند کی ہوئی ہے۔ یہ جو اسے فرقہ بنا رہے ہیں' اسے الگ فرقہ بتا رہے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے' عزیزانِ من! کہ صدیوں کے بعد یہ آواز یہاں سے بلند ہوئی ہے کہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ الگ نمازیں پڑھنا' الگ مسجد بنانا' قرآن کی رو سے کفر ہے' میں نے یہ آواز بلند کی' یہ آواز بلند کرتے ہوئے مجھے چالیس برس ہوگئے۔ اس کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ قرآن کی آیتیں تو میں پیش کرتا تھا۔ انہوں نے اس کا جواب یہ سوچا کہ اسے خود کہہ دو کہ یہ فرقہ قرآنی ہے۔ چل بھئی! معاملہ رفت بود ہوا' غت رُبود[1] ہوا۔

موجودہ حالات میں اس فرقہ بندی کا علاج

یہ ٹھیک ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت جس طرح سے یہ مختلف فرقے اپنے اپنے طریقے پہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ اس کا مٹانا

---

[1] رفت بود' غت ربود' غت ربود یا غتربود: خراب کر دینا' برباد کر دینا۔

میرے بس کی بات نہیں ہے اور اس وقت تو شاید کسی کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ اگر قرآن کے مطابق کہیں حکومت قائم ہوگئی' وہ حکومت ہی اس کام کو کرسکے گی۔ تو اس وقت تک کا انتظار کرو۔ اس تعلیم کو عام کرتے چلے جاؤ کہ ''فرقوں کی موجودگی میں دین نہیں آسکتا' فرقوں کو شرک قرار دیتے جاؤ' قرآن جو کہتا ہے' اسے پھیلاتے جاؤ' فرقوں کو کفر قرار دیتے جاؤ' عوام کے ضمیروں کو جھنجھوڑتے جاؤ۔'' اس سے عوام کے قلب ونگاہ میں تبدیلی پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

امت واحدہ کی پہلی نشانی

اگر آپ کا یہ خیال عام ہوگیا اور کبھی مملکت قرآنی بن گئی تو اس وقت یہ وحدت پیدا ہوگی۔ اور وحدت کی پہلی نشانی یہ ہوگی کہ وہ پوری امت ایک طریق پر نماز کے لیے بھی اور صلوٰۃ کے لیے بھی کھڑی ہوجائے گی۔ اس سے پہلے کی یہ چیز میرے بس کی بات نہیں۔ اس لیے میں اس کے لیے مزید تفرقے سے بچنے کے لیے یہ کہتا ہوں کہ بھئی! جس طرح سے یہ کچھ کرتے ہیں وہ مٹانا چونکہ ہمارے بس کی بات نہیں' ٹھیک ہے اسے کرنے دو' لیکن آپس میں' اس معاملے پہ سر پھٹول نہ کرو' کچھ آپس میں ذرا قریب آنے کی کوشش کرو اور نیا فرقہ تو پیدا نہ کرو۔ خدا کے لیے یہ فرقے پہلے ہی کچھ کم نہیں ہیں۔

بہائیوں کا اعلان

پہلے جتنے بھی فرقے چلے آرہے تھے' غنیمت تھا کہ ان پر صدیاں گزر گئی تھیں' ہمارے ہاں کوئی نیا فرقہ نہیں بنا تھا۔ بہائی اٹھے تھے تو انہوں نے اپنے آپ کو کہہ دیا کہ ہم مسلمان ہی نہیں ہیں! تو ٹھیک ہے کہ ایک غیر مذہب بنا' صدیوں سے ہمارے ہاں کوئی نیا فرقہ نہیں بنا تھا۔ یہ جو یہاں مرزائیوں کا پہلا فرقہ پیدا ہوا تھا' اس کی نشانی الگ نماز پڑھنا تھا۔

اہلِ قرآن کا فرقہ

ابھی حال ہی میں ہمارے ہاں ایک دوسرا فرقہ بنا ہے۔ یہ اہلِ قرآن نام سے بنا ہے۔ اس کی نشانی الگ نماز پڑھنا ہے۔ مرزائیوں نے تو پھر بھی' میں نے کہا' الگ نماز نہیں بنائی تھی۔ نماز پڑھتے ہی الگ تھے' صرف مسجد ہی الگ بنائی تھی۔ اس اہل قرآن فرقہ والوں نے تو نماز ہی باقیوں سے الگ بنالی۔ اور وہ اتنی مختلف ہے کہ وہ کسی بھی جگہ' حریمِ کعبہ میں بھی' باقی مسلمانوں کے ساتھ کھڑے ہوکے نماز نہیں پڑھ سکتے۔ یہ نماز بالکل مختلف ہے۔ نماز کے وقت تو چلو چھوڑ یئے: تین وقت صحیح' پانچ نہ صحیح' تین وقت میں پڑھ لیجیے: دو رکعتیں۔ اگر وہ ظہر کی نماز کے لیے کعبے میں کھڑے ہوگئے تو یہ کیا کریں گے: ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ' حالانکہ وہ امام تو دو سجدے کرے گا۔ چلو وہ تم نے جو کچھ کرنا ہے' چپکے سے پڑھنا ہے' کسی کو پتہ نہیں چلے گا' اس کا کیا کرو گے؟ کیا ایک سجدہ کر کے پھر واپس ہوگے؟ نتیجہ یہ کہ وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی دس آدمی ہونگے: مسجد الگ' نماز الگ' میں یہ عرض کر رہا ہوں عزیزانِ من! یہ ہے فرقے کی نشانی۔

طلوعِ اسلام والوں کی نہ کوئی الگ مسجد ہے اور نہ کوئی الگ نماز

یہ جو آپ کے ہاں رٹ لگاتے ہیں کہ طلوعِ اسلام پرویزی فرقہ ہے۔ اس سے کہو کہ قرآن نے سب سے پہلی تفرقے کی بین نشانی الگ مسجد بتائی' الگ نماز پڑھنے کی بات کی۔ ان سے کہو تو سہی کہ کہاں یہ الگ نماز پڑھتے ہیں؟ کون سی الگ نماز پڑھتے ہیں؟ کون سی الگ مسجد ہے ان کی؟

مکاتب فکر اور فرقے میں کیا فرق ہے؟

کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے پھر اب فریبِ نفس کے لیے کیا کیا؟ پتہ نہیں کہ وہ کون سا شیطان تھا' جس نے کان میں یہ پھونک دیا کہ ارے! یہ فرقے نہیں ہیں۔ اگر یہ فرقے نہیں ہیں تو پھر یہ اور کیا ہیں؟ کہا کہ مکاتبِ فکر ہیں' جی مکاتبِ فکر! اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ مکاتبِ فکر کیا ہے؟ فکر فلاسفی کو کہتے ہیں اور مفکر فلاسفر کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے School of Thought کہتے ہیں۔ جس کا ہمارے ہاں آج تک ترجمہ مکتبِ فکر ہوتا تھا۔ یہ School of Thought ' فلسفہ کے مختلف خیالات کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے الگ الگ سکول ہوتے ہیں: کانٹ کا فلسفہ' ہیگل کا فلسفہ' ابنِ رشد کا فلسفہ' ارسطو کا فلسفہ' اقبال کا فلسفہ۔ اقبالؒ نے فکر کی بنا پر کون سا نیا فرقہ پیدا کر دیا تھا؟ یہ مکاتبِ فکر ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اب مکاتبِ فکر کی کیفیت کیا ہے؟ پچھلے ہی ہفتے یہ خبر آئی کہ ملتان میں ایک مسجد یا جنازہ گاہ کے اندر کوئی مسجد ہے' اس مسجد کی تولیت کے متعلق سنیوں میں اہلحدیث اور جس کو اہلسنت کہا گیا ہے' یہ بھی اپنے آپ کو تو اہلسنت ہی کہتے ہیں' لیکن بہرحال اہلحدیث اور حنفیوں میں غالباً اس مسجد کی تولیت پر جھگڑا چلا آ رہا ہے' مقدمہ بازی ہو رہی ہے' عدالت تک قصہ چلا جا رہا ہے۔ یہ دونوں نماز پڑھنے کے لیے وہاں چلے گئے اور نماز تو پھر مسلمانوں کی ''اخوت کا نشان'' ہے تو وہاں اس مسجد میں وہ لٹھم لٹھ ہو گئے۔ ایک ادھر سے مر گیا ایک اُدھر سے ہلاک ہو گیا۔ گولی چل گئی' باقی جیل میں چلے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جی! یہ مکاتبِ فکر ہیں' جی! فرقے نہیں ہیں۔'' اے مکاتبِ فکر نے اگر' اے فرقے ہوندے تے پتہ نی کی ہوندا ہور''۔ [1] یہ فریب ہے۔

اگر یہ مکاتب فکر ہیں تو پھر فرقے کہاں ہیں؟

عزیزانِ من! یا تو اس میں سے کچھ خود بھی خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں یا یہ دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔ یاد رکھیے! ان میں انہیں فرقے ماننے کی جرأت نہیں حالانکہ خود ہی ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر (73) فرقے ہوں گے' بہتر (72) جہنمی ہوں گے اور ایک جنتی ہوگا۔ یعنی خود یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ اتنے فرقے ہوں گے۔ ان سے پوچھیے کہ یہ سارے مکاتبِ فکر

---

[1] یہ مکاتب فکر ہیں۔ اگر یہ فرقے ہوتے تو معلوم نہیں کہ کیا کچھ ہو جاتا۔

ہیں تو پھر بہتر فرقے کہاں ہیں؟ کیا وہ پھر آپ عیسائیوں کے ہاں جا کے ڈھونڈیں گے؟ کیا باتیں کرتے ہیں؟

عزیزانِ من! مذہب کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ وہ سوچنے کے سوئچ کو آف (Off) کر دیتا ہے۔ چل بھئی! کیا مجال کہ کوئی آدمی ذرا سوچنے کے لیے بھی کھڑا ہو جائے! یہ باتیں جو میں کہہ رہا ہوں' خدانہ کردہ' کہیں مجھے وحی تو نہیں آتی۔ یہ سب سوچ کی باتیں ہیں' سوچ ماؤف کر دیجیے پھر جو جی میں آئے' منواتے چلے جائیے۔ نماز پڑھنے کے لیے مسجد کے اندر یہ فرقہ نہیں ہے' مگر بات یہ ہے کہ ایک ادھر سے ہلاک ہو جاتا ہے' ایک اُدھر سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ مقدمہ چل رہا ہے: فرقہ نہیں ہے جی! الگ مسجد بنائی ہوئی ہے۔ دس آدمی صرف وہاں جا کے نماز پڑھتے ہیں۔ جب ہم نے فرقہ اہلِ قرآن کے متعلق لکھا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ جی! یہ فرقہ ہی نہیں۔ اور طلوعِ اسلام کے متعلق کہا کہ دیکھیے! ان کی کنونشن الگ ہوتی ہے۔ لے بھئی! کنونشن الگ ہوتی ہے لہٰذا یہ فرقہ ہو گیا۔ انہیں ان کی کوئی بھی مسجد الگ نظر نہیں آتی۔ میں نے گزارش کی ہے: مجھے کسی سے واسطہ نہیں نہ پرانوں سے' نہ نئے سے۔ میں نے تو گزارش کی ہے کہ پہلی چیز' جو مدینے کے اندر بنی تھی' وہ یہی الگ مسجد بنی تھی۔ قرآن نے اسے کفر قرار دیا۔ کس بنا پہ اسے کفر قرار دیا تھا؟ تَفۡرِيۡقًاۢ بَيۡنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (9:107) وہ تفریق بین المومنین تھی۔ ہر وہ نماز' ہر وہ مسجد' جو تفریق بین المؤمنین کا جز ہو گی' قرآن کی رو سے وہ مسجد ضرار ہو گی' قرآن اسے کفر' اکہتا ہے۔ اور یہ بھی کہتا ہے کہ خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کی کمین گاہ ہے' جہاں سے بیٹھ کے وہ تیر چلائیں گے۔

سچ کہا تھا قرآن کریم نے: فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَيۡنِهِمۡ (19:37)۔ اس کے بعد مختلف فرقے آپس میں اختلاف پیدا کرنے لگے۔ اس کے بعد دین مذہب میں بدل گیا۔ ان کے اندر اختلافات شروع ہو گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ کہا: فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا (19:37) سو جن لوگوں نے اصل حقیقت سے انکار کیا ہے' ان پر بے حد افسوس ہے' ان کے لیے تباہی ہے۔ لیجیے! قرآن نے یہاں اُسے ''کفر'' کہہ دیا۔ کہا کہ پھر ان کے لیے آخر الامر تباہی ہے' جو یوں ''کفر'' کرتے ہیں۔ اختلاف کفر ہے۔ کہا: مِنۡ مَّشۡهَدِ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ (19:37)۔ ان اختلاف پیدا کرنے والوں کی اس دن کیا حالت ہو گی جب حقیقتِ حال مشہود ہو کر سامنے آ جائے گی۔ وہ وقت ان کے لیے بڑا ہی سخت ہو گا۔ وہ جو ظہورِ نتائج کا عظیم دن آئے گا' اس میں جب ان کی حاضری (Accountability) ہو گی تو اس وقت تم دیکھو گے کہ کس قدر یہ قوم تباہی اور ذلت کے اندر مبتلا ہو گی۔ تم دیکھو گے کہ یہ وہ قوم ہو گی جس میں تفرقے اور فرقے اور اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَاَبۡصِرۡ يَوۡمَ يَاۡتُوۡنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوۡنَ الۡيَوۡمَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ (19:38)۔ آج تو یہ لوگ خدا کے ایک رسول کو خود خدا یا اس کا بیٹا بنا کر اس قدر ظلم کر رہے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کیے غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں لیکن اعمال کے ظہورِ نتائج کے دن یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس دن ان کی کیفیت یہ ہو گی کہ یہ سب کچھ سنیں گے بھی' سب کچھ دیکھیں گے بھی۔ لیکن آج اس وقت اب یہ اندھے بھی ہیں اور بہرے بھی ہیں۔ ''اس دن اکھاں کھلن گیاں ایہہ اے۔''[1] پھر جب ظہورِ نتائج ہمارے سامنے ہو گا تو کہیں گے کہ وہ تو ''مشہد یوم عظیم'' آ گیا۔

---

[1] اس دن انہیں نظر آئے گا' اس دن وہ عقل و ہوش کے ناخن لیں گے۔

عزیزانِ من! یہ سب کچھ اپنے سامنے' آبادی اور مملکتوں کے اعتبار سے دیکھیے آج اس ساری دنیا میں' سب سے زیادہ عظیم قوم' کم از کم ستر کروڑ کی آبادی' ❶ مراکش سے انڈونیشیا تک' ایک بحرِ زخار ہے' متلاطم ہے' کتنی بڑی قوم ہے۔ اور اب تو اس کے تمام حصے قریب قریب آباد ہو گئے ہیں۔ ان کی اپنی مملکتیں ہیں' UNO کے اندر ان کی کتنی بڑی تعداد ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ ان کا جب بھی کوئی یہاں مسئلہ پیدا ہوتا ہے' ایک بحریہ روس اٹھتا ہے' ویٹو کر دیتا ہے' یہ سارے ختم ہو جاتے ہیں۔ ''او فٹے منہ تہاڈا'' ❷ آج تمہاری قسمتوں کا آخری فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔

قرآن نے تو کہا تھا کہ **فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ o اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ** (19:37-38)۔ جن لوگوں نے حقیقت کی اصلیت کو ماننے سے انکار کیا' ان کے لیے تباہی ہے۔ ان کی اس دن کیا حالت ہو گی جب حقیقت حال مشہود ہو کر سامنے آ جائے گی' وہ وقت ان کے لیے بڑا ہی سخت ہو گا۔ اس وقت ان کی کیفیت یہ ہو گی یہ سب کچھ سنیں گے اور سب کچھ دیکھیں گے۔ اس دن ہوش آئے گا۔ **يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** (19:38)۔ یہ اس قدر ظلم کر رہے ہیں اور حقیقت سے آنکھیں بند کیے غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ یہ ظالم' کمبخت' آج اتنی کھلی ہوئی گمراہی کے اندر ہیں کیوں نظر نہیں آتا؟ یہ ان چیزوں کو کیوں نہیں سنتے؟ **وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ** (19:39) اے رسول! تم انہیں اس آنے والے وقت سے خبردار کر دو۔ وہ کس قدر پچھتاوے کا دن ہو گا' جب تمام معاملات کے فیصلے ہو جائیں گے۔ جب بات طے ہو جائے گی۔ وہ **يَوْمَ الْحَسْرَةِ** ہے۔ اس تباہی سے ہی ان کو آگاہ کر دو۔

آج ساری امت حسرت کا مجسمہ ہے

عزیزانِ من! آج ساری امت حسرت کا مجسمہ ہے۔ ہر مسلمان جو دوسرے سے ملتا ہے' اپنی حالت پہ مرثیہ پڑھتا ہے۔ یعنی یہ عجیب بات ہے' ہمارا روز کا تجربہ' ہر سانس کا تجربہ ہے۔ جب بھی دو مسلمان ملتے ہیں' ان کے لیے کوئی دوسرا Topic ہی نہیں ہے: تباہ ہو گئے' برباد ہو گئے' کیا حالت ہو گئی۔ سارے مسلمان یہی کر رہے ہیں' یہی تو **يَوْمَ الْحَسْرَةِ** (19:39) ہے' پچھتاوے کا دور ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد قرآن کریم کہتا ہے: **وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (19:39)۔ اس وقت یہ لوگ اپنے انجام کی طرف سے بالکل غافل ہیں' اس لیے اس بات کا' اس پیغام کا' یقین نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود یہ غفلت کے عالم میں ہیں۔ یہی ایک بات ہی کرنے کی تھی اور یہ وہی نہیں کرتے۔ وہ کیا بات تھی؟ کہا: **لَا يُؤْمِنُوْنَ** (19:39). قرآن پہ ایمان نہیں لاتے۔ چیخ رہے ہیں' چنگھاڑ رہے ہیں' رو رہے ہیں' پیٹ رہے ہیں' ساری تدبیریں سوچ رہے ہیں' لیکن کوئی تدبیر' کوئی سوچ' کوئی چیخ و پکار کارگر نہیں ہوتی۔

---

❶ یہ 1976ء کا تذکرہ ہے۔ ❷ ارے! او' برا ہو تمہارا!

عزیزانِ من! پھر سنیے! ''بات ایک ہی کرنے کی تھی اور یہی نہیں کرتے۔'' یہاں آ کے سمجھ آتا ہے کہ قرآن میں یہ جو کہا گیا: **لا یؤمنون.** (19:39) تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآن میں پہلے **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** (4:136) کہہ کے پکارا گیا ہے اور پھر آگے کہا گیا ہے۔ **اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ** (4:136) ترجمہ ہے ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ'' اے ایمان والو! یعنی حقیقت میں کہا گیا ہے کہ ''اے مسلمانو! ایمان لاؤ'' اور یہاں اس آیت میں کہا گیا ہے کہ **لَا یُؤْمِنُوْنَ** (19:39) یہ ایمان نہیں لاتے۔ ان سے کہدو کہ ان قوتوں کے گھمنڈ میں نہ رہیں' الگ الگ مملکتوں کے گھمنڈ میں نہ رہیں۔ یاد رکھو! **اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْھَا وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ** (19:40). یہ ساری قوتیں' یہ مملکتیں' یہ سلطنتیں' یہ حکومتیں' یہ زمین اور جو کچھ اس پر ہے' وہ انسان ہوں یا دیگر مخلوق' درحقیقت ہم ان کے مالکِ حقیقی ہیں اور اس کی جواب دہی (Accountability) کے لیے تم نے ہماری عدالت میں حاضر ہونا ہے۔

قرآن حکیم کی صدر اول کے مسلمانوں کو وارننگ

عزیزانِ من! جب اسلام نے مسلمانوں کو مملکت دی تو صدر اول میں وہ مملکت محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ رضی اللہ عنہ کو دی تھی۔ ان کے متعلق قرآن نے ہمیں کہا تھا۔ پھر پہلی قوموں کے بعد استخلاف فی الارض دیا۔ وہ استخلافِ فی الارض کیوں دیا تھا؟ کہا: وہ اس لیے دیا تھا: **لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ** (10:14)۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ کہا: **اِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ** (19:40)۔ تمام امور ہمارے قانون مکافات کے گرد گردش کرتے ہیں' اس کے باہر نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اس وقت ہم پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا؟ ہم نے تمہیں اسلام جیسا دین بھی دیا تھا' مملکت بھی عطا کی تھی' مملکت کے آئین میں جب تم نے Totally' کلی طور پر' یہ کہہ دیا تھا کہ اسلام ہمارا دین ہے اور Constitution (آئین) میں بھی لکھ دیا تھا کہ حدود اللہ کے باہر جا کر کوئی کام نہیں کیا جائے گا' تو کیا یہ ساری چیزیں تم نے کی تھیں؟ ہم نے تمہیں مملکت عطا کی تھی تو وہ اس لیے تھا کہ **لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ** (10:14)۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ پھر تم کیا کرتے ہو اور ان سے کہدو: **اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ** (19:40)۔ زمین اور جو کچھ اس پر ہے' وہ انسان ہوں یا دیگر مخلوق' اس سب کے مالک ہم ہیں۔

عزیزانِ من! اس سے ڈر آتا ہے کہ یہ ملی ہوئی ارض چھن سکتی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں یہ کہا ہے کہ ''تم نہیں بلکہ اس مملکت کے ہم مالک ہیں''۔ اور ہمارا قانون یہ ہے کہ ''مملکت کی وارث قوم ''صالحون'' بنتی ہے یعنی وہ ایسی قوم ہوتی ہے جس میں اس امر کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس کو چلائے۔ جب یہ چھن جائے گی' عزیزانِ من! تو وہ دور ''یوم الحسرۃ'' ہوگا۔ اب قرآن کہتا ہے کہ **وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ** (19:40)۔ ان سے کہو کہ تم کہیں بھاگ کے نہیں جا سکو گے۔ اے اشتہاری مجرمو! آخر کار تمہیں یہاں آنا پڑے گا' ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ مریم کی آیت 40 تک آ گئے۔ آیت 41 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀......❀

چودھواں باب: سورۃ مریم (آیت 41)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۥ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1976 کی 11 تاریخ ہے اور درس قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 41 سے ہو رہا ہے: (19:41)۔

سابقہ آیات میں حضرت مریم علیہا السلام کی داستان چلی آ رہی تھی، نہایت مذہبی گھرانے کی چشم و چراغ، ہیکل میں نذر کر دی گئی تھی، وقف کر دی گئی تھی، ہیکل کے ماحول میں پرورش اور تربیت پائی اور پھر اس پورے ماحول کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر کے کھڑی ہوگئی۔

کچھ ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا

عزیزانِ من! اب یہاں اس ایک ''باغی'' کی داستان ختم ہوئی اور دوسرے ''باغی'' کی داستان شروع ہوئی: **وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ**)(19:41۔(اے رسول!) اب تو اس کتاب (قرآن) میں ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تو ہوتے ہی ''باغی'' تھے، جو کچھ ماحول میں غلط چلا آ رہا ہے، جو کچھ ہوتا آ رہا ہے، قوم جس روش پہ چلی آ رہی ہے، جو مسالک، جو مشارب، جو معتقدات اور جو غلط نظریات مروج ہیں، وہ ان سب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والے ہوتے ہیں۔

میں نے کہا یہ ہے کہ اب ایک دوسرے ''باغی'' کا قصہ شروع ہوا۔ وہاں حضرت مریم علیہا السلام کی داستان میں گھر بار، ماحول، یہودیت، ہیکل کے تمام مسالک کے خلاف بغاوت تھی اور یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام [1] کے سلسلہ میں یہ کیفیت ہے کہ وہ مملکت کے سب سے بڑے پروہت کا بیٹا ہے۔ آج پروہت کے لفظ سے وہ بات سامنے نہیں آتی۔ اس زمانے میں، اس کا درجہ، پروٹوکول (Protocole) کے اعتبار سے کہہ لیجئے، بادشاہ سے دوسرے نمبر پر ہوتا تھا لیکن درحقیقت حکومت یہی کرتا تھا۔

---

[1] خلیل اکبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ قریباً 2200 ق م قیاس کیا جاتا ہے اور سلسلۂ نسب حضرت نوح علیہ السلام سے دسویں پشت میں ہے۔ آپ نے اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت کا سنگ بنیاد رکھا اور ساری اقوام میں نبوت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ آپ کی ذریت سے باہر نہ گئی۔ اس شجر مقدس کی ایک شاخ طوبیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچ رہی ہے تو دوسری شاخ سے وہ گل سرسبد تبسم فشاں ہوا جس پر نور و نکہت کی تمام رعنائیاں اپنے اوج کمال تک پہنچ کر ختم ہو گئیں۔ اسی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت، ملت ابراہیمی اور امت امت حنفیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ (پرویز، 1994، ص ص ث اور 96)

تھیا کریسی (Theocracy) میں ہوتا ہی یہ ہے کہ وہ بادشاہ کا نام تو اوپر رکھتے ہیں' مگر حکومت ہمیشہ پروہتوں کے' مذہبی پیشوائیت کے' ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہامان فرعون [1] سے کچھ کم اقتدار نہیں رکھتا تھا' اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ فرعون' ہامان کے مندر میں جاتا تھا' وہاں جا کر سجدے کرتا تھا۔ اسی طرح حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے والد اس دَور کے ہامان تھے۔ یہ بہت بڑا مقام تھا۔ آج تو ہم انہیں صرف بت تراش ہی کہتے ہیں' تو یہ بت تراش نہیں' مجسمہ ساز نہیں' بلکہ حقیقت میں وہ تو اس مملکت کے بہت بڑے مذہبی پیشوا تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے باپ کا بیٹا تھا' جس نے یہ منصب' یہ اقتدار' یہ وجاہت' یہ مقام وراثت میں لینا تھا۔

عزیزانِ من! یہ تھے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' یہ تھی اِن کی پوری کی پوری قوم: بت پرست' ستارہ پرست' بادشاہ ان کا ہیڈ مگر باپ پرستش کے تمام مشارب ومسالک کا سربراہ اور یہ تھے ان کے بیٹے جوان سب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے ہوئے تھے۔ بات سب سے پہلے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بات آگے آئے گی۔ قرآنِ کریم نے پہلے ان کا تعارف کرایا ہے: **وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا** (19:41)۔ اے رسول! تو اس کتاب (قرآن) میں ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر۔ وہ بڑا ہی سچا نبی تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم وفراست

ہر نبی سچا ہوتا ہے۔ نبی کے پاس اپنے دعویٰ کی پہلی شہادت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ سچا ہوتا ہے' صادق ہوتا ہے۔ نبوت پر ایمان لایا ہی اسطرح جاتا ہے کہ پہلے نبی کی صداقت پر' اس کے صادق ہونے پر' یقین ہو۔ نبی جو کچھ وحی کے ذریعے دیتا ہے' اس پر غور وفکر کے بعد انسان اس نتیجہ تک پہنچتا ہے اور اگر غور وفکر کے بعد یہ اس نتیجہ پہ پہنچ بھی جائے کہ واقعی اس کا یہ کلام بڑا عدیم النظیر ہے تو یہ بات دل میں رہ سکتی ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے مفکر ہیں جو اس قسم کی بہت بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے' وہ اس کی فکر ہی کا نتیجہ ہو۔ مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ شخص کہتا ہے کہ یہ میری فکر کا نتیجہ نہیں ہے' یہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملی ہے۔ اس میں میرے اپنے خیالات کا شائبہ تک نہیں' یہ خالصتاً خدا کی طرف سے عطا کردہ علم ہے جو میں تم تک پہنچاتا ہوں۔ یہ وہ چیز ہے جس کے ثبوت میں کوئی کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ہم سنتے ہیں' وہ تو نبی سے سن رہے ہیں اور ساری دنیا کا مسلمہ یہی ہے کہ یہ اس کی اپنی فکر ہے کہ جس سے وہ انسان بولتا ہے۔ یہ ایک خاص استثنا ہوتی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اس میں اس بات کے پیش کرنے والے کی اپنی فکر کا' اپنے خیالات کا' کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا لیکن بات پھر وہیں آ گئی کہ سننے والا' جس کے سامنے وہ بات پیش کی جارہی ہے' اس کے لیے اس کی دلیل اور ثبوت کیا ہے کہ یہ جو بات کہی' بے مثال سہی' بے نظیر سہی' لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ بات اس کی اپنی فکر کی پیدا کردہ نہیں ہے' یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ وحی ہے۔ اس کے لیے نبی کے پاس کوئی محسوس دلیل نہیں ہوتی' کوئی محسوس ثبوت نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہوتی ہے جس کی بناء پر' جس بھروسے پر' جس اعتماد پر' وہ یہ چیز پیش کرتا ہے؟ وہ یہ چیز وحی ہوتی ہے۔ یہ اِس سوال کے جواب کا بڑا اہم نکتہ ہے۔

---

[1] فرعون اور ہامان کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 2004ء ص ص۔109 اور 124 (فٹ نوٹ)

نبی اکرم ﷺ کی پہلی دعوت کا انداز

حضورِ نبی اکرم ﷺ نے پہلی وحی ملنے پر' چھوٹی سی پہاڑی پہ کھڑے ہوکے' مکہ والوں کو آواز دی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ہوتا یہ تھا کہ جب کہیں سے کسی دشمن کی چڑھائی کا' تباہی کا' بربادی کا' کوئی خطرہ ہوتا تھا تو جیسے آج کل طوفان وسیلاب کے سگنل دیئے جاتے ہیں' ان کے ہاں یہ انداز بھی تھا اور رواج بھی تھا کہ ایسے وقت میں کوئی شخص جو قابلِ اعتماد ہو' وہ کسی اونچے مقام پہ کھڑے ہوکے کپڑا اہلائے اور اپنی قوم کو آواز دے کہ آؤ! ایک بہت بڑا خطرہ اُمڈ رہا ہے۔ اِسی انداز و رواج کے مطابق حضور ﷺ نے یہ آواز دی اور یہ قوم' یعنی یہ قریش' مکہ سے بھاگتے ہوئے اس پہاڑی کے نیچے آ گئے کہ کوئی بہت بڑا خطرہ آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں آپ لوگوں سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے' ایک بہت بڑا دشمن ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے اور تمہیں تباہ کر کے رکھ دے گا تو کیا تم میری بات کو مان لوگے؟ انہوں نے یک زبان کہا کہ ہاں' مان لیں گے۔ آپ نے کہا: کیوں مان لوگے؟ کہنے لگے کہ تم نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو بات میں ابھی کہنے والا ہوں' اس کے سلسلے میں' اس اعتراف کو یاد رکھنا کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سب نے کہا: ''ٹھیک ہے' بالکل ٹھیک ہے'' تو آپ نے کہا کہ ''جس روشِ زندگی پہ تم چلے جا رہے ہو' وہ تمہیں تباہ و برباد کر دے گی۔ اسے چھوڑ دو' بچ جاؤ گے۔ نہیں چھوڑو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔''

عزیزانِ من! اسے وہ کیسے مان لیں! مگر انہیں یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ نہیں' تم جھوٹ کہتے ہو کیونکہ وہ کہہ چکے تھے کہ تم نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں' تم تو سچے ہو۔ انہوں نے یہ سنا اور یہ کہہ کے چلے گئے کہ ''لو بھئی! یہ بات کہنے کے لیے ہمیں بلایا تھا۔ ہم سمجھے تھے پہاڑ کے پیچھے کوئی دشمن آ رہا ہے۔'' اور وہ چلے گئے۔ بہرحال اسے چھوڑ دیجیے۔ آپؐ نے کہا: بات یہ ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تو کیا تم اسے مانو گے؟ انہوں نے کہا: مانیں گے۔ پوچھا: کیوں مانو گے؟ کہا: اس لیے کہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

عزیزانِ من! نبی تو اپنے پہلے ہی دعویٰ کے صداقت کے ثبوت میں بات ہی یہ کہتا ہے' ثبوت ہی یہ پیش کرتا ہے کہ وہ سچا ہوتا ہے' اس کی سچائی اس کی قوم میں' اس کے ماحول کے اندر' مسلمہ کے طور پہ مانی جاتی ہے' اور یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر وہ منواتا ہے۔ سچائی صرف یہی نہیں بلکہ زندگی کا ہر گوشہ اسی سچائی پر محیط ہوتا ہے تو جب حضور ﷺ سے انہوں نے یہ چیز بار بار کہی کہ اس کے لیے کوئی ثبوت پیش کیجیے کہ آپ واقعی خدا کے نبی ہیں اور خدا کیطرف سے آپکو یہ وحی ملتی ہے تو ثبوت کے لیے جیسا کہ پہلے روش چلی آ رہی تھی' وہ سمجھتے تھے کہ نبی کوئی معجزہ دکھاتا ہے اور پھر وہ معجزہ اس کے دعوئ نبوت کا ثبوت بنتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بار بار آیا ہے کہ وہ بھی اسی قسم کا معجزہ طلب کرتے تھے۔ قرآن میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ آؤ' میں تمہیں اپنا معجزہ بتاؤں کہ کونسا ہے تو یقیناً وہ اکٹھے ہوئے کہ آج معجزہ دیکھیں گے۔ کہا کہ میرا معجزہ یہ ہے: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16)۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں کہ تمہیں معلوم نہ ہو سکے کہ میرا کردار کیسا ہے۔ میں نے اس دعوائے نبوت سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کہو کہ میری یہ زندگی

تمہیں کس بات کی شہادت دیتی ہے؟ کہو کہ ایسی زندگی ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے؟ کیا میری یہ زندگی اس کی شہادت دیتی ہے کہ میں جھوٹا اور فریبی ہوں یا یہ کہ میں سچا اور پاک باز اانسان ہوں؟ تم اس حقیقت پر غور کرو اور عقل وفکر سے کام لے کر سوچو۔

عزیزانِ من! اس کے سامنے ان کے سر جھک گئے۔ معجزہ اسی کو کہتے ہیں کہ جو فریقِ مقابل کو عاجز کر دے۔ وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکے۔

ابوسفیان ہرقل کے دربار میں

یہ بات کہ وہ اس کے خلاف ایک بات بھی نہ کہہ سکے صرف اسی مقام پہ ہی نہیں ہے۔ یہ بات اُس مقام پہ بھی ہے جب ہرقل [1] کے دربار میں انہی کے خلاف ابوسفیان مدد مانگنے کے لیے گیا تھا۔ اور وہاں جا کے اُسے یہ کہہ کے ابھارا تھا کہ وہ شخص ہمارے بتوں کو تو ایک طرف، تمہارے معبود کو بھی باطل کہتا ہے۔ یہ تھی وہ بات جو اس نے کہی تھی۔ تو اس بادشاہ نے پوچھا تھا کہ یہ شخص جو تمہارے اندر یہ کچھ کہنے والا ہے، کیا یہ کہیں باہر سے آیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں، ہم میں سے ہی ہے۔ کہا: کب سے ہے؟ کہا: پیدائش کے دن سے ہے۔ پھر کہا: یہ پہلے دن سے یہ کچھ کہتا تھا؟ کہنے لگے: نہیں، پہلے تو اچھا بھلا تھا، تقریباً چالیس سال تک کی عمر تو وہاں گزر گئی، اس کے بعد اس نے یہ بات کہنی شروع کی۔ اس نے کہا کہ وہ جو چالیس سال پہلے کی عمر اس نے تمہارے اندر گزاری ہے اس کے متعلق، اس کی زندگی کے متعلق، تم کیا کہتے ہو؟ کیا وہ اس قسم کے فریب دیا کرتا تھا؟ کیا وہ جھوٹ بولا کرتا تھا؟

عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ مدد مانگنے کے لیے انہیں ان کے خلاف بادشاہ کو بڑی مشکل سے اپنا ہمنوا بنانا پڑ رہا ہے۔ اگر آج کا آپ کا سیاستدان ہوتا تو صاحب! وہ آپ کو یاد ہے پھر اتنا ہی نہ کہتا کہ اس میں یہ یہ عیب ہیں، بلکہ ''زندگی کی اہم ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں، واجب ہو جاتا ہے'' کے تحت اپنے سارے عیب اسی کی طرف منسوب کر دیتا۔ یہ آج کی شریعت کا فتویٰ ہے۔ میں یہ Quoted کہہ رہا ہوں کہ اس کے سامنے یہ فتویٰ تھا ''کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں، واجب ہو جاتا ہے''۔ یہی ہے آپ کے ہاں کی آج کی شریعت کا مودودی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کا فتویٰ، اور کچھ نہیں تو وہ ابوسفیان کو یہی کچھ کہہ کر سمجھاتے اور اپنا ہمنوا بناتے لیکن غنیمت ہے کہ وہ آج کا مسلمان نہیں تھا۔ وہ مکہ کا مشرک تھا، اس نے جھوٹ بولنا گوارا نہیں کیا۔

---

[1] بعثتِ نبوی کے زمانے میں ہرقل بازنطینی مملکت کا شہنشاہ تھا۔ شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیرنگیں تھے۔ حدودِ شام پہ قدیم عربی قبائل بستے تھے جنہوں نے مذہب عیسائیت اختیار کر لیا تھا۔ اسی قبائل کے رؤساء (Chaifteins) ہرقل کی طرف سے ان علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسّانی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے جس قدر تصادمات ان علاقوں میں ہوئے وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سرزمین کا شہنشاہ تھا لیکن بلاواسطہ غسّانی حکمرانوں سے ہوئے جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے۔

بلندیٔ کردار کا ثبوت

میں کہتا ہوں کہ بلند کیریکٹر کا رول اتنا ہوتا ہے کہ دشمن بھی اس کی عدم موجودگی میں بھی جرأت نہیں کرتا کہ اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ کردار کی بلندی اپنے اندر بڑی قوت رکھتی ہے۔ انہیں ابوسفیان کو یہ بتانا پڑا کہ نہیں صاحب! وہ تو ہم میں امین مشہور تھا' ہم نے اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ اس زمانے کے بادشاہ یونہی راجہ رنجیت سنگھ نہیں ہوتے تھے' بہت سمجھدار لوگ ہوتے تھے۔ اس نے کہا کہ پھر یہ (Psychologically) نفسیاتی طور پہ ناممکن ہے کہ ایک شخص چالیس سال تک تو کوئی ایسی بات نہ کرے اور شاشب ایسا بدل جائے کہ جھوٹ بولدے' کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا رسول کہدے۔ اس لیے میں اسکو جھوٹا ماننے کو تیار نہیں۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا ہوں کہ نبی کی نبوت کی تو پہلی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ سچا ہوتا ہے' صدیق ہوتا ہے' اس کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوتی ہے کہ اس کے بدترین دشمن بھی اس کے خلاف انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ تو جب نبی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہوتا ہی صادق اور صدیق ہے تو قرآن نے یہاں یہ کہا ہے کہ ''سوچو کہ کیا میں نے اس سے پہلے تم میں اپنی زندگی نہیں بسر کی۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں کہ تمہیں معلوم نہ ہو سکے کہ میرا کردار کیسا ہے۔ میں نے اس دعوائے نبوت سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کی ہے۔ تم اس حقیقت پر غور تو کرو۔'' اب یہاں یہ بات آئی کہ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ (اے رسول!) اب تو اِس کتاب (قرآن) میں ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر۔ یقیناً وہ سچائی کا مجسمہ تھا اور خدا کا نبی تھا۔ لہٰذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ خاص طور پہ' خصوصیت سے' یہاں یہ بات کیوں کہی گئی۔ اپنا اپنا اندازِ فکر ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سچائی کے باوجود قرآن کی حامل قوم کا بہتان

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ خدائے علیم وخبیر نے پہلے ہی پیش بندی کر دی کہ اس قرآن اور اس نبی کے خلاف یہ کچھ اس کی امت کرے گی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ قوم' یہ امت' اس ابراہیم علیہ السلام کے خلاف کیا کچھ کہے گی' لہٰذا اس نے یہ کہہ کر اس کی پیش بندی کر دی کہ وہ صادق ہی نہیں' صدیق ہے' بہت سچا ہے' اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کیا آپ کو پتہ ہے جو میں نے ابھی کہا ہے کہ پہلے پیش بندی کر دی کہ یہ قرآن کی حامل قوم کیا کرے گی؟ قرآن کی حامل قوم یہ کہے گی کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ کیا آپ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ کیوں خدا نے پہلے ہی ان کا تعارف یہ کہہ کے کرایا کہ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ وہ سچائی کا مجسمہ تھا اور خدا کا نبی تھا۔ تورات میں ہے کہ اس کے کون کون سے جھوٹ گنائے جاتے ہیں۔ وہ قوم بت پرست تھی' ستارہ پرست تھی' وہ جسے بت پرستی کہتے ہیں' وہ ستاروں ہی کے بت' معبود کی شکل میں بنا کے' اپنے مندروں میں رکھ لیتے ہیں۔ ہاں' تو وہ ستارہ پرست قوم تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک دفعہ ان کا کوئی بہت بڑا مذہبی تہوار تھا' جس میں انہوں نے اپنے ان معبودوں کا کوئی بہت بڑا جشن منانا تھا۔ تو انہوں نے آ کر اس نوجوان ابراہیمؑ سے بھی کہا کہ آیئے اس جشن میں چلیے۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا بیان اور اس کی حقیقت

قرآن مجید میں یہ واقعہ ہے۔اس کے ثبوت میں کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ **فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِيْمٌ** (37:88-89)۔ وہ قوم ستاروں کی بھی پرستش کرتی تھی۔ابراہیم نے ستاروں کی ماہیت پر غور وفکر کیا اور اپنی قوم کو بتایا کہ ان میں کیا کیا نقص ہیں جن کی وجہ سے وہ معبود بن سکنے کے قابل نہیں۔اُس نے ان سے کہا کہ بھلا بتاؤ کہ میں انہیں کس طرح معبود مان سکتا ہوں؟ میں تمہاری روش سے سخت بیزار ہوں(6:78)اور(60:4)۔

عزیزانِ من! یہاں اس آیت میں "**اِنِّیْ سَقِيْمٌ**" آیا ہے۔یہ کہتے: "**اِنِّیْ سَقِيْمٌ**" کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہہ دیا کہ ''نہیں بھئی! میں نہیں جاؤنگا' میں بیمار ہوں۔'' اس پر اب یہ کہتے ہیں کہ ''وہ جھوٹ تھا' وہ بیمار نہیں تھے۔بہانہ بنایا تھا۔'' اس لحاظ سے پہلا جھوٹ یہ ہوا! پہلے تو یہ پوچھیے کہ یہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ وہ واقعی بیمار نہیں تھے۔بات جو قرآن نے کی ہے' وہ تو میں نے اوپر بتا دی۔اس کی مزید وضاحت میں بعد میں کروں گا۔اب سوال یہ ہے کہ اگر انہوں نے فی الواقعہ یہ کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ وہ بیمار نہیں تھے۔یہ کہتے ہیں کہ نہیں جی' وہ بیمار نہیں تھے۔انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔اب آئی ہے قرآنِ کریم کی آیت جو ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ کہیں سے انکو تنکا ملے' بس اس کا پل بناتے ہیں' پھر اس پر سے ہاتھی گزارتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ستارہ پرستی کا تذکرہ دوسرے مقامات پہ بھی کیا ہے۔وہ سورۃ انعام کی آیات ہیں جن میں انہوں نے پہلے کہا کہ یہ ستارہ ہے' یہ ہے معبود؟ اس میں بھی ہمارے ہاں کے لوگ یہی کہتے ہیں کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے پہلے یہ کہہ دیا کہ اچھا: **هٰذَا رَبِّیْ** (6:77)۔اس ستارے کو اپنا رب تسلیم کر لیا' اور پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا: نہیں نہیں نہیں' میری توبہ' یہ نہیں' بھئی یہ تو ڈوب گیا۔یہ ویسے ہی ہے گویا کہ انہوں نے پہلی دفعہ ڈوبتے ہوئے ستارے کو دیکھا ہے۔پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا کہ ستارہ چڑھا ہوتا ہے' پھر ڈوب جاتا ہے۔جب ستارہ روشن تھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہے معبود؟ تو انہوں نے بھی کہا کہ ہاں ہاں یہ ہے میرا معبود۔اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ نہیں نہیں بھئی! یہ تو ڈوب گیا۔یہ میرا معبود نہیں' پھر چاند چڑھا تو انہوں نے کہا کہ یہ دیکھو' کتنا بڑا چمکدار ہے' اس سے بڑا ہے۔یہ ہے معبود؟ تو انہوں نے بھی کہا کہ اچھا' یہ ہے میرا معبود! اور پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: نہیں نہیں یہ بھی نہیں صاحب! اور پھر سورج طلوع ہوا تو انہوں نے اسے بھی کہا۔انہوں نے اسے بھی کہہ دیا کہ ہاں میرا رب یہی ہے! ایک نبی یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے تو جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: نہیں بھئی! یہ بھی غلط ہے۔ **لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ** (6:77)۔بھلا ایسی چیز بھی پروردگار ہو سکتی ہے جو ابھی سامنے چمکتی ہو اور ابھی عذاب ہو جائے۔جو تغیر پذیر ہو وہ خدا کیا ہوا؟ جن کی کیفیت یہ ہے کہ آج یہ چمک دمک' دوسرے ہی وقت کے اندر وہ ختم۔یہ تو معبود' الٰہ نہیں ہو سکتے۔ عزیزانِ من! یہاں دو باتیں دیکھ لیجیے کہ ایک تو یہی' یہ ستاروں والی بات کا واقعہ قرآن میں موجود ہے اور وہ وہاں موجود ہے۔ان کے سامنے یہ کہا گیا کہ میں نہیں تسلیم کرتا' یہ غروب ہو جانے والے' یہ ماند پڑ جانے والے یہ معبود نہیں

ہو سکتے۔تو گویا یہ ان کے معبودوں کے خلاف قرآن کی شہادت ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا۔وہ بات میں نے وہاں بتائی تھی جب یہ تذکرہ آیا تھا۔جو مکالمہ ہے' وہ میں پھر بتاؤں گا۔

بات کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ اگر اس کتابِ عظیم کو لسانِ عربیٔ مبین کے اندر کی کتاب سمجھ لیا جائے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ انہوں نے کہا: ستارہ ہے جس کی وہ پرستش کر رہے تھے۔ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ یہ ہے رب ہمارا۔انہوں نے کہا: اچھا تو تم کہتے ہو یہ ہے میرا رب۔بہت اچھا جی' تھوڑا ٹھہریئے' تھوڑا سا توقف فرمایئے۔یہ وہ ہے جسے تم کہتے ہو کہ میرا رب ہے' توقف فرمایئے۔جب وہ ڈوب گیا تو کہا: جی فرمایئے' وہ کہاں ہے' جسے آپ کہتے تھے کہ میرا رب ہے؟ عزیزانِ من! اس انداز سے بات کیجیے' بات صاف ہو جاتی ہے۔چیستاں کیوں بنا رہے ہیں آپ؟ انہوں نے اس کے بعد چاند کے متعلق پھر وہی بات کہی ہوگی۔انہوں نے کہا: ذرا ٹھہریئے تو' اچھا یہ ہے میرا رب؟ اور پھر یہ کلیہ بیان کر دیا کہ یہ کبھی الٰہ نہیں ہو سکتا' آج تغیر پذیر ہے: اس کے بعد وہ نہ ہونے والا غیر موجود' افسردہ' ہو جائے گا' اس کی روشنی گم ہو جائے گی۔جس کا وجود ہی باقی نہ رہے' وہ میرا الٰہ نہیں ہو سکتا۔ایسے تمہارے ہی الٰہ ہوتے ہیں۔

فنظر نظرة کا قرآنی مفہوم

قرآن کی آیت ہے: **فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ** (37:88)۔اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے نجوم کی طرف دیکھا' ستاروں کی طرف دیکھا۔ستاروں کی طرف دیکھ کے کہا کہ **فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ** (37:89)۔کہا کہ میں بیمار ہوں۔یعنی اِن کے کہنے کی مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھا اور دیکھ کے کہا: میں بیمار ہوں۔لسانِ عربیٔ مبین سے پوچھیے کہ **فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ** (37:88)۔میں ''نظرۃ'' کے بنیادی معنی کیا ہوتے ہیں۔عربیٔ مبین میں ''غور و فکر سے' دو چیزوں کو آپس میں ایک دوسرے کے سامنے رکھ کے' قیاس کرنے کے بعد' اس چیز کی کمزوریوں کو نگاہ میں لانا اور ظاہر کرنا'' نظرۃ کہلاتا ہے۔اِسی لفظ نظرۃً سے لفظ ''فکر و نظر'' آج بھی آپ کے ہاں استعمال ہوتا ہے۔''النظرۃ'' تو عربی زبان کے اندر کہتے ہی ''عیب اور کمزوری'' کو ہیں۔یہ جو لفظ ''منظور'' ہے اس کے معنی ہوتے ہیں: ''عیب دار' تنقیدی نگاہ سے کسی شے کو دیکھنا۔''

عزیزانِ من! عقیدت مند کبھی اپنے الٰہ کو تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ وہ اِن ستاروں کی پرستش کرنے والے اسے عقیدت مندانہ مانتے چلے آ رہے تھے اور یہ وہ تھے جو انہیں تنقیدی نگاہ سے دیکھتے تھے۔یہ ''نظر'' ہی تھی جس نے کہہ دیا کہ جو ''آفلین'' (6:77) ہیں' وہ معبود نہیں ہو سکتے۔یہ ان کے سامنے بھی تو ''آفل'' تھے۔وہ سارے دیکھتے تھے کہ آج ہیں' کل نہیں ہیں' پھر ڈوب جاتے ہیں۔یہ تھا اِن دونوں کی ''نظر'' میں فرق۔

مومن کا ایمان تو ہمیشہ تنقیدی ہوتا ہے

اِن دونوں کے اندازِ نگاہ میں کیا فرق تھا؟ وہ عقیدت مندانہ دیکھتے تھے' یہ اسے تنقیدی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مومن تو ایمان ہی اس کے بعد لاتا ہے جب ان تمام دعاوی کو پہلے تنقیدی نگاہ سے دیکھ لیتا ہے' پرکھ لیتا ہے۔ وہ پرکھ رہے تھے' تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اور دیکھنے کے بعد انہوں نے وہاں کہا تھا: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (6:77)۔ بھلا ایسی چیز بھی پروردگار ہو سکتی ہے جو ابھی سامنے چمکتی ہو اور ابھی غروب ہو جائے۔ جو تغیر پذیر ہو وہ خدا کیا ہوا؟ تو یہاں بھی یہی بات کہی: فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ (37:89)۔ اُس نے ان سے کہا کہ بھلا بتاؤ کہ میں انہیں کس طرح معبود، الٰہ مان سکتا ہوں؟ پھر (6:79) میں کہا کہ میں تمہاری روش سے سخت بیزار ہوں۔

لفظ سقیم کے معنی اور اس کا استعمال

اِس آیت میں آنے والے لفظ ''سقیم'' کے لیے انہوں نے کہہ دیا کہ صاحب! سقیم بیمار کو کہتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ عرب ''قلبِ سقیم'' اس شخص کے لیے کہتے تھے جو کسی چیز سے بیزار ہو۔ ان سے پوچھیے کہ اگر تم نے بیماری کا لفظ لینا ہے تو انگریزی زبان میں لفظ Unfit آپ روز بولتے ہیں' وہ Unfit ہونا جسم کی طبعی بیماری نہیں ہوتا۔ سقیم کے معنی ''بیزار'' ہوتا ہے۔ اب بات یہ ہوئی کہ انہوں نے کہا: ''یہ معبود ہیں۔'' انہوں نے عقیدت مندانہ طور پر یہ کچھ دیکھا اور کہا۔ انہوں نے ناقدانہ نگاہ ڈالنے کے بعد یہ کہا کہ ''یہ تمہارے معبود ہیں؟ میں تمہاری ان چیزوں سے تو بیزار ہوں۔'' کتنی صاف اور واضح بات ہے۔ اب کہا یہ جائے گا کہ صاحب! سقیم بیمار کو بھی کہتے ہیں' بیزار کو بھی کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ وہی جو کہتے ہیں کہ زبان کے اعتبار سے بھی ایک لفظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں۔ ان میں سے یہ معانی کیوں لیے جائیں۔ اس کے لیے وہی قرآن کا تصریفِ آیات کا اصول ہے کہ ایک مقام پہ جو ایک بات بیان ہوئی ہو' وہیں سے نہ دیکھو' کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ اسی ضمن میں دوسرے مقامات میں جو بات آئی ہو' وہاں سے بھی دیکھو کہ کیا مفہوم ہے۔ اور وہاں اس لفظ کے مفہوم کے تحت ایک سے زیادہ معانی آپ کے سامنے یہ تصریفِ آیات پیش کرتی ہیں' ان میں سے اسے اختیار کرو جو اس کیمطابق ہو کیونکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ اس کے مختلف مقامات میں جو بھی الفاظ آئیں گے ان میں ''توافق'' ضروری ہوگا۔ اب رہی یہ چیز جو میں نے کہی: سقیم کے معنی بیزار کے ہیں۔ تو اس کے لیے قرآنِ کریم کی آیات دیکھیے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بہترین نمونہ ہے

عزیزانِ من! آیئے سورۃ الممتحنۃ میں دیکھیں: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4)۔ تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کا طرزِ عمل ایک بہترین' ایک نہایت حسین عمدہ نمونہ ہے۔ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ (60:4)۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ اب وہ لفظ سن لیجیے جو میں نے کہا تھا کہ ''سقیم'' کے معانی ''بیزار'' کیوں لیے جائیں۔

قرآن میں ہے کہ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (60:4)۔جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے ان سے سخت بیزار ہیں۔عزیزانِ من! اس آیت میں لفظ ''برؤا'' موجود ہے۔ کہا: صاحب! تم جنہیں خدا کو چھوڑ کر معبود بنائے ہوئے ہو' میں ان سے ''بیزار'' ہوں۔ہم ان سے ''بیزار'' ہیں۔اِسی آیت میں اگلے لفظ ہیں: كَفَرۡنَا بِكُمۡ (60:4)۔ہم تمہارے مسلک کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ہم اسے باطل سمجھتے ہیں۔ دیکھیے کہ کس طرح مزید اس کی تشریح ہوتی چلی جاتی ہے۔آ گے ہے کہ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا (60:4)۔ اس بنا پہ تم میں اور ہم میں' ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت رہے گی۔دیکھتے ہیں: ''کفرنا بکم''۔ ہم ان سے انکار کرتے ہیں۔ ''برءؤا منکم''۔ہم ان سے بیزار ہیں۔یہی چیز تو ہے جو انہوں نے وہاں کہی۔ان کے معبودوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھا' انہیں بھی سمجھایا کہ یہ ''آفل'' ہیں' یہ غائب ہو جاتے ہیں' یہ غروب ہو جاتے ہیں' یہ تغیر آشنا ہیں۔تم انہیں معبود بنا رہے ہو۔ انہوں نے کہا: نہیں صاحب! اس کے باوجود ہم تو انہی کی پرستش کریں گے۔انہوں نے کہا: کرتے جایئے مگر میں اِنِّىۡ سَقِيۡمٌ (37:89) ہوں' میں تمہاری روش سے سخت بیزار ہوں۔اور اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (60:4) ۔ہم تم سے اور جن کی تم نے' خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے' اس سے سخت بیزار ہیں۔مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (60:4)۔جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے' جن کی تم نے خدا سے ورے محکومیت اختیار کر رکھی ہے۔وہ یہی تو تھے جو تغیر پذیر تھے۔یہ وہی تنقیدی نگاہ تھی' جو آج پھر ہمارے ہاں ایک توحید پرست [1] میں ملتی ہے:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
یہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

اِس توحید پرست نے یہی کہا ہے کہ جو ستاروں کو معبود بنالے' وہ:

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو ' تابعِ ستارہ نہیں

''انی سقیم'' سمجھتے جا رہے ہیں آپ۔معاف کریں کہ ہم نے یہ سب کچھ ستاروں کے متعلق تو کہہ دیا لیکن گردشِ افلاک ہمارے ہاں شاعری کا جزو بنی ہوئی چلی آ رہی ہے۔بھلا' گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے۔ان کی ہر چیز گردشِ افلاک پہ چلتی ہے۔شاعری میں تو چلتی ہی ہے لیکن رسولِ خدا حقائق بیان کرتا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور' 1996' ص ص 50 اور 62۔

شاعری لطائف ہوتی ہے جبکہ رسول حقائق بیان کرتا ہے

بہر حال، شاعری تو کوئی سند نہیں ہوتی۔ اسی لیے رسول کو کہنا پڑا کہ میں شاعر نہیں ہوں، شاعر کو لائسنس حاصل ہوتا ہے، نبی کو لائسنس حاصل نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنی فکر، اپنی طرف، سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ شاعری لطائف ہوتی ہے، رسول حقائق بیان کرتا ہے لیکن یہ شاعر اپنے اِس لائسنس سے چھرے مارتے ہیں ان میں بڑا ''ابراؤ'' ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں جا لگتا ہے۔ شاعری کے اس لائسنس نے اس قوم کو تباہ کر دیا۔ بہر حال، انہی کے اندر سے تو یہ توحید پرست ❶ بھی آ جاتا ہے:

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے

یہ بھی شاعر تھا۔ یہ شخص ان سب کو ''بخشوا'' گیا ہے۔ مجھے شاعر نہ کہنا جی۔ ''اسیں وی شاعر ہونے ہیگے آں، پتہ نئیں لگن لگیاں تکا دیے دینا اینا نے،'' ❷ اسی لیے وہ بار بار کہتا ہے کہ مجھے شاعر نہ کہو بہر حال بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ جو ''انی سقیم'' ہے اس کے معانی کیا ہیں؟

عزیزانِ من! اس کے یہ معانی ہیں: بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (60:4)۔ جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے، میں تم سے اور ان سب سے سخت بیزار ہوں۔ میں کہتا ہوں لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ (6:77)۔ جو ڈوب جاتا ہے، جو تغیر پذیر ہے، وہ خدا کیا ہوا؟ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ اس نے ''آفلین'' کو عقیدت مندانہ نہیں دیکھا۔ اتنے بڑے پروہت کا بیٹا، بادشاہ کا سب سے بڑا منتری، یہ اس کا بیٹا ہے اور ان معبودوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ (6:77)۔ میں ان سے بیزار ہوں، یہ تغیر پذیر ہیں۔ بقول اِن کے ایک جھوٹ تو یہ ہو گیا!! معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔

بات کرنے کا ایک مؤثر ترین انداز

آپ کے دوسرے جھوٹ کے لیے یہ لوگ وہ واقعہ بیان کرتے ہیں جو انہوں نے بت کدے میں جا کر بتوں کو توڑ دیا تھا۔ مگر ان کے سب سے بڑے بت کو رہنے دیا تا کہ معبد کے پجاری اس کی طرف رجوع کریں یعنی اُن سے کہا جا سکے کہ یہ تمہارا سب سے بڑا ''معبود'' موجود ہے اس سے پوچھو کہ یہ کیا ہوا اور اس کی موجودگی میں کیسے ہوا ہے؟ اگر اس بت کو بھی توڑ دیا جاتا تو اس دلیل و حجت کی گنجائش نہ رہتی۔ بہر حال جب انہوں نے معبد میں یہ کچھ دیکھا تو وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کچھ کس نے کیا ہے؟ جس کسی نے بھی کیا ہے، وہ بڑا ہی ظالم اور سرکش ہے۔ اس بت کی تو خود قرآن شہادت دیتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان یہاں

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) بالِ جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، 1996، ص ص۔ 55۔

❷ ہم بھی شاعر ہی تو ہوتے ہیں۔ لیکن پتہ بھی نہیں لگے گا جب انہوں نے دھکا دے دینا ہے۔

پھرا کرتا ہے وہ ان بتوں کو گالیاں دیا کرتا ہے۔ میں گالیوں کا یہ لفظ اپنی طرف سے کہتا ہوں یا اس قوم کی طرف سے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو کسی کو گالی نہیں دیتے تھے۔ وہ ان پر تنقید کیا کرتے تھے ان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھ گئے ہو اور جن کے تم مجاور بن رہے ہو؟ ذرا عقل و بصیرت سے کام لو اور سوچو کہ تم بڑے ہو جنہوں نے انہیں بنایا ہے یا یہ مورتیاں بڑی ہیں؟ معبد کے پجاریوں کو اس کا علم تھا لیکن انہوں نے دانستہ بات کو چھپایا کیونکہ اگر وہ بتا دیتے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان سے یہ کچھ پہلے ہی کہہ دیا تھا تو عوام ان کے پیچھے پڑ جاتے کہ جب تمہیں اس کا علم ہو چکا تھا تو تم نے ان کی حفاظت کی طرف سے غفلت کیوں برتی؟ اس لیے وہ خاموش رہے لیکن عوام میں سے بعض نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو جسے ابراہیم علیہ السلام کہہ کر پکارتے ہیں ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے سنا ہے۔ شاید یہ اُسی کی حرکت ہو۔ چنانچہ پجاریوں نے معتبر بننے کے لیے کہا کہ: فاتوا (21:61)۔ اُسے بلاؤ۔ کہ اُس سے پوچھیں۔

انہوں نے یہ کہا کہ **ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا** (21:62)۔ کیا تم نے یہ کیا ہے؟ **قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ** (21:63)۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تمہارا عقیدہ ہے کہ یہ معبود بڑی قوتوں کے مالک ہیں۔ یہ اپنے پرستاروں کی تمام مرادیں برلاتے ہیں اور مخالفین کو برباد کر دیتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے دیوتا کی قوتیں تمہارے نزدیک غیر محدود ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا ہے جس شخص نے یہ حرکت کی ہے اس بڑے بت نے اپنی قوت کو کام میں لا کر اسے روکا کیوں نہیں اور اسے تباہ و برباد کیوں نہ کر دیا۔

عزیزانِ من! انداز دیکھیے ان پجاریوں کو منوانا ہے ان کی زبان سے قائل کرانا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: یہ مٹی کے معبود کیا ہیں جنہیں تم خدا بنائے بیٹھے ہو؟ کیفیت تمہاری یہ ہے کہ تم اپنے مستقبل کی تقدیریں اور غیب کے احوال و امکانات و خبریں پوچھنے کے لیے ان کے پاس آتے ہو۔ اسی لیے انہیں معبود بنایا ہوا ہے کیونکہ تمہارے نزدیک یہ ماضی اور حال ہی نہیں مستقبل کا بھی علم رکھتے ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے کہ یہ علم رکھتے ہیں تو چلیے باقی تو ٹوٹ گئے یہ تو سالم بیٹھا ہوا ہے اس لیے **فَسْئَلُوْهُمْ** (21:63)۔ پوچھیے صاحب! اس کے سامنے یہ سب کچھ ہوا ہے۔

عزیزانِ من! بات منوانے کا کتنا مؤثر طریق ہے اس مقام پہ کھڑا ہے یہ شخص جسے ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں۔ کیا اس نے جھوٹ بولا تھا؟ میں کیا عرض کروں عزیزانِ من! خدا کی کتاب واقعی کچھ بلند سا فہم مانگتی ہے۔ کتنا مؤثر انداز ہے! پوچھو بھئی! یہ تمہارے علام الغیوب ہیں۔ یہ تمہارے تمہیں مستقبل کی باتیں بتانے والے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کے سامنے ہوا ہے۔ پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں تو پوچھو اس سے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہیں کیا بات ہوگئی؟ کہتا ہے کہ وہ بے حد نادم ہوئے اور کہا کہ ابراہیم یہ سوال پوچھ کے کیوں شرمندہ کرتے ہو: **لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَاۤءِ یَنْطِقُوْنَ** (21:65)۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ یہ نہیں بول سکتے۔ ''فٹے منہ تہاڈا''[1]

---

[1] لعنت تمہاری شکل پہ۔

کیا انداز ہے عزیزانِ من! کیا انداز ہے ان نبیوں کی دعوت پیش کرنے کا! اَدۡعُوۡٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیۡ (12:108)۔ میں تمہیں خدا کی طرف دلائل و براہین کی رو سے دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ خدا کی طرف علی وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں' بات یونہی نہیں منوا لیتے۔ یہ ہے طریقہ بات کرنے کا! انہوں نے اپنی طرف سے مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہا کیونکہ ان کے جذبات پہلے ہی مشتعل ہو چکے ہوئے ہیں۔ وہ جب بتوں کے ٹکڑے اس طرح سے دیکھیں گے تو پوچھو نہیں ہجوم کا اشتعال کہاں پہنچا ہوا ہوگا۔ حضرت ابراہیم نے مخالفت کا ایک لفظ تک نہیں کہا' کچھ نہیں کہا' انہی کی زبان سے ایسی بات کہلوا رہے ہیں کہ بھئی! کیوں مشتعل ہوتے ہو' غصے میں کیوں آتے ہو' سیدھی سی بات ہے۔ ٹھیک ہے کوئی اور بتانے والا نہیں رہا تو بتانے والا بیٹھا ہوا ہے جس کے پاس آ کر تم اپنے معاملات اور مستقبل کے احوال و کوائف معلوم کیا کرتے ہو۔ دعوی تمہارا یہ ہے کہ یہ غیب و شہود کا عالم ہے' جاننے والا ہے۔ تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ بڑی سیدھی سی بات ہے' اس سے پوچھ لو۔ میں بھی کھڑا ہوا ہوں' میرا نام لے گا تو چلو جناب! جو سزا چور کی وہ میری۔ پوچھ تو لو۔ نبی کی دعوت پیش کرنے کی کیا بات ہے!

بات کرنے کے لیے سنت ابراہیمی علیہ السلام کا انداز چاہیے

عزیزانِ من! اگر ہم لوگ اس انداز کو قائم رکھتے تو اس قسم کے جھگڑے کبھی نہ اٹھتے۔ کل ہی ایک مسجد کی تولیت پہ ایک اِدھر سے مر گیا' ایک اُدھر سے ہلاک ہو گیا۔ روز سر پھٹول ہوتے ہیں۔ انداز بھی ہم نے ''خصیمانہ''[1] اختیار کر رکھا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ذرا اس بڑے بت سے پوچھو' یعنی اس کے بعد جس مقام پہ یہ پہنچانا چاہتے تھے' انہی کی زبان سے کہلوایا کہ ''ابراہیم علیہ السلام جانتا ہے تو جانتے بوجھتے ہمیں شرمندہ کرتا ہے: لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ یَنۡطِقُوۡنَ (21:65)۔ تُو تو خود جانتا ہے کہ یہ نہیں بولتے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آگے سے کیا جواب ہے؟ قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (21:66)۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ تم نے ''اللہ کو چھوڑ کر'' جانتے بوجھتے ان چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے۔ ''میں نے جو پنجابی اچ کیا سی ترجمہ: فٹے منہ تہاڈا ایہو ہی ہوسکدا اے بلکہ ایہہ توں وی اگے ایداں لکھ لانت۔''[2] اس بات کو کس طرح ان کی زبان سے پہنچا رہے ہیں۔ اگر یہ پہلے ہی کہہ دیتے کہ ''فٹے منہ تہاڈا تسی اے کرن آئے او تے اسے ویلے پھڑ لیندے او ہنوں''۔[3]

---

1. جھگڑالو
2. میں نے جو پنجابی میں اس کا ترجمہ کیا تھا: 'تف' لعنت تمہاری شکل پہ' اس کا یہی ترجمہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس سے بھی آگے ترجمہ اس کا یہ ہوگا: تم پہ لاکھ لعنت۔
3. تمہاری شکل پہ لعنت کہ تم یہ کچھ کرنے آئے ہو تو انہیں اسی وقت پکڑ لیتے۔

جھوٹا شخص کبھی بردبار نہیں ہوتا

ایسے مقام پہ قرآن کہتا ہے کہ بڑی بردباری ہوتی ہے' اسی میں سہار اور بردباری ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ میں صداقت پر ہوں۔ جھوٹا بردبار نہیں ہوتا۔ یہ جو آپ کے ہاں روز فرقوں میں' آپس میں' ایک دوسرے کی سر پھٹول ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سہار اور برداشت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ان کے پاس اپنے دعویٰ کی دلیل اور ثبوت نہیں ہوتا' جھگڑا ہی ہوتا ہے۔ جس کے پاس محکم دلیل ہوتی ہے اس کے پاس بڑی برداشت اور سہار ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آخر الامر' بہر حال' میں نے ہی جیتنا ہے۔ اس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں وہاں پہنچا کے یہ کہا: قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (21:66)۔ مقام تاسف ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر انہیں اپنا معبود بناتے ہو۔ اس کے بعد جو اگلی بات ہے کہ پھر اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ نہیں بھئی! یہ بات یوں نہیں ''پکڑو اسے' جلاؤ اسے''۔ یہ اپنی پیشوائیت کو برقرار رکھنے کے لیے تھا' ان پجاریوں نے شکست تو وہاں کھائی ہوئی تھی۔ ان کا یہ سارا اکڑ اور کٹڑ پن ہی ختم ہو جاتا اگر وہاں وہ یہ کہتے کہ اس نے جو وہاں ہمیں کہا ہے' ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یہاں لاجواب ہونے کے باوجود انہیں پھر مشتعل کیا۔ یہ پیشوائیت ہے' یا وہ پیشہ ورانہ اصلیت ہے جس سے سر پھٹول اور دھول دھپا ہوتا ہے لیکن بہر حال بات یہ تھی جسے یہ دوسرا جھوٹ کہا جا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر تیسرا بہتان

تیسری بات وہ کہی جا رہی ہے جس کے متعلق قرآن سے انہیں اتنا بھی نہیں مل سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں تنکے بھی نہیں ملے کہ اس پہ ہاتھی گزار دیتے۔ یہ بہتان تو خالص تورات [1] کی بات پر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ ایک راستے میں' وہ کہتے ہیں' مصر کا ملک تھا' بادشاہ بڑا مستبد تھا' وہ دیکھتا تھا کسی کی کوئی خوبصورت بیوی ہوتی تھی' وہ اپنے ہیلپروں (Helpers) کو کہہ دیتا تھا کہ اِسے لے آؤ' اسے ہمارے محل میں داخل کر دو۔ ٹھیک ہے ایسا ہوتا ہوگا۔ ہاں تو تورات میں یوں ہے کہ آپ جا رہے تھے' آپ کے ساتھ آپ کی رفیقہ محترمہ تھی اور وہاں راستے میں اُس بادشاہ کا ایک (Helper) 'مددگار' کھڑا ہو گیا تو آپ سے پوچھا گیا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ آپ نے کہا: یہ میری بہن ہے اور اس کے بعد پھر اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے ان سے یہ کہہ دیا ہے' تم بھی یہ کہہ دینا' لیکن اس کے باوجود انہوں نے انہیں نہ چھوڑا' وہ انہیں بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں ان کی بہن ہوں' اس نے اس پر بھی نہ چھوڑا' دست درازی کی۔ دست درازی کی تو اس کو مرگی پڑ گئی۔ تو یہ ہے کہ وہ ہاتھ پتھر کا ہو گیا۔ پھر اس نے معافی وافی مانگی' پھر ہاتھ بڑھایا' پھر وہ ہاتھ پتھر کا ہو گیا یا پھر مرگی پڑی اور اس کے بعد جب ایسا ہی ہوا تو اس نے دہائی دی کہ یہ تو

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے تورات۔ پیدائش 20-12/10۔

عورت نہیں معاذ اللہ یہ تو کوئی بھوت ہے، پریت ہے، چڑیل ہے۔ اور پھر وہ قائل ہو گیا کہ نہیں، یہ تو کوئی بہت بڑے آدمی ہیں اور پھر اس نے اپنی لونڈی کنیز حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو خدمت کے لیے دی۔ تو یہ بات کہ انہوں نے اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ میری بہن ہے۔ یہ تیسرا جھوٹ ہے، جو سارا تورات میں ہے۔

تورات ❶ کی یہ باتیں ہمارے ہاں کیسے؟

اب یہ فطری طور پہ آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا ہو گا کہ یہ تورات کی باتیں تھیں۔ یہ اس طرح سے ہمارے ہاں کیسے آ گئیں۔ یہودیوں وغیرہ پر ان چیزوں کا جو اعتراض پڑتا تھا، وہ یہ تھا کہ تمہاری آسمانی کتابیں تو منحرف ہیں تم اپنے دین کو انہی کتب کی بنیاد پر سچا مانتے ہو، یہ کس طرح ہو سکتا ہے تو انہوں نے نہایت آسانی سے یہ ساری چیزیں آپ کے ہاں کی کتب روایات کے اندر داخل کر دیں۔

اب یہ جتنا قصہ میں نے اوپر بیان کیا ہے یہ سارے کا سارا بخاری شریف میں ہے۔ اور جب وہاں یہ بات آئی، تو وہاں سے آپ کی سب سے پہلی تفسیر آئی۔ یہ امام طبری کی تفسیر ہے اور وہاں سے جو آگے چلی تو آپ کی ساری تفسیریں آ گئیں۔ وہ تو نری ''غزلیں'' ہیں، انہی کے مصرعے پہ، دو غزلے سہ غزلے آئے، ہر تفسیر میں یہ سب کچھ اسی طرح سے لکھا گیا۔ یہاں پھر ذہن میں بات آئے گی کہ صاحب! امام بخاری بہرحال کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہوں، کتنا ہی انکا مقام کیوں نہ ہو، ایک انسان تھے۔ انہوں نے یہ کچھ روایات جمع کی ہیں اور پھر یہ چیز بھی دیکھتے ہیں کہ انہوں نے چھ لاکھ روایات میں سے پانچ لاکھ ترانوے ہزار تو خود ہی مسترد کر دی تھیں۔ اس میں سے اتنی سی باقی رکھ لیں تو اگر یہ ہو کہ وہ ایک انسان تھے جو کچھ انہیں ملا، اس میں سے بہرحال کسی معیار کے مطابق ان کو مسترد کیا۔ باقی رکھ لیں۔ اگر اس قسم کی کوئی اور قابلِ متروک روایات اس میں رہ گئی ہیں یا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے یہ رکھی ہی نہ ہوں، بعد میں ہی ایڈ کر دی گئی ہوں۔ اس زمانے میں چھاپہ خانہ تو ہوتا ہی نہیں تھا، یہ روایات لوگوں سے سن سن کے لوگ کتابیں مرتب کیا کرتے تھے یا نقل کیا کرتے تھے۔ چلیے، کچھ بھی الاؤنس دے دیجیے، اگر اس میں اس قسم کی ایک چیز ایسی رہ گئی ہے جو ''صدیقاً نبیاً'' (سچے نبی) کے خلاف جاتی ہے تو کہہ دیجیے کہ یہ امام

---

❶ اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تورات صرف اس کتاب کا نام نہیں جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام صحف کا جو حضرت موسیٰ اور ان کے بعد انبیائے بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ یہ مجموعہ 39 کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں علمائے یہود تین سلسلوں میں تقسیم کرتے ہیں: ۱۔ سلسلۂ اوّل تورات (یا قانون) اس میں 5 پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں جنہیں کتب موسیٰ کہا جاتا ہے: ۱۔ پیدائش ۲۔ خروج ۳۔ احبار ۴۔ گنتی ۵۔ استثنا۔ قرآن کریم میں تورات (یعنی عہد عتیق) کو کہیں بھی حضرت موسیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ ان کے صحف ہی کا ذکر آیا ہے۔ (53:36;78:19) ۲۔ سلسلۂ دوم نبیم: اس میں چھوٹی بڑی 22 کتابیں شامل ہیں اور ۳۔ سلسلۂ سوم: کبتیـــن اس میں 12 کتابیں شامل ہیں جن میں سے ایک زبور ہے۔ یہ کتابیں (جیسی کچھ بھی ہیں) آج موجود ہیں۔ لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آیا ہے جن کا وجود اس مجموعہ میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی کم از کم 11 کتابیں گنائی جا سکتی ہیں۔

بخاری کی بات صحیح نہیں ہے اس معیار پر یہ وہاں صحیح نہیں ہے۔

تفسیر والے مفسر بھی تو بہرحال انسان تھے۔انہوں نے بھی یہ چیز لے لی ہے چھوڑیئے۔لیکن آپ کو پتہ ہے کہ وہاں پہنچ کے کیا بات ہوتی ہے۔یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! وہ نازک ترین مقام جوان تمام چیزوں کواسی طرح سے آج تک رکھے ہوئے چلا آرہا ہے اوران کوچُھ نہیں کرنے دیتا۔اس لیے کہ وہاں اس روایت کوشروع کرنے سے پہلے یہ کہا جاتا ہے:''قال رسول اللہ ﷺ '' یعنی حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا۔اب جب کسی مسلمان سے یہ کہا جائے کہ رسول اللہ کا یہ ارشاد ہے تو کونسا مسلمان ہے جواس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کر جائے صاحب! کہ یہ غلط ہے۔''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' یہ ہے وہ سب سے بڑی تکنیک جس کی بناء پہ ان چیزوں کوآپ ٹچ نہیں کرسکتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن حکیم کا فرمان اور ہمارے ہاں کی روایات

اب آپ کی سمجھ میں بات آ گئی کہ ایک اتنے عظیم اولوالعزم نبی خاتم النبین ﷺ ہیں کہ جن کے بعد کسی اور نبی نے پھر خدا کی بات نہیں کہنی اورایک دوسرے خدا کے اولوالعزم پیغبر ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ دونوں وہ ہیں کہ جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان کی زندگی تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔قرآن نے دو ہی اسوہ حسنہ پیش کیے ہیں: حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اورحضور نبی اکرم ﷺ کی زندگی۔اب ان دو کے متعلق یہ چیز آ گئی کہ ایک نے تو تین دفعہ جھوٹ بولتا ہے معاذ اللہ اور دوسرا اولوالعزم پیغمبر اس کی تائید کررہا ہے خود بیان کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ بولے تھے۔حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19:41)۔وہ سچائی کا مجسمہ اورخدا کا نبی تھا۔ان غلط روایات کے پرستاروں کواس سے کیا کہ کہتا ہے تو کہتا رہے۔

سوچیے عزیزانِ من! بات کہاں تک پہنچتی ہے اور جو یہ کہہ دے کہ صاحب! یہ جو حدیث یا روایت ہے یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہوسکتی یا وہ یہ نہیں کہتا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی ہے اور میں اسے نہیں مانتا کون کمبخت یہ کہے۔وہ تو اس کے بعد مسلمان ہی نہیں رہ سکتا کیونکہ عزیزانِ من! مسلمان ہونے کی تو شرط ہی یہ ہے کہ رسالت پہ ایمان لایا جائے اوراگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ صاحب! میں رسول اللہ ﷺ کی یہ بات نہیں مانتا تو وہ مسلمان کیسے رہا۔دراصل وہ کہتا یہ ہے کہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ کی ہونہیں سکتی۔بس جونہی یہ کہا وہ منکرِ حدیث ہوا منکرِ شانِ رسالت ہوا یعنی یہ منکرشانِ رسالت ہے جو یہ کہتا ہے کہ حضور ﷺ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ بولا تھا اوراس کے برعکس یہ معترفِ شانِ رسالت جو کہیں کہ ایک نبی نے جھوٹ بولا دوسرے نبی نے اس کی تائید کی تو یہ کہنے والا منکرِ شانِ رسالت نہیں منکرِ حدیث نہیں ہمارے ہاں کے اہلحدیث حضرات کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کردیتا ہے۔ہوگیا دائرہ اسلام سے خارج کیونکہ وہ اس حدیث سے بھی انکار کررہا ہے جب کہ یہ تو بخاری شریف کی حدیث ہے۔

وضعی روایات کی تائید میں تاویلیں

اب آگے آئی تاویل کی بات۔ کہا یہ گیا ہے کہ صاحب! چونکہ دین کی خاطر آپ نے ایسا کہا تھا' اس لیے یہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ دین کی خاطر جھوٹ بولنا قابلِ اعتراض نہیں ہے' اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے' چلیے :

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

سچ کے لیے جھوٹ کے سہارے کا انجام

گویا آپ سچ کو جھوٹ کے سہاروں سے پیش کرتے ہیں۔ کتنے وقت تک وہ سہارا قائم رہ سکے گا جی! اور جب نیچے سے یہ جھوٹ کا سہارا نکلے گا تو سب کی سب عمارت اوپر سے' دھڑام سے' نیچے گر جائے گی یا نہیں؟ کہ جی نہیں چونکہ دین کی خاطر جھوٹ بولے گئے تھے' اس لیے یہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ اور وہی' اسی جگہ' دوسرے مقام پہ اسی بخاری شریف میں یہ بھی روایت ہے کہ قیامت میں یہ گناہگار شفاعت کے لیے مختلف انبیاء کرام کے پاس جائیں گے کہ آپ چل کے خدا کے حضور ہماری سفارش کیجیے۔ ایک روایت اور سن لیجیے۔ اور وہ یہ کہ ہر نبی یہ کہے گا کہ نہ صاحب! مجھ سے فلاں معصیت ہوگئی۔ مجھ سے فلاں گناہ ہوگیا' مجھ سے فلاں فلاں چیزیں سرزدگی ہوگئیں' میں تو شرمندہ ہوں۔ میں خدا کے سامنے کیسے جاؤں معاذ اللہ معاذ اللہ۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔ عصمت انبیاؑ جزو ایمان ہے۔ اور یہاں وہ حدیث موجود ہے کہ ہر نبی حضرتِ آدم علیہ السلام سے لے کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک گناہ کرتے ہیں اور اس کا ایک ایک معصیت نامہ گناتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہا کہ ''میں تو یہ کر بیٹھا'' اور دوسرا کہے: ''میں یہ کر بیٹھا'' اور وہ اتنے بڑے بڑے گناہ ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو خود خدا کے سامنے آنے سے شرماتے ہیں۔ ہم تمہاری سفارش کیسے کریں؟ اور آخر میں وہ پھر نبی اکرمؐ کے پاس تشریف لاتے ہیں اور آپؐ فرماتے ہیں: ہم چلے اور اس کے بعد پھر وہ بڑے خوش ہوتے ہیں کہ دیکھیے ہمارا نبی جی! ہمارا نبی! کیا کہنے ان کے! یہ وہ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا کہ کہو: **لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ** (2:285)۔ یہ سب انبیاء ایک ہی سلسلۂ رشد و ہدایت کی کڑیاں تھیں' اس لیے ہم ان سب کو خدا کے سچے رسول مانتے ہیں اور منصبِ رسالت کے اعتبار سے ایک دوسرے میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اور یہ تو ایمان کا جزو ہے۔ یہ انبیاء پر ایمان ہی نہیں بلکہ **لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ** (2:285)۔ ہم ان رسولوں میں کسی میں تفریق نہیں کرتے لیکن اس کے بعد ہم نے یہ نہیں سوچا کہ

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

خدا کے رسول اور ان کی یہ کیفیت کہ ہر ایک اپنی اپنی معصیت گناہ سے شرمسار بیٹھا ہے' خدا کے سامنے نہیں جا رہا۔ تو انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہمارے رسول ایسے تھے۔ بہر حال بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو دلیل دی گئی یا وجہِ جواز بتائی گئی کہ دین کی خاطر یہ جھوٹ

بولا تھا اور اسمیں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں پیش کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے کہ آپ چلیے تو وہ کہیں گے: نہیں صاحب! میں نے تو جھوٹ بولا تھا تو میں خدا کے سامنے کیسے جاؤں۔ چلیے' اگر دین کی خاطر جھوٹ بولنا قابلِ اعتراض نہیں تھا تو وہ شرمندہ کیوں بیٹھے ہوئے تھے وہاں' وہ شرمسار کیوں تھے؟ انہیں تو دھڑلے سے سامنے جانا چاہیے تھا کہ تیرے دین کی خاطر میں نے بت توڑے اور پھر جھوٹ بول بول کر بھی تیرا دین سچا ثابت کرتا رہا۔

برادرانِ عزیز! میں یہ کچھ نہیں کہہ سکتا

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں۔ میری تو ان چیزوں کے اندر عمر گزر گئی۔ ایک ایک چیز میں نے اس سینے کے ساتھ رکھی۔ لیکن عزیزانِ من! کچھ بھی کہہ لیجئے' قرآن کی عظمت' حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس مجھے تو اجازت نہیں دیتی کہ میں یہ چیزیں خدا اور خدا کے اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کروں یا ان میں سے کسی بھی انبیاء کی طرف منسوب کروں۔ جو جی میں آئے' آپ کہہ لیجیے۔ ٹھیک ہے چار دن کی بات ہے' عمر کا آخری حصہ ہے یہ آخری حصہ نہ بھی ہو تو بھی بہر حال ایک دن تو خدا کے سامنے جانا ہے۔ اب آپ کے دل میں اگلی بات یہ آئی کہ یہ سب کچھ یہ لوگ بھی تو سوچتے ہونگے بالآخر' پھر یہ سارا کچھ کیوں رکھا ہوا ہے؟ کیوں اس پہ اصرار کیا جاتا ہے کہ ہاں صاحب! یہ جھوٹ بولا؟

ان روایات کی آڑ میں مودودی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کا فتویٰ اور انبیاء کی سیرت

آج یہ کہا جاتا ہے کہ ''زندگی کی اہم ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں' واجب ہو جاتا ہے۔'' یہ ہے فتویٰ مودودی صاحب کا[1]۔ اور یہ انہی کا نہیں ہے' یہ ہمارے ہاں بڑی پرانی بات چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے تو آج اپنی سیاست کے لیے اسے دہرایا ہے۔ اگر پوچھا جائے تو صاحب! اتنی بڑی بات جو آپ کہتے ہیں کہ ''دین کی خاطر یا زندگی کی اہم ضروریات کی خاطر جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے'' تو اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا۔ اپنے اس جھوٹ کی خاطر تو انہیں کوئی دلیل مل جائے لیکن انہوں نے کچھ نہ سوچا کہ بات کہاں جا کے پڑ رہی ہے۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ خدا کہتا ہے: **اِنَّـهٗ كَـانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا** (19:41)۔ کہ وہ سچے نبی تھے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ بقول ان کے یہ بھی غلط ہے۔ اس نبی کے متعلق خدا ان کے صدیق ہونے کی شہادتیں دے رہا ہے' جو بقول ان کے خدا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم کے فرمان کے مطابق وہ اتنا اولوالعزم نبی ہے جس کی زندگی کو اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم انہیں صدیق کہتا ہے۔ ان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا اور حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تائید کر رہے ہیں کہ انہوں نے یہ جھوٹ بولا۔ آپؐ نے بھی ان کے کہنے کی تردید نہیں کی ہے' معاذ اللہ' کہ ابراہیم علیہ السلام نے بولا

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (1903-1978)

تھا' غلط ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ نہیں' انہوںؑ نے جھوٹ بولا تھا اور یہ نہ کہا کہ یہ سب کچھ غلط ہے۔ اب اس کے بعد ان کے اس کہنے میں کہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے' کوئی چیز وجہِ اعتراض نہ رہی۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ جو ان روایات کو سچا ماننے کے لیے اس قدر اصرار کیا جاتا ہے' اُس کی وجہَ جواز کیا ہے؟

ضرورت صرف قرآن حکیم کو معیار قرار دینے کی ہے

عزیزانِ من! اگر ان روایات کی آج بھی اس طرح سے' از سرِ نو' پرکھ ہو جائے' کہ جو روایات قرآنِ کریم کے معیار کے خلاف جاتی ہیں' ان کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد نہیں ہو سکتیں' تو آپ دیکھیں گے کہ یہ آپ کا اس قدر بگڑا ہوا مذہب پھر سنور کے اسلام کی شکل اختیار کر لے گا۔ پھر آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ بات تو بڑی صاف سی ہے۔ قرآنِ کریم کو معیار قرار نہیں دیتے؟ یہ اس لیے معیار نہیں اختیار کرتے کہ اس سے ان کا اپنا اپنا فرقہ باقی نہیں رہتا اور ان کے اپنے روزگار کی شکل ختم ہو جاتی ہے۔ ہر فرقہ کی بنیاد کسی نہ کسی روایت پر ہے جسے وہ حدیثِ رسول اللہ ﷺ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن کریم پیش کیجیے تو دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرآنِ کریم کی جو تفسیر رسول اللہ ﷺ نے فرمائی' اس سے بہتر تفسیر ہو نہیں سکتی' یہ آخری تفسیر ہے۔ یہ اتنا سا ایسا فقرہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ بات تو اگلی یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وہ تفسیر ہے کہاں؟ اس پر کہتے ہیں کہ یہ تفسیر انہی کتابوں میں ہے۔ قرآن کو یہ کہہ کر یوں الگ رکھ دیا گیا کہ وہ تو جتنا بھی تھا سمجھا گیا' حضور ﷺ نے سمجھا دیا اور اب وہ حدیثوں کے اندر آ گیا۔ اب ان روایات کی بناء پر یہ سارے فرقے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اب یہ اسلام کے فرقے نہیں ہیں' یہ تو موجودہ مسلمانوں کے فرقے ہیں۔ فرقے کے الگ ہونے کی' ان کے الگ مسلک کی' کوئی دلیل تو ان کے پاس ہونی چاہیئے' کوئی سند تو ہونی چاہیے۔

آج دلیل اور سند ہر فرقے کے پاس یہی روایات ہیں۔ اور اگر آج یہ معیار قائم کر دیا جائے کہ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں وہ صحیح ہیں' ورنہ وہ صحیح نہیں ہیں تو قرآن کے مطابق پہلا معیار تو یہ ہو جائے گا۔ قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا (4:82)۔ تو اس میں تمہیں بہت اختلاف ملتا۔ تو پھر دوسرا معیار یہ ہو جائے کہ اگر ان روایات کے اندر بھی ایک دوسرے میں اختلاف ہے تو پھر وہ بھی قرآن کے مطابق نہیں۔ اس طرح اس معیار کی بنیاد پر ان مختلف روایات کے اندر سے وہی روایت صحیح ہو سکے گی جو قرآن کے مطابق ہے اور وہ ایک ہی ہوگی' دو مختلف روایتیں یا حدیثیں تو قرآن کے مطابق نہیں ہو سکیں گی۔ بات سمجھ میں آئی آپ کے! لیکن یہ ہے وہ اختلاف جو روایات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ اس معیار پہ کیسے آ جائیں یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

دار العلوموں سے فارغ التحصیل طالب علموں کی حالتِ زار

محلے میں اچھی بھلی مسجد موجود ہوتی ہے۔ مسجد بھی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ وہ سارے محلے کے جتنے نمازی ہیں وہ ایک دو صفوں میں ہی

آ کے کھڑے ہوجاتے ہیں' باقی مسجد خالی ہوتی ہے۔ اِدھر سے اب آخری سال کا دارالعلوم کا فارغ التحصیل جو ہے وہ دستارِ فضیلت باندھے باہر چلا آ رہا ہے۔کوئی ہنر نہیں' کوئی کسب نہیں جس سے یہ روٹی کما لے۔عزیزانِ من! پوچھو' آپ کے ان نوجوانوں کے اوپر کتنا ظلم ہو رہا ہے'ان بیچاروں کی حالت پہ رحم آتا ہے۔ سات' آٹھ' نو' دس سال ان کی عمر کا جو بہترین حصہ ہے وہ ان مکتبوں' دارالعلوموں کے اندر صرف ہو جاتا ہے۔ ❶

کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے

مکتبوں اور دارالعلوموں سے دستارِ فضیلت لے کے وہ انہیں باہر بھیج دیتے ہیں۔کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے۔وہ بیچارہ باہر آتا ہے۔وہاں اِن مکتبوں اور دارالعلوموں میں تو پھر بھی مانگے تانگے' خیرات کی' دو وقت کی روٹی ہی سہی' مل تو جاتی تھی۔اس سے تو باہر نکال دیا جیسے وہ جیل خانے والا قیدی ہو جب پہلی شام باہر آتا ہے' تو وہ سوچتا ہے: یا اللہ! کہاں رہوں؟ کہاں رات کاٹوں؟ کہاں سے کھاؤں؟ وہاں تو آرام تھا! دو وقت کی روٹی دوسروں کے ذمے تھی' کپڑا بھی دیتے تھے' سونے کے لیے جگہ بھی موجود تھی۔باہر نکلتا ہے تو ان میں کوئی چیز بھی اس کے پاس نہیں ہوتی۔وہ اسی لیے گھر جانے کی بجائے راستے میں کہیں تالا توڑ لیتا ہے کہ ''اوتھے چنگاں ساں'' ❷ اس طرح سے عمر کا بہترین حصہ صرف کرنے کے بعد یہ بے چارا فارغ التحصیل باہر نکلتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کرے۔

مختلف مساجد میں نوکری کی تلاش

ہر مسجد کے اندر امام تو بیٹھا ہی ہے۔اب دو تو ہو نہیں سکتے۔انہوں نے گنجائشیں نکالی بھی تو زیادہ سے زیادہ امام کے علاوہ خطیب اور خادم اور مؤذن کی' اس سے زیادہ تو اب کسی اور کی گنجائش ہی نہیں' کہ ''جی اے صفاں لپیٹن والا اے' اے صفاں کھولن والا اے'' ❸ اور اس طرح دو اسامیاں اور مقرر کر لیں۔ اب یہ باہر کھڑا ہے کیا کیا جائے؟ وہ اگر حنفی دارالعلوم کا فارغ التحصیل ہے تو یہ اس محلے میں جائے گا جہاں اہلحدیث والوں کی مسجد ہو۔وہاں باہر کھڑا ہو کے نمازیوں سے پوچھے گا کہ کیسے نماز پڑھی تھی۔انہوں نے کہا کہ ایسے۔کہاں

---

❶ صدر پاکستان جناب پرویز مشرف صاحب نے دسمبر ۲۰۰۳ کے شروع میں تقریباً ۸۰ کے قریب علماء اور مشائخ سے جو خطاب کیا اس پر روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ دسمبر ۲۰۰۳ء کو جناب ارشاد احمد حقانی صاحب اپنے لکھے گئے کالم بعنوان ''مذہبی انتہا پسندی۔صدر مشرف کی تلقین'' میں تحریر کرتے ہیں کہ ''صدر مشرف کے دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق دینی مدارس میں اس وقت اٹھ لاکھ طالب علم زیر تعلیم ہیں۔'' چنانچہ اس سلسلہ میں حقانی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ان کی غالب اکثریت آئمہ اور خطباء مساجد کے فرائض ادا کرے گی۔لیکن اگر ان لوگوں کو ان کی کئی سالوں پر پھیلی ہوئی تعلیم کے نتیجے میں (انہیں) دین کے صحیح فہم سے آراستہ کر دیا جائے تو معاشرے سے مذہبی انتہا پسندی اور مسلکی شدت کم کرنے میں نمایاں مدد مل سکتی ہے۔(جنگ لاہور' 6 دسمبر 2003ء)

❷ میں تو وہیں بہتر تھا

❸ (طنزیہ کہا کہ) جی ہاں' ایک صفیں لپیٹنے والا ہے اور دوسرا بچھانے والا۔

ہاتھ باندھے تھے؟ انہوں نے کہا کہ جی! یہاں ہاتھ باندھے تھے۔ اللہ اکبر کہتے وقت ہاتھ اٹھائے تھے' آمین کیسے کہی تھی؟ اسی بات پہ لاحول ولاقوۃ کہے گا۔ چار پانچ حدیثیں بیان کر دے گا کہ یہ تو بالکل غلط ہے۔ یہ تو رسول اللہؐ کے مطابق نماز ہی نہیں ہے۔ تمہاری ساری نمازیں غارت ہوگئی ہیں جب کہ اولین پرسش نماز ہوگی۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ چلیے صاحب! مولوی صاحب کے پاس۔ وہ مولوی صاحب اِدھر سے حدیثیں بیان کرتا ہے اور یہ اُدھر سے بیان کررہے ہیں: دونوں اختلافی۔ وہ اپنے اس مسلک کی تائید میں' یہ اس کے خلاف نماز کی تائید میں۔ اس بحث و مباحثہ میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ہاں ہاں صاحب! بات یہ ٹھیک کہتا ہے' وہ پوچھتا یہ ہے کہ جب میں ٹھیک کہتا ہوں تو بتائیے اگلی نماز یہاں پڑھنے جاؤ گے۔ اب پچھلی تو گئیں وہ تو خیر اللہ میاں سے کچھ معافی وافی لے لیں گے۔ پتہ نہیں تھا' آج تو تمہیں پتہ چل گیا ہے۔ پتہ ہونے کے بعد اگر اسی قسم کی پڑھو گے' یہ جرم ہو جائے گا۔ ہاں صاحب! یہ تو جرم ہو گیا لہٰذا اب کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا: اب کیا کیا جائے' تو دیکھو تو سہی جگہ اِدھر اُدھر خالی پڑی ہوئی ہے خواہ وہ ہسپتال بنانے کے لیے کیوں نہ ہو۔ وہ جو آپ کے ہاں مارکیٹ میں مسجد ❶ بنی ہے' یہ گلبرگ میں ہسپتال بنانے کے لیے کسی غیر ملکی فرم کی جگہ تھی۔ سارے گلبرگ میں کوئی ہسپتال ہی نہیں ہے۔ ڈسپنسری بھی نہیں ہے جب کہ گلبرگ تھری میں جگہ تھی۔ کمیونٹی سنٹر کے لیے گورنمنٹ نے بہت بڑی جگہ دی تھی۔ بس جگہ خالی ہونی چاہیے پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے: دو لوٹے' تین اینٹیں' ایک صف' اللہ اکبر۔ یہاں حنفیوں کے مطابق نماز ہوگی صاحب! گنجائش نکل آئی اس کے لیے ایک نئی امامت کی۔ اور اگر دونوں روایات میں' دونوں قسم کی احادیث میں توافق ہو جائے یعنی اختلاف نہ رہے تو دو امام تو ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ الگ مسجد کا مسئلہ بھی ختم ہو گیا۔ مگر یہاں تو اب اس کے بعد ہر نئی مسجد جو آپ بنائیں گے' اس مسجد کی تعمیر کے لیے جو حصہ دے گا اسے جنت میں موتیوں کا گھر مل جائے گا۔ اب یہاں بفضل ایزدی' بہت سے اُمیدوار لگے پھرتے ہیں کہ یہاں تم نے بہت سے گھر بنا لیے تو وہاں ایک گھر خدا کا بھی ہونا چاہیے۔ روپیہ خواہ سمگلنگ سے آیا ہوا ہو' جو یہاں مسجد بنا دے گا تو اس کا جنت میں گھر بنے گا۔ اس میں یہ شرط نہیں ہے کہ روپیہ کس طرح کا آیا ہوا ہوگا۔ تو وہ اس میں بھی انتظار میں ہوتے ہیں۔ ہر نئی آواز کے اوپر وہ آجاتا ہے پھر' مسجد بنتی ہے' بڑی شان سے جائیداد کھڑی ہوتی ہیں۔ بہر حال یہاں گلبرگ مارکیٹ ❷ میں ایک مسجد نئی بن گئی صاحب۔ آپ نے دیکھا کہ کہاں سے بات چلی تھی۔ یہ' وہی جو روایات کا اختلاف ہے' اس کی بنیاد پہ یہ بنی ہے۔ یہ جو مسلمانوں کی تفریق ہے کہ ایک جماعت وہاں ہو رہی تھی اب یہ ایک کی دو ہو گئیں۔ یہ تفریقاً بین المؤمنین ہے۔

---

❶ گلبرگ 2 مارکیٹ' لاہور میں بننے والی مسجد کی طرف اشارہ ہے۔

❶ لاہور پاکستان

مسجد ضرار کی تعمیر اور قرآن

آپ کو پتہ ہے کہ ایک واقعہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں، مدینہ میں ہوا تھا۔ قرآن میں موجود ہے، سورۃ توبہ میں ہے۔ کیا واقعہ ہوا تھا؟ کچھ لوگوں نے مسجد بنانی شروع کی، مسجد عزیزانِ من! اور ابھی تو ان کے عقائد میں بھی اختلاف نہیں تھا، ویسے ہی تھے! نہوں نے نماز بھی کوئی الگ وضع نہیں کی تھی لیکن قرآنِ کریم کے نزدیک یہ اتنا بڑا سنگین جرم تھا کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو خود قرآن میں اتنی آیتیں نازل کرنا پڑیں: (9:107-110)۔ یہ کہا کہ یہ چیز جو بظاہر تمہیں مسجد نظر آتی ہے، مسجد نہیں، یہ کمیں گاہ ہے، جہاں چھپ کے، بیٹھ کے، وہ لوگ جو خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنا چاہتے تھے، یہاں سے تیراندازی کریں گے۔ کہا: یہ کفراً ہے۔

عزیزانِ من! مسلمان مسجد بنا رہے ہیں اور میں پھر عرض کر دوں کہ ابھی کوئی بات ایسی نہیں کہ جس میں یہ نظر آئے کہ انہوں نے کچھ مختلف عقیدے وضع کر لیے تھے، یا کوئی نئی قسم کی نماز ایجاد کر لی تھی۔ بالکل نہیں۔ مسجد بنا رہے ہیں۔ قرآن نے اس کو کفر کہا، کیوں کفر کہا؟ الفاظ سنیے اس لیے کہ یہ ہے: تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ (9:107)۔ یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے ہے۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے عزیزانِ من! تو یہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ جس قدر آپ کے ہاں تفریقاً بین المومنین کی صورت ہے، جسے فرقہ کہتے ہیں، آپ دیکھیں گے کہ اس کی علامت تو علیحدہ نماز پڑھنی ہوگئی، الگ مسجد بنانا ہے۔ اس علیحدگی کے لیے دلیل اور ثبوت کیا ہے؟ یہ ہے کہ وہ نماز جو ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے مطابق نہیں ہو رہی۔ کیسے پتہ چلا؟ یہ حدیثیں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح سے نہیں اس طرح سے نماز پڑھتے تھے، اور ہر فرقہ اس قسم کی اپنے پاس روایات رکھتا ہے، حدیثیں رکھتا ہے۔ اب اگر ان سے یہ کہا جائے کہ کیا یہ چیز تفرقہ مٹانے کی شکل ہے؟ جواب تکفیر کے فتوے کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ تو میں نے کہا تھا کہ قوم اس وقت تک مذہب پرست رہتی ہے جب تک اس میں دین نہیں آتا۔ مذہب تو ان تفرقوں کی اجازت دیتا ہے۔ کیا کہیں بھی ان میں اس بات کی کرک آتی ہے۔ قرآن میں الگ مسجد بنانے کو جو کفر کہا تھا تو وہ تفریقاً بین المؤمنین تھا؟ نہیں قطعاً نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے فرقہ بندے کے متعلق کہا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ٥ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (30:31-32)۔ کہ جنہوں نے دین میں فرقہ پیدا کیا وہ مشرک ہیں، ان جیسے نہ ہو جانا۔ کبھی ان کے ذہن میں یہ کرک نہیں آتی کہ ہم کیوں ایسا کرتے ہیں؟ قرآن ان کے لیے ایسا کچھ کہہ رہا ہے اس لیے کہ ان کو اپنے اس علیحدہ علیحدہ مسلک کے جواز اور تائید کے اندر علیحدہ علیحدہ روایات ملتی ہیں، جنہیں یہ احادیث کہتے ہیں۔ ایک اِن پہ جم کے کھڑا ہے دوسرا اِن پہ جم کے کھڑا ہے، تیسرا ان کے اوپر جم کے کھڑا ہے۔ یہ تھی وہ چیز جو میں کہہ رہا تھا، جو میں نے تفصیل سے آپ کے سامنے یہ بیان کی۔ ابراہیم کے متعلق قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ وہ سچائی کا مجسمہ اور خدا کا نبی تھا۔ یہ ہے ان کی حمایت میں اتنی بڑی قرآن کی سند! اب اس کے خلاف یہ چیز ہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا، تو سوال یہ ہے کہ آخر یہ اب تک کیوں چلا آ رہا ہے؟

یہ قرآن کے علی الرغم کیوں؟

یہ قصہ، علی الرغم قرآن کی اس آیت کے ہمارے ہاں روایات میں چلا آ رہا ہے۔ اور پھر میں تو کہتا ہوں کہ اگر یہ چیز نہ بھی ہو، Specifically یہ الفاظ نہ بھی کہے کہ جو نبی ہے، وہ سچا تھا۔ ہم تو نبی کی نبوت پہ ایمان ہی اس طرح لاتے ہیں کہ اِسے سچا تسلیم کریں۔ معاذ اللہ کیا نبی کو جھوٹ بولنے والا، تسلیم کرکے، اسے نبی تسلیم کیا جائے گا؟ یہ چیز کیوں چلی آ رہی ہے؟ کیونکہ آپ کے ہاں اس قسم کی روایات آ گئیں۔ بھئی! روایات سے تم انکار کرتے ہو کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں تو منکرِ حدیث ٹھہرائے جاتے ہو کیونکہ اس کو تو پہلے لکھ دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ جو پہلے لکھنے والے تھے، ان کے دل میں یہ خلش پیدا ہوئی ہوگی۔ خود ایک ہی حدیث کا جو مجموعہ ہے مثلاً بخاری کا[1]، اس میں بھی متضاد حدیثیں ہیں۔ تو انہوں نے تو گنجائش نکال لی۔ قال رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث شروع کی اور جہاں ختم کیا وہاں کہا کہ ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یعنی یا ''جیسا حضور نے فرمایا ہو۔'' تو یہ الفاظ جو ہیں کہ ''جیسا فرمایا ہو حضور نے''، تو یہ جو دوسرے اپنے ہاں کی حدیث مانتے ہیں یہ الفاظ ان کے متعلق کہتے ہیں یعنی یہ قال رسول اللہ ﷺ نہیں ہے بلکہ وہ جیسا فرمایا حضور ﷺ نے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک اس کے اوپر جما بیٹھا ہے جب کہ قران کہتا ہے کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پہ ہم چل رہے ہیں وہی حق وصداقت کی راہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ قرآن ہے کہ جب بھی آپ ان چیزوں کو شخصیتوں کی طرف منسوب کر دیں گے تو پھر اس کے بعد کیفیت یہ ہوگی کہ باہمی کتنی ہی اختلافی باتیں کیوں نہ ہوں، ہر پارٹی، ہر حزب، ہر فرقہ اپنی اپنی جگہ مگن اور مست ہوگا کہ ہم سچائی پہ ہیں اور یہ دوسرے جو ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔

آپ کے ہاں کی یہ ساری بحثیں اسی نکتے پہ کی جاتی ہیں۔ آپ فرقوں کے اندر الگ نمازوں ہی کی لے لیجیے۔ قرآنِ کریم اسی پہ آ رہا ہے کہ ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ جن احادیث کے مطابق ہم نماز پڑھتے ہیں، وہ سچی ہیں اور تم جن کے متعلق کہتے ہیں وہ وضعی ہیں یا کمزور ہیں یا ضعیف ہیں۔ كُلُّ حِزْبٍ (30:32)۔ یہ ہر فرقے کی نفسیات ہے۔ یہ ان کے متعلق یہ کہتے ہیں۔ معیار اگر خدا کی کتاب کو رکھ لیا جائے کہ س نے خود کہا ہے کہ اگر اختلافی بات یا اختلافات مٹانا چاہتے ہو تو مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآنِ کریم کیطرف آ جایا کرو۔ قرآن سے پوچھ لیا کرو کہ دو اختلافی باتوں میں سے کون سی صحیح یا سچی ہے۔ اور کونسی غلط یا باطل۔

---

[1] ان کا نام امام محمد اسمٰعیل بخاری ہے۔ یہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن وفات 258ھ ہے یا بعض کے نزدیک 260ھ ہے۔ یہ سمرقند کے قریب فوت ہوئے انہوں نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ ان میں سے مکررات حذف کرنے کے بعد 2762 اپنے مجموعے میں درج کیں۔ (پرویز، 1987۔ ص 200)

فرقوں کے مٹنے سے الگ الگ کاروبار ٹھپ ہو جائے گا

اس نے یہ کہا ہے کہ قرآن دو اختلافی باتوں کی بیک وقت تائید نہیں دے سکتا کیونکہ اس میں اختلاف ہے ہی نہیں لیکن یہ نہیں کیا جائے گا کہ جس سے اختلافات مٹ جائیں کیونکہ اگر اختلافات مٹ جائیں تو فرقے مٹ جائیں گے۔ فرقے مٹ جائیں گے تو یہ الگ الگ کاروبار باقی نہیں رہے گا۔ عزیزانِ من! میں پھر عرض کردوں کہ دین امتِ واحدہ بنانا چاہتا ہے۔ جس امت میں تفرقہ ہو جائے' وہاں دین نہیں رہتا' مذہب آ جاتا ہے۔ مذہب میں فرقے ہوتے ہیں' آپ دیکھیں گے کہ ان کی بنیاد روایات پر ہوتی ہے ہیں۔ ان کے متعلق انکارِ حدیث رسول اللہ کی بات آ جائے گی۔ انکارِ حدیث رسول اللہ ﷺ کی تو کسی کو بھی جرأت نہیں ہوسکتی۔ کوئی بھی مسلمان نہیں رہ سکتا جو یہ کرے۔ بات اتنی ہی ہے کہ جسے آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا تھا حالانکہ حضور ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا ہوگا' کیوں بھئی! اس لیے دلیل کیا ہے؟ اس لیے کہ یہ بات قرآن کے خلاف جاتی ہے' یہ حضرات اس پہ نہیں آتے' یہ ایسا کہنا کفر ہے اس پہ فتویٰ صادر ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ میں کیوں کسی کی نیت پہ شبہ کروں' ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی خلوصِ نیت سے ہی ایسا کرتا ہو لیکن آپ کے ہاں

Sincerity is not a guarantee for a truth

تمہارا Sincere ہونا تو صداقت کی دلیل نہیں ہے۔

بت پرستی میں ہندوؤں جیسا Sincere کون ہوگا

اپنی بت پرستی میں ہندوؤں جیسا Sincere اور کون ہوسکتا ہے؟ رتھ [1] کے نیچے اتنا اتنا۔ Rool bar ہوتا ہے' وہ صرف رتھ ہی نہیں ہوتی اُس کے نیچے آنے والے یہاں سے وہاں تک' جلوس کی طرح سے' لیٹے ہوئے ہوتے ہیں' وہ رتھ ان کی پسلیوں کے اوپر کڑک کڑک کرتی ہوئی چلتی ہے۔ توبہ' توبہ' تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ مگر یہ ہنستے ہوئے' خوشی بہ خوشی' اس کے نیچے لیٹتے ہیں' اس سے زیادہ خلوص اور کہاں ہوسکتا ہے۔ تو کیا اسے آپ صداقت کی دلیل مان لیں گے؟

صداقت کی دلیل کسی کا خلوص نہیں بلکہ خدا کی سند ہے

عزیزانِ من! صرف خلوص تو صداقت کی دلیل نہیں ہے۔ صداقت کی دلیل تو خدا کی سند ہے۔ تو میں یہ نہیں کہہ رہا' نیت کچھ بھی ہے اس کو وہ نیت بھی نظر آ جاتی ہے کہ جب وہ اپنے جھوٹ کے لیے ان چیزوں کو سند بنا کے پیش کر دیتا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو' عزیزانِ من!

---

[1] ایک قسم کی گاڑی جس کے اوپر بر جی سی بنی ہوتی ہے۔

یہ جو آپ کے ہاں کا تفرقہ ہے اس کی بنیادیں روایات ہیں اور اس سلسلہ میں آج میں نے آپ کے سامنے یہ چیز پیش کی کہ قرآنِ کریم نے کہا: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ (19:41)۔(اے رسول!) اب تو اس کتاب (قرآن) میں ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر۔ یہ کچھ کہنے کے بعد پہلے حضرت ابراہیم کا تعارف کرایا کہ وہ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ بڑا سچا نبی ہے اور وہ جو میں نے کہا تھا کہ خدائے علیم وخبیر نے شاید اسی لیے یہ کہا تھا کہ ہم نے بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کیا کیا منسوب کر دینا ہے۔

جہاں تک تورات کا تعلق ہے تو اس کے متعلق قرآن نے کہہ دیا کہ یہ محرف ہے۔ یہ تمام آسمانی کتابیں تحریف ہو چکی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کو نہیں ماننا۔ اب قرآن تو محرف نہیں ہے لیکن قرآن کے ماننے والوں نے بھی جو کچھ کرنا تھا اس کی پیش بندی قرآن نے کر دی تھی ۔لیکن افسوس کہ اس نے ہزار پیش بندی کی ہو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کو تو تم پڑھ لو کیونکہ ایک ایک حرف پہ دس دس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے۔ ثواب تو اس سے حاصل کر لو اور فرقہ بندی اپنی ان روایات کی رُو سے جاری رکھو۔ ان کی رُو سے جھوٹ بولو ان کی رو سے ہر قسم کا خلافِ دین خلافِ قرآن کام کرو مگر اپنی جگہ پہ انہیں رکھو۔ ان میں سے بقول ان کے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے ایک کا انکار بھی دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ تو یہ چیز تھی جس کی پیش بندی کے لیے انہیں صدیقًا نبیًا کہا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے ایک ''باغی'' کا قصہ چلا آ رہا تھا۔ کتنی جرأت تھی! اس کے بعد یہ دوسرا ''باغی'' ہے: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْــًٔا (19:42)۔ اس سرگزشت کا آغاز اس وقت سے کرو جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ تُو نے ایک ایسی چیز کی پرستش کیوں اختیار کر رکھی ہے جو نہ سن سکتی ہے نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیرے کسی کام آ سکتی ہے۔ گھر میں بیٹھا ہوا، باپ کی حیثیت ایک طرف رہی اتنی بڑی سلطنت کا سب سے بڑا پروہت، جس کے ایک اشارے کے اوپر گاؤں کا گاؤں تباہ کر دیا جائے اسی گھر میں بیٹھا ہوا بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے (اور یہ بات آگے چل کے آئے گی، وہ جو ماں باپ کی اطاعت فرض کہا جا رہا ہے) پوچھو تو جس کی زندگی کو آپ کے لیے اسوہ قرار دیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ گھر میں بیٹھا ہوا سب سے پہلے باپ سے کہہ رہا ہے: کیا کر رہا ہے! مت ماری گئی تیری۔ اور یہاں سے بات شروع ہوئی۔ پھر آگے جا کے آتا ہے کہ قوم پوری سے برملا کہہ رہا ہے۔ عزیزانِ من! کوئی چھوٹی بات نہیں بنی، کم درجے کے انقلابی نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اتنا بڑا انقلابی ہو کے تو بتائے، یعنی کسی دو چار دس کے خلاف نہیں، پوری کی پوری قوم کے خلاف اور اتنا ہی نہیں اس زمانے کی مذہب جیسی مستبد شخصیت قوم کا شہنشاہ یا بادشاہ اس کے سامنے بھی جا کے کھڑا ہو گیا، کیا پوچھتے ہو تم اس ہستی کے متعلق! تمہیں شرم نہیں آتی ہے جب کہتے ہو کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے تھے۔ یہ ہے وہ انقلابی جس کی زندگی اب ہمارے سامنے پیش ہو رہی ہے۔

نمرود جیسے ایک مستبد کے سامنے بھی جا کے وہ یہ چیز کہتا ہے۔ باپ سے گھر سے بات شروع ہوتی ہے اور پھر آخر تک چلی جاتی ہے اور

پھر اس کے لیے سب کچھ چھوڑتا چلا جاتا ہے' چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ یہ ہے اسوہ ابراہیمی علیہ السلام جو آپ کے لیے پیش کیا گیا ہے اور آپ نے اس اسوہ میں سے اتنی سی بات رکھ لی کہ جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ باقی اسوہ جتنا بھی ہے وہ ان کے لیے تھا جن کا وہ پیغمبر تھا معاذ اللہ۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ تعارفی بات ہی' میں سمجھتا ہوں کہ اتنی اہم تھی اور ضروری تھی جو میں نے عرض کر دی۔ دوبارہ پتہ نہیں اس کے لیے موقع ملے یا نہ ملے۔ ایک ہی آیت 41 پہ ہم آج رہے ہیں' اگلی آیتیں ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀......❀

پندرھواں باب: سورۃ مریم (آیت 42 تا 50)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ﴿42﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ
الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿43﴾ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ
عَصِيًّا ﴿44﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ﴿45﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ
آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ﴿46﴾ قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ
إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ﴿47﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي
شَقِيًّا ﴿48﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا
نَبِيًّا ﴿49﴾ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿50﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1976 کی 18 تاریخ ہے اور درس قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 42 سے ہو رہا ہے: (19:42)۔

انسانوں کی اپنی مطلب براری نے انبیا کی سیرت کو داغ دار کر رکھا ہے

آپ کو یاد ہوگا پچھلے درس میں اس سورۃ کی آیت 41 ہی ہمارے سامنے آئی تھی کیونکہ اس میں بڑی اہم بات تھی۔ قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا تھا کہ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ یقیناً وہ سچائی کا مجسمہ اور خدا کا نبی تھا۔ اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس کے خلاف ہمارے ہاں بدقسمتی سے کتبِ روایات میں ایسی باتیں آ گئی ہیں کہ جن میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا اور وہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے۔ یعنی ایک نبی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا اور دوسرا ایک عظیم نبی اس کی تائید یا تصدیق کر رہا ہے کہ واقعی انہوں نے جھوٹ بولا۔ تو میں نے پورا درس اس پہ لگا یا دیا تھا کہ یہ بڑا اہم سوال ہے اور آپ کے ہاں ہزار برس سے بطور مسلمہ یہ مانے ہوئے چلا آ رہا ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ بولا تھا۔ کھڑے ہو کر کوئی نہیں سوچتا کہ اگر خدا کا رسول بھی جھوٹ بولنے لگ جائے تو پھر ہم سچ کو اس آسمان کے نیچے کہاں تلاش کریں۔ یہی تو شخصیتیں ہیں جو سچ کا مجسمہ ہوتی ہیں اور وہ بھی اگر جھوٹ بولنے لگ جائیں تو سچ کہاں ملے گا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ سازش کے ماتحت یہ روایتیں اسلام میں داخل کی گئیں۔ اب یہ روایات خود اپنی مطلب براری اور اپنے جھوٹ کے جواز کے لیے بطور سند پیش کی جا رہی ہیں اور کوئی نہیں سوچتا کہ "تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے۔" خدا نبی بھیجنے والا' انبیاء کرام علیہم السلام' دنیا کو سچ کی تلقین کرنے والے' اور ان کے متعلق یہ عقائد! یا للعجب!! یہ سب آپ کے ہاں موجود ہیں اور پھر قیامت تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس کے خلاف آواز اٹھائے تو پھر اس کے متعلق ایک ڈونڈی پیٹی جاتی ہے کہ یہ منکرِ شانِ رسالت' منکرِ نبوت' منکرِ رسالت ہے۔ یعنی معاذ اللہ ان انبیاء کرام علیہم السلام کو جو جھوٹا کہنے والے ہیں وہ تو شانِ رسالت کی مؤید و معاون اور جو انہیں اِس سے بری الذمہ قرار دیتا ہے وہ منکرِ شانِ رسالت۔ سچ کہا تھا کہ:

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

پراپیگنڈہ کی مشینری کسی کے پاس ہونی چاہیے پھر پوچھیے نہیں کہ وہ کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ بہر حال میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا اور وہ بات سامنے آ گئی تھی۔ اب ہم آگے چلتے ہیں۔

انبیاء کرام کے علاوہ قرآن میں کئی ایک دوسری شخصیات کا ذکر قابلِ غور ہے

میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اسی سورۃ میں پہلے حضرتِ مریم علیہا السلام کا ذکر آتا ہے ان کے متعلق بھی جو تصور میں نے دیا تھا' وہ ایسا ہی آپ کو نظر آئے گا: بظاہر بالکل انوکھا سا' باقیوں سے ہٹتا ہوا لیکن وہ تو قرآن سے پوچھیے' آپ سوچیے تو سہی کہ اصل واقعات و کوائف کیا ہیں۔ پہلے تو یہ دیکھیں کہ قرآن کی پوزیشن کیا ہے؟ ایک صحیفہ جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا' قیامت تک کے لیے خدا کا حرفِ آخر۔ میں تو کہوں گا کہ اس کے اندر اگر کسی شخص کا نام بھی کسی صفت کے ساتھ' تعریف کے ساتھ' آ جاتا ہے تو اس سے زیادہ دنیا میں صاحبِ نصیب کوئی نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ وہ ایک لڑکی کا قصہ بیان کر رہا ہے۔ ایک جگہ نہیں بیان کر رہا' سورۃ الِ عمران میں آپ دیکھیے' تو آدھی سورۃ اس سے بھری ہوئی ہے۔ اسکے بعد ہمارے سامنے سورۃ مریم آ رہی ہے۔ سورۃ کا نام ہی ان کے نام سے ہے اور اس میں اس قصے کو دہرایا گیا اور اس کے بعد کہا یہ گیا ہے کہ **یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ** (3:41)۔ اے مریم! یقیناً اللہ تعالیٰ نے تجھے ہر قسم کی ہیکل کی زندگی کی آلودہ نگہی اور ہوس کارانہ فضا کی آمیزش سے پاک اور صاف رکھ کر ایک مقصد عظیم کے لیے منتخب کر لیا۔ کتنا بڑا مقام ہے جو ایک لڑکی کو دیا جا رہا ہے۔ **الصطفیٰ** کا یہ لفظ نبیوں کے متعلق آیا کرتا ہے۔ وہ نبیّہ تو نہیں تھیں لیکن اتنا بلند مقام کہ آپ سوچیے کہ اس بلندیٔ مقام کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ یہ ہے غور طلب کہ وہ کیا بات تھی جس کی وجہ سے اتنا عظیم' بلند مقام ایک لڑکی کو عطا کیا جاتا ہے اور میں نے یہ کہا تھا کہ خدا کے نزدیک بلندیٔ مقام تو یہی ہے کہ دنیا میں وہ ہستی کتنا عظیم انقلاب برپا کرتی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام عظیم انقلابی شخصیتیں ہوتی تھیں۔ یعنی آپ سوچیے کہ ایک نبی آتا ہے اور جتنا بھی اس کے دور کے غلط مسلمات ہوتے ہیں اور مسلمات بھی وہ جنہوں نے مذہبی عقائد کی شکل اختیار کر لی ہوتی ہے' تو وہ ان کے خلاف مجسمۂ بغاوت بن کے کھڑا ہوتا ہے:

ایک ایک عقیدہ' مسلک' مشرب اور نظریے کے خلاف۔ کتنی بڑی انقلابی چیز ہے کہ ساری دنیا ان کی مخالف ہوگئی۔ کیوں مخالف ہوگئی؟ جی! وہ بت پرستی کی مخالفت کرتے تھے۔ کہتے تھے: بت نہ پوجو۔ ارے! یہ کون سی ایسی بات تھی! وہ اتنی بات نہیں ہوتی' وہ تو مذہب کی سطح پہ سوچتے ہیں کہ مذہب اتنا ہی سکھاتا ہے: اس کی پوجا کرو' اس کی پرستش کرو۔ اس کے برعکس یہ تو انسانیت کے اندر ایک انقلاب برپا کرنے والی ہستیاں تھیں۔ ان بنیادی تصورات کو بدلنے والی کہ جن پر انسانیت کی عمارت اٹھتی ہے تو حضرتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے قصے تو قرآن نے بیان کیے اور ان سے الگ ہٹ کے یہ شخصیتیں ایسی ہیں کہ جنہوں نے اسی قسم کے انقلاب برپا کیے۔ ان کا تذکار جلیلہ بھی قرآن نے اسی شان وحشمت سے بیان کیا ہے۔

قرآن کی عظمت کی تو یہ کیفیت ہے کہ دربارِ فرعون میں ایک مردِ مومن ہے۔ وہ فرعون کی غلط کوشیوں کے خلاف صدائے احتجاج بن کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو قرآن کی Appreciation کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کی ساری تقریر اپنے اندر کوٹ (Quote) کر دیتا ہے' محفوظ کر دیتا ہے اور آج وہ ساری تقریر قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ [1] کتنا خوش بخت ہے وہ مردِ مومن!

قرآن کی نظر میں جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے کی قدر ومنزلت

سوچیے تو سہی قرآن یونہی تو نہیں ریوڑیاں بانٹ رہا۔ عزیزانِ من! یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے کہ قریباً دو رکوع پہ مشتمل اس مردِ مومن کی پوری تقریر قرآن اپنی دفتین میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔ کیا چیز تھی؟ فرعون [2] کو ذہن میں رکھیے جس کا نام استبداد اور تشدد کی ضرب المثل ہے۔ اور اس کے بعد صاحبِ ضربِ کلیم اور فرعون کی کشمکش کا وقت دیکھیے۔ اس کشمکش کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی کابینہ میں یا اپنی مجلسِ مشاورت میں یا نمائندگانِ مملکت کے ساتھ بیٹھا ہے' وہاں وہ یہ تجویزیں پیش کر رہا ہے کہ یہ جو اس قدر بغاوت کرنے والے جو وہ دو Robins [3] آ گئے ہیں ان کے خلاف کیا چارہ جوئی کی جائے؟ یہ ہے وہ جو وہاں تجویز پیش ہو رہی ہے۔ ایسے وقت میں وہیں کا ایک شخص اٹھتا ہے اور وہ اس بھرے مجمع میں' فرعون کے سامنے' ایسے نازک موقعہ پہ' فرعون کی ایک ایک چیز سناتا ہے کہ تم یہ غلطی کر رہے ہو' تم نے یہ زیادتی کی' تم نے یہ کچھ کیا اور اس کے برعکس وہ شخص جو اس طرح سے صداقت کی بات کرتا ہے' حق کی بات کرتا ہے' تمہارے فائدے کی کرتا ہے' ہمارے فائدے کی کرتا ہے' تم لوگ اس کے خلاف اٹھ بیٹھے ہو۔ بجائے اس کے کہ اس کا شکریہ ادا کرو' اس کی بات سنو' تم یہاں اس کے خلاف جمع ہو کر پروگرام بنانے بیٹھ گئے۔ اس مجلس میں فرعون کے سامنے وہ کھڑا ہو کے یہ باتیں کرتا ہے۔

---

[1] یہ تقریر کیا ہے؟ حرارتِ ایمانی کا زندہ مظاہرہ اور حقائق ومعارف کا ابلتا ہوا سرچشمہ ہے۔ یہ تقریر سورۃ المومن کے چوتھے اور پانچویں رکوع میں مسلسل دی گئی ہے۔ وہاں دیکھ لیں یعنی اسے (40:28-50) میں دیکھ لیں۔

[2] اس کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص۔ 109 فٹ نوٹ۔

[3] حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام

واقعی اس کا حق تھا کہ قرآن اس طرح سے اُسے، جسے دادِ تحسین کہتے، ہیں دیتا۔ قرآن نے اس کی پوری تقریر اپنے دامن میں محفوظ کر لی ہے اور سارا کچھ کہنے کے بعد اس کو پتہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اس کا آخری فقرہ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا: وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط (40:44)۔ اور اس کے بعد میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ کرو جو کچھ تم نے کرنا ہے۔ اللہ اکبر۔

قرآن جب کسی کا نام لیتا ہے اس کے متعلق کچھ چار لفظ بھی کہتا ہے تو عزیزانِ من! یہ وہ صداقتیں ہوتی ہیں جن کی بناء پر وہ یہ کچھ کہتا ہے۔ کسی تسبیح پھیرنے والے کی تسبیح کا ذکر قرآن میں نہیں ملتا۔ میں نے کہا ہے کہ اس نے انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام سے ہٹ کے اگر کسی اور شخص نے بھی یہ کچھ کیا ہے تو وہ اسے بھی اپنے دامن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ وہ تو دربارِ فرعون کے ساحرین کو بھی اپنے دامن میں سمیٹتا ہے خاص کر جب انہوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے رب کے ایمان کو قبول کیا ' اس کے متعلق قرآن دیکھیے کہ قرآن کس طرح سے اپنی بات میں لے آیا ہے۔ وہ بھی تو نبی نہیں تھے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی عظیم شخصیت

اسی طرح سے حضرتِ مریمؑ کا ذکر ہے جب کہ وہاں یہودیوں کی ایک مسلمہ شریعت کی عملاً حکومت تھی جن کے فیصلوں کے خلاف کہیں کوئی اپیل نہیں ہو سکتی تھی، حکومت ان کے معاملات میں Interfere نہیں کرتی تھی، وہ ان کے Final Authority تھے، ان کے خود ساختہ بنائے ہوئے قوانین جتنے بھی تھے وہ مسلمہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ حضرت مریم ان کے خلاف اٹھتی ہے زبانی تقریر نہیں کرتی بلکہ عملاً کھڑے ہو کر اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے اور یہ اس گھرانے کی وہ لڑکی تھی جو بڑا ہی مذہبی گھرانہ تھا جنہوں نے اپنی لڑکی کو ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ منذورہ [1] تھی۔ یہ ہیکل میں وقف کر کے رکھ دی گئی تھی۔ نن (Nun) ' راہبہ بننے کے لیے اسے دے دیا تھا۔ وہاں ہیکل میں اس کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ پوزیشن ہے۔ گھرانہ اس قسم کا ہے گاؤں سارے کا سارا یہودیوں کا ہے یہ علاقہ ہی سارا یہودیوں کا ہے کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اس قسم کا عملاً اقدام کرنے کے بعد وہ ان کے خلاف قدم رکھ سکے لیکن جب وہ جانتی ہے کہ انسانوں کی خود ساختہ شریعت کی ہر چیز غلط ہے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی ہے اور ہیکل چھوڑ کے چلی جاتی ہے۔ وہاں سے جانے کے بعد بھی یہ نہیں کہ کنارہ کش ہو جائے بلکہ وہ اس بغاوت کا عملی ثبوت پیش کرتی ہے۔ ایک تو یہ بات تھی یہ سلسلۂ کلام تھا جو پیچھے سے چلا آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ صاحب! قرآنِ کریم میں ربط نظر نہیں آتا۔ حضرتِ مریم علیہا السلام کا قصہ ہے چلو جی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اس کے بعد ہے۔ ان کو کون بتائے کہ اس کا باہمی ربط کیا ہے یہ تو وہ چیزیں ہیں جنہیں قرآن لوگوں کے سامنے لا رہا ہے۔ ان شخصیتوں کا اگلا حصہ اب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا آ گیا: دوسرے ایک رہبر کی سرگزشت آ گئی۔

---

[1] یہودیوں کا ایک مذہبی فرقہ۔

غلط نظریات کا عالمگیر انسانیت پر اثر

انسانوں کے بعض غلط نظریات بدقسمتی سے عالمگیر مسلمات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان میں ایک مسلمہ یہ بھی ہے کہ ''ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔'' یہ مسلمہ اس لیے گردانا جاتا ہے کیونکہ آپ کے دل میں بھی کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس پہ کھڑے ہو کے سوچنا چاہیے؟ اور اس کی عالمگیر حیثیت اس لیے ہے کہ یہ بات دنیا کے ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ ایسے عالمگیر مسلمہ کے خلاف اگر کوئی بات کہے یا عملاً اس کی مخالفت میں کوئی چیز کرے تو آپ کیا کہیں گے۔ اِس سلسلے میں قرآنِ کریم سب سے پہلے ہمارے سامنے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا یہ پہلو پیش کرتا ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ان کا باپ بھی کوئی عام دہقانی نہیں ہے جس کے ابرے میں یہ کہا جائے کہ بیٹا یونیورسٹی سے ایم اے کر گیا اور گھر جا کے باپ سے کہہ رہا ہے کہ آپ کو کیا پتہ' آپ نہ پڑھے' نہ لکھے' نہ کبھی دنیا دیکھی۔ ہم سے پوچھیے' باپ وہ ہے جس کا مقام اگر اس زمانے کے شہنشاہ کے برابر نہیں تو یقیناً اس سے دوسرے درجہ پر ہے اور عملاً تو ان کے ہاں کا' جسے آپ متولی (Mandatory) کہتے ہیں۔ یہی حاکم ہے۔ باپ کی یہ پوزیشن ہے کہ مملکت کا سب سے عظیم کوہ ہے۔ سوچیے اس کے گھر میں یہ لڑکا پیدا ہوتا ہے' اس کا وارث بننے والا ہے۔ اس باپ نے کس طرح سے اس کی تعلیم و تربیت اس انداز میں نہ کی ہوگی جس نے وراثت میں ان تصورات کو لینا تھا۔ یہ منصب' یہ مقام اور یہ کچھ یونہی نہیں۔ ہم نے تو ان کے باپ' آذر [1] کو محض بت تراش ہی سمجھا ہے۔ یہ بت تراش نہیں' ان کا تو مقام بہت بلند تھا۔ یہ اس زمانے کے ہامان تھے' [2] اور ہامان کا مقام تو ذرا داستانِ فرعون اور ضربِ کلیم میں دیکھیے کہ جہاں فرعون جب اپنی سیاست میں شکست کھاتا ہے تو وہاں وہ ہامان کو بلاتا ہے۔ کہتا ہے کہ میرے بس کی بات نہیں رہی' تم اس سے نمٹو۔ یہ ہے مقام معبد کے ان مہامنتریوں کا!

بیٹے کا باپ سے خطاب

عزیزانِ من! یہ آذر وہ باپ ہے کہ جس کے زیرِ سایہ یہاں اس بچے کی اس قسم کی تعلیم ہو رہی ہے۔ یوں کہیے کہ یہ اس کا ولی عہد ہے اور دوسری طرف دیکھیے کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟ قرآن ابتداء ہی سے اس بچے کا' اس صاحبزادے کا' اس کے بیٹے کا' تعارف یہ کہہ

---

[1] تورات کے بیان کے مطابق یہ سلسلہ یوں قائم ہوا تھا: حضرت نوح' سام' ارفکسد' سلح' عبر' فلج' رعو' سروج' نخو' تارح (آذر)' حضرت ابراہیم۔ حضرت ابراہیم کے والد کا خاندان کلدانیوں کے شہر اور میں آباد تھا۔ کلدانیوں (بابل) کا تمدن تاریخ کے اوراق پر ابھرے ہوئے حروف میں نظر آتا ہے۔ تورات میں حضرت ابراہیم کے زمانے میں عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے۔ جس میں شنعا (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل درج ہے۔ قیاس ہے کہ یہ بادشاہ وہی ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین بابل کی مینارہ پر کندہ ملے ہیں۔ اس قیاس کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عہد 220ق م قرار دیا جا سکتا ہے۔

[2] ہامان کی تفصیل کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص۔ 124 فٹ نوٹ۔

کرکراتا ہے کہ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ (19:42)۔اِس سرگزشت کا آغاز اُس وقت سے ہے کہ جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا: یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْــٴًـا (19:42)۔کہ اے ابو! تو نے ایک ایسی چیز کی پرستش کیوں اختیار کر رکھی ہے جو نہ سن سکتی ہے' نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیرے کسی کام آ سکتی ہے۔میں تو حیران ہوں کہ اتنی عقل وفکر کے مالک ہوتے ہوئے تم اس بت کے سامنے کہ جو نہ سن سکتا ہے' نہ بول سکتا ہے' نہ دیکھ سکتا ہے ارے! سر جھکائے بیٹھے رہتے ہو۔تم جیسا سننے والا' دیکھنے والا' بولنے والا' اس کے سامنے بیٹھا رہتا ہے جو نہ سن سکتا ہے' نہ دیکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ذرا تم دیکھو تو سہی کہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْــٴًـا (19:42)۔وہ بت تو تیرے کسی کام آ ہی نہیں سکتا۔وہ بت تو ہر بات میں تمہارا محتاج ہے۔اس پہ مکھی آ بیٹھے تو جب تک تم نہ ہٹاؤ تو وہ اپنی مکھی بھی نہیں ہٹا سکتا۔ارے! یہ اندھا' بہرا' گونگا' اتنا محتاج کہ اپنی کسی ضرورت کو آپ خود نہیں پورا کر سکتا' وہ تم پوری کرتے ہو۔اور اس کی ضرورت پورا کرنے کے بعد پھر اسی سے اپنی ساری مرادیں مانگتے ہو۔کیا بات ہے تمہاری! واہ! اس وقت تو ہمیں یہ نظر آیا کہ بڑی ہی معقول بات تھی لیکن سوچیے کہ کون کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے؟ اور اس مسلمہ کو کہ ''ماں باپ کی اطاعت فرض ہے'' اس نے توڑ کے رکھ دیا۔

والدین کی اطاعت کے سلسلے میں رام کا کارنامہ

ماں باپ کی اطاعت کی اہمیت کے بارے میں دور نہ جائیے۔اگر میں دوسرے مذاہب میں جاؤنگا تو آپ کو شاید بہت سی باتوں کا علم نہ ہوگا۔یہ ہمارے پڑوسی (انڈیا) میں تو آپ کو معلوم ہے کہ رام کو خدا سمجھا جاتا ہے۔''رام رام رام'' یہی وہ جپتے ہیں۔وہاں اِسے خدا مانا جاتا ہے' خدا کا اوتار مانا جاتا ہے۔اور یوں انہیں خدا بھی مانتے ہیں' اور خدا کا اوتار بھی مانتے ہیں' اُن کے ہاں رام کو Incarnated God مانا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ اس میں وہ کونسا کارنامہ ہے جس کی بناء پر اسے خدا تسلیم کیا جاتا ہے؟ عزیزانِ من! کارنامہ یہ ہے کہ وہ دسرتھ کی سلطنت کا ولی عہد تھا۔ قاعدے' قوانین' روایت کے مطابق بڑا بیٹا سلطنت کا مسلمہ ولی عہد ہوتا تھا' دسرتھ [1] نے جوان کیکئی سے شادی کر لی۔اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔اب اس سوتیلی ماں نے یہ چاہا کہ وہ سارے قاعدے قانون کے خلاف اس کے بیٹے کو ولی عہد بنا دیا جائے۔وہ چہیتی بیوی تھی۔وہ آخری بیوی زیادہ ہی چہیتی ہوتی ہے۔اور رامائن [2] کے بقول' اس نے ایک دن کسی اس عالم میں' جب کہ انسان کی Weakness نمایاں ہوتی ہیں' اُن سے کہہ دیا کہ آپ سے میں ایک قول لینا چاہتی ہوں۔کہیے' آپ بچن [3] دیتے ہیں؟

---

[1] اسے رامائن کی تفصیل کے مطابق مہاراجہ وشرتھ بھی کہتے ہیں۔ اِس کی تین رانیاں تھیں: کوشیلا' کیکئی اور سومترا۔ (پرویز' 1949۔ص 88)

[2] رامائن ہندوؤں کے ہاں ایک بڑی مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے۔یہ مختلف مصنفوں نے لکھی ہے۔۱۸ویں صدی عیسوی کے آخر پر رامائن کے قریب بیس مختلف نسخے فقط بنارس کے ایک کتب خانے (Library) میں موجود تھے جن میں سے ہر ایک میں واقعہ متعلقہ کی بابت بہت کچھ اختلاف پایا جاتا تھا۔ (پرویز' 1949۔ص 87)

[3] بچن کی اصل سنسکرت میں وچن ہے۔بچن ہندی لفظ ہے اس کے معنی عہد و پیمان ہیں۔

انہوں نے کہا کہ ہاں' دیتا ہوں' پورا کرونگا۔ اس نے کہا کہ رام کی جگہ میرے بیٹے کو ولی عہد بنایا جائے۔ اس اندیشہ کے پیش نظر کہ چونکہ رام بہت مقبول تھا' اور ویسے بھی رام کی جگہ اس کے بیٹے کا ولی عہد بننا قاعدے کے خلاف تھا' اس خطرے سے بچنے کے لیے اس نے کہا کہ رام کو بنباس ❶ دے دیا جائے' اس کو جنگلوں میں نکال دیا جائے تاکہ وہ یہاں کوئی سازش نہ کر سکے۔ میرے بیٹے کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ اب اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ وہ بچن دے چکا تھا۔ وعدہ کر چکا تھا' اور بچن کی کیفیت کے بارے تو میں پھر خود بعد میں رام نے جو چیز کہی تھی' میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ کس وقت اس نے یہ کیا چیز کہی تھی۔ اب اس کے بعد یہ باپ' اپنے بیٹے سے کہہ رہا ہے کہ بیٹا! میں پھنس گیا ہوں' میں بچن دے بیٹھا ہوں اور اس بچن دینے پر اُس نے یہ بات مجھ سے کہدی ہے۔ پھر بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے؟ اس نے کہا کہ باپو جی! جو بھی آپ کی ''آ گیا'' ❷ ہوگی' جو حکم آپ دیں گے' میرا فریضہ ہے کہ میں اس کی اطاعت کروں۔ آپ باپ ہیں' باپ کی اطاعت فریضہ ہے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے' میں آپ سے یہ بات کہونگا کہ آپ اپنے قول سے پھریئے گا نہیں۔ اس لیے کہ ریت یہی چلی آئی ہے ''پران ❸ جائے پر بچن نہ جائے۔'' ہماری خاندانی روایت بھی چلی آتی ہے۔ کیوں جی! روایت ہی ہے صرف! خاندانی روایت وہ چلی آتی ہے کہ بے شک جان چلی جائے لیکن بات جو کسی سے کہی ہے' وعدہ جو کسی سے کیا ہے' قول جو کسی کو دیا ہے' اس سے نہ پھرا جائے۔ آپ اس قول سے نہ پھریئے گا۔ اور مجھ پر تمہاری اطاعت فرض ہے کہ آپ باپ ہیں' ماں باپ کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اس لیے میں ملک وسلطنت چھوڑتا ہوں اور بنباس چلا جاتا ہوں۔ یہ ہے جی رام کی ساری زندگی کا وہ کارنامہ جس بناء پہ کہا کہ وہ انسان نہیں' وہ تو مجسم خدا تھا۔

''ماں باپ کی اطاعت فرض ہے'' کے تصور کی حقیقت

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ''ماں باپ کی اطاعت کی اہمیت'' اتنی بڑی پیدا کر دی گئی ہے کہ جس شخص نے ایسے وقت میں باپ کے اس قول کی اطاعت کی ہے جب کہ باپ کے نزدیک بھی وہ بات نامعقول ہے' بیٹے سے کہتے ہوئے' وہ بھی رو رہا ہے' بیٹے کے نزدیک بھی یہ کوئی معقول Reason پر مبنی بات نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ تم قول دے چکے ہو' بچن دے چکے ہو۔ دونوں جانتے ہیں کہ بات بڑی نامعقول ہے لیکن بیٹا اس بناء پر کہ ''باپ کی اطاعت فرض ہے'' اس بات کو تسلیم کرتا ہے اور بنباس چلا جاتا ہے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ مسلمہ صرف عالمگیر مسلمہ ہی نہیں' اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ ہندوؤں کا سارا مذہب رام کے سر پہ چلتا ہے اور رام کی

---

❶ دیس نکالا' جلاوطنی' جنگ میں جا کر رہنا۔ ❷ ہدایت' فرمان' اجازت حکم

❸ پران بمعنی' دم سانس جان۔ پران ہندوؤں کی مقدس کتابوں کو بھی کہتے ہیں۔ ہر ہمانند پران کی رو سے شروع میں وید کی طرح 'پران' بھی ایک ہی تھا۔ جسے دیاس جی نے ویدوں کی رو سے ترتیب کے بعد تصنیف کیا تھا۔ دیاس جی کے شاگردوں نے اس ایک سے چار پران مرتب کر لیے۔ اس کے بعد ان کی تعداد ۱۸ تک بڑھ گئی۔ ۱۸ سے ۳۶' پھر ۳۶ سے ۵۴ پھر ۶۰ تک پہنچی۔ پران اپنی موجودہ شکل میں سب ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

صرف یہ چیز ہے' اس کی اگلی زندگی میں تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ راون [1] بیوی کو چھین کے لے جاتا ہے' ہنومان [2] مدد کے لیے آتا ہے' چھڑا کے لاتا ہے۔ رام سے تو اتنا بھی نہیں ہوسکا کہ اپنی بیوی کو ہی چھڑا سکے۔ بہر حال میں کسی پہ تنقید نہیں کرنا چاہتا یہ ان کی بات ہے۔ میں صرف اس میں سے اتنا ٹکڑا رکھتا ہوں کہ وہ جو رام کی ساری جیون شتر [3] ہے' جو اس کی زندگی ہے' اس میں صرف یہ واقعہ ہے جس بناء پر اسے خدا بنایا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم کا کردار ابتدا سے ہی اطاعت کی بجائے اصول پر مبنی تھا

عزیزانِ من! مذہب یہ کچھ کہتا ہے۔ اِس کے برعکس دین کی کیفیت یہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کی ابتداء ہی یہاں سے کرتا ہے جہاں باپ کی اطاعت کا سوال ہے۔ وہ باپ سے کہتا ہے: **يَـٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِى عَنكَ شَيْـًٔا** (19:42)۔ کہ اے ابو! تو نے ایک ایسی چیز کی پرستش کیوں اختیار کر رکھی ہے جو نہ سن سکتی ہے نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کے یا تیرے کام آ سکتی ہے! اور ہم سے کہتا ہے کہ تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے۔ عزیزانِ من! رام کی زندگی میں نہیں' ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے اور تلقین ہمارے ہاں' وہ ہو رہی ہے جو رام کی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہی مسلمہ ہے۔

اولاد اور والدین کے لیے اطاعت کرنے اور کروانے کا ایک اپنا مقام ہے

اِس بدیہی مسلمے میں کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے دو باتیں وضاحت طلب ہیں: ایک تو یہ کہ جب تک بچہ خود فیصلہ کرنے کی عمر کو نہیں پہنچتا' اسے یقیناً ماں باپ کی ہدایت کے مطابق چلنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہنوز اپنے متعلق صحیح فیصلہ کرنے کی عمر کو نہیں پہنچا۔ اس کی حفاظت' اس کی بہبود' اس کے مفاد' ماں باپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں' یہ ابھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس دور میں' اس زمانے میں' تمہارے لیے سرکشی بے حد تخریب اور نقصان کا موجب ہوگی۔ یہ وہ اطاعت ہے جو ایک مریض ڈاکٹر کی کیا کرتا ہے۔ وہ اطاعت نہیں ہوتی' وہ اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے اور اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ تو یاد رکھیے' اس دور کے اندر ماں باپ ہی زیادہ Competent ہوتے ہیں کہ بچے کی صحیح نگہداشت کر سکیں۔ لہٰذا یہ جو میں نے کہا ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں ہے تو اسے سمجھیں' صحیح فیصلہ نہ کر سکنے کی عمر تک اِسے مانیں یعنی ماں باپ کی بات کو مانیں۔ یہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے بچے اس بات کو کان میں رکھ کر گھر نہ بھاگ جائیں اور جا کے امی ابو سے کہیں کہ بس بس ہم تمہاری کوئی بات نہیں مانیں گے کیونکہ آج ہم نے قرآنِ شریف کا

---

[1] لنکا یا سیلون کا بادشاہ جو سیتا جی کو لے گیا اور اس کے شوہر راجپندر ر جی کے لیے اپنی زندگی اور سلطنت کھو دی۔

[2] ہندوؤں کا ایک روایتی سردار جس نے سیتا جی (راجا رامچندر ر جی کی بیوی) کی بازیابی میں راجپندر ر جی کی مدد کی تھی۔ [3] کوائف حیات

درس سن لیا ہے۔ ''اونی گل ای لے لینی اے جیہڑی اپنے مطلب دی ہیگی اے۔'' ❶ یہ بات نہیں ہے۔ میں اپنے ان بچوں کو جو میرا کیسٹ سنیں گے اور اتفاق سے اُن بچوں کو جو اس وقت میرے سامنے بیٹھے' یہ درس سن رہے ہیں' آج اس درس میں کچھ زیادہ نہیں کہونگا سوائے اس کے کہ اس عمر کے اندر تمہیں ماں باپ ہی کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اسے یاد رکھیں کہ اس عمر کے اندر تمہیں اپنے ماں باپ کی ہی اطاعت کرنا چاہیے۔ اور دوسری یہ ہے کہ جب بچے اپنے فیصلہ کرنے کی عمر کو آ پہنچیں تو ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ وہ انہیں اپنی اطاعت کا حکم نہ دیں۔

اب یہاں مصیبت یہ ہوتی ہے کہ اِدھر ماں باپ کے ذہن میں یہ ہے کہ ہماری اطاعت تو فرض ہے۔ اب وہ مرتے دم تک یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیٹا' خواہ وہ پت پوتیوں والا بھی کیوں نہ ہو جائے' وہ چونکہ بیٹا ہے' یہ باپ ہے یا ماں ہے' اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ حکم ہمارا ہی چلے گا۔ اب وہ کہتے ہیں' خاص کر ماں کہتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے۔ کہ جی! یہ کیسے ہو؟ ''ماں دا حکم ہیگا اے' تے ماں دے پیراں تھلے جنت ہوندی ہیگی اے' میں پیرای نئیں چکنا تے تینوں تھلے آن ای نئیں دینا جنت اچ۔'' ❷ اب یہ اس عذاب سے اسی صورت میں چھوٹ سکتا ہے کہ اوپر سے یہ عذاب ٹل جائے۔ تو وہ یہی دعائیں مانگتا ہے کہ یا اللہ! ''اینہاں نوں چھیتی بلا اپنے کول''۔ ❸

بڑھاپے میں انسان کی ذہنی کیفیت

عزیزانِ من! جب مسلمہ یہ ہو کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے اور وہ اس میں جیت گئے ہیں تو اُن کے بیٹوں پہ تو اس کی اطاعت فرض ہو گئی حالانکہ انہی والدین کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ **وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِى الۡخَلۡقِ** (36:68)۔ کہ عام طور پہ عمر کے آخری حصے میں جا کر فرد کی قوتیں' قانونِ طبعی کے تحت مضمحل ہو جاتی ہیں' اس کی طبعی صلاحیتیں آگے بڑھنے کی بجائے اوندھی ہو جاتی ہیں بڑھاپے میں انسان کی مت ماری جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جو بڑھاپے کی اس عمر میں یہ کچھ بنے ہیں' انہیں یہ مرتبہ دینا کہ ان کے فیصلے اُن پر لاگو ہوں جو اپنی عمر کے اِس دورِ شباب میں' اپنی بڑھتی ہوئی عمر میں' صلاحیتوں کو لیے ہوئے' نئی زندگی کے تقاضوں کو لیے' تعلیم کو لیے اپنی بھرپور جوانی میں ذہنی اور فکری طور پر ان سے کہیں آگے ہیں۔ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کے احکام کی اطاعت کو فرض قرار دے دیا جائے جب کہ ان کے متعلق قرآن خود کہتا ہے کہ ان کی تو بسا اوقات عقل ہی ماری جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے: اُن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ پہلے علم ہوتا ہے ان کو تو وہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن اس چیز کی اطاعت فرض قرار دے گا۔

---

❶ یہ تو صرف اتنی ہی بات لے لینی ہے جو اپنے مطلب کی ہے اور بس۔ ❷ یہ ماں کا حکم ہے۔ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ میں پاؤں ہی نہیں اٹھاؤں گی تو تجھے جنت میں آنے ہی نہیں دوں گی۔ ❸ انہیں جلدی اپنے پاس بلا لے۔

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا ضروری ہے، اطاعت فرض نہیں ہے

قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ اطاعت فرض ہے۔ اگر کچھ ہے تو وہ یہ ہے کہ **وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا** (17:23)۔ تمہارا فرض ہے کہ والدین کی کمی کو پورا کرو کیونکہ اس عمر میں پہنچ کے ان میں بہت سی کمی آ جاتی ہے: کمانے کی کمی، صحت کی کمی۔ اُن میں ان چیزوں کی کمی آ جاتی ہے۔ اس لیے کہتا ہے کہ اس کمی کو تم پورا کرتے جایا کرو۔ وہ انہیں یہ کہتا ہے کہ ان کی اس کمی کو پورا کیا کرو۔ عزیزانِ من! احسان کے معنی ہیں: دوسرے کی کمی کو پورا کرنا۔

یہ کچھ ہے جو قرآنِ کریم والدین کے متعلق کہتا ہے۔ ٹھیک ہے حسنِ سلوک سے پیش آؤ، ان کی ہر قسم کی ضرورت پوری کرو، ان کی کمی پوری کرو۔ اور یہ بھی کہتا ہے کہ ان کو ڈانٹا ڈپٹا نہ کرو، ان سے نرمی سے گفتگو کیا کرو۔ ان بیچاروں کے بس کی بات نہیں ہے۔ انہیں جھڑکی نہ دیا کرو (17:23)۔ یعنی قرآن تو یہاں تک تاکید و تلقین کر رہا ہے اور ہمارے ہاں مسلمہ یہ ہے کہ والدین کی اطاعت فرض ہے اور اس فرض اطاعت کے غلط مفروضے کے ماتحت اس کے جو نتائج ہوتے ہیں، وہ مجھ سے پوچھیے وہ تیس سال کے نوجوان میرے پاس آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ماں کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دو اور وہ تو بیچاری، بڑی اطاعت شعار بیوی، رفیقہ حیات ہے۔ میرے اس سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ مگر ماں یہ کہتی ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بیابان ویرانے میں چھوڑ کر چلے جانے کی روایت

اگر میں آپ کو روایت کی بات میں لے آؤں گا تو ''ماں باپ کی اطاعت فرض ہے'' والی بات آگے چلی جائے گی کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام تو حضرتِ اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو یہاں وادیٔ غیر ذی زرع یعنی حجاز میں چھوڑ گئے تھے، بات پھر اور طرف چلی جائے گی، لمبی سے لمبی ہوتی چلی جائے گی۔ کیا کیا عرض کروں کہ کیا کیا ہماری روایات نے کیا ہوا ہے؟ ذرا سوچو تو سہی کہ آپ کے ہاں کی روایت یہ کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی کو جن کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور بچہ ابھی چھ مہینے کا چھوٹا سا ہی تھا، ایک ایسے بیابان ویرانے جنگل، صحرا میں چھوڑ گئے جہاں دور دور کوئی بستی نہیں تھی، جہاں کوئی انسان نہیں تھا، تنہا، اس ماں اور اس کے چھ ماہ کے بچے کو صرف اتنا سا مشکیزہ پانی کا دے کر چھوڑ گئے۔ سوچیے، آج اگر آپ کو کوئی یہ بات کہے کہ فلاں شخص نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ کیا تو آپ اس کے متعلق کیا کہیں گے۔ ہاں تو کہتے ہیں کہ وہ انہیں وہاں چھوڑ گئے اور چلے گئے۔

بیوی کی پریشانی اور خدا کا حکم

اب اگلی بات کے لیے، جنہوں نے یہ روایت وضع کی، ذہن میں یہ آیا ہوگا، کہ لوگ کہیں گے کہ یہ ابراہیمؑ نے کیا کیا؟ یعنی اگر کوئی شخص بھی ایسی بات کرے تو اس کے متعلق یہ ہوگا کہ صاحب! کس قسم کا یہ خاوند یا باپ تھا: جنگل میں تنہا، کوئی بستی قریب نہیں، کوئی انسان

قریب نہیں' ایک لڑکی یا عورت اور ایک چھ مہینے کے بچے کو بغیر Provision دیئے ہوئے' ایک پانی کے لوٹے کے ساتھ چھوڑ کے چلا گیا! توان روایت کے وضع کرنے والوں کے دل میں خیال آیا کہ اب کیا کریں تو آسان سی بات تھی۔ پیچھے سے بیوی نے کہا کہ آپ ہمیں اس حال میں' بے کس و بے بس' چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں۔ یہ کچھ کیسے کررہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ خدا کا حکم ہے اس لیے میں یہ کررہا ہوں۔ اس روایت والے نے گنجائش نکال لی۔ یعنی اس نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو تو بچالیا۔ اس خدا کے متعلق کیا کہا جو اس قسم کے حکم دیتا ہے۔

عزیزانِ من! انہیں اس سے کیا غرض کہ کس پہ کیا زد پڑ رہی ہے؟ انہیں تو زیبِ داستان کے لیے مسالہ چاہیے۔ خدا نے یہ حکم دیا ہے۔ بیوی صابرہ جو ہوئی' اس نے بھی یہ کہہ دیا کہ اچھا' جب خدا کا حکم ہے تو پھر مجھے ماننا پڑے گا۔ چلیے' وہ بھی خدا کا حکم پہنچا کے چل دیئے' اس نے بھی خدا کا حکم سمجھ کے مان لیا۔ یہ ہیں عزیزانِ من! جو ہمارے ہاں قصے ہیں۔ بہرحال' میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہ ماں باپ کا حکم فرض ہے کہاں تک جا پہنچا! یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بڑے ہوئے' منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے' یہ سب کچھ ہوا۔ میں یہ سب روایات بتا رہا ہوں اور قرآن یہ کہتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ حسنہ تمہارے لیے بطور نمونہ ہے' یہ اسوہ حسنہ ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی انہیں ملنے کو آجایا کرتے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے شادی بھی کرلی تھی۔ اپنے یہاں بس گئے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھار انہیں ملنے کے لیے آجاتے تھے۔

اپنی بہو کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لیے پیغام

عزیزانِ من! ایک دفعہ ہوا یہ کہ وہ انہیں ملنے کے لیے آئے تو بیٹا گھر میں نہیں تھا' بیوی تھی۔ انہوں نے بہرحال انہیں ''لسی پانی کا پوچھا' اے ہونا اے ناں۔''[1] جو کچھ بھی تھا وہاں سے جانے لگے تو کہنے لگے کہ بیٹا اسماعیل اس وقت گھر میں تو نہیں ہے۔ جب آئے تو اس سے کہہ دینا کہ تمہارا باپ آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ گھر کی دہلیز بدل دو۔ اس نے کہا کہ مجھے کچھ سمجھ میں بات نہیں آئی۔ اس نے کہا: وہ سمجھ جائے گا۔ تو آپ یہ کہہ کے چلے گئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو اس بیوی نے پیغام دیا کہ آپ کے ابا تشریف لائے تھے اور انہوں نے جاتے ہوئے یہ بات کہی تھی' میری تو سمجھ میں بات آئی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے: میں سمجھ گیا کہ کیا بات ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ کیا باتیں آپ سنتے ہیں اور کیا باتیں میں آپ کو بتاؤں! خیر' میں یہ کہہ رہا تھا کہ ابراہیمؑ کی کیفیت یہ بتا رہے ہیں کہ باپ کی حیثیت سے وہ اپنے بیٹے کے لیے اس عمر میں بھی یہ حق رکھتا ہے کہ اسے یہ کہہ کے چلا جائے۔ نہ بیٹے سے بات ہوئی' نہ گفتگو ہوئی' نہ کوئی باہمی گفت و شنید سے کسی نتیجہ پہ پہنچے' نہیں' بالکل نہیں بلکہ یہ کہہ کے چلے گئے کہ باپ کا بیٹے پر حق ہے کہ وہ یہ کچھ کہے اور بیٹا وہی کچھ کرے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ دیکھا باپ کا کتنا بڑا حق ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھول گئے کہ یہ تو وہ باپ ہے جس کی کیفیت بیٹے ہونے کی حیثیت سے یہ تھی کہ وہ اپنے باپ سے کہہ رہا تھا: **يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ** (19:42)۔

---

[1] تو انہوں نے کھانے پینے کا پوچھا۔ یہ ہوتا ہی ہے۔

کہ اے باپ! تو نے ایسی چیز کی پرستش کیوں اختیار کر رکھی ہے جو نہ سن سکتی ہے' نہ دیکھ سکتی ہے۔ جو بیٹا (حضرت ابراہیم علیہ السلام) اپنے باپ (آذر) سے یہ کہہ رہا ہے خود باپ بن کے اسے پتہ نہیں ہے کہ خدا کا حکم کیا ہوتا ہے۔

اطاعت صرف قرآن کی فرض ہے حتیٰ کہ کسی نبی کی بھی نہیں

عزیزانِ من! یاد رکھیے' قرآنِ کریم میں' جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' کہیں بھی ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اور اگلی بات سن لیجیے کہ قرآنِ کریم کی رو سے خدا کے سوا کسی کی بھی اطاعت نہیں ہے۔ یہ ماں باپ کی یوں فرض اطاعت آپ کہہ رہے ہیں' قرآن کریم تو نبی کا سب سے بڑا مقام رسالت بتاتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا بتاتا ہے۔ وہ جو آپ کے ہاں جسے آپ کلمہ شہادت کہتے ہیں کا ٹکڑا ہے: **عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ**۔ اُس ٹکڑے کی رو سے پہلے آپ کو اس رسول کے لیے عبدہ کہنا پڑتا ہے' جس کی رسالت پر ایمان لانے سے آپ مسلمان ہوتے ہیں۔ اس رسول کو پہلے عبدہ' خدا کا عبد' اس کا اطاعت گزار ماننا پڑتا ہے۔ تو اِس طرح یہ جو اطاعت ہے' یہ جو عبودیت ہے' وہ صرف خدا کی ہے۔ لہٰذا ماں باپ کی اطاعت کا سوال ہی نہیں اور پھر جو ماں باپ ہیں' وہ ٹھیک ہے' انہوں نے تو یہ مسلمہ قائم رکھنا ہی ہے کیونکہ اس میں انہیں بڑے Advantages حاصل ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرح ساری عمر' جہاں کوئی چیز معقول' نامعقول' منوانی ہو تو وہاں وہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ ''کس طرح اونہوں کیندے''[1] کہ یہ چیز غلط ہے۔ لہٰذا ٹھیک ہے' اب وہ ماں باپ اس مسلمے پر ایک ہو جاتے ہیں۔

دراصل یہ مسلمہ انسانی عقل وفکر کے لیے بوجھ ثابت ہوتا ہے

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ وہ دعا مانگتا ہوگا کہ یا اللہ! ان کو اٹھا لے۔ یہ میرے سر کے اوپر دو من کا بوجھ رکھا ہوا ہے۔ بات ہی کوئی مجھے اپنی عقل وفکر سے نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہو کہ ہمارے مرنے کے بعد تم چھوٹ جاؤ گے' آپ کے ہاں تو پھر اسلاف اور آباؤ اجداد کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی یہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ قرآنِ کریم قدم قدم پہ یہ بات کہتا ہے کہ جب ان سے یہ پوچھو کہ بھئی! یہ اس قسم کے کام تم کیوں کرتے ہو' اس قسم کے غلط راستے پہ کیوں جاتے ہو' تو وہ کہتا ہیں: **اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ** (43:22-23)۔ کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو بھی تو پایا ہے کہ وہ اسی راستے پہ چلے آ رہے تھے۔ ہم پہ بھی اس راستے پہ چلنا فرض ہے کیونکہ ان کی اطاعت فرض تھی: جیتے جی بھی ان کی اطاعت' مرنے کے بعد بھی انہی کے راستے پر اطاعت۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم

قرآنِ کریم بار بار اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے

---

[1] وہ انہیں کس طرح کہتے۔

(قرآن میں) نازل کیا ہے اُس کا اتباع کرو تو یہ نہیں ہیں کہ نہیں! ہم اُسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (2:170)۔ خواہ ان کے اسلاف نہ عقل وبصیرت رکھتے ہوں اور نہ ہی وحی کے صحیح راستے پر گامزن ہوں' پھر بھی انہی کے راستے پر چلتے رہیں گے۔ یہاں قرآن نے دو چیزیں کہی ہیں۔ ایک تو یہ چیز ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستے پہ نہ ہی چل رہے ہوں لَا يَهْتَدُوْنَ اور دوسری چیز یہ کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عقل وفکر سے بھی کام نہ لے رہے ہوں' (لَا يَعْقِلُوْنَ) تو تم عقل وفکر سے ہی کام لو۔ کیا بات قرآن نے کہی ہے: کم از کم اطاعتِ خدا کے لیے Reason کو تو Apply کرو۔ جب تک بچے اپنے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہونے کی عمر کو نہیں پہنچتے ہیں ماں باپ کی ہدایت کے مطابق کام کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ ان کے اپنے فائدے میں ہے۔ جب یہ اپنے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہو جائیں تو ماں باپ کو حق نہیں پہنچتا کہ انہیں اپنی اطاعت کے لیے کوئی حکم دیں' ہاں! مشورہ دے سکتے ہیں۔ اور ان پہ بھی یہ فریضۂ خداوندی عائد نہیں کیا ہوا کہ اگر وہ on merit سمجھتے ہیں کہ یہ فیصلہ میرے لیے اچھا نہیں ہے' تو اسے ضرور مانیں کیونکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔

پہلی چیز جو اسوۂ ابراہیم علیہ السلام کی ہمارے سامنے آتی ہے' جسے قرآنِ کریم نے ہمارے لیے کہا ہے' وہ یہ ہے: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4)۔ تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے رفقاء کا طرزِ عمل نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ میں پھر عرض کروں کہ اسوہ کے لیے تو قرآنِ کریم کے مطابق دو ہی شخصیتیں ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم میں صراحت سے کیا ہے۔ ایک حضرتِ ابراہیم علیہ السلام (60:4) اور دوسرے حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (33:21)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تو ماں باپ کا سلسلہ ہی نہیں تھا۔ آپ کے والدِ محترم کا انتقال تو پیدائش سے بھی قبل ہو گیا تھا۔ آپ چھوٹے سے ہی تھے کہ کوئی چھ سال کی عمر میں کہ والدہ محترمہ بھی انتقال کر گئیں۔ یہ بات تو نہیں آئی لیکن باپ کے بعد چچا تھا۔ اُس کی پوزیشن باپ کے بعد اتنی بڑی ہو جاتی ہے اور اس حقیقی چچا کا قرآن میں جو ذکر آیا ہے' باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار ایک یہی تو تھا جس کا ذکر آیا ہے: تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ [1] (111.1)۔ اور ساتھ وَامْرَاَتُهٗ [2] (111.4)۔ چاچا اور چاچی دونوں کے متعلق قرآنِ کریم میں یہ آیا ہے۔ عزیزانِ من کہ:

در یں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

کسی کا باپ ہونا' کسی کا بیٹا ہونا' کسی کا بھائی ہونا کسی کا بیٹی ہونا' دین کے راستے میں یہ رشتے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ بس یہ ٹھیک ہے کہ یہ معاشرے کے حسنِ آداب ہوتے ہیں' حسنِ سلوک ہوتا ہے' یہ رشتہ داروں سے سلوک کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے قرآن نے کہا کہ (ضعیف) ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آ ؤ' نیز اپنے رشتہ داروں سے بھی۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى (2.83)۔

---

[1] ابولہب اس نظامِ خداوندی کے مقابلہ سے عاجز آ گیا اور بری طرح تباہ ہو گیا۔

[2] اور اُس کے ساتھ ہی اس کی بیوی بھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ کے ساتھ ان کے معبودوں کی بابت گفتگو

قرآن ان کے ساتھ احسان ہی احسان کرنے کا کہتا ہے۔ اطاعتیں تو کسی کی قرار نہیں دیتا۔ عزیزانِ من! قرآن کریم میں یٰابت [1] (9.44) سے بات چلی آ رہی ہے۔ بیٹھے ہوئے ہیں' بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے۔ پہلی بات یہ آ گئی۔ بیٹا باپ سے کس چیز کے متعلق کہہ رہا ہے؟ باپ کے معبود کے متعلق بات کر رہا ہے۔ اللہ اکبر! انسان کے عقیدے کے مطابق سب سے کمزور پہلو' Weak Point' اس کا معبود ہوتا ہے اور معبود بھی وہ جو محسوس معبود ہوں۔ ان کے اندر بڑی نزاکت ہوتی ہے۔ یعنی آپ کے خدا کے متعلق' یہاں چورا ہے میں کھڑا ہوا ایک مستبد جو جی میں آئے کہتا رہے' آپ کبھی اِسے Serious نہیں لیتے۔ کسی کے بت کے متعلق ذرا انگلی اٹھا کے دیکھیے' آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ آج یہ جو روز ہندوستان میں ہندو مسلمان فسادات ہوتے ہیں' ان میں یہی چیز ہوتی تھی اور یہ وہی چیز تو ہے جو چلی آ رہی ہے۔

ہندوستان میں پیپل دیوتا کے درخت پر فسادات

آپ تو بت کہہ رہے ہیں' ہم نے وہ فسادات دیکھے ہیں: شیعوں کا تَعْزِیَے کا جلوس آ رہا تھا' راستے میں پیپل کا درخت تھا۔ ان کے ہاں پیپل دیوتا ہوتا ہے۔ فساد شروع ہو گیا۔ پھر بات میں سے بات یاد آ گئی۔ قرآن نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر کائنات میں دو الٰہ ہوں' دو خدا ہوں تو پوچھیے نہیں کیا فساد ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21.22)۔ اگر کائنات میں خدا کے علاوہ اور الٰہ بھی ہوں۔ یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے تو کائنات کا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔

دیوتے کو پانی پلایا جا رہا ہے

ان کے ہاں پیپل کا درخت دیوتا ہوتا ہے۔ مارواڑی میں پیپل کا پیڑ لگایا اور پھر اس کے لیے ایک مالی مقرر کیا کہ وہ اس کی حفاظت کرے' اسے پانی دے' ہاں! دیوتا جو تھا یعنی دیوتے کو پال پوس رہے ہیں۔ ''پرستارتری مہاراج''[2] بہر حال' مالی رکھا' وہ اسے روز بڑھتا پھولتا دیکھتے تھے۔ بڑے خوش ہوتے تھے۔ ایک دن آ کے دیکھا کہ اس پیپل کے پودے کے پتے وغیرہ اڑ کر سب ختم ہو گئے' ٹنڈ منڈ کھڑا رہ گیا۔ اس مالک کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے مالی سے کہا: او کیا ہوا؟ تم کہاں تھے؟ کہاں غرق ہو گئے ہو؟ یہ کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا: ''جی! میں یہیں تھا۔'' یہیں تھے تو تمہارے سامنے یہ کیا ہوا؟ کہنے لگے: جی! اُدھر سے وہ سانڈ آیا تھا' اس نے آ کے منہ مارا اور ایک ہی لقمے میں وہ سارا لے گیا۔ کہنے لگا: ''اوئے تجھ سے ہٹایا نہ گیا۔''

---

[1] اے ابو! [2] اے مہاراج! تیری ہی پوجا باٹ ہے۔

دو دیوتاؤں میں لڑائی

کہنے لگا: ''مہاراج! پیپل بھی دیوتا ہے' ساند بھی دیوتا ہے۔ دو دیوتے آپس میں لڑ رہے تھے۔ ''میں کی پچھاں کرسکدا سی۔'' (1) سنا' قرآن نے کیا کہا کہ اگر کائنات میں کہیں الٰہین (16.51) ہوں' دو خدا ہوں' دو دیوتے ہوں' تو پوچھو نہیں کیا ہو۔ یہ وہی تھا جو کچھ پیپل دیوتا اور مانڈ دیوتا میں ہوا۔

پیپل کی ٹہنی اور تَعزِیے کا جلوس

بہر حال' آگے بڑھیے۔ وہاں تَعزِیّے کا جلوس آ رہا تھا۔ راستے میں پیپل کے درخت کی ٹہنی نیچے تھی۔ اب یہاں' اس ٹہنی کے نیچے سے یہ جلوس گزر نہیں سکتا تھا۔ ہمارے ہاں تَعزِیّے بہت بڑے بڑے بنا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ آپ میں سے کوئی تذکرہ نگار ہو تو وہ اس کا شاہد ہے کہ یہ بٹالے کا ذکر ہے اور وہاں یہ ماتم بہت دھوم دھام سے ہوا کرتا تھا۔ (ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ جو میرے سامنے بیٹھے ہیں' وہاں ہمارے ہاں دینہ نگر میں' یہ مرثیے پڑھا کرتے تھے۔ میں نے مرثیے بھی پڑھے' پیر بھی رہا' پیادہ بھی رہا اور پھر خدا کے خلاف قوالیاں بھی بیٹھ کر سنیں اور عزیز سا خلیفہ بھی رہا تو میں بھی کونسا اِس فعل سے بَرِیٔ تھا۔ ''اسی ایہہ مرثیے پڑھدے ہوندے سی' دووِیں اکو جئے ساں۔'' (2) ایک میں اور دوسرے یہ میرے سامنے بیٹھنے والے یہ حفیظ جالندھری صاحب۔ (3)

شریفِ مکہ رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانہ کا

عزیزانِ من! ایک عمر' اس تَعزِیَۂ تذکری میں بھی گزری ہوئی ہے' اسی لیے میں کہا کرتا ہوں:

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

برادرانِ عزیز! میں سنی ہوئی باتیں نہیں کرتا۔ پیر بھی رہا ہوں۔ مالی بھی رہا ہوں۔ یہ کچھ بھی کیا ہے' تو خیر۔ وہ تعزیہ گزر رہا تھا۔ پیپل کی شاخ کی وجہ سے' وہ تعزیہ وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ پیپل اتنا جھکا ہوا تھا۔ کھڑے ہو گئے اور ڈٹ گئے: یہ کہیں کہ پیپل کی اتنی سی شاخ کاٹ لی جائے تو تعزیہ گزر سکتا ہے' ہندو کھڑے ہیں کہ صاحب! آپ اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتے' یہ تو ہمارا دیوتا ہے۔ اتنی اتنی سی چیزوں پر

---

(1) میں کس کے لیے کس کی حمایت کرسکتا تھا! کسی کی بھی نہیں

(2) ہم یہ مرثیے پڑھتے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی جیسے تھے۔

(3) ابوالاثر حفیظ جالندھری (1900-1982) ''شاہنامۂ اسلام'' کے مصنف اور ''قومی ترانہ پاکستان'' کے خالق ہیں۔

تمنا ہے اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمت اسلام کر جاؤں

وہاں اتنے اتنے بڑے فساد ہوتے تھے۔ یعنی ایک طرف یہ ہے کہ پیپل کی ٹہنی بچ جائے اور دوسری طرف یہ کہ تعزیہ کا جو کنارا ہے اس کو یوں نہ کرنا، بیشک بیسیوں افراد اِدھر سے قتل ہو جائیں اور بیسیوں اُدھر سے قتل ہو جائیں۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ یہ جو محسوس خدا یعنی بت ہوتا ہے، اس کے لیے بڑا ہی نازک جذبہ ہوتا ہے۔

پیر کی قبر کے تبرک واحترام کا تو مجھے آج تک یاد رہے

اور پھر یہ جو خدا کے ساتھ شاعر مستیاں کرتا ہے وہ تو پوچھو ہی نہیں کہ کیا کیفیت ہوتی ہے۔ خدا تو بیچارہ ''غریب کی جورو، سب کی بھابھی'' کے مصداق ہے۔ جو جی میں آئے اس سے کہتا چلا جائے۔ ان کے کسی پیر کی قبر کے پتھر کے خلاف کچھ کہہ کے دیکھیں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ خدا کے خلاف جو قوالیاں تھیں، وہ بیٹھ کے سنیں۔ کیا بات تھی! آپ کہیں گے کہ یہ بیچ میں اپنی باتیں لے آتا ہے۔ اپنی کرنی پڑتی ہیں۔ ختمِ تبرک بٹ رہا تھا۔ میں کچھ بہت عزیز سا ہی ایک خلیفہ تھا یا پیادہ تھا۔ مجھے کبھی زیادہ زور سے ڈانٹ بھی نہیں پڑی تھی۔ کتنا پیارا قسم کا یہ تبرک بٹ رہا تھا! میں نے بھی اسی طرح سے ایک ہاتھ کیا۔ ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ ایک تھپڑ اسی وقت منہ پر آیا۔ اس کی سنسناہٹ اب تک یاد ہے۔ کچھ سمجھ میں بات نہ آئی۔ میں نے پوچھا۔ کہنے لگے: اس تبرک کو لینے کے لیے تم نے ایک ہاتھ یوں کیا ہے: کیا دعا کے لیے ایک ہاتھ کھڑا کیا کرتے ہیں یا دونوں ہاتھ کھڑے کیا کرتے ہیں؟ خدا سے مانگنے میں یہ دونوں ہاتھ کھڑے کرتے ہو، اور یہ جو تمہیں مل رہا ہے، اس کے لیے تم ایک ہاتھ کر رہے ہو، گستاخ کہیں کے! ایک ہاتھ سے تبرک حلوہ یا مٹھائی؟ اس کے لیے ایک ہاتھ کیوں؟ دو ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ہیں اور تبرک کے لیے بھی یہ کیفیت ہوتی ہے عزیزانِ من! یہ محسوس خداؤں کی عظمت کی کیفیت ہے۔ یہ اس محفل کا ذکر ہے جس محفل میں قوال خدا کے خلاف دس دس باتیں کر رہے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جرات اور حق گوئی و بیبا کی

یہ ابراہیم علیہ السلام باپ کے محسوس خدا کے متعلق یہ کہتے ہیں: اندھا ہے، بہرا گونگا ہے، اپنی ہر ضرورت کے لیے تمہارا محتاج ہے اور تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہو: يَآبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (19:43)۔ اے میرے باپ! حقیقت یہ ہے کہ مجھے علم کی ایک ایسی روشنی مل گئی ہے جس سے تو محروم ہے۔ لہٰذا (تو اس خیال کو چھوڑ دے کہ بیٹے کو باپ کے پیچھے چلنا چاہیے، باپ کو بیٹے کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے۔ باپ ہو یا بیٹا، ہر ایک کو صداقت کے پیچھے چلنا چاہیے اور چونکہ میں حق وصداقت پر ہوں اس لیے) تمہیں میرا اتباع کرنا چاہیے۔ میں تمہیں زندگی کی وہ راہ دکھا دوں گا جو تمہیں سیدھی منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ قرآنِ کریم جس انداز سے بیان کرتا ہے اس کے درمیان کی کڑیاں ایمائیت پہ چھوڑتا چلا جاتا ہے، باپ نے یہی کہا ہوگا کہ تم میرے سامنے ابھی کل کے بچے ہو، یہ باتیں کر رہے ہو، مجھے یہ کچھ کہتے ہو۔ کہا کہ ابا جان! یہاں سوال عمر کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ

قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ (19:43)۔ میرے پاس اس کے لیے علم اور دلیل ہے بلکہ العلم ہے۔ اگر ہے تو پھر وحی کہہ لو میں دلیل اور علم کی بنیاد پہ یہ بات کررہا ہوں۔ عمر کا سوال نہیں ہے کہ آپ یہ کہہ کے مجھے خاموش کررہے ہیں کہ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میں نے تمہیں جنا ہے یا تم نے مجھے جنا ہے؟ سوچو تو سہی' ابا جان! بات یہ نہیں ہے۔

اب اگلی بات یہ تھی کہ میں باپ ہوں۔ باپ کی حیثیت سے تمہیں میری اطاعت کرنی چاہیے' میری اتباع کرنی چاہیے۔ کہا: فَاتَّبِعْنِیْٓ (19:43) تمہیں چاہیے کہ میرا اتباع کرو۔ بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے: تمہیں چاہیے کہ میرا اتباع کرو۔ ارے! کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں تمہارا اتباع کروں؟ کہا: اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (19:43)۔ ہاں' کیونکہ میں تمہیں خدا کے ہموار راستے پر لے چلوں گا' میرے پیچھے آؤ۔ یہ ہے عزیزانِ من۔ قرآن کی تعلیم! یہ ہے اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام کہ تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اسوہ ہے۔ یہاں سے بات شروع ہوتی ہے فَاتَّبِعْنِیْٓ (19:43)۔ تم مجھے کہتے ہو کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے' میرے راستے پہ چلو یہ غلط ہے۔ تم میرے راستے پہ چلو۔ اس لیے کہ مجھے علم دیا گیا ہے اور میں صِرَاطًا سَوِيًّا ❶ (19:43) کی طرف لے جاؤنگا۔ پیچھے اس کے چلنا چاہیے۔

اتباع اور اطاعت میں فرق

عزیزانِ من! اتباع اور اطاعت میں فرق ہے۔ اطاعت کے معنی ہیں: جو کوئی حکم دے' اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ اتباع یہ ہوتا ہے کہ ''جس صحیح راستے پہ کوئی چلے' اس کے پیچھے پیچھے اس راستے پہ چلو' وہ بھی اس راستے پہ چل رہا ہوتا ہے۔'' اپنی اطاعت نہیں کہہ رہا ہوتا' کسی جگہ گاؤں میں جانے کے لیے اگر آپ کو راستے کا پتہ نہ ہو اور آپ کسی سے پوچھیں اور آپ سے کوئی یہ کہے کہ ''میں وی اوتھے ای جانا ہیگا اے۔ میرے نال نال ترئے آ و یا میرے مگر مگر چلا آ۔'' ❷ یہ اطاعت نہیں ہے' اگر آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ اسی گاؤں میں جانے والا ہے اور یقین ہے کہ یہ راستہ جانتا ہے تو اس کے پیچھے پیچھے چلنا اس کی اطاعت نہیں ہے۔ یہ اتباع ہے۔ قرآن نے اس کے لیے اتباع کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اتباع کا مفہوم

عزیزانِ من! عرب تو صاحب! پوچھو نہیں۔ یہ تو بلا کی قوم تھی۔ یہ اتباع کا لفظ کہاں استعمال کرتے تھے: گائے کا نوزائیدہ بچہ ہو' جس طرح سے آگے ماں جاتی ہے' اسی طرح سے وہ پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اس عمل (Process) کو وہ اتباع کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا اتباع فرض ہے' اطاعت نہیں۔ اس نے تو کہا ہوگا کہ تمہیں اطاعت فرض ہے۔ اس نے کہا کہ میں اطاعت کی بات نہیں کررہا' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تو علمِ بصیرت کی بنیادوں پر ایک صحیح راستے پر چل رہا ہوں' میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ تم میرے بیٹے ہو'

---

❶ سیدھی منزل مقصود ❷ مجھے بھی وہیں جاتا ہے۔ یا تو میرے ساتھ ساتھ چلے آؤ یا پھر میرے پیچھے پیچھے۔

اگر ایسی صورتیں کرتے ہو' میرے راستے پہ نہیں چلتے تو پھر تمہارا میرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ یہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں' جنہوں نے اعلان کیا تھا صرف باپ کے لیے نہیں' انہوں نے سب سے یہ کہا: فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (14:36)۔ ''میرا'' اپنا'' وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرنے گا جس پر میں چلتا ہوں۔ اب تم رشتہ داریاں بتا رہے ہو تو سنو' جو میرے اس راستے پر' میرے پیچھے چلتا ہے' وہ میرا ہے۔ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (14:36)۔ تیسرا کوئی میرا ہے ہی نہیں: باپ بیٹے ہونے کی جہت سے کہتا ہے کہ تم میرے بیٹے ہوتے ہو۔ بھائی بھائی سے یہ کہتا ہے۔ بیٹا باپ سے یہ کہتا ہے۔ یہ سب کچھ رشتہ داریاں آپس میں گنائی جاتی ہیں لیکن قرآن کے نزدیک تو یہ سوال ہی نہیں۔ وہاں تو سوال ہی یہ ہے کہ جو فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (14:36)۔ اپنا صرف وہی ہے جو اس مسلک پر چلتا ہے جو مسلکِ ابراہیمی ہے۔

قومیت کی پہلی اینٹ

اسی مسلک میں اسلام کے نظریۂ قومیت کی پہلی اینٹ رکھ دی' عزیزانِ من! فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ''وہ ہیں ہم میں سے اور ہم ہیں ان میں سے۔'' تو یہاں جو ''ہم میں سے ہونا ہے'' اسی کو قومیت کی بنیاد کہتے ہیں۔ ہم میں سے کون ہے؟ وہ جو ہمارا اتباع کرے' جو اس راستہ پہ چلتا ہے جس پہ ہم چل رہے ہیں' وہ ہمارا ہے۔ جو اس راستے پہ نہیں چلتا' ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا ہے جو تجھ سے ناآشنا رہے ہوں۔ یہ ہے فَهُوَ مِنِّیْ۔ پس وہ ہم میں سے ہے۔ اس لیے یہ کہا: فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (19:43)۔ اس لیے تمہیں میرا اتباع کرنا چاہیے۔ میں تمہیں زندگی کی وہ راہ دکھادوں گا جو تمہیں سیدھی منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ اس آیت کے آگے خوب لفظ ہے: يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (19:44)۔ اے میرے باپ! تو اِن غیر خدائی سرکش قوتوں کی اطاعت نہ کر۔ قرآن ان کے ہاں کے سارے معبودوں' خواہ وہ رام ہوں یا کرشن' یہ کہہ رہا ہے کہ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (19:44)۔ اِن غیر خدائی قوتوں کی عبودیت نہ کر' ان کی محکومیت میں نہ آ۔

شیطان کے لیے بھی عبودیت کا لفظ استعمال ہوا ہے

دیکھتے ہیں کہ اسے انقلابی سیرت کہتے ہیں۔ یہیں عبودیت کے تصور سے تابعدار کے معنی بھی واضح ہو گئے' عبادت کا مفہوم بھی واضح ہو گیا۔ اگر آپ عبد کے معنی' پرستش کے لیتے ہیں' پوجنا کے لیتے ہیں تو قرآن نے ایک جگہ نہیں' بے شمار جگہ کہا ہے کہ ''شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرو'' اِن پرستش کرنے کے معنی کے لحاظ سے تو کوئی بھی شیطان کو پوجتا نہیں ہے حتیٰ کہ عرب جیسے بت پرست بھی شیطان کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ دنیا میں کسی نے بھی شیطان کو اپنا پرستار نہیں بنایا ہے۔ کسی زمانے میں شام میں ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا۔ اس کے لوگ کہتے تھے کہ ہم شیطان کی پرستش کرتے ہیں لیکن جب ان کے متعلق بھی تحقیق ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ہم شیطان کی پرستش نہیں کرتے۔ ہم تو اس کا احترام کرتے ہیں' ہم تو اُسے اتنی قوت کا مالک بتا رہے ہیں کہ وہ جو ہمارے ازلی ماں باپ تھے یعنی یہ طاؤس تھے' یہ مور اور سانپ

تھے۔ یہ بائبل (تورات) کی رو سے یوں تھے کہ یہ جنت کے اندر چلے گئے تھے اور یہ وہاں جا کے ورغلا رہے تھے۔ اس طرح یہ بڑی قوت کے مالک تھے۔ بہر حال، تحقیق کے بعد ان کا یہ عقیدہ یوں آیا کہ ہم تو یہ مانتے ہیں کہ وہ اتنا بڑا اصاحبِ قوت تھا کہ ہمارے ماں باپ کو بہکا گیا تھا۔ ہم اتنا ہی اس کا احترام کرتے ہیں، ہم اس کی پرستش نہیں کرتے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی شیطان کی پرستش نہیں کرتا۔ تو قرآن نے جہاں کہا ہے کہ شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی محکومیت اختیار نہ کرو، اس کی اطاعت نہ کرو۔ اور شیطان کے متعلق تو اگلی ہی آیت میں میرے سامنے یہ بات آ گئی ہے کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (19:44)۔ شیطان وہ ہے جو رحمٰن کی، خدا کی، معصیت کرتا ہے، اس کے احکام کے خلاف چلتا ہے۔ تو عزیزانِ من! شیطان کی یہ Definition آ گئی: ہر وہ شخص جو خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ شیطان ہے۔ کہا: لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (19:44)۔ تم ان کی محکومیت اختیار نہ کرو جو رحمٰن کی معصیت اختیار کرتے ہیں۔ اِس مفہوم سے بات صاف ہو جائے گی، کہ جی! نظریہ پاکستان کیا ہے؟ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں؟ آج ہمارے ہاں Discussion پہ Discussion، سمپوزیم پہ سمپوزیم کرنے لگے ہوئے ہیں۔ بات سیدھی سی ہے کہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا (19:44)۔ جو خدائے رحمٰن سے بغاوت کرتا ہے وہ شیطان ہے، جو رحمٰن کی معصیت کرتا ہے، شیطان ہے۔ اس لیے کہا: يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (19:44)۔ اے میرے باپ! تو شیطان کی محکومیت مت اختیار کر، تو اِن غیر خدائی سرکش قوتوں کی اطاعت مت اختیار کر۔ اب اس کے بعد یہ کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، والدِ محترم! وہ جناب کے فائدے کی بات ہے۔ میں صرف اپنے فائدے کی نہیں کہہ رہا۔ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا (19:45)۔ اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھ پر خدا کی طرف سے کوئی عذاب آ جائے اور تو بھی ان سرکش قوتوں کا ساتھی بن کر خدا کی رحمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم رہ جائے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ جس روش پہ تم چلے جا رہے ہو، اُس سے تم بھی شیطان ہی کے ساتھی ہو جاؤ گے کیونکہ اس کا اتباع کرنے والا، اسی کا ساتھی ہو جاتا ہے اور جب ایسا ہو جائے گا تو پھر خدا کے قانون کے مطابق جو تم پر تباہی اور عذاب آنے والا ہے: اِنِّيْٓ اَخَافُ (19:45)۔ مجھے اس سے ڈر آتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں یہ بات کہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شیطان کا غلط راستہ، تباہیوں کی طرف لے جایا کرتا ہے۔ تو میں ڈرتا ہوں کہ تم اس بناء پر تباہ ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں یہ کہہ رہا ہوں، تم سے اپنا حکم نہیں منوا رہا، تمہارے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں صاحب! باپ سن رہا ہے۔

قرآن درمیان کی کڑیاں چھوڑ رہا ہے۔ اور جب بات یہاں تک پہنچ گئی، دیکھا کہ یہ تو آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ (19:46)۔ اس نے کہا: اچھا اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ کیا تو اپنے آبائی مذہب مسلک سے برگشتہ ہو گیا ہے؟ یہ ہے تمہارا ملخص! یعنی یہ جو ہمارے معبود ہیں تم ان سے ہمیں ورغلانا چاہتے ہو اور چاہتے ہو کہ انہیں

چھوڑ دیا جائے۔ یہاں قرآن کا لفظ ''اراغب'' آیا ہے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں' یہ عجیب قوم تھی اور ان کی جو زبان تھی وہ بھی انوکھی اور عجیب تھی۔ رغـب' رغبـت کا لفظ تو یہی ہے لیکن جب اس کے بعد لفظ ''عن'' آتا ہے تو اس کے معنی ''کسی کے خلاف ''نفرت'' کے ہو جاتے ہیں۔'' آپ دیکھتے ہیں کہ Preposition کتنا فرق پیدا کرتی ہیں۔ یہ عربی زبان کی Preposition بڑی اہم ہوتی ہیں۔ خیر۔ کہا: تم ہمیں ان کے خلاف ورغلا رہے ہو' یہ کر رہے ہو' یاد رکھو! میں تو لمبی چوڑی بات جانتا نہیں ہوں۔

جب کسی سے کوئی جواب نہیں بن پائے تو پھر؟

اب آیا وہ باب جو آپ کو معلوم ہے کہ جب کوئی باپ کے پاس یا ماں کے پاس Reason نہیں رہا کرتا تو وہ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنی یہ بکواس بند نہ کی تو گھر سے نکال دونگا۔ یہ آج ہی کا باپ نہیں کہتا' جب بھی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں رہتی اور باپ ہی نہیں جس کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں ہوتی اور اس کے پاس اقتدار ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ کہتا ہی یہی ہے: اگر تم باز نہ آئے تو **لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِىۡ مَلِيًّا** (19:46)۔ یاد رکھو! اگر تم اِن باتوں سے باز نہ آئے' یاد رکھو! تمہیں سنگسار کروا دونگا اور دیکھو اس وقت مجھے بہت غصہ ہے' میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے ابراہیم! میں کچھ کر نہ بیٹھوں' میرے سامنے سے دفعہ ہو جاؤ۔ یہاں قرآن نے بالکل یہی لفظ کہے ہیں: **وَاهۡجُرۡنِىۡ مَلِيًّا** (19:46)۔ اس وقت میرا غصہ بہت تیز ہے' اس وقت تو میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا' اور سوچ اس بات کو۔ اس کے بعد باز آ جاؤ۔ اور اگر باز نہ آیا تو میں تمہیں یہ بات کہہ دیتا ہوں کہ تم میرے بیٹے ہو' پھر بچ نہیں سکو گے' سنگسار کروا دونگا۔ یاد رکھو! ہمارے معبودوں کے خلاف تم نے یہ کچھ کیا ہے۔ یہ وہ کہتا ہے جس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوئی۔ وہ دھاندلی پہ اتر آیا ہے۔ ہتھیار کونسا استعمال کر رہا ہے؟ باپ ہونے کا' گھر کا مالک ہونے کا۔ کہہ کیا رہا ہے؟ اپنے گھر سے نکال دونگا' میری آنکھوں کے سامنے سے دفعہ ہو جاؤ' اس قدر غصہ ہے۔ سامنے وہ ہے کہ جو دلیل اور بصیرت اور علم کی بنیادوں پہ بات کر رہا ہے یہ کہہ رہا ہے۔

عزیزانِ من! سنئے' ایسے مقام پر غصہ کو ضبط کرنا اسوہ حسنہ ہے۔ ہم میں سے کوئی ہوتا' بوڑھا باپ جوان بیٹے کو یہ کچھ کہتا' تو پوچھو نہیں' داڑھی نوچ کے رکھ دیتے۔ ''تیری ایسی کی تیسی' وڈا تڑیا پھرنا ایں تیرے پیو دا مکان ہیگا اے کڈ کے تے وکھ۔''[1] یہ ہوتا ہے جواب عزیزانِ من! اس غصہ کا جواب اِدھر سے بھی یہ آتا ہے۔ وہاں تو بات ہی اور تھی' وہاں تو بات علم اور بصیرت اور دلیل کی بنیادوں پر تھی۔ بات باپ کے بھلے کی کہہ رہا تھا۔ یہ نظر آ رہا تھا کہ اس وقت یہ غصے میں آ گیا ہے دلیل کی بات نہیں سن رہا' وہ اتنے زور سے یہ کچھ کہتا ہے: سنگسار کرا دونگا' دفعہ ہو جاؤ' میرے گھر سے نکل جاؤ۔ مگر ان حالات میں حضرت ابراہیم کا جواب تھا: **قَالَ سَلٰمٌ عَلَيۡكَ** (19:47)۔ اللہ کرے کہ تو سلامت رہے۔

---

[1] تیرا ستیاناس! بڑے بنے پھرتے ہو۔ کیا یہ تیرے باپ کا مکان ہے؟ ذرا اس میں سے نکال کر تو دیکھ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کو جواب ''خدا تجھے سلامت رکھے''

یہ ہے وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17:23)۔ بڑھاپے میں اس میں کمی آ گئی تھی' برداشت کی کمی' سہار کی کمی' یہ جو گہرے جذبات تھے معبودوں کے متعلق ان کے خلاف کچھ نہ سننے کی ایک چیز شدتِ جذبات تھی' یہ عقل کی کمی تھی' اس میں کمی آ گئی تھی اور ایسے وقت میں جب کسی کا غصہ اتنی تیزی پہ آ گیا ہو' عزیزانِ من! اس کی کمی کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے: اللہ تمہیں سلامت رکھے' اللہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے' ابا جان! میری یہی دعا ہے: سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ (19:47)۔ میں اس کے باوجود اپنے خدا سے یہی کہوں گا کہ وہ تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔ بات یہاں سے ایک چلی: اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا (19:47)۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میرے حال پر اس کی عنایات بے پایاں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں جو یہ کچھ کہہ رہا ہوں مجھے امید یہی ہے کہ خدا کے ہاں میری یہ دعا قبول ہو گی۔ وہ مجھ پہ بڑا مہربان خدا ہے' اس بناء پہ تمہارے متعلق میں یہ بات کہتا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے اس سلامتی کی تمنا کے برعکس ہمارے ہاں استغفار کا مفہوم

ہمارے ہاں حسب معمول جناب! اس پر فقہ کا ایک مسئلہ چل دیا کہ یہ جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لیے استغفر کا اس طرح سے اظہار کیا تھا یہ مشرکین کے لیے استغفار جائز نہیں۔ استغفار کے معنی دعائے مغفرت کے ہوتے ہیں۔ مغفرت کے معنی ''یا اللہ'' اینوں قیامت اچ بخش دئیں جہنم اچ نا پیجیں۔''[1] اس طرح یوں بات چلی اور یہ آپ کے ہاں کا مسئلہ چلا ہوا ہے۔ سوال کیا تھا؟ یہ ابراہیم کیا سلامتی چاہتا تھا؟

یہ استغفار کیا تھا؟ استغفار کے معنی تو آپ کو معلوم ہیں کہ ''غفرہ'' اس ہیلمٹ (Halmet) یا مغفر کو کہتے ہیں جو سپاہی اپنے سر پہ ڈال لیتا ہے کہ اگر کہیں سے کوئی گولی یا تیر یا پتھر آئے تو سر کا نازک ترین حصہ محفوظ رہے۔ اس کی حفاظت کا جو سامان ہوتا ہے یہ اسے کہتے ہیں۔ اس طرح استغفار کے معنی ہوتے ہیں: سامانِ حفاظت طلب کرنا۔ یہاں کہا ہے کہ ابا جان! آپ تو غصے میں ہیں لیکن میں آپ کے لیے پھر بھی سامانِ حفاظت طلب کرتا رہوں گا۔ کیا تھی حفاظت؟ اس پہ عذاب کس بات پہ آنا تھا' اس بات پہ آنا تھا کہ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا (19:44)۔ خدا کی معصیت اختیار کرتے چلے جاؤ گے' تو عذاب آتا جائے گا۔ مغفرت یا حفاظت تو اس صورت میں ہو گی کہ تم خدا کی معصیت کو چھوڑ دو۔ میں اسی کی کوشش کروں گا۔ آپ اس وقت غصے میں ہیں' بات سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ میں کوشش کرتا رہوں گا کہ وہ جو خدا کا عذاب معصیت کی وجہ سے تم پہ آنا ہے' وہ یہ نہیں کہ تم معصیت کرتے رہو' اور وہ عذاب رک جائے۔ یہ نہیں۔ ہمارے ہاں تو مغفرت کے معنی یہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو خدا کی مغفرت سے مفہوم ان لوگوں کی بخشش ہوتی ہے جو گناہ سے لتھڑے ہوئے وہاں جائیں۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کی معصیت سے تم پہ عذاب آئے گا' اور میں یہ کوشش کرتا رہوں گا کہ تم معصیتِ خداوندی چھوڑ دو تا کہ اس عذاب سے بچ جاؤ۔ یہ ہے استغفار کے معنی۔

---

[1] یا اللہ! اِسے روز قیامت بخش دینا' جہنم میں نہ بھیجنا

اور پھر یہ چیز کہ صاحب! وہ تو مشرک تھے۔ اس کے لیے آخر تک یہ استغفار کی دعا ہی کرتے رہے، تو یہ کیا معنی؟ میں نے عرض کیا کہ قرآنِ کریم کو سمجھنا ہو تو ساتھ دوسرا مقام سامنے لے آیئے، سورۃ توبہ دیکھیے۔ کہا: وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ (9:114)۔ اس پر تمہارے دل میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی مغفرت کی آرزو کیوں کی تھی حالانکہ وہ مشرک تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس توقع پر کہ اس کا باپ خدا پر ایمان لے آئے گا، اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے خدا سے مغفرت چاہے گا۔ لیکن جب ابراہیم پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ وہ خدا پر ایمان نہیں لانے کا بلکہ وہ اس کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہوگیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابراہیم بڑا ہی غم خوار اور بردبار تھا۔ (14:41;19:27;60:4)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بردبار صفات کے حامل تھے

ٹھیک ہے، اُس وقت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات ان سے کہی تھی جب انہیں ہنوز اس کی توقع تھی کہ میں اگر اس قسم کی انہیں وعظ و نصیحت کرتا رہا، ان کے کان میں سچی بات ڈالتا رہا، تو ہوسکتا ہے، اس کی امید ہے، اس بات کا امکان ہے کہ یہ سمجھ جائیں، غلط راستے کو چھوڑ دیں، خدا کی معصیت کو چھوڑ دیں، ان کی پرستش کو چھوڑ دیں اور صحیح راستے پہ آجائیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تھی ان کی وہ توقع، جس بنا پہ وہ کہتے تھے کہ میں بہر حال تمہارے لیے کوشش کرتا رہونگا کہ تمہیں سامانِ حفاظت مل جائے اور اس کے بعد کہا ہے کہ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ (9:114)۔ لیکن جب سب کوششیں کرنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ نہیں صاحب! یہ تو باز آنے والا نہیں، یہ خدا کا دشمن ہے، یہ ساری کوششیں کرنے کے بعد جب انہوں نے دیکھ لیا تو تَبَرَّاَ مِنْهُ (9:114)۔ ان سے قطع تعلق کر لیا، واسطہ ختم کرلیا۔ کتنی صاف بات ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (9:114)۔ ابراہیم بڑا بردبار تھا، وہ یونہی جلدی سے بھڑک اٹھنے والا نہیں تھا۔ اور یہ بھی ایک صفت ہونی چاہیے۔ انقلابی تو اتنا بڑا انقلابی کہ ذرا سی مفاہمت یا Compromise نہیں کر رہا لیکن سہارا اور برداشت اتنی بڑی کہ دیکھ رہا ہے کہ جہالت کی بناء پہ غلط عقیدت مندی کی بناء پہ باپ بات سننے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اتنا بڑا غصہ آگیا، پارا چڑھ رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ لیکن آپ کی طرف سے اسی قسم کا جواب ہی نہیں جارہا عزیزانِ من! یہ ٹینس کا کھیل نہیں ہے کہ جس زور سے گیند آئے اس زور سے ہی اِدھر سے بھی مارا جائے۔ یہ بات ہی مناسب نہیں رہتی۔ غصے کا جواب آپ غصے سے دیتے چلے جایئے، بات بڑھتی چلی جائے گی۔ اگلا حصہ جو ہوتا ہے پھر متشابہات سے محکمات آتی ہیں اس کے سر پہ پڑتی ہے۔ سہارا اور برداشت بڑی چیز ہوتی ہے۔

صداقت کو اپنائے بغیر سہارا اور برداشت پیدا نہیں ہوسکتی

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ یہ سہارا اور برداشت کس میں ہوتی ہے؟ یہ اس میں ہوتی ہے ''جسے یقین ہوتا ہے کہ میں صداقت پہ ہوں'' یہ اس میں ہوتی ہے ''جس کے پاس دلیل اور برہان ہوتی ہے۔'' جو دلیل کی مار مار سکتا ہے، اسے ضرورت نہیں ہوتی کہ اُس میں

غصہ آ جائے۔ کہا: اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ (9:114)۔ابراہیم بڑا ہی غمخوار اور بردبار تھا۔کیا بات ہے۔لفظ حلیم میں! میں نے شاید پہلے بھی کئی دفعہ بتایا ہے۔ یہ لفظ کئی دفعہ آیا ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ اس لفظ کے جو ہمارے ہاں مروجہ معانی ہیں' یہ معانی عربی زبان کے نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس کے معنی بردباری اور انکساری کے معنی سے لے کر بے غیرتی اور بے حمیتی تک چلے جاتے ہیں۔'' دو طمانچے وی مارلو تاں وی کچھ نئیں کیندا۔ اونوں کیا ناں برہمن نے کہ پین لئی کوئی رشتہ دیکھ یا ہیگا ایں' کہن لگا جی کیا بات ہے' رشتہ دیکھ آیاں' سونڑاں سونڑاں منڈا نئیں ہیگا۔ کہن لگے: میں اوہدی ہٹی تے ویکھیا اونوں' کوئی چار گالیاں وی کڈ جاندا تاں وی ہنسدا اے پیا' اونوں کوئی دو طمانچے وی مارلیندا اں ہیگا تاں وی ہسنا' اوہدی ہٹی تے وی کوئی چیز چک کے لے جاندا تاں وی اوہنوں نئیں غصہ اوندا' ایسا نیک! کہن لگا: اوئے راجہ! ایس منڈے دے نال توں کیناں پیا ہیگاں کہ میں اپنی لڑکی دے دیاں؟ کل نوں میری لڑکی نوں وی کوئی لے گیا او ہنے تاں وی کچھ نئیں کہناں ہیگا۔''[1] ہمارے ہاں تو بردباری' انکساری کا یہ تصور ہوتا ہے۔

انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت

ہم تھے پت[2] پٹھان کے' دل کے دل دیں موڑ۔ ایک پٹھان کسی پیر کا مرید ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ پٹھان مرید خود کہتا ہے کہ

ہم تھے پت پٹھان کے' دَل کے دَل دیں موڑ
شرم لگے رگھو ویت کے جائے نہ تنکا توڑ

لیکن جب سے ان کے مرید بنے ہیں تو اب تو اتنا عجز آ گیا ہے کہ اب ہم تنکا بھی نہیں توڑ سکتے۔'' فٹے منہ تہاڈا''[3] ہمارے ہاں تو یہ عجز اور انکسار عیسائیت کی درویشی تھی مگر اب یہ ہمارے ہاں اتنا بڑا تقربِ خداوندی کا ذریعہ بنا ہے اور ہم نے اسے اپنا نصیب سمجھ لیا: ''ہیگا لکھ نصیب دا' جو آئے تینوں دھتکار کے پرے ہو جائے۔ اگے توں اونوں کج کیئیں وی ناں''[4] ہمارے ہاں حلیم ہونے کا یہی تصور ہے۔ قرآن کہتا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيۡنَهُمۡ (48:29)۔محمد الرسول اللہ اور ان کے رفقاء کی جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد ہیں۔ لہٰذا حلیم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ جو ایک مار کھانے والا مال[5] ہوتا ہے اُسے ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ ''یہ آیا' اس نے

---

[1] اسے دو تھپڑ بھی ماردیں تو بھی کچھ نہیں کہتا۔ اسے برہمن نے کہا کہ کیا تو نے بہن کے لیے ''بر'' دیکھا ہے؟ کہنے لگا: جی! کیا بات ہے! میں ''بر'' بھی دیکھ آیا ہوں۔ بڑا ہی حسین وجمیل لڑکا ہے۔ کہنے لگے: میں نے اسے اس کی دکان پہ ہی دیکھا' اگر اسے کوئی چار گالیاں بھی بک جاتا ہے تو بھی ہنستا مسکراتا ہی رہتا ہے۔ اگر اسے کوئی دو تھپڑ بھی مار دے تو بھی ہنستا اور مسکراتا رہتا ہے۔ اگر کوئی اس کی دکان سے کوئی چیز اٹھا کر لے جائے تو بھی اسے غصہ نہیں آیا۔ یہ ایسا نیک ہے۔ کہنے لگا: ارے راجا! تم کہتے ہو کہ میں اس لڑکے کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دوں۔ کل کلاں اگر کوئی میری بیٹی کو بھی لے گیا تو اس نے پھر بھی کچھ نہیں کہنا ہے۔

[2] بیٹا [3] لعنت تمہاری شکل پہ۔ [4] جو ملتا ہے وہ نصیب ہی کا ملتا ہے مگر یہاں تو جو آئے وہ تجھے دھتکار کر پرے ہو جائے اور تم اسے کچھ بھی نہ کہو۔ [5] مال مویشی

بھی مجھے مارا' وہ آیا تو اس نے بھی مجھے مارا۔'' یہ تو Inferiority Complex (احساس کمتری) ہوتا ہے جس میں وہ ہر ایک سے خطرہ محسوس کرتا ہے' خواہ وہ اس کی مدافعت میں آیا ہو یا وہ اُسے چارہ ہی دینے کے لیے کیوں نہ آیا ہو۔

عربوں کے ہاں حلیم کا مفہوم

عزیزانِ من! جانوروں اور مویشیوں میں حلیم کی یہ بات ہوتی ہے لیکن یہ اس وقت ہوتی ہے جب وہ بھرپور توانائی میں ہوتے ہیں' صحت مند ہوتے ہیں' ان کے ہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ مثلاً اس قسم کا اونٹ' جو توانائیوں سے بھرپور ہے' اُسے یہ خطرہ نہیں کہ مجھے کوئی یوں آکے کچھ کر جائے گا۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اس قسم کے اونٹ پر اٹھکیلیاں [1] کر رہے ہوتے ہیں: کوئی اس کی پونچھ پہ چڑھا ہوا ہے' کوئی گردن پہ بیٹھا ہے' کوئی کان مروڑ رہا ہے اور کوئی یہ کچھ کر رہا ہے اور وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا' اپنی جگالی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کا اونٹ جس کو اپنی توانائیوں پہ اتنا بھروسہ ہو کہ یہ بچے ہیں' کھیل رہے ہیں' کھیلنے دیجیے' وہ ان پہ بھڑکتا نہیں ہے۔ اس قسم کا اونٹ جو یونہی نہ بھڑک اٹھے' وہ اسے حلیم کہا کرتے تھے۔ آج اسے دیکھنے کے لیے بڑی مشکل پیش آ رہی ہے اور اب ہمارے ہاں ''حلیم'' وہ رہ گئی جو بازاروں میں بِکی جاتی ہے۔ ''اونہوں حلیم کیندے ای ایس واسطے نے کہ اوہدے وچ کوئی دانہ رڑکدا ای نہیں ہیگا۔'' [2] اور اب تو اس حلیم میں دال کا وجود بھی ختم گوشت کے ریشے بھی ختم اور مسالے بھی ختم اور اب وہ حلیم تو سرے سے ختم ہی ہوگئی کہ جس کے بارے میں کوئی کہہ سکے کہ کوئی ایسی چیز جو ہوندی ہیگی سی۔'' [3] ہم نے اب اس قسم کے اونٹ سے یہ سمجھا ہے کہ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ (19:114)۔ یہ حلیم وہ تھا جو چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ بھڑک نہ اٹھے۔

حضور ﷺ کی شخصیت قرآن کی نظر میں

قرآن نے اسی لیے حضور ﷺ کے متعلق کہا ہے کہ یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ جس سے تیرا قلب اتنا کشادہ ہو گیا ہوا ہے اگر تو کہیں تنگ قلب کا ہوتا' تنگ نظری والا ہوتا' ساری دنیا کے لوگ تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔

یہ تھا ابراہیم علیہ السلام کا وہ جواب جو باپ کے اس تند و تیز غصے کے مقابلے میں آیا ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ اُسے غصہ ہے۔: قَالَ سَلٰمٌ عَلَيۡكَ (19:47)۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس سخت کلامی کا جواب نہایت نرمی سے دیا اور کہا کہ خدا آپ کو صحیح راستے کی طرف ہدایت کر کے امن و سلامتی میں رکھے۔ عزیزانِ من! یہ کر کے دیکھیے' آدھا غصہ تو اسی وقت ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ وہ گالیاں دے' آپ کہیں کہ اللہ تیرا بھلا

---

[1] شوخیاں

[2] اسے حلیم کہتے ہی اس لیے ہیں کہ اس کے اندر تو کوئی دانہ تک محسوس نہیں ہوتا۔

[3] جو کبھی ہوا کرتی تھی۔

کرے، میں سامنے سے کچھ نہ کہونگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوشش اور آپ کا کردار

سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ (19:47)۔ میں اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہوں گا کہ وہ آپ کو ایمان عطا کر کے کفر کی تباہیوں سے محفوظ رکھے۔ میں اس کے باوجود امکان بھر کوشش کرونگا کہ تم اس تباہی سے محفوظ رہ جاؤ جو خدا کی طرف سے آنے والی ہے۔ اِنَّہٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا (19:47)۔ وہ مجھ پہ بڑا ہی مہربان ہے۔ میرے حال پر اس کی عنایات بے پایاں ہیں۔ اور مجھے توقع ہے کہ وہ بات مان لے گا۔ کوشش کرتا رہونگا کہ تم بچ جاؤ۔ اور یہاں یہ بتادیا کہ جب انتہائی طور پہ انہوں نے دیکھ لیا کہ نہیں' کوئی بات نہیں بنتی' یہ دشمن ہے' یہ ایمان نہیں لاسکتا' قصہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ قرآنِ کریم نے کہا: تَبَرَّاَ مِنۡہُ (9:114)۔ ''وہ اس سے بیزار ہوگیا۔'' یہ ہے وہ مقامِ ابراہیمیؑ۔ اور یہ ہے وہ مقام جہاں خدا نے قرآنِ کریم میں کہا ہے: قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ (60:4)۔ تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کا طرزِ عمل نہایت عمدہ نمونہ ہے' اسوہ حسنہ ہے۔ یہ کس مقام پہ آیا ہے؟ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِہِمۡ (60:4)۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡکُمۡ وَ مِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ (60:4)۔ میں' تم سے اور جو کچھ تم خدا کو چھوڑ کر اوروں کی محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو' ان تمام سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں' ان سے قطع تعلق کرتا ہوں۔ یہ کَفَرۡنَا بِکُمۡ (60:4) ہے۔ یعنی کَفَرۡنَا بِکُمۡ (60:4) تمہاری ان تمام چیزوں سے میں انکار کرتا ہوں۔ سن رکھو! میں یہ اعلان کرتا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کھلے بندوں عام اعلان

سنیے! عزیزانِ من! وَ بَدَا بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمُ الۡعَدَاوَۃُ وَ الۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا (60:4)۔ سن رکھو' کسی غلط فہمی میں نہ رہنا کہ ابراہیم اِس کا بیٹا ہے' اُسکا باپ ہے' اِس کا بھائی ہے' اپنی قوم میں سے ہے' قوم ووم کچھ نہیں۔ تمہارے اور میرے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عداوت اور بغض رہے گا' بغض اور عداوت کے جذبات ہیں۔ اعلانیہ کہہ دیتا ہوں' منافقت نہیں برت رہا۔ یہ ابدًا ہے۔ یہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ قرآن ہے عزیزانِ من! ابراہیم علیہ السلام تھا جس نے یہ کچھ ہمیشہ کے لیے کہا اور واضح کر دیا کہ یہ بغض اور عداوت اور جذبات اس وقت تک رہیں گے: حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ (60:4)۔ تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ اور جب تم خدائے واحد پر ایمان لے آؤ تو اس وقت کوئی ذاتی عداوت نہیں ہوگی۔ یہ قطع تعلق ذاتی نہیں ہے بلکہ یہ اس بنیاد پر ہے کہ تم غلط حکمرانوں کی معبودیت اختیار کیے ہوئے ہو' تمہارے اور میرے درمیان قطع تعلق' بغض اور عداوت کی اصل وجہ یہ ہے اور یہ کیفیت اس وقت تک رہے گی: حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحۡدَہٗۤ (60:4)۔ جب تک تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہ ہے عزیزانِ من! دل میں تعلقات کی بنیاد۔

نظریہ قومیت کی تعریف

یہ ہے قرآن کی رو سے نظریۂ قومیت جو وہ اپنی قوم سے کہہ رہا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ وطن کی چار دیواری میں بسنے والے کافر اور مسلمان سب ایک قوم ہوتے ہیں۔ اور یہاں قرآن کہتا ہے کہ تمہارے لیے اسوہ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں ہے اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں ہے۔ قوم کا یہ لفظ جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا' وہ تو اس تصور کے مطابق ہے' جبکہ ہمیں یہ سبق پڑھایا جاتا تھا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں' وطن کے اندر چار دیواری میں رہنے والے کافر اور مومن سب ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ یہ وہ مروجہ تصور تھا۔ آپ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بات کہی کہ تم میں اور مجھ میں کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہا۔ عداوت اور بغض کے جذبات' پھر کب تک قائم رہ سکتے ہیں؟ کہا کہ یہ اس وقت تک رہیں گے: **حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ** (60:4)۔ تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لے آؤ۔ آپ سے یہ کہا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سن لے گا۔ **وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (19:48)۔ تم کہتے ہو کہ میں تمہیں عاق کر دونگا' نکال دونگا' میرے گھر سے دفعہ ہو جاؤ' ارے! آپ یہ کہیں یا نہ کہیں' میں تو خود تم سے اور جن کی تم پرستش کرتے ہو' معبودیت اختیار کر رہے ہو' ان سب سے' میں خود ہی کنارہ کش ہو رہا ہوں۔ اس نے کہا تھا: **وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا** (19:46)۔ کہ تھوڑے سے وقت کے لیے تم دفعہ ہو جاؤ' ابھی چلے جاؤ' مجھے اس وقت بہت غصہ ہے' میری آنکھوں کے سامنے سے چلے جاؤ' وہ باپ بیٹے کا تعلق باقی رکھتا تھا۔ تھوڑے سے وقت کے لیے کہا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ تھوڑے سے وقت کے لیے چلے جاؤ۔ ارے صاحب! میں تو تم سے اور یہ تم جن کی پرستش کرتے ہو' ان سب سے پہلے ہی کنارہ کشی اختیار کر رہا ہوں۔

خدا کی طرف جانے کا مفہوم

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ (37:99)۔ میں سب کو چھوڑ کے اپنے خدا کی طرف جا رہا ہوں۔ ارے خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ کیا کہا؟ **اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ** (37:99)۔ کہ میں وہاں جا رہا ہوں کہ جہاں خدا کی محکومیت اختیار کرنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ تم باپ ہو' پروہت ہو' تم یہ مناصب' دولت اور حشمت وشوکت اور یہ وطن اور یہ گھر بار سب اپنے پاس رکھو: **اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ** (37:99)۔ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ اس کے باوجود **وَاَدْعُوْا رَبِّیْ** (19:48)۔ میں صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ میں تمہارے متعلق خدا سے یہ کہتا رہونگا کہ یا اللہ! اسے ہدایت دے۔ نہیں چاہتا کہ تم میری آنکھوں کے سامنے تباہ ہو جاؤ۔ یہ نہیں ہے کہ میں تمہاری حفاظت کرتا رہونگا بلکہ خدا سے کہتا رہونگا کہ وہ تمہیں ہدایت دے۔

لفظ شقیًا کا قرآنی مفہوم

عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا (19:48)۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر زندگی اور اس کی کامرانیوں سے محروم نہیں رہوں گا۔ باقی رہا یہ ''شقیًا'' کہ تم گھر بار سے' اس گھر سے' منصب سے' دولت سے مجھے محروم کرنا چاہتے ہو۔ کیا کہہ رہے ہو صاحب! مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میں خدا کے جس راستے پہ چل رہا ہوں' وہ مجھے زندگی کی آسائشوں سے بھی محروم نہیں کرے گا۔ شقیًا کے معنی ''کسی کو محروم کر دینا ہوتا ہے۔'' فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ (19:49)۔ چنانچہ وہ اپنے اہل خاندان کو' اور ان کے معبودوں کو چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ (اور شام کے علاقے میں جا بسا) وہاں ہم نے اسے اسحٰق علیہ السلام جیسا بیٹا اور (اس کے بعد) یعقوب علیہ السلام جیسا پوتا عطا کیا۔ وہ جب ان سب کو چھوڑ کے وہاں چلا گیا اور تو پھر اس کے بعد کی ساری زندگی یہاں نہیں آیا۔

نسلوں تک صداقت ورفعت اور سرفرازی کی نعمت کا ملنا

قرآن نے بتایا ہے کہ پھر اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام ہی نہیں' ہم نے تو اس کی نسل تک اِن خوشگواریوں اور خوشحالیوں کو باقی رکھا اور فلسطین کی سرزمین میں ملکِ عظیم دیا تھا نیز ہم نے ابراہیم اور اس کی ذریت کو' ایک مملکت عطا کر دی تھی۔ اس نے تو صرف گھر سے نکالا تھا' مگر ہم نے اُسے مملکت عظیم دی تھی صاحب! کس کو دی تھی؟ اسحاق کے بیٹے یعقوب یعنی پوتے تک کو مملکت دی تھی۔ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا (19:49)۔ اور اِن سب کو ہم نے شرفِ نبوت سے سرفراز کیا۔ مملکت ہی نہیں دی تھی' اِن سب کو وہ نبوت بھی دی تھی۔ وَوَهَبۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِيًّا (19:50)۔ اور انہیں اپنے ہاں سے زندگی کی تمام نعمتیں عطا کیں اور ان کو سب کچھ ہم نے دیا تھا حتی کہ ان کی زندگی کو ایسا بنا دیا تھا کہ آنے والی نسلوں میں بھی انکا نام صداقت و رفعت اور بلندی کے الفاظ سے لیا جاتا ہے۔ اب یہ بات ہے کہ ''ماں دی بددعا بڑی بری ہوندی اے۔ اُو! ڈرایدے توں۔''[1] باپ کی بددعا کے بعد اب یہ کیفیت ہے۔ خدا یہ کہتا ہے کہ سوال کسی کی دعا یا بددعا کا ہے ہی نہیں وہ تو صحیح راستے پہ چلنے کی بات ہے۔ وہ سب کچھ دیا اور اسے لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِيًّا (19:50)۔ کہا۔ یعنی اِن کی زبانوں سے ایسی صدائیں بلند کرائیں جو صداقتوں اور رفعتوں کی علمبردار تھیں۔

عزیزانِ من! سورہ مریم کی 50ویں آیت پہ ہم آئے اور تذکرۂ ابراہیم علیہ السلام اس سورۃ میں یہاں یہ ختم ہوا۔ یہاں کہا کہ جَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِيًّا (19:50)۔ اور ان کی زبانوں سے ایسی صدائیں بلند کرائیں جو صداقتوں اور رفعتوں کی علمبردار تھیں۔ دیکھیے بات یہاں کہاں توڑی ہے؟ وہاں کہاں کہ: وَاذۡكُرۡ فِی الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا (19:41)۔ اے

[1] ماں کی بددعا بہت بُری ہوتی ہے۔ ابے! تُو اس سے خوف کھا۔

رسول! اب تو اِس کتاب (قرآن) میں ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر' یقیناً وہ سچائی کا مجسمہ اور خدا کا نبی تھا۔ وہاں صدیق سے بات شروع کی تھی اور آخر میں اِس بات کا مقطع **صِدْقٍ عَلِيًّا** (19:50)۔ یہاں آیا: سچا تھا اور اس کا تذکرہ بھی' صداقت کے ساتھ رہا۔ لیکن تورات والوں نے تو اپنے ہاں تحریف کی اور وہاں سے وہ روایتیں اپنے ہاں درج کردیں جو افسانے ہیں' جن میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کہا کہ اس نے جھوٹ بولا۔ آپ کے ہاں دیکھیے کہ قرآن آپ کا ہے' خدا آپ کا ہے' وہ انہیں **صِدِّيقًا نَّبِيًّا** (19:41) کہتا ہے۔ اب صداقت کے ساتھ اِن کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے صداقت کے ساتھ اور بلندیوں کے ساتھ اس کے تذکرے کو باقی رکھا۔ قرآن نے واقعی ایسا ہی رکھا۔

نہ معلوم روزِ قیامت قرآن کی اس روشن تعلیم کے سامنے ہمارا کیا جواب ہوگا

ہمارے ہاں بھی تورات جیسی سازش ہوئی۔ قرآن میں تو تحریف کر کے یہ ایک آیت کا بھی اضافہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے پہلے ہمیں عقیدہ یہ دیا کہ ''مثلہ معہ'' قرآن کی مثل' قرآن کے ساتھ' کچھ اور ہے۔ یا اللہ! وہ قرآن جس میں اللہ تعالیٰ ''تحدی'' سے بار بار کہتا ہے کہ اگر تمہیں یہ زعمِ باطل ہے کہ ہم اس کی مثل پیدا کر سکتے ہیں۔ جاؤ' دنیا بھر کے انسانوں کو اکٹھا کرو' یہ کبھی نہیں کر سکتے۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ روایتیں' یہ خود ساختہ حدیثیں کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ یہ وہی مثلہ معہ ہے۔ ان سے کہیے کہ قرآن تو **صِدِّيقًا نَّبِيًّا** (19:41)۔ کہتا ہے۔ **صِدْقٍ عَلِيًّا** (19:50)۔ اس کا بیان کرتا ہے اور آپ یہ کہتے ہیں کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اس کی مثل ایک اور ہے۔ وہ یہ کہتا ہے: ارے یہ تو متضاد بات ہوگئی۔ کہا: وہ جو روایت ہے' وہ قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ ہے' **استغفر اللہ**۔

عزیزانِ من! وقت ہوگیا۔ سورۃ مریم کی آیت 50 تک آ گئے اور اس کے بعد ذکر آتا ہے ایک اور عظیم انقلابی ہستی کا جسے صاحبِ ضربِ کلیم کہا ہے: **وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى** (19:51)۔ (اِسی طرح' اے رسول!) تو اِس کتاب (قرآن) میں' موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر۔ یہ ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀......❀

سولھواں باب: **سورۃ مریم** (آیات 51 تا 54)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿51﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿52﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿53﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿54﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1976 کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 51 سے ہو رہا ہے: (19:51)۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۃ میں اُن داعیانِ انقلاب کی داستانوں کا تذکرہ ہمارے سامنے آ رہا ہے جنھوں نے باطل پر استوار انسانیت کش عقائد، نظریات، اصول، یا نظام کے خلاف آسمانی انقلاب کی آواز بلند کی۔ اس میں سب سے پہلے حضرتِ مریمؑ کا تذکرہ جلیلہ ہمارے سامنے آیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا وہ ایک عظیم انقلاب کی داعی تھیں اور وہ انقلاب اس زمانے کے شریعت کے اجارہ داروں، ہیکل کے پجاریوں کی روش کے خلاف تھا۔ اس کے بعد حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہمارے سامنے آیا۔ وہ اس دور کے سب سے پہلے انقلابی تھے جنھوں نے برہمنیت اور پھر اپنی ہی قوم اور اپنے ہی بادشاہ کے خلاف صدائے انقلاب بلند کیا۔ اب اس کے بعد حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ آتا ہے جسے بجا طور پر صاحبِ ضربِ کلیم کہا گیا ہے۔

استبداد کی تین مہیب شکلیں

انسانیت کش تین ہی قوتیں دنیا میں چلی آ رہی ہیں: ملوکیت کا استبداد، برہمنیت کی طبلہ نوازیاں، اور سرمایہ داری کی کہن آسانیاں۔ ان میں سے کوئی ایک لعنت ہی انسان کو تباہ کرنے کے لیے کچھ کم نہیں ہوتی لیکن آپ سوچیے جہاں یہ تینوں یکجا، جمع ہو جائیں، وہاں انسانیت پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ تھا وہ دور جس میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی۔ فرعون [1] جیسا مستبد شہنشاہ، جس کا نام استبداد اور ظلم کے لیے ضرب المثل ہو گیا، ہامان [1] جیسا برہمنیت کا نمائندہ، مذہبی پیشوائیت کا اجارہ دار اور قارون [1] جیسا رگِ حیات کو چوسنے والا،

---

[1] فرعون، ہامان، اور قارون کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004ء ص ص۔ 109 اور 124 فٹ نوٹ۔

سرمایہ داری کا سب سے بڑا نمائندہ (Representative)' اس دور میں یہ تینوں مصروفِ کار ہیں۔

دوسروں کے ساتھ لڑنے کے لیے عسکری قوت اور اقتدار کی فراوانی کی مالکہ مذہبی پیشوائیت

جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ یہ لوگ مندروں کے پجاری یا آپ کی مسجدوں کے امام ہی نہیں ہوتے تھے کہ جنھیں کمین کہا جاتا ہے' یہ تو بڑی شوکت اور حشمت کے مالک ہوتے تھے۔ مملکت کی قوت ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی' اگر چہ ان کی صورت یہی تھی۔ لڑنے بھڑنے کے لیے تو یہ عسکریوں کو آگے کیا کرتے تھے' ذمہ داری ساری بادشاہ کی ہوتی تھی اور سارا کچھ اقتدار انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ یہ تو شروع سے ہی بڑی ہوشیار قوم چلی آتی ہے۔ آپ نے 1965ء ❶ کی جنگ میں بھی دیکھا ہوگا کہ انہوں نے مسجدوں میں بیٹھ کے دعائیں کیں۔ ''کوئی نئیں گیا انہاں وچوں۔'' ❷ یہ تین بلائیں انسانیت کی ہڈیاں توڑ دیتی ہیں: ملوکیت جیسا استبداد' برہمنیت جیسی طبلہ نوازی اور اس کے بعد قارون جیسا مجسمہ سرمایہ داری کا۔ اِس دور میں یہ تینوں یکجا جمع تھے۔ اضطراب میں تڑپتی پھڑکتی بنی اسرائیل جیسی قوم ان کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی۔ یہ تھیں وہ قوتیں جن کے خلاف حضرتِ موسیٰؑ جیسا صاحبِ ضربِ کلیم مبعوث کیا گیا اور ان سے یہ کہا گیا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ' وہ حدود فراموش سیلاب بن رہا ہے' جا کے اُسے روکو۔ جب یہ بات آگے آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ یہ کتنی بڑی عظیم مہم تھی۔

فرعون کے مقابلے میں دو نبی یا دو رسول

عزیزانِ من! اس مہم کے عظیم ہونے کا اس بات سے اندازہ لگایئے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کو بھی یہ التجا کرنا پڑی کہ یہ میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ میرے ساتھ میرا بھائی ہارونؑ بھی کر دیجیے۔ کہنے کو تو یہ ہے کہ اگر یہ اپنے بھائی سے خود ہی کہتے تو وہ ساتھ ہو ہی جاتے لیکن اس حیثیت سے نہیں۔ قرآن نے کہا کہ ہم نے بھی انہیں ایک رسول اور نبی کی حیثیت سے ان کے ساتھ کیا' تو گویا دو رسول' دو نبیؑ اس مہم کے لیے تھے۔ مہم بھی کوئی چھوٹی نہیں تھی۔ انسانیت کی تاریخ میں یہ مہم سرِ فہرست آنے کے قابل ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جس تفصیل سے اس داستان کو بیان کیا گیا ہے کسی اور داستان میں یہ اسناد و تفصیل نہیں ہے۔ جگہ جگہ' قریب قریب' ہر سورۃ میں کسی نہ کسی انداز سے اس کا کوئی نہ کوئی گوشہ سامنے لایا ہی گیا ہے' لایا ہی جانا چاہیے تھا۔ قوموں کے عروج و زوال کے متعلق' جو ابدی قوانین ہیں ان تمام کا ملخص اس داستان کے اندر آ گیا ہے۔ لیکن یہاں تو قرآنِ کریم یونہی طائرانہ سی نگاہ ڈالتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے' یونہی ان کا ذکر کر رہا ہے جیسے حضرتِ ابراہیمؑ کے قصے میں بھی صرف' جو باپ کے ساتھ ان کا مکالمہ ہوا تھا' وہی سامنے آیا' باقی داستان یکجا نہیں بیان کی گئی تھی۔ قرآن کا انداز یہ ہے۔ یہاں بھی کسی انداز سے دو تین فقروں میں اس داستان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ

---

❶ پاک بھارت جنگ جو 1965ء میں لڑی گئی۔ ❷ ان میں سے کوئی بھی نہیں گیا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى (19:51)۔اب اس الکتٰب میں، اس قرآنِ کریم میں، موسیٰ علیہ السلام کا ذکر سامنے لایا گیا۔موسیٰ علیہ السلام کہا تو اس کے فوراً ہی بعد ان کا تعارف یہ کہتے ہوئے کرا دیا کہ وہ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19:51)۔وہ بڑا مخلص انسان اور ہمارا فرستادہ نبی تھا۔ بڑا ہی خالص اور بہت ہی کھرا سونا جسے پانسو کا کہتے ہیں، وہ کسوٹی کے ہر معیار پر پورا اترنے والا تھا۔ یہ ہوتا ہے جسے مخلص کہتے ہیں۔ یہ اس قسم کی شخصیت تھے اور اس کے ساتھ کہا: كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19:51)۔ ہمارا فرستادہ نبی تھا۔ رَسُوْلًا نَّبِيًّا یوں گزر جایئے تو بات کچھ بھی ذہن میں نہیں آتی کہ ٹھیک ہے رسول تھا نبی تھا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا چاہیے۔

قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے کی تلقین ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم کا تو کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس پر سے آپ یونہی گزر جائیں۔ جب اس نے بار بار اس میں تدبر، تعقل، تفکر سے کام لینے کا حکم دیا ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اس کتاب کے الفاظ و اصطلاحات سے فقرے بنیں گے، پھر فقروں سے بات بنے گی، بات کے بعد کتاب بنے گی۔ ابتداء میں تو کتاب کے الفاظ ہی ہوتے ہیں جن پہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور قرآنِ کریم کے متعلق تو پوچھیے ہی نہیں۔ این کتاب دیگر است

رسولاً نبیاً، یہ دونوں الفاظ اکٹھے کیوں آئے؟

بہرحال میں تو عرض کرتا ہوں کہ جب میں ان چیزوں پہ کھڑا ہوتا ہوں تو وجد میں آ جاتا ہوں۔ یہاں کہا: رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19:51)۔ سوال یہ ہے کہ یہاں یہ دونوں لفظ اکٹھے کیوں آئے ہیں؟ اس کی کیا تخصیص ہے؟ کیوں دونوں اکٹھے آ رہے ہیں؟ یہ عربیٔ مبین کی کتاب ہے۔ الفاظ وہی ہیں جو اس دور کے عرب اپنے ہاں استعمال کیا کرتے تھے۔ جب وہ عام لفظ ہوگا تو اس کے وہی معنی ہونگے جن معنوں میں وہ لوگ اسے استعمال کرتے تھے۔ جب وہ پھر Proper Noun، اسم معرفہ بن جائے گا، اصطلاح بن جائے گی، Term بن جائے گی، تو اس کے وہ مختص معانی ہو جائیں گے جو قرآنِ کریم نے بیان کیے ہیں۔ رسول کا لفظ عربوں کے ہاں عام Messenger، قاصد، پیغام رساں کے لیے بولا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں بھی یہ اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ آج بھی اسے انہی معنوں میں وہ استعمال کرتے ہیں حالانکہ میں سمجھتا ہوں، میں نے ایک جگہ لکھا بھی تھا کہ اس کے بعد ہمیں احتیاط برتنی چاہیے کہ یہ لفظ اب عام معنوں میں نہ ہی استعمال کیا کریں لیکن بہرحال ان کی تو زبان کا لفظ ہے۔

جواہر لال نہرو کے لیے رسول امین ﷺ کے الفاظ پر اعتراض

مجھے یاد ہے جواہر لال نہرو جب پہلی دفعہ عربوں کے ممالک میں گیا تو وہاں اسے رسولِ امین کہہ کے ایڈریس پیش کیا گیا تھا اور جب

اس کے متعلق اعتراض ہوا یا پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ کونسی قابلِ اعتراض بات ہے۔ رسولِ امین تو انگریزی میں Messenger of Peace ہے۔ ہم نے تو کہا ہے کہ یہ پیامبرِ امن ہے' امن کا پیغام لانے والا ہے۔ ٹھیک ہے' تو ان کی زبان کے اعتبار سے یہ لفظ صحیح تھا۔ اب قرآنِ کریم جب اسے اسم نکرہ (Common Noun) کے اعتبار سے استعمال کرے گا تو اس کے معنی ہو سکتے ہیں: عام پیامبر' قاصد۔ یہاں رسولاً ہے' الرسول بھی نہیں۔ اگر رسول اللہ کہا جائے گا تو پھر یہ اسم معرفہ (Proper Noun) بن گیا' پھر یہ خدا کا پیامبر ہو گیا۔ اسی لیے اسے ال کے ساتھ کہا جائے گا تو پھر یہ بھی مختص معانی ہو جائیں گے۔ اگر صرف رسول کہا جائے گا تو اس کے معنی تو پھر عام پیامبر بھی ہوں گے۔ اس پیامبری میں دو باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی کا پیغام کسی تک پہنچا دیا جائے' وہ بھی پیامبر ہے۔ یہ ایک چیز ہے۔ خدا کی وحی کسی نبی پہ نازل ہوئی۔ اس وحی کو' کسی شخص نے' ان سے لے کے اور آگے پہنچا دیا۔ یہ بھی پیامبر ہوا۔ تو خیال یہ ہے کہ جنہیں خدا نے نبی یا رسول کہا ہے' ان کے لیے رسولاً کا لفظ آیا ہے۔ پیامبر تو وہ ہو سکتا تھا کہ یہ خود صاحبِ وحی نہیں تھے بلکہ یہ کسی کا پیغام لائے تھے اور اس پیغام کو انہوں نے دوسروں تک پہنچایا تھا۔ خالی رسولاً کے تو یہ معنی ہو جائیں گے۔ لیکن اس نے ساتھ ہی فوراً کہا: نبیًا۔ نبی کے معنی ہوتے ہیں: ''خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے والا''۔ تو پیامبر تھا خدا سے براہِ راست علم پا کر' اس وحی کو' اس پیام کو' دوسروں تک پہنچانے والا۔ اب رسولاً نبیًا جو ہے اس کے معنی واضح ہو گئے کہ ہر پیامبر نہیں صرف وہ پیامبر تھا کہ جو خدا کے ہاں سے نبوت پاتا تھا' اس کو خدا کے ہاں سے براہِ راست علم ملتا تھا' وحی ملتی تھی' اس وحی کے پیام کو وہ دوسرے انسانوں تک پہنچا رہا تھا۔ تو رسولاً نبیًا میں دونوں چیزیں اکٹھی ہو گئیں۔ لیکن اس میں پھر اگلی ایک چیز آئی۔ قرآنِ کریم نے نبی کا لفظ بھی عام معنوں میں استعمال کیا ہے اور پھر یہ رسولوں کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے۔ رسول کے متعلق تو یہ بات جلدی سے سمجھ میں آ گئی۔ وہ جو فوراً نبیًا کہا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا کی طرف سے وحی پا کر' اس وحی کو' دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ نبی کے ساتھ رسول کیوں؟ اور یہی وہ اہم نکتہ ہے جس کے لیے میں نے یہاں کھڑے ہو جانا ضروری سمجھا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے تو آپ سمجھ لیجیے کہ جسے اس نے رسول' رسول اللہ' خدا کا رسول' الرسول کہا ہے' وہ وہی تھا جو خدا کی طرف سے نبوت پا کر اس وحی کو دوسروں تک پہنچاتا تھا۔

نبی کے الفاظ میں ہیکل کا منصب

عزیزانِ من! نبی کے متعلق یہ اصطلاح اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں استعمال ہوتی تھی۔ ان کے ہیکل میں ایک منصب نبی کا تھا۔ وہ نبی اپنے آپ کو سلسلہ انبیاء میں نہیں شامل کرتے تھے یعنی ان رسولوں کے سلسلہ میں اپنے آپ کو شامل نہیں کرتے تھے' جنہیں آپ انبیاء بنی اسرائیل کہتے ہیں جیسے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام' حضرت ہارون علیہ السلام' یا حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت داود علیہ السلام۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر میں آئے' انہیں تو خیر یہودی مانتے ہی نہیں تھے۔ تو یہ جو اس طرح ہیکل کے منصب کے لحاظ سے نبی تھے وہ اپنے آپ کو نبی کہتے تھے۔ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمیں خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ یہ کرتے کیا تھے؟ یہ دوسروں کی قسمت بتایا کرتے

تھے۔ یہ ان لوگوں کا ہیکل کے اندر، مندر کے اندر، ٹیمپل کے اندر، ایک بہت بڑا منصب تھا۔ قرآنِ کریم نے جہاں یہود کے انبیاء کہا ہے، ان میں بعض مقامات پر ان کی طرف بھی اشارہ ہے جو اپنے آپ کو ٹیمپل میں نبی کہتے تھے، وہ اصطلاحی نبوت تو نہیں۔ وہ نبی تو نہیں ہے لیکن وہ اس کے مدعی تھے۔

میں پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم کے کچھ الفاظ پہ زیادہ گہرائی میں جانے سے نظر آتا ہے کہ خدائے علیم وخبیر نے یہ جو اس امتِ محمدیہ کے اندر اس قسم کے باطل عقائد آنے تھے، ان کی بھی تردید ساتھ کے ساتھ کردی۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ نبی کا یہ لفظ استعمال ہوتا تھا، یہ اشارہ اور تصور ٹیمپل کے ان منصب داروں کی طرف تھا جن کا یہ عقیدہ تھا۔ اُن کا یہ دعویٰ تھا کہ انہیں خدا کی طرف سے علم ملتا ہے لیکن وہ اِس طرح کے نبی نہیں ہیں جس طرح کے حضرتِ داود علیہ السلام یا سلیمان علیہ السلام تھے اور جنہیں ہم نبی کہتے ہیں۔ لیکن اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ انہیں خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔

رسالت کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا

عزیزانِ من! خدا کی طرف سے علم ملنے کا جو سلسلہ تھا، یہ ذاتِ محمدؐ پر ختم ہوگیا۔ اسے ختمِ نبوت کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کو خاتم النبین کہا ہے تو خدا کی طرف سے علم پانے کا جو سلسلہ تھا وہ ختم ہوگیا ہے۔ عام معنوں میں لیں گے تو یہ ختم المرسلین نہیں ہوگا۔ رسالت کے معنی ہیں ''اس نبوت کے ذریعے خدا کی طرف سے جو وحی ملی ہے، اُسے دوسروں تک پہنچانا۔'' میں نے کہا تھا کہ ہم یہ لفظ استعمال نہیں کریں گے لیکن اگر آپ دیکھیے تو سلسلہ رسالت تو قیامت تک قائم رہے گا، رسول اللہ ﷺ کی طرف آئی ہوئی وحی، جو قرآن میں ہے، اسے دوسروں تک پہنچانا ہے، اسے عام اصطلاح میں، عربوں کے عام الفاظ میں، پیامبری کہیں گے۔ اسے کہیں گے اب رسالت ہی، لیکن نبوت ختم ہوگئی یعنی خدا سے وحی کا براہِ راست ملنا ختم ہوگیا۔ خدا کی طرف سے جو علم پانا تھا، یہ ختم ہوگیا۔ یہ منصبِ رسالت یا جسے آپ کہیں گے مقصد رسالت، یا جسے آپ کہیں گے فریضہ رسالت، یہ اُس وحی کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ یہ امتِ محمدیہ ﷺ کا فریضہ ہوگیا تھا، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس امت میں ہوا کیا ہے؟

امت میں دعویٰ نبوت

اس امت میں اس امر کے دعوے دار پیدا ہوگئے کہ ہمیں خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے۔ اس دعویٰ نے ختمِ نبوت کو بھی توڑا اور خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کے عقیدے نے بھی فروغ پایا۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہودیوں کے ٹیمپل میں منصب کے لحاظ سے یہ نبی ہوتے تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم ویسے نبی تو نہیں ہیں لیکن ہمیں خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ عزیزانِ من! ویسے اور ایسے نبی میں پھر کیا فرق ہوا؟ نبی تو ہوتا ہی وہ تھا جس کا اختصاص ہی یہ تھا کہ اسے خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا

ہے۔قرآنِ کریم میں ہے کہ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی (53:3)۔یہ جو کچھ تم سے بہ حیثیت رسول کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا۔اس میں اس کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا' وہ علم Objectively خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے' وہ علم اسی کی طرف سے ملتا ہے۔اسمیں اس کے اپنے خیالات وفکر کا کوئی اثر و دخل نہیں ہوتا' وہ اس علم کو آگے پہنچاتا ہے۔انہوں نے جو ٹیمپل کے منصب کے لحاظ سے نبی بنے تھے بھی دعویٰ کیا کہ خدا کی طرف سے انہیں بھی یہ علم ملتا ہے۔تو بھئی یا اللہ! یہ تو نبوت ہوگئی۔

وحی کا نام کشف یا الہام رکھ لیا

کہنے لگے: ہاں اصطلاحی معنوں میں تو یہ نبوت نہیں ہے لیکن بہر حال بات تو یہی ہے کہ خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ہم اسے وحی نہیں کہتے' ہم اسے کشف یا الہام کہتے ہیں۔چلیے صاحب! یعنی نام بدل دینے سے سمجھ لیا کہ صاحب! اس کی حقیقت بدل دی۔وہ حقیقت تو وہاں موجود ہے۔نبوت اسکے سوا کیا ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے' جس میں علم پانے والے کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔یہ نبوت کی اور وحی کی Definition ہے۔ بعینہ اس Definition کے مطابق کہا کہ علم ملتا ہے لیکن یہاں اب اسے نبوت بھی کہا گیا ہے عزیزانِ من! آپ کے ہاں تصوف کی ساری عمارت اسی بنیاد پہ اٹھتی ہے اور یہ یہاں تک آگے چلے جاتے ہیں کہ محی الدین ابن عربی جو ان صوفیائے کرام کا' خصوصاً سرِ خیل ہے' اس سلسلہ میں آپ فتوحاتِ مکیہ اٹھا کے دیکھیے۔وہ کہتے ہیں کہ جہاں سے رسول یا نبی لیتا تھا یعنی جس سر چشمہ علم سے وہ علم حاصل کرتا تھا' یہ اولیاء' ابدال' اوتار اور ہم لوگ وہیں سے علم حاصل کرتے تھے۔کہا: پھر ان میں اور رسول اللہ ﷺ میں یا خدا کی طرف سے آنے والے نبیوں میں کیا فرق ہے؟ کہا: وہ فرق یہ ہے کہ ہمیں خدا جو علم دیتا ہے وہ ہماری اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔اسے آگے پہنچانے کا حکم نہیں ہوتا' منصب نہیں ہوتا یعنی اس لیے ہم رسول نہیں ہیں' ہم نبی ہیں۔

پنجابی نبی کی پہلی زندگی اور ان کی نبوت کی منطق

آپ نے اس بحث پہ غور کیا جو آپ کے ہاں پنجابی نبی [1] کی چلی ہوئی ہے کہ ''من نیستم رسول'' میں رسول نہیں ہوں بلکہ میرے پاس نبوت ہے۔آپ نے غور فرمایا: یہ بات کہاں سے آئی تھی؟ ان کے ہاں اپنی کوئی بات نہیں تھی۔یہ ساری جتنی ٹامک ٹوئیاں وغیرہ تھیں' یہ ہمارے لٹریچر میں تھیں' یہ سارا کچھ انہوں نے وہاں سے مستعار لیا۔مرزا صاحب کی پہلی ساری زندگی سیالکوٹ کے زمانے کی تصوف میں گزری ہوئی ہے۔ان کے ہاں خود اپنی داستان کے اندر یہ موجود ہے' وہاں یہی مراقبے' ریاضتیں' مکاشفے' یہ سب کچھ وہ کیا کرتے تھے' اور کہتے تھے کہ من نیستم رسول' یعنی میں رسول نہیں۔اب انہوں نے فرض کیا کہ اس تصوف والے علم میں جو انہیں خدا کے ہاں سے ملتا ہے اور نبوت والے علم میں فرق یہ ہے کہ تصوف کا علم ان کے اپنے لیے ہوتا ہے اور خدا کا وہ علم جو نبوت کی شکل میں ہے' جو نبی

---

[1] مرزا غلام احمد آف قادیان (1908-1835)۔

کووحی کے ذریعہ ملتا ہے' تو اسے حکم ہوتا ہے کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (5:67)۔ تم اس ضابطۂ حیات کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو۔ اس طرح سے اس کا فریضہ ہے کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچائے' اس اعتبار سے وہ رسول ہوتا ہے۔ اب انہوں نے یہ فرض کیا کہ یہی جو اس کا دوسروں تک پہنچانا ہے وہ اس کی کتاب کہلاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تصور یہودیوں کے ٹیمپل میں موجود تھا۔ ان کے ہاں کے انبیاء کا یہی دعویٰ تھا کہ خدا کے ہاں سے علم تو ہمیں ملتا ہے لیکن ہم اس کے لیے مامور نہیں ہیں کہ ہم وہ علم دوسروں تک بھی پہنچائیں۔

تصوف کا باطنی علم

یہاں بھی یہ مروج ہے کہ آپ کے ہاں تصوف میں جو علم ملتا ہے' یہ باطنی علم ہوتا ہے اور سینہ بہ سینہ چلتا ہے۔ اسے عام نہیں کیا جاتا' اسے عام نہیں پہنچایا جاتا۔ جب ان سے کہا جائے کہ صاحب! یہ ہے کیا؟ تو وہ کہتے ہیں کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

اس شراب کے نشے کا علم تو اسے ہوسکتا ہے جو خود شراب پیے' نشے کا کسی کو سمجھایا نہیں جا سکتا' اس میں زاہد کے متعلق تو یہ بات بڑی کھری کہدی: زاہد نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو

میں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے رسالت کا نہیں

زاہد! کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی! شرابی خود بھی پیتا ہے اور کہتا ہے: لذت اس وقت ملتی ہے جب دوسرے کو ساتھ شامل کر لیتا ہے واہ! نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو۔ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ ''نہ خود پیو'' یہ تو ٹھیک ہے کہ ''نہ کسی کو پلا سکو'' یہ جو ہماری شراب کا نشہ ہے یہ ہم کسی کو بھی نہیں پلا سکتے' نہیں بتا سکتے' نہیں پڑھا سکتے لیکن نہ خود پیو والی بات غلط ہے۔ یہ علم ہمیں ملتا ہے۔ لہٰذا اس [1] نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میرا دعویٰ رسالت کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ نبوت کا ہے۔ ان سے یہ بات پوچھی گئی کہ صاحب! یہ نبوت اور رسالت میں تخصیص کیا ہے' ان دونوں میں تفریق کہاں سے ہے؟ تو جواب میں انہوں نے جھٹ سے ایک روایت' ایک حدیث بتا دی۔

ایک خودساختہ روایت

یہ احادیث و روایات تو ان حضرات کے لیے ایسا کھلا ہوا دروازہ تھا کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ وحی ختم کرنے کے بعد' جو دروازہ بند کیا ہے تو انہوں نے اس کمرے میں اتنی کھڑکیاں کھول دیں کہ دروازے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہ کھڑکیاں یہودی روایات کی تھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دو برتن دیئے' ان کے منہ بند تھے' اوپر کپڑا لپیٹا

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908)۔

ہوا تھا۔ یہ حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی آخری زندگی میں ایمان لائے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی حیات میں کوئی تین سال کا عرصہ پایا ہے اور جتنی بھی روایتیں صحابہ سے منسوب ہوئی ہیں وہ اگر ایک طرف رکھ دی جائیں اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف جو روائتیں منسوب' ہیں وہ دوسری طرف رکھ دیں تو ان کی تعداد ان سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو بچپن کے دوست' یارِ غار' سب سے پہلے ایمان لانے والے' حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی خلافت پہ آنے والے یعنی اتنی زیادہ رفاقت کہ جسے خود خدا نے قرآن کے اندر یارِ غار کہہ کر پکارا ہو' اس سے بڑی رفاقت اور کیا ہے۔ ان کی طرف سے تو صرف چودہ حدیثیں مروی ہیں' لیکن حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے تین چار ہزار (اور اس کے علاوہ بھی) مروی ہیں۔ اور انہی کی یہ ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ نے مجھے دو برتن دیئے۔ آپ دیکھیے کہ یہ وضعی روایتیں کہاں تک پہنچتی ہیں۔ ان میں سے ایک برتن تو میں نے کھول کے عام کر دیا ہے اور یہ جو تین چار ہزار کے قریب روایتیں ہیں وہ ایک برتن کے اندر تھیں' وہ تو میں نے کھول کے عام کر دیا اگر دوسرا برتن اسی طرح سے میں عام کروں تو انہوں نے یوں کہا کہ ایسا کرنے پر میرا گلا کاٹ دیا جائے۔

تصوف کی خلوت گاہوں کا علم

یہ ہے وہ بند برتن جو سینہ بہ سینہ باطنی علم کے ذریعے' آپ کی تصوف کی خلوت گاہوں میں' آگے چلتا ہے لیکن اِسے باطن' چھپا کر' بند رکھا جاتا ہے' یعنی اسے عام نہیں کیا جاتا۔ یعنی یہ نبوت ہے' رسالت نہیں ہے۔ جی! آپ نے غور فرمایا ہے کہ میں کیوں ان دو لفظوں پہ ٹھہر گیا۔

تصوف کے سلسلہ میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا چھٹا لیکچر [1]

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک لیکچر میں اس فرق کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود ان کے الفاظ آپ کے سامنے لے آؤں۔ وہ تو انگریزی میں لیکچر ہیں۔ وہ ان کے Six لیکچر ہیں۔ وہ ان میں کا ایک پانچواں لیکچر ہے۔ اس کا ترجمہ میں آپ کو اردو میں سنواتا ہوں۔ اس لیکچر کی ابتداء اس طرح سے ہوتی ہے کہ ''محمد عربی ﷺ فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے اگر میں اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔'' یہ اقبال کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ انہوں نے کوٹیشن دی ہے اور کہا ہے کہ ''یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔'' یعنی یہ جو صوفیوں کا دعویٰ ہے' اس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے دعویٰ کے متعلق جو شعورِ نبوت میں اور اپنے دعویٰ میں جو فرق کیا ہے وہ یہ

[1] Iqbal, Allama Muhammad (1989). The Reconstruction of Religious thoutht in Islam, Lahore: Aqbal Academy Pakistan, P. 99.

ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ اس سے بہتر الفاظ شاید ہمارے تصوف کے لٹریچر میں نہ ملیں' جن میں انہوں نے یہ کہہ دیا ہے۔ پھر سن لیں کہ عبدالقدوس بنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فرق کو بیان کرنے کے لیے کہا ہے کہ ''محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔'' یہ کہنے کے بعد اقبالؒ لکھتا ہے: ''ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا ہے تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اس لیے کہ اس زمانے کے طوفان پر تسلط پائے۔'' یہ اقبال ہے' کہتا ہے کہ اب ''وہ واپس آتا ہے تا کہ زمانے کے طوفان پر' تاریخ کی قوتوں کو' اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے ولولہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے' نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے' وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی وہ کس انداز کی ہے۔''

تصوف کی دنیا میں انسان کی چلہ کشیوں اور ریاضتوں کی حقیقت

آپ نے غور فرمایا کہ یہ فرق کیا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ ختمِ نبوت کے بعد خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا کوئی امکان ہے۔ یہ سب امکانات ختم ہو گئے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے' تو وہ وحی ہے' اس کا نام کشف یا الہام رکھ دینے سے' یہ کچھ وحی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کر کے وہ ختمِ نبوت کو توڑتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے بارے میں میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' بار بار یہ چیزیں کہنی پڑتی ہیں کہ جسے یہ خدا کی طرف سے علم کہا جاتا ہے یا اس علم کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی طرف سے حاصل کیا جاتا ہے' وہ دراصل انسان کی اپنی ہی بعض ریاضتوں سے Will Power کو Concentrate کرنے کا نتیجہ ہے یعنی یہ جو چلے کشیاں ہوتی ہیں' وہ ایک خاص تکنیک ہے۔ اس خاص فنی تکنیک سے انسان کے اندر جو کچھ اپنی صلاحیتیں ہوتی ہیں' وہ صلاحیتیں مرتکز ہو جاتی ہیں' Concentrate ہو جاتی ہیں اور پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مجھے خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ یہ جسے آپ وجدان یا Intuition[1] کہتے ہیں' یہ چیز بھی انسان کی اپنی ہی مرتکز صلاحیتیں

---

[1] اس نکتے کے مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ النحل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ ۲۵ بی گلبرگ' لاہور' ۲۰۰۳ء عنوان ''وحی وجدانی نہیں ہوتی''۔ ص ص۔ 273-274

ہوتی ہیں۔ جب وہ فکری طور پر اپنے آپ کو 'اپنی فکر کو' ایک نقطہ پہ مرکوز کرتا ہے تو انسان کے اندر بہت سی ''پھیلی ہوئی قوتیں'' مرتکز ہوجاتی ہیں۔ شاعر بھی اسے یہی سمجھتا ہے کہ یہ میری اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ آمد ہے: بقول غالب ❶

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

ان کے ہاں ایک لفظ سروش ❷ ہے۔ یہ وہی جبرئیل کی بجائے ایک فرشتہ ہے جو انہوں نے مقرر کیا ہے اسے یونان والے میوز (Muse) کہتے تھے جہاں سے میوزک (Music) کا لفظ آیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ایک فرشتہ ہے۔ وہ نازل ہوتا ہے۔ یہ شاعر بھی' جو اپنی فکر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ آورد نہیں ہے' آمد ہے۔ آورد تو وہ ہوتا ہے جس میں اپنی کاوشوں کو دخل ہو اور یہ شاعر کہتے ہیں کہ نہیں' اصل شعر وہ ہے جو آمد ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس کا ہمیں بھی پتہ نہیں کہ وہ کیسے آجاتا ہے۔ بس وہ ایک خیال آتا ہے اسی سے کہتے ہیں: صریرِ ❸ خامہ ❹ نوائے سروش ہے۔ لیکن غنیمت یہ ہے کہ وہ اسے نبوت نہیں کہتے۔ یہ کھلے کھلے سے بادہ نوش ہوتے ہیں۔ یہ نوائے سروش پہ پیتے بھی ہیں' پلاتے بھی ہیں۔ یہ وجدان (Intuition) کو اس سے الگ کردیتے ہیں۔ وجدان (Intuition) بھی حقیقت میں یہی ہوتا ہے۔ اس میں انسان کی اپنی فطری قوتیں ایک نقطہ پہ مرتکز ہوتی ہیں اور اس سے انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ میری فطری چیز نہیں ہے کیونکہ جب وہ اس عادت سے الگ ہوتا ہے تو پھر سمجھتا ہے کہ اس قسم کے خیالات نہیں آرہے تو یہ اس فریب میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ کچھ دانستہ نہیں ہوتا' اگر دانستہ ہوا تو پھر وہ پیغمبری کا دعویٰ کرتے ہیں' پھر وہ اپنا کاروبار چلاتے ہیں' یہ اس وہم میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور اگر اجازت دیجیے تو پھر میں کہوں گا کہ ایک زمانے میں' میں بھی کشف والہام کا مہابلی تھا۔ ❺

میں بھی ایک زمانے میں اس کشف والہام کا مہابلی ہوتا تھا

قلندر حرفِ گوید دیدہ گوید

یہ بندہ ناچیز کی سنی سنائی باتیں نہیں ہیں۔ میں تو آپ سے اپنی آپ بیتی سنا رہا ہوں۔ ہم بھی کبھی اس کشف والہام کے مہابلی ہوتے تھے۔ ہم بھی کبھی اس فریب میں مبتلا ہوتے تھے۔ آپ اس چیز کو معاف رکھیے گا' جسے میں فریب کہتا ہوں۔ اس وقت تو ہم یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ یہ فریب ہے۔ درحقیقت خدا کی طرف سے' اپنی فکری کاوشوں کے بغیر' براہِ راست علم کا ملنا وحی ہے' یہ نبوت ہے' یہ سلسلہ اب ختم ہوگیا۔

---

❶ مرزا اسداللہ خاں غالب (1869-1797)۔ دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002ء ص۔ 162

❷ سروش: یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے معنی ہیں: آوازِ غیب' الہام۔ اصطلاحی طور پر یہ پیغام الٰہی لانے والا فرشتہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح جبرئیل علیہ السلام کو کہتے تھے۔ ❸ صریر: یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں صدا' قلم چلنے والی کی آواز

❹ خامہ بمعنی قلم ❺ شہ زور

اس شے کا کچھ بھی نام رکھ دیجیے' اصل کے اعتبار سے یہ وہی رہے گا۔ [1] یہ ختمِ نبوت کی کڑی کو توڑنے کے مرادف ہوگا۔

عزیزانِ من! اسی نے تو اس امت کے اندر یہ مصیبت ڈالی ہے کہ ان تمام چیزوں کو ہم اس لیے برداشت کرتے چلے گئے کہ یہ تصوف ہے' یہ کشف ہے' یہ الہامات ہیں' یہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں' مقربِ الٰہی ہیں' اولیا اللہ ہیں' یہ سارے الفاظ ہی الفاظ ہیں اور اصل کے اعتبار سے' یہ نبوت ہے' یہ نبی ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے فرق یہ کیا کہ یہ نوائے سروش ہے۔ اور یہ وہی ہے جو ابھی ابھی میں نے آپ کے سامنے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ ہی کے پیش کردہ اقتباس میں دیا ہے۔ یہ صوفیا میں بہت بڑا مقام رکھتے تھے۔

دیوبندی حضرات کا نظریۂ حیات

دیوبند کے تمام حضرات میں بظاہر تو آپ کو نظر آئے گا کہ انہیں تصوف سے کوئی تعلق نہیں بلکہ انہیں تو ہمارے ہاں گلابی وہابی کہتے ہیں۔ وہابی تو وہ اہلحدیث ہوئے اور گلابی وہابی یہ دیوبندی تصوف والے۔ ان کے ہاں صورت یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اس قسم کی شریعت کے بھی مدعی ہوتے ہیں' دوسری طرف یہ صوفی بھی ہوتے ہیں۔ یہ داب بھی لیتے ہیں' مراقبے بھی کرتے ہیں' تعویذ گنڈے بھی لکھتے ہیں' یہ سارا سلسلہ بھی ان کے ہاں ہوتا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو اس طرح کے صوفی نہیں کہلاتے۔ انہیں ہمارے ہاں پنجاب والے' گلابی وہابی کہا کرتے ہیں۔ مجھے دوسروں کا تو معلوم نہیں کہ وہ انہیں کیا کہتے ہیں۔

مولا حسین احمد مدنی بھی صاحب کرامت تھے

ان گلابی وہابیوں کے ہاں کا جو سلسلہ ہے وہ حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ ہی کے زیرِ قول ہے اور یہ کہتے بھی ہیں۔ ان کے ہاں کشف و کرامات اسی طرح سے سرزد ہوتی ہیں۔ اور تو اور مولانا حسین احمد مدنی اپنی زندگی میں صاحبِ کرامات ہیں۔ آپ میں سے بھی کسی کو اس شے کا خیال بھی نہیں آیا ہوگا۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس میں وہ آپ اپنی کتنی کرامات گناتے ہیں۔ لیکن تصوف کھلا ہوا ہو یا اس انداز کا ہو' وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ علم ہمارے ہی لیے ہے۔ یہ آگے پہنچانے والی بات نہیں ہے۔ مگر یہ اسے نبوت نہیں کہتے' کشف والہام کہتے ہیں۔ یہ وحی اور کشف والہام میں فرق کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو کشف والہام ہے' یہ ہمارے ہی لیے ہے' یہ آگے پہنچانے کے لیے نہیں ہے۔ اگر یہ آپ ہی کے لیے ہے تو صاحب! ہمیں اس سے کیا واسطہ؟ یہ کشف والہام ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں اس سے کیا! [2] وہ تو کہہ گیا ہے کہ:

---

[1] اس نکتے (وحی' وجدان' القاء) کی مزید تشریح و تفصیل کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن: النحل' ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' 2003ء' ص ص۔ 274-273

[2] مرزا اسداللہ خان غالب (1869-1797)۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ارے آپ کا یہ علم لدنی خداوندی ہی سہی۔ اگر یہ میرے دکھ کی دوا نہیں کرتا تو مجھے اس سے کیا فائدہ؟ میں اس بحث میں پڑوں ہی کیوں؟

سرسید رحمۃ اللہ علیہ❶ کا جواب مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق

سرسید احمد خان سے مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق پوچھا تھا۔ عزیزانِ من! یہ سرسید احمد خان بھی خوب آدمی تھے' بڑے صاف دماغ کے مالک تھے اور بڑی شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ ان سے پوچھا یہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی الہام کا' کشف کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انہی کے لیے ہے' کسی دوسرے کے لیے نہیں تو مجھے اس بحث میں سر کھپانے کی چنداں فرصت نہیں۔ یہ بحث ہی بے کار ہے: فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں۔ اور اگر یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اِس الہام' اس کشف' کی بنا پر حاصل کردہ علم کو آگے پہنچانا ہے تو پھر اس علم کو آگے پہنچانے کے نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ کس قسم کے ہوں گے۔ اِس سلسلے میں بھی مجھے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا کیا؟ یہ باقی تمام تو یہی کہتے رہے کہ یہ علم صرف ہمارے ہی لیے ہے مگر انہوں نے یہ کہا کہ ہاں' یہ دعویٰ رسالت ہمارے لیے نہیں' اسے آگے بڑھنا ہے اس لیے یہ عوام کے لیے ہے۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! اس سے اور بڑا دعویٰ رسالت کیا ہوسکتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے نزدیک نبی اور رسول میں فرق

اب بحث اس سے آگے چلی ہے صاحب! کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے مگر نبی صاحب کتاب نہیں ہوتا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہیں خدا کے ہاں سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے' اِن کا دعویٰ ہے کہ انہیں کشف والہام ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے اِس دعویٰ کو وحی کہتے ہیں۔ یعنی دعویٰ وحی کا ہے اور ان کے ذہن ونظر کی کیفیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی دو آیتیں بھی ان کے سامنے نہیں ہوتیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول وہ ہوتا ہے جس کو کتاب ملتی ہے اور نبی وہ ہوتا ہے جسے کتاب نہیں ملتی۔ قرآنِ کریم نے بالتصریح' سورۃ حدید میں' یہ کہا ہے کہ ہم نے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کتابیں نازل کیں۔ **لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ** (52:2)۔ ہم نے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ہر ایک کے ساتھ کتابیں نازل کیں۔ اس آیت میں یہ بات ہوگئی کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے۔ اب سورۃ بقرۃ کی آیت دیکھیے۔ اس میں ہے: **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ**

---

❷ سرسید احمد خان (1898-1817)۔

مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ (2:213)۔نوعِ انسان ابتداء میں ایک عالمگیر برادری کی طرح رہتے تھے پھر انہوں نے اختلافات پیدا کر لیے' ان اختلافات کومٹانے کے لیے خدانے نبیوں کو بھیجا۔ یہ ہے فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ (2:213) نبیوں کو بھیجا۔ کیوں بھیجا؟ تا کہ وہ مبشرین اور منذر بن ہوں۔یعنی وہ اختلافی زندگی کے نتائج وعواقب سے انہیں آگاہ کریں اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوش خبری سنائیں۔اِن اختلافات کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ ہر فرد اور ہر گروہ کی عقل اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔دوسروں کا مفاد اُس کے سامنے ہوتا ہی نہیں۔اس مقصد کے لیے وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ الْکِتٰبَ (2:213)۔ ان سب کو کتاب دی۔غور فرمائیے' کتنی واضح آیت ہے کہ ہر نبی بھی صاحبِ کتاب ہے۔نبیین بھی مَعَھُمُ الْکِتٰبَ ہیں۔مگر یاللعجب کہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں صاحب! وہ نبی ہوتا ہے مگر اسے کتاب نہیں ملتی اور رسول وہ ہوتا ہے جسے کتاب ملتی ہے۔اور یہ اسی پر اکڑے ہوئے ہیں۔

نبی ہے اور وہ رسالت کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے

عزیزانِ من! اب ان دولفظوں کے اوپر آیئے تو بات واضح ہو جائے گی اور پھر آپ بھی میری طرح وجد میں آ جایئے گا کہ قرآنِ کریم نے انبیاءکرام' جو خدا کی طرف سے آنے والے نبی تھے' کے متعلق کہا: (مگر یہ کچھ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے متعلق نہیں کہا) رَسُوْلًا نَّبِیًّا (19:51)۔یہ نبی ہے' رسالت کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔عزیزانِ من! رسول خدا سے علم پا کر یہ کچھ کہتا ہے۔کوئی رسول ایسا نہیں ہوسکتا' جو نبی نہ ہو۔کوئی نبی ایسا نہیں ہوسکتا' جو رسول نہ ہو۔ اس کے لیے تو وہ الطاف حسین حالی[1] کے بڑے پیارے الفاظ ہیں' اگرچہ حرا کا قصہ تو خیر بعد کا ہے' لیکن اس کی بناء یہ ہی سمجھ لیجیے کہ وہاں تک نبوت کا علم پایا ہے تو اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ:

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

یہ ہے نبوت اور یہ ہے رسالت! یہ دو الگ الگ مناصب نہیں ہیں۔جب وحی ملتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (5:67)۔اے رسول! تم اِس ضابطۂ ہدایت کو' جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاؤ۔یہ تیری ذات کے لیے نہیں ہے۔اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاؤ اور اگلے الفاظ ہیں: اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (5:67)۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یہ فریضۂ رسالت کی عدم ادائیگی ہوگی۔ اگر تم نے یہ فریضہ تبلیغ ادا نہ کیا تو تم نے رسالت کا فریضہ ادا نہیں کیا۔ہر رسول' نبی ہوتا تھا اور ہر نبی' رسول ہوتا تھا۔عزیزانِ من! ان دونوں فرائض میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔یہ

---

[1] الطاف حسین حالی (1914-1834)۔آپ ''مسدس حالی'' کے خالق ہیں۔

تفریق کرنا امت کے اندر تخریب پیدا کرنا ہے۔

نبی اور رسول ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں

اب وہ بات آپ کے ذہن میں آئے گی جو میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے یوں نہ گزر جایا کیجیے' یہ کھڑے ہو کر سوچنے کا مقام ہے۔ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا یہ تھا اور کئی ایک اور مقامات پہ بھی یہی آیا ہے۔ ان انبیائے کرام علیہم السلام یا ان رسولوں کے متعلق' جو خدا کی طرف سے آئے تھے' یہ الفاظ ہیں: رَسُوۡلًا نَّبِيًّا ۔ اور یہ اسی لیے ہیں کہ کوئی یہ دعویٰ نہ کر دے کہ ہاں علم تو خدا کی طرف سے مجھے ملتا ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ اسے اپنی ذات تک رکھو۔ جو کوئی یہ کچھ کرتا ہے یاد رکھو! وہ ہماری طرف سے بھیجا ہوا نبی نہیں ہے۔ اگر وہ نبی تھا تو وہ یہ بات نہ کہتا کیونکہ اس کا رسول ہونا ضروری تھا' اور اگر کوئی دعویٰ رسالت لے کے تمہارے پاس آیا ہے تو یاد رکھو! ہمارا رسول اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہماری طرف سے عطا کردہ وحی کو تم تک پہنچائے۔ اگر وہ اس وحی کو نہیں پہنچاتا تو وہ الرسول نہیں ہو سکتا' وہ خدا کا رسول نہیں ہو سکتا۔ اسے وحی کو پہنچانا ہو گا۔ اور محض وحی کو آگے پہنچانے والے جو بھی اشخاص ہیں' ان میں کا ہر شخص ضروری نہیں کہ وہ نبی بھی ہو۔

رسالت کے سلسلہ میں ایک اہم ترین وضاحت

عزیزانِ من! حضور ﷺ کے بعد' یہ وحی جو حضور ﷺ کو ملی تھی' اُس کا پھر کسی اور کو ملنے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا۔ لیکن وہ وحی تو قرآنِ کریم کے اندر ہے۔ اب اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کا جو فریضہ ہے' جسے ہم تبلیغ کہتے ہیں' یہی رسول کا فریضۂ رسالت تھا' یہ فریضہ تو امت نے ادا کرنا ہے۔ لیکن یہ امت اس فریضے کی ادائیگی کے ساتھ "رسولًا نبیًا" نہیں ہو سکے گی۔ آپ نے غور فرما لیا' جو کچھ میں نے عرض کیا ہے۔ دیکھتے ہیں کتنے اہم ہیں قرآن کے الفاظ! میں نے تو اس بحث میں عرض کیا تھا کہ ہمیں یہ رسولاً لفظ بھی نہیں ادا کرنا چاہیے۔ امت کا فریضۂ رسالت بھی نہیں کہنا چاہیے لیکن اگر ان معنوں میں لیا جائے یعنی تبلیغ کو رسالت کے معنی میں لیا جائے کہ یہ دوسری طرف پیغام پہنچانا تو پھر اس میں تفریق یاد رکھیے گا کہ یہ جو فریضہ رسالت ہے' نبوت والا فریضہ رسالت نہیں ہے' نبوت تو وہ ہے جو ہمیں وحی خداوندی عطا کر رہی ہے۔ اس کو دوسروں تک پہنچانے کا کام ہے' اسے تبلیغ ہی کہنا چاہیے۔ وہ ایک ہی شخصیت ہوتی تھی' جو نبی بھی ہوتا تھا اور رسول بھی ہوتا تھا۔ اور جب رسول ہوتا تھا تو کہتا تھا کہ اپنی طرف سے میں کچھ نہیں کہتا' نبوت کا جو علم مجھے حاصل ہوا ہے' میں اسے تم تک پہنچاتا ہوں۔ لہٰذا یہ ایک ہی شخصیت رسولًا نبیًا ہوتی تھی۔

اب قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مُوۡسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخۡلَصًا وَّكَانَ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيۡنٰهُ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنِ وَقَرَّبۡنٰهُ نَجِيًّا (19:51:52)۔ "اسی طرح اے رسول! تو اس کتاب (قرآن) میں موسیٰ کی سرگزشت بیان کر' وہ بڑا مخلص انسان اور ہمارا فرستادہ نبی تھا۔" اور ہم نے اُسے کوہ طور کی دائیں جانب سے پکارا اور وحی کے سربستہ راز بتانے کے

لیے اپنے قریب کرلیا۔'' عزیزانِ من! قرآن کے کیا الفاظ ہیں! کیا کیا انداز ہے! کہا: ہم نے اسے پہاڑ کی ایک جانب سے آواز دی۔ یہ پہاڑ بڑی برکات کا مہبط بننے والا تھا۔ یعنی اس پہاڑ کو بھی قرآن نے ایمن کہہ دیا حالانکہ وہ تو وہی پہاڑ ہے' اس میں تو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ لیکن چیز یہ تھی کہ وہاں انسانیت کو زندگی عطا کرنے والی برکات سحاب کرم سے نوازنے کے احکام وہدایات ملی تھیں۔ اس مقام کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ وہ مقام بھی ایمن تھا جیسے ہم مکۃ المعظمہ کہتے ہیں۔ وہ اسی قسم کے گھر ہیں جیسے کہ ہر بستی کے گھر ہوتے ہیں لیکن اس کی تعظیم اس لیے ہے کہ وہ ان ہدایاتِ خداوندی کا مرکز بن گیا ہے۔

قرآن حکیم کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کرنے کا انداز

قرآن کریم کے الفاظ ملاحظہ کیجیے اور پھر میں اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تو نہیں کہتا کہ داد دیجیے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس چیز کا لطف اٹھایئے۔ **قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا** (19:52)۔ آپ آواز دیتے ہیں:''ذرا اورے آئیں ناں' اور اورے آ' کان اچ اک گل کہنی اے' کیہڑی گل میں تینوں کن اچ کہنی ہوندی اے اونوں کیندے نیں اورے آ۔'' ❶ **قَرَّبْنٰهُ** (19:52)۔ ہم نے اسے آواز دی کہ'' ذرا اورے آ موسیٰ''❷ اس نے کہا کہ ''ایتھے ای گل سنا دے۔''❸ **قَرَّبْنٰهُ** ۔ تو کاہے کے لیے کہا: **نَجِيًّا** (19:52)۔ ہم نے ایک راز کی بات تم سے کہنی ہے۔ کیا کتاب ہے قرآن کی!

نزولِ وحی کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے محسوس سے محسوس ذرائع بھی ختم کر دیئے گئے

عزیزانِ من! ایک انسان دوسرے انسان سے یہ راز کی بات کہے گا۔ کتنا ہی اس کو رازِ مستور رکھے' کتنی ہی آہستہ آواز سے کہے' اس میں کچھ نہ کچھ تو محسوس چیز آئے گی۔ اگر وہ محسوس شے نہ ہو تو اس کے کان تک آواز ہی نہیں پہنچ سکتی اگر محسوس آواز نہ ہو' تو کوئی کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو اس میں تو یہ محسوس سی شے آ ہی جائے گی۔ لیکن یہ جو راز تھا' تو اُس کے لیے یوں کہا گیا ہے کہ ''قریب آ جا'' کیسا حسین انداز ہے کہنے کا! لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں' اس راز کے متعلق یہ کہا ہے کہ جبریل اسے قلبِ نبی کے اندر اتارتا تھا۔ بیچ میں سے سارے محسوس ذرائع ہی نکل گئے۔ قرآن حکیم میں اسے ''القا'' کہا گیا ہے۔ وہ روح القدس نازل کرتا تھا۔ وہ بھی مادی پیکر نہیں تھا۔ اس کے جو کمیونیکشن کے ذرائع ہیں' ان میں کوئی مادی چیز نہیں اور وہ سیدھا قلبِ نبوی میں اترتا تھا۔ ''جو اترتا تھا'' وہ یہ نہیں تھا کہ یونہی کچھ مبہم سے خیالات ہوتے تھے اور یہ بھی نہیں کہ نبی کریم ان خیالات کو اپنے طور پر' اپنے الفاظ میں' بیان کرتا تھا۔ قطعاً نہیں' بالکل نہیں! کلام اللہ اس کو کہا گیا ہے اور یہاں بھی جو کہا گیا ہے' اتنا قریب کرنے والے کے کان میں جیسے کچھ کہنا کہتے ہیں: **كَلَّمَ اللّٰهُ**

---

❶ ذرا ادھر آنا تو۔ اور ادھر آ' مجھے تمہارے کان میں ایک بات ڈالنی ہے۔ جو بات کان میں ڈالنی ہوتی ہے یہ لفظ اس کے لیے بولتے ہیں۔ ذرا ادھر آیئے گا۔

❷ اسے موسیٰ علیہ السلام ذرا ادھر آیئے گا! ❸ یہیں بات بتا دو۔

مُوْسٰی تَكْلِيْمًا (4:164) کلام کہا ہے' لیکن کلام کے متعلق کہا یہ ہے کہ نبی کے قلب میں اس کو ڈالا جاتا تھا تو جو براہِ راست علم کسی کے دل میں ڈال دیا جائے اس میں تو محسوس ذریعہ ابلاغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' اور جو میں نے عرض کیا ہے کہ محض یونہی خیالات نہیں تھے' ایک یہ بھی ہمارے ہاں مسئلہ چلا ہوا تھا' پوچھو نہیں کہ پھر یہ امت جو ہے' جب ان کے سامنے عملی پروگرام نہ رہے تو پھر یہ مسائلِ نظری کے اندر الجھ جاتے ہیں اور اسے دین کی بہت بڑی خدمت کہا جاتا ہے۔

ویلی جٹی اُن ویلے [1]

وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ''ویلی جٹی اُن ویلے۔ تے سارے اُن ویلدے پۓ سَن' ویلے ہوکے''[2] یہی بحث چلی ہوئی تھی کہ ''کیا یہ خیالات خدا کی طرف سے آتے تھے یا الفاظ بھی خدا کی طرف سے آتے تھے؟'' اس کے اوپر بڑی بڑی بحثیں چلی ہوئی ہیں۔

ہمارے ہاں یونانی فلسفہ اعتقادات کی حد تک جا پہنچا

وہ جو یونانی فلسفہ آپ کے ہاں منتقل ہوا ہے' پوچھو نہیں کہ وہ آپ کے ہاں کتنی ابلیسی شرارتیں پھیلا گیا۔ یہ ساری بحثیں ان کے ہاں ہوتی تھیں' وہاں یہ بچپتی تھیں۔ یہ فکری بحثیں تھیں' فکری طور پر وہ کرتے تھے۔ یہاں ان فکری بحثوں Theoretical Discussions نے اعتقادات کی حیثیت اختیار کر لی حتیٰ کہ نبوت کی تشریح غیر نبیوں کے خیالات کی رو سے کی جانے لگی۔ اللہ اکبر! یاللعجب!!

نبی ﷺ کا علم خداوندی باالفاظ تھا

بہر حال' غنیمت ہے کہ ان کا فلسفہ ہی اس مقام تک پہنچ گیا اور انہوں نے یہ کہہ دیا بلکہ اب تو ان کے ہاں کا یہ مسلمہ بن گیا ہے کہ ''کوئی خیال بغیر لفظ کے انسان کے ذہن ہی میں نہیں آ سکتا' اور کوئی لفظ اس کی زبان پہ نہیں آتا جس کے پیچھے خیال نہ ہو۔'' تو پہلی چیز یہ ہے کہ ''کوئی خیال بغیر لفظ کے آ ہی نہیں سکتا۔'' یہ بڑی بات ہے' تو اسی لیے یہ جو نبی کو علمِ خداوندی دیا جاتا تھا' یہ باالفاظ ہی تھا' یہ حقیقتاً کلام اللہ تھا۔ اب یہاں بھی ہمارے ہاں دو قسم کی وحی آ گئی ہے صاحب! پوچھو نہیں اس امت نے قرآن چھوڑ کے کیا کچھ کیا! یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک تو وہ وحی ہے کہ جو الفاظ کے ذریعے نبی کو ہی ملتی ہے' یہ نبی کو باالفاظ ملتی ہے اور دوسری یہ کہ اسی نبی کو وہ وحی بھی ملتی ہے جس میں الفاظ نہیں ہوتے' خدا کے خیالات ہوتے ہیں' الفاظ نبی کے اپنے ہوتے ہیں۔ بہر حال' یہ عقیدہ ان یہودیوں کے ہاں تھا کہ خیال بغیر لفظ کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا ہم انہیں معزول خیال کرتے ہیں کہ انہیں معلوم ہی نہیں تھا۔

---

[1] کام کاج سے فارغ جٹی اون بیلے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کی شائع کردہ کتاب ''مطالب القرآن فی دروس القرآن: سورہ النحل' ۲۰۰۳ء' عنوان ویلھی جٹی اُن ویلے۔ ص ص۔ 243 تا 244۔

[2] نہ کام' نہ کاج۔ اب تو سبھی فارغ ہو کر بے مقصد کام میں لگے ہوئے ہیں۔ مقصد کام تو کچھ بھی نہیں۔

دراصل وحی جلی اور وحی خفی کا عقیدہ یہودیوں کا عقیدہ تھا

بہر حال، اس عقیدے کی بنا پر وحی کی دو قسمیں ہوگئیں جس کے باعث ان کے ہاں وحی جلی یا وحی مکتوب اور وحی خفی یا وحی غیر مکتوب کا عقیدہ رواج پا گیا چنانچہ وحی جلی کو وہ وحی متلو کہتے تھے اور وحی خفی کو غیر متلو۔ یعنی ان کے ہاں وحی کے دو مختلف ذریعے ہیں۔ توارت الگ ہے اور تالمود [1] ان کے ہاں الگ ہے۔ تالمود کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ وہ وحی تھی جو الفاظ کے ذریعے نازل نہیں ہوئی لیکن ہے وہ وحی۔ یہ خفی وحی ہے۔ اس کی تلاوت نہیں کی جائے گی۔ یہ یہودیوں کا عقیدہ ہے اور تالمود میں یہ روایات ہیں۔ بعینہ یہی عقیدہ آپ کے ہاں ہے۔ آپ کے ہاں بھی وحی کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں، باالفاظ وحی جلی تو قرآنِ کریم کے اندر ہے، اور دوسری وحی جس میں الفاظ خدا کی طرف سے نہیں آئے، الفاظ حضور ﷺ کے اپنے ہیں، خیالات خدا کی طرف سے آئے، وہ وحی خفی ہے۔ یعنی وہ ایک ایک چیز جس کی امم سابقہ کے اعتقادات کے سلسلے میں قرآن تردید کرتا چلا آ رہا تھا، انہوں نے وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے مزرع عقیدت سے ایک ایک کر کے چنے اور انہیں طاقِ حرم میں سجا کے رکھ دیا اور یہ اب آپ کے ہاں کا عقیدہ ہے۔ اور پھر یہ آپ کے ہاں حدیث کی ساری بحث اسی پہ ہوتی ہے، یعنی اگلا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم، جلی وحی یا وحی مکتوب ہے اور حدیث خفی وحی یا وحی غیر مکتوب ہے۔ اور جب آپ ان دو قسموں کی وحی میں تضاد پائیں یعنی جب یہ تضاد قرآن اور حدیث کی شکل میں ہو، تو حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔

برادران عزیز! توبہ کریں۔ انہوں نے یہ دھڑلے سے کہا ہے، اور ان کے ہاں کی یہ تحریریں میرے پاس موجود ہیں۔ ہمارے ہی بیان میں یہ سب کچھ ہے۔ علامہ عبدالوہاب عزام [2] جو کراچی میں ہوا کرتے تھے، انہوں نے ایک کتاب لکھی۔ انہوں نے کہا کہ ایسا

---

[1] تالمود: دو مجموعوں کو تالمو کہتے ہیں۔ ایک وہ جو دوسری صدی عیسوی کے آخر میں، ربی یہودا نے اقوال کو جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام مشنا (Mishnah) ہے اور دوسری وہ جو اس مجموعہ کی جمع شدہ تشریحات وتفسیرات ہے۔ اس کا نام جمارا (Gemara) ہے۔ تالودان دونوں کا مجموعہ ہے۔ تالمود بھی مصر میں ایک شامی یا فلسطینی اور دوسرا بابلی۔ یہ دونوں پانچویں صدی عیسوی کے مرتب شدہ ہیں۔ (پرویز، 1996، ص۔ 23)

[2] 1951 میں، مصر کے نامور دانش ور، صاحب قلم اور کلام اقبال کے شیدائی، ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ، مملکت مصر کے نئے سفیر کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے۔ اس سے پہلے آپ فرانس میں یہ فرائض ادا کر رہے تھے، جہاں انہوں نے اقبالؒ کے ''پیام مشرق'' کا منظوم عربی ترجمہ کیا۔ قیام فرانس کے دوران کسی تقریب میں آپ کو کسی نے بتایا کہ اگر آپ کلام اقبال سے کماحقہ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو پاکستان جایئے۔ وہاں آپ کو ایک پاکستانی اقبال شناس کلام اقبال کی حقیقی روح سے روشناس کرائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس وقت کے فرمانروائے مصر شاہ فاروق سے اپنی خصوصی درخواست پر پاکستان کے لیے سفارت حاصل کر کے یہاں آئے۔ یہیں کراچی میں مجلس قلندران اقبالؒ کی تاسیس ہوئی۔ مجالس میں شیخ قلندران کا منصب پرویزؒ صاحب کے لیے مختص تھا۔ ڈاکٹر عزام صاحبؒ نے علامہ اقبال کے عرب دنیا میں تعارف کی غرض سے ایک خود مکتفی کتاب بعنوان ''محمد اقبال سیرتہ وشعرہ وفلسفہ'' بھی تالیف کی۔ مجلس قلندران اقبال کی آخری نشست 11 دسمبر 1954ء کو منعقد ہوئی۔ اس کے بعد سفیر اقبال پاکستان سے رخصت ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔ (پرویز، 1996ء ص۔ 140۔

کہنے والا شخص یہ جانتا ہی نہیں کہ اس نے کیا بات کہنی ہے۔ کہا کہ ایک وحی دوسری وحی کو ہی تو منسوخ کر رہی ہے۔ چلیے صاحب! ایک وحی بالالفاظ دی تھی جو قرآن میں ہے۔ دوسری وحی خفی' بغیر الفاظ کے' نبی کو دی تھی۔ یہ جو دوسری وحی تھی' وہ اس لیے دی تھی کہ وہ اس وحی کو منسوخ کر دے' یعنی خدا کو اپنی وحی جو اس طرح قرآن میں دی تھی' اسے خود منسوخ کرتے ہوئے کیا چیز مانع تھی۔ بات کچھ کہنے کی نہیں ہے۔ خدا نے کہا کہ منسوخ تو کرنی ہے پھر کیا کیا جائے؟ ''کہن لگے ایہ کم تہانوں اسیں دسنے آں کی کیتا جائے۔''❶ رسول کی طرف یہ وحی کر دی کہ اسے قرآن میں نہ لانا۔ انہوں نے کہا: جی! نہیں لایا۔ کہا: پھر اس کے ذریعے سے' قرآن کے ہمارے اس حکم' کو منسوخ کر دو۔ جی! ''او کر دیتا۔''❷

حقائق کو تسلیم کرنے کی بجائے کفر کے فتویٰ

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں یہ چیزیں قطعاً غلط ہیں۔ بہر حال کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ باتیں محفوظ رہ جائیں۔ ان چیزوں پر شاید آنے والا دور ہی کھڑا ہو کر سوچے کہ ہم کیا کہہ رہے تھے۔ بہر حال میں کہہ رہا تھا کہ **قربنٰہ نجیًا** (19:52)۔ وحی کے سربستہ راز بتانے کے لیے ہم نے انہیں اپنے قریب کر لیا۔ عزیزانِ من! کیا حسین انداز ہے! ایک بات کہنی ہے' راز کی بات کہنی ہے۔ وہ بات کان میں کہی۔ بات اتنی بڑی تھی کہ وہ کانپ اٹھے: بارِالٰہا! بہت بڑا صبر آزما' ہمت طلب فریضہ ہے۔ کہا: **اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20:24)۔ اب تم فرعون❸ کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و استبداد میں بہت ہی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہوگئی ہے۔

عزیزانِ من! اس آیت میں فرعون ہی کم لفظ نہیں اس پر **اِنَّـهٗ طَغٰى** بھی ساتھ ہے۔ کہا: فرعون کے دربار کے اندر تلاطم خیز طغیانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس نے ساحلوں کو توڑ دیا ہے' سیلاب بن گیا ہے۔ موسیٰ! جاؤ' ان ساحلوں کو سنوارو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: بارِالٰہا! **وَ اجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَهۡلِیۡ** (20:29)۔ چونکہ یہ مہم بڑی سخت ہے اس لیے میرے اہل خاندان میں سے ایک کو میرے ساتھ کر دے تاکہ وہ میرا بوجھ بٹائے۔ اس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساتھ ایک ''وزیر'' ہی مانگا تھا: بوجھ بٹانے والا۔ کیا لفظ ہے صاحب! بوجھ بٹانے والا۔ دیکھیے الفاظ بھی اپنے کیا ابتدائی معنی رکھتے ہیں اور بعد میں کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ یہاں وہ لفظ ''وزیر'' تھا یعنی بوجھ بٹانے والا۔ **وَوَهَبۡنَا لَهٗ مِنۡ رَّحۡمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ نَبِيًّا** (19:53)۔ اور اسے' اپنی عنایت سے' ہارونؑ جیسا بھائی عطا فرمایا جو خود بھی نبی تھا۔ کہا کہ یہ مہم ہے۔ اسے سر کرنا ہے۔

---

❶ کہنے لگے کہ ''کیا کیا جائے'' یہ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ ❷ وہ کر دیا ہے۔

❸ فرعون کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء ص۔ 109۔

اتنی سی بات کہہ کے قرآن نے یہ قصہ یہاں چھوڑ دیا کہ جاؤ اور اس مہم کو سر کرو۔ اس کی تفصیل قرآن کے مختلف مقامات پہ موجود ہے ان ٹکڑوں کو مسلسل جوڑو' یہ ایک زریں داستان تمہارے سامنے آجائے گی۔ عجیب داستان ہے' عزیزانِ من! یہ جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام او رفرعون کی آویزش ہے' چپقلش ہے' یہ بنی اسرائیل کا قصہ' عجیب قسم کی ایک مسلسل داستان ہے۔ یہ ساری کشمکش' جو پہلے ہی دن سے ان طبقات میں' ان مستبدانہ قوتوں میں' ان مستبدانہ قوتوں کے نیچے کچلی ہوئی انسانیت میں چلی آرہی ہے صاحب! یہ داستان بڑے ہی بصیرت افروز انداز میں اور ہدایت کے انداز میں' قرآن نے بیان کی ہوئی ہے۔ لیکن یہاں اتنا ہی قصہ ہے۔

معیار نسل کا نہیں' نظریات کا ہے' Idelogy کا ہے

قرآنِ کریم نے کہا: وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِسۡمٰعِيۡلَ (19:54)۔ اسی طرح قرآن میں' اسماعیل علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر' جو سلسلۂ نبی اسرائیل سے الگ' دوسری شاخِ ابراہیمی علیہ السلام کا مورث تھا۔ وہ اپنے قول کا سچا اور ہمارا بھیجا ہوا نبی تھا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بات چھیڑی کہ بنی اسرائیل سامنے آئے' پھر شاخِ ابراہیمی علیہ السلام کی بات شروع کی ہے۔ ان کا مورث وہ نبی تھا جو پوری انسانیت کو ایک عالمگیر برادری بنانے کے لیے آیا تھا۔ وہ نبی کہ جس نے اپنے باپ سے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ اگر تو خدا کے راستے پہ نہیں چلتا تو نہ میں تم سے ہوں' اور نہ تم مجھ سے ہو۔ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ (14:36)۔ میرا ''اپنا'' وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں یہاں تو اپنے اور بیگانے ہونے کا معیار بدل گیا۔ معیار نسل کا نہیں رہا' اشتراک نظریہ Ideology کا ہو گیا۔ جو وحیِ خداوندی میں میرا اتباع کرتا ہے' وہ میرا ہے۔ جو یہ نہیں کرتا وہ میرا نہیں ہے۔ یہی دین کی تعلیم تھی یعنی انسانیت کو ایک واحد امت بنانا۔ یہ دین کا ملخص ہے۔ سب سے پہلے جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے' وہ نسل کی بناء پہ کیا گیا ہے۔

قصہ آدم پھر سامنے آئے گا تو میں بتاؤں گا کہ ابلیس نے جو اس کے کان میں شر پھونکا تھا وہ یہی تھا کہ ''حیاتِ جاوید حاصل کرنا چاہتے ہو تو نسل کے ذریعے حاصل کرو۔'' قرآنِ کریم نے کہا کہ اس پھیر میں نہ آجانا۔ یاد رکھو' خدا تم سے کہہ رہا ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ انسانیت ایک امتِ واحدہ ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ تمام نوعِ انسان ایک برادری ہے۔ اِس کے برعکس اگر تم اس پھیر میں آگئے کہ ''تمام نوع انسان ایک برادی نہیں ہے' نسل کے ذریعے حیات جاوید حاصل ہوتی ہے' تمہیں اولاد کے ذریعے سے بقا ملتی ہے۔ جو نسل کا اولاد کا مورثِ اعلیٰ ہے' اس کا نام ہے۔'' تو جنت چھن جائے گی۔ یہی تو وہ پہلا فریب تھا جو ابلیس نے دیا تھا کہ ''ایویں بوٹا اگے لگدا اے' ہن تے کیندے نے ناں' بوٹا لگ گیا جی۔''[1] نام روشن کرتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا نوح علیہ السلام کا نام اس کا بیٹا روشن کرتا ہے' ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کا نام روشن کر رہا تھا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ تو نہیں تھے' چچا ابولھب کا نام روشن کر رہے تھے؟

---

[1] پودا اسی طرح سے لگتا ہے (اپنی نسل یونہی پیدا ہوتی ہے) آپ تو بچے کے پیدا ہونے پہ کہتے ہیں کہ پودا لگ گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ قطعاً نہیں۔ بات ہی ساری اتنی ہے کہ ابلیس نے نسلِ آدم کو فریب یہ دیا تھا کہ یہ یاد رکھو کہ نسل کے ذریعے سے آگے چلنے والی بات ہے۔ یہ تھا وہ پہلا فریب جو ابلیس نے دیا جس کے باعث انسان سے وہ جنت چھن گئی اور یہ عالمگیر برادری انسانیت کے تصور کی بجائے گروہوں میں بٹ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے گروہ بندی کی پہلی چیز نسل پرستی، خاندان، قبیلہ، اس کے بعد آگے نسل پروری کا تصور جڑ پکڑ گیا۔ دین یہ کچھ دینے کے لیے نہیں آیا تھا۔ پتہ ہے کہ یہودیوں نے، جنہیں بنی اسرائیل کہتے ہیں، کیا کیا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا شجرہ نسب

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام بڑے تھے اور حضرتِ اسحاق علیہ السلام چھوٹے تھے۔ ہدایتِ خداوندی کی رو سے انہوں نے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذمے یہ فریضہ لگایا کہ وہ عرب جیسی بے برگ و گیاہ زمین میں خدا کا ایک گھر تعمیر کر کے اس کی تولیت کا فریضہ سنبھال لے، عالمگیر انسانیت کے لیے یہ مرکز توحید کا بنایا گیا۔ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو وہاں بسا دیا، اب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو قرآن نے بتایا ہے کہ ملکِ عظیم بھی عطا ہوگا، بڑی عظیم مملکت ان کو عطا ہوئی تھی۔ فلسطین اور شام کے اس قدر سرسبز خطے تھے، وہاں ان کی مملکت تھی۔ اس مملکت کا وارث دوسرا بیٹا اسحاق علیہ السلام ہوا۔ یہ اس ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں کہ جس نے کہا تھا کہ جو میرا اتباع کرے گا وہی مجھ سے ہے۔ حضرتِ اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے حضرتِ یعقوب علیہ السلام ہیں۔ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ تورات کی رو سے، عبرانی زبان میں، اس کے معنی ہیں: خدا کا پہلوان۔ یہ اسرائیل کی یعنی حضرتِ یعقوب علیہ السلام کی اولاد آگے چلی۔ یہ ہے بنی اسرائیل۔ انہی میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ہوئے، انہی کا اتباع کرنے والی یہ قوم جو یہود کہلاتی ہے، بنی اسرائیل ہوئی۔ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے: ایک ادھر آ کے بس گئے اور ایک بیٹے کی شاخ اُدھر وادیٔ غیر ذی زرع......عرب......میں چلتی گئی۔

بنی اسرائیل کا وضع کردہ نسل پرستی کا عقیدہ

اب اس کے بعد یہودیوں نے یا بنی اسرائیل نے یہ مذہبی عقیدہ وضع کیا کہ یہ نبوت بھی بنی اسرائیل کے ہاں ہی رہے گی اور جنت بھی بنی اسرائیل کی نسل کے لیے محدود کر دی گئی ہے۔ یہودیت اس مذہبی عقیدے کی رو سے وہ مذہب ہے، جو تبلیغی مذہب نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس کو پسند کرے اور وہ مذہبِ یہودیت اختیار کر لے، قطعاً نہیں۔ وہ صرف بنی اسرائیل کی نسل میں محدود ہے، غیر از بنی اسرائیل یہودی ہو ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے یہ عقیدہ وضع کر لیا۔ وہ نسل پرستی کا عقیدہ، جسے میں نے عرض کیا ہے، مٹانے کے لیے دین آیا اور جس کی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے، ان کے مورثِ اعلیٰ نے، اس شدت سے تردید کی۔ اِسے مٹانے کی انتھک کوشش کی۔ انہی کی ذریت میں بنی اسرائیل نے یہودیت نسل کی بنیاد پر اپنے ہاں یہ عقیدہ وضع کر لیا۔ اب یہ باہمی نسل پرستی میں، ایک خاندان میں، آپ کو معلوم ہے،

جھگڑے چلتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک لفظ ہے: شریک۔ ''بھئی اے تیرے خلاف گلاں ولاں کردا اے' تیرے چاچے دا پتر اے' اوئے۔ کہن لگا:''[1] ۔او بھئی شریک جو ہوا۔ سب سے زیادہ عداوت جو ہوتی ہے وہ قریب ترین ''او شریک دی ہوندی ہیگی اے تے''[2] شریک وہ ہے جو نسل میں سب سے قریبی ہوتا ہے۔ جو دور کا ہمارا ایک رشتہ دار ہے' وہ اتنی دشمنی نہیں کرتا ''اے جنی تایا چاچا دے کردے نیں آپس اچ'' ایہ شریک ہے۔[3] لفظِ شریک ہی ہمارے ہاں دشمن کے معانی میں استعمال ہو رہا ہے۔

یہودیوں کی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مخالفت اور ہماری روایات

بنی اسرائیل نے' یہودیوں نے نسل پرستی کا جو یہ عقیدہ پیدا کیا' تو سب سے پہلا شریک ''ایناں نے حضرتِ اسماعیلؑ نوں قرار دے دتا''[4] دونوں (حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام) حقیقی بھائی' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اور تورات میں دیکھیے سارا زور اس پہ صرف کیا ہوا ہے کہ وہ برکتوں کا' سعادتوں کا' وارث تو اسحاق تھا اور یہ اسماعیل معاذ اللہ ایک وحشی سا لڑکا تھا۔ اِسے گھر سے باہر نکال دیا تھا اور پھر آگے چلے تو کہا کہ وہ صاحب! حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا تو اسحاق تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک لونڈی ملی تھی۔ جی! گھر کی نوکرانی تھی۔ معاذ اللہ معاذ اللہ' یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کے بطن سے تھے۔ یہ سارا کچھ ان کے ہاں موجود ہے۔ اس لیے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے انہیں گھر سے نکال دیا تھا اور اس بچے کو بھی نکال دیا تھا۔ یہ ان کی روایتیں ہیں جو آپ کے ہاں کی مقدس روایتوں کا جز بنی ہوئی ہیں۔ آپ کے ہاں کی کتبِ احادیث میں یہ ذکر ہے۔ آپ کی تفسیروں میں یہی کچھ لکھا ہوا ہے یہودیوں نے تو حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے متعلق' آپ کی نبوت کا ذکر تک نہیں کیا۔ بات آگے بڑھتی چلی گئی۔

یہودیوں کے ہاں ایک آنے والے کا انتظار

حضرت اسحٰق علیہ السلام رہے' نہ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام رہے۔ حضرت اسحاق کی شاخ کو وہ اپنے ہاں بنی اسرائیل کہتے رہے۔ یہ جو اُدھر کے عرب تھے وہ انہیں بنی اسماعیل کہتے تھے۔ یہودی ایک آنے والے مسیح کا انتظار کرتے تھے۔ ہر وہ قوم جو ضعف و ناتوانی کا شکار ہو جاتی ہے' ذلتوں کے گڑھے میں گر جاتی ہے' پھر وہ کسی آنے والے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں ایک آنے والے کا انتظار ہے۔ آپ کے ہاں بھی ہے اور یہودیوں کے ہاں آنے والے کا انتظار تھا۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ جس آنے والے نے کہا کہ وہ میں آ گیا' اِسے پکڑ کے' بقول ان کے' انہوں نے سولی پہ ٹانگ دیا۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام انہی میں سے تھے حالانکہ اُدھر سے نبی اسماعیل علیہ السلام

---

[1] ارے بھائی! یہ تمہارے خلاف بہت باتیں کر رہا ہے۔ ارے کیا یہ تمہارے چچا کا بیٹا ہے! وہ کہنے لگا۔

[2] وہ قریب ترین رشتہ دار کی طرف سے ہوتی ہے۔

[3] یہ تایا چچا کے آپس میں جتنی کرتے ہیں۔ یہی ''شریک'' ہیں۔

[4] انہوں نے حضرت اسماعیل کو قرار دے دیا۔

نے جب یہ دعویٰ کیا ہے تو یہودیوں نے اس دعویٰ کے پرکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ یہ مشرکین تھے جن کا ذکر قرآن میں آتا ہے کہ وہ آ کے یہ بھی پوچھتے تھے۔ یہ اعتراض بھی کرتے تھے' یہ بھی دلیل مانگتے تھے یعنی کچھ تو Interest لے رہے تھے' جبھی تو کسی چیز کے متعلق اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ جو اس [1] نے کہا ہے کہ:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

وہ یہی صورتِ حال تھی۔

انسان دوستی بھول جاتا ہے لیکن عداوت نفسیاتی طور پر کبھی نہیں بھولتی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کا ایک دوسرے کے ساتھ عداوت میں جو تعلق ہوتا ہے وہ دوستی سے بھی زیادہ استوار ہوتا ہے۔ اس کا خیال کہیں دوسری طرف نہیں جاتا لہٰذا عداوت تو یہ چیز ہوتی ہے۔ اس کینہ پروری کی بنا پر یہودیوں نے اور صرف یہودیوں نے تو ایک ہی بات کہی کہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ بنی اسماعیل علیہ السلام کے ہاں نبوت آ جائے۔ یہ تو بات ہی ختم ہوئی۔ انہوں نے وہی نسل پرستی کو لیا کہ غیر از بنی اسرائیل کے ہاں نبوت آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہ انہوں نے کبھی اس موضوع پہ بحث تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ لہٰذا یہی وجہ ہوئی کہ جیسے اس ابلیس کو قیامت تک کے لیے دھتکار دیا گیا' بالکل اسی طرح انہیں بھی وہاں سے دھتکار کے نکال دیا گیا۔

اس تنزل اور مسکنت کا علاج نسل پرستی کے عقیدے میں نہیں

کہا یہ گیا کہ اگر تمہارا یہی عقیدہ ہے تو نسل تو بہر حال محدود رہتی ہے' انسانیت نے تو اس کرہ ارض پہ اتنا عظیم ہو جانا ہی ہے چنانچہ اس عقیدے کی بنا پہ تم دیکھو گے کہ ذلت اور مسکنت تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ جہاں جاؤ گے' تمہارے سائے کی طرح یہ تمہارے ساتھ رہے گی۔ اور اس کے بعد قرآن کے الفاظ' یاد رکھو' اگر پھر سے زندگی حاصل کرنا چاہو گے' تو یہ جو انزل اللہ ہے' جو خدا کی وحی ہے اگر اس سے اہتمام کرو گے تو اس صورت میں استقامت ہو جائیگی۔ بصورت دیگر ہو سکتا ہے کہ ہنگامی طور پر عبد الناس بھی تمہیں کوئی حفاظت دیدے' ہو سکتا ہے دنیا کی قومیں اپنے مفاد کے لیے تمہیں کہیں Protection دے دیں' تمہاری ایک مملکت قائم کر دیں' لیکن یاد رکھو! یہ نسل پرستی کا عقیدہ تمہیں لے ڈوبے گا۔ تو انہوں نے حضرتِ اسماعیل علیہ السلام سے پہلی مخالفت اس بنا پہ کی کہ وہ شریک (نسل میں قریبی رشتہ دار) تھے اور اس نسل پرستی کے ماحول کے اندر جب نبی اکرم علیہ السلام نے دعویٰ نبوت کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کی تردید کر دی اور کنارہ کش ہوئے کہ بنی

---

[1] مرزا اسد اللہ خان غالب (1869-1797)۔

اسماعیل میں نبوت تو آ ہی نہیں سکتی۔ یہ تھا عزیزانِ من! نسل پرستی کا وہ سب سے پہلا باطل عقیدہ جو ابلیس نے نسل میں پھونکا تھا۔ یہی تھا وہ باطل عقیدہ کہ جسے مٹانے کے لیے خدا نے بنی اسرائیل کے گھرانے سے نبوت کو نکال کر بنی اسماعیل کے گھرانے میں پہنچایا۔

آج امت کی ناگفتہ بہ حالت

اسی نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسی امت کی تشکیل کی جس میں ہر نسل کے انسان کو برابر کا درجہ ملا اور اسی رسول ﷺ کی آج وہ امت ہے کہ جس کی کیفیت یہ ہے کہ سید' شیخ' پٹھان اور گجر اور جاٹ اور ارائیں کے اندر بٹی ہوئی ہے۔ غور فرما رہے ہیں آپ؟ پھر پوچھا یہ جاتا ہے کہ ہم اتنے ذلیل وخوار کیوں ہیں؟ ہم سے کیوں پوچھتے ہو' بنی اسرائیل سے پوچھو جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ نسل پرستی کے یہ عقائد جب تک تم رکھو گے تو ذلت وخواری تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

عزیزانِ من! وہ قرآن جو كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ کہتا تھا کہ پوری انسانیت ایک عالمگیر برادری ہے اور جس نے اس امت کے متعلق کہا تھا: كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (2:143)۔ تمہیں ایک برادری بنایا۔ جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلہ پر رہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی ہو۔ جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو۔ ابتدائے کار کے لیے منتہا تو اسکا انسانیت کی عالمگیر برادری ہے لیکن ابتداء کے لیے تو کسی ایک مقام سے بات شروع کرنی ہوگی۔ اس مقام سے بات شروع کی اور کہا کہ تمہیں ایک امتِ واحدہ ہم نے بنایا۔ اس امت واحدہ کی کیفیت یہ ہے کہ آج نہ صرف یہ کہ ان کی جغرافیائی مملکتیں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں بلکہ نسل پرستی کی یہ کیفیت ہے کہ عرب نیشنلزم کا عقیدہ آپ کے ہاں اتنے زور سے آج آ رہا ہے یعنی وہ جو کافر ملک ہیں انہوں نے تو پھر بھی جغرافیائی تقسیم کی بناء پہ ایک اپنی الگ قومیت بنائی ہے' یہ نسل پرستی ان کے ہاں بھی جاری تھی' ہندوستان میں جو اپنے ہاں مذہب کی بنیاد رکھتے تھے' یہ ورن کی تقسیم تھی' برہمن اور کھشتری اور ویش اور شودر' یہ انہوں نے Constitutionaly ختم کر دی ہے۔ دنیا کی مختلف مملکتوں نے' جو ملحد و بے دین ہیں' انہوں نے جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والی مختلف نسلوں کو ایک قوم بنالیا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ امتِ مسلمہ اس دین کی علمبردار ہونے کی مدعی ہے' اُسی گروہوں' نسلوں' قبیلوں میں گرفتار ہے۔

اسرائیل کے خطوط پر ہماری نسل پرستی

عرب نیشنلزم' کیا ہے؟ وہ چیز جو عربوں کی نسل سے ہے وہ ایک قوم' اور ان ملکوں کے اندر آپ حیران ہونگے کہ عربوں کی نسل کے عیسائی تو اس قوم کے فرد اور غیر عرب مسلمان ان کی قومیت کے فرد نہیں۔ بات کہاں سے کہاں چلی گئی کہ جس جرم کی بناء پہ یہودیوں کو قرآن نے کہا تھا کہ یہ ذلت اور مسکنت میں گرفتار رہیں گے' وہی جرم اگر اِن کے ہاں ہوگا تو اس جرم کی وہی سزا انہیں نہیں ہوگی؟ وہ تو عدالتِ خداوندی ہے۔ قرآنِ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا قصہ ساتھ ہی اس لیے لے آیا ہے کہ

موسیٰ علیہ السلام کی قوم وہ بنی اسرائیل تھی۔ اس نے اپنے ہاں نسل پرستی کا عقیدہ وضع کیا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ہمارے نزدیک ہمارے نظام کی رو سے اسماعیلؑ بھی اسی قسم کا نبی تھا جس قسم کا اسحاق علیہ السلام تھا' جس قسم کا موسیٰؑ تھا۔ اس کے ساتھ قرآن یہ لفظ لے آیا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (19:54) وہ اپنے قول کا سچا تھا۔

وعدہ کی اہمیت

آپ نے دیکھا کہ رسول کی ایک یہ خصوصیت کتنی بڑی بتائی کہ وہ: ''**صَادِقَ الْوَعْدِ**'' (19:54) تھا۔ یعنی وہ اپنے قول کا پکا 'وعدے کا سچا تھا' جو کہا' کر کے دکھایا۔ میں نے پہلے بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ قرآن کے نزدیک وعدہ کی بڑی اہمیت ہے: اتنی اہمیت کہ جس کا ہم آپ یا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جہاں اس نے یہ کہا ہے کہ خدا نے تم سے یہ وعدہ کیا ہے: **كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا** (25:16)۔ یہ نشو ونما دینے والے کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ اگر خدا نکردہ یہ وعدہ پورا نہ ہو تو تم خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ وعدہ کیوں نہیں پورا کیا گیا۔ اللہ اکبر۔ یہ ہے عزیزانِ من! اور یہ وعدہ ہے' یہ ہے اس کی حیثیت اور یہ ہے اس کی اہمیت۔ بات لمبی چلی جائے گی ورنہ آپ کو میں بتاتا کہ یہ یونہی کوئی اخلاق کا ایک نسخہ نہیں۔

مغرب کے مفکرین کے نزدیک انسان کی تعریف

قرآن میں جو وعدے کی اہمیت دی گئی ہے' ٹھیک ہے ویسے تو اسے ہمارے ہاں اخلاقی چیز ہی مانا جاتا ہے لیکن اس کی اہمیت اخلاقی نہیں ہے' ہم سے نہ پوچھیے' مغرب کے بڑے بڑے منکرِ خدا ''فلاسفر'' نیٹشے [1] سے پوچھیے' انسان کسے کہتے ہیں؟ جسے ہم Man کی Definition کہتے ہیں' اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے مفکرین ابتدائی دور سے کاوشیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یونان کے مفکروں سے یہ بات شروع ہوئی۔ ابتدائی مفکرین نے کہا ہے کہ

Man is a rational animal

لیکن کہا کہ ہے تو یہ Animal لیکن Animal سے اس کا جو اختصاص کیا ہے' وہ یہ کہہ کے کیا ہے کہ یہ Rational ہے' صاحبِ شعور ہے۔ بحث لمبی ہوگی کہ پھر اس کے خلاف بات چلی تو پھر کیا ہوا؟ کہا: یہ Cooking Animal ہے' پکا کر کھانے والا

---

[1] Nietzsche, Friedrich (Wilhelm) (1844-1900) was a German Philpsopher. He rejected the "slave morality" and values of Christianity in works such as Also Sprach Zarathustra (1883-91); he proposed a philosohy asserting the self and the "will power". (Reader's Digest, 1990, p.1043)

ہے۔ پکا کے کھانے والا جانور ہے۔ انہوں نے اس میں یہ چیز ایجاد کی' پھر اس کے متعلق کہا: Tool-making Animal ہے' اوزار بنانے والا جانور ہے۔ یہ تمام Man کی Definitions چلی آ رہی تھیں۔ پھر جب نیٹشے کے ہاں بات پہنچی...... وقت تھوڑا رہ گیا ہے' اس لیے بات کو تھوڑا مختصر کرتا ہوں۔

نیٹشے کا قول: انسان وہ ہے جو بدلتا نہیں

سنیے عزیزانِ من! نیٹشے خدا کا منکر ہے لیکن انسانی خودی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ سب کچھ اسی کو قرار دیتا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ Man کسے کہتے ہیں؟ غور سے سنیے صاحب! اس نے کہا کہ Man کی اختصاص یہ ہے کہ

He can tell his words.

وہ وعدہ کر سکتا ہے۔ غور کیجیے عزیزانِ من! میں یہاں صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا تھا کہ قرآن کے ان دعووں کی اہمیت ان لوگوں سے پوچھیے۔ وہ Definition یہ کرتا ہے کہ ''انسان وعدہ کر سکتا ہے۔'' اور آگے پھر جب تفصیل میں جا کے دیکھیے تو آنکھیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ دو لفظوں میں بات کہونگا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ وعدہ کے معنی کیا ہیں؟ آج اگر آپ کسی شخص سے یہ بات کہتے ہیں کہ میں یہ ایسا کرونگا۔ سال بھر کے بعد بھی وہ آپ سے کہتا ہے کہ تم نے یہ بات کہی تھی۔ ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے کہی تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سال بھر میں آپ بدلے نہیں ہیں' آپ وہی ہیں جو اس وقت تھے۔ نیٹشے کہتا ہے کہ: ''انسان وہ ہے جو کسی وقت بھی نہیں بدلے۔'' وعدے کے یہ معنی ہیں عزیزانِ من! جبھی تو وہ کہے گا کہ میں نے یہ بات کہی۔ ''میں'' کی Definition یہ ہے کہ یہ Changelessness in Change ہے' یہ برگسان (1859-1941) کے نزدیک ''میں'' کی Definition ہے کہ انسان کی ''میں'' یا انا یا جسے یہ self یا خودی کہا جاتا ہے' کبھی نہ بدلے۔

یہ ''میں'' ہوتی کیا ہے؟ وہ ہوتی یہ ہے کہ سب کچھ بدل جائے لیکن یہ نہ بدلے۔ تو وعدہ کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ آج جو بات کہی ہے دس برس کے بعد بھی آپ سے کہا جائے تو آپ کہیں کہ ہاں میں نے یہ کہا تھا۔ تو اگر آپ کی وہ ''میں'' باقی نہیں رہی ہوئی جو اس وقت کی تھی تو آپ تو کہیں گے کہ ہاں صاحب! یہ اس ''میں'' نے تو کہا تھا' وہ آج والی ''میں'' (I-am-nes) تو ہے ہی نہیں۔ تو وعدے کے معانی یہ ہیں کہ آپ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ''میں'' نہیں بدلونگا۔ ''میں'' وہی رہونگا۔ خدا نے یہ کہا ہے: **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ** (3:9) کہ خدا کا وعدہ کبھی نہیں بدلتا' وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ تو جو خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے والے لوگ ہیں' ان کا بھی پہلا نشان قرآن نے یہ علامت بتائی ہے کہ وہ اپنے وعدے کو ضرور نبھاتے ہیں' کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ اگر وہ کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ انسان وہ نہیں رہا ہے جو اس دن انسان تھا۔ آج وہ نہیں رہا۔ یہ ہے قرآن

کریم کا اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (19:54)۔وہ اپنے قول کا سچا تھا۔

یہاں پہ نبی کی دو لفظوں میں تعریف ہوتی ہے: وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19:54)۔اور وہ ہمارا بھیجا ہوا نبی تھا۔ یہاں بھی وہی رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19:51)۔جس کی تفصیل میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔آ گے کہا: وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (19:55)۔وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا تھا (کہ یہی نظام خداوندی کے ستون ہیں)۔اور وہ اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین سے یکسر ہم آہنگ تھا۔عزیزانِ من! بات لمبی چلی جائے گی۔مختصراً کہوں گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ کی اور زکوٰۃ کی تلقین کیا کرتے تھے۔یہاں کوئی لمبی چوڑی فہرست ہی نہیں دی' اور ان دو لفظوں کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن اس کی ضرورت کیوں نہ تھی؟ اور اس کے اندر اس اجمال میں کتنی تفصیل آ گئی ہے؟ یہ ہم آئندہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

آج گیارہ بج گئے۔ ہم سورۃ مریم کی آیت 54 تک ہی آ سکے ہیں۔ 55 ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

سترھواں باب: سورۃ مریم (آیت 55)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1976 کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 55 سے ہو رہا ہے: (19:55)۔ آسمانی انقلاب کے داعیان کی سرگذشت چلی آ رہی ہے اور سابقہ کڑی میں کہا تھا کہ **وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ** (19:54)۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کا ذکر تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ان مقامات میں قرآنِ کریم یونہی ایک دو اشارے کرتا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ان کے تذکارِ جلیلہ کی تفصیل دوسرے مقامات پر آتی ہے اور یہاں پر ایک تو نہ صرف ان کی بنیادی خصوصیت یا صفت ہی بتائی ہیں، بلکہ وہ بنیادی خصوصیت یا صفت بھی بتائی جو ہر نبی کی ہے، جو ہر رسول کی ہے کہ وہ صادق الوعد تھے، وعدہ کے پکے، قول کے سچے، جو کہا، وہ کر دکھانے والے تھے۔

انسان اور حیوان میں فرق

میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ نیٹشے ((1844-1900 کے الفاظ میں انسان میں اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان وعدہ کر سکتا ہے۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ ہم نے تو اب ہر چیز کو کچھ مذاق سا بنا لیا ہے۔ ہماری زندگی مذاق ہی بن گئی ہے۔ عزیزانِ من! ان چیزوں کی ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ یونہی ہم کہتے ہیں کہ کیا چار بجے آؤ گے؟ ہاں جی! آؤنگا جی۔ بس، اسکے بعد وقت کی پابندی ختم ہے۔ احساس ہی نہیں ہے کہ میں نے کیا کہا ہے۔ وہ جو میں نے کہا ہے کہ میں آؤنگا، اگر یہ "میں" چار بجے بھی وہی "میں"، (I am ness) ہے تو پھر یہ آئے گا۔ اگر وہ چار بجے نہیں آتا تو یہ بڑی گہری چیز ہے۔ دراصل یہ "میں"، وہ "میں" نہیں ہوتا جس نے چار بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ پوچھو Psycho Analyst سے جا کے، وہ آپ کو بتائے گا کہ وہ "میں" نہیں رہا۔ وہ جو بارہ بجے والا "میں" تھا، اس وقت نہیں رہا۔ وہ "میں" کوئی اور "میں" ہے، جو اس طرح سے بدلتا ہے۔ یوں تو ہمارے ہاں اگر یہ چیز کسی کے متعلق کہہ دیجیے کہ صاحب! تم تو ہر آن بدلتے رہتے ہو تو بڑا برا مناتا ہے۔ لیکن جب اسے دیکھو کہ کبھی کوئی وعدہ بھی پورا کیا ہے تو اس سے یونہی ہوتا ہے کہ ہاں یار ٹھیک ہے، میں نے کہہ تو دیا تھا۔ اور اگر آپ کہیں کہہ دیتے ہیں کہ ہاں صاحب! میں انشاء اللہ ضرور آؤنگا۔ یہ انشاء اللہ والی کیا بات ہے؟ ایمان سے کہو: آؤ گے یا نہیں یعنی ہمارے ہاں کی زندگی یہ ہے۔

عزیزانِ من! قرآن نے بار بار یہ کہا تھا کہ بابا! زندگی کو Seriously لیا کرو اور عزیزانِ من! یہ بڑی Seriously لینے والی بات ہے۔ اگر یہ احساس ہو کہ اس زندگی میں آگے بڑھنا اور ارتقائی منازل طے کرنا ہیں تو اس کے بعد اس کا ایک ایک سانس Seriously لینے کا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بتایا تھا کہ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا (19:54)۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے قول کا سچا تھا اور ہمارا بھیجا ہوا نبی تھا۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اہل کا مفہوم

اب خصوصیات ملاحظہ فرمائیں کہ وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ (19:55)۔ وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا تھا۔ یہ صلوٰۃ و زکوٰۃ ایسی اہم چیز ہے کہ انبیاء سابقہ علیہم السلام کے متعلق جہاں بھی آتا ہے یہ دو ہی چیزیں گنائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے ''اہل'' کو اس چیز کا حکم دیتے تھے۔ ''اہل'' کے معنی گھر بار ہی نہیں ہیں بلکہ ساتھی' رفقاء' جماعت' ان کے ہم خیال' ہم آہنگ' مومن بھی ہیں۔ ان سب کے لیے یہ لفظ اہل آتا ہے' کیونکہ جب حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا تو قرآن نے کہا کہ نہیں Biologically تو تمہارا بیٹا تھا' مگر تمہارے اہل میں سے نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کا کردار ایسا نہیں تھا جو تیرے جیسے باپ کے لائق بیٹے کا ہونا چاہیے۔ تو اہل کے معنی یہ ہو گئے۔ اب یہاں کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور رفقاء کو' اپنی جماعت کو' اس چیز کا یعنی صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتا تھا۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے حکم کی اہمیت

الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ کا حکم تو تمام انبیاء سابقہؑ کے متعلق بھی بنیادی طور پہ آتا ہے اور پھر قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کے متعلق تو پوچھیے نہیں کہ کیا کہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ قرآن پاک صلوٰۃ اور زکوٰۃ اکٹھا لاتا ہے۔ قرآن میں بیسیوں مقامات پر اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ اکٹھا چلا آتا ہے۔ تو گویا یہ بڑی اہم چیز ہے جو قرآن نے انبیاء کرام کی تعلیم کے متعلق' اگر کہیں' دو لفظ کہے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے جماعتِ مومنین کا فریضہ بتایا ہے تو وہ اہم فریضہ صلوٰۃ و زکوٰۃ بتایا ہے۔ آج ہمارے ہاں صلوٰۃ تو یہی نماز ہے۔ زکوٰۃ وہ جو سال کے بعد' اڑھائی فیصد نکال کے' خیرات کے طور پہ' کسی کو بانٹ دینا ہے' یہ ہے زکوٰۃ۔ آپ غور کیجیے کہ یہی چیز ہے جو دین کی بنیاد بنے گی' وہ پہلے ہی دن سے قرآنِ کریم نے یا اللہ تعالیٰ نے' جو انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے رہنمائی بھیجی' مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے' صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا' تو کیا یہی بات تھی کہ اس طرح سے جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں یا ہم زکوٰۃ دیتے ہیں اسی طرح سے دیتے چلے جائیں۔ میں وہ بات ابھی کر رہا ہوں کہ وہ اتنی سی بات ہی تھی کہ بھئی! وہ اکٹھے ہو کے اس طرح سے کچھ رکعتیں وہاں ادا کر دیا کرو۔ سال کے بعد اڑھائی فیصد پیسے دے دیا کرو تو دین کا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ ایک عظیم الشان نبی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ کہا ہے کہ اپنی جماعت کو صلوٰۃ

اور زکوٰۃ کی تلقین کرو صاحب! تو میں اس کے متعلق تو بڑی تفصیل سے ہر مقام پہ بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

قرآن حکیم میں قانون کا لفظ نہیں آیا اور نہ ہی نظام کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے

ایسا نظر آتا ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن کے وقت عربوں کی زبان میں قانون کا لفظ رائج نہ تھا۔ اس لیے قرآنِ کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا۔ اس کے لیے دوسرے الفاظ آئے ہیں مثلاً کلمۃ اللہ آیا ہے' فرائض کا ذکر آیا ہے مگر لفظ قانون نہیں آیا ہے۔ ہمارے اس دَور میں اسی بات کو سمجھانے کے لیے ہمارے ہاں قانون کا لفظ رائج ہو گیا۔ لہٰذا ہم اسے قانونِ خداوندی کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح سے اس زمانے ان کے ہاں نظام کا لفظ ان معنوں میں نہیں تھا جن معنوں میں آج ہم اسے استعمال کرتے ہیں۔ ویسے تو یہ دونوں ہی لفظ عربی کے ہیں: قانون بھی عربی زبان کا لفظ ہے' نظام بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن یہ ان معنوں میں ان کے ہاں رائج نہیں تھا تو قرآن چونکہ انہی کی زبان میں نازل ہوا اس لیے اس نے یہ الفاظ اپنے ہاں استعمال نہیں کیے: قانون کا لفظ بھی اور نظام کا لفظ بھی۔

کلمۃ اللہ کا لفظ نظام اور قانون خداوندی کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے

آج ہماری سمجھ میں بات آ ہی اس طرح سکتی ہے اگر یہ الفاظ ساتھ بول دیئے جائیں: قانونِ خداوندی' قوانین الٰہیہ' قوانینِ فطرت۔ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ''کلمۃ اللہ'' کہنے سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جیسے قانونِ خداوندی سمجھ میں آتی ہے اسی طرح اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ اب ہمارے ہاں تو نماز قائم کرو ہے' پہلے ہی اس کا مفہوم واضح نہیں تو جب نماز قائم کرو آتا ہے تو بالکل ہی بات سمجھ میں نہیں آتی' اور اہم بات یہ ہے کہ ہم ہر وقت یا ہر روز نماز پڑھو کہتے ہیں۔ میں نماز پڑھ آیا ہوں' نماز پڑھ چکے ہو' نماز پڑھنے جاؤ' لیکن جب کہیں قرآنِ کریم کی طرف سے جہاں اقامت صلوٰۃ کے الفاظ آئے ہیں تو وہاں ہے ہی یہ کہ نماز قائم کرو' کبھی کھڑے ہو کے ہم سوچتے نہیں۔

عزیزانِ من! مذہب میں تقلید ہوتی ہے۔ بنیادی چیز یہ ہے کہ کوئی سوچے کہ نماز قائم کرو کے کیا معنی ہیں؟ قرآنِ کریم میں اقیموا الصلوٰۃ کی اصطلاح میں اقیموا کا ترجمہ تو قائم ہی ہوتا ہے لیکن ہم نے صلوٰۃ کے معنی نماز کے کر دیئے۔ زکوٰۃ دوسرا لفظ آ گیا۔ اب زکوٰۃ کے متعلق وہی سال کے بعد اڑھائی فیصد اپنے مال میں سے نکال لو تو یہ زکوٰۃ صلوٰۃ کی طرح ہو گئی۔ اب اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس میں بھی جس قدر کوئی اصلاحات وغیرہ کا سوچتا ہے تو اتنا ہی ہوتا ہے کہ مساجد میں کسی طرح سے قالین بچھائے جائیں' کوئی فانوس لٹکائے جائیں' ان کے وضو کا انتظام کیا کیا جائے' صفیں کیسے درست ہوں' امام خطیب کیسے مقرر ہوں گویا یہ بات انہی امور میں سمٹ کر رہ گئی۔ جب بھی زکوٰۃ کے متعلق کہیں بات آئے گی تو وہ یہ کہ صاحب حکومت ٹیکس جمع کیا کرے' حکومت اپنا بیت المال کھولا کرے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم یہ بات کیا کر رہے ہیں؟ یعنی اچھا اگر یہی کچھ ہے تو پھر حکومت اس کے لیے الگ بیت المال کھولے جبکہ بیت المال کہتے ہی خزانہ کو تھے۔ اس زمانے میں' بیت المال کے معنی ''مال کا گھر یعنی جہاں مال جمع کیا جائے۔'' اس زمانے میں ابھی سکے

(Coins) بہت کم ہوتے تھے؛ جن سے Commodity بھی آیا کرتی تھی اور مال میں دونوں چیزیں شامل ہوجایا کرتی تھیں: یعنی دولت اور مال واسباب۔

بیت المال کا اور سٹیٹ بنک کا ایک ہی مفہوم ہے

دولت جسے ہم روپے پیسے کہتے ہیں؛ اور مال واسباب جس طرح سے آج ہم کہتے ہیں؛ وہ سب مال ہوتا تھا۔ یہ کچھ گاؤں والوں سے پوچھو جو آج بھی مال مویشی کہتے ہیں۔ تو اس طرح بیت المال تو ہوتا ہی وہ تھا جس میں حکومت کی آمدنی؛ جس بھی شکل میں ہوتی تھی؛ وہ اس میں جمع ہوتی تھی۔ وہ اسے بیت المال کہتے تھے۔ یہ ایک مکان نہیں ہوتا تھا کہ جس کے اندر یہ دولت؛ یہ مال واسباب رکھا جاتا تھا۔ جتنے بھی گورنمنٹ ریونیوز تھے یہ انہیں بیت المال کہتے تھے۔ یہ Terms جو ہمارے ہاں کی ہیں؛ ان میں آپ دیکھیے کہ ان کے اندر آپ کی حکومت موجود ہے؛ اس کا خزانہ موجود ہے؛ الگ الگ اس کے ڈیپارٹمنٹ ہیں؛ ریونیو ہیں لیکن اگر زکوٰۃ حکومت کے ہاں جائے گی تو بیت المال میں جائے گی اس کے لیے الگ محکمہ کھولنا پڑے گا۔ الگ کوٹھا چھتنا پئے گا ایدے لئی''۔ [1] مشکل یہ ہے عزیزانِ من! کہ مذہب کے معاملے میں کھڑا ہو کے کوئی نہیں سوچتا۔ مذہبی پیشوائیت تو اس لیے نہیں سوچتی کہ سوچنے کے بعد تو ان کا روزگار ختم ہوجاتا ہے۔ ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ یہاں اربابِ حکومت Seriously معاملات کو لیتے نہیں ہیں کہ کون ''بھڑوں کی کھکھر میں پتھر مارے''۔ [2] سچ کہا تھا اس نے۔ [3]

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

ٹھیک ہے؛ جیسے یہ کہتے ہیں ویسے ہی کہدو۔ انہوں نے بھی ایک الگ رجسٹر کھول لیا ہوگا۔ اگر زکوٰۃ کا معاملہ آئے گا تو وہ کہہ دیا کہ ہاں صاحب! ہم اسے حکومت کی آمدنی سے الگ رکھتے ہیں۔ بیت المال میں جمع کرتے ہیں۔ خوش ہوگئے یہ صاحب بھی کہ حکومت اسلامی ہوگئی۔ جی کہ اب زکوٰۃ کا روپیہ بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔ انکم ٹیکس گورنمنٹ ریجن میں جاتا ہے؛ زکوٰۃ کے روپے بیت المال میں جمع ہوتے ہیں۔ ایہہ اسلامی ہوگیا''۔ [4] جب تک عزیزانِ من! قوم کو سوچنا نہیں سکھایا جائے گا؛ اس کی کوئی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ ان صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے معاملات کو دیکھیے۔ ان میں پہلی چیز یہ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے ان کے لیے شرط کیا لگائی ہے۔ یہیں آگے چل کے

---

1. اس کے لیے الگ مکان تیار کرنا پڑے گا۔
2. کون بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے۔
3. مرزا اسداللہ خان غالب (1797-1869)۔
4. یہ اسلامی ہوگیا۔

سورۃ حج آتی ہے: 22 ویں سورۃ 41 ویں آیت ہے (22:41)۔ اس آیت میں جماعتِ مومنین کا ذکر آ رہا ہے جو مظلوموں کی جماعت ہے اور دنیا سے ظلم وسرکشی کو مٹانے کے لیے اٹھی ہے۔ اب انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی مملکت کے استحکام اور تمکن کے لیے اپنی مدافعت کریں۔ یہ پہلی جنگ، بدر کی جنگ ہے۔ یہ چیز اس مقام پہ آئی ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ جماعت، جسے کہا جا رہا ہے کہ اپنی مملکت قائم کرواور اسے مستحکم رکھو: اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں مملکت قائم کرنے کا موقع ملا، تمکن حاصل ہو گیا تو گویا یہ پہلی "مَکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ" ہے۔ جب انہوں نے اپنی مملکت قائم کر لی تو پھر یہ کیا کریں گے؟ کہا: اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (22:41)۔ یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ (22:41)۔ کے معنی کو کبھی کھڑے ہو کے سوچو۔

تمکن فی الارض، جسے آپ اپنی مملکت کہتے ہیں، کے بغیر تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہی نہیں آئی۔ یہ تو اس مملکت کے تمکن کے متعلق بات آ رہی ہے۔ قرآن نے شرط لگائی ہے کہ اگر ان کی مملکت قائم ہوئی تو پھر یہ لوگ، یہ جماعت، یہ سرکش وظلم کو مٹانے والی مظلوموں کی جماعت اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کرے گی۔ اقامت صلوٰۃ کو تو یوں کہیے گویا کہ یہ صلوٰۃ کو قائم کرنا ہے۔ اگر صلوٰۃ کے معنی اسی نماز کے لیے جائیں تو اس کے لیے تو کہیں بھی اپنی حکومت کے قائم کرنے کی شرط نہیں ہے: ہم تو وہاں انگریز کی غلامی میں بھی اسی طرح نمازیں پڑھتے تھے، کوئی پابندی نہیں تھی، آج وہاں ہندوستان میں جو مسلمان ہیں وہ بھی اسی طرح نماز پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں تحریکِ پاکستان کے حامیوں اور نیشنلسٹ مسلمانوں یا علماء کے درمیان نزاعی مسئلہ یہ تھا کہ وہ نیشنلسٹ مسلمان یا علماء یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی مملکت میں ہندو یہ وعدہ کرتا ہے کہ جو جمہوریت قائم ہوگی، اس میں مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی پوری آزادی ہوگی۔ تو اگر اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز پڑھنے کی آزادی کے ہیں تو وہاں وہ وعدہ کرتے تھے اور اب وہاں یہ آزادی ہے۔

محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ سے علماء کرام کے تنازعہ کی وجہ

ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) اور محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ (1876-1948) جو تحریکِ پاکستان کو لے کر اٹھے تھے، کا کہنا یہ تھا کہ یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ جو تم کہہ رہے ہو، قرآن تو اس کے لیے اپنی مملکت کے ہونے کی شرط لگاتا ہے۔ عزیزانِ من! وہاں مابہ النزاع مسئلہ ہی یہ تھا۔ میں اس لیے یہ کہہ رہا ہوں کہ اس قرآنی مفہوم کے زاویہ نگاہ کو پیش کرنے کی ذمہ داری میرے اوپر عائد کی ہوئی تھی۔ مجلّہ طلوعِ اسلام جاری ہی اس کے لیے ہوا تھا۔ وہاں یہ لڑائی میں نے لڑی تھی۔ یہ اتنی سی چیز تھی جس کو پھر ٹھہرایا گیا اور برسوں تک بات چلی۔ مجلّہ طلوعِ اسلام کے فائل آپ کے پاس موجود ہیں۔ اتنے بڑے بڑے جید علماء کرام وہاں موجود تھے۔ ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ وغیرہم، سب دوسری طرف تھے۔ وہ یہی کہتے تھے کہ یہاں غیر منقسم ہندوستان میں نماز کی

اجازت ہے' زکوٰۃ دینے کی اور نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔لہٰذا اگر انگریزوں سے آزادی ملتی ہے تو یہ ٹھیک ہے پھر اس کے بعد اپنی حکومت کاہے کے لیے بنانا ہے۔

مولوی حضرات کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مفہوم

ہم یہ کہتے تھے کہ جب قرآن نے **اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ** (22:41) کی شرط لگائی ہوئی ہے کہ اگر انہیں اب تمکن فی الارض حاصل ہوا' اپنی مملکت قائم ہوئی' تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے اور اگلا قدم ہے: **وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** (22:41) امر بالمعروف کریں گے' نہی عن المنکر کریں گے۔اس **امر بالمعروف نهي عن المنكر** کے متعلق بھی آپ کو معلوم ہے' یہ جتنے مولوی صاحبان وعظ کرتے ہیں اسے وہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کہتے ہیں' حالانکہ امر کے تو معنی حکم دینا ہیں۔ سارا وعظ کہنے کے بعد پھر ہاتھ جوڑتے ہیں کہ بابا! خدا کے لیے ہم آپ سے کہتے ہیں کہ یہ چیزیں مانو۔منتیں کر رہے ہیں۔ یہاں پر قرآن نے امر کا لفظ استعمال کیا ہے۔**نهي عن المنكر** کے معنی کسی کو روک دینا ہے' نہ کہ اس کی منتیں کرنا ہے۔اب پتہ لگا کہ قرآن میں **اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ** کی یہ شرط کیوں آئی ہے۔

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیات

یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنی ہی آزاد حکومت میں ہوسکتا ہے۔تو جس چیز کے کرنے کا قرآن نے حکم دیا ہے وہ کرایا جائے' جس سے قرآن نے روکنے کا حکم دیا ہے اس کو روکا جائے۔یہ تو قانون کے بغیر نہیں ہوسکتا' یہ تو اپنی مملکت کے بغیر نہیں ہوسکتا اور اسی عمل (Process) میں چار ہی تو چیزیں ہیں۔❶**اَقَامُو الصَّلٰوةَ** ❷ **اٰتَوُا الزَّكٰوةَ** ❸ **اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ** اور ❹**وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** ۔وہ نیشنلسٹ علماء یہ کہتے تھے کہ **امر بالمعروف نهي عن المنكر** کے لیے ہم وعظ کہتے ہیں۔یہ تو ہم کرتے ہیں۔ چلیے یہ تو یہ قصہ ہوا۔باقی رہا معاملہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز پڑھنے کا اور زکوٰۃ دینے کا' تو اس کے لیے یہ لوگ' یہ یہاں کے حکمران اجازت دیتے ہیں۔اس کے علاوہ اور کاہے کے لیے آپ کو مملکت چاہیے۔میں نے عرض کیا ہے کہ بات تو صرف اتنی ہے کہ کھڑے ہو کر ذرا سوچیے کہ قرآن کیا بات کہتا ہے؟ ان موضوعات پر مجلّہ طلوعِ اسلام میں' میری' ان لوگوں کے ساتھ برسوں تک جنگ رہی۔وہ اس کا جواب نہیں دے سکے۔کبھی اس طرف آتے ہی نہیں تھے۔

نبی ﷺ کا تمکن فی الارض حاصل کرنے پر دوسرا اعتراض

وہ نیشنلسٹ علماء حضرات ان کا ترجمہ کر دیتے تھے: اقامت صلوٰۃ' نماز پڑھو۔ایتائے زکوٰۃ' زکوٰۃ دو۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر وعظ کرو۔وہ جو اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینے میں جو مملکت قائم کی تھی وہ اصل میں ایک سیاسی

چیز تھی' وہ دین والی بات نہیں تھی۔ وہ زندگی میں ناداروں' غریبوں' ضعیفوں' کمزوروں کی زندگی بسر کرتے تھے' طاقت نہیں تھی۔ مدینے میں آئے' طاقت حاصل ہوگئی۔ انہوں نے اپنی سلطنت قائم کردی۔ دین وہاں بھی تھا' دین یہاں بھی ہے۔ **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ** (22:41)۔ یہ بات تو اور آگے آتی ہے جی۔ سوال یہ ہے کہ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا' جب یہ اپنی مملکت قائم کریں گے تو پھر یہ کیا کریں گے؟ کہا یہ **اقامتِ صلوٰۃ** کریں گے۔ اب اقامتِ صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ یہ کیسے ہو گا؟ یہ میں ایتائے زکوٰۃ کے بعد عرض کروں گا۔

حکومت کا فریضہ زکوٰۃ لینا نہیں بلکہ زکوٰۃ دینا ہے

اب ایتائے زکوٰۃ پہ آیئے۔ یہ ہے **اٰتَوُا الزَّكٰوةَ** (22:41)۔ اس کے مفہوم و معانی یہ ہیں کہ یہ مملکت' یہ حکومت' زکوٰۃ دے گی۔ یہ **اٰتَوُا الزَّكٰوةَ** ہے۔ یہاں ہمارے ہاں پاکستان میں زکوٰۃ کے متعلق جتنی بھی زیادہ سے زیادہ ریفارمز (Reforms) کیں ہیں' ان کے لیے دہائی مچائی جاتی ہے کہ یہ حکومت وصول کرے' حکومت زکوٰۃ لے' مگر جو قرآن کہتا ہے' وہ یہ ہے کہ حکومت زکوٰۃ دے گی۔ ارے! یہ کیا ہوگیا؟ قرآن نے تو کہا ہے کہ یہ صلوٰۃ قائم کرے گی اور زکوٰۃ دے گی۔

زکوٰۃ کا مفہوم سامانِ نشوونما کا مہیا کرنا ہے

اب یہاں یہ بات آگئی کہ پھر یہ زکوٰۃ کیا شے ہے جو مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ یہ دے گی؟ عربی زبان میں بھی اور سارے قرآن میں بھی' عزیزانِ من! جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے' اس کا مادہ ایک ہی ہے۔ یہ ہے: ''ز ک و'' اس کے معنی ہیں: نشوونما دینا' سامانِ پرورش مہیا کرنا۔ فریضہ یہ بتایا ہے کہ جب ان لوگوں کی مملکت قائم ہوگی تو بجائے اس کے کہ یہ دوسروں کا سامانِ نشوونما اور سامانِ پرورش غصب کریں' استحصال کریں' چھینیں' ان سے لوٹیں' ان سے لیں' یہ ساری دنیا کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ یعنی سامانِ نشوونما بہم پہنچانا مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ ہوگا۔ یہ ہے ایتائے زکوٰۃ۔

ہر فرد' مملکت کا بھی فرد ہے اور نوعِ انسانی کا بھی

یہ ٹھیک ہے کہ یہ جو مملکت ہے یہ کہیں آسمان سے اترے ہوئے کوئی چار آدمی تو نہیں ہیں جن کا یہ فریضہ ہے۔ یہ تو پوری امت کی مملکت ہے۔ وہ پوری امت آپس میں ایسا انتظام کرے گی کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرے' اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لے' باقی سامانِ نشوونما جتنا ہے' وہ سارے کا سارا' ایک نظم و ضبط کے تابع' مملکت کی رو سے' عالمگیر ربوبیت کے لیے' پوری نوعِ انسانی کے لیے بہم پہنچانا ہے۔ یہ ہے ملتِ اسلامیہ کا فریضہ' عزیزانِ من! ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق Contribute کرے گا' اسے یوں کہیے کہ یہ انفرادی طور پر' نوعِ انسانی کو زکوٰۃ دینے کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ یہ انفرادی بات نہیں ہے یہ اجتماعی ہے: **مَكَّنّٰهُمْ فِى**

الْاَرْضِ ۔وہ جو آپ کے ہاں اس طرح نظامِ مملکت ہے، جو کچھ ان افراد نے Contribute کیا ہے، جتنے بھی اس مملکت کے اپنے ہاں کے ریونیوز ہیں، آمدنیاں ہیں، ضروری اخراجات پورا کرنے کے بعد انکا فریضہ یہ ہوگا کہ اس سے افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ یہاں میں نے جو عالمگیر کہا ہے تو وہ اس لیے ہے کہ ابتداءً تو اس عمل کی اپنے قریب سے ہی ہوگی، پہلے اپنے معاشرہ کے افراد کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا، بہم پہنچانا، سامانِ نشوونما مہیا کرنا، اور آخرالامر اسے عالمگیر سطح تک لے جانا۔ یہ ہے اٰتوا الزکٰوۃ. یہ مملکت زکوٰۃ دے گی۔ یہ تو مملکت کا بڑا عظیم فریضہ ہے عزیزانِ من! اسی مقصد کے لیے یہ مملکت قائم ہوتی ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح کا مفہوم سوشل سسٹم کی شکل میں پورا ہوگا

اب آیئے اقامتِ صلوٰۃ کی طرف۔ اقامتِ صلوٰۃ تو جیسے کہ میں سمجھتا ہوں آج کی دو اصطلاحیں ہیں، ان دونوں کو کور کرتی ہیں۔ ایک تو ہمارے ہاں سوشل سسٹم (Social System) کہلاتا ہے۔ تمدنی، معاشرتی، سیاسی، یہ سوشل نظام ہے، یہ پورا حصہ الصلوٰۃ میں آتا ہے۔ کہا کہ وہ ایسا نظام کریں گے جس میں ہر قدم قانونِ خداوندی کے مطابق اٹھے گا: افراد کا بھی، مملکت کا بھی اور اجتماعی بھی۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ اور خود مملکت بھی قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں گے۔ اس طرح اقامت صلوٰۃ کے معنی ہیں: وہ معاشرتی، سیاسی، تمدنی نظام، جس میں ہر فیصلہ، ہر قدم، قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔ اس زمانے کے اعتبار سے قرآنِ کریم نے 42 ویں سورۃ کی 38 ویں آیت میں یہ کہا ہے کہ ان کے تمام معاملات قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ یہ **اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38) ہے۔ وہاں ہے کہ یہ **اَقَامُوا الصَّلٰوةَ** کریں گے یعنی سوشل سسٹم کو چلانے کے لیے، اس سوشل سسٹم کے مقصد کے حصول کے لیے یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے۔ تو یہ جو آپ کے ہاں کا پورا تمدنی، معاشرتی، سیاسی نظام ہے وہ باہمی مشاورت سے طے ہونا ہے۔ اس کے لیے صلوٰۃ کے یہ اجتماعات ہیں۔ ان اجتماعات کی بھی اہمیت ہے۔ یہ پارلیمنٹ کا سیشن تو آپ کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ صلوٰۃ کے یہ اجتماعات، تو اس قسم کے سیشن ہی تھے۔ اس کی شکل کیا ہوگی؟ اس کی مختلف جزئیات وتفصیلات کیا ہونگی؟ یہ تو وہ مملکت اپنے زمانے اور حالات کے مطابق طے کرلے گی مگر اس کا مقصد یہی ہوگا۔

صلوٰۃ کی یہ ظاہرہ شکل نماز بھی ضروری ہے

یہ صحیح ہے کہ جب خدا کے احکام کی اطاعت یا ان قوانین کو نافذ کرنے کے لیے یہ سارا کچھ ہوگا، تو ٹھیک ہے اس کے لیے یہ جو ایک ہمارے ہاں کی ظاہرہ شکل ہے، جسے ہم نماز کہتے ہیں، یہ بھی اس میں ضروری ہو جائے گی۔ تو یہ خود ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔

قدم قدم پر نفسیاتی کیفیت کا اظہار

انسان کے اندر ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ جذبہ غیر محسوس ہوتا ہے لیکن جسمانی حرکت سے، از خود، Automatically ' اس کا

اظہار ہوتا ہے۔ جب آپ کسی کو سلام کہتے ہیں' تو اندر سے جذبہ تو تعظیم کا بیدار ہوا تو یہ ہاتھ' Unconsciously کیوں خود اٹھ جاتا ہے۔ سلام کہتے وقت ہاتھ آپ کا اٹھتا ہے' آپ کا سر یوں ہوتا ہے: ٹھیک ہے' ٹھیک ہے او ٹھیک ہے میاں! تو آپ دیکھتے ہیں' یہ آپ فی الارادہ سوچتے وقت یہ کچھ نہیں کر رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے: نہیں بھئی! میں نہیں آونگا' بالکل نہیں' بالکل نہیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ غصہ تو ایک ایسا جذبہ ہے' جو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس میں یہ خود بخود زور سے چیخنے کی آوازیں کیوں نکلتی ہیں؟ پیار کی باتیں' لطافت اور نزاکت لیے ہوئے کیوں ہوتی ہیں؟ یہ بڑا گہرا سائیکالوجی کا مسئلہ ہے۔ اسے (Parallelism) یعنی متوازیت کہتے ہیں۔ یہ دل کے ارادے اور جسم کی حرکت کا متوازی ہونا ہوتا ہے: زبان سے کہتے ہیں کہ اٹھو جی! اندر سے اٹھنے کا ارادہ ہوا ہے' آپ اٹھ جاتے ہیں جب کہ کمرے میں کوئی نہیں' آدمی اکیلا ہی ہے۔ ہوتا یہ ہے چل بھئی' باہر چل' وہ اٹھ کے چل دیتا ہے۔ یہ یونہی مذاق نہیں ہے۔ دل کے اندر ارادے کے جو جذبات ہیں' ان کا اظہار جسم کی مختلف حرکتوں سے ہوتا ہے۔

بالارادہ حرکات کے اظہار کی اہمیت

کسی شعلہ نوا مقرر سے کہیے کہ صاحب! تقریر تو آپ کیجیے۔ دفعہ ایک سو چوالیس تو نہیں لگی ہوئی۔ شرط صرف اتنی ہے کہ تقریر کیجیے لیکن جسم کی کوئی حرکت نہ ہو۔ آپ دیکھیے کہ دو چار منٹ کے بعد خود ہی بور ہو کے بیٹھ جائے گا اور وہ دو چار منٹ کچھ کہے گا بھی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا اثر ہی کچھ نہ ہوگا۔ وہ آپ دیکھتے ہیں! تصور میں لائیے ان مقررین کو کہ جب وہ تقریر کر رہے ہوتے ہیں تو کیا کر رہے ہوتے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ صاحب! یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ چیزیں بالارادہ نہیں ہوتیں' یہ غیر شعوری طور پہ ہوتی ہیں اور اگر یہ ساتھ نہ کرے تو نفسیاتی طور پر انسان کی تسکین نہیں ہوتی' خود کہنے والے کی بھی تسکین نہیں ہوتی۔ جب آپ ایک اجتماع میں ایسا کام کریں' جس میں قوانینِ خداوندی کے سامنے سر جھکانا ہو' تو جب ارادہ رکوع میں سر جھکانے کا آئے گا' تو آپ جھک جائیں گے۔ عزیزانِ من! جب آپ اجتماعی طور پر اکٹھے ہوئے ہونگے کہ ہم نے اس نظامِ خداوندی کو تسلیم کر لینا ہے' اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا ہے' یہ ہمارے لیے الفاظ ہیں کہ یہ Formal Parallelism متوازیت کا تقاضا ہے کہ آپ کا سر جھک جائے۔ یہ جو چیز ہے قرآن نے اسے بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس کا سسٹم بڑا عجیب سائیکلاجکل ہے جو انسان کے نفسیاتی تقاضے ہیں' وہ ان کو بھی پورا کرتا ہے۔ اس لیے ان اجتماعات کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ اجتماعی طور پر باہمی مشاورت سے سوچیں کہ ہم نے یہ نظم و نسق کیسے قائم کرنا ہے یا فرائض ہمارے ذمہ کیسے عائد کیے گئے ہیں؟ صلوٰۃ کے معنی فرائضِ منصبی ہوتے ہیں۔

صلوٰۃ کے معنی فرائضِ منصبی کا ادا کرنا ہیں

لہٰذا قرآن نے جو کہا ہے کہ کائنات کی ہر شئے' پرندوں تک' اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو جانتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر چڑیا

کو پتہ ہے کہ ''ظہر دیاں بارہ رکعتاں ہوندیا نیں''[1]۔ وہ کیا صلوٰۃ ہے جس کو یہ جانتے ہیں؟ کیا تسبیح ہے جس کو کائنات کی ہر شے جانتی ہے؟ وہ یہ ہے کہ ہر شے جانتی ہے کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ منتہٰی کیا ہے؟ میرے ذمہ فرائض کیا عائد کیے گئے ہیں؟ انہیں بھی جانتی ہے اور تسبیح کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ دائرہ کار جس کے اندر رہتے ہوئے ان فرائض کی سرانجام دہی کی جائے۔'' وہ منکوں والی تسبیح نہیں۔ وہ دائرہ کار تھا' انہوں نے گول تسبیح بنالی کہ لو جی! کائنات کی ہر شے' پرندے وغیرہ' بھی ہر ایک ان میں سے' اپنی اپنی تسبیح اور اپنی اپنی صلوٰۃ کو جانتا ہے۔ یہی ہے وہ صلوٰۃ' عزیزانِ من! جو انسانوں کی زندگی میں ہے۔ یہ جتنے آپ کے اجتماعات ہیں' وہ اس مقصد کے لیے ہیں کہ ہمارے ذمہ کیا فرائض عائد کیے گئے ہیں اور ان کو کس طرح سے ہم نے پورا کرنا ہے۔

قرآن کا سوشل سسٹم اور اکنامک سسٹم

اقامتِ صلوٰۃ کے تو معنی ہونگے جسے آپ سوشل سسٹم کہتے ہیں اور ایتائے زکوٰۃ ہوگی جسے آپ اکنامک سسٹم کہتے ہیں۔ اس مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ یہ جو سوشل سسٹم اینڈ اکنامک سسٹم ہے' اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق Establish کرے۔ یہ ہے جس کے لیے کہا گیا ہے اور تمام انبیاء کی طرف یہ حکم دیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ وہ اپنی جماعت کو یہ حکم دیا کرتے تھے۔ پہلی چیز تو یہ کہی ہوئی تھی کہ **اقـامـوا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ** اور اس کے بعد **امـروا بالمعروف و نھی عن المنکر** کرو۔ ہر وہ بات جسے قرآن صحیح Recognize کرے' معروف ہے۔ معروف کے معنی ہوتا ہے: پہچانا ہوا' جانا ہوا' Recognize کیا ہوا۔ تو بات یہ بنی کہ یہ نظام جس کو صحیح Recognize کرے' اس کا وہ حکم دے اور جس کو یہ Recognize نہ کرے' اس کو روکے۔ اور اس طرح سے ایک ایسا سوشل سسٹم قائم کریں جس میں ہر قدم قانونِ خداوندی کے مطابق اٹھے' اور اکنامک سسٹم قائم کریں جس میں تمام افرادِ انسانیہ کا سامانِ نشوونما مہیا کیا جائے۔ یہ ہے عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ۔ قرآنِ کریم کی رُو سے' مذہب میں آ کے یہ چیز چھوٹ گئی۔

حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے متعلق ذکر آ رہا ہے اور انبیائے کرام کے متعلق جب ذکر آئے گا' تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے رفقاء کو' اپنی جماعت کو **کَـانَ یَـاْمُرُ اَھْلَهٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ** (19:55)۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دے رہے ہونگے۔ تو ہدایتِ خداوندی کا تو مقصد ہی یہ تھا: ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے' جس میں ہر قدم قانونِ خداوندی کے مطابق اٹھے۔ ایسا اکنامک سسٹم رائج کیا جائے' جس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی چلی جائیں۔ زکوٰۃ صرف انسان کی جسمانی پرورش تک محدود نہیں ہے' یہ تو بالکل حیوانی سطح ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر آپ نے اپنے گھر میں کوئی گھوڑا رکھا ہوا ہے اور بچے بھی ہیں تو پرورش کا سامان تو آپ دونوں کا کرتے ہیں: اسے بھی چارہ ڈالتے ہیں' ضرورت کے لیے انہیں بھی روٹی کھلاتے ہیں' تو اس طرح دونوں کی زندگی یکساں طور پر ایک سطح پہ ہوگئی۔

---

[1] نمازِ ظہر کی بارہ رکعتیں ہوتی ہیں۔

ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ذات کی نشو ونما بھی

لہٰذا اس کے علاوہ آپ اولاد کے متعلق اور کیا کرتے ہیں: ان کی صحیح تربیت بھی کرتے ہیں' ان کی صحیح تعلیم کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ صحیح تعلیم وتربیت سے کیا ہوتا ہے؟ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ اس سے انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے تو جب قرآن سامانِ زکوٰۃ کہے گا تو سامانِ زکوٰۃ کے معنی ہونگے: تمام افراد کی جسمانی' طبعی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا اور اس کے ساتھ ان کی ذات کی نشو ونما کا سامان بھی بہم پہنچانا۔

کمیونزم انسانی ذات کو تسلیم نہیں کرتا

یہ ہوگئی مملکتِ اسلامیہ اور اگر صرف گھوڑے اور بچے کو آٹا دانہ ہی دینا ہے تو وہ تو آپ کے ہاں کا کمیونزم ہوگا یا سوشلزم۔ کہ ٹھیک ہے روٹی کپڑا' بچوں کو بھی دو۔ باہر بکری باندھی ہوئی ہے' گھوڑا ہے' گدھا ہے' ان کو بھی چارہ ڈالو' ان کو بھی روٹی دو۔ یہی ہے کمیونزم: روٹی دو۔ انسانی ذات یا نفس کا تو اسمیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ جسم کے سوا بھی انسان کچھ ہے۔ یہاں یہ چیز قرآن نے کہی۔

تزکیہ کا قرآنی مفہوم

اب جو قرآن کے اندر تزکیہ کا لفظ آئے گا اسے آپ دیکھیے کہ اس کے معنی کیا ہونگے۔ تزکیہ کے معنی ہیں: Growth, Development۔ نشو ونما تو تزکیہ نفس ہے۔' ادھر ہماری صلوٰۃ صرف نماز ہوئی' اور زکوٰۃ اڑھائی پرسنٹ میں بدل گئی۔ تزکیہ نفس آپ کے ہاں کی خانقاہوں میں' مزاروں میں اور درگاہوں میں ہونا شروع ہوگیا۔ یہاں آپ نے کونوں میں بیٹھ کر چلّے کھینچنے شروع کر دیئے۔ یہ تصوف کے مطابق تزکیہ نفس ہو رہا ہے' جی! کس طرح ہو رہا ہے؟ یہ نفس کشی سے ہو رہا ہے' جی! ذرا اور سمجھایئے۔ کہا کہ ساری دنیا کے ترک کر دینے سے ہو رہا ہے۔ قرآن نے انسان کیلیے تسخیر فطرت کا فریضہ بتاتا ہے۔ لہٰذا قرآن تو یہ کہتا ہے کہ تمام فطرت کی قوتوں کو کنٹرول کرکے' ان کو نشو ونمائے انسانیت کے اندر صرف کرو۔ یہ ہے تزکیہ اور اس سے تمہاری ذات کی نشو ونما ہو جائے گی۔ یہاں آپ کے ہاں تزکیہ نفس' ان تمام چیزوں کو ترک کرنے سے ہے اور ترک کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنے لیے کچھ نہیں کرونگا۔ میرے لیے تم کرو کیونکہ حضرت صاحب نے چار دن کے لیے بند ہو جانا ہے۔

تربیت کے معنی ربوبیت کے ہیں

یہ تزکیہ عالمگیر ربوبیت ہے' جسے آپ نوعِ انسانی کی' تمام افرادِ انسانیہ کی' طبعی زندگی کی ضروریات اور ان کی ذات کی تربیت کرنا

کہتے ہیں۔ لہٰذا تربیت کے معنی ربوبیت کے ہیں۔ کیا بات تھی اس قوم کی بھی اور ان کے الفاظ کی بھی! یہ جسے آپ ربوبیت یا تربیت کہتے ہیں ان کے ہاں مثال تھی تو ہمارے ہاں بھی مشہور ہے کہ قطرہ ابرِ نیساں جو ہے' بہار کی پہلی بارش' اس کا ایک قطرہ سمندر کی سیپ اپنے اندر لے لیتی ہے' اسے بند کرتی ہے اور پھر اس کے اپنے اندر ہی اندر اس کی نشو ونما کرتے ہوئے' اسے ایک گوہرِ تابدار یا موتی بنا لیتی ہے۔ عربوں کے ہاں یہ جو پروسیس (Process) عمل تھا' کسی قطرۂ آب کو موتی بنا لینے کا تھا' وہ اسے ربوبیت کہتے تھے' اور رب ایسا کرنے والے کو کہتے تھے۔ تو یہی چیز تھی جو اقبالؒ نے کہی تھی کہ

زندگانی ہے صدف' قطرۂ نیساں ہے خودی

وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

یہ ہے زکوٰۃ عزیزانِ من۔ یہ اتنا عظیم انقلاب کوئی مذاق نہیں تھا جو خدا کی طرف سے آپ کو دیا جائے۔ کتنی عظیم الشان انقلابی شخصیت کے رسول تھے جو اس پروگرام کو لانے والے تھے' ایسی ایسی جماعتیں تیار کر کے' جان دے کے' اس پروگرام کو قائم کرنے والے تھے۔ کیا یہی چیز تھی جس کی قریش مخالفت کیا کرتے تھے کہ ''نماز نہ پڑھو۔'' حضرت شعیب کے قصے کے اندر قرآن تو یہ کہتا ہے کہ انہوں نے جب کہا کہ صاحب! میرا مقصد صلوٰۃ کی ادائیگی ہے' انہوں نے کہا: بسم اللہ۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا ہوگا کہ جی! یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: بات ہی کونسی ہے۔ ہم یہاں ڈنڈوت بجالاتے ہیں' گھنٹیاں بجاتے ہیں' بتوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ یہ کہیں اپنے طور پہ کہتا ہے کہ میں اپنے طور پہ یوں یوں کر لیا کرونگا تو کر لیا کرے۔ ''ساڈا اوگڑ دا کی اے ایدے نال۔''[1] اجازت دیدی۔ اب وہ نبی والی صلوٰۃ آئی۔ انہوں نے جو یہ شروع کیا تو قومِ شعیب علیہ السلام لگی بگڑنے' آ گئی مخالفت پر۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ اور ہماری نماز میں فرق

عزیزانِ من! سوچیے ان مقامات پہ کہ انہوں نے یہ کہا کہ شعیب! ہم نے تو تمہیں نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ یہ تیری صلوٰۃ کس قسم کی ہے کہ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی کے ساتھ خرچ کریں۔ تمہاری یہ کیسی صلوٰۃ ہے؟ انہوں نے کہا: ''یہ خدا کی صلوٰۃ ہے۔ وہ تمہاری صلوٰۃ تھی جس کو تم سمجھتے تھے کہ کیا حرج ہے' کرو'۔ قوم کہتی ہے کہ ''یہ کیسی صلوٰۃ ہے کہ جو ہمیں اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے نہیں دیتی۔'' یہ ہے اقامتِ صلوٰۃ اور یہ ہے ایتائے زکوٰۃ کہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق صرف نہیں کیا جائے گا۔ اپنی مرضی کے مطابق تو اپنی پرورش اور اپنے بچوں کی پرورش کے لیے ہوتا ہے اور یہاں عالمگیر ربوبیت کے لیے

---

[1] ہمارا اس سے کیا بگڑتا ہے۔

ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ تو رب العالمین ہے۔ تو یہ صلوٰۃ ہے۔ اب سمجھے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا کیسا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی تو تشریح حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں خدا نے خود کر دی کہ یہ صلوٰۃ کیسی ہے کہ جو ہمیں اپنا مال بھی' اپنی مرضی کے مطابق صرف نہیں کرنے دیتی ۔ بڑا آسان ہے' عزیزانِ من! دین کو مذہب میں بدل لینا۔ پھر راوی عیش ''لکھدا ہے۔''❶ ٹھیک ہے جی! پانچ وقت یہ کچھ رسمی طور پر کرو۔ پھر جو جی میں آئے کرتے چلے جاؤ۔ یہ کرو اور پھر جس طرح سے جی میں آئے' دولت اکٹھی کرتے چلے جاؤ اور سال کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد نکال دو اور اس اڑھائی فیصد میں بھی اگر آپ فقہ کے مسئلے لیں تو پوچھیں نہیں کہ پھر اس سے بھی بچ نکلنے کے لیے کتنے دروازے اور کھڑکیاں رکھی ہوئی ہیں: اس پہ بھی زکوٰۃ نہیں' اس پہ بھی زکوٰۃ نہیں' اس پہ بھی زکوٰۃ نہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قابلِ غور الفاظ

كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (19:55)۔ وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تلقین کرتا تھا کہ یہی نظام خداوندی کے ستون ہیں۔ یہ تھا اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا اس کا امر۔ اب اس آیت کا اگلا حصہ لیجیے: وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (19:55)۔ اور وہ اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین سے یکسر ہم آہنگ تھا۔ عزیزانِ من! صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں ہی اتنا وقت لگ گیا تھا۔ اب یہاں ایک لفظ اور آ گیا: كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (19:55)۔ وہ لفظ ہے مرضیا۔ آپ جب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا بھی نام لیتے ہیں تو ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ کتنی دفعہ ہم یہ لفظ بولتے ہیں اور جب یہ لفظ یوں بولنے شروع کر دیئے جائیں تو پھر یہ اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔ کبھی بھی آپ نے یہ سوچا کہ باقی باتیں جو اس سے کر رہے ہوتے ہیں اس میں تو آپ سوچ کے بات کرتے ہیں' سمجھ کے بات کرتے ہیں کہ یہ بات میں نے کہنی ہے لیکن جب آپ یہ نام لیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو اس پہ بھی آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ ساتھ میں چار لفظ کہہ رہا ہوں یہ کیا ہیں؟ یہ بغیر سوچ کے جو الفاظ بولتے ہیں اگر آپ یہ الفاظ نہ بولیے تو دیکھیے کہ پھر یہ کیسے آپ کے پیچھے پڑتا ہے کہ صحابہ کا نام لیا ہے' اس کے ساتھ ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نہیں کہا۔ کہہ دیا ہے: وہ خوش ہو گئے۔ کبھی ہم نے کھڑے ہو کے سوچا بھی ہے کہ قرآنِ کریم میں جتنی یہ اولوالعزم شخصیتیں ہیں اور پھر جتنے یہ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم ہیں' خاص طور پہ مہاجرین' اور ان کے ساتھ ملنے والے انصار' ان کے متعلق یہ کہا ہے: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں اور یہی ہیں وہ الفاظ جو ہم صحابہ کبار کے نام کے ساتھ لیتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اس کا ترجمہ آپ جہاں دیکھیے یہ ہوگا کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا' وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ ''راضی نامہ ہو گیا اونہاں دو آں اچ'' ❷ عزیزانِ من! پھر وہ بات قرآن کیوں بار بار کہتا ہے: ''او کھڑے ہو کے''

---

❶ لکھتا ہے۔

❷ ان دونوں میں راضی نامہ ہو گیا۔

تدبر کیا کرو، ❶ تفکر کیا کرو، تعقل سے کام لو، شعور سے کام لو۔ تو یہ الفاظ ہی تو ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ سوچو تو سہی۔ ہماری مشکل یہ ہوگئی ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو عربی مبین میں سمجھا ہی نہیں اور ہمارے ہاں جو اردو زبان میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں تو یوں ہوا کہ گویا یہ اسی میں نازل ہوا ہے اور ان الفاظ کا ترجمہ یونہی کر لیا گیا کہ ''اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔'' اور اگر صاحب انگریزی میں چلے گئے تو اس میں یہ ''رضی'' والی چیز ہوگئی: Pleased' قرآن حکیم کا عربی مبین کی بجائے دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کا نتیجہ' چلو جی! وہ ترجمہ یوں ہو گیا:

God was pleased with them

وہ خوش ہو گئے۔ کیا خدا بھی کبھی کسی کے ساتھ Pleased ہوتا ہے' خوش ہوتا ہے؟ کیا اسے بھی کسی کے ساتھ کبھی غصہ آتا ہے۔ کہ وہ دھتکار کر کہے کہ ''تیری ایسی کی تیسی۔'' ❷ عزیزانِ من! دین کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا کا صحیح تصور آپ کے سامنے آ جائے۔ خدا کا لفظ ہم نے سنا ہوا ہے' ساری عمر بولتے چلے جاتے ہیں' کبھی کھڑے ہو کے سوچا کہ یہ بات جو ہم کہہ رہے ہیں تو اس کا ہمارے ذہن میں تصور کیا ہے؟ کبھی یہ خیال نہیں آتا۔ لفظ ''رضی'' کا Pleased انگریزی میں ترجمہ ہو گیا اور اردو میں ہو گیا کہ ''خدا ان سے راضی ہو گیا' وہ خدا سے راضی ہو گئے''۔ اپنے ہاں پنجابی زبان میں ذرا وہ ''راضی'' کا لفظ بول کے دیکھ لیجئے' وہاں تو آپ سوچتے ہیں: پھر وہ اس سے راضی ہو گیا۔ یعنی راضی نامہ ہو گیا تو گویا پہلے کچھ روٹھے ہوئے تھے' کوئی جھگڑا تھا' وہ طے ہو گیا' اب وہ راضی ہو گئے' معاملہ ٹھیک ہو گیا' صلح ہو گئی: خدا ان سے راضی ہو گیا' وہ خدا سے راضی ہو گئے۔ مگر نہیں' ان الفاظ کا یہ قرآنی مفہوم نہیں ہے۔

قرآن اردو یا انگریزی میں نہیں بلکہ عربی میں نازل ہوا ہے

عزیزانِ من! وہ راضی ہو گیا گویا کہ یہ اردو کا قرآن ہے۔ وہ Pleased ہو گیا گویا کہ یہ انگریزی کا قرآن ہے' عربی کا قرآن نہیں۔ اور آگے چلیے۔ اس کے معنی یہ ہو گئے: ''صاحب! یہ رضائے خداوندی کے مطابق کام کرنے لگ گئے۔'' ان الفاظ میں اس سے ذرا اور آگے بڑھتے ہیں' عزیزانِ من! بڑی توجہ سے بات سنیئے گا۔ پہلی دفعہ یہ چیز آ رہی ہے: رضی اللہ عنہم: خدا ان سے رضی' یہ خدا کا ہوا اور **و رضوا عنہ**: یہ عنہ خدا سے۔ اس ٹکڑے کے معنی ہو گئے کہ ''انہوں نے رضائے خداوندی کے مطابق کام کیا'' اور جو پہلا رضی اللہ عنھم ہے تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ ''خدا نے ان کی مرضی کے مطابق کام شروع کر دیا۔'' یہ لفظ ''رضی'' تو دونوں جگہ ہے۔ راضی ہو گیا۔

---

❶ او صاحبانِ انسانی! کھڑے ہو کر غور کیا کرو۔

❷ بڑا برا ہو' تیری بربادی ہو' تیرے تمام کام بگڑیں۔

پہلے ہم نے دیکھا کہ اس میں پہلے جو بات ہے وہ خدائی تصور کے ساتھ بگڑنے کی ہے' جھگڑا کرنے کا تصور لیے ہوئے ہے لہٰذا یہاں اگر یہی کچھ ہے تو یہ ٹھیک ہے ان کے متعلق تو بات سمجھ میں آ گئی۔ دراصل ہمارے ہاں رضائے خداوندی کا جو لفظ ہے وہ خدا کی رضا کے مطابق ہونے کے معنی میں لیا جاتا ہے' اور استعمال ہوتا ہے لیکن میں ابھی عرض کرونگا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ انگریزی زبان میں Will of God اس کا ترجمہ ہو گیا' یہ انگریزی کے سارے تراجم ہم نے Christianity (عیسائیت) سے لیے ہوئے ہیں۔

قرآنی تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں راضی برضا کا تصور

عزیزانِ من! یہ اس طرح کا تصور ہی عیسائیت کا ہے۔ Will be done کہ ان کی صبح کی Prayer ہے۔ وہ اردو میں کہتے ہیں: تیری مرضی پوری ہو' یعنی مرضی کے مطابق۔ اب مرضی کا لفظ آ گیا۔ رضا سے آگے چلے تو مرضی: مرضئ مولا برہما۔ آدمی کو راضی برضا ہونا چاہیے۔ کیا آپکو معلوم ہے کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ اِس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''جو کچھ مصائب و آلام' تکلیف' نامساعد حالات آتے ہیں' انسان کو ان پہ صبر شکر کر کے بیٹھنا چاہیے کیونکہ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے۔'' اور راضی برضا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ''جب اس کی مرضی ہی ایسی ہے تو ہمیں اس پہ راضی رہنا چاہیے' اس کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہیے' بیماری آتی ہے تو خدا کی مرضی سے آتی ہے' علاج نہیں کرنا چاہیے۔''❶ اور پھر تفسیروں میں جائیے تو پوچھیے نہیں کہ کہاں کہاں تک ان کی نشتر جاتی ہے۔ بقول ان کے حضرتِ ایوب علیہ السلام کے سارے جسم میں کیڑے پڑ گئے ہوئے تھے۔ جب ایک کیڑا گر جاتا تھا تو وہ اس کو اٹھا کے پھر رکھ لیتے تھے۔ اگر کہتے تھے کہ حضرت! آپ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب میں کہتے ہیں کہ جب خدا کی مرضی ہی یہ ہے کہ میرے جسم میں کیڑے چلیں تو یہ رضائے خداوندی کے مطابق ہے' وہ جو کیڑا رکھا ہے۔ روتے ہیں' رولانے والے' مولا کی مرضی ہے۔ علاج تو بڑا کیا تھا لیکن بالآخر نہ بچا۔ بہرحال ''اللہ دی مرضی ہیگی اے جو کچھ او کردااے۔''❷ ''مرضی خدا کی' ہر بگڑے ہوئے کام پہ آپ بولتے ہیں۔ یاد رکھیے' اگر اس مریض کو شفا ہو جاتی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ہم کبھی نہیں کہتے کہ صاحب! اللہ کی مرضی یہ تھی کہ اس کو شفا ہو جائے۔ بات ساری یہ ہوتی ہے۔ ''او فلاں ڈاکٹر صاحب ہیگے سن۔ اونہاں نے بڑا کچھ کیتا جی' بچ گیا۔ جے مر گیا تے اللہ دی مرضی اے ہے۔ مقدمہ ہر گیا! اے تے اللہ دی مرضی۔ منڈا فیل ہو گیا تے: اے اللہ دی مرضی۔ پاس ہو گیا تے کدی اللہ دی مرضی نئیں جناب! او جی ایہہ۔''❸ میری بیٹیاں اور بہنیں بیٹھی ہیں۔ ان کا تو معاملہ ہی یہ ہے یعنی ایک بیٹی کی پیدائش تک تو ان بے چاریوں کو معاف کیا جاتا ہے' اگر دوسری ہو جاتی ہے تو ''بیٹھ جاندیاں ہیگیاں' ایتھوں تک دی خیر' متشابہات تک گل ریندی اے۔ اگر تیسری آ جائے تو وخت پے جاندا اے۔ اتے اونوں

---

❶ مرضی یار کے خلاف نہ ہو۔ لوگ میرے لیے دعا نہ کریں۔ ❷ یہ جو کچھ بھی کرتا ہے یہ اللہ ہی کی مرضی ہے۔

❸ فلاں ڈاکٹر صاحب ہوتے تھے۔ انہوں نے بہت کچھ کیا تو وہ بچ گیا۔ اگر مر گیا تو یہ اللہ کی مرضی۔ مقدمہ ہار گئے تو اللہ کی مرضی۔ لڑکا فیل ہو گیا تو اللہ کی مرضی۔ اور اگر پاس ہو گیا تو پھر جناب کبھی نہیں کہیں گے کہ اللہ کی مرضی۔

مصیبت پے جاندی اے پئی اگلا ہن مطالبہ طلاق دا ہویا' تیسری بیٹی۔حوصلہ دین والیاں ہوندیاں' تے ساس نوں کیندیاں نیں: اے تے اللہ دی مرضی ہوندی ہیگی اے [1] یعنی لڑکا پیدا ہوتا ہے تو وہ اللہ کی مرضی نہیں' 'ایہہ جیہڑی لڑکی پیدا ہوئی' اے اللہ دی مرضی اے' منڈے دے واستے نئیں۔'' [2] ہر وہ کام جو آپ کی منشاء کے خلاف ہو تو وہ اللہ کی مرضی ہوگئی۔موت آ گئی تو اللہ دی مرضی یعنی رضوا عنہ کے معنی ہو گئے کہ جو اللہ کی مرضی ہوئی۔انہوں نے اس پہ کہا کہ راضی برضا ہو جاؤ یعنی انہوں نے شکایت نہیں کی۔ٹھیک ہے جی! اللہ کی مرضی ہے' تین لڑکیاں ہی آئی ہیں اگر اللہ کی مرضی سے آٹھ آ جائیں تو آ رہی ہیں یہ! میں پوچھتا ہوں کہ آپ **رضی اللہ عنہم** کے پھر کیا معنی کریں گے۔کیا یہ لیں گے کہ خدا انسان کی مرضی کے مطابق کر رہا ہے؟

عزیزانِ من! وہی لفظ ہے یعنی جو یہ رضوا عنہ' خدا کے متعلق کرتے ہیں تو خدا ان کے متعلق بھی وہی کچھ کرتا ہے۔پہلے ترجمہ کرو پھر معنی یہی کرو: وہ اُن کی مرضی سے راضی ہو جاتا ہے' پھر وہ ان کی ضد کے مطابق کرتا ہے' عزیزانِ من! کھڑے ہو کے سوچنے سے ایک دفعہ تو جھنجھناہٹ آ جاتی ہے۔جھنجھناہٹ اس لیے ذہن کو آتی ہے کہ عزیزانِ من! بچپن سے ہمارے ذہنوں میں یہی آوازیں پڑتی رہی ہیں۔ ہم نے کبھی کھڑے ہو کے سوچا نہیں اس لیے کہ یہ مذہب ہے۔

دنیا میں سب سے مشکل کام' سوچنا ہے

''غالبِ خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں'' [3] جو کھڑا ہو کے آدمی خوامخواہ کے لیے اپنے ذہن میں سوچ کو لے آئے۔سوچنا تو بڑا مشکل ہوتا ہے۔اگر دنیا میں سب سے مشکل کام سوچنا ہے تو کیوں اس کے متعلق سوچا جائے؟ سوچنا چاہیے کاروبار کے متعلق' ملازمت کے متعلق' گھر بار کے متعلق' زمینداری کے متعلق۔وہ تو باتیں ہیں سوچنے کی لیکن ان کے متعلق خوامخواہ کے لیے دماغ سوزی سے کیا فائدہ ہے۔کبھی نہیں سوچا' جو چیزیں ہوتی چلی آ رہی ہیں' ان کو ہم نے مسلمات کے طور پہ Accept کر لیا ہے' اب عمر کے کسی حصہ میں جو کھڑے ہو کے یہ بات کوئی کہہ دے کہ نہیں یہ جو تم مانتے چلے آ رہے ہو' یہ بات تو غلط ہے' یوں نہیں ہے تو ایک دفعہ تو جھنجھناہٹ آ جائے گی اور اگر بار بار زور دیا جائے کہ اُس کے اوپر کھڑے ہو کے سوچو' یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔یہ سوچنے کی تو ایک عادت ہوتی ہے۔ نئی نئی عادت ڈالنا' پھر عمر کے اس حصے میں آ کے' یہ بھی بڑا مشکل ہوتا ہے اور سوچنے کے بعد ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔وہ جو اندر مسلمہ کے طور پہ مانا ہوا تھا سوچ اس کے خلاف جا رہی ہوتی ہے۔یہ ہوتا ہے۔' یہی تو کشمکش ابلیس و آدم ہے۔یہی تو آویزشِ حق و باطل ہے۔لیکن اگر آپ زندگی کو

---

[1] یہاں تک تو پھر بھی خیر خیریت ہی رہتی ہے۔بات اشاروں کنایوں تک رہتی ہے۔اگر تیسری بیٹی پیدا ہو جائے تو مصیبت پڑ جاتی ہے۔ تو وہ مبتلائے الم ہو جاتی ہے کہ اب ہوا مطالبہ طلاق دینے کا کیونکہ تیسری بیٹی پیدا ہو گئی ہے۔حوصلہ دینے والی ہوتی ہیں جو ساس سے کہتی ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔

[2] یہ جو لڑکی پیدا ہوتی ہے تو یہ اللہ کی مرضی ہے۔اگر لڑکا پیدا ہوتا ہے تو پھر وہ اللہ کی مرضی نہیں ہوتی۔

[3] غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روییے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

Seriously لیتے ہیں تو یہ تو ہوگا ہی اور پھر یہ بھی کہ یہ تو کرنا ہی پڑے گا وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكِيْنَ (61:9)۔ خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کے بجائے مختلف خداؤں کے احکام کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں۔ یہی تو مشرکین ہیں۔ قرآن کہتا ہے اگر تم زندگی کو Seriously لیتے ہو تو پھر اب یہ تو کرنا پڑے گا۔ سوچنا ہوگا کہ یہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کیا ہے؟ پوچھو زبان والوں سے کہ اس میں عزیزانِ من! خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ دراصل یہ ساری بات اس کے اندر مضمر ہے اور یہ بڑی عظیم چیز ہے' مذہب میں کہیں نہیں ملے گی' دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملے گی۔ یہ چیز آپ کو صرف دین میں ملے گی' صرف قرآن میں ملے گی۔

ان الفاظ کا ترجمہ ہی قوانین خداوندی سے ہم آہنگی ہے

اگر دیکھا جائے تو بندے کا خدا کے ساتھ تعلق ہی کچھ قوانین کا ہے یعنی خدا کے ان قوانین کے مطابق چلنا اور اب یہاں عربی زبان کا وہ لفظ آ گیا جس کا مادہ ''ر ض ی'' ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی کے مطابق ہو جانا' ہم آہنگ ہو جانا' جیسا وہ ہے ویسا ہی ہونا۔ اس کے معنی میں ہم آہنگی آ جاتی ہے یعنی اس کے مطابق ہو جانا۔ اس کے کچھ قوانین ہیں' اب ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو یاد رکھیے' جہاں بھی قرآن نے اللہ کہا ہے تو ہمارے ساتھ جو اس کا تعلق ہے وہاں ان الفاظ کا ترجمہ' آپ خدا کے قوانین کر لیں تو بہت سی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں اور بات سمجھ میں بھی آ جاتی ہے: قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جانا۔ اب دو باتیں ہوتی ہیں: ایک تو ہوتا ہے' حکمِ حاکم مرگِ مفاجات' یعنی تھانیدار نے حکم دیا کہ یہاں روز تھانے میں دس بجے آیا کرو لہٰذا آپ پہنچ رہے ہیں تو ایک تجربہ حکم ہے مگر کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیوں کہہ رہا ہے؟ کیوں بلوا رہا ہے؟ مصیبت کیوں آ رہی ہے؟ آپ گالیاں کیوں دے رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں وہاں؟

حکم اور ہدایت میں فرق

دوسرا ڈاکٹر کی اطاعت ہے کہ یہ دوائی ہے اور یہ تمہارا مرض ہے۔ اس میں خدا کا قانون یہ ہے کہ اس کے مطابق تمہیں عمل کرنا ہوگا اور تمہیں اتنے وقت میں دوائی کھانا ہوگی نیز ایسا ایسا پرہیز کرنا ہوگا۔ یہ بھی ایک حکم ہے۔ لیکن اسے حکم نہیں' ہدایت کہا جاتا ہے' اسے ڈاکٹر کی Direction کہا جاتا ہے' شیشیوں کے اوپر بھی Directions لکھی ہوئی ہوتی ہیں تو یہ Direct کسی راستہ کی طرف راہنمائی کر دینا ہوتا ہے۔ ''پچھدے نیں ناں سڑک تے کھلوتے ہوئے' میاں صاحب! میں شہر نوں جانا اے' کس پاسے جانا اے؟ ایدر چلے جاؤ''۔ [1] اسے کہتے ہیں ہدایت۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ کرو گے تو اس کے مطابق کیا ہوگا؟ بخار اتر جائے گا۔

---

[1] سڑک پہ کھڑے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ میاں صاحب! مجھے شہر جانا ہے' میں کس طرف جاؤ۔ کہا: ادھر چلے آؤ۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ کا دوسرا نام ہی باہمی رفاقت ہے

یہ جو قانون کے مطابق اس پہ عمل کرنا ہے یہ رضوا عنہ ہے: اس کے قانون سے ہم آہنگ ہو گئے' متفق ہو گئے' مطابق ہو گئے' اور اس کے قانون نے وہ کر کے دکھا دیا' جو کہا جاتا تھا۔ وہ قانون اپنے دعویٰ سے ہم آہنگ ہو گیا' وہ نتیجہ نکل آیا۔ وہ جو دونوں کا' ڈاکٹر اور مریض کا' ڈاکٹر کے مشورے اور مریض کا' یا ڈاکٹر کے نسخے اور اس کی بیماری کا' آپس میں تعلق ہے' یہ باہمی تعلق ہے' یہ رفاقت کا تعلق ہے' یہ ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں' دونوں مل کے کچھ کرتے ہیں' اِدھر کا قانون اُدھر کی اطاعت دونوں ملتے ہیں تو ملنے کے بعد نتیجہ شفا ہوتا ہے۔ دونوں آپس میں ہم آہنگ ہوتے ہیں تو نتیجہ شفا نکلتا ہے: رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ اور اس رفاقت کے متعلق تو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ ارضی کے سانس کا آخری لفظ یہ تھا کہ **بل ھو رفیق الاعلیٰ** حضور ﷺ آخری لفظ میں یہ بتا گئے کہ خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا تعلق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ رفیقِ اعلیٰ ہے' انسان رفیقِ ادنیٰ ہے۔ تعلق رفاقت کا ہی ہے۔

عزیزانِ من! یہ باہمی تعلق دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ میں یونہی یہ بات نہیں کہہ رہا۔ اللہ کا شکر ہے تمام مذاہبِ عالم کی جتنی مبینہ آسمانی کتابیں ہیں میری ایک ایک پڑھی ہوئی ہے۔ انہی چیزوں کی تلاش میں میں انکے اندر نکلا تھا کہ دیکھوں کہ یہ جو قرآن کا دعویٰ ہے' کیا یہ دعویٰ مسخ شدہ کتابوں میں موجود ہے؟ تو پتہ چلا کہ یہ باہمی رفاقت کا تعلق کہیں' کسی مذہب میں' موجود نہیں ہے۔ یہ تعلق آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ یہ جو باہمی رفاقت کا تعلق ہے یہ تو حضور ﷺ نے فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے کہاں سے فرمایا؟ وہ جو آپ کے ہاں قرآنِ کریم میں واقعہِ معراج ہے'[1] وہ بھی پتہ نہیں کیا کیا چیستانیں بنی ہوئی ہیں؟

واقعہ معراج کے تحت قاب قوسین کا مفہوم

گو کہ وہ بات دوسری طرف نکل جائے گی مگر اس میں آتا ہے کہ پھر حضور ﷺ پھر چلے گئے: **وَھُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی ؕ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی** (53:7-8)۔ اس کے ساتھ ہی وہ (وحی کی رو سے) علم کی ان بلندیوں پر جا پہنچا جہاں عقل انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔ (81:23)۔ وہاں پہنچ کر وہ حقائق کائنات سے قریب تر اور قوانین خداوندی کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان سے ہم آہنگ ہو گیا۔ عزیزانِ من! یہاں اس کے معنی ہیں کہ قریب ہو گئے یعنی خدا تو اپنی جگہ پہ بیٹھا رہا' یہ چلتے گئے' قریب ہو گئے اور قریب ہو گئے' اتنا قریب ہو گئے' جیسے کہ قاب قوسین (53:9) جہاں بھی آپ دیکھیے گا اس کا ترجمہ ''درمیان میں دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا۔'' جہاں بھی دیکھیے آپ کو اس کا ترجمہ یہی ملے گا۔ ''دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا'' تو اس سے ذہن میں یہ تصور آیا کہ فاصلہ تو خود دو نقطوں کے درمیان ہوتا ہے جو ہوتے ہیں یعنی جو اپنی

---

[1] اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء ص ص۔66-23

جگہ پہ قائم ہوتے ہیں یعنی ایک نقطہ اگر کہیں سے ہل کے آگے چلا جائے تو وہ فاصلہ ہی نہیں رہتا۔ ''پھر نویں سرے توں ماپنا پیندا اے''[1] گویا پہلا تو خدا کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ تو اپنی جگہ کے اوپر بیٹھا ہے یہ حضور ﷺ یہاں سے اس کی طرف تشریف لے جاتے ہیں' تو گویا ایک تو چیز ہوئی کہ وہ کہیں Space کے اندر ہے' کسی مقام میں ہے' مقام میں بھی وہ خدا بیٹھا ہوا جیسا عرش کا تصور اس نے لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہاری رگِ جان سے بھی قریب ہوں۔ یہ کہتے ہیں عرش پہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہاں حضور ﷺ تشریف لے گئے' چلے گئے آگے' چلے گئے آگے۔ وہاں جانے کے بعد پھر اب آگے یہ بات نہ آ جائے کہیں کہ ''جا کے ایویں جپھی پا لئی۔''[2] انہوں نے دو کمانوں کا درمیان میں فاصلہ رہنے دیا۔ اس فاصلے کو ماپنے کے لیے بھی ان کے پاس وہ قوسین تھی۔ وہ کمان تو یوں ٹیڑھی ہوتی ہے تو فاصلہ تو ہمیشہ کسی سیدھے گز سے ناپا جاتا ہے۔ مگر وہ تو قوسین تھا۔

یہاں قاب قوسین ہے۔ عزیزانِ من! کیا عرض کروں' قرآن کیا کہہ گیا ہے' پوچھو اس زمانے کے عربوں سے کہ یہ قاب قوسین کی کیا بات تھی؟ معراج حقیقت میں معراجِ انسانیت ہے۔ خدا اور انسان کے تعلق کو واضح کرنے والی ایک چیز ہے۔ یہ کیا تعلق تھا؟ عربوں کے ہاں قاعدہ یہ تھا کہ جب دو شخص آپس میں اس قسم کا معاہدہ کرتے کہ ہم جو کچھ کریں گے' مل کر کریں گے' اکٹھے کریں گے' متفق طور پر کریں گے۔ اس کام کے لیے جب وہ معاہدہ کرتے تو اس معاہدے کے لیے ان کے ہاں کا وہ طریقہ تھا اور یہ بہترین طریقہ' پختہ ترین طریقہ تھا۔ ان کے ہاں معاہدے کے لیے طریقہ یہ تھا کہ وہ دونوں شخص اپنی اپنی کمانوں کو جوڑ دیتے۔ وہ جو کمان کی لکڑی ہوتی ہے وہ اسے نیچے جوڑتے وہ جو اس کے اندر ذرا سا کپڑا یا کچھ چمڑا ہوتا ہے۔ جس کے اندر تیر رکھتے ہیں' وہ اسے قاب کہتے ہیں اور وہ جو لکڑی ہوتی ہے' وہ قوس ہوتی ہے۔ اب یہ دونوں کمانیں ایک جیسی' دونوں کمانوں کی وہ کمانی کی لکڑی اکٹھی کرتے' نیچے سے وہ دھاگہ تو اکٹھا ہو ہی جاتا' یہ کعب تھے۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر آ جاتے۔ اس قاب کے اندر ایک تیر لیتے وہ تیر کا نیچے کا حصہ ہوتا اوپر کا حصہ وہاں ہوتا۔ ان میں سے ایک شخص اس لکڑی کو کچھ یوں کرتا' دوسرا اس قاب کو کھینچتا اور اس طرح سے تیر چلاتے۔ اسے عرب اپنے ہاں قاب قوسین کہتے تھے۔

رفیق اعلیٰ کی کمان اور انسان کی کمان کا باہمی ربط

یہ دو کمانوں کا ایک قاب کرنا ایک رفاقت کا معاہدہ کرنا تھا۔ اور اس آپس کے معاہدے کے معنی ہوتے تھے کہ اب اس کے بعد ہم جو کچھ کریں گے آپس میں متفق ہو کر' اکٹھے یک رنگ ہو کر کریں گے۔ ان کے متعلق یہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کا اعلان تھا۔ وہ اُس رفیقِ

---

[1] پھر اسے نئے سرے سے ماپنا پڑتا ہے۔

[2] جاتے ہی خوب بغل گیر ہو گئے۔

اعلیٰ کی کمان اور یہ اس انسان کی کمان' یہ دونوں اکٹھی ہوئیں' ایک بنا۔ ایک نے اس سامان کو تھاما' دوسرے نے وہ تیر چلایا اور یوں یہاں یہ نظامِ خداوندی قائم ہوا۔

عزیزانِ من! قرآن کی رو سے میں کہہ رہا ہوں' اکیلے خدا نے بھی یہ نہیں کیا اور خدا کو چھوڑ کے کوئی اکیلا انسان بھی نہیں کر سکا' خدا کو بھی محمد ﷺ اور والذین معہ کے ساتھ بھیجنے کی ضرورت ہوئی' دوسرا بھی تو چاہیے کھینچنے والا تھا' انہیں خدا کی ضرورت ہے۔ **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ** (8:64)۔ اے رسول! خدا کا یہ قانون تیرے لیے بھی کافی ہے اور ان مومنین کی جماعت کے لیے بھی جو اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لیے تیرا اتباع کرتی ہے۔ اسے پھر سنیے کہا کہ اے نبی! تیرے لیے اللہ اور یہ تیری جماعت کافی ہے۔ تو اکیلا نہیں۔ کہا: یہ جماعت تیرے ساتھ ہے۔ یہ تو تھے وہ عنھم والے۔ یہ جو اس کے ساتھ جماعت والی بات کہی ہے تو ان کے لیے کہا ہے: رضی اللہ عنھم ورضوا۔ پھر یہاں جمع کا صیغہ ہے۔ اکیلا رسول نہیں ہے: ورضوا عنہ۔ یہ جو کمانیں تھیں اور ان کمانوں کے اندر سے نکلنے والے تیر تھے' اس کے لیے بدر کے میدان کا نقشہ سورۃ انفال میں دیا گیا ہے (8:17)۔ کہا کہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ میدان جنگ میں ایک طرف قریش کا لشکر تھا دوسری طرف ان مخالفین کا لشکر تھا۔ دو ہی لشکر ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ اس زمانے میں تیروں سے ہی تو لڑائی ہوتی تھی' تلواروں سے بھی ہوتی تھی۔ اب یہ سیدھی سی بات ہے جہاں ان کی کمانوں میں سے تیر نکل رہے تھے' ان کی تلواریں ان کو قتل کر رہی تھیں لیکن یہ دو ایسے دوست تھے جنہوں نے یہ معاہدہ قاب قوسین کا کیا ہوا تھا۔ غور کیجیے' اس میدانِ جنگ کے نقشہ میں تلواروں سے قتل یا کمانوں سے تیراندازی یا شمشیر زنی تھی۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم میں کیا الفاظ ہیں!

باہمی رفاقت کی کیفیت

قرآن کہتا ہے: **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** (8:17)۔ تم ہی شمشیر زنی نہیں کر رہے تھے' خدا بھی تمہاری تلواریں چلا رہا تھا۔ یہ جو دو آپس میں معاہدہ کرتے تھے' ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے تیر چلایا۔ ایک کہتا تھا تو دوسرا بھی کہتا تھا کہ نہیں بھئی' تم نے بھی چلایا' میں نے بھی چلایا: **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** (8:17)۔ تم ہی نے نہیں قتل کیے' تم ہی نے وہ شمشیر زنی نہیں کی' ہم نے بھی ساتھ کیا۔ اور اگلا لفظ تو پھر' عزیزانِ من! قاب قوسین کی تفسیر ہے: **وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی** (8:17)۔ وہ تیر تمہاری کمانوں سے تو ضرور نکل رہے تھے' وہ نیچے سے چلے کہ اوپر ہاتھ ہمارا تھا۔ یہی تھا: **وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی** (8:17) جو تیراندازی تم نے کی' وہ بھی تم نے از خود نہیں کی' بلکہ خود اللہ ہی نے کی۔ یہ تھا مقامِ رفاقت' عزیزانِ من! ساری دنیا کی آنکھیں' ان تیروں کو' اس جماعت کی کمانوں سے ہی نکلتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں' ''یار تیرے نال تے اوو عدہ سی ناں ساڈا۔''[1] ٹھیک ہے' کمان کی لکڑی پہ تو تمہارا ہی ہاتھ تھا' مگر کیا تمہیں معلوم ہے کہ نیچے کس کا ہاتھ تھا؟ **وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ**

---

[1] نہیں دوست! تمہارے ساتھ تو ہمارا وعدہ تھا۔

الـلّٰہَ رَمٰی (8:17)۔ہم تیر چلا رہے تھے۔آپ کو یاد ہوگا جب بھی یہ مقام آیا ہے میں نے ہمیشہ مرزا اسد اللہ خان غالب (1797-1869) کا وہ شعر پڑھا ہے۔عجیب چیز وہ کہہ گیا ہے صاحب! یہ اسی کی تو تفسیر ہے:

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ خدا کے ترکش میں ہوا کے تیر ہوتے ہیں۔ترکش وہ ہوتا ہے جس میں وہ تیر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ہم نے وہ ترکش نہ کبھی دیکھے نہ ہمیں ان کا پتہ ہے۔یہ گلف والوں کی جو چھڑیاں ہوتی ہیں Sticks ہوتی ہیں وہ جو تیر انداز تھے ان کے پاس اس قسم کی تھیلی سی ہوتی تھی۔اس میں تیر رکھے ہوتے تھے نکال نکال کے ڈالتے رہتے تھے:

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

ہوا کے تیر ہیں وہ ٹھیک ہے خدا کے ترکش میں ہوتے ہیں۔

اما کشادِ آں زکمانِ محمدؐ است [1]

مولوی صاحب کی علمی بصیرت اور رسالت ﷺ کا مقامِ بلند

وہ تیر اس وقت چلتا تھا جب محمد ﷺ کی کمان میں سے نکلتا ہے ورنہ وہ خدا کے قضاؤں کے تیر اس کے ترکش میں پڑے ہوئے رہ جاتے ہیں۔عزیزانِ من! محمد ﷺ کی کمان میں بھی تیر اگر ادھر خدا کی ترکش سے نہ ملے تو وہ کمان کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ترکش میں پڑا ہوا تیر کچھ نہیں کرسکتا۔کمان بغیر اس تیر کے کچھ نہیں کرسکتی۔یہ تو دونوں قاب قوسین کی کیفیت ہوگی۔اسے کہتے ہیں: رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔اس کے برعکس آپ نے مولوی صاحب کا وہی وعظ سنا ہوگا کہ ''اونہاں نے کستراں جڑ پٹی اے''[2] وہ ہوا یوں کہ بدر کے میدان میں کامیابی کا کوئی چارہ نہیں تھا تو آخر میں رسول اللہ ﷺ نے کنکریوں کی زنبیل سے ایک مٹھی بھری انہیں چلایا۔وہ جو سامنے قریش کی ایک ہزار فوج تھی سب کی آنکھوں میں جا کے لگی۔وہ اندھے ہوگئے۔اور خدا نے یہ کہا کہ اے رسول ﷺ! وہ کنکریوں کی مٹھی تم نے نہیں ماری تھی ہم نے ماری تھی۔

میدان بدر کا ذکر قرآن حکیم کی نظر میں

عزیزانِ من! اگر یہ قتل یونہی ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اسوہ حسنہ کیسے بن گئی صاحب؟ اور پھر اگر یہ

---

[1] اس حقیقت کو اقبالؒ (1877-1938) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بندۂ مومن:

چوں فنا اندر رضائے حق شود   بندۂ مومن قضائے حق شود

[2] کس طرح انہوں نے اس کی جڑ تک اکھاڑ پھینکی۔

حضور ﷺ کی مٹھی سے یہ سب کچھ ہوا تھا تو انہیں' اہلِ بدر کے متعلق' یہ کیوں کہا کہ ''آفرین اے تہاڈے''[1] رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ۔اللہ تم سے راضی ہو گیا یعنی تم نے تو کچھ کیا ہی نہیں پھر بھی اللہ تم سے راضی ہو گیا' کیا یہ بات رسول ﷺ کہہ سکتا تھا؟ مگر بیان ہزار برس سے ہو رہا ہے۔عزیزانِ من! زیبِ داستاں تو اسی سے ہوتا ہے۔یہ جو باتیں میں کر رہا ہوں ان میں دلچسپی کا سامان کیا ہوتا ہے جسے آپ کہتے ہیں وہ یہ ہے: مَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ (8:17)۔رفاقت کی بڑی عظیم چیز ہے جو خدا نے کہی ہے: رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ۔ یہ عظیم چیز ہے۔ یہ باہمی رفاقت ہے' یہ ایک دوسرے کیساتھ باہمی تعامل ہے۔وہ آپس میں باہمی رفاقت ہے۔اس کے معنی ''متفق کہہ دیجیے' یوں بات بن جائے گی' ہم آہنگ کہہ دیجیے' بات بن جائے گی' باہمی رفاقت کہہ دیجیے' بات بن جائے گی۔ایک اور چیز آتی ہے۔وہ ہے کہ مرضی مولا کے مطابق ہوا' اب میں لفظ مرضی بول رہا ہوں۔یہاں جو آیا ہوا ہے' اس کے معنی یہ کہہ دیجیے کہ ''قوانین خداوندی کے مطابق جو کام کرنا ہے وہ ہو گیا۔ اسے آپ راضی برضا کہتے ہیں۔''اس طرح اس کے معنی ہوتے ہیں کہ جیسا وہ چاہتا ہے اسی کے مطابق وہ کام کر دیا۔

ایک اہم بات کی وضاحت

قرآنِ کریم میں دو مقامات پہ ایک بات آئی ہے۔وہ بڑی اہم بات ہے لیکن آپ یہ کہیں گے کہ قرآن جو بات بھی سامنے لاتا ہے اور جس طور اسے سمجھا جا رہا ہے تو کیا یہ پھر غلط سمجھا جا رہا ہے۔اب میں اس کا کیا علاج کروں؟ عزیزانِ من! میں تو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔یہ قرآن کی بات ہے جو آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔قرآنِ کریم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے متعلق ایک بات آئی ہے: (81:27-29) اور (76:30)۔دو جگہ یہ الفاظ آئے ہیں۔پہلے یہ دیکھیے' یہ جو عام معنی لیے جاتے ہیں۔اس سے کیا بات بنتی ہے: اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (81:27)۔یہ قرآن تو تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک ضابطہ قانون ہے' جو ہم نے مقرر کر دیا ہے۔کہا: ٹھیک ہے پھر کیا ہو؟ کہا: لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (81:28)۔تم میں سے جس کا بھی چاہے' اس کو Follow کرکے' زندگی کے صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے۔یہاں لفظ ہے: اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (81:28) یعنی اپنے آپ کو اس طرح قائم کرنا' ہموار رکھنا' کہ پاؤں میں لغزش نہ آنے پائے۔' قائم یا کھڑا تو وہ ہوتا ہے جس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ نہ پیدا ہو' لڑکھڑاہٹ پیدا ہونے والا تو گر جاتا ہے: یہ ہے اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ. تو بات یہ ہے کہ جو بھی تم میں سے چاہے' اس ضابطہ کے مطابق عمل کرنے سے وہ قائم ہو جاتا ہے۔اس سے اس کا قیام ہوتا ہے۔یہ عجیب لفظ ہے! خیر اسے چھوڑیئے' جو بھی تم میں سے اس راستے پہ چلنا چاہے یہ تو ہم نے ساری اقوامِ عالم کے لیے ایک ضابطہ قانون بنا دیا ہے۔مگر کہا یہ ہے کہ: لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ (71:28)۔تم میں سے ''جو چاہے کرے۔'' اب یہاں یہ ہے کہ ''جو چاہے اس میں

---

[1] تمہارے اوپر تحسین وستائش کے ہزاروں پھول نچھاور۔

یہ کچھ کرلے۔'' اب یہ تو ساری عمر یہ کہتے رہے کہ ہوتا تو وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے' وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ مگر یہاں کہا ہے کہ جو چاہے یہ کرے۔ تو یہ بندہ جو چاہے؟ اب اگلی آیت ساتھ ملائی اپنے اس مفہوم کے مطابق ترجمہ کیا: بات بگڑ گئی۔ مگر قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ. وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (81:28-29)۔ یہاں پہلی آیت کا ترجمہ ہے کہ تم میں سے جو چاہے' صراطِ مستقیم پہ چل پڑے' یعنی جو چاہے۔ اگلی آیت کا ترجمہ کیا۔ ''لیکن تم تو چاہ ہی نہیں سکتے' تم تو وہی چاہ سکتے ہو جو خدا چاہے۔'' چلیے اس طرح ان کا جو فیصلہ تھا یا ان کا جو چاہنا تھا' وہ ختم ہوا' یعنی پہلے میں نے یہ چاہا کہ اچھا جو تیرا جی چاہے: ''تو کردا رئیں' لیکن جو تیرا جی چوندا اے تُو کرا نئیں کرسکیں گا' او تے توں مجبور ایں' او کرن تے جو اسی چاہ نے آں''❶ تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ جو آپ کے لیے Human Rights ہیں' یہ سارے Constitution کے اندر جو UNO کے دستور دیئے ہوئے ہیں تو وہ تو یہ ہے کہ جو تم میں سے چاہے تمہیں آزادی حاصل ہے' اختیار ہے' کرلے۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ تم تو خود کچھ کر ہی نہیں سکتے' تم تو وہ کرنے کے لیے مجبور ہو جو ہم چاہیں' لیکن اس کے بعد پھر یہ بھی جو تم میں سے جو چاہے کرے' یا اللہ! کیا یہ قرآن ہے! کیسے یہ احکام ہیں! یہ خدا کا کیا ہے؟

برادرانِ عزیز! یہ ابدی صداقتیں قیامت تک کیلیے ہیں' ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ''نوعِ انسان میں سے جو قوم بھی چاہے اس ضابطہ حیات کے ذریعے زندگی کی متوازن اور سیدھی راہ پر چل سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے ذاتی رجحانات اور انفرادی مفادات کو ایک طرف رکھ کر' وہی کچھ چاہو جو اس خدا کے قانون کا تقاضا ہے۔ جس نے تمام اقوامِ عالم کی نشو و نما کا ذمہ لے رکھا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں اس کے ساتھ دو آیتیں اور بھی ہیں۔ پھر آپ کہیں گے' بھئی ہزار برس سے یہ کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ پہلی آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ جو تم میں سے چاہے' صراطِ مستقیم پہ چلے۔ دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ تم چاہ ہی نہیں سکو گے بجز اس کے جو ہم چاہیں۔ کوئی نہیں سوچ رہا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اور: لمن شاء کا کیا مفہوم ہے؟

ہر ایک کی مشیت میں اپنا اپنا اختیار

انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ وہ جو خدا کی اپنی دنیا ہے' اس میں تو اس نے کہا ہے کہ وہاں ہماری مشیت کام کر رہی ہے اور ہم نے اپنے قوانین کے مطابق انسان کو بنایا ہے تو وہ اس کی اپنی مشیت ہے' جس کے تحت انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ چنانچہ یہ کہہ دیا گیا ہے کہ ''تمہاری اس اپنی دنیا میں تمہاری مشیت چلے گی' ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ لہٰذا ان سے کہہ دو کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (18:29) تمہارے خدا کی طرف سے الحق آ گیا: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29)۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے' اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ لہٰذا تم میں سے جو چاہے اسے اختیار کرلے' جو نہ

❶ تم کرتے رہو۔ لیکن جو تیرا دل چاہتا ہے' وہ تو تم کر ہی نہیں سکو گے۔ جو ہم چاہتے ہیں وہ کرنے کے لیے تو تم مجبور ہو۔

چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہاں ماشاء جو انسان کے لیے آیا ہے' بڑی چیز ہے۔ اب جب یہ کہا گیا کہ تم جو جی میں آئے کرلو' کہا: یہ تو ٹھیک ہے بھائی! تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ اب یہ کہ صحیح طریقے کے اوپر ہم کیسے چلیں؟ کہا کہ اس کے لیے طریقہ یہ ہے اور یہ ہے ماتشاء ون کا ترجمہ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: بھئی' سیدھی سی بات ہے' تم جو چاہو کر سکتے ہو' اب تم پوچھتے یہ ہو کہ وہ صحیح بات ہم کیسے اختیار کریں؟ کہا: **مَا تَشَآءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ** (81:29)۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں کہ تم چاہو۔

قرآن کی منشا یہ ہے کہ انسان کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ تمہیں یہ چاہیے کہ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں' وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ تم سیدھے راستے پہ چلو۔ تم بھی یہی چاہو۔ تمہارا چاہنا ہمارے چاہنے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا چاہیے۔ ہم چاہتے یہ ہیں۔ بعد میں یہ کہتا ہے کہ بھئی! ہم چاہتے یہ ہیں کہ تمہیں فتح ہو جائے۔ اب اس کے بعد' ٹھیک ہے' تمہاری مرضی ہے دوائی کھاؤ' پرہیز کرو یا نہ کرو۔ لیکن چاہتے وہ ہیں کہ جو" ہم چاہتے ہیں تم بھی وہی کرو۔" اگر تمہارا چاہنا ہمارے چاہنے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا تو پھر یہ نتیجہ نکل آئے گا۔ یہ جو صراطِ مستقیم پہ چلنا ہے' ہم چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستے کے اوپر چلو' ہم یہی چاہتے ہیں' تمہیں جبراً نہیں چلانا چاہتے۔ اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ تم بھی یہی چاہو کہ ہم صراط پہ چلیں۔ سیدھی سی بات ہے یعنی جو ہم چاہ رہے ہیں وہ تم چاہ رہے ہو' تمہارا چاہنا ہمارے چاہنے سے ہم آہنگ ہو جائے' نتیجہ نکل آئے گا۔ یہ ہے **رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ**۔ تمہارا چاہنا ہمارے چاہنے کے مطابق ہے۔ کیا بات ہے! تم چاہو ہی وہی اور جب تم وہی چاہو گے جو ہم نے پہلے کہا ہے تو اس کے بعد جو کچھ تم چاہو گے وہ کچھ خود ہوتا جائے گا۔ یعنی وہ جو تمہارا چاہنا ہے ہمارے چاہنے کے مطابق ہو جائے گا۔ اس قانون کو ہم چاہتے ہیں کہ تم اس قانون کا اتباع کرو' تم بھی یہی چاہو کہ میں اس قانون کا اتباع کرونگا۔ ٹھیک ہے اس قانون کا اتباع کرو' نتیجہ اس کا نکل آئے گا۔ یہ دونوں کا چاہنا ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہے۔ یہ انسان ہی کی طرف سے نہیں ہے کہ یہ اس سے راضی برضا ہو گیا' اُدھر سے بھی تو رفاقت اور یہ رضا کی بات آ رہی ہے۔ ہم اور تم دونوں ایک دوسرے کیساتھ راضی ہو جائیں' متفق ہو جائیں' ہم آہنگ ہو جائیں۔ ہمارا چاہنا تمہارا چاہنا ہو جائے۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم سیدھے رہو "بندے دے پتر بنو"[1] تم بھی یہی چاہو' ٹھیک ہے' ہم مجبور نہیں کرتے لیکن تم وہ چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں' ہم نے بتا دیا کہ ہم یہ چاہتے ہیں۔ "اگے تہاڈی مرضی"[2]۔ اطاعت کے تو معنی یہ ہیں عزیزانِ من! اپنی رضا و رغبت سے' دل کی پوری رضامندی کے ساتھ' دوسرے کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا' یاد رکھیے! دل کی رضامندی کے ساتھ میں نے کہا ہے کہ دو چار منٹ زائد ہو جائیں گے۔ اس کی دل کی رضامندی کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ ورنہ بات درمیان میں رہ جائے گی۔

---

1. راہ راست پہ آ جاؤ۔
2. آگے تمہاری مرضی۔

حکم اور قانون میں فرق

اب میں حکم نہیں کہونگا قانون ہی کہونگا' یاد رکھیے! حکم اور قانون میں ایک فرق ہوتا ہے۔ حکم عارضی بھی ہوسکتا ہے' کسی وقت کسی سے کہا کہ ''جا اوئے تو او تھے چلا جا'' آ گیا❶ دوسرے وقت اسے کہا ''کہ اب ماکھے کی طرف چلے جاؤ''۔ اب وہاں چلا گیا' تیسری دفعہ کہا: یہاں بیٹھے رہنا' یہ احکام ہیں۔ جب ایک حکم مستقل ہو جائے' ہمیشہ وہی رہے' اس میں تبدیلی نہ ہو' اسے قانون کہہ دیتے ہیں! فرق یہی ہے کہ خدا کے احکام کی پابندی جو کہتے ہیں کرتے رہو۔ احکام سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج اس نے یہ کہہ دیا کہ یہ کر آ ؤ' کر آیا جی' اب یہ کر آ ؤ ''ہو آیا جی''❷ اس نے اسی طرح یہ کہہ دیا ہے کہ ہمیشہ دیانتدار بنو۔ بس کہہ دیا۔ اسے قانون کہتے ہیں۔ یہ غیر متبدل ہیں۔ اسی لیے کہا: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64)۔ کلمات اللہ غیر متبدل ہوتے ہیں۔

کلمات اللہ کبھی تبدیل نہیں ہوتے

جب کلمات اللہ تبدیل نہ ہوں' غیر متبدل ہو جائیں تو اسے قانون کہتے ہیں۔ اطاعت کے معنی ہوتے ہیں دل کی رضامندی سے کسی کے احکام کے مطابق کرنا۔ یہ ہوتی ہے Self - imposed پابندی۔ یعنی اپنے آپ طے کرنا کہ میں نے اس کے مطابق کرنا ہے۔ ایک پابندی وہ ہوتی ہے جیسے تھانے والے کا حکم ہوتا ہے کہ تم یہ کرو' انسان کرتا تو وہ بھی ہے' انسان کرتا یہ بھی ہے' اس کرنے کے ساتھ تو دل سے ہزار ہا گالیاں نکلتی ہیں۔ تنگ کر مار یا اے' جان عذاب اچ آ گئی ہوای اے''❸ صاحب! یہ کیفیت ہے اور یہ ایک کرنا ہوتا ہے: محبوب کے اشارے کے اوپر جان دیدینا' ارے!

اطاعت کا مفہوم

اطاعت کا تو عربی زبان میں استعمال ہی اس وقت کرتے تھے' جس میں کوئی جبر کا پہلو نہ ہو۔ یہ کچا پھل آپ کو اتارنا ہو تو ''پھل دا وی ستیاناس ہو جاندا''❹ اور درخت کا بھی ستیاناس ہو جاتا ہے۔ ایک ہوتا ہے جسے آپ پکا ہوا پھل کہتے ہیں۔ ان کے ہاں جب کھجور پک جاتی تھی تو اس کے پکے ہونے کی علامت ہی یہ تھی کہ وہ کھجور ازخود گر جاتی تھی۔ پکی ہوئی کھجور کا ازخود گرنا ''طاعنا'' کہلاتا ہے۔ اسے عربی زبان میں اطاعت کہتے ہیں۔ یہ جو اس انداز کی اطاعت ہوتی ہے' وہ رسمی نہیں ہوتی' وہ مجبوری کی نہیں ہوتی' وہ اپنے دل کے اندر سے ابھرنے والا

---

❶ ارے! تم وہاں چلے جاؤ۔

❷ جی کر آیا ہوں۔

❸ تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔ جان عذاب میں آ گئی ہے۔

❹ پھول بھی تباہ ہو جاتا ہے' پھول کا ناس مار دیا جاتا ہے۔

ایک جذبہ ہوتا ہے۔ یہ ہے جسے اس کے ساتھ ''راضی'' ہوجانا کہتے ہیں۔ اس کی اس قسم کی اطاعت کو یہ کچھ کہا جاتا ہے صاحب! یہ اطاعت ہے۔ یہ اطاعت یہ ہے کہ تم وہی چاہو' جو ہم چاہتے ہیں۔ یہ ہے وہ اطاعت جس کے متعلق' ایمان کی شرط رکھی گئی ہے اور یہی وہ اطاعت ہے جس کا خدا تعالیٰ نے انسان کو حکم دے رکھا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ ہیں۔

جبر ہے دل پہ مگر کس اختیار کے ساتھ

اطاعت اور Duty میں فرق

میں نے عرض کیا کہ اطاعت تو دونوں طرح کی ہو جاتی ہے۔ وہ جو ہمارے ایک شاعر نے یہ کہا تھا' یہ بڑے شوخ لوگ ہوتے ہیں' تصور میں لائیے صبح' آج کل سردیوں کے موسم میں' چار بجے اٹھ کے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا' ٹھٹھرتے ہوئے جا رہے ہیں اور یہ کچھ ہو رہا ہے کہ صاحب! اللہ کا حکم ہے' جسے بجالانا ہی ہے' تو اس لیے بجالانا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ یہ دیکھ کے کہتا ہے:

مر رہے ہیں نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

یہ اطاعت نہیں ہے' عزیزانِ من! Responsibility اور Duty میں جو فرق ہوتا ہے یہی فرق ایک اطاعت اور دوسری اطاعت میں ہوتا ہے۔ یہ دو قسم کی اطاعتیں ہیں: Responsibility تو Response کرنا ہوتا ہے۔ لبیک کہنا ہوتا ہے۔ یہ تو Imposed ہوتی ہے۔ سنیے اطاعت کا لفظ کہاں آیا ہے: **فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ** (4:65)۔ اے رسول! تم ان لوگوں کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ عزیزانِ من! یہ جو بات آگے آتی ہے اس کی اہمیت بتانے کے لیے پہلے یہ کہا ہے۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہے کہ خدا خود کہتا ہے تیرے رب کی قسم۔ اپنے سر کی قسم' جیسے ہم کہتے ہیں: جان کی قسم۔ لیکن قسم کے تو یہ معنی نہیں ہوتے۔ **فَلَا وَرَبِّکَ** (4:65)۔ قطعاً کوئی اور بات ایسے نہیں جیسے یہ سمجھ رہے ہیں۔ **فلا** (4:65)۔ تیرا خدا اس حقیقتِ کبریٰ پہ شاہد ہے کہ **لَا یُؤْمِنُوْنَ** (4:65)۔ یہ کبھی بھی ایماندار نہیں ہو سکتے۔ **حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ** (4:65)۔ تاوقتیکہ اپنے ہر اختلافی معاملہ میں تمہیں ثالث مقرر نہ کریں' تمہیں ھادی مقرر نہ کریں۔ کبھی مومن نہیں ہو سکتے' مقرر کر دیا' ثالث مقرر کر دیا' ھادی مقرر کر دیا عدالت میں چلے گئے اس کے بعد وہاں سے فیصلہ صادر ہوا تو بات تو یہ تھی کہ تمہیں مقرر کر دیا پھر یہ تمہارا فیصلہ تسلیم کریں' مومن ہو جائیں۔ نہیں جناب! خدا ہے کہنے والا: **ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ** (4:65)۔ اور اس کے بعد جو تو فیصلہ دے اس کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ جی! اسے اطاعت کہتے ہیں' پکی ہوئی کھجور کی طرح ٹپک پڑے' دل کی گہرائیوں میں اس کے خلاف گرانی محسوس نہ کرے۔ **وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا** (4:65)۔ اس

فیصلے کو دل کی رضامندی سے تسلیم کیا جائے۔عزیزانِ من! اسے کہتے ہیں تسلیم' اسے کہتے ہیں اسلام۔یعنی دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ کرے۔

عزیزانِ من! یہ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ ہے' جو باہم ہم آہنگ ہو کے ایک دوسرے کے مطابق عہد کر لے' ایک دوسرے کی بات کے خلاف گرانی محسوس نہیں کریں گے' اور یہ کہتے ہوئے قرآن نے یہ کہا ہے کہ تیرا رب اس پہ شاہد ہے کہ یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ جو اطاعت رسول کرتا تھا یہ بھی ایسی اطاعت کریں۔ وہ تو ایک مرکز کی وساطت سے قوانینِ خداوندی کی اطاعت تھی' تو یہ تو اطاعتِ خداوندی ہے کہ اس کی اطاعت میں یہی نہیں کہ یونہی اس کے سامنے سر جھکا دیں۔نہیں نہیں' دل میں بھی گرانی محسوس نہ کریں۔ یہ ہے عزیزانِ من! رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔اور کہا کہ کَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ (19:55)۔ اسماعیل علیہ السلام کی کیفیت یہ تھی کہ اپنے رفقاء کو وہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے: وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا (19:55)۔ اور وہ اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے یکسر ہم آہنگ تھے۔اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ ''مرضیًا'' کیا معنی رکھتا ہے۔رسول کا یہ شعار تھا اور جسے آپ اتباعِ سنتِ نبویؐ کہتے ہیں عزیزانِ من! اس کے تو معنی یہ ہو جائیں گے کہ ''قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس طرح سے ہو کہ پھر دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو'' یہ ہے وہ چیز جو مقامِ مومن ہوتا ہے اور یہ ہے جو نبی کا مقام بتایا ہے۔ہم نے ایک ہی آیت 55 لی' خدا کرے کہ بات سمجھ میں آ گئی ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم ط

❀......❀......❀......❀

اٹھارھواں باب: سورۃ مریم (آیت 56 تا 61)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ ۫ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا ﴿۵۶﴾ۙ وَّ رَفَعۡنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنۡ ذُرِّیَّۃِ اٰدَمَ ٭ وَ مِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ۫ وَّ مِنۡ ذُرِّیَّۃِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡرَآءِیۡلَ ۫ وَ مِمَّنۡ ہَدَیۡنَا وَ اجۡتَبَیۡنَا ؕ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا ﴿۵۸﴾ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا ﴿۵۹﴾ۙ اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا ﴿۶۰﴾ۙ جَنّٰتِ عَدۡنِۣ الَّتِیۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ وَعۡدُہٗ مَاۡتِیًّا ﴿۶۱﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1976 کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 56 سے ہو رہا ہے: (19:56)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ آسمانی انقلاب کے داعیان یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ آخری ذکر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تھا۔ اب اس کے بعد ہے قرآن کریم نے حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ جلیلہ کیا۔ وَ اذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ ۫ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا (19:56)۔ وَّ رَفَعۡنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا (19:57)۔ اسی طرح اے رسول! تو قرآن میں ادریس علیہ السلام کی سرگزشت بیان کر۔ وہ بھی بڑا سچا نبی تھا اور ہم نے اسے بہت بڑا مرتبہ عطا کیا تھا۔ حضرت ادریس علیہ السلام کا نام قرآنِ کریم میں صرف دو مقام ((19:56;21:85 پہ آیا ہے اور ان کی کوئی تفصیل قرآن نے نہیں دی- تورات میں ان کا نام حنوک [1] یا اخنوخ یا اخنوع آیا ہے اور بعض کا خیال یہ ہے وہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے بھی پہلے گزرے ہیں لیکن قرآنِ کریم کی رو سے تو یہ صحیح نہیں نظر آتا اس لیے کہ قرآن میں انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو وہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا ہے۔

کیا حضرتِ آدم نبی تھے؟

یہ بھی یاد رہے کہ وہ جو ہمارے ہاں عام طور پہ حضرت آدم مشہور ہے، تو قرآنِ کریم میں آدم کا ذکر انبیاء کے سلسلے میں نہیں آیا ہے۔ وہ تو بات ہی کچھ اور ہے۔ دراصل وہ تو ہمارا آپ ہی کا ذکر ہے، بنی آدم کا ذکر ہے، آدمی کا ہی قصہ ہے جو قرآن میں آدم کے نام سے بیان

ہوا ہے۔ وہ نہ تو ابوالبشر ہیں' اور نہ ہی تصریحی طور پہ قرآنِ کریم نے انہیں نبیوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ قرآن کریم میں حضرتِ نوح علیہ السلام سے ہی انبیاء کرام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ حضرتِ ادریس علیہ السلام کے متعلق چونکہ قرآن میں کچھ کہا نہیں گیا اس لیے ہم نہیں بتا سکتے کہ ان کا ذکر کیا ہے؟ ایک ہی بات ہے کہ جس سے انکی بھی ہمارے ہاں خاص طور سے اہمیت بتائی جا رہی ہے اور یہ وہی ہے جو کہ مغالطہ ہے: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (19:57)۔ ہم نے اسے بہت بڑا مرتبہ عطا کیا تھا۔ بائبل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنوک کو آسمان کی طرف اٹھا لیا تا کہ وہ موت کو نہ دیکھے چنانچہ یہی ہمارے ہاں بھی مشہور ہے۔ بھئی! یہ کیوں جی! جناب وہ تورات میں جو قصہ آیا ہے لہٰذا وہ تو اِدھر سے اُدھر بھی آنا تھا سو آ گیا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق عجیب وغریب روایت

ہمارے ہاں کتبِ تفاسیر میں بھی ایک روایت ہے۔ اس روایت کی رو سے جو تفسیر بھی پہلے لکھی گئی تو سب سے پہلے انہوں نے روایت درج کر دی اور پھر ایک روایت کی رو سے یہ سمجھا گیا کہ حضرتِ ادریس علیہ السلام (ملاحظہ فرمائیے کیا کیا باتیں اور کہانیاں ہمارے ہاں آئی ہوئی ہیں) مرنا نہیں چاہتے تھے تو ان کا دوست ایک فرشتہ تھا۔ اس نے کہا: کوئی بات نہیں' میں تمہیں کہیں لیجا تا ہوں تو وہ ان کو چوری چھپے چوتھے آسمان پہ لے گیا۔ ادھر سے ملک الموت ان کی جان قبض کرنے کے لیے آ رہا تھا اُدھر سے وہ اتر رہا تھا۔ اس نے دیکھا۔ وہ راستے میں مل گئے۔ اس نے کہا: موج ہوگئی' میرا آدھا راستہ بچ گیا۔ ملک الموت نے ان کو وہیں پکڑ لیا۔ کیا کیا کہانیاں ہیں' ہمارے ہاں! اُو پنجابی اچ ہیگا اے' موسیٰ علیہ السلام نٹھا موت توں' تے موت اگے کھڑی' او اصل موسیٰ دی ہیگی تے او ہو گل۔ حضرت ادریس علیہ السلام والی انہاں دے ذہن اچ آ گئی''۔ [1] ہمارے ہاں کہانیاں ہیں۔ اس کے لیے انہیں تو بس کوئی تنکا چاہیے' جس سے وہ پل بنائیں' پھر ہاتھی گزاریں۔ قرآن میں تھا: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (19:57)۔ اس کا لفظی ترجمہ کر دیا: ہم نے اٹھا لیا اس کو: مکاناً علیاً' بہت اونچے مکان کی طرف۔ ''مکان'' کا لفظ آیا تو مکان آ گیا' علیاً حالانکہ قرآنِ کریم میں اور خود عربی زبان میں یہ الفاظ مدارج کی بلندی کے لیے آتے ہیں اور رفعتِ مدارج تو ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں۔ رفیع الشان بھی ہمارے ہاں کہتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے آپ مکان کہتے ہیں۔ وہ خاص Space اور جگہ کا نام نہیں ہوتا۔ مثلاً مقامِ بلند' اس کے مقامات بڑے بلند ہیں۔ یہ چیز بھی ہمارے ہاں رائج ہے۔ تو بلندیٔ مکان کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ وہ کچھ مینار ہوتا ہے' جس کے اوپر کسی کو پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ جو مدارج کی بلندی ہے' اسی کا ذکر ہے۔ تو قرآنِ کریم نے ان کے متعلق جیسے پہلے انبیاء کے متعلق کہا تھا' صدیقاً نبیاً کہا۔ اور کہا: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (19:57)' ان کے مدارج بڑے بلند تھے۔

---

[1] یہ پنجابی زبان میں مشہور بات ہے کہ موسیٰ موت کے خوف سے بھاگا تو موت کو سامنے ہی موجود پایا۔ دراصل یہ بات موسیٰ علیہ السلام سے متعلق تھی لیکن وہ حضرتِ ادریس علیہ السلام کے بارے میں بھی ان کے ذہن میں آ گئی۔

مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کا منارۃ المسیح

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ اصل میں یہ چیز ہمارے ہاں اس ایمان، عقیدے یا نظریے پر ہے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چلا آ رہا تھا۔ لہٰذا وہی ایک آیت کے چار ٹکڑے ہیں جس بنیاد کے اوپر اتنی بڑی عمارت استوار ہوگئی۔ بقول اُن کے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی آسمان پہ اٹھایا گیا وہ ابھی تک وہاں زندہ ہیں، جب زندہ رکھا گیا تو پھر ان کو ابدی طور پر کسی طرح وہاں زندہ تو نہیں رکھا جا سکتا تھا، پھر ان کو واپس زمین پہ اتارا گیا۔ نزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوگا یعنی پھر وہ تشریف لائیں گے۔ اب جو آنے کا قصہ ہوا تو پھر کڑیاں وہاں سے یہاں تک چلیں اور وہ آ کے قادیان کے مینار کے اوپر ختم ہوئیں۔ وہ مینار جو دراصل مرزا غلام احمد قادیانی صاحب (1835-1908) کی موت کے بعد بنا تھا۔ اب اس پہ منارۃ المسیح لکھا ہوا ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان سے نازل ہونگے تو دمشق کی مسجد کے مینارے تک وہ اتر آئیں گے اور وہاں آ کے کہیں گے کہ اب سیڑھی لاؤ تو ان سے کہا جائے گا کہ اتنی دُور سے تو آپ ایسے ہی یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو یہاں سے آپ سیڑھی کیوں منگوا رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اس سے پہلے پہلے جو تھا وہ مشیتِ خداوندی کے تابع تھا۔ اب یہاں شریعتِ محمدی کا تابع ہوں۔ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ کوٹھے سے نیچے اترو تو سیڑھی کے راستے اترا کرو اس لیے مجھے اس کا اتباع کرنا ہے۔ لہٰذا اب مجھے وہاں سیڑھی چاہیے۔

خدا کے تصور کی اہمیت

یہ جتنے تصورات ہیں عزیزانِ من! اس کی تہ میں ایک ہی چیز ہے۔ وہ چیز سارے دین کی علامت (Symbol) ہے، نقطہ ماسکہ ہے، بنیاد ہے۔ وہ ہے خدا کے متعلق صحیح تصور۔ اصل یہ ہے کہ ہمیں کبھی خدا کے ساتھ تو کوئی واسطہ ہی نہیں پڑتا اور نہ ہم نے رکھا ہی ہوا ہے۔ یونہی ہمارے ہاں ایک ذہنی سا، فرضی سا ہی تصور ذہن میں سمایا ہوا ہے جو عام طور پہ تو قسم کھانے کے کام آتا ہے اور پھر جھوٹی قسم کھانے کے لیے تو زیادہ کام آتا ہے۔

لفظ ظِهْرِيًّا کا مفہوم

قرآنِ کریم نے قومِ عاد کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ تم خدا کو تو مانتے ہو لیکن خدا کو تم نے اپنے ہاں ظِهْرِيًّا کے طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ یہ عجیب لفظ ہے صاحب! غالباً اس سے پہلے بھی آپ نے شاید یہ لفظ سن لیا ہو۔ یہاں پھر اس کے معنی دہرادوں کیونکہ یہ بڑی اہم چیز یں ہیں کہ تم خدا کو مانتے تو ہو لیکن اسے "ظھریا" کے طور پہ مانتے ہو تو آپ کو معلوم ہے کہ کرکٹ کے ٹیم میں یا جتنی بھی یہ ہاکی وغیرہ کی ٹیم ہوتی ہیں، ان میں گیارہ تو کھلاڑی ہوتے ہیں۔ انہوں نے کھیلنا ہوتا ہے۔ وہ ایک دو کھلاڑی اپنے ساتھ بطور ایکسٹرا (Extra) رکھ چھوڑتے ہیں کہ کھیل کے دوران اگر کوئی ایک کھلاڑی زخمی ہوجائے یا کسی طرح سے الگ ہوجائے تو اس کی جگہ ایک فالتو

(Extra) کھلاڑی کھیلنے کے لیے رکھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ وہ کھلاڑی ہے جسے ایکسٹرا کہتے ہیں۔ اب آپ نے تو ایکسٹرا سمجھ لیا کہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ویسے تو اب یہ ایسے نظر آتا ہے جیسے یہ انگریزی کا لفظ ہے اور ابھی حال ہی میں شاید ایجاد ہوا ہے۔ عربوں کے ہاں بھی یہ چیز تھی۔ جب وہ قافلے میں چلتے تھے تو سواری کے لیے' سامان کے لیے' جتنے اونٹوں کی ضرورت تھی' وہ تو ساتھ رکھتے تھے' وہ دو ایک اونٹ فالتو ساتھ رکھ لیتے تھے کہ راستے میں کوئی ایک اونٹ بیمار پڑ جائے' مر جائے' کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر اس وقت یہ کام آئے۔ تو وہ جو ان کے ساتھ Stand by رکھا ہوتا تھا جو وہ ایسے وقت کے لیے لے جاتے تھے۔ تو جب کوئی اصل چیزیں جن پہ دارومدار ہے وہ فیل ہو جائیں' ناکام ہو جائیں تو ایسے وقت میں کوئی ایک اس قسم کا فالتو رکھنا چاہیے جو ایسے وقت میں کام دے جائے۔ اسے عرب اپنے ہاں **ظِهْرِيًّا** کہتے تھے۔ حضرت شعیب نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے' تم کہتے ہو' ہم خدا کو مانتے ہیں لیکن تم نے تو خدا کو اپنے ہاں **ظِهْرِيًّا** رکھا ہوا ہے۔ کام لینے کے لیے تو اور چیزیں ہیں لیکن جب تمہارا ہر حربہ' ہر سامان' ہر ذریعہ' فیل ہو جائے تو وہاں پھر تم خدا کو لے آتے ہو۔ '' تھوڑا جیا ڈنگ تے ٹپا جا' تھوڑا جیا ہور کجھ نئیں تے' ڈنگ ای ٹپا''۔ [1] آپ غور سے دیکھیے عزیزانِ من! ہمارے ہاں بھی خدا کچھ کام نہیں آتا۔ ذہن میں ہی کوئی چیز ہے کہ جب سب طرف سے مایوسی ہو جائے' ناامیدی ہو جائے' اپنا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو پھر اللہ کی طرف رجوع کرو کہ یا اللہ! اب تو ہی کچھ مدد کر' یعنی تو ہی مدد کر۔ ''ہور باقی چیزاں سن' او تے فیل ہو گیاں نیں۔ دیکھا ''تو ہی دے'' وچ کڈی وڈی گل ہوندی ہیگی۔'' [2]

دین میں اصل چیز خدا کا تصور ہے

دین میں جو اصل چیز ہے وہ خدا کا صحیح تصور ہے۔ عزیزانِ من! یہی ہے وہ بنیاد جس پہ دین کی عمارت استوار ہوتی ہے اور یہ جو چیز ہمارے ہاں ہے کہ ہم صحیح دین پہ آ نہیں رہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا صحیح تصور ہمارے ذہن میں نہیں ہے۔ قرآن کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس نے خدا کا صحیح تصور دیا ہے لہٰذا قرآن کی رو سے اگر وہ تصور سامنے آ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ہماری ساری ذہنی الجھنیں صاف ہو جاتی ہیں اور جو عملی دنیا کی مشکلات ہیں وہ بھی خدا کے صحیح تصور سے طے ہو جاتی ہیں' حل ہو جاتی ہیں۔ صرف اتنی سی وضاحت سننے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ میں نے یہ اس لیے کہا ہے کہ سب سے زیادہ غلط تصور' جو ہمارے ذہن میں ہے' وہ خدا ہی کے متعلق ہے۔ اسی لیے کہنے والا [3] کہہ گیا کہ:

---

[1] اگر اور کچھ نہیں تو تھوڑا سا وقت ضرورت ہی کام آ جا۔

[2] باقی جو دوسری چیزیں تھیں وہ تو ناکام ہو گئیں۔ آپ نے دیکھا کہ ''تو ہی دے'' کے اندر کتنی بڑی بات پوشیدہ ہے۔

[3] مفکرِ اسلام ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938)۔

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

اور ہمارے دماغ کعبہ نہیں ہیں وہ تو بت خانہ ہیں جن میں بہت پرانے بت متمکن ہیں۔ ان میں خدا کے لیے تو گنجائش ہی نہیں ہے۔ خدا ذرا غیور واقع ہوا ہے۔ وہ اگر اپنے مکان میں کسی ایک کو بھی دیکھ لے تو منہ پھیر کے چل دیتا ہے۔ وہ وہاں آتا ہی نہیں ہے۔ اس کے نزدیک شرک ظلمِ عظیم ہے اور ہم ہیں کہ کتنے ہی بت پال رکھے ہیں اور انہیں اپنے دماغ کے اندر متمکن کر رکھا ہے اور پھر یہ کہیں کہ ان میں خدا بھی سما جائے، وہ نہیں آ سکتا۔ وہ جسے آپ اس طرح خدا کہیں گے وہ بتوں کے ساتھ آپ کے ذہن کا تراشیدہ بت ہی ہوگا چنانچہ اس طرح کا جو خدا کا تصور ہوگا وہ قرآن کا عطا کردہ نہیں ہوگا۔ عزیزانِ من! خدا کا صحیح تصور بڑی اہم چیز ہے۔ یہ بات ضمناً کہنے کی نہیں ہے جو میں اس درس میں آپ کو سمجھاؤں۔ بات آتی جائے گی تو ساتھ ساتھ میں عرض کرتا جاؤں گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں اوپر آسمانوں میں اٹھا لینے کی حقیقت

یہاں جو چیز میں کہہ رہا ہوں وہ حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق ہے: **بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ** (4:158)۔ یہاں الیہ آیا ہے۔ انہوں نے الیہ کا ترجمہ کیا: تو خدا نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔ یہ وہی ہے جو ہمارے ہاں مردے کے لیے، مرنے کے وقت کہتے ہیں: **انا للہ و انا الیہ راجعون** (2:156)۔ اس میں جو الیہ ہے وہ اصل میں ہمارے مغالطہ کی بنیاد ہے۔ یعنی خدا کے متعلق جو غلط تصور ہے، وہ اس کا نتیجہ ہے۔ اس میں ایک چیز یہ ہے کہ خدا نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔ اب جونہی ہم نے ''طرف'' کہا تو اب آپ کو خدا کسی ایک جگہ رکھنا پڑے گا۔ آپ اس ''طرف'' تو اسی وقت کہتے ہیں، جب (مثلاً) شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جائے کہ شہر وہاں ہے یعنی ایک سمت میں شہر واقع ہوا ہے جس کی طرف آپ نے جانا ہے: مغرب کی سمت یا مشرق کی طرف، وہاں ایک جگہ متعین ہے۔ جب بھی آپ ''طرف'' کہیں گے تو پھر اس Space یا مکان کے لیے آپ کو متعین مقام کا تصور کرنا پڑے گا۔

ہمارے ہاں عرش کا غلط مفہوم

اب اس کے لیے عرش متعین کیا کیونکہ عرش کا لفظ قرآن میں آ گیا ہے۔ چلیے صاحب! وہ عرش تخت بن گیا جس پہ بادشاہ بیٹھتے ہیں۔ اب اس عرش کو بھی تو کہیں رکھنا پڑے گا۔ آپ دیکھیے ایک ذرا سی بات خدا کی سمت یا خدا کی طرف کی وہاں سے اس کی کتنی کڑیاں بنتی چلی گئیں۔ اگر بنیاد میں پہلی اینٹ غلط رکھی جائے تو آسمان تک دیوار ٹیڑھی جاتی ہے۔ عرش رکھا، عرش پہ خدا کو بٹھایا۔ اب عرش کو کسی مقام پہ بٹھانا ہوا صاحب! بڑی مشکل پڑ گئی کہ اسے کہاں رکھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ جو روایت کئی دفعہ سامنے آ چکی ہے کہ سات آسمان ہیں۔ پہلے تو یہ سات آسمان کا تصور ہی باطل ہے۔ آسمان اس طرح سے سامنے ہیں جیسے ان کے نزدیک یہ ایک شیشے کا بل ہوتا ہے اور

ایک آسمان اور دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو میل گنتے تھے جیسے سائنس دانوں کی ہاں ہوتے ہیں۔اسی طرح سے وہ اتنے سال کی مسافت کہا کرتے تھے۔ایک آسمان اور دوسرے کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے' پھر اس کے بعد دوسرے آسمان اور تیسرے میں' پھر اس طرح سے چلتے گئے' چلتے گئے ساتواں آسمان آ گیا۔انہوں نے ایسے ہی تو ساتویں آسمان کے اوپر نہیں رکھا۔میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں' اسے ایک حدیث کہہ کے پیش کیا جاتا ہے۔میں تو نہیں کہتا کیونکہ وہ تو ارشادِ گرامی نبی اکرم ﷺ کا سمجھا جائے گا۔وہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ حضور ﷺ نے خدا کے متعلق ایسا ارشاد فرمایا ہو کہ ساتویں آسمان کے اوپر پھر ایک سمندر ہے' اتنا ہی گہرا ہے۔اس سمندر میں سات پہاڑی بکرے ہیں وہ اتنے اونچے ہیں کہ اتنے گہرے سمندر کا پانی ان کے صرف گھٹنوں تک آتا ہے۔ان کے سینگ اتنے اونچے ہیں کہ ان پر خدا کا عرش ہے' عرش کے اوپر خدا متمکن ہے۔یہ سارا کچھ اس لیے کہنا پڑا کہ خدا کے متعلق ذہن میں یہ ہے کہ وہ کسی مقام پہ ہے۔بس یہ ہے غلط بنیادی تصور۔

خدا کہتا ہے: **هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4)۔تم جہاں بھی ہو' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔**نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ** (50:16)۔ہم تو تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب تر ہیں۔**فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ** (2:115)۔تم کہیں بھی ہو' تمہارا رخ خدا کی طرف ہوگا۔پہلی بنیادی چیز جو اس نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ جسے آپ Space کہتے ہیں' مکان کہتے ہیں۔زمان اور مکان دونوں سے اس کا تصور منزا و مبرا ہے۔**هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ** (57:3)۔ Time & Space دو ہی چیزیں ہیں جو مادی دنیا سے متعلق ہیں۔Material world' Complete world کا تصور Time & Space سے آتا ہے۔مکان کے معنی Space کے معنی ہیں۔یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا جو ہم کہتے ہیں وہ ٹائم ہے: ایک وقت سے دوسرا وقت تک۔یہ دونوں چیزیں مادی دنیا کی ہیں' محسوس دنیا کی ہیں۔خدا کا تصور اس محسوس دنیا سے ماورا ہے اس لیے Time & Space میں سے کسی کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی جاسکتی کہ وہ فلاں وقت تھا یا اس سے پہلے نہیں تھا یا فلاں جگہ تھا دوسری جگہ نہیں ہے۔

انسان تو اپنی جان کے متعلق بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ جسم میں کہاں ہے اور کیسی ہے

یہ جو خدا کا تصور ہے اس سلسلہ میں میں عرض کرونگا کہ قرآنِ کریم آگے چل کر بتائے گا کہ خدا کا تصور کس قسم کا ہے لیکن اس وقت مثال کے طور پر یونہی سمجھ لیجیے جیسے کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ آپ کی جان کہاں ہے۔جسے آپ رگِ جان کہتے ہیں وہ بھی دورانِ خون کی بڑی نالی کا نام ہے اور آپ سے دورانِ خون کا نام زندگی رکھا ہے' یہ تو صرف زندگی کی نشانیاں ہیں۔کہا: آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جسم میں جان کہاں ہے؟ اور جان کے بغیر تو آپ بھی موجود نہیں' آپ موجود ہو ہی نہیں سکتے' جان یا Life کے بغیر آپ کا وجود ہی نہیں ہو سکتا' اور Life کے متعلق آپ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کہاں ہے؟ چھوٹی سی مثال ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ بات کیسے سمجھی جائے کہ وہ ہر جگہ ہے اور ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا تو ذرا سی بات سمجھنے کی ہے۔بتائیے کہ آپ کی جان کہاں ہے؟ اِس کے لیے اگر جگہ کا تعین ضروری

ہے تو وہ جب نکل جاتی ہے' اس وقت بھی پتہ نہیں چلتا۔ یونہی ہم نے تصور کر رکھا ہے کہ ایک روح سی ہے جو نیچے سے نکل جاتی ہے۔ یہ سارے تصورات غلط ہیں۔ ہم تو لائف کے متعلق بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جان کے متعلق نہیں سمجھ سکتے۔ یعنی اس کی جگہ متعین نہیں کر سکتے' ہمیں صرف اس کا احساس ہے کہ یہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمانوں پر پانے کا تصور کس طرح پیدا ہوا

ایک چیز تو خدا کے متعلق یہ غلط تصور تھا کہ وہ ایک مقام میں ہے۔ بس جب اس کے لیے قرآن میں کہیں الیہ آیا جیسے **رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ** (4:158)۔ اسے خدا نے اپنی طرف اٹھا لیا تو اب ہم نے خدا کو آسمانوں کے اُوپر ایک جگہ متمکن کہا تو اسکے معنی یہ ہو گئے کہ وہ اسے آسمانوں کی طرف لے گیا۔ یہی تصور ہے جس کی بناء پر اس آیت کے حوالے سے وہ ساری روایات جو بائبل وغیرہ میں تھیں' ہمارے ہاں آ گئیں کہ وہ اسے آسمانوں کی طرف لے گیا۔ لہٰذا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پہ زندہ چلے جانے کا تصور انجیل کا تصور ہے۔ ان کے ہاں تو یہ تصور ہونا ہی چاہیے تھا کیونکہ وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو انسان یا بشر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان کے ہاں دو عقیدے ہیں: ایک تو ابن اللہ ماننے والے' خدا کا بیٹا ماننے والے' وہ بھی بشریت سے آگے چلا جاتا ہے' اور دوسرا عقیدہ انہیں خود خدا ماننے والے ہیں جسے مسیح علیہ السلام کی الوہیت کہتے ہیں۔ جب وہ مسیح علیہ السلام کو خدا ہی مانتے ہیں تو وہ تو مان ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ پیدا بھی عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے کہ عام انسانوں کیطرح ان پہ تو موت طاری ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ عقیدہ تھا۔ ہم تو قرآنِ کریم کی رو سے انہیں ایک نبی ہی مانتے ہیں اور ہر نبی یہ کہتا ہے کہ **اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ** (14:110;21:3;23:24;23:33)۔ تمہارے ہی جیسے ایک انسان ہیں۔ لیکن میں نے عرض کیا کہ اس آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کے تصور کے لیے بنیاد یہی الیہ کا ہی لفظ ہے۔ یعنی جسے کہتے ہیں خدا نے اپنی طرف اٹھا لیا حالانکہ یہ چیزیں' کسی مقام کے متعلق' کسی Space کے متعلق' نہیں تھیں۔ یہ تو بلندی مدارج ہے جس کے لیے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے ہم مقربِ بارگاہِ خداوندی کہتے ہیں' جسے ہم خدا کا قرب کہتے ہیں۔ اس میں بھی یہ نہیں ہوتا کہ ہم Distance میں' کچھ فاصلہ طے کر کے' اس کی طرف چلے گئے۔ یعنی کہ پہلے اس کے اور ہمارے درمیان دس میل کا فاصلہ تھا' قرب کے معنی یہ ہو گئے کہ اب وہ فاصلہ پانچ میل کا رہ گیا۔ یہ تو Space کے اعتبار سے ہوگا۔ اب اگر آپ اس قرب کو بھی مدارج کا قرب لیتے ہیں تو پھر یہ ساری چیزیں حقیقت میں مدارج ہی کی ہیں اور اس طرح یہ جو چیز اس کی ''طرف'' کی ہے یہ وہ بن جاتی ہے جسے آپ قربِ خداوندی کہتے ہیں۔

صفاتِ خداوندی کا ظہور حدِ بشریت میں

یہ قرب کیا چیز ہے؟ انسان کی ذات میں اس کی صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اگر وہ وحی کی اقدار' قرآنِ کریم کی اقدار' کے مطابق زندگی

بسر کرے تو اُس کی ذات کے اندر وہ صفات' جنہیں خدا کے اسماء الحسنٰی کہا جاتا ہے' جنہیں خدا کی صفات کہا جاتا ہے' حدِ بشریت' محدود انداز سے' انسان کی ذات کے اندر سے منعکس ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ خدا کی اِن صفات کو جتنا زیادہ انسانی ذات اپنے اندر منعکس کرتی چلی جائیں گی اتنا ہی اسے خدا کا مقرب کہا جائے گا۔ یہ ہے قربِ خداوندی۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی Distance ہے' فاصلہ ہے' جو کم ہو جاتا ہے اور زیادہ ہو جاتا ہے' بلکہ یہ جسے آپ خدا کا رنگ کہتے ہیں صِبْغَةَ اللّٰهِ (2:138)۔ اُس رنگ کے معنی یہ ہیں کہ ''وہ جو خدا کی صفات ہیں' ان کا مظہر' محدود پیمانے' پہ انسان کی ذات ہو جاتی ہے جبکہ خدا کی ذات لامحدود ہے' انسان کے اندر علیٰ حدِ بشریت صرف وہ صفات منعکس ہوتی ہیں جو محدود ہیں۔ یہی محدود صفات (Attributes) ہی اس کی ذات سے باہر آتی ہیں۔ مثلاً اس نے اپنے آپ کو رَزّاق کہا ہے یا رازق کہا ہے: خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (5:114) کہا ہے یعنی الرازقین میں سے بہترین رازق ہے۔ انسان جس قدر اپنے اندر صفتِ رزاقیت کی نمود کرتا چلا جائے گا' خود محنت کرے اور جو محنت کے قابل نہیں ہیں ان کے رزق کا سامان بہم پہنچائے تو اس کے اندر خدا کی صفتِ رزاقیت کی نمود ہو گئی۔ یہ خدا کا قرب ہو گیا۔ یہ اس درجے میں' ایک گوشے میں' ایک صفت کے اندر خدا کا مقرب ہو گیا' وہ اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (23:14) کہتا ہے: تخلیق کرنے والوں میں سب سے موزوں ترین' حسین ترین' تخلیق کرنے والا' اوروں کو بھی خالق مانتا ہے' یہ تو انسان ہی ہو سکتا ہے جو تخلیق کر سکتا ہے۔ اس لیے اس کی تخلیقی صلاحیت کو جو فرد اپنی ذات میں زیادہ سے زیادہ سمائے گا' منعکس کرے گا' اسے اس کا قرب حاصل ہو گا۔

تخلیق یا خلق کا مفہوم فاطر کے مقابل نہیں لایا جا سکتا

یاد رکھیے عربی زبان میں عدم سے وجود میں لانے کے لیے تخلیق یا خلق کا لفظ نہیں ہے۔ یہ لفظ Nothingness سے وجود میں لانے' یا کسی شے کو معدوم سے بنانے کے لیے نہیں آتا۔ اس عمل کے لیے تو لفظ ''فاطر'' آتا ہے' یا لفظ ''بَدِيْعُ'' آتا ہے جیسے فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (2:117)۔ جیسا اس نے کہا ہے اِس کے لیے یہ الفاظ آتے ہیں: کسی چیز کو عدم سے وجود میں لے آنا بغیر کسی پہلے مسالے کے' یہ فاطر اور بدیع ہے۔ یہ تو خدا ہی کے لیے ہے۔ اس کے لیے اس نے نہیں کہا کہ اِس عمل میں کوئی اور بھی اس کا شریک ہو سکتا ہے۔ عربی زبان میں تخلیق یا خلق کے معنی ہوتے ہیں: جو موجود چیزیں ہوں' ان میں نئے نئے توازن اور ترکیبیں پیدا کر کے نئی نئی چیزیں وضع کرتے چلے جانا۔ اس عمل (Process) کے لیے اُس سامان کا پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے۔ اس عمل سے جو نئی چیز وضع ہوتی ہے وہ مخلوق کہلاتی ہے۔ آپ کے ہاں تخلیق ہوتی ہے' آپ کے ہاں جو Invention بھی ہوتی ہیں' وہ ان چیزوں سے جو موجود ہیں ان سے نئی نئی چیزیں بنتی ہیں' تو یہ جو خدا کا عملِ تخلیق ہے' اس کے لیے وہ تصور دیتا ہے کہ انسان خالقین ہو سکتے ہیں۔ تو اب جس میں جتنی زیادہ تخلیقی قوت ہو گی اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا قرب حاصل ہو جائے گا' وہ اتنا ہی خدا

کا مقرب ہو جائے گا۔

حیوانات میں تولید ہوتی ہے' تخلیق تو ہوتی ہی نہیں

حیوانات میں قوتِ تخلیق نہیں ہوتی' تولید (Procreation) ہوتی ہے۔ یہ قرآن کا ایک اور لفظ آ گیا۔ تولید کے معنی ہوتا ہے: جنسی اختلاط سے ایک چیز پیدا کرنا' جسے افزائش نسل کہتے ہیں۔ یہیں سے ولادت' والد اور والدہ بھی ہے' یہ جتنا بھی سارا سلسلہ ہے۔ اس میں جنسی اختلاط سے جو چیز پیدا ہوتی ہے' اس کے لیے عربی زبان میں جو الگ لفظ ہے' وہ تولید کا لفظ ہے۔ خدا تولید سے بلند و بالا ہے: لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ (112:3)۔ نہ تو وہ تولید کے ذریعے سے خود وجود میں آیا ہے اور نہ ہی وہ تولید کے ذریعے سے آگے کسی کو وجود میں لاتا ہے۔ تولید کے ذریعے جو تخلیق ہے' جسے آپ افزائش کہتے ہیں' یہ تو حیوانات کا درجہ ہے۔ یہ ایک حیوانی خصوصیت ہے اور انسانی بھی چونکہ انسان حیوان ہی کا اگلا درجہ ہے' وہ اپنے ساتھ حیوانی سطح کی بہت سی خصوصیتیں لایا ہے۔ تولید کی خصوصیت تو حیوانی درجہ یا سطح کی خصوصیت ہے۔ خدا کی صفت نہیں ہے۔ وہ تو لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ (112:3) ہے۔ یعنی نہ وہ تولید کے ذریعے خود وجود میں آیا اور نہ ہی وہ تولید کے ذریعے آگے کسی اور کو وجود میں لاتا ہے۔ قربِ خداوندی تخلیق سے آئیگا۔ حیوانات میں تخلیق نہیں ہے۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو ہم قربِ خداوندی کہتے ہیں' یہ منزلت اور مدارج کی بلندی ہے۔ قرب کے معنی ہیں کہ خدا کی جو صفات ہیں وہ علیٰ حدِ بشریت انسان کے اپنے اندر پیدا ہوتی چلی جائیں یا ان کی نمود ہوتی چلی جائے۔ پیدا کا لفظ بھی ذرا خاص نہیں ہے۔ یہ جو ان کی نمود ہوتی ہے یا جو ان کا عکس باہر آنا ہے تو بہتر یہی لفظ ہو سکتا ہے: نمود یا عکس۔ کیونکہ Potentially تو یہ ذات کے اندر ہوتی ہیں' ان کے مضمرات تو ہوتے ہیں' انہیں ابھی مشہود طور پہ باہر آنا ہوتا ہے' یہ خوابیدہ (Dormant) ہوتی ہیں۔ یہ بات تو کچھ اور ہی ہو گئی مجھے معاف رکھئے گا۔

قربِ خداوندی مدارج کی بلندی کا دوسرا نام ہے

میں کہہ یہ رہا تھا کہ خدا کے متعلق جو یہ تصور پہلے ہمارے ذہن میں آیا کہ وہ کسی مقام کے اندر متمکن ہے' وہاں سے یہ ساری باتیں ہمارے ذہن میں آئیں۔ قربِ خداوندی بھی یوں آیا۔ یہ چیز اِلَیۡهِ کے لفظ سے آئی۔ اب جس کا نام قربِ خداوندی ہے' خدا کے قریب ہونا تو اُس کے لیے میں نے یہ سب کچھ عرض کیا ہے۔ اس کے تو یہ معنی تھے۔ لیکن یہ حضرات جنہیں ہم مقربینِ بارگاہِ خداوندی کہتے ہیں' انہیں تو آپ روز صبح دیکھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہر رات خدا کے ساتھ سوتے ہیں' اس کی محافل میں ہوتے ہیں' وہاں سے جا کے پھر یہ احکام لاتے ہیں' وہاں سے دستخط کرا کے لاتے ہیں اور جو سب سے زیادہ مقرب بننے کا مدعی تھا اس نے تو بتایا کہ جب میں نے اللہ میاں سے درخواست پہ دستخط لیے تو انہوں نے جو اپنا پین قلم اٹھایا' تو وہ (ان کے الفاظ میں) ''سرخ سیاہی کا قلم'' تھا۔ سرخ سیاہی ہاں جی' یہ ہماری آپ کی زبان تھوڑی ہے' یہ تو عالمِ بالا کی زبان ہے۔ تو جب دستخط کرنے کے لیے قلم چھینٹا' تو اس قلم کے چھینٹے سے جو چھینٹے پڑے تو یہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ہاں یہ کوئی اللہ دتہ پٹواری کا کوئی مقدمہ تھا تو وہ اس کے کرتے کے اوپر پڑے ہوئے چھینٹے وہ صبح لوگوں کو

دکھاتے تھے اور وہ قلم سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ (37:159)۔ خدا اس سے بہت بلند ہے جو کچھ یہ لوگ اس سے متعلق بیان کرتے ہیں۔ "یصفون" عجیب چیز ہے' کہ بظاہر ایسا نظر آئے گا جیسے اس کی صفتیں بیان کی جا رہی ہوں۔ کہا کہ یہ ان کی اس بیان کردہ صفتوں سے بہت دور ہے۔ یہ ہے خدا کا صحیح تصور۔

جسمانی طور پر جان کا کوئی مقام متعین نہیں

عزیزانِ من! کبھی ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ ہر جگہ موجود ہونیوالا' جس نے کہا ہے کہ وہ انسان کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہے' میں رگِ جان کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ جسے ہم شہ رگ کہتے ہیں۔ خود جان اور جان کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے جیسا میں نے ابھی کہا ہے کہ اس کا تو کوئی مقام ہی متعین نہیں ہے۔ آپ کے جسم میں جان کہاں ہے' آپ بتا ہی نہیں سکتے۔ تو یہ چیزیں جو خدا کے متعلق ہیں اُن کے بارے میں انسان کی غلط نگہی ملاحظہ فرمائیں کہ اس کے ذہن میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح' ہر جگہ' ہر ایک کے ساتھ' انسان کی رگِ جان سے بھی قریب تر موجود ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کہ خدا کے متعلق تو ان کے ذہن میں نہیں آتا' اُسے تو کہیں اوپر بٹھاتے ہیں اور جیسا کہ آپ کو پتہ ہے کہ شیطان کے متعلق ان کا یہی عقیدہ ہے کہ وہ ہر جگہ' انسان کے ساتھ ہوتا ہے' یعنی خدا کے متعلق ہر جگہ موجود انسان کی رگِ جان سے بھی قریب تر ہونے کا یہ عقیدہ ان کے ذہن میں نہیں آتا۔ اللہ اکبر۔ بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ حضرات جو آپ کے ہاں دین پیش کرنے والے ہیں' ان کی کیفیت کیا ہے۔ ہمارے ہاں کے دو فرقوں میں روز مناظرے ہوتے ہیں: ایک کو وہابی کہا جاتا ہے' دوسرے کو بریلوی کہا جاتا ہے۔ ان کا موضوع ہوتا ہے: نبی اکرمؐ حاضر ناظر ہیں یا نہیں؟ یعنی وہ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں یا نہیں؟ ان میں سے ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ موجود ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' یہ چیز محال ہے' وہ موجود نہیں ہو سکتے' معاذ اللہ معاذ اللہ۔

شیطان کا ہر آن' ہر جگہ' شہ رگ سے بھی نزدیک تر موجود ہونے کا عقیدہ

میں اس موضوع پہ یا اس چیز کے متعلق ابھی کچھ گفتگو نہیں کر رہا۔ میں یہ بتا رہا ہوں کہ ذہنوں کی کیا غلطیاں ہیں جو یہ سارے دلائل دیتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ موجود نہیں ہو سکتے۔ ان کے متعلق تو یہ دلائل دیتے ہیں کہ نہیں' ہر جگہ موجود نہیں ہو سکتے' لیکن شیطان کے متعلق یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ شیطان کو ایک موجود' ہستی مانتے ہیں یعنی یہ کہ وہ کوئی ایک ہستی ہے اور اس کے متعلق یہ چیز ہے کہ وہ ساری دنیا میں' ہر انسان کے ساتھ' ہر وقت' موجود ہوتا ہے۔ اندازہ لگائیے یہ بیان کر رہے ہیں کہ اس کے اندر خدا کی قوت ہے۔

دین کو مذہب میں بدلنے کا مؤثر ترین طریق

میں نے عرض کیا ہے کہ عزیزانِ من! یہ کبھی کھڑے ہو کے سوچتے ہی نہیں ہیں۔ پہلی ہی چیز یہ ہے کہ دین کو مذہب میں بدلنے

کا طریقہ یہ ہے کہ سوچ کے دروازے بند کر دیجیے۔ انہوں نے کبھی سوچا نہیں کہ یہ بات کہاں سے آئی۔ یہ عقیدہ مجوسیوں کے ہاں ہے۔ وہ دو برابر کی قوتیں مانتے ہیں' اکھاڑے کے دو پہلوان ہیں: اہرمن اور یزداں' شیطان اور خدا' یہ انہیں برابر کی قوتیں مانتے ہیں۔ اور یہ جو خدا ماننے والوں کا تصور ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے' انہوں نے اس اہرمن کے متعلق ساتھ ہی کہا کہ وہ بھی ہر جگہ موجود ہے۔ خدا کی قوتیں یہ ہیں کہ وہ صحیح راستے کے اوپر لیجاتا ہے' شیطان کی قوت یہ ہے کہ وہ غلط راستے کی طرف لے جاتا ہے' اور خدا اور شیطان میں' اہرمن اور یزداں میں' دونوں میں' ہر وقت کشمکش جاری ہے۔ یہ مجوسیت کا تصور تھا کہ شیطان یا ابلیس اس قسم کی موجود فی الخارج ایک ہستی ہے جو خدا کے مقابل میں کھڑی ہے اور یہ جو خدا کی ساری صفات تھیں انہوں نے بعینہٖ شیطان کے اندر رکھیں بعینہٖ وہی تصور آپ کے ہاں آیا ہوا ہے۔

انسان کے اپنے سرکش جذبات کا نام ہی شیطان یا ابلیس ہے

اب انہیں کیا بتایا جائے کہ قرآن جسے شیطان یا ابلیس کہتا ہے' وہ تو انسان کے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے۔ ملائکہ تو خارج کی قوتیں ہیں جنہیں آپ فطرت کی Powers کہتے ہیں Forces کہتے ہیں' یہ تو ساری کی ساری انسان کے سامنے' آدم کے سامنے' جھکتی ہیں' سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ اس کے اپنے جو سرکش جذبات ہیں' یہ کم بخت ان کے سامنے جھکتا ہے۔ یہ وہ سرکش جذبات ہیں جو ہر وقت ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس نے کہا کہ صاحب! قیامت تک مجھے مہلت دیدیجیے یعنی جب تک دنیا میں کوئی ایک انسان بھی ہے' اس کا شیطان (سرکش جذبات) موجود ہے۔ شیطان تو اس کے اندر موجود ہے۔

عزیزانِ من! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا کے متعلق جو غلط تصور ہمارے ذہن میں آ گئے ہیں' ان کی رو سے یہ ساری بنیادی عمارتیں' جتنی بھی ہیں' جو بھی ہیں' یہ غلط اٹھتی ہیں۔ جب آپ کے ذہن میں اللہ کا تصور آ جائے تو وہاں ایک مقام یہ پھر خدا کو رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کو اس کی طرف جانا پڑتا ہے جیسے Physically آپ اس کی طرف Move کر رہے ہیں' جا رہے ہیں کیونکہ وہ ایک مقام یہ جو ہوا۔ آپ دیکھیے کہ جیسے ہم نے قیامت یا محشر کا تصور اپنے ذہن میں رکھا ہوا ہے کہ ایک میدان ہے۔ اس میدان کے اندر اللہ تعالیٰ بھی کرسیٔ عدالت پر متمکن ہے' ساری دنیا اس کے حضور وہاں یوں حاضر ہے۔ اللہ سے ذہن میں یہی تصور آتا ہے۔

دینِ خدا میں خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

اسی تصور کے ماتحت اِنَّـا لِـلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (2:156)۔ کے معنی لیے جاتے ہیں کہ ہم اس کی طرف جا رہے ہیں' یعنی وہ کہیں بیٹھا ہوا ہے۔ ''تے تسی اودے ول جانڈ ے اؤ' او ایتھے کیندا ہوئے گا میں تے ایتھے آیا ای نہیں''[1] او بابا! میں تو تمہارے ہی پاس ہوں جہاں بھی تم ہو اور یہ ہیں کہ اسے ملنے کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ دین کو یا قرآن کے حقائق کو سمجھنے کے لیے ابتداء خدا کے اس صحیح تصور' جو قرآن دیتا ہے' سے کیجیے۔ اس نے ان تمام اہلِ مذاہب سے جو خدا کو مانتے تھے یہ کہا تھا

[1] تم اس کی طرف جا رہے ہو اور وہ وہاں کہہ رہا ہو گا کہ میں تو یہاں آیا ہی نہیں۔

کہ تمہارا خدا کو ماننا تو خدا کو ماننا ہی نہیں ہے۔ وہ تو ان کے ایمان کو ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا حالانکہ ان میں سے ہر ایک خدا کو ماننے والا ہے۔ یہ جنہیں ہم 32 کروڑ بتوں یا دیوتاؤں کا ماننے والا ہندو [1] کہتے ہیں، وہ بھی آخرالامر ایک خدا، برہما کو مانتا ہے۔ وہ ان کو اس کے غلط یا صحیح مظاہر ہی قرار دیتا ہے۔ بہرحال یہودیت اور عیسائیت اور مجوسیت اور ہندو دھرم میں خدا کا یہی تصور ہے۔

خدا پر ایمان کے سلسلہ میں ہماری کیفیت

قرآن تمام مذاہب عالم کے متعلق کہتا ہے کہ ان کا خدا پر ایمان تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیسے تسلیم کیا جائے گا؟ **فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا** (2:137)۔ اگر یہ اسطرح خدا پر ایمان لائیں جیسے تم خدا پہ ایمان لائے ہو تو قرآن کی رو سے پھر سمجھا جائے گا کہ یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پہ چلے۔ انہیں تو یہ کہا گیا تھا کہ جیسے یہ امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین ایمان لائے تم بھی خدا پہ ویسا ہی ایمان لاؤ تو خدا پہ ایمان سمجھا جائے گا اور ہماری کیفیت یہ کہ ہم خدا پہ اس طرح ایمان لائے ہوئے ہیں جیسے یہ غیر مسلم مذاہب والے لائے ہوئے ہیں۔ ہمارے ایمان کو اس نے دوسروں کے لیے مثال قرار دیا تھا، ان کا تصور ہمارا اپنا ایمان بن چکا ہے۔ یہ ہے صورت خرابی کی۔ تو یہ ہے بنیادی چیز عزیزانِ من! اگر کوئی پوچھے کہ قرآن کی منفرد خصوصیت کونسی ہے جو بنیادی طور پہ دوسرے مذاہب سے، دنیا کے مذاہب سے، اسے الگ کرتی ہے تو یہ بنیادی خصوصیت خدا کا وہ تصور ہے جو قرآن پیش کرتا ہے اور بڑا عظیم تصور ہے۔

عزیزانِ من! میں کہہ رہا تھا کہ یہ جو مثلاً حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا: **رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ** (4:158)۔ یا ہمارے متعلق کہ **وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ** (2:156)۔ تو اس سے ذہن میں جو تصور آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کوئی خاص مقام ہے جس کی طرف جانے کی بات ہے۔ یہ تصور قرآن کا نہیں ہے۔ یہ غیر قرآنی تصور ہے۔

قرآن انسان کے ذہن میں ایک اپنا تصور قائم کرتا ہے

جب خدا کا کسی مقام پر بیٹھنے کا تصور ہی نہ ہو تو پھر نہ تو کسی کو آسمان پہ لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کسی کو کسی جگہ خود جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں ایک نیا تصور آپ کو دیں گی۔ لہٰذا عزیزانِ من! یہ ہے وہ ایک نیا تصور، جو قرآن انسان کو پیش کرتا ہے۔ اسی سے حیات بعد الممات کا تصور آپ کے سامنے آئے گا۔ اسی سے جنت و دوزخ کا تصور بھی آپ کے سامنے آئے گا، اس ایک تصور کے صحیح ہو جانے سے مکافاتِ عمل کا تصور بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

انبیاء کرام کی داستان چلی آ رہی تھی۔ حضرتِ ادریس علیہ السلام کے متعلق قرآن نے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ ان کے بلندیٔ مدارج کا ذکر اجمالاً کر دیا اور یہاں سے سرِ دست ان کا ذکر صراحت کے ساتھ ختم کر کے کہا: **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ**

---

[1] یہ 1976ء کا ذکر ہے۔

مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ق وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ز وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ز وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا (19:58)۔
یہ سب انبیاء میں شامل ہیں۔ انہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا تھا۔ یہ سب نسل آدم (یعنی انسان) تھے اور ان لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام اور اسرائیل علیہ السلام (یعنی یعقوب علیہ السلام) کی نسل سے۔ انہیں ہم نے صحیح راہنمائی عطا کی تھی اور (منصب نبوت کے لیے) چن لیا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان کے سامنے قوانین خداوندی آتے تو وہ دل کے پورے گداز کے ساتھ ان کے سامنے جھک جاتے۔ عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ یہ انبیاء میں سے تھے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب آدمی تھے۔ ذریت آدم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدم ایک شخص تھا' یہ اس کی نسل میں سے تھے۔ وہ تصور جو پہلے ایک فرد کا تھا جس سے یہ سلسلہ آگے چلا تھا' یہ وہی تصور ہے جو پہلے بھی غلط تصور کے تحت آیا ہوا ہے' جبکہ انسانوں کے متعلق بھی ہمارے ذہن میں یہی آتا ہے۔ آج تو ہمارے لیے یہ سمجھ لینا بڑا آسان ہے کہ انسان کیسے پیدا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے' مرد عورت کے' جنسی اختلاط سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ ٹھیک ہے' اس کے لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت پہلے موجود ہوں۔ جیسے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بات جو آپ پیچھے لے جائیں گے تو چلتے جایئے۔ مرد اور عورت جو جوڑا ہے وہ پہلے موجود ہوگا تو ایک بچہ پیدا ہوگا۔ یہ سلسلہ چلے گا تو چلے جایئے' چلے جایئے تو وہاں کہیں جا کے کھڑے ہونا پڑے گا کہ یہ جوڑا پہلے کہاں سے آ گیا؟ وہ جو عام طور پہ ہمارے ہاں کہا کرتے ہیں کہ مرغی پہلے تھی یا انڈا پہلے تھا۔

انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں مذاہب عالم کا مشترکہ تصور

ہاں! تو سوال یہ تھا کہ پہلے کون تھا؟ یہ انسان کے ذہن میں مشکل ترین تصور تھا۔ ذہنِ انسانی اپنے بچپن کے زمانہ میں اس سے زیادہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا کہ بھئی! کسی نہ کسی طرح سے پہلا تو تم ایک کھڑا کر دو' کچھ کرو' اسے بنا دو ''فیر اگے گل بڑی اسان ہو جاندی اے۔''❶ مشکل تو پہلے انسان کی پیدائش کی تھی۔ ٹھیک ہے' انسانوں کے ذہن کا خود ساختہ تصور آپ کے ہاں بائبل میں آیا۔ صرف بائبل میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب میں وہ قدرِ مشترک ہے۔ پہلا آدم جو بنایا ہے' اسے ہر مذہب نے بنایا ہے۔ یہ ایک پتلا تھا۔ اس کے سوا انسان کا ذہن کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا' عزیزِ من! یہ سلسلہ آگے کیسے چلا؟ تو انہوں نے پہلے ایک پتلا تراشا۔ وہ ایک پتلا تراشا تو پھر یہ بات ہوئی کہ نہیں صاحب! ''کلّے نال تے کم نئیں چلدا۔''❷ جوڑا ہونا چاہیے' تو یہ نہیں کیا کہ اسی طرح کا ایک اور پتلا تراش لیں۔ وہ اور تراش لیں تو وہ تو پھر برابر کا ہو جائے گا' یہ ساتھ والی برابر کی ہو جائے گی اور پھر کہے گی کہ جس طرح سے خدا نے تجھے بنایا ہے' اسی طرح سے مجھے بنایا ہے۔ ''بڑا لاڈو خان بنا پھرنا ایں''❸ تو انہوں نے تو اُسے پست درجے پہ رکھنا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ باطل تصورات

---

❶ پھر آگے بات میں آسانی ہو جاتی ہے۔
❷ اکیلے سے تو کام نہیں چلے گا۔
❸ بڑے تکڑم باز رہنے پھرتے ہو۔

انسان کو کہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسے اسی طرح اس کے ساتھ نہیں بنایا حالانکہ بڑی آسان بات تھی۔ جس طرح سے ایک بابا بنایا' اسی طرح سے ایک اماں کو بنا دیا جاتا۔ مگر نہیں' اس طرح تو پھر وہ بابا اور اماں ایک جیسے ہو جائیں گے۔ لہٰذا بائبل نے تصور یہ دیا کہ آدم تنہا تھا' بڑا اداس رہنے لگا۔ ''کاکے نوں چھنچھنا چاہیدا سی۔''[1] تو پھر وہ اس طرح سے تو نہیں بنا سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی پسلی میں سے چیر کے اسے بنایا۔

میں نے عرض کیا' عزیزانِ من! ٹھیک ہے' وحی کی صحیح روشنی سامنے نہ رہے اور ابھی علمی طور پر ذہنِ انسانی کا ارتقا بھی نہ ہوا ہو تو وہ پھر یہی کچھ کرے گا۔ وہ بیچارے کچھ قصوروار نہیں تھے۔ انسانی علم اور انسانی ذہن کی سطح ہی اس زمانے میں ایسی تھی۔ غلطی تو یہ ہوگئی کہ یہ جو انسان کے عہدِ طفولیت کے ذہن کے تصورات تھے بائبل وغیرہ نے انہیں خدا کی وحی بنا دیا کہ خدا نے خود ایسا کہا ہے۔ تو جب وحی اپنی صحیح شکل میں ہمارے سامنے آئی تو اس وقت تو وہ تصورات ختم ہو جانے چاہئیں تھے لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی یہ ہوگئی کہ وہی تصورات ہمارے ہاں کی روایات اور تفاسیر میں آ گئے۔ یہ سارے تصورات کہ اس طرح سے' پتلا بنا کے' چیر کے' اور بیچ میں سے نکال کے' یہ سارے بائبل کے تصورات ہیں جب کہ قرآن کی تفاسیر ان سے الگ ہیں لیکن جب یہ کہا جائے کہ یہ تفاسیر حضور نبی اکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں تو اس وقت 'وہاں آ کے' اِنسان کی زبان پہ مہر لگ جاتی ہے کہ نہیں' ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن تک رسائی کے لیے تمام غیر قرآنی تصورات سے کفر اختیار کرنا ہوگا

عزیزانِ من! صحیح تصورات اسلام سے یا دین سے یا قرآن سے لیجیے۔ جب تک ان مستعار تصورات کو آپ الگ نہیں کریں گے' خدا پر' قرآن پر' وحی پر' نہیں آئیں گے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ م بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256)۔ جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے گی تو سمجھ لو کہ اس نے ایسے محکم سہارے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تو بات یہ بنی کہ پہلے غیر قرآنی تصورات سے کفر اختیار کرو گے تو ایمان آ سکے گا۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ ہم ایماندار ہیں یا ایماندار ہونا چاہتے ہیں تو پہلا ٹیسٹ یہ ہے کہ ان سے اس بات کا پوچھو کہ کیا ہم کفر بالطاغوت کر چکے ہیں۔ یہی وہ چھوٹے سے تین لفظوں میں پہلے لا الٰہ کہا گیا ہے اور پھر الا اللہ کہا ہے۔ تو عزیزانِ من! ہم تو سب ابھی اس کفر کی منزلوں میں پھر رہے ہیں' طاغوت کی منزلوں میں پھر رہے ہیں' اس سے ہم نے کفر نہیں برتا' وہ تو اس کفر برتنے کے بعد یومن باللہ آتا ہے۔

---

[1] شیر خوار بچے کو ایک کھلونا چاہیے تھا۔

ہم نے تو جنوں کا نام ہی خرد رکھا ہوا ہے

آج تو مشکل یہ ہے کہ یہ مذہب' جو باطل ہے' اس کی گرفت اتنی سخت ہو جاتی ہے کہ اگر آج ان عقائد کو جو ہمارے قرآن کے نہیں' مستعار لیے ہوئے ہیں' کوئی شخص یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ غلط ہیں' باطل ہیں' اس پہ کفر کا فتویٰ لگتا ہے۔ یعنی باطل سے کفر برتنے والا ان کے نزدیک اسلام کی رو سے کافر ہو جاتا ہے۔ کیا بات ہے صاحب!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اقتدار فتویٰ کے ہاتھ میں دیدیجیے پھر جو جی میں آئے ان سے کہلواتے چلے جایئے۔ یہ ہیں باطل کے تصورات۔ عزیزانِ من! صحیح ایمان لانے کے لیے سب سے پہلے غیر قرآنی تصورات کو نکالنا ہوگا۔

بات ذریت آدم سے ہو رہی تھی اور حضرتِ نوح علیہ السلام کیساتھ تھی۔ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (19:58)۔ اُن لوگوں کی تھی جنہیں حضرتِ نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کرا کر بچا لیا گیا اور ابراہیم علیہ السلام کی ذریت سے تھے' اسرائیل کی ذریت سے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ اسرائیل حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اور انہوں نے' یہودیوں نے' عالمگیر انسانیت کی بجائے نسلی تصور کو اپنے ہاں اپنایا۔ وہ پیدائش کے اعتبار سے خالصتاً کفر کا تصور تھا۔ عزیزانِ من! کسی طرح سے بھی اپنے آپ کو یا کسی ایک کو دوسروں کے مقابلے میں صرف پیدائش کی رو سے افضل یا ممتاز سمجھنا ابلیسی تصور ہے۔ شیطانی تصور ہے' پیدائش کی رو سے کسی کو اونچا سمجھنا' کسی کو نیچا' کسی کو وڈی'[1] ذات کا' کسی کو چھوٹی ذات کا سمجھنا' عالمگیر انسانیت کے بجائے نسلی تصور ہے۔ اس کی بنیاد کیا ہے؟ آپ کو پتہ ہے کہ جس وقت ابلیس سے کہا گیا تھا کہ تُو ملعون ہو گیا اس لیے نکل جا' دفع ہو جا۔ اس سے پوچھا تھا کہ تو اس کے سامنے کیوں نہیں جھکا؟ یاد رہے کہ یہ ساری بات تمثیلی ہے۔ عزیزانِ من! اس نے کہا تھا: اس لیے کہ میری پیدائش ''نار'' سے ہوئی ہے۔ اس کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے۔ کہا: تو پیدائش کو وجہ افضلیت سمجھ رہا ہے۔ یہ شیطانی تصور ہے' باطل کا تصور ہے۔ اسے دھتکار دیا گیا۔ آج یہی تصورات آپ کے ہاں عین اسلام ہیں' یہ سید اور یہ پٹھان اور راجپوت اور یہ جاٹ یہ اونچی ذاتیں ہیں: ''اے کمین ذات دا ہیگا جی اے' ایہو ای گل کئی سی ناں ابلیس نے''[2] کہ میں اونچی ذات کا ہوں یہ نیچی ذات کا ہے۔ سوچتے ہیں' عزیزانِ من! باتیں کہاں پہنچ رہی ہیں! کیا کوئی آج اس بات کا ماننے والا ہے کہ ''سید تے جولا ہے جیہڑے نیں پیدائش دے اعتبار نال اکو جئے ہوندے نیں''[3] آپ نے ٹھیک کہا کہ چوہڑا[4] کہو' ٹھیک ہے۔ مجھے

---

[1] بڑی [2] یہ کمی کمین (نچلی) ذات کا ہے۔ یہی تو بات تھی جو ابلیس نے کہی تھی۔

[3] جو پیدائش کے اعتبار سے سید اور جولا ہے ہیں' وہ ایک ہی منصب کے ہوتے ہیں۔ [4] مہتر۔ بھنگی

یہی کہنا چاہیے تھا۔ انسان کی حیثیت سے تو قرآن نے کہا ہے کہ مومن اور کافر کا بھی کوئی امتیاز نہیں۔ انہوں نے مجھے یہ ٹھیک کہا کہ یوں کہو کہ کوئی ایسا ذہن ہے جو اس بات کا تصور کر سکتا ہو کہ جسے ہمارے ہاں سید کہتے ہیں اور جسے چوہڑا کہتے ہیں' ان دونوں کے بچے یکساں واجب التکریم ہیں۔ کفر سے نکل کر جب ہم قرآن کی طرف آئیں گے تو اس میں بنی آدم کے لیے کہا ہے: **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ** (17:70)۔ ہم نے ہر انسانی بچے کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ابلیسی تصور یہ تھا کہ اس نے کہا تھا کہ میں اونچا ہوں صاحب! میری پیدائش اونچی ہے۔ اس کی پیدائش نیچی ہے۔ یہودیوں کا سب سے پہلا جرم یہ تھا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ نبوت بھی حضرتِ اسحاقؑ کی نسل میں رہے گی۔ مقابل میں حضرتِ اسماعیل تھے۔ ان یہودیوں کی اِن سے دشمنی تھی۔ یعنی یہ دونوں بھائی ہیں' حضرتِ ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں' یہودی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم تک بھی نہیں لے کر گئے' حضرت ابراہیم جس نے یہ کہا تھا کہ **فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ** (14:36)۔ میرا تو وہ ہے جو میرا اتباع کرتا ہے۔ ''پتراں والی گل نئیں اوناں کئی ہیگی سی' بلکہ یہ پتراں والی گل دی تے اوناں کولوں تردید ہوئی ہے۔ ❶

قرآن میں ہے کہ تعمیر کعبہ کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حضور پہلی دعا مانگی ہے تو واقعی بہت بڑی خدمت تھی' اس کا صلہ ملنا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے ابراہیم علیہ السلام ہم تمہیں ان چیزوں سے نوازیں گے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ بات میری ذات تک ہی رہ رہی ہے یا میری اولاد بھی اِن نوازشات میں شامل ہے بالخصوص ایک بیٹا جو ساتھ ہی تعمیرِ کعبہ میں شریک تھا۔ کہا: ابراہیم علیہ السلام! یہاں سوال اولاد کا نہیں ہے۔ ان میں جو بھی ظالمین میں سے ہوگا' اس کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یاد رکھنا' کل کو یہ نہ کہنا کہ ہم نے آپ سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ ان سے' جو ظالمین میں سے ہیں' ہمارا کوئی وعدہ نہیں ہے۔

یہودیوں کا پہلا جرم نسلی امتیاز تھا

یہودیوں کا پہلا جرم' جس کی وجہ سے انہیں ''مغضوب علیہ'' کہا گیا تھا' یہ تھا کہ انہوں نے یہ خصوصیات پیدائش کے اعتبار سے نسلِ اسرائیل میں رکھ دیں۔ یعنی جو حضرتِ اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئیں گے' نبوت بھی ان کے لیے مختص اور جنت بھی ان کے لیے مقرر' حتیٰ کہ دینِ ابراہیمی علیہ السلام بھی نسلِ اسرائیلی میں مختص کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ بنی اسرائیل سے جو باہر پیدا ہونے والے لوگ ہیں' وہ یہودیت کا مذہب اختیار ہی نہیں کر سکتے۔ وہ مذہب نسلی ہو گیا۔ او بھئی! یہ دین تو خدا کا دین ہے لہٰذا ساری دنیا کو کہو کہ جس کا جی چاہے اسے Accept کرے لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔

---

❶ انہوں نے مَردوں والی بات نہیں کہی تھی بلکہ مُردوں کی سی بات کی تو ان کے ہاں سے تردید ہوئی ہے۔

غیر از بنی اسرائیل جنت میں جا ہی نہیں سکے گا

آپ کو معلوم ہے کہ اِس سلسلے میں انہیں کیا مشکل پیش آ گئی تھی۔ کہنے لگے کہ دین کے اعتبار سے کوئی ہم میں آنا چاہے تو آئے لیکن کیا کریں مصیبت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے جنت مخصوص ہے۔ نسلاً جو بنی اسرائیل ہو جنت اس کے لیے ہے۔ غیر از بنی اسرائیل اگر ایمان لائے، اچھے کام کرے تو اسے ہم کہاں لیجائیں گے کیونکہ جنت میں تو وہ جا ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا انہوں نے کہا: نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ غیر از اسرائیل کو اسرائیلی مذہب کے اندر آنے ہی نہ دو۔ مسئلہ آسان ہو گیا۔ برادرانِ عزیز! ذہن میں باتیں تو بڑی آگے بڑھتی جا رہی ہیں اور کیا کیا یاد آتی جا رہی ہیں۔ مگر وقت کی کمی کا خیال دامن گیر ہے۔

جنت میں داخلے کی لیے ختنے کی پہچان

میں عرض کروں کہ انہوں نے اپنے ہاں بنی اسرائیل کی خصوصیت اور پہچان ختنہ کی رکھی تھی۔ ختنہ ان کے ہاں کی چیز ہے۔ عقیدہ ان کے ہاں یہ آ گیا۔ شیطان والی بات ہوئی کہ وہاں سوال یہ پیدا ہوا کہ جنت میں جانے کے لیے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ بنی اسرائیل میں سے ہی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی پہچان کی علامت ہونا چاہیے۔ ''او ٹکٹ کلکٹر جیہڑا رستے اچ کھلوتا ہور وہ جانے دے۔''[1] لہٰذا انہوں نے ختنوں کی علامت بتائی تو یہ ختنہ بنی اسرائیل میں تھا۔ انہوں نے کہا: یہ ٹھیک ہے بڑی پکی بات ہوگئی۔ یوں انہیں اس علامت کی بنیاد پر جنت میں بھیجا جائے گا لیکن اس کے بعد آگے ایک اور کھڈ آ گئی۔''[2]

بچوں کے ختنے جنت کے باہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کرینگے

جی! بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کی ایسی بھی صورت ہوتی ہے کہ ختنوں سے پہلے مر جاتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوا، پیدا ہونے کے ساتھ ہی مر گیا۔ بنی اسرائیل کے ہاں کا ہونے کی وجہ سے تو جنت میں جانا چاہیے۔ مختون وہ ہے نہیں۔ ''پے گئی مصیبت''[3] وہ ریلوے میں تو یوں ہو جاتا ہے کہ اس بچے کے ٹکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوائی جہاز میں تو یوں نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک دن کے بچے کا بھی ٹکٹ مانگتے ہیں۔ انہوں نے کہا: اس کے لیے تو دشواری ہو جائے گی کہ ان بچوں کو جنت میں کیسے بھیجا جائے؟ نشانی تو یہ ہوگی اس کا پتہ حل کیا ہو؟ کہا: حضرتِ ابراہیم علیہ السلام باہر بیٹھے ہوئے ان بچوں کا ختنہ کریں گے۔ ''ایہہ جیہڑا نائیاں نوں خلیفہ کیندے نے ناں، ایس طرح کیندے نیں، ایہہ خلیفہ ابراہیم دے نیں۔''[4] عزیزانِ من! کیا عرض کروں، یہ تھیں وہ خدا کی طرف منسوب کی جانے والی کتابیں۔

---

[1] وہ راستے میں ٹکٹ کلکٹر کھڑا ہوا تھا۔ وہ کیسے نکلنے دے؟

[2] ایک اور دشواری پیدا ہوگئی۔ [3] مصیبت پڑ گئی۔

[4] یہ جو حجام (نائی) کو خلیفہ کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حضرتِ ابراہیمؑ کے خلیفہ ہیں۔

یہی نہیں کہ یہ کتابیں تھیں یہ تو آج بھی ہیں۔

یہاں کہا کرتے ہیں کہ صاحب! یہ تو تم ہو جو یہ کہہ رہے ہو۔ یہ مسلمانوں کی امت کروڑوں کی تعداد میں ہے۔ یہ کس طرح ساری کی ساری باطل پہ چلی گئی؟ کس طرح یہ ساری کی ساری غلط روش پہ چلی گئی؟ ارے بابا! انہیں تو چھوڑ دیجیے۔ مسلمانوں کی ان کروڑ در کروڑ آبادیوں سے عیسائیوں کی آبادیاں زیادہ ہیں اور اگر ان میں یہودیوں کو بھی ملایا جائے تو تم ان سب کو گمراہ کہتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ باطل پہ ہیں۔ یعنی وہ تو باطل پہ ہو سکتے ہیں آپ نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے بھی یہ کہا تھا کہ ہم نہیں ہو سکتے' ہم تو ابن اللہ ہیں۔ اللہ کی چہیتی اولاد ہیں۔ انہوں نے یہ جرأت تو نہ کی کہ یا اللہ! یہ تو شرک ہو گیا البتہ انہوں نے کہا کہ ہم خدا کے محبوب امت ہیں۔ چل بھئی!

حضرت ابراہیم کی ذریت سے کیا مراد ہے

یہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ یہودی اور عیسائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں' قرآن نے کہا تو آپ نے غور کیا اس میں کیا بڑی چیز ہے؟ یہودی صرف ذریت اسرائیلی کہتے تھے۔ قرآن انہیں ایک قدم پیچھے لے جا کے ذریتِ ابراہیم تک لے گیا۔ قرآن تو یوں راستے میں سے تخفیف کرتا چلا جاتا ہے' عزیزانِ من! باطل چیزوں کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا (19:58)۔ انہیں ہم نے صحیح رہنمائی عطا کی تھی اور منصب نبوت کے لیے چن لیا تھا۔ یہاں تو ذریت کا سوال ہی نہیں ہے۔ جنہیں بھی خدا نے صحیح راستہ دکھا دیا' جنہیں بھی اس منصب کے لیے چن لیا' وہ اس میں شامل ہیں۔ اب وہ کیسے ہوں؟ ان کی ذریت میں سے ہوں یا نہ ہوں' کیفیت ان کی یہ تھی۔ خصوصیت ان کی یہ بتائی کہ انہیں صحیح رہنمائی عطائی تھی اور منصب نبوت کے لیے چُن لیا۔ عزیزانِ من! اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا (19:58)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا کہ ان کے سامنے یہ آیات یا قوانینِ خداوندی پیش کیے جاتے ہیں' تو روتے ہوئے وہ سجدے میں گر جاتے ہیں۔ یہ چیز میں نے پچھلے درس میں بھی عرض کی تھی کہ یہ واقعی جھکنا یا سجدہ کرنا تو دل کے جذبات کے مظاہرے کی ایک علامت ہے' پہلے سجداً ہے پھر بُكِيًّا ہے۔ سجداً کے معنی سجدہ دیا۔ اس کے معنی یہی نہیں ہیں کہ جب بھی' جو چیز سامنے آتی ہے' وہ جھٹ سے زمین کے اوپر سر رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تلاوتِ قرآنِ کریم میں جو قاعدے مقرر ہیں' جن کو ادب یا تعظیم کہتے ہیں' تو وہاں یہ چیز ہوتی ہے کہ جہاں اس قسم کی آیتیں آتی ہیں' فوراً سجدہ دے دیا۔

سجدہ کرنے کا مقصد تو قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوتا ہے

وہ آیات جنہیں سجدہ والی کہتے ہیں تو قرآنِ شریف پڑھتے ہوئے وہاں اُس آیت پر پہنچے قرآنِ پاک ایک طرف رکھا اور سجدہ کر دیا۔ یہ محسوس مظاہرہ ہے لیکن یہ بات یا جو چیز قرآن نے یہاں کہی ہے وہ اصل میں یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے قوانینِ خداوندی آتے تھے تو یہ لوگ فوراً زمین پہ سر رکھ دیتے تھے۔ بُكِيًّا پھر روتے تھے۔ یہ بات نہیں ہے۔ سجداً تو سرِ تسلیم خم کرنا ہے' اطاعت اختیار کرنا ہے۔ اس کے بنیادی معنی یہ ہوتے ہیں۔ ''اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ لوگ تھے کہ جب قوانینِ خداوندی سامنے آتے تھے تو وہ ان کی پوری

پوری اطاعت اختیار کرتے تھے، ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔'' اب اگلی بات جو یہاں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ روتے ہوئے یہ کچھ کرتے تھے ''روتے ہوئے ہی'' اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کی رو سے یہ رونا تو آپ کے ہاں مقربین بارگاہ کی پہلی علامت بتائی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو حضرتِ آدم جوان کے ہاں کے بابا آدم ہیں وہ جنت سے نکلے تو نکلنے کے بعد وہ بچھڑ گئے۔ ایک ہی رفیقہ تھی، وہ بھی جدا ہو گئی۔ تو اب اس کے بعد انہوں نے جو رونا شروع کیا ہے تو ایک مقام پہ پوچھو نہیں۔ پھر اب آپ کے ہاں جو تفاصیل آتی ہیں، افسانے بھی ہیں، جو اس دور کے ہیں، وہ کچھ یوں نہیں ہیں کہ کھڑے کھڑے روتے رہے وہ تو یوں ہیں کہ ایسے روئے کہ گالوں کے اوپر وہ جو آنسو گرتے رہے تو اس سے ان کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے حتیٰ کہ چڑیوں نے اندر گھونسلے بنا لیے اور پاؤں کے نیچے سے گھاس اگ آئی تھی۔ اب آپ کے ہاں بھی یہ جتنے مقربین ہیں ان کی سب سے بڑی صفت یہ بتاتے ہیں کہ خشیتِ خداوندی کی رو سے روتے رہتے تھے، گریہ وزاری میں عمر گزار دیتے تھے۔

بکیًا کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ صرف رونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ شدتِ جذبات سے واقعی دل پگھل کر آنسو بن جاتا ہے۔ لیکن یہ جو **بُـكِيًّـا** کی بات ہے یہ تو ایک اور ہی بات ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ حکم ماننے کے دو طریقے ہوتے ہیں: ایک وہ تھانے والے کا حکم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روز آ کے حاضری لگوایا کرو۔ وہاں جاتے ہیں۔ حکم وہ بھی مانتے ہیں۔ ایک ایک قدم پر دس دس گالیاں دیتا ہے، مگر حکم مان رہا ہے۔ اس کی طرف حکم جا رہا ہے، اسے آپ حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کہیں گے۔ یہ بھی تعمیل ہو رہی ہے، اس کے بلاوے پہ گالیاں دینے کا عمل بھی ہو رہا ہے۔ اور ایک دوسرا حکم ہے۔ ایک بلاوا آتا ہے: **حی علی الصلوٰۃ ، حی علی الافلاح**۔ اس کا ایک بلاوا آتا ہے: لبیک الھم لبیک۔ ایک یہ بھی تعمیل ارشاد ہے۔ اِس میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ اُس میں جبر کی رو سے انسان جا رہا ہے۔ اِس میں دل کے جھکاؤ کے ساتھ انسان جا رہا ہے۔ یہ جسے میں نے ''دل کا جھکاؤ'' کہا ہے، اسے عربی زبان میں ''بـکـیاً'' کہتے ہیں۔ اطاعت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ آپ کے جبر سے اطاعت ہو۔ اطاعت یہ بھی ہے کہ اُس میں آپ کے دل کا جھکاؤ ہو، گدازِ قلب بھی ساتھ شامل ہو۔ وہ جو پچھلی دفعہ میں نے آپ کے سامنے آیت تلاوت کی تھی جو قرآن نے کہا ہے کہ تیرا رب اس حقیقت پہ شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کی کیفیت یہ نہ ہو کہ اپنے ہر اختلافی معاملہ کو تیرے سامنے لائیں اور پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ جو تو فیصلہ دے یہی نہیں کہ اس کو یہ یونہی تسلیم کر لیں بلکہ ان کے دل میں بھی اس کے خلاف گرانی کے جذبے بھی پیدا نہ ہوں۔ وہ دل پہ بھی گراں نہ گزرے، اسے اطاعت کہا گیا، یہ ہے بکیًا کا مفہوم اور اس کی کیفیت۔ عزیزانِ من! ورنہ اگر آپ اسے صرف یہی چیز لے لیں کہ وہ جب آتی تھی تو وہ اوہو ہو کر کے رونے ہی لگ جاتے تھے۔ وہ یہ بات نہیں۔ یہ تو قرآنِ کریم نے جو ماننے کی بات کہی ہے، مومن کی صفت کہی ہے۔ پہلے تو اسکو دیکھیے وہ تو اس کے خلاف جاتی ہے، مومنین کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے۔ **وَالَّـذِيْـنَ اِذَا ذُكِّـرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ**

(25:73)۔مومن کی صفت یہ ہے کہ جب اس کے سامنے خدا کے قوانین اور آیات بھی لائی جائیں تو لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا (25:73)۔وہ ان کے سامنے بھی اندھا اور بہرا بن کے نہیں جھکتے۔ یہ مومن کی صفات ہیں کہ جب خدا کی آیات اس کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو لَمۡ یَخِرُّوۡا عَلَیۡہَا صُمًّا وَّ عُمۡیَانًا (25:73)۔مومن اندھا بہرا بن کے بالکل نہیں گرتا۔تو جس کے متعلق یہ ہے کہ وہ اندھا بہرا بن کے خدا کے احکام کے سامنے بھی نہیں جھکتا' اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ جب وہ خدا کے احکام سامنے آئیں گے اور وہ رونا شروع کر دے گا اور جھک جائے گا' کتنا بعید از قیاس و فہم ہے! رونا شروع کر دے گا نہیں بلکہ حاضر دماغی کے ساتھ ان پر غور وفکر کرتے ہوئے دل کی پوری پوری رضامندی سے ان کی اطاعت کرے گا۔

جبر کی اطاعت اور دل وجان کی اطاعت میں بنیادی فرق ہوتا ہے

عزیزانِ من! عقائد کی کیفیت ایسی ہوگی کہ اس کے سامنے' دل کے جھکاؤ کو ساتھ لیے ہوئے' گداز قلب کے ساتھ' اس کا سر بھی جھکے گا اور دل بھی جھکے گا۔ یہی اطاعت ہے جو مستقل رہتی ہے' عزیزانِ من! جبر کی اطاعت تو کسی دن ذرا سا جبر اٹھا' بس ختم ہوا قصہ! ان کی کیفیت یہ ہے۔ کہا: یہ تو وہ تھے جو گزر گئے۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی: ''یا تہاڈی باری آئی' بلکہ دوہاں دی آئی'' [1] میرے بھائی! کہا: یہ تو وہ تھے۔ اب: فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ (19:59)۔ انکے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے۔ کیا بات ہے صاحب! پہلے ان کا ذکر ہو رہا تھا اور اس کے بعد کن کا ذکر آ رہا ہے' آنا چاہیے ہی تھا تا کہ ہم خواہ مخواہ ہی کسی غلط فہمی کے اندر مبتلا نہ ہو جائیں: فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ (19:59)۔ اُن کے بعد ایسے ناخلف اُن کے جانشین ہوئے' قرآن نے جن کے وہ خلف تھے اُن کی یہ خصوصیت بتائی تھی: وَ کَانَ یَاۡمُرُ اَہۡلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ (19:55)۔ میں نے پچھلے درس میں بتایا تھا کہ وہ اپنے رفقاء کو' اپنے ساتھیوں کو' صلوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ صلوٰۃ کیا ہے: اپنے تمام جذبات وخواہشات وآرزوؤں اور امنگوں کو خدا کے احکام کے تابع رکھنا۔ کہا کہ یہ خلف ناخلف جو پیدا ہوئے تو انہوں نے کیا کیا؟

ہمارے ہاں صلوٰۃ کو ضائع کر دینے کا مفہوم

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ (19:59)۔ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ بھئی! کیا کر دیا؟ ہمارے ہاں بھی ایک صلوٰۃ ضائع ہوتی ہے: مسجد میں بھی تیری نماز نہیں ہوئی: اوئے نہیں ہوئی' اجی کی ہو گیا ئیں ہوئی' دیکھدا نئیں پتلوں گٹیاں تو تھلے ہوئی ہوئی اے تیری' جے اونوں ایوں کر دیا تے ہو گئی'' [2] اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ (19:59)۔ یہ نماز ضائع ہوتی ہے۔ یہاں صلوٰۃ ضائع ہوتی ہے۔ قرآن ہے'

---

[1] یا آپ کی باری آئی بلکہ دونوں ہی کی باری آ گئی۔

[2] ارے بھئی! تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ ابھے کیا ہوا کہ نماز نہیں ہوئی۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ تمہاری پتلون ٹخنوں سے نیچے ہے۔ اگر اسے ذرا اوپر کر دیتے تو تمہاری نماز ہو جاتی۔

عزیزانِ من! وہ تو کسی ابہام میں رہنے ہی نہیں دیتا' وہ کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑتا' کوئی چوردروازہ ہی نہیں دیتا کہ بھاگ جاؤ کہ اس سے کہہ دیا جائے کہ یہ نماز ہوگئی اور مطمئن ہوگئے کہ ہاں نماز ہوگئی۔ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ (19:59)۔ انہوں نے صلوٰۃ کے نظام کو ضائع کر دیا۔ یہاں سوال یہ ہے کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟ اِن سے کیا ہوا تھا؟

سرکش جذبات کا اتباع کرنا دراصل صلوٰۃ کا ضائع کرنا ہے

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (19:59)۔ انہوں نے اپنے ہی جذبات کی پیروی شروع کردی۔ لیجیے صلوٰۃ ضائع ہونے کی تفصیل بیان ہورہی ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے ہی جذبات کا اتباع شروع کردیا' جو جی میں آیا کیا۔ وہ امر بالصلوٰۃ کرنے والے تھے' یہ اُن کے خلف' جانشین آئے تو انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کردیا۔ یعنی: وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (19:59)۔ اپنے ہی جذبات کی پیروی شروع کردی۔ معنی واضح ہوگئے۔ مقصد اپنے ہی مقاصد کا حاصل کرنا ہے۔ نماز پڑھنے سے فارغ ہوگئے تب بھی اپنا ہی مقصد حاصل کررہے ہیں۔ نماز چھوڑنے سے ہوا ہے جب بھی اپنے ہی مقصد حاصل کرلیتے ہیں۔ انہوں نے یہ شروع کردیا۔ لہٰذا انہوں نے اتباع شہوات شروع کیا۔ یہ اپنے اپنے مفاد اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ اور قرآن نے دوسرے مقامات پہ کہہ دیا ہے۔ یاد رکھیے! یہ چیز اپنے ہی جذبات یا اپنی ہی آرزوؤں کا اتباع بذاتِ خود کوئی بری بات نہیں ہے۔ دراصل قرآن نے کہا یہ ہے کہ الحق کو چھوڑ کے اپنے جذبات کا اتباع کرنا اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ (19:59) ہے۔ جبکہ الحق صرف قرآن ہے۔ لہٰذا اس کے ساحلوں کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے چلیے۔ یہ وہ جوئے رواں ہے جو آپ کو جنت تک لے جائے گی۔ ساحلوں کو توڑ دیجیے یہی پانی سیلاب بن جائے گا اور ساری دنیا کیلیے تباہیاں لے آئے گا' اسی لیے قرآن نے انہیں بغیر الحق کہا ہے کیونکہ یہ "اتباع ھوا" جو ہے وہ خطرناک ہے۔ اب اس سے رہبانیت کی اور آپ کے ہاں سارے تصوف کی تردید ہوگئی' جن کے ہاں جذبات کا اتباع بجائے خویش ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ عمل تو انسان کو راندہ درگاہ ہونے کے قابل بنادیتا ہے' ترکِ لذات' ترکِ شہوات' ترکِ جذبات یہ سب تصورات غیر قرآنی ہیں۔ یہ بات غیر قرآنی ہے۔ حق کے تابع رکھتے ہوئے ان جذبات کو پورا کیجیے۔ یہ ہے قرآن: وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا (19:59)۔ کہا کہ یہ اپنے اپنے مفادات اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ نزولِ قرآن سے اب بھی ایک وقت آگیا ہے' ایک موقعہ آیا ہے اگر انہوں نے اسے بھی ضائع کردیا تو یہ بہت جلد اپنی ہلاکت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ لیں گے۔

قرآن تو آج بھی قدم قدم پر پکار رہا ہے

یہ لوگ جو اِدھر اُدھر بھٹکے پھر رہے تھے' غیر خداوندی طریقے اختیار کیے ہوئے تھے' اپنے اپنے جذبات کے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے' اب وقت آگیا ہے' ہم نے پھر قرآن کو نازل کیا ہے۔ خالص وحی اس کے اندر ہے۔ یہ رسول آیا ہے۔ اگر اس کا اتباع کرلو گے تو بچ جاؤ گے۔ اگر اس کا بھی اتباع نہ کیا' تو پھر تو قیامت تک کے لیے کوئی صورت ہی نہیں پھر تباہ ہوگئے' اس کے بعد تو کوئی اور رسول آنا ہی نہیں

ہے' یہ Last Chance ہے' اگر یہ بھی Miss کر گئے تو وہ پھر جسے کہتے ہیں Missed the Bus۔ یہی بات تھی آخر یہ ٹرین نکل گئی۔ مگر اب بھی ایک موقعہ ہے۔

توبہ کا مفہوم

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ (19:60)۔ یہاں ابدی مایوسی نہیں ہے' کوئی بات نہیں' غلط راستے پہ چل پڑے تھے تو کوئی بات نہیں' آ جاؤ۔ وہ جو اُس چوراہے پہ لوٹ آیا' وہ اس مقام پر آ گیا جہاں سے اس نے غلط راستہ اختیار کیا تھا: **عمل صالحًا** (19:60)۔ صحیح راستے پہ چل پڑا۔ قرآن میں دونوں چیزیں اکٹھی آتی ہیں' غلط راستے سے آ کے' اس جگہ' اس چوراہے پہ آ کے کھڑے ہو جانا' صرف اتنا تو ہوا کہ غلط راستے پہ نہیں چل رہا' کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہونا بھی تو کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تو جانا ہے' پھر وہ اس راستے پہ چل پڑا جو اس کو سیدھا صحیح منزل تک لے جانے والا ہے۔ یہ عمل صالح ہے۔ **فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ** (19:60)۔ ''او پھاٹک کھلیا ہویا اے۔''❶ تو وہ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ میں داخل ہو جائیں گے اور بعد کی زندگی میں بھی یہ جو وہ پھر سیدھے جنت کے اندر چلے جائیں گے تو **وَلَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا** (19:60)۔ ذرا برابر بھی ان کے عمل کے معاوضے میں کمی نہیں کی جائے گی۔ جنت میں داخل ہوں گے: **جَنّٰتِ عَدْنٍ** (19:61)۔ یہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے۔ ایک جنت آدم کو ملی تھی' ایک ہی لغزش ہوئی: ''کنوں پھڑ کے باہر کڈ دتا''❷ وہ جنت بخشش میں ملی ہوئی تھی۔ اس میں اور عمل کے معاوضے میں ملنے والی جنت میں بڑا فرق ہے۔ اس کے بعد اسے کہا کہ یہ جنت دوبارہ بھی مل سکتی ہے۔ ابدی مایوسی نہیں ہے۔ عیسائیت میں ابدی مایوسی ہے۔ یہودیت میں غیر از یہودی' غیر از بنی اسرائیل کو ابدی جہنمی کہا۔

قدرت عرقِ انفعال کے قطروں کو کبھی ضائع نہیں کرتی

قرآن نے کہا: نہیں' یہ بات نہیں۔ جب بھی کوئی ندامت کا یہ احساس کر لے تو وہ تو یوں ہے گویا کہ:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

صحیح ندامت کا کوئی قطرہ پیشانی کے اوپر آئے تو وہ آگے بڑھ کے منہ چوم لیتا ہے۔ انسان تائب ہوتا ہے تو وہ شدت کے ساتھ' دس گنا تیزی کے ساتھ' اس کی طرف آتا ہے۔ وہ انسان کو کہتا ہے کہ آ تو سہی۔ وہ انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔

---

❶ وہ گیٹ تو کھلا ہوا ہے جانے کے لیے۔ ❷ کان پکڑ کر باہر نکال دیا۔

عین موت کے وقت تو چلنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی

لیکن اس میں ایک شرط ہے' ایک Exception ہے۔ وہ اس کی طرف تیزی سے آتا ہے بجز اس کے جو اس نے کہا کہ ہاں! یہ بات نہیں ہے کہ جب موت سامنے آ کے کھڑی ہو جائے تو کہے۔ یا اللہ میری توبہ! اس وقت وہ کہے گا کہ اب نہیں کیونکہ اب وہ چورا ہے پہ آ کے بھی کھڑا ہو گیا تو اس کا کیا فائدہ؟ موت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اب چلنے کا وقت نکل چکا ہے۔ اب تو محض واپس آ جانا تو کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ توبہ کے یہ معنی ہیں عزیزانِ من! یہ یا اللہ! میری توبہ نہیں ہے صرف۔ جنت عدن وہ جنت جو تھی وہ یونہی ملی ہوئی تھی جبکہ یہ وہ جنت ہے کہ: اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7:43)۔ اس کے تم وارث بنائے جا چکے ہو اور یہ تمہارے اعمال کے بدلے میں تمہیں جنت ملے گی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا (4:57)۔ اب تمہیں یہاں جنت میں سے کوئی نہیں نکالے گا' وہ تو بخشش میں ملی ہوئی جنت تھی' جس سے نکال دیئے گئے۔ لیکن تمہارے عمل کے بدلے میں یہ جو جنت ملے گی تو یہ جنت' جنت عدن ہے' ہمیشہ رہنے والی جنت ہے۔ بخشش میں ملی ہوئی جنت تو میک اپ کی جنت ہوتی ہے جو پانی کا چھینٹا ملا اور نیچے سے پھر وہی نکل آئی' مگر یہ تو جنت عدن ہے۔ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ (19:61)۔ دیکھیے کہاں لفظ رحمٰن آیا ہے۔ اب آج تو وقت ہی ہو رہا ہے ورنہ رحیم اور رحمٰن کی بات تو پہلے سورۃ فاتحہ میں آئی تھی۔ جی چاہتا ہے کہ میں یہاں بھی رحمٰن بتاؤں' تمہارے رحمٰن نے بِالْغَيْبِ وعدہ کیا ہوا تھا۔ یہ جنت ابھی تمہارے سامنے نہیں آئی تھی۔ غیب کے معنی ہیں: مستقبل۔ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے' نتیجہ ہمیشہ بعد میں ملتا ہے۔

نتیجہ ہمیشہ عمل کے بعد نکلتا ہے مومن کا بالغیب پر ایمان

عمل کا نتیجہ ''غیب'' ہوتا ہے' ابھی آنے والا ہوتا ہے۔ تو جو چیز " بِمَا تَعْمَلُوْنَ " میں آئے گی' عمل کے نتیجہ میں آئے گی' وہ ہمیشہ مستقبل میں آئے گی۔ اسی لیے مومن کی پہلی صفت بالغیب ہے وہ اپنے ہر عمل کے نتیجے پہ یقین رکھتا ہے کہ ایسا ہوگا۔ اسے مومن کہتے ہیں: وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا (19:61)۔ اس کا عام ترجمہ جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا وعدہ ایسا ہے جو آ کر رہے گا۔ یہ بات نہیں ہے کہ آ کر رہے گا۔ آپ کو یاد ہے میں کبھی کبھی تصنع کے طریقے کہا کرتا ہوں۔ ہم کہتے ہیں جب ہم گاڑی میں سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ لاہور سے جا رہے ہیں ''اوئے گوجرانوالا آ گیا' آ ہو گوجرانوالا آ گیا' او گوجرانوالا تے اوتھے ای ہونداائے' آ کتھے گیا؟ اوئے تسیں گئے او گوجرانوالے۔ لاہور آیا' او آ گیا ہے' چلو اترو' جلدی کرو' لاہور آ گیا اے۔ پھر گاڑی آگے چل پڑی۔ گوجرانوالا آ گیا ہے' آ گیا جی گوجرانوالا' آ گیا' پھر راولپنڈی آ گیا۔''[1] یہ تم ہو جو وہاں جاتے ہو۔

---

[1] او بھائی! گوجرانوالا آ گیا۔ ہاں ہاں گوجرانوالا آ گیا۔ ارے بھائی! گوجرانوالا تو وہیں ہوتا ہے' وہ آ کہاں گیا ہے؟ اے تمہی گوجرانوالے آ گئے ہو۔ جب لاہور آیا تو کہا: یہ آ گیا ہے' جلدی کرو' نیچے اترو' لاہور آ گیا ہے۔ پھر گاڑی آگے چلی۔ کہا: گوجراں والا آ گیا ہے۔ آ گیا جی گوجرانوالا آ گیا۔ پھر راولپنڈی آ گیا۔

لاہور یا پنڈی ہمارے پاس نہیں آتا بلکہ ہم اس تک پہنچتے ہیں

بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ''ماتیًا'' لفظ عربی زبان کا ہے اور مفعول ہے۔ اس کے معنی ہیں: جو کہنا یہ چاہیے کہ ہم گوجرانوالے پہنچ گئے' یہ کہنا صحیح ہے' اس کا ترجمہ ہمارے ہاں کیا جاتا ہے: بیشک اس کا وعدہ آ کر رہے گا یعنی یہ وہی ہے کہ گوجرانوالا آ جائے گا۔ قرآن کا لفظ ہے عزیزانِ من! تم وہاں پہنچ کے رہو گے۔ خدا کا کلام اور آخری کلام یونہی ہونا چاہیے تھا۔ عزیزانِ من! یقین نہیں آتا تھا یہاں آ کے کتنا کتنا عرصہ کھڑا ہونا پڑتا تھا کہ یہ ''ماتیًا'' تو مفعول ہے۔ خدا کا وعدہ نہیں آ کر رہے گا۔ وہ یہ کیوں کہے گا وہ تو کہے گا کہ تم وہاں پہنچ کے رہو گے۔ یہ تھا خدا کا وعدہ کہ جنت تم تک نہیں آئے گی۔ گوجرانوالا تمہارے پاس نہیں آئے گا بلکہ تم کو وہاں پہنچنا ہوگا۔ وعدہ یہ تھا کہ یہ اگر کرلو گے' ٹکٹ لے لو گے' اس گاڑی میں سوار ہو جاؤ گے' تو تم گوجرانوالا پہنچ جاؤ گے' یہ ہے ماتیًا۔

جنت تک پہنچنے کے لیے انسان کو ہی یہ فاصلہ طے کرنا ہوگا

یہ جنت وہ ہے جس کے متعلق ہم نے یہ کہا ہے کہ وہ تو اپنے مقام پہ ہے۔ وہ چل کے کسی کے پاس نہیں آیا کرتی' تمہیں چل کے جانا پڑیگا اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ہمارا وعدہ یہ نہیں کہ جنت کو تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ ہمارا وعدہ یہ ہے کہ اگر تم نے یہ کچھ کیا تو تم جنت تک پہنچ کر رہو گے۔ ماتیًا ہے' عربی جاننے والے اس کا لطف اٹھا سکتے ہیں کہ قرآن یہ کیا کہہ گیا ہے۔ ماتیًا: پہنچ کر رہو گے' وہ کسی کے پاس نہیں آتی عزیزانِ من! ''بخشش والی جنت تے آ جاندی اے'' [1] لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا (19:62)۔ اس جنت میں' جس تک پہنچنے کے لیے انسان کو ہی فاصلہ طے کرنا ہوگا' کوئی ناشائستہ بات کسی قسم کا بے مقصد شور وشغب یا بے نتیجہ ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی۔ عزیزانِ من! اب اس جنت کی آگے سے بات آ رہی ہے' اور وقت ہو گیا ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ مریم کی آیت 61 تک آ گئے' 62 ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم ط

❀......❀......❀......❀

---

[1] وہ جنت جو بخشش میں ملے وہ تو خود آ جاتی ہے۔

انیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 62 تا 67)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلۡكَ الۡجَـنَّةُ الَّتِىۡ نُوۡرِثُ مِنۡ
عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ﴿۶۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَاعۡبُدۡهُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلۡ
تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۚ﴿۶۵﴾ وَيَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ اَوَلَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا
خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ يَكُ شَيۡـًٔا ﴿۶۷﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1976 کی 15 تاریخ ہے' درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 62 سے ہورہا ہے: (19:62)۔

سابقہ آیت میں کہا گیا تھا کہ اِس دنیا کا جنتی معاشرہ اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے اور جہاں تک اُخروی جنت کا تعلق ہے' وہ اِس دنیاوی زندگی میں سامنے نہیں آ سکتی لیکن اس بات کا وعدہ خدائے رحمٰن نے کر رکھا ہے کہ ایمانِ صالحہ کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں جنتی زندگی ہے اور خدا کے وعدے کے متعلق تو یوں سمجھو کہ اس کے واقع ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس سے پہلے سابقہ انبیاء کرام کے ذکر کے بعد کہا تھا کہ **فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ** (19:59)۔ اس کے بعد ان کے ایسے ناخلف جانشین ہوئے کہ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا یعنی اپنی ہی خواہشات کے پیچھے لگ گئے' یہ نہ دیکھا کہ قانونِ خداوندی کا تقاضا کیا ہے لیکن ان میں سے جو پچھلی امتوں میں سے چلے آ رہے تھے ایسے بھی تھے کہ جن کے بارے میں قرآن نے کہا: **اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ** (19:60)۔ جو لوگ اپنی غلط روش سے ہٹ کر اس ضابطۂ خداوندی پر ایمان لے آئیں گے اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے' جس سے انسانیت کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں گے' انہیں یہ کچھ مل جائے گا۔ اب پھر ایک دور آ گیا ہے جس میں ان کے لیے بازآفرینی کی گنجائش موجود ہے۔ اگر اب یہ پھر انہی صداقتوں پر ایمان لے آئیں' انہیں صحیح تسلیم کر لیں جو ان کی طرف مبعوث انبیاء کرام کو اپنے اپنے وقت میں بھی ملی تھیں' اب پھر وہی صداقتیں اپنی منزہ اور اصلی شکل میں دوبارہ آ گئی ہیں' اگر اب بھی یہ اپنے غلط راستے سے پلٹ آئیں اور پھر اس کے مطابق کام شروع کر دیں تو ان کی زندگی جو گم گشتہ فردوس کی شکل میں

زندگی کے کاروبار کا سارا Essence' سارا ملخص یہی ہے کہ آدم سے جو جنت چھنی تھی وہ اُسے دوبارہ کسی طرح سے مل جائے۔ یہ سارا پروگرام اسی کے لیے ہی تو ہے۔ یہ گنجائش اس کے لیے ہے کیونکہ اس نے اپنی خطا کا اعتراف کرلیا۔ اس لیے اس میں باز آفرینی کی گنجائش ہے۔ اسے دوبارہ وہ جنت مل سکتی ہے۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ ان دونوں جنتوں میں فرق کیا ہوگا؟ ایک وہ جنت جس کا وعدہ کیا گیا ہے کہ اسے اس دنیا میں ملے گی اور ایک اس کے ساتھ آنیوالی جنت جو مستقبل میں' ان کے اعمال کے نتیجہ میں ملے اور انہیں اس جنت تک جانا ہوگا۔ یہ یقینی چیز ہے کہ یہ وہاں جا کر رہیں گے اگر انہوں نے اس پروگرام پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اسی لیے تو قرآن نے **ماتیا** کہا ہے کہ خدا کے وعدے کے متعلق تو یوں سمجھیے جیسے وہ وقوع میں آ ہی گیا ہے یعنی ایسا یقینی ہے کہ اس کے واقع ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن تمہیں اس تک جانا ہوگا۔ یہ ایک لازمی شرط ہے۔

جنت کی چند ایک خصوصیات

اب اس کے بعد اگلی آیت میں اس جنت کی کچھ خصوصیات بتائی ہیں۔ جہاں جہاں بھی قرآنِ کریم میں جنت کا یہ ذکر آیا ہے وہاں آپ دیکھیں گے کہ اس کی کچھ خصوصیات آئیں گی اور اگر ان منتشر پتیوں کو یکجا کرلیا جائے تو ایسا خوبصورت گلدستہ بنتا ہے کہ واقعی وہ جنت فردوس بد اماں ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کے متعلق یہ کہا کہ **لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا** (19:62)۔ پہلی چیز تو اس میں Negative' نفی کی آئی کہ اس میں کوئی ناشائستہ بات' کسی قسم کا بے مقصد شور وشغب' بے نتیجہ ہنگامہ آرائی' قطعاً نہیں ہوگا۔ یہ ''**فِيْهَا لَغْوًا**'' کا لفظ عربوں کے ہاں بھی بڑا جامع لفظ ہے۔ اسے ہم اپنے ہاں ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ وہ ہوگا جسے ہم لایعنی یا بے معنی **لغوا** کہتے ہیں۔ یہ اس قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اصل میں یہ جو چڑیوں کا چیں چیں کرنا ہے۔ اسے وہ بنیادی طور پر کہتے ہیں' تو یہ وہ کوئی چیز ہے جسے ہم بے معنی یا لایعنی یا بے مقصد کہتے ہیں وہ سب اس میں آ جاتی ہے۔ وہاں اُس جنت میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہوگی جو بے معنی یا بے مقصد ہو۔

جنتی زندگی کے ایک ایک سانس کو محفوظ کیا جائے گا

اب وہاں زندگی کا ایک ایک سانس اتنا قیمتی اور Serious ہو جائے گا کہ اسے کسی بے معنی یا بے مقصد کام کے لیے صرف نہیں کیا جائے گا۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ لائف یا زندگی کو Seriously لینا ہے' سنجیدگی سے لینا ہے۔ ہمارے ہاں Serious کا متبادل لفظ یا ترجمہ کے لیے ابھی تک کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا حالانکہ میری ساری عمر ترجمے کرتے کرتے گزر گئی ہے۔ زندگی کو Serious لینا قرآن سکھاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے تو اصل میں اس کے معنی اسے بالحق لینا ہے' کسی چیز کو Seriously لینا ہے' زندگی کا ایک ایک سانس بڑا قیمتی ہے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ کتنا قیمتی ہے۔ لہٰذا پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ مرنے کے بعد آنے والی جنت ہی کا ذکر نہیں ہے اور اسی پہ میں نے زور دیا ہے۔ مرنے کے بعد جو زندگی ہے یہ اپنے مقام پر برحق لیکن یہ

وہیں کی بات نہیں ہو رہی۔ قرآن یہیں سے اس کی ابتداء کر دیتا ہے۔ اسی زندگی میں ہی جہنم اور جنت کی ابتداء ہو جاتی ہے اور بات پھر معاشرے کی آ گئی۔ یہاں انفرادی نجات کا سوال نہیں ہے۔ یہ تو مذہب میں پہنچ کے ہر شخص اپنی اپنی انفرادی نجات کی فکر کر رہا ہوتا ہے اور وہ اپنے اپنے طور پر اور ان کے وہم کے مطابق' ان کے خیال کے مطابق' ان کی خوش فہمی کے مطابق' غلط فہمی کے مطابق' سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس طرح اپنے اپنے طور پر کوئی کام کرنے سے اپنی اپنی نجات ہو جاتی ہے' جب کہ دین یہ نہیں کہتا۔ دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اجتماعی نظام بھی افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے' انہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ افراد بھی صالح ہونے چاہئیں۔ ان کی صلاحیتیں برومند ہونی چاہئیں۔ اسی میں تو افراد کی سیرت ہے۔

معاشرے کی مثال تو گھڑی کے پُرزوں کی سی ہے

جس قسم کے افراد ہونگے اسی قسم کا معاشرہ ہوگا۔ لیکن جنہیں ہم افراد کہتے ہیں وہ اس معاشرے کے لیے بالکل Fit ہوں۔ ان کا اس معاشرے سے' اس معاشرے کی اقدار سے' گہرا ربط و تعلق ہو۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کے پاس ایک گھڑی ہے اور گھڑی کا ہر پُرزہ نہایت صحیح شکل میں ہے لیکن وہ بکھرا ہوا میز پہ رکھا ہے۔ اب یہ گھڑی اپنا مقصد نہیں پورا کر رہی' مشین اپنا مقصد نہیں پورا کرتی کیونکہ اس کے پُرزے الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔ ہر پُرزہ اپنی جگہ قیمتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا پیچ بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ وہ بھی اگر کسی طرح سے ڈھیلا ہے تو ساری مشینری کھڑ کھڑ کرنے لگ جاتی ہے۔ اسی لیے تو ہر پرزہ قیمتی ہے۔ اسی لیے کہا:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

لیکن اگر ہر فرد اپنی اپنی جگہ تنہا اور الگ رہتا ہے تو یہ خواہ کتنا ہی فٹ (Fit) کیوں نہ ہو اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ میں نے پُرزے کے اعتبار سے' پُرزے کی گھڑی کی فٹنگ کی نسبت سے کہا ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں' اس کا کوئی مقصد نہیں' اس کا کوئی حاصل نہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے' تنہا کچھ نہیں

یہ ہے رازِ زندگی۔ یہ ہے بنیادی فرق۔ مذہب میں انسان خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ ہر پُرزہ بجائے خویش اپنے آپ کو اس چیز کا مقدر سمجھ لیتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے میں اپنی جگہ فٹ ہوں' ٹھیک ہے جہاں بھی پڑا ہوں' پڑا رہوں۔ مقصد حاصل ہو گیا لیکن اس طرح اگر وہ ساری عمر بھی پڑا رہے تو مقصد حاصل نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ یہ معاشرہ انہی افراد پر مشتمل ہوگا اور انہی افرادِ معاشرہ یا اجتماعی نظام کے اندر یہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے۔ الگ الگ رہتے ہوئے یہ مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ اور جب اس قسم کا معاشرہ قائم ہو جائے گا' جو ایسے افراد پر مشتمل ہوگا تو یہیں سے جنت کی زندگی شروع ہو جائے گی۔ اور زندگی چونکہ ایک جوئے رواں ہے' اسی طرح سے اس نے آگے جانا ہے' جس قسم کی یہاں زندگی شروع ہوگی' اسی قسم کی وہ آگے جائے گی۔ یہ نہیں ہے کہ یہاں آپ جہنم کے اندر رہوں اور جونہی آپ نے آنکھ

بندگی' آپ کی جنت شروع ہوگئی۔قطعاً ایسا نہیں ہے۔ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72)۔جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا۔ یہ ہے دین کی بنیاد۔اس سلسلے میں یہ یاد رکھیے کہ جب قرآن میں کسی معاشرے کا یا جنتی معاشرے کا ذکر آئے تو پہلے یہ تصور کر لیجیے کہ اگر وہ یہاں قائم ہے تو اُس معاشرے کے افراد کا معاشرے سے کیا ربط ہے۔اگر وہ افراد ان اقدار سے مربوط ہیں جن پر وہ معاشرہ قائم ہے اور وہ اقدار قرآنِ کریم نے دی ہیں تو یہ وہی افراد ہیں جو جنت کے اہل ہیں' یہاں اس دنیاوی زندگی میں بھی اور وہاں حیات بالآخرت میں بھی۔اور اگر وہ نہیں ہیں تو پھر یہاں بھی جہنم اور اس کے تسلسل میں وہاں بھی جہنم ہے۔زندگی جوئے رواں است و رواں است۔ یہ تو ایک ندی کا نام ہے۔ہو ہی نہیں سکتا کہ ندی کسی ایک مقام پہ جو ہڑ بن گئی ہو' رک گئی ہوتو پھر بھی اسے ندی کہا جائے یا پھر وہ ندی بھی باقی رہے۔اس کے بعد ندی تو رہتی نہیں۔

اس دنیا میں اجتماعی زندگی کے لیے انسان کی انفرادی کوشش

اس کا Test' اس کی پہچان کہ آیا انسانی زندگی جنت کے قابل ہوگئی ہے یا نہیں' یہ ہے کہ یہاں جنتی زندگی میسر ہے یا نہیں۔اگر میسر نہیں ہے تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا میسر ہونے کے لیے کوشش ہو رہی ہے یا نہیں اور کیا میں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں یا نہیں؟ یاد رہے کہ اس کی تگ و تاز اور صحیح Direction اپنا وزن رکھتی ہے اور اگر یہ یہاں نہیں ہے تو اس کے لیے یہ کوشاں ہے۔یہ اس کے بس میں نہیں ہے کہ یہ تنہا یہ کچھ کر لے' اجتماعی نظام قائم کر لے لیکن اگر یہ اس نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد میں رہتے ہوئے یہاں سے چلے جائیں گے تو یہ اپنا جتنا Balance Credit کا ہے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔یہ معاشرہ وہاں قائم ہو جائے گا لیکن اگر یہاں ایک شخص انفرادی زندگی میں مطمئن ہو گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ یہاں میری نجات ہو رہی ہے تو یاد رکھیے! نہ وہ یہاں کی نجات ہوتی ہے۔نہ وہاں کی نجات ہوتی ہے قرآن حکیم میں تو نجات کا تصور ہی کچھ اور ہے

زندگی کا ایک ایک سانس' جو بے مقصد ہے وہ باطل ہے' لغو ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس معاشرہ میں وہ لغو بات نہیں سنیں گے اور یہ بھی نہیں کہ ایک فرد کہیں اپنے کمرے میں' حجرے میں' خانقاہ میں' مسجد میں' محراب میں' تنہا بیٹھا ہو اور کوئی دوسرا وہاں نہ ہو اُس وقت کے لیے کہیں کہ لَا يَسْمَعُوْنَ (19:62)۔آپ وہاں ایسی کوئی بات نہیں سنیں گے۔اس کا تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہاں کوئی دوسرا بولنے والا ہوگا تو کچھ سنے گا تو وہاں اوروں کا ہونا تو ضروری ہوگیا۔ تو پہلے یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ نہ ہوں جو لغو باتیں کرتے رہیں' بے معنی بے مطلب باتوں میں مگن رہیں۔ یہ معنی بڑے وسیع ہو جاتے ہیں۔ہمارا جو لغو کا تصور ہے اس سے مراد صرف یہ ہے کہ کوئی بے مقصد اور بے معنی بات نہ ہو برادران عزیز! زندگی کا تو ایک ایک سانس قیمتی ہے۔لہٰذا بے مقصد ہونا تو باطل ہوگیا۔قرآن میں تو اس کے لیے لفظ ہی باطل آیا ہے۔آپ کی زندگی کا ہر سانس

جو بے مقصد ہے وہ باطل ہے اور جب یہ سانس بامقصد ہے اور مقصد بھی وہ جو اقدارِ خداوندی نے متعین کیا ہے' تب تو وہ بامقصد سانس بالحق ہے اور اگر بے مقصد ہے تو باطل ہے۔ اب بے مقصد سانسِ حیات کے بعد اگلی چیز یہ ہے کہ اگر بُرا مقصد ہے تو پھر تو وہ کفر ہو گیا لیکن یاد رکھیے کہ اگر یہ صرف بے مقصد ہے تو پھر بھی وہ باطل ہے۔ اِس طرح لغو اِس بے مقصد بات کو بھی کہیں گے جو لا یعنی بات ہو' بے معنی بات ہو' بے مقصد بات ہو۔ اس کے برعکس اس معاشرے میں یہ چیز نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ کہا: سَلٰمًا (19:62)۔ اس میں ہر بات انسانی ذات کی تکمیل کا ذریعہ اور انسانیت کے لیے موجب امن وسلامتی ہوگی۔ اس آیت میں سلام ایک لفظ ہے اور یہ اتنا جامع لفظ ہے کہ اگر اس کا تصور ان کی زبان سے اور قرآن کی رو سے ہو جائے تو پھر پورا نظام آپ کے سامنے آ جاتا ہے اور اسی سلام سے لفظ اسلام ہے جس کا مادہ ''س ل م'' ہے جس سے مسلم ہے۔

ہمارے تراجم نے ہمیں قرآن سے بیگانہ کر دیا

اب ہمارے ہاں جو تراجم ہوئے ہیں ان کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ ان تراجم نے ہمیں قرآن سے بیگانہ کر دیا۔ اس کا پہلا ترجمہ تو انگریزی زبان میں ہوا۔ وہ وہاں کی اس انگریزی زبان میں ہوا جب انگریزی زبان کے تراجم میں' جو مذہب کی زبان تھی' اس میں بائبل چھائی ہوئی تھی۔ اس انگریزی مذہبی زبان کے انگریزی لفظ آئے تو ہمارے ہاں کے تراجم نے ہمیں قرآن کی صحیح تعلیمات سے ہی بیگانہ کر دیا۔

انگریزی زبان میں مختلف قرآنی الفاظ کے مختلف تراجم کی مثال

ہاں تو عزیزانِ من! وہاں کی جو بہترین انگریزی ہے وہ بائبل کی انگلش کہلاتی ہے۔ جب بھی ہم مذہب میں جاتے ہیں' مذہبی لٹریچر پڑھتے ہیں تو وہ بائبل انگلش ہی ہے جو ہمارے تصورات پہ چھا جاتی ہے۔ وہاں God' جو قرآن کریم میں ہمارا ''رب'' ہے' بائبل میں اس کا ترجمہ Lord ہوا ہے' یہ بائبل کا ترجمہ ہے' یہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہے' یہاں لارڈ کا تصور نہیں ہے بلکہ ربوبیت کا ہے جو پرورش کرنے والا ہے۔ جس کو آپ لارڈ کہہ رہے ہیں یہ Christianity سے ہے' عیسائیت سے ہے۔ اسلام سے نہیں ہے۔ اسلام میں قران کریم نے نبی کا لفظ دیا' عیسائیت میں اس کا ترجمہ Prophet ہوا۔ یہ Prophet نہیں ہے نبی Prophesy کرنے والا نہیں ہوتا' پیش گوئیاں کرنے والا نہیں ہوتا۔ وہ جو یہودیوں کے ٹیمپل کے کاہن تھے جو Prophet کہلاتے تھے وہ پیش گوئیاں کرتے تھے۔ وہ تھے پیش گوئیاں کرنے والے۔ نبی تو مقامِ بلند کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تو پہاڑی کی چوٹی کے اوپر کھڑا ہوتا ہے جہاں سے اِدھر کی دنیا کو بھی دیکھتا ہے اور اُدھر کی دنیا کو بھی دیکھتا ہے۔ اُس مقام بلند سے بنی نوع انسان کے لیے پیغام حق لاتا ہے۔ وہ پیش گوئیاں نہیں کرتا۔ اس نبی کا Prophet ترجمہ کرنا غلط ہے۔ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح قرآن میں لفظ صلوٰۃ آیا۔ انہوں نے Prayer ترجمہ کیا' انہوں نے Worship ترجمہ کیا۔ ٹھیک ہے Christianity آ گئی' اسلام نہیں آیا۔ اسی طرح ہمارے ہاں سَلٰمًا کا ترجمہ انگریزی زبان میں Peace ہوا ہے۔ ٹھیک ہے زندگی کا ایک Aspect یہ ہے۔ یہ پھر بھی Negative Aspect ہے۔ یہ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ

وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (10:62) والی صورت تو ہے کہ کسی قسم کا نہ خوف ہو نہ حزن ہو تو اسلام میں صرف یہی تو نہیں ہے کہ اگر کسی قسم کا یہ انتظام ہو جائے کہ آپ کو کوئی خوف وحزن نہ ہو اور آپ بیٹھے ہوئے ہوں تو زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ خوف وحزن کا نہ ہونا تو اس لیے ہے کہ زندگی کا بلند مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خوف وحزن نہ ہو۔ ارے بھئی! آپ کو جو باہر نکلنے کے لیے کہتے ہیں کہ راستہ محفوظ ہونا چاہیے' کوئی ڈاکو نہیں راستے میں پڑنا چاہیے' کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے' تو یہ اس لیے ہے کہ آپ انارکلی ❶ جاسکیں' وہاں اپنا کام کر کے واپس آسکیں۔ اگر آپ نے گھر میں بیٹھے رہنا ہے تو آپ کو اس سے کیا غرض کہ باہر ڈاکہ پڑ رہا ہے یا چور پھر رہے ہیں' آپ تو محفوظ ہیں۔ تو محض محفوظ ہونا جو ہے یہ مقصد کے حصول کا بنیادی ذریعہ یا شرط تو ہے مقصد نہیں ہے۔ یہ محفوظ رہ جانا یعنی مذہب میں محفوظ رہنا ہی مقصد ہو جاتا ہے' مثلاً جہنم کی آگ سے محفوظ رہنا' عذاب سے محفوظ رہنا۔ تو جیسا میں نے عرض کیا کہ یہ تو کسی مقصد کے حاصل ہونے کی صرف پہلی بنیادی شرط ہوگئی۔ یہ بات مقصود بالذات تو نہیں ہے اور آپ کے ہاں اسلام کا ترجمہ جو Peace ہوا' تو وہ اتنی بات تو ہوگئی لیکن یہ تو مقصد نہیں۔ یہ تو مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

قرآن حکیم نے نجات کے لفظ کی بجائے فوز العظیم کہا ہے

قرآنِ کریم نے جو مقصد بتایا ہے' وہ نجات نہیں ہے۔ نجات کے معنی ہوتے ہیں: محفوظ رہنا' عذابِ جہنم سے محفوظ رہنا۔ قرآنِ کریم نے اس کے لیے فوز (9:89) کہا ہے' فوز العظیم کہا ہے۔ اب ''فوز'' کے لیے ہمارے ہاں مشکل آ گئی' انگریزی میں اس کے لیے Achievement کا لفظ ہے یعنی کچھ حاصل کرنا' کچھ بننا۔ یہ ہے مقصد۔ اور یہ جتنی چیزیں ہیں مثلاً یہ حفاظت' یہ خطرات سے مامونیت' محفوظیت' مستونیت' یہ ساری اس مقصد کے لیے شرطیں ہیں کہ آپ یہ کچھ حاصل کر سکیں۔ اور وہ جو کچھ کیا ہے اس کا تعین اُس سے ہے جو خدا کی کتاب مستقل اقدار کے ذریعے کرتی ہیں۔ زندگی کا مقصد وہ اقدار متعین کرتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ اس کے حصول کے لیے کیا کیا شرائط ہیں' کیا کیا ذرائع ہیں۔ لہٰذا ان میں پہلی شرط یہ ہے کہ وَلَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:112)۔ نہ ان کے لیے کسی قسم کا خوف وخطر ہوگا اور نہ ہی افسردگی اور غمگینی۔ لہٰذا اس بلند مقصد کے حاصل کرنے کی ابتدائی شرط ہی یہ ہے کہ خوف اور حزن نہ رہے۔

قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے گا کہ اس نے روٹی کے مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن روٹی کا مقصود بالذات نہیں ہے۔ زندگی کا بلند مقصد حاصل کرنے کے لیے انسان کو زندہ رہنا ضروری ہے۔ یعنی یہ زندہ ہی نہیں رہے گا تو بلند یا پست مقصد کے حاصل کرنے کا تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا اس طرح تو بات ہی نہیں ختم ہوگئی' اسے جو زندہ رہنا ہے جو کہ اس بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تو پھر زندہ رہنے کے لیے جن ذرائع اور اسباب کی ضرورت ہے ان کی بھی اہمیت ہوگئی کیونکہ انہی کی وجہ سے یہ زندہ رہے گا لیکن یہ

---

❶ لاہور کا مشہور ومعروف بازار

جسے آپ اسبابِ زیست کہتے ہیں' جسے رزق کہا جاتا ہے' یہ جو سارا روٹی کپڑا مکان ہے' یہ انسان کے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے' اس کی اپنی ایک اہمیت ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے کیونکہ انسان اس طرح جو زندہ رہے گا تو وہ کسی بلند مقصد کے حاصل کرنے کے لیے رہے گا چنانچہ زندہ رہنے کے لیے یہ سامانِ زیست نہایت ہی ضروری ہے۔ اس طرح یہ ایک مقصد کے حصول کا صرف ابتدائی ذریعہ بنا' مقصدِ حیات نہیں۔ یہ فرق ہے!

سوشلزم' کمیونزم اور موجودہ اشتراکیت کے اندر روٹی' کپڑا' مکان ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کے نظامِ ربوبیت میں روٹی' کپڑا' مکان' مقصود بالذات نہیں ہیں۔ مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ آپ کی اس اشتراکیت اور سوشلزم اور کمیونزم میں تو روٹی مقصود بالذات ہو جاتی ہے اور جینے کے ذرائع مقصود بالذات گردانے جاتے ہیں جب کہ یہ حیوان کی زندگی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ حیوان کی اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہوتا' زندہ رہنا ہی مقصد ہوتا ہے' یہ ایک الگ بات ہے کہ آپ کسی حیوان کو اپنے قبضے میں لیں تو اس سے آپ اپنا مقصد پورا کرتے ہیں اور یہی ہے آپ کے ہاں کی اشتراکیت یا سوشلزم۔ وہ چارہ ڈالتے ہیں تاکہ ان گدھوں کے اوپر اپنا بوجھ لاد سکیں۔ اسلام میں رزق کو اور روٹی کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن وہ اس لیے ہے کہ انسان زندہ رہے اور زندہ اس لیے رہے کہ وہ جو اس کے لیے مقصد متعین کیا گیا ہے یہ اسے حاصل کر سکے اور اگر آپ کے ہاں مقصود بالذات ہی یہ روٹی کپڑا مکان ہو جائے تو یہ حیوانی زندگی ہو گی۔ اب آپ نے دیکھا دونوں میں کتنا فرق ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھیے اسلام یا قرآن بھی رزق پر' روٹی پر' بڑا زور دیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں نے عرض کیا کہ واقعتاً اس چیز کا بڑا زور ہے۔ ریلوے کا ٹکٹ خریدنا بڑا اہم ہے لیکن مقصود بالذات تو نہیں ہے۔ ٹکٹ لے کے آپ ساری عمر بیٹھے رہیے' کہیں جا تو نہیں سکتے۔ وہ کہیں جانے کے لیے ذریعہ ہے' اس کے لیے ایک ٹوکن ہے۔ اسے یاد رکھیے کہ Peace جو اسلام کا ترجمہ ہوتا ہے' یہ Peace' آپ کی Destination نہیں' آپ کا آخری مقصد نہیں ہے' منتہائے زندگی نہیں ہے بلکہ کسی مقصد کے حصول کے لیے ابتدائی شرط ہے۔ اس لیے اسلام کا ترجمہ صرف Peace کر دینا Christianity کے لیے تو ٹھیک ہے' مذہب کی رو سے تو ٹھیک ہے کیونکہ وہاں مقصد ہی یہ Peace ہے اور بس۔ اگر یہ ہو گیا تو ٹھیک ہے' جب کہ یہاں قرآنی نظام میں یہ Peace ایک ذریعہ ہے کسی مقصد کے حصول کا' اس لیے یہ ترجمہ غلط ہے۔ سلامتی تو آپ کے ہاں' ٹھیک Peace کے ہی معنوں میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں جو سلامتی کا ترجمہ ہوا تو پھر سلامتی تو وہی Peace ہی ہے' لیکن آگے آپ کے ہاں مذہب کی دنیا میں جو لفظ بولتے ہیں وہ آپ کے لفظ نہیں ہیں۔ عیسائیت کے ہیں۔ وہاں تو پھر سلامتی کے لفظ سے آگے آپ کے ہاں ''سالم داسالم'' ہی ہے۔ [1]

---

[1] پورے کا پورا

سلامتی کے ساتھ ''سالم'' زندگی کا ایک لازمی جز ہے

عزیزانِ من! یہ وہی ہے جو اسلام ہے۔ کیا مطلب ہے سالم کا؟ جس میں کوئی کمی نہ آئی ہوئی ہو۔ یہ مرغ مسلم تو آپ نے یہاں دیکھا ہی ہوگا۔ یہ وہی ''س ل م'' ہے۔ تکمیل شدہ' مکمل شدہ' مکمل انسان کے لیے لفظ مسلم آئے گا' جسے انسانِ کامل کہا جائے گا۔ انسانی ذات کی جتنی تکمیل آخری حد تک اس سطح زندگی میں ممکن ہے' وہ پوری کی پوری حاصل ہو جائے' ذات کی تکمیل یہاں ہو جائے' اسے آپ کے ہاں مسلم کہیں گے' اِسی سے سلام' اسلام' سلیم ہے۔ یہ Achievement ہے کہ آپ نے یہ کچھ حاصل کیا ہے۔ اگر یہ انسانی ذات نامکمل رہ جاتی ہے تو وہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ بہت اہم بات ہے۔

تکمیلِ ذات اور حیاتِ جاویدانی کے حصول کا معیار اور پیمانہ

عزیزانِ من! اگر میری ذات کی تکمیل یا میری ذات میں ایک ذرہ بھی کم رہ جاتا ہے تو اس قیمت پر میں حیاتِ جاویدانی کبھی خریدنے کو تیار نہیں۔ یہ مہنگی پڑتی ہے۔ اور یہیں سے ارضِ بسلم لاتے ہیں۔ وہ سیڑھیوں کو کہتے ہیں' یہ بلندیوں کی طرف جانے والی چیز ہے۔ یہ عجیب چیز ہے صاحب! تو یہ جو چیز ہے یہ اسلام یا جسے سلام کہا جاتا ہے اور جو آپ کے ہاں سلام علیکم' علیکم۔ ''چل ناں بچو تینوں دساں گا۔''[1] کتنا فرق ہے! ہاں جی وہاں تو بات ہی دوسری ہے۔ یہ تکمیلِ ذات کی بات ہے۔ وہاں اسلام علیکم میری طرف سے ہی نہیں ہے یہ تو ہے کہ تُو ہر طرف سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ۔ یہی نہیں کہ میں تمہاری تکمیل کا ذریعہ بنوں گا۔ وہ کہتا ہے: میں بھی ایسا ہی کرونگا۔ یہ معاشرہ ہے۔ اس میں افراد ایک دوسرے کی تکمیلِ ذات کا ذریعہ بنتے ہیں جیسے گھڑی کا ہر پُرزہ اس کی ذراسی حرکت باقی سارے پُرزوں کا جو مقصد ہے اس کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔ گراری کی ذراسی جنبش پوری گھڑی کے پرزوں کے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔

ایک فرد دوسرے فرد کی تکمیل ذات کے لیے کوشاں

یہ ایک فرد جو دوسرے فرد سے اسلام علیکم کہتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد یہ ہے کہ میں تمہاری سلامتی و تکمیل' دونوں اس میں آجاتی ہیں' کے لیے مدد و معاون بنوں گا' ذریعہ بنوں گا۔ وہ کہتا ہے وعلیکم السلام: میں بھی یہی کچھ تمہارے لیے بنوں گا اور جب یہ معاشرے میں ہر فرد دوسرے فرد کے لیے یہ کچھ بنتا جائے تو اس وقت یہ معاشرہ جنتی معاشرہ ہوگا۔

عزیزانِ من! اس آیت میں (19:62) یہ کہا ہے کہ وہاں لغو بات نہیں سنیں گے: اِلَّا سَلٰمًا (19:62)۔ ہر فرد دوسرے کے لیے یہ بن جائے گا تو یہی ہے وہ جنتی معاشرہ جس کے متعلق کہا ہے کہ یہ تقوی شعار لوگ ہونگے جنہوں نے یہاں قوانینِ خداوندی' احکام الٰہیہ کی پابندی کی ہوگی وہ جنت کی طرف لیے جائیں گے' چلائے جائیں گے۔ اس طرح سے ایک ایک فرد جنت میں جائے گا عزیزانِ من!

---

[1] بیٹے چلو تو سہی! تمہیں خوب بتاؤں گا!

گروہ درگروہ جائیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ گروہ درگروہ جانے کی بات ہے۔ نجات سب کی ہوتی ہے' یہاں جنت کا حصول بھی اور جہنم کے اندر بھی۔ قرآن کہتا ہے: فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ o وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ (30-29:89)۔ میرے بندوں کے گروہ کے اندر شامل ہو پھر جنت میں جانے دونگا' فرد کی اپنی اہمیت ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس تکمیل تک پہنچائے گا تو اس معاشرے کا جزو بنے گا۔ اس طرح فرد اور معاشرہ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ زندگی کی کیفیت یہ ہوگی کہ ہر فرد کو اپنا دھیان رکھنا پڑے گا لیکن اسے ایک انجمن ایک محفل کا فرد بننا ہوگا۔

اپنی ذات کو تندرست و توانا بنائے رکھ تا کہ کارواں کا ہم رکاب بنا رہے

کارواں کے ایک فرد کی طرح اپنا خیال رکھ خواہ تجھ میں چلنے کی ہمت رہے یا نہ رہے کہ خواہ تو لنگڑا ہی ہو جائے اور گر جائے۔ اپنی ذات کا خیال رکھ جبھی تو تُو اس کارواں کے ساتھ چلے گا اور پھر کارواں وہاں جائے گا' یہاں گروہ جائے گا۔ یہاں معاشرہ جنتی بنے گا فرد جنتی نہیں۔ قرآن کریم نے اس کے لیے لفظ ہی زمرًا استعمال کیا ہے۔ کہا: وَسِیۡقَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ اِلَی الۡجَنَّۃِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡہَا وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُہَا (39:73)۔ جو لوگ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں گے' انہیں گروہ درگروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ چنانچہ جب وہ اس کے قریب پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ دیکھیے' یہاں لفظ زمرًا چلتے چلتے کہا گیا ہے جیسا کہ میں نے ماتیا کے سلسلے میں کہا ہے کہ جنت تم تک نہیں آئے گی بلکہ تم وہاں پہنچو گے اور بات ہی یہ ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! اگر کسی تک وہ چیز بیٹھے ہوئے آ جائے تو اس کی تو قدر ہی نہیں ہوتی۔ وہ تو پھر چھن جاتی ہے۔

آزادی اوپر سے نہیں اترتی: قوم کو اس تک جانا ہوتا ہے

وہ بات یاد آ جاتی ہے جسے اس زمانے میں دیکھ کر ہم گالیاں دیا کرتے تھے۔ تقسیم سے پہلے کا زمانہ تھا جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک (Freedom Movement) چل رہی تھی اور اس وقت یہ تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ ہم لوگ سیکرٹریٹ میں ملازم تھے' نیا سیکرٹریٹ جو نئی دہلی میں بنا تھا' بہت عظیم الشان عمارت تھی۔ اس کے سامنے دو بلاک تھے اور ہر بلاک کا ایک ایک دروازہ تھا۔ یہاں میں سمجھتا ہوں کہ شاہی مسجد لاہور کا دروازہ بھی اتنا بڑا نہ ہوگا۔ اتنے بڑے دروازے کے سامنے سرخ پتھر ہوتا تھا' اس دروازے کے باہر یہ ایک تراشیدہ پتھر تھا' جس پر انگریزی زبان میں ایک جملہ لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اسے بھی یاد رکھیے اس وقت انگریز کی حکومت تھی' آزادی کا زمانہ تھا۔ یہ جملہ تھا:

Liberty does not defend a people, a people must defend to achieve it

''آزادی کسی قوم پر اوپر سے نیچے نہیں اترا کرتی' قوم کو اوپر جانا چاہیے تا کہ وہ آزادی کو حاصل کر لے۔'' اور ہم لوگ اس زمانے

میں آزادی کی تحریک (Movement) میں سرمست تھے۔ ہم کہتے تھے: دیکھا یہ کتنے کم بخت ہیں' ہمیں اس حزیں پہ لا کے رکھتے ہیں کہ تمہاری جھولی میں آزادی نہیں گرے گی' تمہیں آ کے اس کو حاصل کرنے کے لیے اوپر جانا پڑے گا' ہاں گویا ہم اس قابل ہی نہیں ہیں۔ یعنی یہ تھا کہ نشے کی حالت میں تو آدمی کی عقل ماری جاتی ہے۔ ہم روز اسے پڑھتے تھے۔ اور روز مذاق کرتے تھے۔ آج ہر روز اس فقرے کو دہراتے ہیں کہ بات بڑی صحیح کہہ گیا ہے: ''اپنے لئی وی مصیبت تے ماں پیولئی وی''۔ [1] ہاں وہ واقعی مصیبت بن جاتا ہے۔ دیکھا' یہ آزادی جو Defend ہوئی ہے' قوم اس بلندی پہ نہیں پہنچی تھی کہ اسے لے لے۔ یہ ٹھیک ہے یہ جنتِ آدم تھی جو بغیر کوشش کے مل گئی ہے۔ اسمیں رہا جاسکتا ہے' یہ مستقل طور پہ ہمیں الاٹ ہوسکتی ہے لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے تم کیا سلوک کرتے ہو

اس مقصد کے لیے قرآن کریم ایک شرط عائد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ** (7:43)۔ وہ شرط یہ ہے کہ یہ الاٹمنٹ تمہارے اعمال کے بدلے میں تمہارے نام ہوگی' قوموں کی زندگی میں یہ ہوتا ہے لیکن ہم نے یہ آزادی حاصل نہیں کی تھی' یہ ہمیں خدا کی طرف سے احساناً مل گئی تھی۔ **لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ** (10:14)۔ اس مقصد کے لیے ملی تھی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ اس دیکھنے کے لیے بھی تو کوئی میدان ہونا چاہیے۔ لڑکوں سے جو کہا جائے کہ ہم دیکھیں گے بھئی! تم اس دفعہ کیا کرتے ہو تو وہ یہ ہے کہ امتحان میں انہیں بیٹھنا ہوگا اور اگر ان کا امتحان ہی نہ ہو تو وہ آپ کو دکھائیں گے کیا۔ یہ ہے وہ چیز جو قرآن نے کہی ہے کہ ہم بعض اوقات قوموں پر بعض اوقات احسان کرتے ہیں' انہیں ان کی غلامی کے شکنجے سے رہائی دیدیتے ہیں تاکہ ہم دیکھیں کہ پھر وہ کیا کرتے ہیں' کس قسم کے کام کرتے ہیں۔ ورنہ تم ساری عمر کہتے رہو گے کہ جی! ہمیں تو موقعہ ہی نہیں ملا' گنجائش ہی نہیں ملی' آزادی ہی نہیں ملی' اپنی حکومت ہی نہیں ملی' ہم کیسے آپ کو بتا سکتے تھے کہ ہم کیسے حکومت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا: بہت اچھا لیجیے' یہ لو مملکت ہے' یہاں آزادی ہے اور اپنی حکومت ہے' لیکن یہ نہیں ہے کہ یہ جو اس طرح سے ممدًا' احساناً مل گئی ہے' یہ ہمیشہ کے لیے تمہارے نام' تمہارے بیٹوں کے نام' کوئی پٹہ لکھا گیا ہے۔ یہ تو اس لیے مل گئی ہے کہ تم یہ نہ کہو کہ ہمیں تو اس کا موقع ہی نہیں دیا گیا کہ ہم اپنی صلاحیتوں کو دکھا سکیں کہ ہم کیا کرسکتے ہیں۔ کہا کہ پھر ہم نے تمہیں اس ارض کا وارث بنایا (33:27)۔ کہا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو۔ جنت کے متعلق بھی قرآن نے کہا ہے کہ **حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا** (39:73)۔ جو وہاں جنت میں پہنچے۔ دیکھیے' وہاں پہنچنا ہے۔ وہ جنت خود نہیں آتی۔ میں نے وہ بات اس لیے کہی تھی کہ انہوں نے اس زمانے میں یہ کہہ رکھا تھا کہ تمہیں وہاں پہنچنا ہوگا' قرآن قدم قدم پہ یہ کہتا ہے: جب تم وہاں پہنچو گے تو **وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا** (39:73)۔ ہم اگلا دروازہ کھولیں گے۔ یہ بھی بڑی چیز ہوتی ہے کہ: یونہی پہنچ جائیں یار کا دروازہ گر پائیں کھلا

---

[1] اپنے لیے بھی مصیبت اور والدین کے لیے بھی۔

کھلے ہوئے دروازے میں تو سارے ہی اندر جاسکتے ہیں۔ دروازہ بند ہو باہر سے کھٹکھٹائیں تو سوال ہوتا ہے کہ کون آ گیا؟ جی صاحب آ گئے۔ او بسم اللہ او بسم اللہ: ''میں اوناں ایں دروازہ کھولنا''[1] دیکھتے ہیں اس کھولنے میں بھی کتنی عزت افزائی ہے۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ جنت ایسے ملے گی جیسے مہمان کو Receive کیا جاتا ہے تو اس میں پہلی بات یہ ہے کہ دروازے کی کنڈی کھولی جائے دروازہ کھولا جائے گا۔ پھر: **وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا** (39:73)۔ دربان دروازہ کھولے اور کھولتے ہیں کہے گا: **سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ** (39:73)۔ تم پر ہر طرح کی سلامتی ہو۔ یہ ہے سلام علیکم۔ کیا Reception ہے! کیا استقبال ہے! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس میں ہر قسم کی خوشگواریاں آ جاتی ہیں اور طیب قسم کی آتی ہیں۔ اس کے بعد کہا: **فَادْخُلُوْهَا** (39:73)۔ تم اس میں داخل ہو کر زندگی بسر کرو۔

وہاں گروہ در گروہ ہیں، جو دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں دروازہ کھولا جاتا ہے وہاں دربان کھڑے ہیں۔ ملائکہ ہیں کہتے ہیں: **سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ** (39:73)۔ تشریف لائیے تم پر ہر طرح کی سلامتی ہو۔ تم اس میں داخل ہو کر زندگی بسر کرو۔: **خٰلِدِيْنَ** (39:73)۔ اب آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ یہ وہ تمہارے باپ آدم والی جنت نہیں ہے کہ ایک لغزش ہوئی اور باہر نکال دیا۔ وہ تو مفت میں ملی ہوئی تھی۔ ایسی جنت کی تو کیفیت یہی ہوتی ہے کہ چھن جاتی ہے لیکن جو خریدی ہوئی ہو اس میں سے تو پھر کوئی یونہی نہیں نکال دیتا اور اسی لیے یہ کہا: **وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ** (39:74)۔ وہ اپنے اعمال کی درخشندہ نتائج کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ فی الحقیقت درخور ہزار حمد و ستائش ہے خدا کا قانون مکافات جس کے مطابق خدا کے تمام وعدے پورے ہوئے۔ ہاں تو وہ یہ کہیں گے: تشریف لائیے آئیے بیٹھیے: **سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ** ۔ یہ کہیں گے: الحمدللہ کس قدر واجب حمد و ستائش ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے وعدے کو پورا کر دکھایا۔ وہاں صرف وعدہ تھا وہاں تو وہ جنت ابھی سامنے نہیں تھی۔

وراثت کا مفہوم

اس نے اپنے وعدہ کو پورا کر دکھایا کہ اگر یہ کرو گے تو یہ ہو جائے گا۔ یہ ہے وعدہ۔ اسی کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں کہ یہ کرو گے تو یہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے اپنے وعدہ کو پورا کر دکھایا۔ اس نے کیا کیا: **وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ** (39:74)۔ اور ہمیں دنیا میں مملکت اور حکومت عطا کر دی۔ برادران من! ہمارے ہاں تو جو یہ لفظ وراثت ہے تو وہ ہم ہر چیز بخشش میں مانگتے ہیں یعنی مفت میں وراثت میں مانگتے ہیں۔ باپ دادا سے جو کچھ مل جائے اور خود کو کچھ نہ کرنا پڑے۔ ہمارے ہاں تو وراثت کا لفظ ہی ہر اس چیز کے لیے استعمال ہونے لگ گیا ہے جو ورثے میں ملے۔ یہ لفظ اپنی کمائی ہوئی چیز کے لیے نہیں آتا حالانکہ بنیادی طور پہ تو یہ لفظ کسی چیز کے مالک بنا دینے کے لیے آتا ہے۔ اب بھی ہمارے ہاں یہ جو لفظ ''والی وارث'' ہے وہ انہی معنوں میں بولا جاتا ہے ''یعنی والی وارث ہی کوئی نہیں ہیگا۔''[2] وہاں

---

[1] میں آیا ہوں ذرا دروازہ تو کھولنا۔

[2] یعنی اس کا مالک ہی کوئی نہیں ہے۔ یا وہ کسی کی ملکیت ہی نہیں اس پر کسی کی حکومت ہی نہیں ہے۔

والی وارث کے معنی مالک کے ہوتے ہیں لیکن جونہی ادھر ہمارے ہاں یہ لفظ مذہب کی دنیا میں آیا' وراثت کے معنی ہو گئے: وہ چیز جو ہمیں باپ دادا سے ترکے میں ملے' وہ اپنی کمائی نہ ہو۔ یہاں اِس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! وارث کے معنی ہیں کسی کو مالک بنا دینا۔ اب جو میں نے کہا تھا کہ یہ جنت یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے' وہاں عرب کو اس نے وارث بنا دیا جس کی کیفیت یہ ہے کہ ''یہاں ہمیں پورا اختیار حاصل ہے۔ پوری ارض پر ہمیں تمکن حاصل ہے۔'' یہ ہے جنت کی پہلی خصوصیت۔ وہ ارض جس کا وارث بنایا جاتا ہے' اس میں مالک بنایا جاتا ہے' مالک کو ہی ہر قسم کا اختیار و مجاز ہوتا ہے' ہر قسم کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ آواز ملے گی کہ ٹھیک ہے جو تم نے سمجھا' مالک بنائے گئے ہو۔ اس لیے کہ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (39:74)۔ کام کرنے والوں کا کتنا حسین اجر ہے! وہ مل رہا ہے' یہ تو اجر العاملین ہے' یہ تو کام کرنے والوں کا اچھا بہت اچھا صلہ ہے۔

ہمارے لیے پاکستان کی یہ مملکت اجر العالمین نہیں ہے

آدم کی جو جنت تھی وہ ایسی ہی تھی جیسی کہ ہمیں پاکستان کی مملکت ملی ہے۔ یہ اجر العالمین نہیں تھی۔ یہاں تو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک لغزش سے بھی باہر نکال دیئے جاتے تھے۔ یہ وہاں کی جنت ہے۔ اس میں فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (39:74)۔ ایسی آزادی ہے کہ جیسے چاہیں' رہیں۔ کام کرنے والوں کا یہ کیسا اچھا صلہ ہے! میں نے سلمٰا کی بات شروع کی تھی تو یہ جو وہاں سلمٰا تھی تو پہلے تو داخلے کے وقت تھی۔

جنت کے حصول اور ملائکے کے نزول کے لیے استقامت شرط ہے

میں نے گزارش کی ہے کہ وہ ملائکہ جو استقبال کرتے ہیں ان کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان کا نزول تو تمہارے اوپر یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اب ابتداء اس جنت کی آ گئی جس میں سلام کہنے والے ملائکہ' محافظ' ان سے کہیں گے کہ تم پر ہر طرح کی سلامتی ہے۔ تم اس میں خوش گواریوں کی زندگی بسر کرو (39:73)۔ یہ سلامتی دینے والے ملائکہ کا نزول ہو رہا ہے۔ قرآن نے ایک دوسرے مقام پہ کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ (41:30)۔ وہ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہاں ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر یہ کہہ دیا تو کیا چھٹی پائی؟ کہا: نہیں قطعاً نہیں۔ یہ اتنی سستی جنت نہیں مل سکتی۔ اس کی ایک بنیادی شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ: ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30)۔ پھر اس پر جم کر کھڑے ہو گئے۔ نظر آیا کہ یہ جو ربنا اللہ کہہ دینا ہے یہ بڑی سخت آزمائش کی بات ہے تبھی تو اس کے ساتھ استقامت کی شرط آئی ہے کہ جم کے کھڑے ہو گئے۔ لغزشیں آئیں گی' تو جم کے کھڑے ہونے کا ثبوت دیں گے جن کے لیے مزاحمتیں ہونگی' تصادم ہوگا' ٹکراؤ ہونگے تو پھر پتہ چلے گا کہ اپنے اس جسم کے کھڑا ہونے میں کتنی استقامت ہے: کیا وہ جم کے کھڑا ہوا ہے یا نہیں ہوا؟ اور اگر یہ کچھ خالی کہتے رہنا ہی ہے تو اس کے بعد تو استقامت کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر ہمارے ہاں اس کے معنی یہ ہو گئے کہ روز اٹھ کے تسبیح پھیرا کرو۔ عزیزانِ من!

استقامت تو بہت بڑی چیز ہے۔ یہ جسے ہم قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (41:30)۔ کہیں گے، یہ ہے ہی بڑی چیز۔ پہلی چیز جہاں انسان کسی کے سامنے جھکتا ہے، وہ اس لیے جھکتا ہے کہ اسے ان داتا سمجھتا ہے، رب سمجھتا ہے، اپنی نشوونما کا ذریعہ سمجھتا ہے، اپنے آپ کو محتاج سمجھتا ہے، اپنے آپ کو اس کا دست نگر سمجھتا ہے اور رب کے یہی معنی ہیں کہ وہ جو اس کی پوری نشوونما کا ذمہ لے لے اور جس نے یہ کہہ دیا کہ میری نشوونما کا جو ذمہ لینے والا ہے وہ دنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی فرد نہیں، وہ صرف اللہ ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

فرعون کی فرعونیت کا دارومدار

صاحبِ ضربِ کلیم کی اس آویزش کے خلاف جب فرعون کو اپنی قوم سے خطرہ محسوس ہوا تو اس نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ میں تمہارے خدا سے بھی کوئی بڑا خدا ہوں بلکہ کہا تو یہ کہا کہ رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى یعنی رب تو میں ہوں اور کہا تھا کہ تمہارے رزق کی کنجی میرے ہاتھ میں ہے، تمہاری روٹی میرے ہاتھ میں ہے لیکن میں ہوں سب سے بڑا ''اَن داتا''، اور دنیا میں فرعون بنتا ہی اس وقت ہے جب وہ دوسروں کی روٹی کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں اس نے کہا تھا کہ کیا اس ملک مصر کی زمینیں میری ملکیت میں نہیں ہیں؟ اور اس میں بہنے والے دریا میرے قبضے میں نہیں ہیں، کہا: جب یہ کیفیت ہے تو پھر اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى میں سب سے بڑا روٹی دینے والا ہوں۔ یہیں سے فرعون کی فرعونیت چلتی ہے اور اسی سے پھر وہ اسرائیل بیچارہ ہے جو وہاں ہے اور وہ فرعون جس طرح سے جی چاہے ان اسرائیلیوں کے بیٹوں کو ''ذبح'' کرے گا، کرتے ہیں پھر وہ بیٹوں کو ذبح، ابھرنے نہیں دیتے۔ جب روٹی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں تو ابنائے قوم کو ابھرنے ہی نہیں دیتے، خود تو رزق کی تقسیم اپنی مصلحت کے ماتحت ہوتی ہے تو آپ نے سوچا کہ یہ جو قرآن نے کہا تھا کہ جس نے کہہ دیا کہ رَبُّنَا اللّٰهُ (41:30)۔ اس کے بعد پھر نظر آیا کہ اس میں تو پھر بڑے مقامات ایسے آئیں گے جہاں لغزش کے اندیشے اور خطرے ہونگے تو وہاں اگلی منزل آئے گی۔ وہ ہوگا: ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30)۔ اس پر جم کر کھڑے ہو جانا۔ تو یہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ زبان سے کہہ دیا: میرا رب اللہ ہے۔ وہ یہ ایمان رکھے کہ رزق کسی انسان کا دیا ہوا نہیں۔ یہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کہہ دینا بڑی چیز ہے۔ جب میں کسی سے کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو میں کانپ اٹھتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لا الہ میں کتنی مشکلات ہیں صاحب! جس نے لا الہ کہا اُس نے کہا: قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30)۔ جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔ عزیزانِ من! جس نے یہ کر دیا، اس کے لیے اسی دنیا میں تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30)۔ ان پر یہاں، اس زندگی میں، اس دنیا میں فرشتے نازل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ آ کے پہلی چیز یہ کہتے ہیں: اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (41:30)۔ مت خوف کھاؤ، مت افسردہ خاطر ہو، نہ خوف نہ حزن۔ اللہ اکبر! جو پہلی چیز وہ آ کے کہتے ہیں کتنی بڑی چیز ہے! وہی جو میں نے کہا تھا کہ پہلی شرط ہے کہ خوف اور حزن نہ رہے گا۔ پہلی چیز

وہ آ کے یہ کہے گا کہ خوف اور حزن نہیں ہے۔ یہ ہو گیا Negative منفی پہلو کسی سے ڈرنے کی بات نہیں ہے کوئی فرعون نہیں جو تمہارا کچھ بگاڑ سکے گا مت خوف کھاؤ اور پھر وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30)۔ اور بشارت یا خوشخبریاں لو اس جنت کی جس کا تم سے خدا نے وعدہ کیا تھا۔ اس جنت کی کیفیت کیا ہو گی؟ یہ ہے عزیزانِ من! وہ جو میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ جنت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

اس دنیا کی زندگی میں خدا اور کائناتی قوتوں کی رفاقت کا مفہوم

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (41:31)۔ ہم اس دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے دوست اور رفیق ہیں ساری کائناتی قوتیں خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ وہ ان کی رفیق ہو جاتی ہیں وہ ان کی ولی ہو جاتی ہیں ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور وَفِى الْاٰخِرَةِ (41:31) اور آخرت میں بھی یہی کیفیت ہو گی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جنت یہاں سے شروع ہوتی ہے یہاں سے ملائکہ کی رفاقت شروع ہوتی ہے جو آخرت میں ساتھ چلتی ہے۔ یہاں جس کے رفیق ملائکہ نہیں ہیں وہ یہاں بھی محروم ہے۔ وہاں بھی محروم ہوتا ہے۔ وہ تو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آخرت میں بھی یہی کیفیت ہو گی اور سنیے عزیزانِ من! اس زندگی میں جو یہاں رفاقت ملتی ہے وہ وہاں بھی ہو گی اس کی پھر اگلی خصوصیت کیا ہو گی؟ میں نے یہاں کہا ہے کہ یہ اس کا صرف Negative ''منفی'' پہلو ہی نہیں ہے کہ محفوظ رہو گے آپ کی نجات ہو جائے گی وَلَكُمْ فِيْهَا (41:31)۔ تمہیں اس زندگی کے اندر ملنے کی کیا کیفیت ہو گی کہا کہ سنو: مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ (41:31)۔ جو طلب کرو گے ملے گے۔ جو چاہو گے وہ ہو گا۔

وہاں تو خدا خود میزبان ہو گا

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (41:31)۔ جو مانگو گے ملے گا جو چاہو گے ہو گا۔ جو مانگو گے ملے گا اسے آزادی کہتے ہیں۔ تمہاری یہ کیفیت ہو گی اور یہ گداگری اور بھکاری کی طرح نہیں ہو گی۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ (41:32)۔ یہ سب کچھ عزت و توقیر کے ساتھ ملے گا جیسے میزبان اپنے مہمان کی تواضع کرتا ہے۔ اس میں خدا کی طرف سے زندگی کے خطرات سے حفاظت کا سامان بھی ہو گا اور سامان نشو و نما بھی۔ تمہاری یہ میزبانی ہو گی خدا میزبان ہو گا تم اس کے مہمان ہو گے کتنا بڑا امر تبہ ہے! عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ آیتِ قرآنی کے آخر میں جو صفاتِ خداوندی آتی ہیں یہ بڑی غور طلب ہوتی ہیں۔ یہاں ان سے دو چیزیں کہی گئی تھیں۔ ایک تو ان سے یہ کہا تھا کہ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (41:30)۔ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر رہو۔ تمہاری ہر طرح سے حفاظت ہے۔ اور اگلی چیز یہ کہی تھی کہ پھر اس کے بعد تمہیں ہر طرح کا سامانِ نشو و نما بھی ملے گا۔ کہا: نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ (41:31)۔ یہ سامانِ حفاظت اور سامانِ نشو و نما خدا کے ہاں سے ملے گا۔ اس آیت میں غفور حفاظت دینے والا ہے اور رحیم نشو و نما دینے والا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوگا: لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَاهُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:112)۔ کہ نہ ان کے لیے کسی قسم کا خطرہ ہوگا اور نہ ہی افسردگی اور غمگینی تو مغفرت ہے، حفاظت ہے۔ لیکن یہی چیز ہی نہیں ہے کہ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہی رکھا جائے۔ بچے کو اگر آپ جھولنے میں محفوظ رکھیں، بلی کتا نہ آ جائے۔ آپ اسے اسی طرح رکھیں، اسے دودھ نہ دیں تو محض اس کا اس طرح سے محفوظ رہنا تو اس کی زندگی کے لیے کافی نہیں ہے۔ اسے دودھ بھی تو وقت پہ پلانا پڑے گا۔ یہ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ہے۔ یہی ہے وہ جس کے لیے وہاں سَلٰمًا (19:62) کہا ہے تمہارے لیے یہ کچھ ہوگا اور یہی سلٰمًا ہے۔

درود کی حقیقت اور اہمیت

عزیزانِ من! ہمارے ہاں درود کی بڑی اہمیت ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآنِ کریم میں سورۃ الاحزاب کی آیت 33 میں کہا: کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ (33:56)۔ اللہ اور اس کے ملائکہ "یصلون علی النبی" ہیں۔ یہ بات نبی کے متعلق آتی ہے، ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے، اتنا ہی بتایا جاتا ہے۔ جب کہ اسی سورۃ میں ساتھ ہی ایک اور آیت بھی ہے۔ سورۃ کا نمبر 33 ہے اور آیت کا نمبر 43 ہے۔ اور وہ ہے کہ هُوَ الَّذِىۡ يُصَلِّىۡ عَلَيۡكُمۡ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (33:43)۔ اللہ اور اسکے ملائکہ تم پہ درود بھیجتے ہیں۔ یہاں علیکم آیا ہے۔ اس آیت سے پہلے آیا تھا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (33:41)۔ یہ درود يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا (33:41) کے متعلق ہے لیکن یہ جو وہاں سے درود و سلام آ رہا ہے اس سے پہلے ایک شرط لگا دی گئی ہے۔ رسول پہ بھی درود و سلام اسی لیے آ رہا تھا۔ حضور کی تئیس سالہ زندگی سامنے رکھیے پھر استقاموا کی کیفیت دیکھیے کہ وہاں کیا کیفیت تھی، کتنے کتنے تزاحم اور تصادم تھے: ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ اور پھر ساری زندگی اس تزاحم اور تصادم سے گزری۔ تب جا کے وہاں سے آواز آئی کہ شاباش! خوش رہو، کیا بات ہے تیری! اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ (33:56)۔ اللہ اور اس کے ملائکہ "يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ" ہیں۔ یہاں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِيۡرًا وَّسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا (33:41-42)۔ اے جماعت مومنین! تمہارا فریضہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کو خود اپنے سامنے بھی رکھو اور ان کا چرچا بھی کرو اور ان کی عملی تنفیذ کے لیے دن رات سرگرداں رہو۔ یہ ایک شرط ہے مگر ہمارے ہاں تو ان چیزوں کے اندر بہت آسان کر دیا گیا، کہ "و اذکر الله" میں خدا کا ذکر کرو اور اس "ذکر الله" کی ضربیں لگایا کرو۔ اس کے بعد "صبح تسبیحاں پھیرا کرو"[1] کیا چیز ہے، ذکر اللہ؟ اس کے لیے کہا کہ زندگی کے ہر قدم پر، ہر فیصلے کے وقت، قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھو۔ یہ ہے ذکر اللہ۔ عزیزانِ من! اور یہی نہیں کہ ہر قدم پہ قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھو بلکہ کہا: سبحوہ، اس کے حصول کے لیۓ، اسکی تکمیل کے لیۓ، سرگرداں پھرتے رہو، سرگرمِ عمل رہو۔ سبح کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ یعنی

---

[1] صبح تسبیح کیا کرو۔

یہ کچھ کرتے رہو۔ تو پھر جب یہ کرو گے تو تم دیکھو گے کہ کس طرح هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ (33:43)۔قوانین خداوندی کی برکات اور اس کی کائناتی قوتوں کی تائید ونصرت تمہارے ساتھ رہے گی۔ان کی طرف سے تم پر تبریک وتہنیت کے پھول برسیں گے۔عزیزانِ من! یہی تو ہے جسے کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے فرشتے تم پر درود بھیجیں گے۔یہی درود وسلام ہے۔ایسا کچھ کرنے سے پہلی بات کیا ہوگی؟ اس سے لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (33:43)۔تمہیں زندگی کی تاریکیوں سے روشنی میں لے آئیں گے‘عزیزانِ من! اگر دنیا کے اندر اتنی سی چیز بھی میسر آجائے‘ میں کہتا ہوں اس سے بڑی نعمت کیا ہے!

اِس سے کیا ہوتا ہے؟ تاریکی اور روشنی میں بنیادی فرق کیا ہوتا ہے؟ تاریکی میں آپ کا ذہن چیزوں کو اپنی اصلی شکل میں نہیں دکھا سکتا۔ان چیزوں کے بارے میں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔تاریک کمرے کے اندر اگر ذرا سی بھی کھڑکھڑاہٹ ہو‘ ذرا سی بھی سرسراہٹ ہو تو پوچھو نہیں کہ ذہن کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں: رسیاں سانپ بن بن کے نظر آتی ہیں‘ دوازوں کے اندر بھوت پریت نظر آتے ہیں۔کوئی ذرا سا کھٹکا ہو تو پتہ نہیں کون سا چور آ گیا‘ سرسراہٹ تو پتہ نہیں کونسا سانپ آ گیا۔اس کے اندر آپ پہلی چیز کیا کرتے ہیں: اگر آپ کے پاس لائیٹ کا سامان ہے تو سوئچ آن کرتے ہیں‘ نظر آتا ہے اوہو! یہ تو رسی تھی‘ وہ تو بلی تھی‘ ''جنے دروازہ کھٹکھٹادتا سی''[1] اگر کھڑکی ہوتو یہ باہر ہوا ہے جو باہر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ایک روشنی سے‘ صرف ایک دیا سلائی کی روشنی سے یہ تمام واہمات کی چیزیں‘ قیاسات کی چیزیں‘ بے بنیاد خطرات‘ اور حزن کی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔

قرآن کی روشنی ہر شے کی حقیقت کو آشکار کر دیتی ہے

پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ روشنی سے ہر شے اپنی اپنی اصل شکل میں سامنے آ جاتی ہے۔ قرآن سامنے آتا ہے۔ہر وہ شخص‘ جو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے‘ اس کی قیمت معلوم ہو جاتی ہے کہ اسے کتنے میں خریدا جا سکتا ہے۔قرآن کے سامنے آنے سے اس کی قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔کہا: لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (33.43)۔اس کا عملاً نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہیں زندگی کی ہر قسم کی تاریکی سے نکال کر جگمگاتی روشنی میں لے آتا ہے اور تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما کرتا چلا جاتا ہے۔یہ بہت بڑی رحمت ہے۔یہی سب سے پہلی رحمت ہے۔اس لیے اس آیت کے بعد کہا: تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ (33:44)۔ان کی موجودہ زندگی بھی درخشندہ وتابناک ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بھی جب وہ اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کریں گے‘ حقیقی زندگی اور سلامتی کی جانفزا اور روح پرور دعائیں ہر طرف سے ان کا استقبال کریں گے۔اب اس آیت میں جہاں پھر سلام کا لفظ آ گیا‘ جب بھی ان سے ملائکہ کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ سلام کہتے ہیں۔اس ''سلام'' میں ان کی ہر قسم کے خطرات سے حفاظت ہے‘ انہیں اس جنت کی بشارت ہے جس

---

[1] جس نے دروازہ کھٹکھٹادیا تھا۔

میں ان کی ذات کی تکمیل ہو جائے گی' ان کو رزقِ حسنا ملتا چلا جائے گا' وہ ملائکہ اس زندگی میں بھی اور اخیر میں بھی ان کے دوست ہوں گے' خدا اور اس کے ملائکہ ''یُصَلُّوْنَ عَلَیْکُمْ'' (33:56) ان کے اوپر درود وسلام بھیجیں گے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے خدا کی نصرت اور اس کائناتی قوتوں کی تائید حاصل رہے گی۔

جنت کی پہلی خصوصیت ہی خوف وحزن سے محفوظیت ہے

بات یہاں سے چلی تھی کہ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (19:62)۔اس معاشرہ میں کوئی ناشائستہ بات' کسی قسم کا بے مقصد شور وشغب یا بے نتیجہ ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر بات' انسانی ذات کی تکمیل کا ذریعہ اور انسانیت کے لیے موجبِ امن وسلامتی ہوگی۔ تو عزیزانِ من! جنت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی بے مقصد' بے معنی بات نہیں ہوگی۔ ہر بات' ہر پروگرام کی کڑی یہ ہوگی کہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظیت اور بلند مقاصدِ حیات کے حاصل ہونے کے تمام ذرائع اور سامان میسر ہوں گے تا کہ انسان کی تکمیلِ ذات ہو سکے۔ ایک لفظ ہے سلام یا اسلام' اس کے اندر یہ سب کچھ آ جاتا ہے۔ اسی سے سلٰمًا ہے۔ اس تکمیل کے لیے میں نے کہا تھا کہ سامانِ زیست نہایت ضروری ہے کیونکہ وہ زندہ رہے گا تو بات آگے بڑھے گی۔ اس کے لیے کہا: وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (19:62)۔ اس میں سامانِ زیست کی فراوانیاں ہونگی اور ہر ایک کو سامانِ نشوونما مسلسل ومتواتر ملتا رہے گا۔ یہ پہلی شرط ہے تا کہ کوئی فرعون ❶ یہ نہ کہہ سکے: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ تمہارا سب سے بڑا رب میں ہوں' میں ہی تمہارا سب سے بڑا ان داتا میں ہوں۔ اس معاشرے میں یہ پہلی چیز ہے کہ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (19:62)۔ ہر ایک کو سامانِ نشوونما مسلسل اور متواتر ملتا رہے گا۔ اس آیت میں بکرۃً و عشیًا کے لفظی معنی یہ نہیں ہیں کہ صبح شام وہ رزق ملے گا' جو ان جیل خانہ والوں کو اس طرح دو روٹیوں پہ دال' ''پھر رات نوں دو روٹیاں تے دال'' ❷ ۔ یہ تو زبان کے محاورے ہوتے ہیں جیسے وہ کہتے ہیں: ہر صبح سفر۔ ہر شام سفر' تو صبح شام کے معنی ''ہمیشہ یا دوام'' ہوتا ہے ''مسلسل اور متواتر'' ہوتا ہے۔

ہوتا ہے' شب وروز تماشا میرے آگے ❸

یہ الفاظ دوام کے لیے بولے جاتے ہیں۔ ہر زبان کا محاورہ ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ ہمیشہ ملے گا' مستقلاً ملے گا۔ یہ ہوگی پہلی چیز یعنی وہاں پہ خطرات سے محفوظیت' سامانِ زیست اور وہ بھی دوام کے ساتھ۔ اور پھر کہا جائے گا: تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا (19:63)۔ یہ ہے وہ جنت جس کا مالک ہم اپنے بندوں میں سے انہی کو بناتے ہیں جو: مَنْ كَانَ تَقِيًّا (19:63)۔ ہمارے قوانین کی

---

❶ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' ۲۰۰۴ء' ص۔۱۰۹۔ (فٹ نوٹ)

❷ پھر رات کو بھی دو عدد چپاتی پہ دال ڈال کر دے دیا جاتا ہے۔

❸ بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے ہوتا ہے شب وروز تماشا میرے آگے (غالبؔ)

نگہداشت کر کے، زندگی کی تباہیوں سے بچتے ہیں۔ انہیں اس کا وارث بنایا جاتا ہے، وہ اس لیے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7:43)۔انہوں نے اس کے لیے اپنا خون جگر دیا تھا، انتھک محنت کی تھی۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں بھی یہ ہے۔ایک اور ریفرنس لے لیجیے تو بہتر ہوگا۔ ذرا قرآن کی تائید ہو جاتی ہے۔ دیگر مقامات میں بھی، جب اس کی تائید میں حوالے ملتے ہیں تو بات محکم اور پختہ ہو جاتی ہے، عزیزانِ من! جو قوم ہمارے قوانین کی صداقت کو تسلیم کر لے گی اور ہمارے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوگی تو ان کا معاشرہ جنتی معاشرہ ہوگا، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہ اسی میں رہیں گے۔انہیں ہمارے قوانین کی اطاعت میں، اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کرنا پڑتی ہیں لیکن ان پابندیوں سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذات کی وسعتیں بڑھ جائیں۔صحیح نظام قائم کرنے کے لیے یہ بنیادی شرط ہے (7:42)۔کیا بات ہے عزیزانِ من! جنت کی خصوصیت کی! وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (7:43)۔اس جنتی معاشری کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے بغض، عناد، کینہ، عداوت، سازش، مکروفریب غرض یہ کہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جسے انسان دوسرے سے چھپا کر رکھنا چاہے۔ یہ معاشرہ ہوگا، یہ اصحابِ جنت، ہوں گے، آپس کے رہنے والے ہوں گے ان میں سے، کسی کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جو وہ دوسرے سے چھپا کے رکھنا چاہے! او میرے اللہ، اس سے بہتر بھی کسی معاشرے کا نقشہ انسانی دماغ بنا کر پیش کر سکتا ہے!

کوئی بات بھی کسی دوسرے سے چھپی نہ ہوگی

عزیزانِ من! دنیا میں ایک ایسا دوست بھی مل جائے کہ جس کے ساتھ یہ کیفیت ہو جائے کہ کوئی ایسی بات دل میں نہ رکھے جو تم سے چھپا کر رکھنا چاہے۔اگر ایک مل جائے تو جنت حاصل ہو جاتی ہے، یہاں تو پورا معاشرہ ہی اس قسم کا بن جاتا ہے۔پہلی صفت یہ ہے۔اسی پر مزید وہ کہتے ہیں: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا (7:43)۔کس قدر قابلِ حمد وستائش ہے جس نے اس معاشرے کی طرف ہماری راہنمائی کر دی کہ جہاں کے ہر رہنے والے کی یہ کیفیت ہے۔

جہنمی معاشرے کی کیفیت

عزیزانِ من! وہ اس لیے کہ جنت میں کوئی جہنمی نہیں ہوتا، جس طرح جہنم میں کوئی جنتی نہیں ہوتا۔کیا ہے کوئی جنتی آج اِس بھری کارگہہِ کائنات میں؟ ہے کوئی خطرہ اور حزن سے محفوظ؟ ہے کوئی کہ جس کو صبح اور شام باآسانی بغیر احتیاج کے ملتا ہو؟ یاد رکھیے! جہنم میں کوئی بھی جنتی نہیں ہوگا۔اسی طرح جنت میں کوئی بھی جہنمی نہیں ہوگا۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (36:59)۔اس زندگی میں معاشرہ مخلوط نہیں رہے گا۔مجرم اور شریف، الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔کوئی مجرم شریف بن کر دوسروں کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔نہ ہی اہل جہنم جنت کی آسائشوں میں شریک ہو سکیں گے۔ وہاں سب مجرم شریف انسانوں سے الگ ہو جائیں گے۔جہنم تو یہی ہے،

عزیزانِ من! کہ ساری عمر پہچانا ہی نہیں جاتا کہ اس میں مجرم کون ہے اور شریف کون ہے' یہ غِلٍ (7:43)۔ بغض' کینہ' عداوت' سازش' مکرو فریب ہوتا ہے کہ دل میں دوسرے سے چھپا کر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ کہا: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ...... رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (7:43)۔ وہ یہ کہیں گے کہ تیری ذات کس قدر حمد وستائش کے قابل ہے جس نے یہ کچھ دیا...... جس نے ہماری رہنمائی اس حسین منزل کی طرف کر دی۔ اگر ہمیں یہ رہنمائی نہ ملتی اور ہم اسے اختیار نہ کرتے تو کبھی اس مقام تک نہ پہنچ سکتے۔ خدا کے جو پیغامبر ہماری طرف آئے تھے' حقیقی تعلیم لے کر آئے تھے اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا' بالکل سچ کہا تھا۔ وہ ہو کر رہا ہے۔

یہ کچھ دینے اور عطا کرنے کے باوجود خدا شکریہ تک کا بھی متمنی نہیں ہوگا

عزیزانِ من! یہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے کہ ہم نے یہ کچھ حاصل کیا۔ ٹھیک ہے یہی کہنا چاہیے تھا کہ تم نے یہ کچھ دیا لیکن اس دینے والے کی کیفیت کا اندازہ لگایئے یعنی اگر وہ اس پہ چپ ہی کر رہتا' تب بھی کوئی بُری بات نہیں تھی: ٹھیک ہے' تم نے یہ کہا۔ شکریہ! بھئی! تم نے یہ کہا۔ وہاں تو صورت حال ہی کچھ اور ہے۔ قرآن نے کہا: نُوْدُوْٓا (7:43)۔ ہم پکار کر وہاں سے کہیں گے: نہیں بابا! نہیں بابا! دیا نہیں بلکہ نُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (7:43)۔ او بابا! اِس جنت کے تو تم مالک بنائے گئے ہو۔ یہ تو تمہارے اپنے کاموں کی اجرت ہے۔ ''یہ ایویں ساڈا شکریہ ادا کردے پئے او۔''[1] کہا: نُوْدُوْٓا (7:43)۔ انہیں آواز دے کر کہا۔ اندازہ لگایئے عزیزانِ من! یہ نہیں کہ کان میں کہہ دیا بلکہ پکار کر کہہ دیا کہ کہیں ذہن میں یہی احساس نہ پیدا ہو جائے کہ یونہی گداگری کے طور پہ' بخشش کے طور پہ' یہ جنت ملی ہے۔ کہا: نُوْدُوْٓا (7:43)۔ ہم نے انہیں آواز دے کر کہا۔ اور بڑی چیز تھی کہ یہ اعلان کر کے کسی سے کہہ دیا جائے کہ اے لوگو! اس بات کو سن رکھو! میں نے اس میں کوئی چیز احساناً نہیں کی یا یہ کہ اس نے مجھ سے مانگ کر یہ کچھ لیا۔ یہ گداگری کی بات نہیں ہے۔ سن رکھو' سارے سن رکھو' یہ اسی کا تھا جو اس کو دیا گیا ہے۔ اس نے تو قیمت ادا کر کے اسے خریدا ہے' یہ اس کا مالک ہے۔ ملنے کو تو دونوں چیزیں مل ہی جاتی ہیں۔ اگر کوئی خاموشی سے یہ چیز لے کے باہر چلا جائے تو اس میں یہ خطرہ رہ جاتا ہے کہ ہزار قسم کے خیالات آئیں گے۔ اندازہ لگایئے کہ یہ نُوْدُوْٓا (7:43)۔ کہہ کر قرآن نے کیا کہا ہے۔ کہہ یہ رہا تھا کہ وہاں تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا (19:63)۔ یہ ہے وہ جنت جس کا وارث' ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں' جو ہمارے قوانین کی نگہداشت کر کے زندگی کی تباہیوں سے بچ جائے۔ ایسا ہی کرنے والوں کے لیے کہا تھا کہ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں' ملائکہ نازل ہوتے ہیں' جو ان تک ان کے اعمال کے نتائج کی خوشخبریاں پہنچاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ (19:64)۔ ہم تمہارے نشوونما دینے والے کے حکم کے مطابق نازل ہوئے ہیں۔ ہم از خود ہی تمہاری

---

[1] آپ تو مفت میں ہی ہمارا شکریہ ادا کر رہے ہو۔

طرف نہیں آتے' خدا کے بھیجے ہوئے آتے ہیں۔ وہ تھا اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ (33:56)۔ وہ خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید و نصرت تھی۔ یہ خدا اور اس کے فرشتے' ملائکہ' کا ایک مشترکہ پروگرام ہے۔ یہ ان دونوں کا ہے جو کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے متعلق یہ نہ سمجھ لینا کہ بھئی! تمہاری بہت نوازش ہے تم آئے اور ہم پہ یہ کچھ عنایت کیا' یہ کچھ کہا۔ بلکہ یہ کہا کہ ہم تو تمہارے رب کے بھیجے ہوئے آتے ہیں۔ اس میں بھی بڑی بات ہو جاتی ہے کہ کوئی از خود آ کے یہ چیز کہنے کی بجائے یہ ہے کہ تمہاری طرف اتنا بڑا جواب کہنے کے لیے اس نے بھیجا ہے۔ کہا: یہ تمہارے ہی اعمال ہیں' جن کا یہ نتیجہ ہے۔ جنت تیری پنہاں تھی تیرے خونِ جگر میں۔ اس وقت جنت پنہاں تھی' اب مشہود ہوگئی ہے۔ یہ اسی کی تفسیر میں کہا: لَہٗ مَابَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ (19:64)۔ محفوظ کرتا چلا گیا تمہارے وہ اعمال جو پیچھے تھے اور وہ بھی جو آگے ہیں اور وہ بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے۔ (وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ)

قرآن حکیم کی نظر میں زمانہ حال کے تصور کی حقیقت

یہاں پھر ایک بڑی عجیب چیز آ گئی۔ کہا تو یہی ہے کہ تمہاری جو ساری زندگی تھی' جو اس زندگی کے سارے اعمال و خیالات و وعدے تھے' وہ سارے کے سارے محفوظ کرتا چلا گیا۔ یہاں اس ٹائم کے متعلق یوں ضمناً یہ بات آ گئی ہے کہ تمہارے پیچھے جو ہے' وہ تو ماضی ہے' گزرا ہوا ہے' اور جو آگے آنے والا ہے وہ تو مستقبل ہے اور تیسری چیز وہ ہے جسے ہمارے ہاں حال یا Present کہتے ہیں۔ Future اور Past کے درمیان Present آتا ہے۔ قرآن نے اسے وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ (19:64) کہا ہے۔ یہ حال ہے جو ماضی اور مستقبل کے درمیان آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ٹائم یا زمان کے متعلق ایک خاص سلسلہ شروع ہوا ہے اور اسے بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی اور ویسے بھی میں یہاں اسے Explain نہیں کرسکوں گا۔ قرآن نے ماضی Past اور مستقبل Future اور جو ان کے مابین ہے اسکے لیے حال نہیں کہا۔ اب اس حلقے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ جسے آپ Present یا حال کہتے ہیں وہ ہوتا ہی نہیں ہے۔

The Present is the Future of the Past and the Past of the Future

زمانہ حال تو ماضی کا مستقبل ہوتا ہے اور مستقبل کا ماضی ہوتا ہے، یہ حال ہوتا ہی کچھ نہیں۔ اب بڑی عجیب بات ہے' یہاں تو ہر سانس' جو آ گیا ماضی ہوا' جو آنے والا ہے وہ مستقبل ہوا۔ ٹائم کے سلسلہ میں اس دور کی یہ ایک عجیب فلاسفی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹائم کا موجودہ تصور ہی غلط ہے۔ زندگی میں زمانہ حال Present کچھ زیادہ صحیح نہیں ہوتا۔ ٹائم یا تو ماضی Past ہوتا ہے یا مستقبل Future اور یہ جو زمان کی Definition دی ہے' میرا خیال ہے برگسان نے اس کی ابتداء کی تھی کہ جو Present ہے' جسے آپ حال کہتے ہیں:

this is the Future of the past- and past of the Future

قرآن نے کہا ہے: لَہٗ مَابَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا (19:64) جو تمہارا ماضی تھا اور جو تمہارا مستقبل ہے اور وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ

(19:64) اور جوان کے درمیان ہے‘ اسے اس نے حال نہیں کہا‘ وہ پورا زمان لے کے آ گیا۔ پھر کہا: وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (19:64)۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ بھول جائے۔ وہ بھولنے والا نہیں ہے‘ وہ تو بہت یاد رکھنے والا ہے اور پھر تم ہی صرف اس کے ہاں نہیں ہو‘ وہاں تو اور بھی بہت کچھ ہے۔ کہا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (19:65)۔ وہ تمہاری ہی ربوبیت کا ذمہ دار نہیں۔ وہ تو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے‘ ان سب کا نشوونما دینے والا ہے۔

ارض سماوات کی حقیقت

قرآن تو کائنات کی پستیاں اور بلندیاں اور ''مَا بَيْنَهُمَا'' جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے‘ ان کا ایک صحیح تصور دیتا ہے۔ یہاں ارض تو سما کی پستی ہوگئی اور کرہ بلندی میں ہوگیا۔ یہ جو ارض اور سما کے درمیان ہے‘ وہ بھی تو کچھ ہے۔ یہ جو ''مابین'' ہے‘ اس کے متعلق تو اب تحقیق شروع ہو رہی ہے کہ یہ کیا عظیم چیزیں ہیں۔ قرآن حکیم نے تو چودہ سو سال پیشتر جو چیزیں سماوات و ارض میں ہیں‘ انہیں مَا بَيْنَهُمَا کہا ہوا ہے۔ اور پھر ارض و سما کو بھی متعین طور پہ کوئی کرے (Spheres) نہیں کہا کہ یہ زمین اور وہ آسمان۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی‘ خاص طور پر علم الافلاک تو تھا ہی قیاسات کے اوپر۔ بطلموسی نظام کے اندر آپ دیکھیے کہ یہ جو اتنا بڑا‘ سب سے بڑا‘ نظام الافلاک ہے اس میں وہ زمین کو ساکن مانتا ہے اور سورج کو اس کے گرد گھومتا ہوا بتا رہا ہے۔ اس دور کے اندر اندازہ لگائیے کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ جسے تم یہ سماوات و ارض کہتے ہو‘ تو اس میں ارض کے معنی ہوتا ہے ''نیچے کی چیز'' اور سما ہوتا ہے ''اوپر کی چیز'' کہا کہ یہ کوئی ایسے نہیں کہ اتنے سما ہوں اور اتنے ارض ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر سما کا ایک ارض ہوتا ہے‘ ہر بلندی جو ہے اس کی نسبت سے نیچے کی پستی ہوتی ہے۔ اس پستی والے کی‘ جو نیچے ہے‘ وہ اس کی ارض ہوتی ہے۔ کہا: جتنے سما ہیں اتنی ہی ارضیں ہیں۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین کا تو اس بات سے اندازہ لگائیے کہ پہلے تو دنیا کا ہی اندازہ لگائیے کہ علمی اعتبار سے ساری دنیا کہاں تھی۔ یہ یونان کے بطلموسی نظام والے اس زمانے میں علمی لحاظ سے سب سے اونچے تھے۔ ان کی تو یہ صورت کہ زمین کو ساکن پائیں اور سورج کو اس کے گرد گھومتا ہوا پائیں اور ان میں عرب کہ جہاں مکہ جیسے شہر کے اندر‘ کہتے ہیں کہ صرف نوشت وخواند‘ لکھنا پڑھنا‘ کوئی سترہ آدمی جانتے تھے وہ بھی تعلیم یافتہ نہیں تھے‘ اس کے اندر بھی وہ ''امی'' اتنا بھی نہیں جانتا اور اس کی زبان مبارک سے یہ الفاظ آ رہے ہیں کہ یہ جن کو تم ''کرے'' کہہ رہے ہو اور جنہیں ارض کہہ رہے ہو‘ جنہیں اجرامِ فلکی کہہ رہے ہو‘ اور یہ گن رہے ہو کہ یہ سات آسمان ہیں‘ یہ غلط ہے۔ یہ تو آپس میں Relative چیزیں ہیں۔ حقیقت میں اضافی چیزیں ہیں۔ ہر سما کی ایک ارض ہے اور ہر ارض کا ایک سما ہے۔ عزیزانِ من! یہ کہنا تو ایک طرف کوئی بڑے سے بڑے فلاسفر کا ذہن اس بات کو اس دور کے اندر بھی سوچ سکتا تھا؟ پھر اس دور میں یہ کہنا کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (19:65)۔ ارض و سما اور جو کچھ اس کے درمیان ہے۔ وہ ان سب کے نشوونما کی ذمہ داری لینے والا ہے۔

اجرامِ فلکی میں جاندار مخلوق کا باہمی ملاپ

عزیزانِ من! اس دور میں یہ بات کہنا کہ یاد رکھو! یہ کرے جو تمہیں یونہی گولے گولے سے نظر آ رہے ہیں' یہ دراصل گولے گولے کی بات نہیں ہے۔ ان کے اندر بھی بعض وہ ہیں جن کے اندر جاندار مخلوق بستی ہے (42:29)۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ تمہارا خدا اس پہ قادر ہے کہ ایک دن ان بستیوں کو آپس میں ملا دے: وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29)۔ چودہ سو سال پیشتر یہ کہنا کہ ان اجرام کے اندر بھی وہ ہیں جن میں جاندار مخلوق ہے' متعین نہیں کیا کہ یہ جاندار مخلوق کس قسم کی ہے' جاندار مخلوق ہے اور اتنا ہی نہیں کہ اس کے اندر ہے' ٹھیک ہے بھئی! شاید ہوگی کیا پتہ ہے! کہا کہ ہم اس پہ قادر ہیں کہ ایک دن ہم ان مخلوقات کو آپس میں ملا بھی دیں۔ ان کا Contact ہو جائے، عزیزانِ من! آج دور شروع ہو گیا۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (19:65)۔ کہا: یہ ہے اس کی ارض وسما اور جو کچھ ان کے درمیان کی ہے ۔ ربوبیت کی کیفیت! لہٰذا فَاعْبُدْهُ (19:65) محکومیت صرف اسی کے قوانین کی اختیار کرو۔ صرف ''فاعبدو'' وہی ہے۔ وہ ساتھ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں' استقامت اختیار کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہاں استقامت کہا تھا۔ پھر کہا: فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (19:65)۔ صرف اسی کے قوانین کی محکومیت اختیار کر اور اس پر ثبات اور استقامت سے جما رہ۔ یعنی جم کے کھڑا ہو جا' پھر اس کی عبادت کر۔ یہاں' لفظ تو عبادۃ ہے۔ جم کے کھڑے ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟ یہ اگر نماز ہی ہے' اگر' نوافل ہی ہیں' اگر تسبیحیں ہی ہیں' میں یہ اپنے ہاں کے تصور مروجہ سے کہہ رہا ہوں' اس سے تو آپ کو یہاں کوئی بھی نہیں روکتا۔ ہندو کی محکومیت میں بھی کوئی نہیں روکتا۔ روکنے کا تو سوال ہی نہیں۔ حکومت نے اس چیز پہ آزادی دی تھی۔ یہ بات کہ ''اس کی عبادت جم کے کھڑا ہو جا'' میں وہی بات آ گئی جو میں نے استقامت میں کہی تھی کہ صرف اسی کے قوانین کو تھام رکھو' کسی اور کے قوانین کی محکومیت مت اختیار کرو۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (19:65)۔ کیا تمہارے علم میں کوئی اور بھی ایسی قوت ہے جو اس جیسی نظیر کی مالک ہو جو اس جیسی ہو؟' اس کی اور بات کو تو چھوڑ دیجیے صرف رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہی لے لیجئے' ہے کوئی اور اس کا ہم سر! نہیں' قطعاً نہیں۔ اس کا مثیل و نظیر کوئی نہیں۔

انسانیت کی سطحِ زندگی کا ارتقاء

عزیزانِ من! اس کے بعد اگلی چیز جو یہ کہتا چلا جا رہا ہے کہ اگر تصور یہی ہے کہ یہی زندگی ہے' یہیں کا کھانا پینا ہے' مقصدِ حیات زندہ رہنا اور پھر مر جانا ہے' جسے قرآن نے کفر کہا ہے' اس سلسلے میں کہا: اس سے تو تم انسانیت کی سطح کے اوپر آ ہی نہیں سکتے۔ ہر گدھے گھوڑے کی بھی یہی کیفیت ہے۔ پیدا ہوا' زندہ رہا' سامانِ زیست سے متمتع ہوا' سانس لی' زندگی بھر یہ کچھ کیا اور اس کے بعد طبعی قوانین کے مطابق موت واقع ہو گئی' معاملہ ختم ہو گیا۔ اگر یہی کیفیت انسان کی بھی ہے تو پھر یہ اپنے آپ کو انسان کیوں کہتا ہے؟ یہ حیوان کی زندگی ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَ اِذَا مَامِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا (19:66) ذرا اس پر غور کرو کہ قانونِ مکافات سے جی چرانے والا انسان یہ کہتا ہے کہ کیا جب مر جائیں گے تو پھر ہمیں دوبارہ زندگی ملے گی؟ ٹھیک ہے' اس کے تصور کے مطابق تو یہ ناممکن ہے۔ اس لیے کہ یہ خود کسی شے کو زندگی دے ہی نہیں سکا۔ زندگی عطا ہونے کا تصور تو ذہن میں نہیں آ رہا۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ جب موت واقع ہو جائے تو پھر اس کے بعد زندگی چہ معنی دارد؟

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے اس موضوع پہ اتنا کچھ کہا ہوا ہے کہ مجھے تو پتہ نہیں کہ اگر میں اسی موضوع کو لوں' حیات بعد الممات جو ہے' یہ جو طبعی موت ہے' یہ جو اس موت کے بعد زندگی ہے تو مجھے اس پر مہینوں لگ جائیں' لیکن یہاں تو قرآن ایک ایسی دلیل دیتا ہے جو وہ ہر ذہن کی ہر سطح کو اپیل کر جانے والی چیز ہے۔ وہ اسے پیش پا افتادہ کہتا ہے۔ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ (19:67)۔ کیا انسان کو یہ یاد نہیں ہے؟ کیا انداز ہے کہنے کا! ایسی بات کہ جو کبھی بھی نہ بھولا ہوا ہو' اس کے لیے یونان کے کسی فلاسفر کی ضرورت نہیں۔ الانسان ہی کہا ہے۔ پوچھا ہے کہ کیا اسے یاد نہیں کہ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (19:67)۔ ہم اسے' اس سے قبل پیدا کر چکے ہیں۔ درآنحالیکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یعنی اس سے پہلے جب اسے پیدا کیا تو وہ اس سے پہلے تھا ہی نہیں۔ ''کی خیال اے تہاڈا؟ یاد اے گل کہ نئیں' گل او پوچھی جیہڑی کسے نوں پہلے کئی نئیں ہیگی۔'' ❶ ٹھیک ہے' یہی تمہارے نزدیک محال یا ناممکن تھا' جسے تم تصور کہتے تھے کہ جب کسی میں زندگی نہیں ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے تو وہ زندہ کیسے ہو؟ کہا: سرکار کچھ نہ ہو' جذب مردہ تو ہے۔

دہقان سے لے کر نیوٹن تک کیلیے اعترافِ حقیقت

یہ وہ مقام ہے جہاں عزیزانِ من! ایک دہقان بھی وہیں کھڑا ہے' جہاں نیوٹن کھڑا ہے کہ زندگی کی ابتداء کہاں سے ہوگئی۔ کیسے ہوگئی؟ Nothingness سے' جب کچھ بھی موجود نہیں تھا' اس سے کوئی کس طرح ہوگیا؟ عزیزانِ من! آج کا بڑے سے بڑا فلاسفر اس مقام کے اوپر آ کے انگشت بدنداں کھڑا ہے۔ اور پھر Limitations of Science کے مصنف ❷ کو کہنا پڑا ہے کہ زندگی کی ابتداء کے متعلق تو آخری لفظ آخری انسان پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ سائنسدان بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔ یہ ہے دلیل! ایک عام انسان بھی یہ بات کہے گا کہ صاحب! بات تو ٹھیک ہے کہ نہیں تھا' پیدا ہوا۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ آج اس دور میں بلند ترین سطح کے اوپر جو آپ کے سائنسدان اور فلاسفر کھڑے ہیں' وہ بھی یہ بات کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ بات تو ہم یونہی نہیں کہہ سکتے کہ انسان جب کچھ نہ تھا تو پھر کیسے ہوگیا؟ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (19:9)۔ تیرے پروردگار کا ارشاد ہے کہ ہمارے قانون کی رو سے یہ مستبعد نہیں ہے۔ وہ قانون اس سے پہلے تجھے پیدا کر چکا ہے حالانکہ تیری ہستی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ کیا وہ زمانہ بھی نہیں تھا کہ کوئی شے موجود ہی نہیں تھی؟ بلکہ یہاں تو کہا: لَمْ تَكُ شَيْئًا (19:9)۔ تم کچھ شے ہی نہیں تھے۔ تم تھے ہی نہیں

---

❶ کیا خیال ہے آپ کا؟ بات وہ دریافت کی جو کسی نے کبھی پوچھی ہی نہیں۔

❷ Prof. W. N. Sullivan

کچھ شئے' تم Nothingness تھے۔ تو اگر اس کا تمہیں اعتراف ہے تو پھر یہ کونسی بات وجہ تعجب ہے یا تم اسے ناممکنات میں تصور کرتے ہو کہ موت کے بعد زندگی دے دی جائے۔ موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اس لیے اس فریب میں مبتلا نہ ہو کہ اب تو آرام سے گزرتی ہے' موت کے بعد زندگی کا امکان نہیں ہے۔ لہٰذا اس فریب میں مبتلا نہ ہو۔ یہاں اب اور کب کا سوال نہیں ہے۔ زندگی موت سے ختم نہیں ہوتی۔

زندگی کا خاتمہ موت سے نہیں ہوتا

زندگی تو مسلسل ایک عمل کا نام ہے۔ موت اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ موت تو ایک منزل سے دوسری منزل میں داخل ہونے کا نام ہے اور پھر ایک اور نیا دروازہ کھلتا ہے جہاں انسان کو جانا ہے اور پھر وہ جو چیز تھی کہ **لَہٗ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَیۡنَ ذٰلِکَ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا** (19:64) جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہم نے پیچھے چھوڑا ہے۔ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ یعنی ماضی حال اور مستقبل میں جو کچھ تم نے کیا ہے' سب نوشتہ خداوندی میں محفوظ ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی فروگزاشت کا امکان نہیں۔ تمہاری زندگی کا ہر ارادہ' ہر خواہش' ہر عمل' محفوظ ہے' بھولا ہوا نہیں ہے۔ یہ مرنے کے بعد نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہی نہیں ہونگے تو تمہارا یا درکھا ہوا کس کام آئے گا۔ پڑھتے پھرو' یہاں وہ اشتہاری مجرم مفرور ہو جاتا ہے۔ وہ تو یہاں سے حد پار جانے کے بعد کہتا ہے کہ لو پکڑ لو اور اگر کہیں وہ کوئی دس چودہ برس کے بعد آتا ہے تو وہ یہ پوچھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جو ریکارڈ تھا' وہ جلا دیا تھا' تلف ہو گیا۔ چلو موج ہو گئی۔ مگر یہاں قرآن کہتا ہے یہاں سب کچھ محفوظ ہے۔ **وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا** (19:64) وہ بھولتا نہیں ہے اور تم مر کے اس کے احاطۂ عدالت سے کہیں باہر نہیں جا سکتے' تم اشتہاری مجرم ہو' تمہاری گرفت ہوگی' اس کی عدالت میں آنا ہوگا' تمہارا ریکارڈ بھی محفوظ ہوگا' اس واسطے یہ کہنا کہ صاحب! موت سے چھٹکارا ہو جائے گا' بےکار ہے۔ چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ اور اگلی آیت میں پھر بتا دیا: **فَوَرَبِّکَ لَنَحۡشُرَنَّہُمۡ وَالشَّیٰطِیۡنَ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّہُمۡ حَوۡلَ جَہَنَّمَ جِثِیًّا** (19:68)۔ ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ہم انہیں' اور ان کے باغی سرغنوں کو گھیر کر (جنگ کے میدانوں میں) اکٹھا کریں گے اور انہیں گھٹنوں کے بل جھکائے ہوئے' ذلت وخواری کے جہنم کے گرد لا کھڑا کریں گے تو گویا بمعہ ریکارڈ کے جی بلائے جاؤ گے' حاضر کیے جاؤ گے اور وہاں پھر دیکھو گے کہ کس طرح سے نتائج تمہارے سامنے آتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ مریم کی آیت 67 تک ہم آ گئے۔ اس کے بعد آیت 68 کی تشریح وتبعین سے شروع کر کے اگلی آیات آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀......❀

بیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 68 تا 75)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ
اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ
كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ
اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا
قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا
مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1976 کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 68 سے ہوتا ہے: (19:68)۔

مستقل اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے اقتدار اور دولت کے حصول کا نتیجہ

سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ وہ لوگ جو کسی قاعدے اور قانون پہ، قرآنِ کریم کی مستقل اقدار پہ، اخلاقی پابندیوں پہ، پابند ہونا نہیں چاہتے، من مانیاں کرنا چاہتے ہیں، دنیا حاصل کر لیتے ہیں، اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے بعد جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارے جتنے اس قسم کے بداعمال ہیں، ان کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہے، اس لیے تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ ہم کسی کی گرفت میں نہ آئیں، اگر کسی طرح سے گرفت میں آ بھی جائیں تو اس کے بعد چھوٹ جائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمیں کون پکڑ سکتا ہے۔ لہٰذا انہیں کہا کہ اس زندگی کے اندر تو یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایسا انتظام کر لو اور صاحبِ اقتدار ایسا انتظام کر بھی لیتے ہیں۔ وہ تو اُس کے لیے کوئی نہ کوئی ایک قانون یا عقیدہ بنا دیتے ہیں۔ ہر صاحبِ اقتدار جو ان پابندیوں سے گریز کرتا ہے وہ اپنی زبانِ حال سے یہی کہتا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ کہاں اسکی گرفت اور کہاں کی یہ سرشت! ہمارے اعمال کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ ان سے کہا کہ سنو: زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی آگے بھی چلتی ہے اور یہاں کے کچھ اس قسم کے تمہارے انتظامات اور تدابیر وہاں کارگر نہیں ہو سکتیں۔

اعمال کا ایک ایک ذرہ حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانتیں، وہ بھی اپنے نتائج سامنے لا کر رہیں گی اور وہاں سے کسی طرح بھی مفر اور Escape نہیں ہو سکے گا۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہ کہہ رہے ہو کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے سامنے مرتا ہے، قبر میں دفن کر دیتے ہیں، جلا دیتے ہیں، دریا میں پھینک دیتے ہیں، قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہاں لمبی چوڑی بحث نہیں کی اگرچہ اس سوال کے متعلق اس نے متعدد مقامات پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور جب وہ مقام آئیں گے تو میں یہ عرض کرونگا کہ موت کے بعد کی یہ زندگی کس طرح علم وبصیرت پر مبنی ہے لیکن یہاں تو قرآن نے اتنا ہی کہا کہ تم یہی کہتے ہو کہ انسان مر جاتا ہے، مردہ ہو جاتا ہے، لاش یا میت تلف ہو جاتی ہے اور پھر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا؟ خدائے حکیم نے کہا کہ کبھی تم اس پہ غور کرو کہ خود تمہارا وجود کیسے زندگی میں آ گیا؟ تم کیسے پیدا ہو گئے جب کہ اس سے پیشتر کوئی شے موجود ہی نہیں تھی؟ تم تو ایک طرف رہے، یہ اتنی بڑی عظیم کائنات کے وجود میں آ گئی جبکہ اس سے پہلے کوئی شے موجود نہیں تھی؟ کہا کہ وہ خدا جو اس کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے اور بغیر کسی قسم کے پہلے سے تیار شدہ میٹریل کے اس کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے تو کیا اس کے لیے مشکل ہے کہ تمہیں دوبارہ زندہ کر دے؟ بڑی محکم دلیل ہے۔

آخری مقام پر جب علت ومعلول کی کڑیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں تو پھر؟

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ اسے بہترین سائنسدان (Scientist) ہی Appreciate کر سکتا ہے کیونکہ اتنی بڑی تحقیقات اور کاوشوں کے باوجود جب وہ Effect اور Cause یا علت ومعلول کی کڑیوں کو پیچھے چلاتے چلاتے آخر میں اس مقام پہ پہنچتا ہے کہ اس کائنات کی ابتداء کیسے ہوگئی تو جیسا میں نے کہا تھا کہ بڑے سے بڑا Scientist بھی یہاں پہنچ کر یہ کہتا ہے کہ یہ وہ معمہ ہے جس کا کوئی حل ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اُن کے الفاظ میں کہ کائنات کی ابتداء کے متعلق حرفِ آخر تو آخری انسان پہ چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ اتنی محکم دلیل ہے جو قرآن نے دے دی ہے۔ وہ سائنسدان اس چیز کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ وجود میں تو آ گئی اور یہ ہمارے سامنے ہے لیکن یہ کیسے ہو گیا؟ اس کا جواب کوئی انسان نہیں دے سکتا۔ کہا کہ جب تمہارے اعترافِ عجز کی یہ کیفیت ہے، اس کے متعلق تم خود کہتے ہو کہ کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا کہ یہ کیسے وجود میں آ گئی لہٰذا تمہارا یہ اعتراض کہ صاحب! مرنے کے بعد کس طرح سے انسان زندہ ہو جائے گا تو یہ بات خود تمہارے اس عجز اعتراف کی شہادت ہے۔ یہ ہے اصولی دلیل جو قرآن نے دی۔ اس کے بعد کہا کہ یاد رکھو! تم کہیں بھاگ کے نہیں جا سکتے، ہماری مملکت کا دائرہ کچھ ایسا تنگ نہیں ہے کہ تم وہاں سے نکل جاؤ اور جھٹ سے کہیں سرحد پار کر کے کہہ دو کہ صاحب! ہم آزاد قبائل میں چلے گئے ہیں تو آؤ، کر لو، دیکھ لو، ہمارا کیا کرتے ہو۔ کہا: تم کہیں نہیں جا سکتے، تم تو اس لسٹ کے اندر آؤ گے جو ہماری گرفت میں ہوگی۔

آخر کار سرکشی کرنے والوں کو گھیر گھیر کر' کھینچ کھینچ کر' چھانٹ چھانٹ کر' نکال لیا جائے گا

اس گرفت کے لیے کہا: فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّاo ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (19:68-69)۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم انہیں اور ان کے باغی سرغنوں کو گھیر کر اکٹھا کریں گے اور انہیں گھٹنوں کے بل جھکائے ہوئے ذلت وخواری کے جہنم کے گرد لا کھڑا کریں گے۔ پھر ان کی مختلف پارٹیوں کے سرغنوں (Ring Leaders) کو' جو خدائے رحمان کے نظام کی مخالفت میں سب سے زیادہ متشدد تھے' باقیوں سے الگ کر لیا جائے گا۔ یہاں عجیب انداز میں گفتگو کی گئی ہے کہ ہم یقیناً تمہیں اور تمہارے ان بڑے بڑے دیگر سرغنوں کو جن کو بڑے بڑے شیاطین یا سرغنہ کہا جاتا ہے' انہیں مکافاتِ عمل کے زور سے گھیر گھیر کر اکٹھا کر کے تباہیوں کے جہنم کے کنارے کے اوپر لا کھڑا کریں گے۔ چنانچہ پہلے تو یہ کہا کہ ان کے سب سرغنوں کو گھیر کے اکٹھا کر لیا جائے گا۔ پھر کہا کہ ان میں سے چنا جائے گا کہ وہ بڑے بڑے لیڈر اور سرغنے کونسے ہیں جو ان لوگوں کی تباہی کا باعث بنے تھے' انہیں ان میں سے کھینچ کھینچ کے نکال لیا جائے گا۔ قرآن کے عجیب عجیب الفاظ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ ان کو اشارہ کیا جائے گا کہ ''یہ آئے اور پھر وہ آئے۔'' ان میں سے انہیں اس طرح سے چھانٹ چھانٹ کے نکالا جائے گا کہ ان میں سے کون کون سب سے زیادہ سرکش تھا؟ یہ سب گھیر گھیر' کھینچ کھینچ' اور چھانٹ چھانٹ کر اس لیے تھا کہ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا (19:70)۔ ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے وہ کون ہیں جو سب سے زیادہ اس بات کے مستحق ہیں جنہیں جہنم میں جھونکا جائے۔

زندگی کے اس مرحلہ پر آئندہ زندگی کی شکل وصورت اور ہیئت وطبائع کو کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا

میں متعدد بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو آخرت کی زندگی ہے اسے بہرحال اس دنیا میں مثالوں کے ذریعے' استعارات کے ذریعے' ہی سمجھایا جا سکتا ہے۔ آج وہ زندگی تو ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہمارا آج کا شعور اور ادراک اسے اپنے احاطے میں لا ہی نہیں سکتا کہ وہ زندگی کس قسم کی ہوگی۔ ایمان ہمارا یہی ہے کہ وہ زندگی ہے اور ہر عمل کا نتیجہ وہاں سامنے آ کر رہے گا۔ وہاں اس کی شکل وصورت ہیئت و طبائع کیسی ہوگی یہ آج ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن کریم نے ان باتوں کو مثالوں کے ذریعے کہا ہے۔ سمجھایا ہے۔ اس لیے اسے ذہن میں رکھیے۔

ہر دو فریقین کے لیے سزا

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم متعدد مقامات میں جہنم کا تذکرہ کرتے ہوئے' کئی ایک چیزوں کو بڑے ہی عبرت انگیز انداز میں پیش کرتا ہے۔ لہٰذا یہ مقامات بڑے ہی غور طلب ہیں اور مختصراً ہیں۔ اِن میں بات یہی ہے کہ وہ صالح اور متبعینِ ناصح یہ کہیں گے کہ

''ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا''۔ وہ کہیں گے کہ ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تھے کمبخت جنہوں نے ہمیں بھی بھڑکایا اور تباہ کر دیا۔ انہیں دوہری سزا دیجیے۔ استحقار کے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ٹھیک ہے انہوں نے تمہیں بہکایا ہم تو صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ انہیں اتنے بڑے بڑے گرگ کس نے بنایا تھا؟

انہیں تو '' تم '' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

''جناب'' ہم نے بنایا ''حضور'' ہم نے کیا

پوچھا جائے گا کہ ان کی اپنی طاقت کیا تھی؟ یہ جو انہیں اتنا بڑا اقتدار حاصل ہو گیا' جس کا یہ آج اتنا رونا روتے ہیں تمہارا ہی تو دیا ہوا تھا۔ اگر تم ان کے دستِ بازو نہ بنتے' اگر تم ان کے لیے باعثِ تقویت نہ بنتے تو انہیں کون پوچھتا۔ اور اگر عصرِ حاضر کی اصطلاح میں پوچھتے ہو تو یوں کہا جائے گا کہ اگر تم انہیں ووٹ نہ دیتے تو انہیں پوچھتا کون تھا۔ بنیاد تو تم ہو۔ انہوں نے کہا کہ انہیں دوہری سزا دیجیے۔ قرآن نے کہا: انہیں ہی دوہری سزا کیوں؟ تمہیں بھی دوہری سزا ہے۔ وہ اس لیے کہ تم ان کے اسقدر زہریلے ہونے کے موجب بنے۔ عجیب چیزیں ہیں جو قرآن کہہ جاتا ہے عزیزانِ من! کوئی فرعون بھی' جو باقی ہزاروں انسانوں کے اوپر اقتدار اور غلبہ حاصل کر لیتا ہے' ماں کے پیٹ سے قوت لے کے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کچھ انہی انسانوں کا دیا ہوا ہوتا ہے۔

کوئی سچا آدمی کسی جھوٹے کو اپنا نمائندہ نہیں بناتا

اب یہاں اس چیز کے لیے کہ صاحب! ہم تو کمزور تھے' قرآن کہتا ہے کہ ''تم کمزور تھے'' مگر تمہاری دی ہوئی قوتوں سے وہ اس قدر طاقتور بن گئے۔ تم کہتے ہو کہ ہم کمزور تھے' تم سے زندگی تو چھینی نہیں جاتی تھی۔ لہٰذا دوہرا عذاب دونوں کے لیے ہے۔ یہ ہیں وہ شیاطین جن کا یہاں ذکر آیا ہے (19:68)۔ کہا: انہیں ہم جانتے ہیں۔ میں نے یہ پہلے بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے۔ اب ہر بار تو ایک درس میں یہ بات آتی ہے کہ یہ جہنم اور جنت مرنے کے بعد کی زندگی میں برحق ہے۔ اس پہ ہمارا ایمان ہے لیکن یہ وہیں کے لیے محصور اور مقید نہیں ہے۔ جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جس عذاب کا ذکر یا جس مکالمے کا ذکر قرآن جہنم میں کر رہا ہے تو کیا یہاں ہم جہنم میں نہیں ہیں؟ کیا صبح و شام ہم یہی باتیں نہیں کرتے؟ اور اگر آج کی اصطلاح میں پوچھتے ہو تو آج ان کو اپنا نمائندہ کہتے ہو۔ اپنا نمائندہ! تو ٹھیک ہے جیسے تم ہو' اسی قسم کا تمہارا نمائندہ ہوگا۔ سوچنے کی بات ہے کہ کوئی سچا آدمی کسی جھوٹے کو کہہ سکتا ہے کہ یہ میرا نمائندہ ہے کیونکہ وہ تو جو بات کہے گا میری سمجھی جائے گی۔ لہٰذا وہ تو کہے گا کہ نہیں صاحب! اس کے ساتھ میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ تو صبح سے شام تک جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی بات میری بات کیوں مانی جائے۔ تم اسے نمائندہ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ تو جب تم یہ کہتے ہو کہ یہ ہمارے نمائندہ ہیں تو پھر ان کے خلاف یہ کیوں کہتے ہو کہ انہیں دوہری سزا دی جائے۔ جیسے تم ہوتے ہو' ویسے ہی تمہارے نمائندہ ہوتے ہیں۔

دراصل زندگی کے یہ حقائق موجودہ انسانی معاشرے کے متعلق بھی ہیں

یہ جو چیزیں ہیں، یہ ہم نے صرف آخرت پر اٹھا رکھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کی زندگی میں کھڑے ہو کے ہم کبھی نہیں سوچتے کہ ہم جہنم میں ہیں۔ یہ جہنم کے اندر کے مکالمے یہاں کے مکالمے ہیں، جو سرِ شام ہم کرتے ہیں۔ یہاں تو جواب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ دراصل آج یہ جواب ہمیں مل رہا ہے کہ یہ تمہاری ہی دی ہوئی قوتیں تو ہیں جنہیں یہ تمہارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ تم شفاعت کس کی کرتے ہو؟ اور یہ بھی انہی فرعونوں کی پھیلائی ہوئی سازش تھی کہ جنہوں نے ذہن کو اس طرف پلٹا دیا کہ یہاں کی زندگی کے ساتھ اُن چیزوں کا تعلق نہیں ہے۔ یہ وہاں قیامت میں جاکے جہنم میں ہونگی۔ یہاں یہ باتیں نہ کرو۔ اور اسکے ساتھ انہوں نے سند مذہبی پیشوائیت کی دی اور انہوں نے پھر صبح وشام ان کو تھپکیاں دے دے کے سلانا شروع کر دیا کہ ٹھیک ہے اس دنیا کی یہ بات نہیں، قیامت میں جاکے ان کو ایسے ''چھیتر'' [1] پڑیں گے کہ یاد کریں گے۔ اس واسطے یہ باتیں یہاں نہ کرو ورنہ، جسے قیامت کہتے ہیں، وہاں جا کر اور کون سی باتیں کرو گے۔

ہمیں اپنی اس سوچ کا رخ بدلنا ہوگا

جہنم کے متعلق تصور یہ ہے کہ یہ کچھ اور لوگ ہیں، جن کی ہم ایسی باتیں کر رہے ہیں، جب کہ کتنی بار ہم یہ اپنی باتیں کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم جہنمی ہیں۔ یہ بڑی گہری سازش ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم میں جہنم کے متعلق اتنا سا باب جو ان Leaders اور Followers متبعین کے سلسلہ میں آیا ہے اگر صرف اس کے اتنے ہی حصے کو سامنے لے آیا جائے تو پھر یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ اِس مسئلے کو حل کر سکیں، یا نہ لیکن کم از کم یہ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم اس جہنم کے کس قدر ذمہ دار ہیں، یہاں تو بس بتایا ہی یہ جائے گا کہ ہاں صاحب! یہ وہاں جاکے یہ باتیں ہونگی۔ یہاں تو ہم اس جہنم کا کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ قرآن نے جو یہ چیزیں یہاں کہی ہیں وہ اس لیے کہی ہیں کہ بتا دیا جائے کہ یہیں وہ حق وباطل کی کشمکش ہو رہی تھی اور اس میں تصادمات ہو رہے تھے اور وہ بڑے بڑے اکابر وظالمین جن کی مفاد پرستیوں پر زد پڑ رہی تھی وہ اس کی مخالفت اس طرح سے کرتے تھے، انہی کو جب گھیر کے یہ میدانِ جنگ میں لے کے آئے ہیں تو اس کے بعد اس طرح ان کی کیفیت ہوئی۔ یہی ان کے شیاطین تھے، یہی ان کے سرغنہ تھے اور یہی وہ تباہیاں تھیں جن کے اندر انہیں گزرنا پڑا۔ حضور ﷺ سے پہلے وارننگ دی جاتی تھی کہ ایسا انجام ہو کے رہے گا اور وہ مذاق اڑاتے تھے کہ ملاحظہ فرماؤ:

ذرہ ناچیز وتعمیر بیابانے نگر

لو جی! ان کی ساری کائنات بے سروسامان کے عالم میں، یہاں تک کہ ان کا اپنا کوئی گھر بار بھی نہیں اور دعویٰ یہ ہو رہا ہے کہ ہم الٹ

---

[1] جوتے

کے رکھ دیں گے، تمہیں ہی نہیں، قیصر و کسریٰ کے استبداد کو بھی الٹ کے رکھ دیں گے۔ عزیزانِ من! انہیں معلوم تھا کہ مکافاتِ عمل یہیں سے شروع ہوتا ہے اور انہوں نے اس چیز کو بتایا کہ ظلم اور استبداد اور اس کے جو تباہ کن نتائج ہیں وہ اسی دنیا کے اندر سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا یہ چیزیں صرف وہیں کی نہیں ہیں۔

جہنم کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے مروجہ تراجم

میں نے یہ تمہیداً اس لیے عرض کیا ہے کہ آگے جو آیت آتی ہے اس کے غلط مفہوم نے جہنم کے متعلق ذکر کرتے ہوئے پتہ نہیں وہ بات کہاں سے کہاں پہنچا دی ہے: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (19:71)۔ اس آیت کا عام ترجمہ یہ کر دیا جاتا ہے: تم میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو جہنم میں وارد نہیں ہوگا، داخل نہیں ہوگا، اور وہ تمہارے خدا کا فیصلہ ہے۔ تو صاحب! اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (19:71)۔ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو جہنم میں نہیں جائے گا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا: ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (19:72)۔ پھر ان میں سے جو متقی ہوں گے انہیں وہاں سے نکال لیا جائے گا اور جو مجرمین ہوں گے انہیں وہیں رہنے دیا جائے گا۔ یعنی جہنم میں سب کو ڈالا جائے گا، پھر اس میں سے نکال لیا جائے گا۔

میں نے ابھی گزارش کی ہے کہ اگر اسلام کو سمجھنا ہے اور دین کو سمجھنا ہے تو پہلے جس قدر یہ Concepts ہیں، تصورات ہیں، جو ہم نے دوسروں کے ہاں سے مستعار لیے ہوئے ہیں، جب تک ہم ان سے کفر نہیں برتتے، کبھی بھی قرآن کے حقائق ہمارے ذہن میں، ہماری سمجھ میں، نہیں آ سکتے۔ غلطی تو انسان سے ہو ہی جاتی ہے بندہ بشر جو ہوا۔ تو ٹھیک ہے، قرآنِ کریم تو خود اس چیز کی شہادت دیتا ہے۔ وہ ان کے متعلق کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ جو گناہ کبیرہ ہیں، ان سے تو وہ ہمیشہ بچتے ہیں لیکن جو چھوٹی موٹی لغزشیں ہیں، یہ ہو ہی جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے تو اب اس کے متعلق پیشوائیت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سے، جو یہ کچھ غلطیاں، جنہیں یہ چھوٹے موٹے گناہ کہتے ہیں، ہو جاتی ہیں۔ ان کی سزا بھگتنے کے لیے سب کو جہنم میں بھیجا جائے، کسی کو تین مہینے کی، کسی کو چھ مہینے کی، کسی کو سال بھر کی، سزا ملے گی، وہ اپنی اپنی سزا بھگتیں گے پھر انہیں وہاں سے نکال نکال کے جنت میں بھیجا جائے گا۔ بعض نے کہا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کپڑوں پہ میل لگ جاتی ہے، کپڑوں پہ میل کچیل آ جاتی ہے، دھبے پڑ جاتے ہیں تو دھوبی ان کو بھٹی پہ چڑھاتا ہے۔ اس کے لیے کسی ایک بہت بڑے عالم فاضل کی مثال دی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ ایک ہی نہیں، ہمارے ہاں کے جو بڑے بڑے مفسر اور علماء ہیں ان کی مثالیں دی ہوئی ہیں: انہوں نے کہا کہ یہ جس طرح سے دھوبی کپڑوں کو بھٹی پہ چڑھاتا ہے اور وہاں ساری میل کچیل کٹ جاتی ہے، بالکل اسی طرح سے گناہوں کی میل کچیل کاٹنے کے لیے جہنم ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ جہنم یہ ہے۔ بعض نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ جہنم تو Sanitorium ہے، جیسے تپ دق (T.B) کے مریضوں کو وہاں رکھا جاتا ہے، ویسے ہی یہ کچھ وہاں جہنم میں ہوتا ہے۔ یعنی کچھ وقت کے

لیے جہنم میں لے جانا تا کہ گناہوں کی میل کچیل کٹ جائے اور پھر یہاں سے نکال کے جنت کی طرف لے جانا ہے۔ اسی طرح سے یہ دنیا بھی تو ایک جہنم ہے۔ آپ کے ہاں جہنم کا یہ ایسا متفقہ علیہ مسلمہ ہے کہ اس کی محض ہیئت تھوڑی سی بدل لو' جیل خانہ کہو یا Sanitorium کہو لیکن ہے یہی بات کہ ہر ایک کو وہاں بھیجا ضرور جائے گا اور پھر وہاں سے نکال کے دوسری طرف یعنی جنت میں لے جائیں گے اور جب اُن سے یہ چیز کہیں کہ صاحب! قرآن تو کچھ اور کہتا ہے۔ وہاں اہل جہنم کے لیے ہے کہ وہ تو خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (72:23)۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اسی طرح جنتیوں کے لیے ہے۔ (64:9) قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ تو ابدی طور پہ وہاں رہیں گے تو یہ کچھ کہنے والوں کا دل سہم جاتا ہے تو پھر یہ لوگ اس کے خلاف اتنے دلائل دیتے ہیں کہ صاحب! الحفیظ والامان! کہتے ہیں کہ صاحب! آپ سوچیے کہ یہ چیز خدا کے شایانِ شان ہے کہ وہ بندے کو جہنم میں بھیج دے اور پھر وہ ابدی طور پہ جہنم میں ہی رکھے اور پھر ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ صاحب! اگر کسی نے تھوڑا چھوٹا سا جرم کیا ہوا ہو تو وہ بھی ابدی طور پہ رہے' جنہوں نے بہت بڑے جرم کیے ہیں' وہ بھی ابدی طور پہ رہیں تو یہ کس قسم کی عدالت ہوئی؟ یہ کس قسم کا انصاف ہوا؟ یعنی پہلے اپنے ہی ذہن سے اسے جیل خانہ تصور کیا اور جب جیل خانہ کہا تو سزا کی میعاد مقرر کی کہ اس جرم کی اتنی سزا ہوگی' پھر کہا کہ صاحب! وہاں سے نکلنا تو ضرور چاہیے۔ یہ کیا ہے کہ ''ہتھاں دیاں دتیاں ہویاں' منداں نال کھولن آ لی گل ہیگی''[1] آپ استدلال ملاحظہ کیجیے۔

بنی اسرائیل کے نزدیک جہنم اور جنت کا تصور

پہلے تو یہ لوگ' مذہبی پیشوا خود ہی غیر کی جانب سے وہ تصورات لائے۔ پھر ان کے تحت جہنم کا تصور مستعار لیا اور جب اس میں بندوں کو ڈال دیا تو انہوں نے اس جہنم سے نکلنے کے لیے پہلے ہی یہ رعایت رکھ لی۔ عزیزانِ من! دراصل یہ تصور یہودیوں کے ہاں سے آیا تھا اور قرآن حکیم نے بھی ان کا یہ تصور نقل کیا ہوا ہے کہ انہیں ہم تھوڑے دنوں کے لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے اور پھر اس کے بعد نکال لیں گے۔ ارے بھئی! کیا یہ تھوڑے دنوں کے لیے تم نے معصیت کی تھی یا تھوڑے دنوں قانون کی خلاف ورزی کی تھی تو وہ اس گناہ کے بدلے میں جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے؟ کہنے لگے: نہیں' یہ سارے جتنے بھی بنی اسرائیل ہیں ان سب کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ چند دن کی بات ہوگی تو اتنا چھوٹا سا تو جرم تھا۔ ان کے ہاں بھی جہنم کے مختلف گروہ ہیں' ایک تو یہ ہے جو کہے گا کہ وہ مجرم تھے جس کی وجہ سے وہ اتنے دنوں کے لیے جہنم جائیں گے' یعنی انہیں Term of Imprisonment ہی اتنی سی ہوگی اور دوسرے وہ ہیں جو کہیں گے کہ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ اتنے میں ہمارے نبی اکرم ﷺ جو سفارش کرنیوالے ہیں وہ اس دوران میں سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک اللہ میاں امت کے تمام افراد کو جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں بھیجے گا' حضور ﷺ سجدے سے سر اٹھائیں گے' نہ خود جنت

---

[1] یہ تو ہاتھوں سے دی ہوئی گانٹھوں کے منہ سے کھولنے والی بات ہوئی۔

میں جائیں گے تو گویا یہ تو وہی ہے جیسے اللہ میاں کے ساتھ کچھ اور طور طریق ہے مگر دیکھنے کے لیے کچھ اور وتیرہ ہے اور انہیں پتہ نہیں چلا کہ حساب کتاب کے بعد وہ جہنم میں چلے گئے۔ دیکھو تو سہی وہ بنی اسرائیل کو جہنم میں اس نے پکڑ کے ڈال دیا تو وہ جلدی سے آئیں گے اور وہ ہمیں نکال کے لے جائیں گے۔ یہی کام عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ نے کر دیا۔ اور پھر یہ بھی کہ یہ وہاں جیل خانے کے داروغے سے کہیں گے کہ غلطی ''نال''،❶ یہ یہاں داخل کر دیئے گئے جب کہ ''ایہہ تے بنی اسرائیل ہیگے''❷ لہٰذا وہ وہاں سے نکال لیے جائیں گے۔

عزیزانِ من! عقیدہ ملاحظہ فرماؤ کہ جہنم میں ڈالنا ضرور ہے حالانکہ ان یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ''جنت میں ہمارے سوا کوئی اور جا ہی نہیں سکتا اور ہم تو جائیں گے کیونکہ ہم اس کی اولاد ہیں''۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں ان کے دعویٰ کے الفاظ یہ ہیں: **وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ** (5:18)۔ ان یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ ہم خدا کے محبوب اور اس کی چہیتی اولاد ہیں۔

ہمارے ہاں اس قسم کے عقائد تو نہیں ہیں لیکن بنیادی تصورات ہم یہیں سے ہی لائے ہیں اور وہاں لانے کے بعد جب یہ دیکھا کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ **يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ** (5:18)۔ جو قوم بھی قوانین خداوندی کا اتباع کرے گی زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہے گی' جو ان کے خلاف چلے گی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ دونوں راستے کھلے ہیں جونسا راستہ جس کا جی چاہے اختیار کر لے۔ یہ اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے جس کی رو سے کائنات کا ایسا عظیم القدر سلسلہ اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کی ہے۔ اس کے تفسیر و تاویل کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ دیکھیے تفسیر و تاویل کی رو سے یہ سب کچھ ہم وہیں سے نکالتے ہیں اور عزیزانِ من! وہیں سے نکالتے جائیں گے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بنیادی تصور وہ خود یہودیوں سے مستعار لائے اور ان تصورات کی ہی یہ پیدا کردہ مشکلات ہیں کہ جن کا حل یہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ ملے کہاں سے؟ بنیاد ہی غلط ہے۔

جنت اور جہنم کا یہ تصور بنیادی طور پر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے

جنت اور جہنم کا یہ تصور ہی غلط ہے عزیزانِ من! قرآنی تصور تو مکافاتِ عمل کا ہے' قانونِ ارتقاء کا ہے اور میں تو یہ برسوں سے بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ قرآن بتا یہ رہا ہے کہ زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ یہ قانونِ ارتقا ہے کہ کوئی نوع جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے یا اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتی ہے' وہ زندہ رہتی ہے' وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ جس نوع میں وہ صلاحیت نہیں رہتی' وہ وہیں کی وہیں رک جاتی ہے۔ اور بار بار یہ عمل نہیں ہوتا کہ اس سال امتحان میں فیل ہوا تو سپلمنٹری میں اپنی کلاس کو Improve کر لے۔ یہاں قانونِ ارتقاء میں وہ صورت نہیں۔ اس کے لیے دوبارہ چانس نہیں ہے۔

---

❶ کی وجہ سے ❷ یہ تو بنی اسرائیل ہیں۔

پچھلی دفعہ بھی میں نے عرض کیا تھا کہ اس تصور کے ماتحت سوچیے تو زندگی اور اس کا ایک ایک سانس اتنا اہم اور قیمتی ہو جاتا ہے کہ دوبارہ چانس نہیں ہے۔ وہی چانس ہے۔ لہٰذا اس اسٹیج میں انسان کو بھیجنے کے بعد یہ کہا کہ اگر اب تم نے آگے چلنا ہے تو آگے چلنے کے لیے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرلو۔ اگر پیدا کرلو گے تو زندگی کی اگلی بلند منزل تک پہنچنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تو آگے پہنچ جاؤ گے اور اگر یہ صلاحیتیں تمہارے اندر پیدا نہ ہوئیں یعنی اتنے مارک نہ لے سکے تو اسی کلاس کے اندر فیل ہو جاؤ گے اور پھر دوبارہ امتحان نہیں ہوگا۔ وہ فیل سٹوڈنٹ کو پھر سکول میں رہنے نہیں دیتا۔ قانون یہ ہے کہ معیار کے تحت آگے جانے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ جس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کے متعلق یہ تصور غلط ہے کہ خدا تعالیٰ پہلے سال اس کو فیل کر دے، کچھ دن کے لیے نویں جماعت میں رہے پھر دو مہینے کے بعد تمہیں دسویں میں لے جائے۔ قانونِ ارتقاء یہ ہے کہ وہ جو آٹھویں کلاس میں پاس ہے وہ نویں کلاس میں چلا جاتا ہے اور جو فیل ہو جاتا ہے وہ اگلی کلاس میں جانے کے قابل نہیں ہوتا، وہ وہیں روک دیا جاتا ہے۔ اور اگلی بات یہ یاد رکھیے کہ یہ امتحان دوبارہ نہیں ہونا، یہ نہ سزا ہے اور نہ زیادتی۔ یہ تو قانونِ ارتقاء (Theory of Evolution) کی کڑیاں ہیں۔ یہ تو ارتقاء کا ایک قانون ہے جس کے مطابق یہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جو آگے جانے کے قابل ہوتا ہے وہ آگے چلا جاتا ہے، جو اس قابل نہیں ہوتا وہ آگے جا ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس چیز کا انحصار آگے جانے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ اس کو کوئی عارضہ ہوتا ہی نہیں۔

انسان کی تندرستی کا دارومدار قوتِ مدافعت کی اہمیت میں مضمر ہے

ہم جتنے بھی اپنے آپ کو تندرست کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بیمار نہیں ہیں تو کسی اچھے Examine کرنے والے سے جا کے پوچھیے۔ وہ آپ کے اندر بیس بیماریاں بتا دے گا تو پھر سوال یہ ہے کہ ہم بیمار کیوں نہیں ہیں۔ کہتا یہ ہے کہ ''یہ بیماریاں پیدا کرنے والے اسباب تو موجود ہیں لیکن تمہارے اندر مدافعت کی قوت ہے۔'' آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیے وہ بتائے گا کہ ایک سانس میں کروڑوں ایسے بیماریوں کے جراثیم اندر جاتے ہیں، وہ لینے پڑتے ہیں۔ پانی کے ایک گھونٹ کے اندر جسے ہم غٹاغٹ پی جاتے ہیں دیکھنے کو تو وہ صاف کا صاف نظر آتا ہے لیکن کبھی خوردبین کے نیچے گلاس رکھ کے دیکھیے کہ اس گلاس میں ہلاک کرنے والے جراثیم کس قدر ہوتے ہیں۔ یہ تو اس کی رحمت ہے جو اس نے انہیں اتنا چھوٹا بنایا ہے کہ جو انسانوں کو نظر نہیں آتے ورنہ ''اسی تے دم گھٹ کے مرجاندے۔''[1] وہ ڈاکٹر یہ بتاتا ہے کہ ''یہاں کیفیت تو یہ ہے کہ ایک سانس میں تمہارے اندر اتنے مہلک جراثیم جاتے ہیں لیکن تمہارے اندر قوتِ مدافعت اتنی بڑی ہوتی ہے کہ جب ان کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو جو تمہاری قوتِ مدافعت ہے، جو Resistance کی پاور ہے، وہ انہیں فنا کر دیتی ہے۔ اس لیے تم اپنے آپ کو تندرست کہتے ہو۔ بیماری اس وقت ہوتی ہے جب تمہاری قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ توازن بگاڑنے

---

[1] ورنہ دم گھٹنے سے موت واقع ہو جاتی۔

والے Elements یا عناصر جو اندر جاتے ہیں' وہ غالب آ جاتے ہیں تو قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ جسے آپ علاج کہتے ہیں وہ صرف یہ ہوتا ہے کہ قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جاتا ہے تاکہ توازن بگاڑنے والے عناصر کو یہ خود تلف کر دے''۔ اگرچہ یہ سارا مسئلہ سائیکالوجی کا ہے ایرک فرام (Erich Fromm) نے یہ کہا ہے اور یہ لوگ بڑی عجیب چیزیں کہہ جاتے ہیں' کہ Sycho-analysis کے ذریعے قوتِ مدافعت بڑھا دیتے ہیں تو جسے مرض کہتے ہیں اس کے توازن بگاڑنے والے عناصر کو یہ قوت خود ہی تلف کر دیتی ہے۔ مرض دور ہو جاتا ہے۔ یہ ہم دور نہیں کرتے بلکہ ہم مریض کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ خود اپنا علاج کر لے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ کرنا تو آپ ہی پڑتا ہے عزیزانِ من! دوسرا اتنا ہی کر سکتا ہے کہ آپ کو اس قابل بنا دے کہ آپ یہ کچھ خود کر سکیں۔ [1] کرنا آپ ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قوت مدافعت زیادہ ہو اور یہ جو ہلاکت آفریں Elements ہیں وہ ان پہ غالب آ جائیں۔ تو وہ جسے ہم اگلے درجہ میں پہنچنا کہتے ہیں اُس سے یہی تو ثابت ہوتا ہے کہ اس میں صلاحیت کی Percentage زیادہ ہوتی ہے۔ یہ دراصل آگے بڑھنے کے لیے پاس مارکس ہوتے ہیں۔ مثلاً 66% والے کا یہ نہیں ہوتا کہ اس میں غلطی ہوتی ہی نہیں ہے۔ اس کی 34% تو غلطیاں ہوتی ہیں لیکن اگلی جماعت میں پہنچنے کے لیے جو معیار رکھا ہے وہ 56 % یا 61 % رکھا ہے۔ وہ جو اتنے مارکس حاصل کر لیتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ہلاکت آفریں Elements کے مقابلے میں قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے۔ پاس فیل کے حساب سے اس میں 34% تو اغلاط ہوتے ہیں اور یہ پاس ہونے کے لیے اغلاط سے پاک صحیح نمبر 66% ہوتے ہیں' یہ کبھی بھی نہیں ہوتا کہ اس میں ایک بھی غلطی نہ ہو' ایک Percent بھی اس میں کمی نہ رہ گئی ہو۔ زندہ رہنے کا یہ اصول ہے۔ آگے بڑھنے کا یہ اصول ہے۔ پاس اور فیل ہونے کا یہ اصول ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک حصول جنت کا فارمولا

یہ ہے وہ اصول جسے قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر بیان کیا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101:6-9)۔ جس شخص کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا' اس کی زندگی' اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی۔ لیکن جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا' وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا جہاں اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا دل و دماغ کچھ کام نہیں دے گا اور وہ پریشان حال مارا مارا پھرے گا۔

ہاں تو عزیزانِ من! جس کا یہ صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائے گا' صرف ''وزن'' زیادہ ہو جائے گا' تو جو پلڑا جھکا ہے وہ 56% ہو گیا۔ یہ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (101:7) ہے۔ یعنی اس کی زندگی' اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی۔ اس طرح اس نے پاس مارکس حاصل کر لیے تو وہ اگلی جماعت میں پروموٹ (Promote) ہو گیا اور اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:8)۔ لیکن

---

[1] زندگی کا اصول یہ ہے کہ انسانی صلاحیتیں سازگار ماحول میں نہایت عمدگی سے نشوونما پاتی ہیں اور انہیں نامساعد معاشرہ میں دن گزارنے پڑیں تو وہ مفلوج و مسلول ہو کر رہ جاتی ہیں۔

جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101:9) ذلت کی پستیوں میں گر جائیگا۔ یہاں پلڑے کے ہلکے یا بھاری ہونے کا سوال ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس کا یہ پلڑا ''خالی'' ہو جائے گا۔ نہیں' ایسا نہیں بلکہ بھاری پلڑے کے مقابلے میں یہ کم وزن کا ہوگا۔ یہ آگے نہیں جا سکتا۔ بس فیل ہو گیا۔ یہ اسی طرح جہنم کے لیے یہیں روک دیا گیا۔ قرآن حکیم میں اس روکنے کے لیے جحیم کا لفظ آیا ہوا ہے۔ جحیم کے معنی ہیں' روک دینا۔ تو روک دیا گیا۔ وہ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:6)۔ یعنی پلڑے کے بھاری ہونے اور خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:8)۔ یعنی پلڑے کے ہلکا ہونے کو آپ لیجیے تو یہ جتنے بھی اعتراضات پیدا ہو گئے تھے' وہ سارے حل ہو گئے۔ وہ کہتا ہے ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:6)۔ صرف وہاں اعمالِ صالحہ کا پلڑا بھاری ہونا چاہیے۔

قرآن حکیم میں تو سزا کا تصور ہی نہیں ہے

خدا تعالیٰ نہ تو کسی انسان سے محکومیت کا تقاضا کرتا ہے' نہ یہ ہے کہ کوئی لغزش یا ایسی ہے کہ جس کے لیے ضرور سزا دے دی جائے۔ وہاں سزا کا تصور نہیں ہے۔ عزیزانِ من! وہ سزا نہیں دیتا۔ یہ تو ''آگے بڑھنے یا رک جانے کا قانون'' ہے۔ اور یہ وہ اصول ہے عزیزانِ من! جسے میں نے دیکھا ہے کہ یہ جتنے بھی سائنسدان ہیں' جب ان کے سامنے قرآن کی یہ ایک آیت آئی ہے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں کہ یہ اصول چودہ سو سال پہلے بتایا گیا تھا۔ اسی اصول پر تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہ سارے انکشافات اور تحقیقات مبنی ہیں۔ جس نوع میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت بڑھی ہوئی تھی' وہ آگے بڑھ گئی' وہ ہلاکت آفریں Environment یا ہلاکت کے عناصر سے محفوظ رہی' وہ زندہ رہی اور آگے بڑھی۔ جس میں وہ صلاحیت کم ہو گئی تھی' وہ وہیں کی وہیں رک گئی۔ کہا: یہ ہے کیفیت۔ اسے وہ لوگ Appreciate کر سکتے ہیں جو سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن کیا بات کہہ گیا ہے۔ ہم نے تو قرآنی تعلیم کو مذہب کی سطح پہ رکھا ہوا ہے جس میں جہنم کو جیل خانہ بنایا ہے' اس میں انسانوں کو داخل کرنا ہے' پھر وہاں سے سزا بھگت کے واپس لانا ہے اور اس مفہوم کے لیے قرآنِ کریم کی اس آیت کو پیش کیا گیا ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (19:71)۔ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو جہنم میں داخل نہ کیا جائے۔ چل بھئی! آپ کے ہاں تصور یہ لیا' اس کا سہارا لیا' اس میں بندوں کو داخل کیا اور اب اس کے بعد یہ سزا متعین کر دی: تین مہینے' چھ مہینے' سال بھر کے لیے۔

اقبالؒ کی محفل میں عظمتِ قرآن عظیم اور مکتب و ملا کا مقام

عزیزانِ من! اگر ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:6)۔ اور خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:8)۔ سمجھ میں آتا تو بات صاف ہو جاتی۔ قرآنِ کریم حقائق سمجھنے کے لیے بڑا بلند ذہن چاہتا ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ (1877-1938) نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ:

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب

کیا کہتے ہیں مکتب اور ملا اور کہاں قرآن کے حقائق!

تیرے مادرزاد و نور آفتاب

صد آفریں کیا بات تھی اس شخص کی بھی صاحب! یعنی ایک ناممکن چیز کو' اتنی سی تشبیہ دے کر دیکھیے تو کیا سے کیا کچھ کہہ گیا ہے۔ کہا: وہ آفتاب تو بے نیاز ہے۔ اس نے تو چمکنا ہے' روشنی دیتے چلے جانا ہے' دیتے چلے جانا ہے۔ کس کو؟ روشنی دیگا اسے جو آنکھیں کھول کے رکھے گا۔ اور آنکھیں بند کرنے والے کو قطعاً نہیں دے گا۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جن کی عارضی طور پر آنکھیں دکھنی آ گئیں تھیں' تھوڑے وقت کے لیے بند کر لی تھیں' چندھیا گئی تھیں اور دوسرا وہ ہے جو تیرے مادرزاد ہے' پیدائشی اندھا ہے۔ وہ سورج کی روشنی سے ابدی طور پہ محروم ہوتا ہے' مکتب و ملا و اسرارِ کتاب۔ یہ ابدی طور پہ محروم رہتے ہیں اس لیے کہ نہ انہوں نے کفر بالطاغوت کرنا ہے' نہ ایمان باللہ ان کے نصیب میں آنا ہے۔ یہ تو عزیزانِ من! جب تک غیر قرآنی تصورات ذہن و فکر سے نہیں نکلتے قرآن اس وقت تک وہاں نہیں آتا۔ یہ بڑا غیور ہے۔ آپ خود بھی سوچیے کہ اگر ہمارے جیسا کوئی شخص کہیں کرایہ پہ مکان حاصل کرنے کے لیے جائے اور جو پہلا کرایہ دار ہے وہ اندر بیٹھا ہوا ہو' آپ باہر کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ مالک مکان سے کہتے ہیں کہ صاحب! پہلے اسے نکالیے۔ وہ مالکِ مکان کہتا ہے کہ صاحب! ''دو چار دن کے بعد جھگڑا وگڑا کر کے وہ خود نکل جائے گا' ذرا اندر جا کے اسے تنگ کرو۔'' وہ کہتا ہے کہ نہیں' شریف آدمی ایسے تو نہیں کرتا' وہ اندر نہیں جاتا' اندر قدم بھی نہیں رکھتا۔ اگر آپ کوئی محسوس مثال چاہتے ہیں تو سنیے۔ حضور نبی اکرم ﷺ مکہ فتح کرنے کے باوجود خانہ کعبہ کے باہر کھڑے ہوگئے۔ جب تک اندر کے سارے بت باہر نہیں نکالے گئے آپ نے اپنا قدم اندر نہیں رکھا۔ وَيَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (2:256)۔ جو بھی' افراد یا اقوام' غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے گی اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے گی تو سمجھ لو کہ اس نے ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ تو عزیزانِ من! پہلے آپ کو کعبے سے یہ بت' یہ غیر خداوندی نظام' نکالنے پڑیں گے پھر اندر قدم رکھنا ہوگا اور خدا تو بڑا غیور واقع ہوا ہے۔ وہ کسی ایسے مکان میں قدم نہیں رکھتا کہ جہاں اس کے شریک بیٹھے ہوئے ہوں۔

المطہرون کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک کہ غیر قرآنی تصورات کو ذہن و فکر سے نکال باہر نہ کیا جائے۔ دل و دماغ کو ان سے صاف نہ کیا جائے۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79)۔ کے یہ معنی ہیں' یعنی قرآنِ کریم کے حقائق سے وہی لوگ صحیح معنوں میں مطلع ہو سکتے ہیں جنہیں قلب و نگاہ کی پاکیزگی نصیب ہو۔ اس سے بہرہ یاب ہونے کے لیے تطہیر فکر و نظر ضروری ہے۔ یعنی اگر انسان پہلے سے کچھ خیالات ذہن میں رکھ کر یا جذبات سے مغلوب ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے تو وہ اس سے مستفیض نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر' جذبات سے الگ ہٹ کر' قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے لیکن عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو اس کے معنی پاک وصاف ہی کیے جاتے ہیں کیونکہ مطہرین وہ ہیں جو پاک وصاف ہوں۔ ان کے سوا کوئی دوسرے معنی کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔

لہٰذا انہوں نے کہا کہ اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ ''قرآن کو پڑھنے سے پہلے غسل کرنا چاہیے' وضو کر لینا چاہیے۔'' مگر صاحب! اگر دل اور دماغ دونوں غیر قرآنی تصورات سے بھرے ہوئے ہوں' کفرستان بنے ہوں' بت کدے بنے ہوئے ہوں تو اِن سے ان کی تطہیر نہیں ہوسکتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں اس سے یہی مطلب لیا جاتا ہے کہ پاک وصاف ہونے کے لیے صرف غسل کر لینا چاہیے۔

اب میں پھر اسی آیت پر آتا ہوں یعنی وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (19:71)۔ اس کے معنی یہ کیے کہ تم میں سے کوئی نہیں ہے جو جہنم میں نہیں جائے گا۔ اب جو یہ کہا کہ اِنْ مِّنْكُمْ (19:71)۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو پھر خود ہی ذہن میں آیا کہ صاحب! یہ تو بڑے بڑے حضرت صاحب' اولیاء کرام' بزرگان احکام آئمہ ہیں جو ان میں شامل ہیں۔ یہ اِنْ مِّنْكُمْ ہیں۔

لفظ وارد اور صادر کا قرآنی مفہوم

عربی کے دو لفظ ''وارد'' اور ''صادر'' ہیں۔ یہ ''وارد'' اور ''صادر'' تو ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن میں نے کہا ہے کہ یہ دوسری زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد اپنی اصلی صنف ہی کھو دیتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ ہوتا ہے کہ جب گھاٹ سے پانی پینے کے لیے مویشی آتے ہیں تو یہ اسے ''وارد'' ہونا کہتے ہیں اور جب پانی پی کر واپس جاتے ہیں تو اسے ''صادر'' ہونا کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ اصل میں وہاں گھاٹ تک آئیں گے' اندر نہیں داخل ہونگے تو یہ ''پانی پینا نئیں ہیگا۔ کدی کسی جانوراں نوں ویکھدے او کہ جنوں پانی نہ پینا ہووے تو جاوے ضرور گھاٹ اچ۔''[1] اسے تو کھینچ کھینچ کے لے جاؤ تب بھی وہ نہیں جاتا' وہاں جاتا ہی وہ ہے جس نے پینا ہوتا ہے۔ کہ ''جی! انہیں وہاں لے جایا جائے گا مگر انہیں اندر داخل نہیں کیا جائے گا۔ بس یہ تو یوں ہوگا کہ ''ذرا جا ہتی مار لوؤ ہور کجھ نئیں تے اے۔''[2]

اور میں نے گزارش کی ہے کہ قرآن کریم کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ اگر ایک بات ایک مقام پہ کہتا ہے تو اس کی مزید تفصیل کہیں باہر ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہیں چار قدم آگے چل کے یہ آیت تھی جس میں اس کی مزید وضاحت اور تفصیل تھی۔ اسی آیت نمبر 71 سے چار قدم آگے جائیے اور اسی سورۃ میں 86 ویں آیت دیکھ لیجیے۔ اس میں ہے کہ وہ جہنم کی طرف ہنکائیں گے' جس طرح پیاسے جانوروں کو گھاٹ کی طرف ہنکایا جاتا ہے۔ یہ ''وارد'' ہے' اور مجرمین کو اس طرح ہنکایا جاتا ہے' قرآن ہے' عزیزانِ من! یہ قرآن ہے اس آیت میں کہا کہ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا (19:86)۔ یہاں وہی لفظ وارد ہے' کہا: مجرمین کو جہنم کی طرف وارد کریں گے۔

پل صراط مجوسیوں کا تصور ہے نیز یہ لفظ عربی کا بھی نہیں

تو یہ پہلی چیز ہوگئی۔ اب یہ رہا کہ بھئی! یہ مجرمین نہیں ہیں' ان میں سے بعض مجرم تھے یہ سب مجرم نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ کہا کہ او ٹھیک

---

[1] تو یہ پانی پینا نہیں ہے۔ کبھی آپ نے کسی جانور کو دیکھا کہ جس نے پانی ہی نہ پینا ہو' وہ کبھی گھاٹ کے اندر نہیں جاتا۔

[2] اگر اور کچھ نہیں بس ذرا جھانک کر ہی دیکھ لیجیے۔

ہے جی! جہنم میں ڈالا نہیں جائے گا: ''اک پل صراط بنایا گیا۔ اوہدے اتوں اے لنگائے جان گے۔''[1] یہ مجوسیوں کا تصور ہے۔ ان کے ہاں پل صراط کا تصور ہے۔ پل کا تو لفظ ہی خود بتا رہا ہے کہ عربی نہیں ہے۔ یہ پل صراط کا تصور مجوسیوں کا ہے۔ کہا کہ یہ پل صراط تلوار سے تیز' بال سے باریک ہے۔ معاف رکھیے گا میں آپ کے ہاں بیچ میں یہ باتیں لے آتا ہے۔ تھوڑی سی جھجک بھی ہوتی ہے۔ ہاں' تو ملا وعظ کر رہا تھا۔ ''پل صراط نوں دسدا سی پیا' بال توں باریک' تلوار توں تیز' لنگے گا تے پیر اوہدا تلکے گا' جھٹ جہنم دے اندر' اوا تنا باریک ایناں مشکل بڑی اذیت مصیبت نال لنگے گا۔''[2]

اہل جنت اور اہل جہنم کے مابین فرق

عزیزانِ من! میں نے گزارش کی ہے کہ یہ تصور مجوسیوں کے ہاں سے مستعار لیا اور پھر یہ بھی کہ انہوں نے بندوں کو جہنم میں سے ضرور گزارنا تھا۔ یہ ''وارد نئیں کیتا جاندا تے اوتوں دی لنگاؤ' لنگاونا تے ضروری ناں او کیہہ بیٹھے ناں''[3] کہ اِنْ مِّنْكُمْ (19:71)۔ کوئی ایسا نہیں ہوگا کہ جو وہاں وارد نہیں ہوگا۔ میں نے کہا ہے کہ چار قدم آگے چلے تو اسی سورۃ میں آیت 86 میں کہا ہے کہ یہ وہ مجرمین ہیں جن کا وہاں صرف ورود ہوگا۔ پہلی بات تو اس نے مجرمین کی۔ یہ کردی' باقی رہے وہ جو مجرم نہیں ہیں۔ اب ان کے لیے یہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں لایا جائے گا' ڈالا جائے گا' اوپر سے گزارا جائے گا۔ یہ اِس کام کے لیے سارے تصور لائے۔ یعنی یہ کہ انہیں جہنم میں یا ڈالا جائے گا یا وہاں وارد کیا جائے گا اور یا گزارا جائے گا۔ یہ سارا کچھ کیا اور سمجھے کہ یا اللہ! شکر ہے جان تو بچی۔ آپ سمجھے کہ انہوں نے یہ پل صراط کا غیر قرآنی تصور دے کر کتنی الجھنیں پیدا کر لیں۔ لیکن چار قدم آگے قرآن سے نہ پوچھا۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى (21:101)۔ وہ لوگ جو اپنے اعمال کی بدولت حسن کارانہ اندازِ زندگی کے حقدار قرار پا چکے ہوں گے۔ یہ وہی ہیں کہ جن کے متعلق ہم نے کہہ دیا ہے کہ ہاں! یہ پاس ہو گئے تو جن کا Result ہم نے Declare کردیا' کہ یہ ٹھیک ہے کہ پاس ہو گئے۔ یہ جہنم کے متعلق ذکر آیا تھا تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (21:101)۔ انہیں اس سے بہت دور رکھا جائے گا' وہ اس عذاب سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا (21:102)۔ اسے دیکھنا بھالنا تو ایک طرف' اس کی حس حس کی آواز بھی ان کے کان میں نہیں آئے گی۔ اتنے دور کہ اس کی آہٹ تک بھی نہیں سن پائیں گے۔ اب جہاں یہ کیفیت ہو کہ وہ مبعدون ہوں یعنی پہلے یہ کہا: دور ہے' فاصلہ اتنا ہے۔ اور پھر قرآن نے مزید کہا ہے کہ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا (21:102)۔

---

[1] تو انہوں نے پل صراط بنایا اور کہا کہ انہیں اس کے اوپر سے گزارا جائے گا۔

[2] وہ پل صراط کا بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ یہ بال سے باریک ہے اور تلوار سے زیادہ تیز دھار ہے۔ جب اس کے اوپر سے گزرو گے تو پاؤں پھسلے گا پھر جھٹ سے جہنم کے اندر آ گرو گے۔ وہ اتنا باریک اور اتنا مشکل ہے کہ اس پر سے بمشکل' تکلیف واذیت سے گزر سکو گے۔

[3] یہ وارد نہیں کیا جاتا تو پھر اس پر سے گزارو کیونکہ وہ کہہ بیٹھے تھے کہ انہیں اس پر سے گزارنا تو ضروری تھا۔

کیا بات ہے یہاں "حسیسھـــا" کی! کبھی آپ نے دور سے تیز آگ کو دیکھا ہوگا۔ اس میں سے ایک طرح کی آواز آیا کرتی ہے۔ حسیس کا یہ لفظ خود صوتی اعتبار سے کہہ رہا ہے کہ سی سی کی آواز نکلتی ہے۔ یہ اس زبان کا صوتی اعتبار سے لفظوں کے اندر لطف ہے۔ پھر وہ "حس" آ جاتا ہے۔ کہا: حسیسھا یعنی وہ اتنی دور رکھے جائیں گے کہ تمہیں اس کی "سی" کی آواز تک نہیں پہنچے گی۔ وہ جنہیں جنت میں جانے کے قابل کہا ہے' انہیں تو خواہ مخواہ کے لیے اس پر وارد کرنا' اس کے اوپر سے گزارنا ہے۔ کہا ہے کہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو اتنے دور رکھے جائیں گے۔

بات اب ظاہر ہوگئی کہ یہ جو پیچھے سے ذکر چلا آ رہا تھا' آپ وہیں آ جایئے۔ وہاں انہیں شیاطین کا' ان کے ساتھ ان کے Followers کا ذکر چلا آ رہا تھا' جن کے متعلق ہے کہ انہیں لایا جائے گا اور جہنم میں یہ کچھ کیا جائے گا۔ یہ انہی کے متعلق تھا۔ بات وہاں یہ کہی تھی۔ سنیے کہ اب کیوں کہا۔ قرآن نے یہاں "اِنْ مِّنْکُمْ" سے پہلے کہا تھا: ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِیًّا (19:70)۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے کون کون جہنم کے عذاب کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لیے ان میں سے پہلے ہم وہ دیکھیں گے کہ کون کون سے بڑے سرغنہ ہیں۔ ہم انہیں اِن میں سے کان کھینچ کے باہر نکالیں گے۔ ہم کہیں گے کہ انہیں الگ کردو' انہیں ہم جانتے ہیں۔ سب سے پہلے انہیں وارد جہنم کیا جائے گا۔ یہ ان میں سے وہ ہیں جو سب سے پہلے وارد جہنم ہوں گے۔ وہ کہتا ہے (4:41) کہ ان سرغنوں نے وہ روش اس لیے اختیار کر رکھی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ معاشرہ کا نقشہ اسی انداز پہ رہتا ہے جس میں فریب اور تصنع سے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے ان کو وارد جہنم کرو۔ اب وہ اگلی بات دیکھیے کہ یہ جو Followers تھے' یہ تو خوش ہونگے کہ صاحب! ٹھیک ہے' یہی تھے اور ان کو پکڑ لیا' ہمیں تو نہیں پکڑا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (19:71)۔ تم میں سے بھی کوئی ایسا نہیں ہوگا جو اس کے عذاب سے بچ جائے گا۔

جہنم سب کے لیے سوائے متقیوں کے

عزیزانِ من! سوال تو صرف یہی ہے کہ کسی معاشرے کا جہنم ایسا نہیں ہوتا' جس میں بڑے بڑے سرغنہ ہی ملوث ہوں اور یہ چھوٹے اس سے باز رہیں۔ یہاں کہا ہے کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ جان بچی کیونکہ یہ جو بڑے بڑے تھے وہ تو پکڑے گئے' ہمیں تو موج ہوگئی۔ کہا کہ تمہارا یہ تصور بالکل غلط ہے۔ وَاِنْ مِّـنْـكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (19:71)۔ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کے عذاب سے بچ جائے گا۔ یہ سب مجرم ہیں اس لیے ان سب کو وہاں ہانک کر لایا جائے گا۔ یہ بات تیرے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کی رو سے طے پا چکی ہے۔ لیکن آگے جو اگلی ہی آیت میں ہے کہ ثُمَّ نُـنَـجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (19:72)۔ البتہ متقیوں کو اس سے محفوظ رکھا جائے گا۔ وہ اِس سے اتنی دور رہیں گے کہ اس کی آواز تک بھی ان کے کانوں میں نہیں آئے گی۔ (21:10) اس لیے اب یہاں سے پھر وہی بات آ گئی اور انہوں نے پھر ثُـمَّ کے معنی کیے: "اس کے بعد" اور اب یہاں متقی کا لفظ ہے' اور اس کے آگے "ننجی" کا لفظ ہے۔ انہوں نے اس لفظ "ننجی" کے معنی کیے: ہم نجات دیدیں گے۔ لہٰذا اب یہاں سے بات جہنم سے

نجات کی آ گئی جب کہ اہل جنت کے متعلق تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ جہنم کی ''حسیس'' بھی نہیں سنیں گے تو قرآن کی اس وضاحت کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ وہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ وہاں سے پھر نجات اور چھٹکارا ہوگا۔ یہ تو تصور ہی غلط ہے۔ لفظ''ثم'' کے معنی ضروری نہیں کہ ''اس کے بعد' کیے جائیں بلکہ یہ بالکل "and" کے معنوں بھی میں آتا ہے۔ ''اور' کے معنوں میں آتا ہے' ایک بالکل نئے واقعے کے شروع میں آتا ہے۔ یہ بھی اس کے معنی ہوتے ہیں۔

نجات کا غیر قرآنی تصور

اب آیا لفظ نجات۔ نجات کے جو معنی ہمارے ہاں رائج ہیں اُس کا تو سارا تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ نجات کے معنی تو یہ ہیں کہ کسی عذاب میں پھنسا ہوا ہو' وہاں سے چھٹکارا ملا۔ اس کے لیے ہم لفظ ہی چھٹکارا کہتے ہیں۔ یعنی پہلے کوئی مصیبت میں پھنسا ہوا ہو' اس سے وہ آزاد ہو جائے' چھوٹ جائے' چھٹکارا ہو جائے' اسے ہمارے ہاں نجات کہتے ہیں۔ یہ تصور کہ پہلے کسی کو کسی بات میں سمجھنا کہ ملوث ہے' عذاب میں گرفتار ہے' سزا بھگت رہا ہے' پھر اسے اس میں سے نکالنا' یہ تصور آپ کے ہاں عیسائیت' یہودیت وغیرہ سے آیا۔ اور عیسائیت کا تو عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اپنے ازلی ماں باپ' آدم اور حوا' کے گناہ کی آلائش لے کر پیدا ہوتا ہے' ہر انسانی بچہ تو پیدائش کے ساتھ ہی آلائش لے کے پیدا ہوا ہے۔ اب ان کے ہاں نجات کے معنی ہیں: اس آلائش کو دور کر دینا' اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا۔ یعنی پہلے انہوں نے ہر انسانی بچے کو آلائش میں ملوث تصور کر لیا کہ پہلے سے اس میں میل کچیل ہے' پہلے سے گناہ کی آلائش ہے' اس سے انہوں نے اسے الگ کرنا ہے: تیری نجات تو اسی میں ہے' اس کو نجات کہیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد انسانوں میں سے جو لوگ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پہ' صلیب پہ' ایمان لے آئیں گے' ان سے یہ آلائش الگ ہو جائے گی' وہ اس آلائش سے چھوٹ جائیں گے۔ باقی انسانوں کے ساتھ یہ آلائش لگی رہے گی۔ یہ سب جہنم میں چلے جائیں گے۔ یہ ہے ان کے ہاں نجات' یا Salvation۔ یعنی یہی کہ پہلے سے کوئی کسی مصیبت میں محصور ہو' کسی چیز میں گرفتار ہو۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ وہ جو ہمارے بڑے بوڑھوں کا جرم تھا۔ ''کرنی کسے نیں بھرنی کسے نیں'' ❶ تو ان کے اُس جرم کی وجہ سے ہم کچھ تھوڑے سے دنوں کے لیے جہنم میں جائیں گے پھر وہاں سے نکالے جائیں گے۔ یہ نجات ہے۔

یہودیت اور عیسائیت کے اس تصور کے بعد ہندوؤں کا تصورِ نجات

یہ نجات تو وہی ہوا کہ پہلے عذاب میں گرفتاری ہوں پھر وہاں سے چھوٹنا اور نجات کا ہونا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ ہوا کہ ہر بچہ اپنے پچھلے جنم کے کرن کی سزا بھگتنے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ پیدائش کے ساتھ یہ بھی جہنم میں' سزا بھگتنے کے لیے آیا' یہاں پھر اس کو چکر دیئے تو یہ ان کے ہاں آواگون ہوا جس کو آپ کہتے ہیں: آیا اور گیا۔ یہ آیا اور گیا کا چکر چلتا ہے۔ یہ کسی کا چھوٹا چکر ہوتا ہے تو کسی کا کٹھن چکر۔ وہ

---

❶ کرتا کوئی ہے بھرتا کوئی اور ہے۔

سینتیس کروڑ سال چکروں میں رہتا ہے۔ بہرحال وہ اس پچھلے جنم کے کرن میں قصہ چلتا ہے اور آخر میں جا کے جب وہ اس چکروں سے چھوٹ جاتا ہے تو اسے کہتے ہیں: ''مکت'' ہوگیا' اُس کی مکتی یا نجات یا Salvation ہوگئی گویا اسے بھی پہلے کرن کی سزا میں محصور کرتے ہیں پھر وہاں اس سے نجات دلاتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاں ان کے ہاں کا ویدانت ہے۔

تصوف کی دنیا میں نجات کے عقیدے کی کیفیت

اب آیا آپ کے ہاں کا تصوف کہ خدا کی ذات میں سے ایک روح...... یہ ذات ہے...... جو الگ ہو کے یہاں آئی۔ یہاں آ کے وہ مادہ کے دلدل میں پھنس گئی۔ ''نویں نویں آئی سی۔ پتہ نئیں سی پکی سڑک کیہڑی اے تے کھوبہ کتھے اے' آئی خبر اے رات نوں چوری چوری اوتھوں گڈی اچ بیٹھی اونداں ای پھس گئی دلدل اچ''[1] اب وہاں اس نے رونا شروع کیا۔ جھوم جھوم کے پڑھتے ہیں' یہ روح رو رہی ہے' ''کھوبے اچ پھسی اے' مقصدِ زندگی اس کھوبے میں سے نکلے''[2] معاف کیجیے گا ''ترجمہ ایہد ا آہی نئیں سکدا کسے زبان اچ۔ اصل اچ کھوبہ ہوندا ای پنجاب اچ ہے''[3] اگر اہلِ زبان کو بہت مان ہے تو بتا دیجئے کہ ''کھوبے'' کیا ہیں' یہ لکھنؤ کے' اہلِ زبان کب مانتے تھے۔ ''بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں'' والی بات ہے۔ میں نے کہا کہ میں وہاں لکھنؤ میں نہیں تھا' ورنہ میں وہاں کہہ دیتا کھوبے دا ترجمہ۔ ان کے ہاں کا تصور یہ ہے۔ آپ کے ہاں کا سارا تصوف ہندوؤں کے ہاں کا ویدانت ہے۔ وہ آتما کو پرماتما کا ایک حصہ مانتے ہیں: وہ پرم آتما' یہ آتما۔ پھر وہ روح جو اس میں پھنسی ہوئی ہے' وہ اس کو مایا کا جال' سراب کہتے ہیں۔ یہ ہستی کا' کائنات کا' چکر ہے جس چکر میں' یہ کہتے ہیں کہ یہ پھنسی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں یہ ایک مادہ ہے۔ یہ وہی چیز ہے' ان کے ہاں بھی۔ اس مادہ کا جو فریب ہے اسی کو یہ سراب کہتے ہیں۔ اس سراب میں سے' ریاضتوں سے' مشقتوں سے ''چکیاں پی پی کے' فاقے کٹ کٹ کے' الٹے ٹنگے ہوئے' بیت پین ڈئے ہوئے' ڈے دہائی ملن ڈئی ہوئی ہیگی اے''[4]

نجات کا ملخص

پھر اس میں اُف! یہ کتنی مشقتیں اور ریاضتیں ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے تو پوچھو نہیں کہ ہم نے کتنی قید و مشقت کاٹی ہوئی ہیں' ان مشقتوں کے بعد کیا ہوگا کہ جی! پھر یہ جو روح ہے' یہ اپنی اصل میں جا ملے گی۔ آخر اس کا ملخص کیا ہوا؟ یہ کہ یہ سارا جو نجات کا تصور

---

1. نو وارد تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پکی سڑک کونسی ہے اور دلدل والی کون سی ہے۔ شاید رات کو گاڑی پر بیٹھ کر چوری چھپے آئی اور یہاں دلدل میں پھنس کے رہ گئی۔
2. دلدل میں پھنسی ہے۔ اس کی زندگی کا منتہا اس دلدل سے نکلنا ہے۔
3. معاف رکھیے گا' اس کا ترجمہ کسی بھی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ دلدل ہوتی ہی پنجاب میں ہے۔
4. چکی پیس کر' بھوک پیاس برداشت کر کے' الٹے لٹک کر جہاں ڈنڈے پڑ رہے ہیں۔ شور و شغب رونا دھونا مچا ہوا ہے۔

ہے وہ کچھ ایسے ہی ہے کہ صبح آپ اچھے بھلے تھے' تندرست وتوانا' بالکل ٹھیک ٹھاک' دس بجے یہ کہیں رات کو بخار ہوا' بہت تیز بخار ہوا' اس کے ساتھ اور تکلیفیں بھی ہوئیں' علاج کرنے کے بعد شام کو بخار اتر گیا۔ تو کیا ہوا؟ یہ جیسے آپ صبح تھے ویسے پھر شام کو ہو گئے تو گویا یہ سارا سلسلۂ کائنات' یہ تمام سلسلۂ رشد وہدایت' انبیاء کرام کا بھیجنا' انسانوں کا پیدا ہوتے چلے جانا' یہ کاہے کے لیے ہوا؟ کہ انسان پہلے جس قسم کا تھا پھر دوبارہ ویسا ہی ہو جائے۔ اب ملاحظہ فرماؤ آخر یہ ہوا کیا؟ اور پھر یہ نہیں کہ کہیں ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو چلو جی! پیدا کر بیٹھے تھے ایسے چکر میں سے گزار دو بھئی! ٹھیک ٹھاک ہو گئے' صاف ہو گئے۔ چلو بھیج دو' قصہ ختم ہوا۔ معاف رکھنا کہ خدائے علیم وخبیر یہ کرتا چلا جا رہا ہے' وہ پاک صاف انسانوں کو بھیجتا چلا جا رہا ہے۔ یہ یہاں ملوث کیے چلے جا رہا ہے یہاں ''کھوبے''[1] میں پھنسائے چلے جا رہا ہے اور ان سے کہا یہ ہے کہ پھنسایا ہم نے ہے' نکلو تم۔ اب وہ بیچارے مرمرا کے' کسی طرح سے نکل نکال کے آگے جاتے ہیں' تو وہ کہے گا جیسا وہ پہلے تھا جیسے کہتے ہیں جنت میں آدم تھا یہ سارا چکر دے کے اسی قسم کا پھر بنا دینا۔ عزیزانِ من! می نہ سازد خدائے را۔ خدا کے شایان شان یہ نہیں تھا۔ اگر یہی چیز تھی تو کیا بات یہ شخص کہہ گیا ہے:

ہے نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟ ہے نقش اگر باطل تو ہمت کر' جرأت کر' تسلیم کر لے کہ یہ نقش باطل ہے اور اگر یہ باطل ہے تو اتنی مصیبتوں میں سے گزرنا' انبیاء کرام کا بھیجنا' ہدایات آسمانی کا آنا' یہ یہاں کی تمام مشقتیں مصیبتیں' یہ سارا کچھ بھگتنا' کاہے کے لئے؟ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر ویسا ہی آدم رکھنا ہے جیسا وہ پہلے تھا تو اس کو تیری جنت میں بھیج کر برا ہی کیا! وہ ویسا موجود ہے جنت میں اس کو رہنے دے۔ کہا: ''نہیں جی نکل ایتھوں۔''[2]

نجات کا یہ ملخص خدا کی شان کے شایان نہیں

عزیزانِ من! یہ ہے نجات کا تصور جو دنیائے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ قرآن نے آ کے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اس نے کہا کہ انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی عذاب میں گرفتار نہیں ہوتا' کوئی آلائش ساتھ لے کے نہیں آتا' یہاں کلین سلیٹ لے کے آتا ہے: **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ** (17:70)۔ یہ پیدا ہوتا ہے تو بڑا واجب التکریم ہوتا ہے صاحب! اسے کیوں مجرم اور گناہگار بناتے ہو۔

---

1. دلدل جس میں انسان کے پاؤں پھنس کر رہ جاتے ہیں' وہ جتنی کوشش کرتا ہے اتنا ہی اس میں دھنستا چلا جاتا ہے۔
2. قطعاً نہیں' نکلو اس جنت سے۔

قرآن حکیم انسانی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو عملِ پیہم کی دعوت دیتا ہے

یہاں آنے کے بعد اسے کہا جاتا ہے کہ اب تمہارے لیے میدانِ عمل ہے۔ تمہاری مضمر صلاحیتوں کی نمود کا موقعہ ہے' کرو کوشش' بڑھو آگے جتنا آگے بڑھنا ہے۔ یہ تو اس کارزار کے اندر ایک میدانِ عمل کے اندر ہے۔ کہتا یہی ہے کہ یہ تو آگے بڑھنے پیچھے رہنے کی بات ہے' چلو جس کا جی چاہتا ہے چلے آؤ۔ اور پھر اس کے بعد یہ کہ ہم 100 فیصد مارکس نہیں مانگتے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہاں بہت سی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پرچے کے اندر تم سے 33 غلطیاں بھی ہو جائیں' ہم تمہیں فیل نہیں کرنے کے' کوئی بات نہیں 66 لے آؤ' 51 لے آؤ۔ مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ (101:6-7)۔ ہوگا یعنی جس شخص کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا اس کی زندگی اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی تو وہاں یہ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (99:7-8)۔ جو ذرہ برابر بھی قانون خداوندی کا اتباع کرے گا اس کے حسنِ عمل کا خوش گوار نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا۔ اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ بس یوں کہیے کہ ایک ایک سطر کا ایک ایک لفظ ہم پڑھیں گے' پھر تمہیں جانچیں گے' پرکھیں گے' حساب کریں گے۔ یاد رکھو! ایک ایک لفظ کا حساب ہوگا۔ مثقال ذرةً: ہم جانتے ہیں اس کے اندر غلطیاں ہونگی' دیکھنا یہ ہے کہ وہ غلطیاں 33% ہوں۔ 66% تو حسنِ عمل تک لیجاؤ۔ چلو پروموشن' تو وہ دے دیتا ہے اور پھر مزید اس کے لیے آگے بڑھنے کا میدان بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ جنت آخری میدان نہیں ہے۔ اہلِ جنت کے متعلق یہ ہے کہ ان کی پیشانیوں کا نور' ان کی یہ سرچ لائٹ' انہیں سراطِ حمید کی طرف راہنمائی کرتی چلی جائے گی کہ آگے چلنا ہے' وہ تو میدانِ عمل ہے' اور جہاں تک جہنم کا تعلق ہے تو وہ Same ہو گیا' عزیزانِ من! پہلے سے کہہ دیا کہ بھئی! دوبارہ امتحان نہیں ہونا' اس کے لیے میدانِ عمل تو ختم ہو گیا۔

عزیزانِ من! یہ تصور قرآن کا دیا ہوا تصور ہے۔ اُسے آپ ذرا مذاہبِ عالم کے دیئے ہوئے تصور سے موازنہ کر کے دیکھیے' یہ قرآن ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ پہلے سے کسی عذاب میں مبتلا کر کے' وہاں سے اس کا چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ یہ سوال نہیں ہے۔ اور پھر خدا تعالیٰ کا یہ پروگرام بھی نہیں ہے کہ انسان کو وہ کچھ عذاب دینے کے بعد وہاں سے واپس اپنے پاس لے آئے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔

آج کا انسان اگر یہاں کی زندگی کی آخری کڑی ہے تو اُخروی زندگی کی ابتدا بھی ہے

آج کا انسان اگر یہاں کی زندگی کی آخری کڑی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اُخروی زندگی کی ابتدا بھی ہے۔ یہاں تو نہایت قاعدے اور قانون سے' Rationally' ایک بات ہو رہی ہے۔ فطرت کا سارا قانون یہی کارفرما ہے۔ عزیزانِ من! انہوں نے ایک ایک کڑی

کے متعلق ریسرچ کر کے بتا دیا کہ کون کونسی نوع تھیں جن کے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی' انہیں وہیں روک دیا گیا تھا۔ جن میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو چکی تھیں وہ آگے بڑھتی چلی گئیں۔ یہاں تک تو یہ بھی پہنچ گئے تھے۔ مغرب کے سائنسدان وہاں آ کے رک گئے کہ یہ جو انسان کی موجودہ زندگی ہے' یہ سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ بھی خدائے حکیم وخبیر کو نہیں جچتا کہ وہ یہاں تک لانے کے بعد ہی صحیح انسانوں کو ختم کر دے اور یہ کہ یہ زندگی کا کھیل اسی لیے ہے' کہ جی! کیا حاصل ہوا ہے' جہاں سے چلے تھے وہیں تک پہنچ گئے۔ یعنی وہ سائنسدان مذہب سے چھوٹے اور یہاں آ کے پھنس گئے۔ بات وہی ہو گئی۔ مذہب والوں نے تو پھر بھی یہ سارا کچھ دنیا کی سزائیں وزائیں دلوا کے بہرحال' As you were تو کر دیا۔ یہ کمبخت Scientist تو اس سے بھی بدتر مقام پہ رہا کہ اس نے تو قصہ ہی ختم کر دیا۔ نہ رہے بانس' نہ بجے بانسری۔ اس نے کہا کہ خدا اس کو چکر دیئے چلا جا رہا ہے' دیئے چلا جا رہا ہے۔ ''مکائے گا سیاپا ایتھوں''[1] یعنی یہ اس سے بھی جسے آپ کہتے ہیں بدتر ہے۔ کہ اس نے مذہب ہی تو چھوڑ دیا۔ آپ دیکھیے یہ تصور انسان کے لیے اور بھی پست واقع ہوا ہے۔ اہلِ مذاہب نے انسان کو عذاب سے چھٹکارا دلا کر بہرحال کہیں As you were پر پہنچا تو دیا' اس کا ستیاناس! یہ تو اس کو یہاں ختم ہی کر دیتا ہے۔ اور قرآن جو آیا تو اس نے کہا کہ نہ تو انسان کسی عذاب میں محصور ہے' نہ گناہوں کی پاداش ساتھ لے کے آتا ہے' نہ ہی یہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تو سلسلہ ارتقاء کی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے جو یہاں پہنچی ہے۔ اس کے پاس میدانِ عمل ہے جتنی صلاحیتیں بیدار ہوتی چلی جائیں گی یہ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی لیے جو نیک کام ہیں وہ عملِ صالحات ہیں۔ یہ وہ کام ہیں جن سے انسان کی صلاحیتیں بیدار ہوں' جو Potentialities ہیں وہ Actualise ہو جائیں' Realise ہو جائیں۔

اس زندگی میں تو انسان نے اپنی صلاحیتوں کو مشہود کرنا ہوتا ہے

اس بات کو آپ ان معانی میں سمجھیں۔ یعنی ہر انسانی بچہ کو' Potentially وہ صلاحیتیں دی جاتی ہیں' بجائے اس کے کہ وہ گناہ کی آلائش لے کے پیدا ہو' وہ تو اتنے بڑے مراعات لے کے پیدا ہوتا ہے' اور اسے کہا یہ جاتا ہے کہ لو بھئی! ان مراعات کو تم مشہود بناؤ' ان Potentialities کو Actualise یا Realise کرو۔ جس نے اس کو اتنا Realise کر لیا کہ یہ اس سے آگے جانے کے قابل قرار پا گیا۔ یہ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (101:6-7) ہے۔ اور اس کے برعکس جس کی یہ صلاحیتیں دبی کی دبی رہ گئیں' برومند نہ ہوئیں تو وہ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101:9)۔ وہ رک گیا' آگے چلنے کے قابل نہیں رہا اور عزیزانِ من! قرآن حکیم نے یہاں سے ہی یہ چیز کہی کہ یہ جو وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (19:71)۔ یعنی یہ نہیں کہ جہنم میں صرف ان کے سرغنے ہی جائیں گے۔ ان سے کہہ دو کہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کے عذاب سے بچ جائے گا۔ یہ سب مجرم ہیں اس لیے ان سب کو وہاں ہانک کر لایا جائے گا۔ یہ بات تیرے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کی رو سے طے پا چکی ہے۔ عزیزانِ من! وہ

---

[1] یہاں سے اس کا ٹانٹا ہی ختم کر دے گا' اس کا وجود ہی ختم کر دے گا۔

تو ان منکرین کے متعلق تھا کہ یہ Followers نہ سمجھ لیں کہ ہم تو بچ گئے باقی سب کو وہاں جانا پڑے گا۔ یاد رکھو! باقی رہے تقویٰ شعار ان کے لیے کہا کہ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (19:72)۔ تو ان کے متعلق یاد رکھو کہ نجات کے عربی زبان میں بھی یہ معنی ہیں: ''کسی کو کسی بات سے محفوظ رکھنا۔'' اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی کو کسی مصیبت میں مبتلا کر کے پھر اس سے چھٹکارا حاصل کرانا بلکہ اس کے معنی ہیں ''شروع سے ہی کسی سے کسی کو محفوظ رکھنا ہے'' تو قرآن نے ان متقین کے متعلق یہ کہا ہے کہ ''وہ جہنم سے اتنی دور رکھے جائیں گے کہ وہ جہنم کی ''حسیس'' بھی نہیں سن سکیں گے (21:102)۔'' لہٰذا ان کے متعلق جہاں یہ لفظ آئے گا اس کے معنی ہیں کہ ان متقین کو محفوظ رکھا جائے گا' اور جو مجرمین ہیں وہ جہنم میں آئیں گے۔ وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (19:72)۔ وہ لوگ جو اس وقت قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت رہے ہیں' اس میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کریں گے' وہاں ان ظالمین کو جہنم میں چھوڑا جائے گا' اِن ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

فتح مکہ کے بعد مجرمین قریش کی کیفیت

کیا لفظ ہے' جثیا! ''گھٹنے ٹیک کے وہاں یہ کھڑے ہونگے۔ شکست اور اتنی بڑی شکست کو جثیا کہا گیا ہے۔ ان کی یہ کیفیت ہوگی۔ یہ کیفیت تو یہاں کی زندگی میں ہی' نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں' دیکھ لی گئی تھی کہ اتنے اتنے بڑے اکابر ومجرمین قریش اور ان کے ساتھی جنہوں نے صحرا کے بدوؤں کو ساتھ ملا لیا ہوا تھا۔ اندازہ لگائیے صاحب! کہ حضور ﷺ کی پوری مدنی زندگی میں انہوں نے ایک دن بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ اگر تمام جنگوں کو اکٹھا کریں تو قریباً اسی بیاسی کے قریب بن جاتی ہیں' جن سے آپ کو گزرنا پڑا لیکن اس کے بعد انہیں وہ شکست ملی ہے کہ قرآن نے قیامت میں جہنم کا جو نقشہ کھینچا بس یہی ان کا نقشہ تھا: پا بہ زنجیر' طوق بہ گردن' نگاہیں ندامت سے جھکائے ہوئے ننگے سر' آنکھ نہیں اوپر اٹھا سکتے۔ فتح مکہ کے بعد تاریخ میں اکابرینِ قریش کا جو نقشہ ہے بالکل اس قسم کا ہے۔ یہ یہاں کی جہنم کا بھی ذکر ہے۔ یہاں بھی جب یہ کیفیت پیدا ہوئی تھی تو ان لوگوں نے جو Followers تھے' سمجھا یہ تھا کہ یہ جو بڑے بڑے اکابر قریش ہیں' وہی سزا پائیں گے' ہم بخشے جائیں گے' چھوٹ جائیں گے۔ کہا: یہ غلط بات ہے بلکہ یہ سب کے سب اس میں ملوث ہوتے ہیں لیکن جو تقویٰ شعار ہیں ان کو اس سے شروع سے ہی الگ رکھا جاتا ہے۔ اس سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

ہماری غلط نگہی اور اس کی حقیقت

اب رہی ان کی یہ دلیل جو آج بھی دی جاتی ہے کہ صاحب! جنہیں آپ مجرمین کہتے ہیں' جہنم میں جانے والے کہتے ہیں' انہیں شکست ہوگی' ذلت ہوگی' رسوائی ہوگی۔ واہ! عیش کرتے ہیں' ان کی کوٹھیاں' موٹریں' بینک بیلنسز' خدام اور شان دار پارٹیاں ہوتی ہیں' آپ دیکھیے کہ انہیں شان وشوکت سطوت' وحشمت یہ سارا کچھ میسر ہے۔ لیکن قرآنِ کریم دیکھیے کہ کیا کہتا ہے: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ

اٰیٰـتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ خَیۡرٌ مَّقَامًا وَّاَحۡسَنُ نَدِیًّا (19:73)۔ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے قرآنی احکام وقوانین پیش کیے جاتے ہیں تو یہ جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ تم یہ بتاؤ کہ ہم دونوں پارٹیوں میں سے کون سی ایسی ہے جس کی پوزیشن اعلیٰ اور جس کی عقل زیادہ آراستہ وپیراستہ ہے۔ بس اسی سے سمجھ لو کہ کون صحیح راستے پر ہے اور کون غلط راہ پر۔ عزیزانِ من! بات یوں ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! سب کچھ صحیح ہے، جو کچھ تم کہتے ہو۔ ہمیں بتاؤ کہ ایک یہ ہیں جو خدا کے قوانین کی نگہداشت کرنے والے ہیں، اس کے صحیح راستے پہ چلنے والے ہیں اور ہمیں مجرمین وغیرہ بتا رہے ہو۔ کہتے ہیں کہ ذرا ان کی حالت کو تو دیکھو۔ کھانے کو روٹی نہیں، پہننے کو کپڑا نہیں، رہنے کو مکان تک بھی نہیں ہے، خستہ حال، درماندہ، گھربار سے نکالے ہوئے، مکہ سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہوئے، یہاں ان بے چاروں کے دوستوں کی یہ کیفیت ہے کہ کوئی کھجوروں پہ گزارا کر رہا ہے، کوئی پانی کھینچ کھینچ کے مزدوری کر رہا ہے۔ یہ جماعت ہے اور اس کے بعد اِدھر آؤ، ہم تمہیں دکھائیں۔ کہا کہ نگاہوں سے پوشیدہ چیزوں کو چھوڑ دو۔ ہماری محفلوں کو ذرا دیکھو، ہماری کلبوں کو ذرا دیکھو، ہمارے جلسوں پہ ذرا نگاہ دوڑا کے دیکھو، ہمارے محلات کو دیکھو، ان کے ہاں یہ حریر واطلس کے پردے اور اتنے اتنے چاندی اور سونے کے ظروف، ان پہ نگاہ ڈال کے کہو کہ کس کا مقام اچھا ہے۔ وَاَحۡسَنُ نَدِیًّا (19:73)۔ کن کی محفلیں اس قدر مسرت اور شادمانی کے گہوارے جھول رہی ہیں، ہماری یا ان کی؟ تو اگر یہ چیزیں خدا کی نوازشات ہیں تو کیا یہ ہمارے حال پہ ہیں یا ان کے حال کے پہ ہیں؟ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

کہاں وہ اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ! زندگی کی دورخی تصویر

حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں بھی یہی اعتراض تھا۔ حضورؐ کے زمانے میں بھی یہی اعتراض تھا۔ آج بھی یہی کہا جاتا ہے: دیکھ لیا دیانتدار بن کے، فاقے مر رہے ہو، ذرا اور ایماندار بنو، ٹھیک ہے ٹھیک ہے! ان سے کہا گیا کہ یہ ٹھیک ہے، تم یہ سب کچھ دکھا رہے ہو، ذرا اقوامِ سابقہ کی تاریخ پر بھی تو ایک نگاہ ڈال کے دیکھو۔ وہ تم سے کہیں زیادہ دولت وحشمت کی مالک تھیں اور تم سے کہیں زیادہ ان کی محفلیں بارونق تھیں: وَکَمۡ اَهۡلَـكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّرِءۡيًا (19:74)۔ (اس میں شبہ نہیں کہ نظام خداوندی کے ابتدائی مراحل میں جماعتِ مومنین کی حالت کمزور ہوتی ہے اور مخالفین کے پاس دولت وثروت زیادہ ہوتی ہے لیکن انہیں اس کا علم نہیں ہوتا کہ) ہم ان سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر چکے ہیں جو ان سے کہیں زیادہ بہتر ساز وسامان رکھتی تھیں۔ اور ان کی نمود ونمائش بھی ان سے کہیں زیادہ تھی۔ ہاں! تم سے بھی کہیں زیادہ خوشگوار تھیں، جنہیں ہم تم سے قبل تباہ کر چکے ہیں۔

عزیزانِ من! ہماری فلموں میں تو یہ تھا کہ یہ پہلی، پرانی قومیں تہذیب وتمدن میں بڑی پست تھیں۔ اب جو کھدائیوں کے بعد آرکیالوجیکل ڈِسکوریز Archaeological Discoveries ہونی شروع ہوئیں، تو اب جو چیزیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں تو انہیں دیکھ کر آدمی عش عش کر اٹھتا ہے کہ اچھا اس زمانے میں بھی یہ کیفیت تھی! تو قرآن کہتا ہے کہ ابھی تاریخ کو مزید سامنے آنے دو،

تمہیں پتہ چلے گا کہ جس قسم کی دولت وحشمت تم کہہ رہے ہو'اس سے کہیں زیادہ دولت وحشمت کی وہ قومیں مالک تھیں اوراس کے بعد پھر پوچھو تاریخ کے اوراق سے یا ان بستیوں کے کھنڈرات سے' جن پر سے تم صبح وشام گزرتے ہو۔ان کی اینٹوں کے اوپر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ ہوتا ہی ہے۔ اسی سے تم فریب کھا جاتے ہو۔ کیوں فریب کھاتے ہو؟ ہوتا یہ ہے کہ نظام خداوندی کے قیام کے ابتدائی مراحل میں جماعت مومنین کی حالت کمزور ہوتی ہے اور مخالفین کے پاس دولت وثروت زیادہ۔لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ ہم اِن سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر چکے ہیں جو ان سے کہیں بہتر ساز وسامان رکھتی تھیں اوران کی نمود ونمائش بھی ان سے کہیں زیادہ تھی۔ **قُلْ مَنْ كَانَ فِى الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا** (19:75)۔ان سے کہہ دو کہ یہ ٹھیک ہے کہ اِس وقت تمہارے پاس قوت اور دولت زیادہ ہے لیکن خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں انہیں فوراً نہیں پکڑ لیا جاتا۔انہیں مہلت دی جاتی ہے۔

مہلت کے وقفہ کی اہمیت

اس طرح بات یہ ہے کہ ہم پہلے ہی انہیں گرفت نہیں کر لیتے۔ یہ تپ دق (T.B) ہوتا ہے' آہستہ آہستہ جان کھاتا چلا جاتا ہے۔ بخار بھی آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم گنجائش اور مہلت دیتے چلے جاتے ہیں کہ اب بھی تم زندگی کی طرف آ جاؤ' اب بھی تم اپنا علاج کر لو' اب بھی قوتِ مدافعت کو زیادہ کر لو تو بچ جاؤ گے۔ اس لیے کہ ہم بڑے رحیم وکریم واقع ہوئے ہیں اور یہ مہلت کا وقفہ بڑی چیز ہے عزیزانِ من! یہ ایک محنت کا عنصر ہے۔ اسے دیکھیے کہ جس طرح انسان ہر محنت کے غلط استعمال سے تباہیاں خریدتا ہے' وہ مہلت کے وقفے کے غلط استعمال سے بھی تباہی خریدتا ہے بجائے اس کے کہ وہ یہ سمجھے کہ صاحب! یہ اتنا وقت ملا ہوا ہے اس میں مجھے اپنا علاج کر لینا چاہیے' وہ کہتا یہ ہے کہ نہیں نہیں' مجھے ہوا ہی کچھ نہیں ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اس فریب میں رکھتا ہے۔ یہ مہلت کے وقفے سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ کہا: ہم نے تو اس لیے انہیں مہلت کا وقفہ دیا تھا کہ وہ اپنا علاج کر لیں۔

خدا کی صفتِ رحمانیت اور قرآنی لفظ الساعۃ کا مفہوم

عزیزانِ من! پھر وہ بات آئی کہ جہاں کہیں قرآن خدا کی کسی صفت کو لاتا ہے وہاں وہ عجیب صفت ہوتی ہے۔ یہاں قرآن خدا کی صفت رحمٰن لایا ہے۔ یعنی یہ مہلت کا وقفہ ہے جس کے متعلق یہ اس پہ اعتراض کر رہے ہیں کہ صاحب! پھر ہم ایسے کیوں ہیں۔ یعنی اس کی صفتِ رحمانیت یہ بتائی ہے کہ مہلت دینا بھی ہماری صفتِ رحمانیت کا تقاضا تھا۔ لیکن جو وہ پیچھے کہا ہے کہ **عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا** (19:69)۔ وہ جو خدائے رحمٰن کے نظام کی مخالفت میں تھے۔ یہاں (9:75) میں بھی وہ لفظ رحمٰن آیا ہے کہ رحمٰن کی صفتِ رحمانیت نے ان کو مہلت دی اور اسی مہلت کے وقفے سے' اس کی رحمانیت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا بگڑتا ہی کچھ نہیں:

حَتّٰى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ط فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا

(19:75)۔ انہیں مہلت (Respite) دی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ اس تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں جس کی بابت ان سے کہا جاتا تھا‘ پہلے ہلکی سی سزا تاکہ وہ اپنی روش سے باز آجائیں اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو پھر انقلاب کا ہلاکت انگیز عذاب‘ اسی قانون کے مطابق یہ مخالفین بھی عنقریب جان لیں گے کہ کس کی پوزیشن بدتر ہے اور کس کا جتھہ کمزور! یہاں بھی وہی اوپر والے الفاظ ہیں کہ ذرا مہلت کا وقفہ ختم ہو جانے دیجیے پھر ان کے بعد وہ اِس تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں جس کی بابت اِن سے کہا جاتا تھا۔ اب یہاں عذاب اور ساعۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ ہم نے عذاب کا مفہوم عذابِ جہنم اور ساعۃ‘ کو بمعنی قیامت لیا اور بس بات وہاں ختم کر دی۔ یہاں نہ ہم پہ عذاب ہوتا ہے‘ نہ ہم پہ کوئی انقلاب آتا ہے‘ نہ کوئی ساعۃ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! ''عذاب'' اس قسم کی تباہیاں ہوتی ہیں جو پہلے تھوڑے تھوڑے جھٹکے دیئے جاتے ہیں تاکہ شاید ان جھٹکوں سے ہی سمجھ لو اور ''ساعۃ'' وہ آخری گھڑی ہوتی ہے کہ جس کے بعد پھر قوموں کو انسانوں کو زندگی نصیب نہیں ہوتی۔ میں قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ دیکھتا ہوں کہ جسے اس نے ''عذاب'' کہا ہے‘ یہ چھوٹے چھوٹے جھٹکے ہیں جو ہم پہ پچیس تیس سال سے آتے رہے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ اسکے بعد اس کا قانونِ مکافات ''الساعۃ'' لے آیا کرتا ہے۔ پھر اس قوم کے اوپر دوبارہ زندگی حرام ہو جاتی ہے:

حذر اے چیرہ دستاں‘ سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

درد کی شکل میں خطرے کی گھنٹی بھی ایک رحمت ہے

کیا رحمانیت کی صفت ہے جو قرآن یہاں لایا ہے! کہ وہ پہلے ہی جھٹکے میں ختم نہیں کر دیتا: ہلکا ہلکا سا سر درد ہوتا رہتا ہے‘ گرانی بھی ہے‘ تھوڑی تھوڑی کھانسی بھی آتی ہے۔ یہ آغاز ہے‘ یہ اس بات کی علامتیں ہیں۔ یہ عذاب‘ عزیزانِ من! کسی ڈاکٹر سے پوچھیے۔ وہ جسم انسانی کے لیے بتائے گا کہ یہ کیا ہے۔ وہ جسے ہم Pain کہتے ہیں جو کہ درد ہوتا ہے‘ ہم تو سمجھتے ہیں کہ بڑا ہی عذاب ہے۔ یہ درد تو بڑا شدید کرب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سے پوچھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ جسے آپ Pain کہتے ہیں یہ خدا کی رحمت ہے‘ یہ خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے۔ پہلے Painless کے طور پر کچھ خرابیاں ہوتی ہیں‘ گرانی محسوس ہوتی ہے‘ کئی گنا نظر بظاہر تکلیف محسوس ہوتی ہے ''چلن پھرن نال وی''[1] تکان ہو جاتی تھی تو یہ آہستہ آہستہ والی گھنٹی ہوتی ہے۔ اس پہ بھی جب یہ اصحٰب کہف والا سویا ہوا نہیں اٹھتا‘ تو اس کے بعد یہ ایک شدید قسم کی گھنٹی آتی ہے۔ ڈاکٹرز بتاتے ہیں کہ اسے Pain کہتے ہیں۔ او کمبخت! اب بھی سمجھ‘ اس کے اندر قیامت آ رہی ہے‘ وہ یہ چیز ہوتی ہے جسے قرآن عذاب کہتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ اتنی بڑی اہم چیز ہے اور تشخیص کرنے میں یہ بہت مدد دیتی ہے کہ جھٹ سے درد کی علامات

---

[1] چلنے پھرنے سے بھی۔

کو دیکھ کر مریض سے بات کر کے مرض کی نوعیت سمجھ میں آ جاتی ہے' ورنہ اگر یہ درد اتنا کچھ نہ ہو' مریض اپنا مرض بھی نہیں بتا سکتا۔ وہ جو ہمارے ہاں عام طور پہ بڑی بوڑھیاں ہیں' ان سے پوچھتے ہیں کہ ''مائی تینوں ہوندا کی اے؟ ڈاکٹر جی! مینوں ایہہ کجھ کاوں کاوں جیا ہوندا ہیگا اے''۔ [1] لیکن یہ وہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ نہ بتا سکے اور نہ ہی کچھ سمجھ سکے' لیکن جب کہیں اسی ''مائی''[2] کو درد ہوتا ہے تو وہ جب پوچھتا ہے کہ مائی کیا ہوتا ہے؟ وہ کہتی ہے: ''ڈاکٹر صاحب! ایتھے پیڑ ہوندی ہیگی اے بڑی۔ ایتھے پیڑ ہوندی اے''۔[3] بات لپیٹ ہوگئی' اس نے سمجھ لیا کہ یہاں پتہ (Gall- Bladder) ہوتا ہے' یہاں جگر (Liver) ہوتا ہے' اس لیے یہ جو Pain ہے' یہ جو درد ہے' ان سے پوچھیے' وہ کہتے ہیں: یہ تو خدا کی رحمت ہوتی ہے' یہ ہے جسے قوموں کی زندگی کے اندر جسے عذاب کہا ہے۔ یہ جو Pain کے مرحلے آتے ہیں' اس سے بھی اگر یہ علاج کی طرف رخ کرلے تو بچ سکتے ہیں۔ لیکن یہ جسے آپ موت کہتے ہیں' اسی کی بڑھی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ ''کاوں کاوں دی اگلی شکل پیڑ ہوندی ہیگی اے۔ اس پیڑ'' کو اگر آپ اسی طرح سے Neglect کرتے رہو تو وہ ناسور بن جاتا ہے' وہ سرطان ہو جاتا ہے۔[4] یہی موت ہوتی ہے۔ قوموں کی زندگیوں میں یہی الساعۃ ہوتا ہے۔ پھر کہا: **فَسَيَعْلَمُوْنَ** (19:75)۔ عنقریب جان لو گے۔ یہ جو ہم ہر معاملہ' ہر بات' قیامت تک اٹھانے والے ہیں پوچھو کہ یہ الساعۃ کا ہے کے لیے آتا ہے صاحب! پچھلے پن سے یا مستقبل کے اندر؟ جب یہ الساعۃ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''عنقریب جان لو گے۔'' یعنی یہ آئے گا تو Future میں ہی' مستقبل کے لیے ہی اس کا استعمال ہونا چاہیے' نتیجہ تو عمل کے بعد ہی آتا ہے۔ لیکن اس میں بھی' یہ عربی زبان ہے عزیزانِ من! وہاں جب یہ الساعۃ کا لفظ لگاتے ہیں تو اس کے معنی ہوتا ہے کہ یہ بہت جلد ہو جائے گا' تم جلد ہی جان لو گے: انہوں نے کہا تھا کہ پھر دیکھو یہ ہمارا مقام' دیکھو یہ ہماری مجلسیں' دیکھو یہ ہماری یہ بیٹھکیں' دیکھو یہ ہمارے جلسے۔ کہا: ٹھیک ہے ذرا ان کو آگے بڑھ جانے دو' یہ مہلت کا وقفہ ہے' اسے گزر جانے دیجیے اور پھر ان سے پوچھیے گا کہ حضور فرمایئے! کیسا تھا مقام! کیسی تھی مجلسیں! پھر کیا صورت ہوئی؟ پتہ چلے گا: **مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا** (19:75)۔ کہ کس کی پوزیشن بدتر ہے اور کس کا جتھہ کمزور! جسے تم نے **خَيْرٌ مَّكَانًا** (19:73) کہا تھا کہ اس کی پوزیشن اعلیٰ و برتر ہے۔ وہ کہتا ہے: نہیں' قطعاً نہیں۔ یہ تو **شَرٌّ مَّكَانًا** (19:75) ہے۔ یہ پوزیشن تو بدتر ہے۔

---

[1] بی بی جی! آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب! مجھے کچھ تھوڑی سی انجانی کیفیت سی محسوس ہوتی ہے جو قدرے حیطہ ادراک سے باہر ہے۔

[2] بی اماں کو

[3] ڈاکٹر صاحب! اس جگہ درد ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ جگہ جہاں بڑا شدید درد ہے۔ اور اس پر بات کو پورا کر دیا۔

[4] یہ جو کچھ انجانی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے جو حیطۂ ادراک سے بھی باہر ہے اس کی اگلی شکل درد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وہ درد ہے کہ اگر اسے آپ نظر انداز کر دیں تو ناسور بن جاتا ہے۔

توانہوں نے کہا تھا کہ یہ تو **اَحۡسَنُ نَدِیًّا** (19:73) ہے' یہ پوزیشن تو اس پارٹی ہی کی ہے جس کی محفل زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے۔ یہاں کہا کہ نہیں' بالکل نہیں۔ یہ تو **اَضۡعَفُ جُنۡدًا** (19:75) ہے۔ اس کا جتھا تو از حد کمزور ہے۔ اور اس کے مقابلے میں وہ ہے جو **وَیَزِیۡدُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اہۡتَدَوۡا ہُدًی** (19:76)۔ صحیح روش زندگی اختیار کرتے ہیں' خدا کا قانون ہدایت' ان پر فلاح و کامرانی کی راہیں اور کشادہ کیے چلا جاتا ہے۔

اس سوال پر ہے کہ وہ کونسی حقیقت ہے جس کا پیش نظر رکھنا از حد ضروری ہے؟ اور اس کے مقابلے میں کیا ہوگا؟ گیارہ بج گئے' عزیزانِ من! یہ آئندہ ہوگا کہ پھر اس کے مقابلے میں کیا چیز آئے گی۔ ہم سورۃ مریم کی آیت 75 تک آ گئے' 76 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡم ؕ

❀......❀......❀......❀

اکیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 76 تا 87)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۗ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ
كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٧٧﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۗ سَنَكْتُبُ مَا
يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا
لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۗ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۗ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ
وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1976 کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 76 سے ہورہا ہے: (19:76)۔

مالی وسائل کی فراوانی کو ہی کامیاب زندگی قرار دیا جاتا تھا اور آج بھی یہی ہے

سلسلۂ کلام مخالفینِ قریش اور جماعتِ مومنین کے متعلق چلا آرہا تھا۔ یہ واضح رہے کہ صدرِ اسلام کے یہ وہ ابتدائی ایام ہیں جس میں یہ جماعت ہنوز تعداد میں بھی بڑی قلیل تھی، متاعِ حیات بھی بہت کم تھا۔ عام اصطلاح میں ایک کمزور سی، ناتواں سی، غریبوں کی جماعت تھی۔ جب ان مخالفین کو حق کی طرف دعوت دی جاتی اور کہا جاتا کہ تم غلط راستے پہ چلتے ہو تو وہ دلیل یہ دیتے کہ آؤ! ذرا دیکھو تو سہی کہ کن کی محفلیں زیادہ آراستہ و پیراستہ ہیں، زیادہ بارونق ہیں، کس کے محلات زیادہ شاندار ہیں، کن کے پاس دولت زیادہ ہے تو اسکے بعد خود فیصلہ ہو جائے گا کہ کون صحیح راستہ پہ ہے اور کون غلط راستے پہ ہے۔ یعنی ان کے ہاں غلط اور صحیح ہونے کا معیار ہی یہ تھا کہ دولت وحشمت اور ساز و سامان کس کے پاس زیادہ ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ یہ بات آج ہی کی نہیں جس کا ہم رونا روتے ہیں۔ یہ سلسلہ بھی، جو حق و صداقت کی کشمکش کا ہے، شروع سے ہی چلا آرہا ہے۔ یہ باطل ذہنیتیں ہیں۔ ان کے نزدیک کامیاب زندگی گزارنے کا معیار صرف مال و دولت ہوتا ہے۔ شرافت، نیکی، حسنِ کردار، پاکیزگی اور سیرت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ''جیدی کوٹھی اچ دانے اودے کملے وی

ہوتا چلا آ رہا ہے۔ معاشرے میں عزت کا' تکریم کا' تعظیم کا' مقام کا' معیار دولت ہو جاتی ہے اور اس کشمکش میں ایک چیز **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** (49:13) بھی آتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ سب سے پہلے آتی ہے۔ یہی عزت و تعظیم کا معاشرے میں معیار ہے۔

بدترین معاشرے کی نشانی

جانچنے کا معیار یہ ہے کہ کون زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہے' کس کی سیرت و کردار بلند و پاکیزہ ہے' شرافت کس میں ہے' حسنِ کردار کس میں ہے۔ یہ مال و دولت تو ہر طرح سے جمع کیا جا سکتا ہے۔ اور جب بھی کسی معاشرے میں شرافت کا' بڑائی کا' بلندی کا' عزت کا' شہرت کا' معیار دولت اور صرف دولت قرار پا جائے تو پھر وہ معاشرہ بدترین قسم کا معاشرہ ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! پھر ہر ایک اس ہوس میں مبتلا ہوتا ہے کہ میں دولت کسی طرح سے اکٹھی کروں' میں کس طرح سے دولت کے انبار حاصل کر لوں۔ اس کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے اور ہمارا آج کا دور تو اس کی زندہ شہادت ہے۔ ابھی چار دن پہلے یہ چیز نہیں تھی اور ہم جیسے لوگوں کی تو مشکل یہ ہے کہ ہمارا ماضی ابھی تک اُس ماحول کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ہمارا حال اِس ماحول میں ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں معیار کچھ اور تھا۔ اپنے سے مراد ہے کہ ذرا پیچھے کا وہ زمانہ دیکھیے جس میں محلے کا سب سے زیادہ باعزت وہ ہوتا تھا جو سب سے زیادہ شریف انسان ہوتا تھا' جو نیک انسان ہوتا تھا۔ یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ وہ بڑا امیر ہے' وہ عام طور پہ غریب ہوتے تھے اور ان شریف انسانوں کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ شرافت وجہِ تکریم اور عزت تھی۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جھکڑ چلا ہے کہ اب شرافت کو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ شریف اور دیانتدار آدمی کو تو بے وقوف کہتے ہیں اور نہ بھی کہیں تو اس کی کوئی پرسش' کوئی عزت نہیں۔ محلے کا وہ چوہدری نہیں رہا' محلے کا چوہدری وہ غنڈہ ہوتا ہے کہ جس کے پاس دولت زیادہ ہو جاتی ہے صاحب! معیار دولت ہو جاتی ہے' عزیزانِ من! تو معاشرہ کی تباہی آ جاتی ہے' پھر تمام اقدار یا Values کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دور کی معاشرتی حالت

حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے سے یہ بات شروع ہوئی اور پہلی چیز قرآن نے یہ بتائی کہ وہ آ کے کہتے یہ تھے کہ یہ تمہارے ساتھی' دیکھو تو سہی' کوئی سبزی بیچتا ہے' کوئی دوکانداری کرتا ہے' کوئی چھوٹے چھوٹے کام کر رہا ہے' جنہیں ہم کمینے کہتے ہیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جو کمین ہیں اور ہماری طرف دیکھیے: دولت کس کے پاس ہے' عزت کس کے پاس ہے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ کشمکشِ حق و باطل' تمام انبیاء کرام کے دور سے چلی آئی ہے۔ اس میں ایک چیز یہ بھی آتی تھی کہ وہ مخالفین کہتے تھے کہ معیارِ عزت دولت ہے اور یہی نہیں کہ یہ معیارِ عزت و تکریم ہے بلکہ سچے ہونے کا معیار یہ بھی ہے کہ آ ؤ دیکھو! ہمارے پاس کتنی دولت ہے اور اس کے جواب میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ ٹھیک ہے۔

اگر حشمت وقوت میں مستقل اقدار کی چاشنی شامل نہ کی جائے تو پھر ہر لقمہ زہر آلود ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! قرآن نے یہ نہیں کہا کہ دولت وجہِ نفرت ہے۔اس نے کہا یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں انسان کی سیرت وکردار کے تابع رہتی ہیں۔ دولت وثروت اور حشمت وقوت نہایت ضروری چیز ہے بشرطیکہ یہ مستقل اقدار کے تابع رہیں۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو کشتی اس کے اوپر تیرتی ہے۔اس کے لیے پانی کا ہونا ضروری ہے۔ وہی پانی اگر کشتی کے اندر آ جائے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔ یہ وہی پانی ہے جو اس کے لیے وجہ زیست تھا۔ جب دولت وثروت حسنِ کردار پر غالب آ جائے تو یہ وہ پانی ہے جو انسانی کشتی کے اندر آ جاتا ہے۔ یہاں بھی وہی چیز ہے جو ان مخالفین نے کہی تھی کہ آؤ' دیکھو کہ کس کی محفلیں زیادہ بارونق ہیں' کس کے ہاں مال ودولت زیادہ ہے۔ اِن قوانینِ خداوندی کی اتباع کرنے والوں نے کہا: ذرا تھوڑا سا ٹھہر جایئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مال ودولت' یہ جاہ وجلال' وجہ عزت ہیں۔ یہ مہلت کا وقت ہے' گزر جانے دیجیے' درمیان میں سے یہ مہلت کا وقفہ گزر جانے دیجیے اور پھر مآلِ کار دیکھیے کہ کس کا انجام بہتر ہوتا ہے اور قرآنِ حکیم کی یہی بنیادی تعلیم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ مفادِ عاجلہ کیطرف جاتے ہیں' چاہتے ہیں کہ یہ پیش پا افتادہ مفاد ابھی حاصل ہو جائیں۔ یہ Over night Millionaire بننے والے ہیں۔انہوں نے کہا: ٹھیک ہے' بنا جا سکتا ہے۔لیکن ذرا یہ دیکھو کہ مآلِ کار' انجام وآخرت کس کا بہتر ہوتا ہے: مستقل اقدار کا ہوتا ہے' یا لوٹ مار کا انجام بہتر ہوتا ہے؟ اسی لیے کہا کہ یہ جو درمیانی عرصہ ہے' اسے گزر جانے دیجیے یہ عرصہ ایک طرف تو ان لوگوں کے لیے جو اس طرح سے دولت جمع کرتے ہیں بڑا افریب انگیز بھی ہوتا ہے۔ وہ ہر نت' ہر نئے دن' دیکھتے ہیں کہ دولت زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے اور دوسری طرف یہ عرصہ اُن لوگوں کے لیے ہمت شکن' صبر آزما' بھی ہوتا ہے جو محنت کرتے ہیں' مشقت کرتے ہیں' دیانت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان مخالفین ومترفین کے مقابلے میں ابھی سر دست پیچھے رہتے ہیں۔ یہ چیز بڑی ہمت طلب ہوتی ہے۔اسی کا نام استقامت ہے۔ وہاں یہ کہا کہ تھوڑے عرصے کے بعد معلوم ہو جائے گا: **فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا** (19:75)۔تھوڑا اعرصہ توقف کیجیے' معلوم ہو جائے گا کہ پھر کس کا مال اچھا ہے؟ کس کے پاس ساز و سامان ایسا ہے جو باقی رہنے والا ہے؟ صرف توقف کیجیے۔

ھدیٰ کا مفہوم

اب اگلی آیت ہے جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔کہا: **وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى** (19:76)۔اس آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جو "ہدایت پہ چلتا ہے' اللہ اسے ہدایت زیادہ کرتا چلا جاتا ہے۔" عام طور پہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو پہلے ہدایت کے راستے پہ چل رہا ہے' صحیح راستے کے اوپر ہے' اسے اس مزید ہدایت کے کیا معنی ہیں کہ وہ ہدایت کرتا چلا جاتا ہے۔عزیزانِ من! ھدیٰ کے معنی ہوتا ہے: نمایاں راستوں کا سامنے آ جانا۔سمندر میں تو کوئی سڑک نہیں ہوتی' کوئی سگنل نہیں ہوتا۔اگر کہیں دور سے کوئی

چٹان ابھری ہوئی ہو تو وہ یہ بتا دے کہ اس طرف چٹان کے ساتھ نہ ٹکرائیے' یا یہ بتا دے کہ راستہ اِدھر جاتا ہے۔ اس قسم کی نمایاں چیز جو دور سے دکھائی دے کہ راستہ کدھر جاتا ہے' اس کے لیے عرب بنیادی طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔ اس کا ترجمہ ''کشادگی راہیں ہوتا ہے' کامیابی کی راہیں ہوتا ہے۔'' یہ جو اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (1:5) ہے کہ خدا ہدایت دیتا ہے' راہنمائی کرتا ہے۔ کس چیز کی راہنمائی کرتا ہے: کامیابیوں کے راستے کھولتا ہے۔ اب جو یہ چیز تھی کہ یہ لوگ صحیح راستے پہ چل رہے تھے اور ابھی کامیابیوں کی راہیں نمایاں طور پر ان کے سامنے نہیں آئی تھیں' کہا کہ ذرا رکیے: وَيَزِيۡدُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًى (19:76)۔ صحیح راستے پہ چلیے اور چلتے جائیے اور پھر دیکھیے کہ خدا کس طرح سے کامرانیوں کی مزید راہیں تمہارے سامنے روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے اور یہی وہ چیز ہے جو دوسرے مقام پہ قرآنِ کریم نے کہی ہے اور اس کے لیے ''سبلنا'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

قرآنی لفظ سُبُلَنَا کا مفہوم

یہ ایک بڑی اہم چیز ہے۔ یہ سورۃ عنکبوت میں ہے۔ وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (29:69)۔ جو لوگ بھی ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں' کوشش کرتے ہیں۔ لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (29:69)۔ ہم انہیں اپنی طرف آنے والے راستوں کی طرف راہنمائی کرتے چلے جاتے ہیں' وہ راستے ان کے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ جو راستے ہمارے تجویز کردہ ہیں' جو ہم نے نصب العین مقرر کیے ہیں' ان کی طرف آنے والی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں' کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اب غور کیجیے کہ پہلی چیز تو صراطِ مستقیم ہی تو ہے اور وہ تو ایک ہی راستہ ہے' ایک ہی صراط ہے۔ قرآنِ کریم نے تو صراطِ مستقیم کی ہی طرف ہدایت کی ہے۔ یہاں سُبُلَنَا میں جمع کا صیغہ ہے۔ یہاں ان کی طرف جانے والی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں' کامیابیوں کے حاصل کرنے کے مختلف طریقے ان کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ وہ سارے ہی مستقل اقدار کے تابع' مختلف راستے ہوتے ہیں' متعدد راستے ہوتے ہیں' بہت سی راہیں ہوتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ہماری طرف آنے والی راہ میں' وہ کوشش کرتا چلا جائے' سفر کرتا چلا جائے تو اس کے سامنے کشادگی مختلف راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ چیز یہاں سے ثابت ہو گئی؟ یہ اس زبان کا اعجاز ہے اور قرآنِ کریم کا حسنِ انتخاب ہے۔ ایک تو ہوتا ہے شاہراہ' جسے آپ ہائی وے (Highway) کہتے ہیں۔ یہ بڑی سڑک ہے۔ مثلاً وہی جیسے کلکتہ سے پشاور تک کہتے تھے' ہم آج بھی اسے جی ٹی روڈ (GT. Road) کہتے ہیں' جسے شاہراہ کہتے ہیں' جسے ہائی وے کہتے ہیں' وہ تو صراطِ مستقیم ہے۔ ایک ہی ہوتی ہے اور یہ جو چھوٹے چھوٹے راستے' اِدھر اُدھر سے نکلتے ہوئے جا رہے ہیں' انہیں سبیل یا سبل کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں' ان متعدد راستوں کو بشرطیکہ وہ آخر کار جا کر ہائی وے میں مل جائیں' سبیل یا سبل کہا جاتا ہے۔ وہ ہائی وے (Highway) تو اصل مقصود ہے یہی تو وہ صراطِ مستقیم ہے' یہی وہ ہائی وے ہی ہے جو اصل مقصود ہے۔ لیکن جہاں جہاں سے کسی مسافر نے چلنا ہے' جہاں جہاں سے آغازِ سفر کرنا ہے' ضروری تو نہیں ہے کہ اس کا مکان یا اس کا گاؤں یا اس کا شہر ہائی وے کے اوپر ہو۔ وہ ہائی وے سے ہٹ کے بھی تو ہوتے ہیں اور کثیر آبادیاں تو ہائی

وے سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیے' قرآن ایک ایک لفظ کے انتخاب میں کتنی عجیب باتیں کہہ جاتا ہے کہ جہاں سے تم نے آغازِ سفر کرنا ہے' وہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ ہائی وے پر ہو یا ہائے وے تمہارے سامنے ہو اور اس پہ پہلے ہی قدم سے چل پڑو۔ تمہارے ہاں سے چلنے کے لیے سبل ہونگے' مختلف پگڈنڈیاں ہوں گی' چھوٹے چھوٹے راستے ہوں گے ''جنوں کیندے نیں''❶ ہونگے۔ یہ ساری چیزیں ہوں گی۔ اب دیکھیے کہ زندگی میں کسی معاشرے نے جہاں سے اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ہائی وے یا صراطِ مستقیم پہ پہنچنا ہے' اس کے حالات' اُس کے تقاضے' اس کے سامنے ہوں گے۔ سب سے پہلے یہ راستے' یہ پگڈنڈیاں آنے چاہئیں۔ یہ وہاں سے شروع کرے گا۔ اس کے گھر سے لے کر یہاں تک آنے کے لیے یہ پگڈنڈیاں ہونگی' یہ چھوٹے چھوٹے راستے ہونگے۔ جب یہ ہائی وے پہ آئیں گے تو وہ ایک ہی ہائی وے ہوگی۔ ہر طرف سے آنے والا راستہ اس میں ملے گا۔ ہر طرف سے آنے والا مسافر اس کے اوپر آ جائے گا اور یہاں سے یہ ایک کارواں بن جائے گا۔

راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا❷

یہ کتنا پریکٹیکل اور عملی پروگرام ہے جو قرآن دیتا ہے۔ عزیزانِ من! وہ کہتا ہے کہ ہماری طرف آنے والے راستے میں جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ جو بھی یہ کرے گا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (29:69) ہم اس صراطِ مستقیم کی طرف آنے والے ان چھوٹے چھوٹے راستوں کی راہنمائی کرتے چلے جائیں تا آنکہ وہ اس ہائے وے کے اندر آ کے مل جائیں۔ پھر کیا ہوگا؟ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (29:69)۔ یاد رکھو! یہ خدا کی وہ نصرت ہے جو ان لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ نصرتِ خداوندی کیا ہے؟ یہ وہی ہے کہ آپ جن چھوٹے چھوٹے راستوں پر چلیں وہ اس کے ساتھ شاہراہ میں مل جائیں۔ اب راستے میں تو کئی ایک اور راستے بھی ہوتے ہیں جن کی طرف قرآن راہنمائی کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے راستے بھی وہاں جا ملیں گے۔ یہ بھی وہاں جا ملے گا اور وہ بھی۔ لہٰذا دین تو ایک شاہراہ ہے' اس پر چلنے کے لیے عملی طریق ہر زمانہ میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ اس کی Details کہلائیں گی' یہ اس کی جزئیات کہلائیں گی۔ یہ ان اصولوں کی جو قرآن نے دیئے ہیں' Details یا جزئیات کہلائیں گی۔ اصول تو ابدی ہونگے' شاہراہ تو وہی رہے گی' وہ نہیں بدلے گی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس تک لے جانے والی پگڈنڈیوں اور راستوں میں زمانے کے تقاضوں سے تبدیلی ہو جائے: کبھی پہلے سروے نہ ہوئی ہو تو راستہ لمبا ہو' سروے ہو جائے تو شارٹ کٹ ہو جائے۔ راستے میں کہیں کوئی ندی وغیرہ آ جائے تو اس کے اوپر پل بن جائے۔ اس طرح یہ راستہ اور زیادہ شارٹ ہو جائے۔ لہٰذا ہر زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے' ان پگڈنڈیوں اور ان چھوٹے چھوٹے راستوں کے اندر یہ حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں لیکن شاہراہ وہی رہی رہے گی'

---

❶ جنہیں کہتے ہیں۔

❷ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر — راہرو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

چنانچہ یہ ہے دین کا اور اسلام کا وہ اصول جو غیر متبدل رہے گا جب کہ اس پر چلنے کے طور طریق ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے چلے جائیں گے۔ بہر حال یہ وہ سبل ہیں جن کی طرف خدا راہنمائی کرتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک ہی لفظ کے اندر وہ کیا کچھ نہیں کہہ جاتا ہے اور یہیں یہ بات کہی کہ **وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى** (19:76)۔ جو بھی صحیح راستے کے اوپر چلتا ہے اس کے سامنے کامرانیوں اور کامیابیوں کی بہت سی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس طرح اس کے لیے راہنمائی کے نشانات کو ہم اور زیادہ واضح سے واضح تر کر دیں گے۔ اب رہی وہ بات جہاں سے اس بات کا سلسلہ چلا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں آ کے دولت اور حشمت دیکھو۔ شان وشوکت دیکھنی ہے' تو یہاں آ کے دیکھو۔ اور یہ معیار اس بات کے جانچنے کا ہوگا کہ کس کا راستہ صحیح ہے۔ کون حق کے اوپر چل رہا ہے۔ اس نے کہا: یہ ٹھیک ہے یہ تمہیں حاصل ہوا ہے۔

لفظ فانی اور لفظ باقی کا مفہوم

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا (19:76)۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ ناقابل تغیر اور باقی رہنے والا سامان حیات وہی ہے جس سے خدا کے قانون ربوبیت کے مطابق' انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اس نظام کے قیام واستحکام میں جو کچھ صرف کیا جاتا ہے' یہ اس کا بہترین بدلہ ہوتا ہے اور انجام کار یہی سب سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کی نگاہ مفادِ عاجلہ کی بجائے، ہمیشہ کاروبارِ حیات کے انجام کی منفعت پر رہنی چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ اس آیت میں ''باقیات'' کا عام ترجمہ تو یہی ''باقی'' ہوتا ہے جیسے یہ کہا جائے کہ تقسیم کرنے کے بعد یہ کچھ بچتا ہے تو ہمارے ہاں اسی کو 'باقی'' کہتے ہیں۔ اسے Balance بھی کہتے ہیں۔ باقی کیا رہا' بھی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس سے آگے بڑھتے ہیں تو ''فنا'' کے مقابلے میں لفظ ''بقا'' آتا ہے۔ ''فنا'' کے تو معنی ہیں فنا یعنی ختم ہو جانے والی بات۔ بقا کے معنی ہوتا ہے باقی رہنے والی چیز لیکن عربی زبان میں ان کے معنی بڑے گہرے ہیں۔ یہ ایک عظیم چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ قرآن جہاں یہ لفظ لا رہا ہے' وہاں اس نے یہ کہا ہے کہ یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ یہ فانی ہے' وہ فانی ہے اور جو بچے وہ ناقابل تغیر ہے' باقی رہنے والا ہے۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ عافل کے صیغے ہیں' اس میں فاعل ہیں اور اس میں یہ نہیں ہوتا کہ یہ کچھ کہیں کسی وقت جا کے ایسا ہوگا۔ جیسے عالمین کے معنی ہیں جو اس وقت بھی علم رکھتا ہے اور ہمیشہ رکھتا ہے یعنی اس میں یہ عمل رہتا ہے۔ رازقین کے معنی ہیں جو اب بھی رزق دے رہا ہے اور ہمیشہ رزق دیتا ہے۔ اس میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ اِس وقت بھی وہ کچھ ہو رہا ہے اور اُس وقت بھی تھا۔ اس میں ہمیشہ رہنے کا پہلو ہے' اس میں ناقابل تغیر ہونے کی بات ہے۔ یہ باقیات ہے اس کے مقابلے میں فنا کا لفظ ہے۔ ہمارے ہاں تو کسی چیز کو کہنا کہ یہ فنا ہو رہی ہے' فانی ہے' اس کے معنی ختم ہو جانا ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہ معنی نہیں ہیں۔

فنا کے معنی تغیر پذیر ہونا ہے' بنیادی طور پر اس کا ختم ہو جانا نہیں

ہمارے ہاں تو وہ فنا ہوتی ہے جب وہ ختم ہو جاتی ہے یعنی فلاں چیز تو فنا ہوگئی یہ تو آگے جا کے' مستقبل کا ایک وقت آتا ہے' جس وقت وہ چیز فنا ہوتی ہے۔ گرائمر کی رو سے فانی کے معنی ہیں کہ اس وقت بھی کچھ ہو رہا ہے تو اس وقت یہ فنا کیسے ہو رہی ہے؟ تو یہ بڑی گہری چیز ہے۔ فنا کے معنی ہوتا ہے تغیر پذیر' جس میں Change واقع ہوتا جائے' جس میں تبدیلی واقع ہوتی چلی جائے۔ آج آپ کے ہاں کی جو Scientific اور Philosphical Discoveries اور دیگر جتنی بھی معلومات ہیں وہ یہ بتا رہی ہیں کہ

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ہر شے تغیر پذیر ہے' اس میں تغیر واقع ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کی کوئی شے' ایک ثانیہ کے لیے بھی' اپنی اِس حالت میں نہیں رہتی۔ بظاہر ہم ان چیزوں کو دیکھتے ہیں' لیکن وہ کہتے ہیں کہ ذرا اس کا Analysis' تجزیہ کر کے دیکھیے' اسکی تحقیق کر کے دیکھیے' اب اگر میں تفصیل میں جاؤں گا تو وہ بات لمبی ہو جائے گی۔ وہ الیکٹران (Electron) پیدا ہوتے ہیں' جن سے یہ چیزیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ بجلی کی توانائیاں ہیں' بجلی کی لہریں ہوتی ہیں۔ ان میں ہر آن تغیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ اندازہ لگائیے' ہر آن تغیر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! عربی زبان کا ایک لفظ اور قرآنِ کریم کا انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔ جب اس نے کہا ہے کہ یہاں کی ہر چیز فانی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ہر وقت تغیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب ہم نے اس کا ترجمہ ''فنا ہونے والی'' کیا تو پھر انتظار کیا کہ اس وقت تو اس میں کچھ نہیں ہو رہا' ممکن ہے آگے جا کے ایک وقت آئے گا جب یہ عمل ہو لیکن ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کہ یوں یکدم کوئی چیز فنا ہو جائے گی۔ لیکن آپ اس پر غور کیجیے' وہ چیز یکدم ختم نہیں ہوتی۔

یہی میں عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے محاورہ عرب بڑی چیز ہے اور پھر لفظوں کا انتخاب بذات خود قرآن حکیم کا ایک بہت بڑا اعجاز ہے۔ قرآن کریم نے سورہ الرحمٰن میں ''فان'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کہا: **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** (55:26)۔ **فَانٍ** کے معنی کیے ہیں: فنا ہو رہا ہے: **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** (55:26)۔ ہم نے یہ سمجھا: یہاں کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے' وہ تو ایک آخری چیز ہے لیکن وہ تو فانٍ کہا ہے یعنی فنا ہو رہی ہے۔ یہ فنا کیا چیز تھی؟ ان لوگوں سے پوچھیے وہ Appreciate کریں گے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے اور چودہ سو سال پیشتر کہہ گیا ہے! جبکہ مادے Matter کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ تغیر پذیر نہیں ہے۔ یہ آپ کے ہاں کا فلسفہ چلا آ رہا تھا' یہ یونان کی Materialism ہے یعنی یہ فلسفۂ مادیت ہے جو چلا تھا اور زمانے میں چودہ سو سال پیشتر یہ کہنا کہ **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** (55:26)۔ یہ فاعل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں کہ فنا ہو رہا ہے۔ سائنس تو یہ کہتی تھی کہ یہ Preservation of Matter ہے' یہ بقائے مادہ ہے' یہ تو فنا ہی نہیں ہوتا۔ سائنس کا یہ مسلمہ ہے' یہ سائنس کا قانون بقائے مادہ ہے۔ اسے Law of Preservation of Matter کہتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا۔ فنا ''ختم ہو جانا ہے'' کے معنوں میں ہے۔ سائنس نے کہا کہ یہ صرف طبعی یا کیمیائی تغیر سے اپنی شکل بدلتا ہے۔ لکڑی جلتی ہے' لکڑی نہیں رہتی' وہ کوئلہ ہوتی ہے' راکھ ہوتی ہے۔ اس میں سے کچھ گیسز نکلتی ہیں۔

یہ ساری چیزیں جن سے یہ شے مرتب تھی' وہ Split up ہو جاتی ہیں' الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی معدوم نہیں ہوتی' ختم نہیں ہوتی۔ یہ اپنی شکلیں بدلتی ہیں' ان میں تغیر آتا ہے' اِن میں Change ہوتا ہے۔ اس کے اندر تبدیلی آتی ہے۔ کہا: **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** (55:26)۔ یہاں کی ہر شے تغیر پذیر ہے' اس میں تغیر آتا رہتا ہے۔

جسم انسانی ہر آن تغیر پذیر ہے

عزیزانِ من! اب یہیں سے ایک چیز آگے چلی۔ آج کی سائیکالوجی ہمیں بتاتی ہے کہ جسمِ انسانی میں بھی ہر آن تغیر آتا رہتا ہے۔ یہ بھی ''فانٍ'' ہے۔ ہر آن' کروڑوں کی تعداد میں وہ خلیے (Life Cells) جن سے انسان کا جسم مرتب ہے' وہ مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے (Cells) بنتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ تغیرات جسمِ انسانی کے ساتھ ہر آن' ہر سانس میں' جاری ہے۔ اب ان کی تحقیق یہ ہے: پہلے وہ یہ کہتے تھے کہ سات سال کے بعد انسانی جسم کا کوئی پہلا سیل باقی نہیں رہتا' بالکل نیا جسم ہوتا ہے۔ اب اس خلیے (Cell) کے ٹوٹنے کے عمل میں بھی' انہوں نے مدت Reduce کردی ہے۔ غالباً تین سال میں ہی وہ کہتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا جسم Change ہو جاتا ہے۔ یہ سابقہ جسم جسم ہی نہیں رہتا۔ بالکل' یہ تو بالکل' دوسرا ہو جاتا ہے۔ تو یہاں سے یہ بات چلی کہ جب یہ انسان کا سابقہ جسم رہتا ہی نہیں ہے تو پھر انسان پہ کسی اپنے کیے گئے وعدے کے ذمہ داری کیسی؟ اس نے جو ذمہ داری لی تھی اس کی ضمانت کیا؟ کہ میں پانچ سال یا دس سال کے بعد آپکو اتنا روپیہ دے دونگا۔ سائنس کی تحقیق کے مطابق سات سال یا تین سال کے بعد یہ وہ شخص رہا ہی نہیں۔ وہ کہے گا کہ Analysis' یعنی تجزیہ کرا کے دیکھ لیجیے صاحب! اس میں تو ایک ذرہ بھی وہ نہیں ہے جو اس میں دس سال پہلے یا پانچ سال پہلے تھا جس نے وعدہ کیا تھا۔ وہ سیل جو تھے وہ تو ختم ہو گئے۔ یہ بالکل نئے ہیں' نئے سیل کہیں گے کہ ہم نے تو وعدہ ہی نہیں کیا۔ وہ بھی سچے ہیں۔ میری بہنیں بھی ہنس رہی ہیں اگر میں یہ بات کہہ دوں کہ صاحب! دس سال پہلے جو شادی ہوئی' نہ وہ میاں رہا' نہ وہ بیوی رہی۔ وہ جن بن گیا' یہ بھوتنی بن گئی۔ وہ کہیں گے صاحب! ہم تو وہ ہیں ہی نہیں۔

عزیزانِ من! کیا بتاؤں قرآن کیا کیا کچھ کہتا ہے: **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** (55:26)۔ اس کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لیکن **وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ** (19:76) ناقابلِ تغیر اور باقی رہنے والا سامانِ حیات وہ ہے جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ **فانٍ** کے ساتھ ''باقی'' ہے۔ **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** (55:26)۔ کے ساتھ یہ ''باقی'' ہے۔ کہا: جی ہاں! ایک شے ایسی بھی ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے اور وہ انسان کی ''میں'' ہے۔ وہ اس کی Personality ہے' اس کی ذات ہے' اس کا نفس ہے۔ برگسان نے اس کی Definition یہ کی ہے: Changelessness in change یعنی تغیر میں باقی رہنے والی۔ قرآن کریم نے کہا: **وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ** (19:76)۔ یہ ہر شے' تم اور تمہارا جسم تک' سب فنا ہو جائے گا لیکن اِس جسم کے اندر جو ''میں'' ہے' وہ تمہارے ہر عمل' ہر وعدے' ہر قول' ہر خیال کی ذمہ دار ہے۔ آپ جب بھی کہتے ہیں کہ میں ''ذمہ دار ہوں'' دس سال کے بعد بھی کہا جائے گا: تم نے کہا تھا' میں نے کہا تھا' میرے اس جسم نے نہیں کہا تھا جو نہیں رہا۔ میں نے کہا تھا۔ میں وہی ہوں۔ یہ جو وعدہ سے پھر

جانے والے ہوتے ہیں ان کی 'میں' ہوتی ہی نہیں ہے۔ 'میں' تو اپنے وعدہ سے پھر ہی نہیں سکتی۔

انسان اپنی اس 'میں' کو اپنے ہی ہاتھوں سے مسل کر رکھ دیتا ہے

عزیزانِ من! جو وعدہ سے مکرنے والا ہے اس کے اندر اس کی ''میں'' ہی نہیں ہوتی۔ دراصل یہ ''میں'' Undeveloped ہوتی ہے' اس کی نشوونما نہیں ہوتی۔ آج وعدہ کر کے کل ہی وہ کہے کہ نہیں صاحب! میں نے تو یہ نہیں کیا تھا۔ یہ وہ ''میں'' نہیں ہے جس نے کل وہ کہا تھا۔ وہ ''میں'' ہوتی تو وہ تو کبھی بھی یہ نہ کہتی کہ ''میں'' نے نہیں کہا تھا۔ ''میں'' نے تو رات کو سوتے وقت کہا تھا کہ میں صبح پانچ بجے ضرور اٹھونگا' اور پانچ بجے آنکھ بھی کھلتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ذرا سا اور سو جایئے۔ یہ ''میں'' بدل چکی ہوئی ہے۔ اگر رات والی ''میں'' ہوتی تو وہ صبح کبھی اپنے ساتھ وعدہ خلافی نہ کرتی۔

عزیزانِ من! یہ جو انسان اپنے ساتھ بھی وعدہ خلافی نہیں کرتا' عزم کرتا ہے یا فیصلہ کرتا ہے اور جم کے کھڑا ہوتا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ''میں'' فانی نہیں ہے' تغیر پذیر نہیں ہے' Undeveloped نہیں ہے۔ یاد رکھیے' غیر نشوونما یافتہ ''میں'' بدلتی رہتی ہے۔ ''میں'' جب بھی غلط ہوتی ہے تو اُس میں Changelessness in change والا معاملہ نہیں ہوتا ہے۔

ہوئی لاکھ دنیا ادھر کی ادھر ہے
وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

لہٰذا اس طرح کی جو پختہ ''میں'' ہے' یہ دودھ کے اندر پکی ہوئی ''میں'' ہے۔ جب تک یہ فیٹ (Fat) بہ شکلِ کریم (Cream) رہتی ہے' پانی ڈالتے جایئے وہ پانی ہوتی جائے گی۔ گلاس میں ڈالیئے گلاس کی شکل اختیار کر لے گی' پیالے میں ڈالیئے' وہ پیالے کی شکل بن جائے گی' وہ Undeveloped Form کے اندر فیٹ (Fat) یا کریم (Cream) ہوتی ہے اور جب وہ مکھن (Butter) کا پیڑا بن جاتی ہے پھر سارا دن اس کو پانی کی چاٹی اور لسی میں ڈالے رکھیے۔ لسی تو بدلتی چلی جائے گی مگر ''مکھن دا پیڑا اسے طراں دا اس طراں ای روے گا۔'' ❶ وہ نہیں بدلتا' فیٹ Develop ہو گئی' وہ Changelessness in change والی بات ہو گئی۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کے اس مال و دولت کی صورت یہ ہے کہ یہ جو ان طریقوں سے لیا جاتا ہے انہی طریقوں سے چلا بھی جاتا ہے۔ وہ تو فانٍ ہے' تغیر پذیر ہے لیکن جو کچھ تمہیں وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ (19:76) انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے حاصل ہوتا ہے' وہ تغیر آشنا نہیں ہے' وہ باقی رہنے والا سامانِ حیات ہے' وہ ناقابلِ تغیر ہے۔ عزیزانِ من! وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ (19:76) کی کیا بات ہے! سچ تو یہی ہے' حقیقت یونہی ہے کہ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ (19:76) کے حساب سے جو صالحات ہیں' وہی باقی رہ سکتی ہیں۔ ناقابلِ تغیر اور باقی رہنے والا سامان حیات وہی ہے جس سے خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ جب صلاحیتوں کی

---

❶ مگر یہ مکھن کا پیڑا ویسے کا ویسا ہی رہے گا۔

نشوونما پختہ ہوجائے تو پھر یہی کہا ہے کہ خَیۡرٌ عِنۡدَ رَبِّکَ ثَوَابًا (19:76)۔ یہی ہے تمہارے خدا کے اصول کے مطابق' قانون کے مطابق بہترین بدلہ' بہترین Reward' بہترین ثواب۔ ابھی عرض کرتا ہوں کہ یہ بہترین ثواب کیا ہے؟

ثواب کا قرآنی مفہوم

بہترین ثواب' کیا بات ہے! تیسرے ہی لفظ یعنی وَخَیۡرٌ مَّرَدًّا (17:76) میں فوراً ہی اس لفظ ثواب کی تشریح کر دی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ خدائے خبیر کا کلام ہے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ اپنے طور پر انہوں نے ثواب کے کیا معنی کر لینے ہیں۔ لہٰذا وہی جھٹ سے کہہ دیا: وخیر مردًا (19:76)۔ اور انجام کار یہ (بدلہ) سب سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔ کیا بات ہوئی! بہت بڑی بات ہوگئی۔ مگر آپ کے ہاں تو حساب کتاب ہی دوسرا ہے: اس کی اتنی تسبیحیاں گن لیجیے۔ 33 دفعہ یہ گن لیجیے۔ 34 دفعہ یہ کہہ لیجیے۔ سو دفعہ یہ کیجیے۔ ہزار دفعہ یہ کر لیجیے۔ اتنے نفل پڑھ لیجیے' یہ کچھ کر لیجیے۔ صاحب! یہ اس سے کیا ہوگا؟ کہ جی! اس سے ثواب ہوتا ہے۔ ہم دن میں کتنی بار یہ لفظ سنتے ہیں! کتنا عام ہے ہمارے ہاں یہ لفظ! ''ایناں ثواب ہوندا ہیگا۔''[1] ہر بات کے متعلق یہ چیز ہے کہ ثواب ہوتا ہے۔ یوں کر لیجیے ثواب ہوتا ہے۔ پوچھیے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ کہ جی ثواب ہوتا ہے۔ ان سے کہیے کہ یہ تو عربی زبان کا لفظ ہے۔ ''تے میں تے ڈھگا جیا ہیگا۔ مینوں تے نئیں کوئی ہور زبان آندی۔ مینوں پنجابی اچ سمجھا دو ثواب ہوندا کی ہیگا اے' او بابا! کُش ہوندا اے ناں' او جو کچھ وی ہوندا اے ایتھے اونوں سمجھایا جاسکدا ای نئیں۔ ویسے اے ہوندا اے' تو جو کیناں ایں ثواب ہوندا اے مینوں وی تے دس ہوندا کی اے؟ لو جی! اونوں اے وی نئیں جے پتہ ثواب کی ہوندا اے۔''[2] او بابا! مجھے نہیں معلوم جبھی تو پوچھ رہا ہوں۔ دراصل ''پتہ تے اس دسن والے نوں وی نہیں ہیگا لیکن کدی نئیں کہے گا کہ مینوں نئیں پتہ ہیگا۔''[3] منہ میں سے جھاگ نکلے گی' پیشانی پہ جفر کے نقشے بنیں گے' آنکھوں سے شعلے نکلیں گے' مسجد سے نکال دیا جائے گا۔ بات یہ ہے کہ جب ثواب کہتے ہیں تو اسے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے: ''ہوندا اے' تے ہوندا کی اے؟''[4] عزیزانِ من! ''جے انوں دس دتا جائے کی ہوندا اے؟''[5] تو پھر تو یہیں' عزیزانِ من! بات ختم ہوگئی۔ زیادہ سے زیادہ جب اور کوئی راستہ نہیں ملے گا تو اس کے بعد ایک ہی چیز باقی رہتی ہے کہ ''یہ ہوتا ہے'' لیکن یہ آخرت میں جا کے ملتا ہے۔ ٹھیک ہے۔

---

1. اس سے ثواب ہوتا ہے۔
2. میں تو بیل سا احمق ہوں مجھے کوئی دوسری زبان نہیں آتی۔ مجھے پنجابی میں بتا دیں کہ ثواب ہوتا کیا ہے؟ ارے بابا! یہ کچھ تو ہوتا ہی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے اس دنیا میں سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ مگر یہ ہوتا ہے۔ تم جو کہتے ہو کہ ہوتا ہے' مجھے بھی بتاؤ کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ لو جی! اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ ثواب ہوتا کیا ہے؟
3. حقیقت یہ ہے کہ اُس بتانے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ہوتا کیا ہے۔ مگر وہ کبھی نہیں کہے گا کہ مجھے بھی یہ معلوم نہیں ہے۔
4. اگر ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟
5. اگر اسے بتا دیا جائے کہ کیا ہوتا ہے؟

یعنی یہاں اس کے متعلق کوئی بات نہیں لیکن جس خدا نے یہ ثواب کی بات کہی ہے وہ تو کچھ اور کہتا ہے: وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (3:145)۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ملیں گے۔ ایک وہ جو محض دنیاوی زندگی کے مفاد کو اپنا مقصود سمجھیں اور دوسرے وہ جو دنیاوی مفاد کے علاوہ اخروی زندگی کے مفاد کو بھی سامنے رکھیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو شخص یا قوم جس مفاد کے حصول کے لیے کوشش کرے' اسے وہی مل جاتا ہے خواہ وہ دنیاوی ہو یا اخروی زندگی کا ہو۔ لہٰذا تم میں سے جو اس نظام سے وابستہ رہے گا' اس کی کوششوں کے نتائج بہت جلد اس کے سامنے آ جائیں گے۔

عزیزانِ من! دیکھا آپ نے یہ شاکرین کے کچھ عمل کا بدلا ہے' اور کیا ہے: جو ثواب الدنیا چاہتا ہے تو اسے ثواب الدنیا ملتا ہے' جو ثواب الاٰخرۃ چاہتا ہے تو اسے ثواب الاٰخرۃ ملتا ہے' جو دونوں چاہتا ہے اسے دونوں ملتے ہیں یہاں۔ تو میں نے کہا ہے کہ اس آیت کے مطابق ثواب تو الدنیا میں بھی موجود ہے' آپ کے ہاں موجود ہے۔ وہ ثواب کا لفظ جس خدا نے استعمال کیا ہے' جس قرآن میں اس نے یہ کہا ہے' وہ یہ ہے کہ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا (3:145)۔ ہم اسی دنیا میں دیتے ہیں۔ تو یہ تو اس دنیا میں بھی ملنے والی چیز ہے۔ بہت سے ریفرنسز (References) اس سلسلے میں میں پیش کر سکتا ہوں مگر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو قرآن ایک ہی آیت میں بات کہہ جاتا ہے صاحب: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (4:134)۔ جو اس دنیا میں مفاد' اجر' بدلہ' نتیجہ' لینے کا طلب گار ہو۔

ہر دو جہانوں میں عمل کے اجر (ثواب) کا ملنا

جو کوئی اس دنیا ہی میں ثواب چاہتا ہے تو یہ یہاں کی بات ہوگئی۔ تو اس سے کہہ دو کہ اپنے اس چاہنے کو ذرا اور آگے بڑھائے۔ تم اتنا ہی مانگتے ہو' صرف تمہاری مانگ بڑی مختصر اور محدود ہے۔ ہم تو اس سے بہت زیادہ دیتے ہیں۔ سنیے' عزیزانِ من! کیا انداز ہے! مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (4:134)۔ جو یہ چاہتا ہے کہ مجھے اس کا بدلہ یہیں مل جائے' اس سے کہہ دو: فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (4:134)۔ ارے! ہم تو دگنا دگنا دیتے' یہاں بھی دیتے ہیں۔ یہاں کے چاہنے والے کو کہو کہ وہ اپنی مانگ کو کچھ اور بڑھائے' یعنی ایسا دینے والا بھی کہاں اور ملے گا! ورنہ اگر کوئی مانگتا ہے کہ اسے اتنا ہی دے دیا جائے تو یہ بھی بڑی چیز ہوتی ہے کہ صاحب! وہاں سے جو مانگو' ملتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری مانگ مختصر ہے' حدِ نگاہ تھوڑی دور تک جا رہی ہے' یہ بھی ہم دیتے ہیں: فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (4:134)۔ وہاں بھی دیں گے' یہاں تو ہم دیں گے ہی۔ بات یہ ہوگئی۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! ثواب ایک ایسی چیز ہے جو یہاں' اس دنیا میں ملتی ہے' آخرت میں بھی جا کے ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے: دونوں جگہ ملتی ہے اور اگر یہ چیز ہو کہ صاحب! یہاں نہیں ملتی ہے' اور بقول ان کے صرف وہیں ملتی ہے تو خدا کے اس وعدے کو کیا کریں گے کہ ہم یہاں بھی دیتے ہیں۔ جو یہاں دیتے ہیں وہ لینے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ کیا دیتے ہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ پتہ ہی نہ چلنے دے۔ وہ تو ثواب الدنیا مانگ رہا ہے اور وہ کہے: ''ہم نے تمہیں دے دیا' اور

لینے والا کہے کہ ''میرے پلے اے تے کچھ پیا ئیں ہیگا''[1] اور دینے والا یہ کہے کہ ''او جا جا کہہ جو دتا تینوں۔''[2]

اس دنیا میں ثواب کے ریٹرن (Return) کی محسوس شکلیں

عزیزانِ من! یہاں قرآن محض ذہنی چیزیں نہیں دیتا۔ وہ اس دنیا کے اندر چیزیں محسوس طور پر دیتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ** (24:55)۔ یہاں مملکت دیتے ہیں' یہاں حکومت دیتے ہیں' یہاں استخلاف فی الارض دیتے ہیں' یہ چیز ہے کہ یہاں بھی دیتے ہیں۔ اب اس کے بعد ثواب کے لفظ کی طرف آ جایئے بات واضح ہو جائے گی۔ آپ کوئی کام بھی کریں' آپ کا وقت صرف ہوگا' کچھ پیسہ بھی صرف ہوگا' کچھ توانائی کا حصہ بھی صرف ہوگا۔ یہ کچھ صرف ہوا' جسے آپ نے Invest کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ کاروبار کیا: **اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ** (9:111)۔ جماعت مومنین کا نظام خداوندی کے ساتھ ایک عظیم معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے نظام خداوندی' ان کا جان اور مال خرید لیتا ہے۔ ٹھیک ہے صاحب! تم نے یہ کچھ ہمارے پاس بیچا' یہ کچھ دیا ہے' یہ انوسٹ (Invest) کیا ہے' اس کی ہمارے ہاں انوسٹمنٹ کی ہے۔ ایک تو ہے کہ ''وہ دیا ہے۔'' وہ آپ کے ہاں سے گیا' آپ کے ہاں وہ ختم ہو گیا۔ ایک یہ ہے کہ آپ نے انوسٹمنٹ (Investment) کی ہے۔ وہ کچھ ہے جو آپ نے لگا دیا ہے تو اس کی Return کیا ہے؟ یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو کاروباری ہے' جو ہر کاروبار کرنے والا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے جی! یہ بہت اچھا ہے کہ اتنا انوسٹ (Invest) کیا' اتنا لگایا' اتنا صرف ہوا۔ آخر میں اس کی Return کیا آئے گی؟ اس کی ریٹرن کیا آئے گی کے لیے یہ ثواب کا لفظ ٹھیک ہے۔

جتنا صرف کرو گے' جتنا مانگو گے' اتنا اور مل جائے گا' ختم ہی نہیں ہوگا

ہاں! پانی کی بڑی قلت ہوتی تھی۔ کسی جگہ پانی جمع ہو جاتا تھا۔ اس میں سے پانی لیتے جائیں یا وہ پانی آگے کھیتیوں کو دیتے جائیں۔ وہ پانی نکلتا جائے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر کچھ اس قسم کے پانی کے ذخیرے یا حوض یا تالاب ہوتے ہیں کہ جن میں سے جتنا پانی نکلتا چلا جائے اتنا ہی آتا چلا جائے۔ اس کو ثواب کہتے تھے۔ یہ قوم بلاتھی' یہ وہی ہے جسے آپ Recoupment کہتے ہیں۔ جو چیز جتنی صرف ہوئی وہ اتنی Replace ہوتی چلی جائے' وہ اتنی ہی ملتی چلی جائے۔ اسے Return کہتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ اتنا انوسٹ کیا پھر اس میں سے (Recoupment) بازیافت کیا ہوگی۔ کیا آئے گا' اس میں سے ریٹرن کیا ہوگی۔ لہٰذا ثواب کے لیے انگریزی میں یہ Exact لفظ تھا' پہلے انوسٹ کرنے کی ضرورت ہے' کچھ صرف کریں گے۔ پھر Return کا سوال ہوگا۔

---

1. میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا
2. ارے جاؤ بابا! تمہیں کہہ جو دیا۔

ثواب بخششیں نہیں بلکہ انوسٹمنٹ کی ریٹرن ہے

پہلی چیز بغیر کچھ انوسٹ کیے ہوئے ریٹرن مانگنا ہے یہ تو پھر بخشش ہی ہے ''منگن والی گل ہیگی اے۔''❶ وہ تو ثواب دیتا ہے۔ پوچھتا یہ ہے کہ آپ نے کیا انوسٹ کیا تھا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا اتنے کا اتنا ہی ملے گا؟ کہا: نہیں' خیر ملے گا اور دوسرا لفظ کہا ہے مردًا۔ یہ لفظ ردًا سے ہے اس کے معنی ہیں: واپس لوٹنا۔ کہا: جتنا انوسٹ کرو گے تو وہاں اس سے زیادہ بہترین چیز اور مزید اجر ملے گا۔ پہلے سے زیادہ ریٹرن (Return) ہوگی اور پھر اس میں ایک فرق اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ تم نے انوسٹ کیا ہے وہ تو ''فانٍ'' تھا' تغیر پذیر تھا لیکن جو ریٹرن تمہیں مل رہی ہے' ایک تو یہ ہے کہ وہ خیر ہے۔ اس کے بارے میں ابھی میں عرض کرتا ہوں۔ اور دوسری ہے: اَلْبٰـقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ (19:76)۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں تغیر نہیں ہوگا۔ ایسی ریٹرن جو خیر بھی ہو اور اس میں تغیر بھی نہ ہو۔ کہا: ہمارے ہاں سے یہ جو ثواب ملتا ہے وہ دراصل خیر ہے۔

لفظ خیر کے تصور کا قرآنی مفہوم

پہلے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس خیر کے لفظ کو کس طرح تبدیل کر دیا جاتا ہے: خیر کوئی بات نہیں۔ یعنی یہاں کچھ نہ ہو' وہاں کہتے ہیں: خیر۔ ''اوہدے بعد اے آ گیا ساڈے پنجابیاں اچ۔ ایہہ خیر پائیں اے کڑیئے بار بچے نوں۔ اے اوہی خیر ہیگا او منگن والے فقیر نوں جیہڑا دتا جاندا اے جو دیندا اے ناں او' اووی آن کے کیندا اے جی خیر پاؤ''❷ ریٹرن کے لیے خدا کے ہاں سے بلند ترین لفظ خیر ہے۔ یہ ''خیر'' ہوتا کیا ہے؟ محکوم میں اور آزاد میں فرق کیا ہوتا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ محکوم کے اختیارات نہیں ہوتے' آزاد صاحبِ اختیار ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ وہ آزاد ہوتا چلا جاتا ہے' اس کے اختیارات کی وسعتیں اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ''اختیار'' جو لفظ ہے' اس کا مادہ ہی ''خیر'' ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کی پہچان ہی یہ ہے کہ یہ خود کتنا صاحبِ اختیار ہے' اپنے فیصلے آپ کر سکنے کی کتنی صلاحیت رکھنے والا ہے۔ اس کا کتنا اختیار رکھنے والا ہے۔ اس کی جتنی جتنی نشوونما ہوتی چلی جائے گی' اتنے ہی اس کے اختیارات بڑھتے چلے جائیں گے۔ اتنے ہی اپنی ذات کے اختیارات بڑھتے چلے جائیں گے۔ کمزور خودی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جہاں بھی اختیار دیا ہوا ہوتا ہے' وہ وہاں بھی اس کو صرف میں نہیں لاتا اور پختہ خودی کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ہر قسم کی بندشیں ہیں' صلیب بھی سامنے کھڑی ہے' جہاں کہا جاتا ہے کہ سچ نہیں بولنے دیں گے۔ لیکن وہ کہتا ہے: تم مجھے نہیں روک سکتے ہو؟ انسان کے اختیار کی اتنی وسعتیں ہیں۔

---

❶ یہ تو مانگنے والی بات ہے۔

❷ اس کے بعد اب ہمارے ہاں پنجابیوں میں یہ آیا کہ اے بچی! بال بچوں کو ''خیر'' دو۔ یہ وہی ''خیر'' جو مانگنے والے فقیر کو دیا جاتا ہے۔ جو یہ دیتا ہے وہ بھی آ کر کہتا ہے کہ خیر ڈالو۔ لفظ خیر کے قرآنی مفہوم کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ النحل شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام لاہور' ۲۰۰۳' ص ص۔ 42-41

نشو ونما یافتہ خودی کی کیفیت و ماہیت

عزیزانِ من! وہ خودی جو پابندِ سلاسل ہوتی ہے' وہ تو ضعف خوردہ خودی ہوتی ہے جب کہ اس کے برعکس جو پختہ خودی اور نشو ونما یافتہ Personality ہے اس کے اختیارات کی تو حدود ہی نہیں ہوتیں وہ حدود فراموش ہوتی ہے اور وہ تو یہی چیز ہے جو قرآن کہتا ہے کہ **لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (2:286)۔ یہ جو تم سمجھتے ہو کہ ہم تمہارے اوپر یہ پابندیاں عائد کررہے ہیں' یہ اس لیے نہیں ہیں کہ تمہاری خودی سمٹ جائے' تمہارے اختیارات کم ہو جائیں بلکہ یہ اس لیے ہیں کہ **اِلَّا وُسْعَهَا** (2:286)۔ تاکہ تمہارے نفس کے اختیارات وسیع ہوتے چلے جائیں۔ یہ نہر کے سامنے جو ٹھوکر (Fall) لگا دی جاتی ہے تو وہ اس کی رفتار کو بند کرنے کے لیے نہیں ہوتی ہے۔ یہ ٹھوکر اس میں مزید روانیاں پیدا کرنے لیے ہوتی ہے۔ اس سے اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے : **لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (2:286)۔ ہم جو اس نہر کے راستے میں کبھی کہیں ٹھوکر لگا دیتے ہیں' یہ نہ سمجھو کہ ہم اس نہر کو بند کرنے کے لیے لگاتے ہیں بلکہ وہ اس لیے لگاتے ہیں تاکہ اگر اس کی رفتار میں کمی آ رہی ہے تو وہ اور تیز ہو جائے' تیز تر ہوتی چلی جائے' تاکہ یہ زندگی جو جوئے رواں ہے' رواں خواہد بود۔ خیر کے یہ معنی ہیں عزیزانِ من! اب آ گئی وہ دوسری بات۔

کہتے ہیں کہ آیئے' دیکھیے' ہمارے پاس کتنا مال و دولت ہے' کتنا جاہ و عزت اور شان و شوکت ہے! کہا: ٹھیک ہے' تھوڑا سا انتظار کرو۔ یہ مہلت (Respite) کا وقفہ ہے جس میں ہم چاہتے یہ ہیں کہ تم اپنی اِس غلط روش کو بدل لو۔ باقی رہا مآلِ کار! تو مآلِ کار میں تم دیکھو گے کہ یہ قوم جتنا' یہ غریب سی قوم' یہ ناداری قوم' بظاہر جو انوسٹ (Invest) کر رہی ہے' اس کی ریٹرن دیکھو کہ ہمارے ہاں سے کتنی ملے گی۔ ایسی ریٹرن جو آج تم کہتے ہو کہ ان کے اختیارات میں کیا ہے' تم دیکھو گے کہ ان کے اختیارات کی وسعتیں' ایران اور روما تک جا پہنچیں گی اور پھر یہ وسعتیں **اَلْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ** ہونگی کہ جب تک اس پروگرام پر عمل پیرا رہیں گے' اس کی بقا میں تغیر واقع نہیں ہوگا۔ یہ نا قابلِ تغیر اور باقی رہنے والا سامانِ حیات انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما کی صورت میں دیتا رہے گا۔

ایسا شجرِ طیب جو موسموں کی قیود کا بھی پابند نہ ہوگا

قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ وہ شجرِ طیب ہے جو بے موسمہ پھل بھی دیتا ہے صاحب! اس کے پھل دینے کے لیے کوئی موسم بھی متعین اور محدود نہیں ہے کہ کبھی تو پھل لگا ہوا ہو اور دوسرے موسم میں اس کے اندر پھل نہ رہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ پھل دیتا رہتا ہے۔ اسے **اَلْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ** (19:76) کہتے ہیں۔ اب آپ نے غور فرمایا کہ **عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ مَّرَدًّا** (19:76)۔ یہ خیر مردًا دیکھیے۔ اس میں ثواب کے لفظ کا مفہوم خود متعین کر دیا ہے۔ عزیزانِ من! لوٹ کر جو ریٹرن ہؤا اس کا لفظی معنی ثواب ہوتا ہے۔ یہ ردًا عربی زبان کا کیا لفظ ہے! اسی سے ''تردید'' کا لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں: اس کی بات کو لوٹا کے

''اوہدے منہ تے مار دینا''[1] کسی چیز کا اُلٹا لوٹا دینا۔ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا (19:77)۔ اصول زندگی سے انکار کرنے والے کو جب مفاد عاجلہ حاصل ہوتے ہیں تو وہ اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ اسے مال و دولت بھی فراواں ملتا رہے گا اور اس کی اولاد (جتھہ Majority) کی بھی کثرت ہوگی اور اس کی یہ حالت ہمیشہ ایسے ہی رہے گی۔ صحیح قوانین سے انکار کرنا اور ان سے سرکشی برتنا اور اس کے بعد مطمئن ہو جانا اور دوسرے کو اپنے برسرِ حق ہونے کی شہادت میں یہ کہنا کہ ہمارا یہ مال کتنا ہے دیکھیے تو! دیکھیے تو کہ ہمارے افرادِ خاندان کتنے ہیں! یہ چیز آج کم کم سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں پر لفظ تو ''وَلَدًا'' ہی ہے تو شروع ہی سے یہ چیز چلی آ رہی ہے کہ مخالفین ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ دیکھیے! ہمارے پاس مال و دولت کتنی زیادہ ہے اور ہمارے ''وَلَدًا'' کس کثرت سے ہیں۔ ''وَلَدًا'' کا ترجمہ ہم نے صرف اولاد کر لیا اور کہا کہ ہماری اولاد کتنی ہے! اس لیے اس وقت سے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا جب قبیلے کی زندگی تھی کیونکہ ابتدائی طور پر انسانوں کی تو قبائلی زندگی ہی ہوتی تھی اور اس قبائلی زندگی میں یہ ایک خاندان ہوتا تھا اور پھر یہ خاندان اپنی ہی اولاد کے اوپر مشتمل ہوتا تھا اور اسی سے قبیلہ بن جاتا تھا۔ اسی سے اس کا جتھہ بنتا تھا۔ اس لیے قرآن نے ''وَلَدًا'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آج سیاسی انداز میں اس کے لیے بہتر لفظ اکثریت ہے۔

باطل کا نظام افراد کی تعداد پر متشکل ہوتا ہے نہ کہ اصولوں پر

اس طرح جن کے ہاں اولاد زیادہ ہوتی تھی ان کا قبیلہ زیادہ بڑا ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں جو لڑائیاں ہوتی تھیں، جو جھگڑا ہوتا تھا یا جو وقعت ہوتی تھی، وہ قبیلے کے افراد کی گنتی پہ ہوتی تھی۔ کہتے تھے کہ صاحب! ان کا قبیلہ بہت بڑا ہے۔ ہمارے ہاں جب تک گاؤں کی زندگی تھی اس میں ابھی تک یہ بات تھی۔ کہتے تھے: بڑا گھر وہ ہوتا تھا ''جدے جی بہت ہوندے سن''[2] یہ چیز ہے جو قرآن نے ان کی اس اصطلاح کو ابھی تک جاری رکھا۔ اس کے معنی ہیں: افرادِ خاندان، افرادِ قبیلہ، قوم کی نفری۔ اور آج کی اصطلاح میں اس کے معنی ہیں: جن کے ووٹرز زیادہ ہوں۔ الفاظ ہی بدلے ہیں، گنتی تو ان کے ہاں آج بھی بڑی اہمیت رکھ رہی ہے۔ یہ باطل کے نظام ہیں، عزیزانِ من! جس میں افراد کی کثرت، گنتی کی کثرت، کسی کے برسرِ حق ہونے کی وجہ ہوتی جائے۔ جو حق کی آواز لے کے اٹھتا ہے اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کا تو اس وقت سیکنڈ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا، ووٹ دینے والے تو ایک طرف رہے۔ جب اس حق کی آواز کو بلند کرنے والے نے یہ کہا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:164)۔ میں سب سے پہلے خود اس حکیم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والا ہوں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا پہلا اعلان ہے، یہ اس سارے کرۂ ارض کے اوپر حق کی آواز بلند کرنے والے ایک شخص کا اعلان ہے۔ جس کا سیکنڈ کرنے

---

1. اسی کے منہ پہ بات مارنا۔
2. جس کے افرادِ خاندان بہت زیادہ ہوتے تھے۔

والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ شخص فخر سے یہ کہتا ہے: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:164)۔ میں نے تو اس وقت اس کی آواز بلند کی تھی جب دوسرا سیکنڈ کرنے والا بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ تو قرآن اسی رسول کو کہتا ہے کہ یاد رکھو! اگر تم نے اکثریت کو معیارِ صداقت قرار دے دیا تو پھر سمجھو کہ تم حق سے پھر گئے۔ دنیا کی اکثریت تو باطل کے اوپر ہے' اس کی تو گنتی نہیں ہے' عزیزانِ من! یہ جو مغرب کا جمہوری نظام ہے' جس کے متعلق اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) نے کہا تھا کہ یہ اس لیے باطل ہے کہ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے۔ تو قرآن کہتا ہے کہ کس کا وزن زیادہ ہے: مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ (101:6)۔ جس شخص کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا۔ قرآنِ کریم گنتی کا شمار نہیں کرتا۔ اسی لیے اس نے یہ چیز کہی کہ یہ کہتے ہیں: دولت بھی ہے اور دیکھیے ہمارے ہاں افراد بھی کتنے ہیں' ہماری پارٹی میں ووٹرز کتنی ہے۔ یہ آج کی اصطلاح میں ''ولد'' کا ترجمہ ہے۔ کہا کہ یہ ہے وہ چیز جو تم کہتے ہو کہ چونکہ ہماری اکثریت ہے اسی Strength لیے اقتدار ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس ہی رہے گا: اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (19:78)۔ اس سے پوچھو کہ کیا اسے اس باب میں کہیں سے غیب کا علم حاصل ہو گیا ہے یا اس نے خدائے رحمٰن سے کوئی اقرار نامہ لکھوا رکھا ہے۔ کہا کہ ان سے پوچھیے کہ کیا ان کو کوئی غیب کی خبریں مل رہی ہیں؟ کیا یہ مستقبل کی باتیں جانتے ہیں کہ آج بھی یہ ہے اور مستقبل کے اندر ہمیشہ کے لیے یہی رہے گا۔ ہے کوئی ذریعہ ان کے پاس؟ یا انہوں نے خدا سے اس بات کا کوئی پٹہ لکھوا رکھا ہے کہ یہ ہمیشہ تمہارے نام کے لیے ہم نے دوامی شدہ کر دیا ہے۔ کیا کوئی اس قسم کی چیز ان کے پاس ہے؟ ذرا ان سے پوچھو تو کہ کیا انہیں اس بات میں کہیں سے غیب کا علم حاصل ہو گیا ہے یا انہوں نے خدائے رحمان سے کوئی اقرار نامہ لکھوا رکھا ہے؟

مفادِ عاجلہ ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہاں دونوں ہی باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ انسان مستقبل کا علم نہیں رکھتا ہے اور دوسری یہ کہ اس قسم کی حاصل شدہ چیزوں کے لیے خدا نے کوئی ضمانت نہیں دے رکھی کہ یہ ہمیشہ اسی طرح سے رہیں گے۔ وہ تو ابھی ابھی کہہ رہا ہے کہ یہ تو عاجلہ ہیں' یہ بدلنے والی ہیں' یہ فانٍ ہیں۔ یہ ہمیشہ کیسے رہیں گی؟ کہا: كَلَّا (19:79)۔ ہرگز نہیں۔ کیا بات ہے انکار کی! یہ بڑے زور کے الفاظ ہوتے ہیں: ''بلا'' اور ''کلا'' کے جو الفاظ ہوتے ہیں' وہ دراصل ہرگز نہیں کے معنوں میں ہوتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے یہ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (19:79)۔ یاد رکھو! یہ جو کچھ کہتا ہے یا سمجھتا ہے' بالکل غلط ہے۔ ہم اس کی ایک ایک بات کو لکھتے چلے جاتے ہیں اور اس وقت اس کی مہلت کی رسی کو دراز کیے جا رہے ہیں۔ یہ مہلت کا وقفہ ہے' لمبا ضرور ہو رہا ہے لیکن ان کے گلے میں رسی پڑی ہوئی ہے جو کھینچ کے ان کو تباہی کی طرف لیے جا رہی ہے اور اسکے بعد جب یہ مہلت کا وقفہ ختم ہو جائے گا تو دیکھ لے گا کہ جس اولاد اور مال کے زعم پر یہ اس طرح بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہا ہے: وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا

(19:80)۔اس کے ہم ہی وارث ہوں گے اور وہ ہمارے سامنے بالکل تنہا آئے گا۔اور اس کے بعد انجام تم دیکھو گے کہ یہ جتنی باتیں کر رہے ہیں' یہ جن چیزوں کے متعلق کہہ رہے' ہم ان سب کے مالک ہونگے۔یعنی جو ہماری جماعت ہے' جو ہمارا نام لے کے اٹھی ہے' جو ہمارے قوانین کے مطابق چلتی ہے' وہ اِن سب چیزوں کی وارث ہوگی۔

وارث کا قرآنی مفہوم

پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں وارث مالک کو کہتے ہیں۔اب ہمارے ہاں تو وارث وہی ہے جو مرنے کے بعد ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے وارث ہونگے حالانکہ یہ تو ہر اضافی چیز' جس کو یہ میری کہتا ہے' سب یہاں چھوڑ جائیں گے اور ان کی تنہا ''میں'' ہمارے سامنے آئے گی۔میں نے اس سے پہلے بھی ایک آدھ درس کے اندر عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات میں کہا ہے۔مثلاً ایک مقام پہ قرآنِ کریم نے کہا: وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی (6:94)۔اور خدا کہے گا کہ تمہیں اپنے متبعین کی جمعیت پر بڑا ناز تھا۔لیکن آج تم ہماری عدالت میں تنہا آ گئے۔عزیزانِ من! اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک ایک فرد ہمارے پاس آئے گا۔قرآنِ کریم بڑی عظیم چیزیں کہہ جاتا ہے صاحب! کہا کہ ہر وہ شے جسے تم ''میری'' کہتے ہو' وہ ''فانِ'' ہے۔وہ موت کے ساتھ یہاں رہ جاتی ہے: میری دولت' میرا مکان' میری جائیداد' میرا بھائی' میرا باپ' میری اولاد' میری بیوی' میرا یہ سب کچھ ہے حتیٰ کہ میرا جسم اور یہاں تک کہ میری جان بھی یہ سب کچھ موت کے ساتھ ہی یہاں رہ جاتا ہے۔یہ جو ''میری'' کہہ رہا ہے' یہ جو کہہ رہا ہے کہ یہ ''میرا'' ہے' یہ کون ''میں'' ہے' یہ سب کچھ کون کہہ رہا ہے۔یہ ''میں'' کون ہے۔یہ ہے اصل سوال' یہ ہے اصل مسئلہ۔یہ ماں باپ' یہ بھائی بہن' یہ دولت' یہ جائیداد وغیرہم وہ ہیں جسے تم نے ''میں'' یا ''میرا'' کہا ہے۔یہ ہے کیا؟

انسان کی ''میں'' اس کے ہر عمل کی ذمہ دار ہوگی اس کی وارث ہوگی

کہا: یہ جسے تم نے ''میرا یا میری'' کہا ہے وہ سب کچھ یہاں رہ جائے گا اور یہ جو صرف تمہاری ''میں'' ہے وہ ہمارے سامنے آئے گی۔وہ اس لیے کہ تمہارے تمام اعمال کی ذمہ دار انسان کی یہ ''میں'' ہی ہوتی ہے' جسم نہیں ہوتا۔اگرچہ چوری یہ ہاتھ کرتا ہے' سزا اس ہاتھ کو نہیں ملتی' سزا اس ''میں'' کو ملتی ہے جو ذمہ دار ہے۔کہا کہ فَرْدًا (19:80)۔یہ سب چیزیں جو تمہارے ہاں کی اضافی (Relative) ہیں' وہ ختم ہو جائیں گی۔باقی رہنے والی شے تمہاری نشوونما یافتہ ذات ہے جو غیر متبدل ہے' جس میں تغیر نہیں ہے' وہ ہمارے سامنے آئے گی۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (19:81)۔اور ان لوگوں نے خدا کے سوا اوروں کو بھی صاحب اقتدار تسلیم کر رکھا ہے تا کہ وہ ان کے لیے تقویت کا موجب بنیں۔یہ جو بڑے بڑے صاحبِ اقتدار ہیں' یہ جو ان کے مقرب بنتے ہیں' ان کو صاحبِ اقتدار مانتے ہیں تا کہ ان کے ہاں سے ان کو تقویت ملے' یہ بڑی پارٹیوں کے ساتھ اسی لیے شامل ہوتے

چلے جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ لگنے سے' لکڑی کے ساتھ لگنے سے' لوہے کے بھی ساتھ لگنے سے' انہیں عزت ملے گی' تقویت ملے گی۔ یہ تقویت ان کے اپنے اندر نہیں ہوتی' یہ کسی سہارے سے طاقتور بنتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ ان لوگوں نے خدا کے سوا' اوروں کو بھی صاحبِ اقتدار تسلیم کر رکھا ہے تاکہ وہ ان کے لیے تقویت کا موجب بنیں۔

یہ تمام اضافی سہارے ختم ہو جائینگے

کہا: یہ ان سہاروں کے ساتھ وابستہ ہو کے سمجھتے ہیں کہ ہم میں یہ طاقت آ گئی۔ کیا بات ہے! **كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا** (19:82)۔ ان سے کہہ دو کہ ان کا یہ خیال بھی خام ہے جن کی یہ اس خیال سے محکومیت اختیار کیے ہوئے ہیں' وقت آنے پر وہ ان کی اطاعت گزاری ہی سے انکار کر دیں گے اور ان کے لیے موجب تقویت ہونے کے بجائے الٹے ان کے مخالف ہو جائیں گے۔ عزیزانِ من! یہاں کہا کہ ان کے ساتھ چلتے جاؤ گے' ٹھیک چلتے ہوئے اگر انہوں نے تمہاری آنکھ کے اندر ذرا سا بھی تغیر دیکھا تو ایسی مخالفت کریں گے کہ جتنی قوت آج باقی ہے' یہ بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ ہیں وہ سہارے جن سے یہ تقویت لیتے ہیں۔ کہا: قوت چاہتے ہو تو اپنے اندر پیدا کرو۔ سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ کہا: یہ جو اس وقت تمہاری مخالفت پہ بہت آگے بڑھنے والے نظر آتے ہیں۔ **اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا** (19:83)۔ اصل یہ ہے کہ ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات اور ان کے سرغنے ان کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو چکے ہیں اور انہیں اس نظامِ حق و صداقت کی مخالفت پر اکساتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ ان کے بڑے بڑے سرغنے ہیں' لیڈر ہیں۔ انہیں اکساتے رہتے ہیں' Instigate کرتے رہتے ہیں: چلو آگے' الٹاؤ ان کو' کرو تباہ' کرو یہ توڑ پھوڑ' کرو یہ فساد۔ قرآن انہیں شیاطین کہتا ہے: بھڑکانے والے۔ قرآن کیا لفظ استعمال کر جاتا ہے! اس میں ساری Instigation ہوتی ہے۔ آپ خود نہیں ابھرتے' دوسروں کو بھڑکاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بھڑکانے والے جو ہیں' یہ بھڑکاتے چلے جاتے ہیں مگر تم **فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ** (19:84)۔ اب باب میں جلدی نہ کرو۔ گھبراؤ نہیں' جلدی نہ کرو' کوئی بات نہیں۔ یہ سوڈا واٹر کا ابال ہے۔ **اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا** (19:84)۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ ہم اپنے قانونِ مہلت کے مطابق ان کے دن گن رہے ہیں اور ان میں سوڈا واٹر کا ابال آ رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ترجمہ بڑا صحیح ہے کہ ہم تو اپنے قانونِ مہلت کے مطابق ان کے گنتی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہ مہلت کے وقفے کا محاورہ ہے: **يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ۝ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا** (19:85-86)۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب ہم متقیوں کو' اپنے ہاں عزت و رفعت اور حصول عطا و نوازشات کے لیے نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ جمع کریں گے اور مجرمین کو اس طرح جہنم کی طرف ہنکائیں گے جس طرح پیاسے جانوروں کو گھاٹ کی طرف ہنکایا جاتا ہے۔ ہنکایا کیا جاتا ہے' ان کی تپش دروں انہیں خود کشاں کشاں اس کی طرف لے جاتی ہے۔ عزیزانِ من! یہاں کہا کہ مکافاتِ عمل کے باعث وہ ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا۔ اس میں کیا صورت ہوگی' میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا

کہ قرآن کا تو فرمان ہے کہ یہ جو جنت میں زمـــرًا ہوتے ہیں‘ ان کی بھی جماعت جاتی ہے۔ تو کہا کہ اس دن متقین گروہ بن کے خدائے رحمٰن کی طرف جائیں گے۔ یہاں پر قرآنِ کریم نے ''وَفْدًا'' کا لفظ استعمال کیا۔ واہ کیا بات ہے!

جنت میں متقین بحیثیت مہمان ہوگا

میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کچھ ایسے ملے گا جیسے مہمان کی میزبانی کی جاتی ہے۔ جنت یوں دی جائے گی۔ ہماری طرف سے تمہاری میزبانی ہوگی‘ تم ہمارے مہمان ہوگے۔ مہمان کی تو بڑی عزت کی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ ''اوہدے لئی پروٹھے پکائے جاندے نیں''۔ ❶ اس کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ یہاں ''وفد'' کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو ''وفد'' کے معنی کچھ اور ہو گئے۔ ان کے ہاں یہ بڑا ہی عزت وتکریم کا لفظ ہوتا تھا: عزت‘ بلندی‘ تکریم‘ عزت بھی گروہ کی‘ ایک فرد کی نہیں‘ ایسا گروہ جس کے پورے گروہ کی عزت کی جائے‘ سرفرازی اور بلندی ان کے حصے میں ہو‘ ان کی آ ؤ بھگت کی جائے‘ ان کے لیے بہترین ساز وسامان مہیا کیا جائے‘ نشو ونما کے سامان دیئے جائیں۔ یہ سب کچھ اس ایک لفظ ''وفد'' کے اندر آ جاتا ہے صاحب! وفد کے لفظ کے اندر!! متقین ❷ ''وفد'' کی صورت میں رحمٰن کے ہاں مہمان جائیں گے اور وہاں ان کی عزت وتکریم ہوگی یہ کچھ تصور میں نہیں آ سکتا۔

آخرت میں مجرمین کی حالت

اس کے مقابلے میں جو مجرمین ہیں‘ ان کے لیے لفظ تو عجیب ہے: ہانکے جائیں گے۔ جسے قرآن کہتا ہے کہ ہانکے جائیں گے۔ کبھی وہ لفظ ''وردًا'' دیکھ لیجیے۔ یہاں وردًا کا لفظ آیا ہے: گھاٹ کی طرف لیجانے والی چیز۔ بڑی چیز ہے۔ یہ ٹھیک ہے چرواہا پیچھے سے مویشیوں کو ہانک کے ہی گھاٹ کی طرف لیجاتا ہے۔ اس لیے یہاں لفظ وردًا آیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے معنی گھاٹ ہوتا ہے‘ جہاں مویشیوں کو پانی پینے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ درحقیقت ان مویشیوں کی جو آتشِ دروں ہے وہ انہیں کھینچ کے لیے چلی جا رہی ہوتی ہے‘ جو جانور پیاسا نہیں ہوتا اس کو گھاٹ تک لیجانے کے لیے مصیبت ہوتی ہے‘ اِدھر کرو تو اُدھر نکل جاتا ہے اور جس کے اندر پیاس ہوتی ہے وہ تو رسیاں تڑا کے بھی اس طرف چلا جاتا ہے صاحب! تو یہ جو انہیں مجرم کہا ہے‘ ان کے اپنے اندر عذاب کے لیے ایک کشش ہوتی ہے جو ان کو عذاب کی طرف کھینچ کے لیے چلی جا رہی ہوتی ہے صاحب! بظاہر نظر آتا ہے کہ کوئی ہانک کے لیے چلا جا رہا ہے۔ وہ تو ان کے اندر کی چیز ہوتی ہے۔ جو کھینچ کے لیے جا رہی ہوتی ہے۔ اور عزیزانِ من! یہ تو محسوس الفاظ‘ محسوس انداز سے سمجھانے کی ساری باتیں ہیں‘ ورنہ اس نے تو کہا تھا کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6-7)۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کی

---

❶ یہی نہیں ہوتا کہ اس کی پراٹھوں سے خاطر ومدارت کی جاتی ہے۔

❷ وہ لوگ جو سفر زندگی میں ضابطۂ قوانین خداوندی کے مطابق غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔

بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ یہ وہ جہنم ہے کہ جس کی آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں' مجرم تو تباہیوں کی طرف کھنچے چلا جاتا ہے' کھنچا چلا جا رہا ہے۔

ہمارے ہاں شفاعت کا مفہوم

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ (19:87)۔ اُس دن کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہوگا۔ کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا' بہت مشکل مقام آیا' کسی کی شفاعت کام نہیں دے سکتی' وہ شفاعت کر ہی نہیں سکے گا۔ یہ شفاعت کیا چیز ہے؟ یہاں تو' عزیزانِ من! سارا دارومدار ہی شفاعت پہ چلتا ہے۔ یہ چیز کس قدر مقدس ہوگئی ہے کہ ہمارے ہاں جس کو بدترین گالی دینی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہیں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ شفاعت کے معنی ہمارے ہاں سفارش ہوتا ہے۔ یہاں بات تو مجرمین کی ہو رہی ہے اور سفارش تو ہمیشہ مجرم کی ہوتی ہے۔ جرم ثابت ہو' اس کی سزا مل رہی ہو اور پھر اس حاکم کا' اس جج کا' کوئی ایسا مقرب ملے جس کی اس تک پہنچ ہو' وہ سفارش کرے اور وہ مجرم چھوٹ جائے۔ چھڑانے کا وہ لائسنس ملنا ہے' مل تو جانا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے لیے عرضی' درخواست Application جو کچھ بھی ہے' دے تو دی ہے۔ وہ ٹھیک ٹھیک پورا بھی اترتا ہے لیکن صاحب! وہ آج کل کا زمانہ ایسا ہے کہ یہاں تو سفارش کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ اب اس درخواست کے بعد سفارش ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ عرضی بعد میں دیتے ہیں' سفارش پہلے ڈھونڈی جاتی ہے۔ وہ اگلا کہتا ہے کہ میاں! کیا تم نے وہاں اپلائی (Apply) کیا ہے؟ ہاں میں نے اپلائی تو کیا ہے۔ ٹھیک ہے: Qualification بھی ہے' میں سلیکشن میں آ بھی سکتا ہوں۔ وہ کہتا ہے: کوئی سفارش بھی ڈھونڈ لی ہوئی ہے؟ یعنی ہمارے ہاں یہ چیز ایسی لازمی ہوگئی کہ سفارش کے بغیر کام نہیں چلتا۔ یہ لازم بھی ہوگئی اور اسکے ساتھ یہ بھی کہ جس حاکم یا جج یا افسر کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ تو صاحب! صرف سفارش پہ ہی کام کرتا ہے تو اس کا بدترین Character سامنے آتا ہے: آن میرٹ (On Merit) فیصلہ نہیں کرتا' قانون کی رو سے فیصلہ نہیں کرتا' سب فیصلہ سفارش پہ کرتا ہے۔ آپ سوچیے عزیزانِ من! جس سفارش کا ہمارے ہاں یہ تصور ہے اور پھر اس سفارش کی نسبت یہ بھی ہے کہ خدا حاکم ہے اور وہاں اس کے ہاں مکافاتِ عمل نہیں ہے کہ انسان کے اعمال کے نتیجہ میں جو چیز ہوگی سزا یا جزا وہ ملے گی۔ خدا بھی ایسا حاکم نہیں ہے اور پھر اس کے ہاں انبیاء کرام' اور اُن میں بھی نبی اکرم ﷺ جیسے حضور نبی وہ سفارش کرنے والے ہوں گے کیوں کہ خدا تو سفارش کے بغیر سنتا ہی نہیں۔ ہمارا سارا تصورِ دین سفارش کے متعلق فیصلہ دینے والا ہے۔ عزیزانِ من! حالانکہ دین کے تو معنی ہی مکافاتِ عمل کے ہیں' وہ مکافاتِ عمل جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا کہ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (99:7)۔ جو ذرہ برابر قانونِ خداوندی کا اتباع کرے گا' اس سے حسنِ عمل کا خوش گوار نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا۔ ایک ایک ذرہ سامنے آئے گا' آئے گا ہی نہیں' وہ تولا جائے گا' اور اس تولنے کی میزان کے

متعلق کہا کہ یہ الحق ہے۔ وہ میزان "دھرم کانٹا" [1] ہے۔ دھرم کانٹا ہو اور تلنے پہ فیصلہ ہو! عزیزانِ من! وہاں سفارش کچھ بھی کام دے سکتی ہے؟ کسوٹی پہ سونا کسا جائے یا دھرم کانٹے میں تولا جائے' تو کیا تولنے والا کسی کی سفارش سن لے گا؟ وہ کہے گا کہ نہیں صاحب! یہ اتنا نہیں' کانٹا اتنا بتائے' وہ کانٹا اگر ایسا ہے کہ کمی بیشی کرے تو وہ دھرم کانٹا ہی نہیں رہ سکتا۔ یہ خدا کا میزان ہے جس میں عمل کا ایک ایک ذرہ تلتا ہے اور اس کا فیصلہ یہ ہے کہ مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101:6-9)۔ جس شخص کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا' اس کی زندگی' اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی۔ لیکن جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا' جہاں اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا دل و دماغ کچھ کام نہیں دے گا اور وہ پریشان حال مارا مارا پھرے گا۔

انسانی ذات پر اس کا ایک ایک عمل منقوش ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے مکافاتِ عمل کے اسی کانٹے کے لیے کہا کہ بھائی صاحب! انسانی اعمال کے تولنے کا وہ کانٹا ہے اور اِدھر تمہارے ہاں کی وہ پرچیاں ہیں یا نہیں جو بھی متاع کہو' لیکن اِن دونوں کا موازنہ ضرور کرو۔ مکافاتِ عمل کے دھرم کانٹے کے پاس ہم تو خود وہاں کھڑے بھی نہیں ہوتے۔ یہ Automatic وہ Balance ترازو ہے' جس میں تولنے والے کے ہاتھ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خود جا کے دیکھ لو۔ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا (17:14)۔ آج اپنا فیصلہ آپ کر لے' ہم وہاں کھڑے بھی نہیں ہوتے تو آپ کھڑا ہو جا اور اس میں اپنے ہاں کی یہ جنس ڈال دے۔ یہ ہمارے ہاں آٹو میٹک ہے۔ يَنۡطِقُ عَلَيۡكُمۡ بِالۡحَقِّ (45:29)۔ بڑا سچا کانٹا ہے' حق کے ساتھ بات کرتا ہے اور خود دیکھ لے کہ کتنا وزن نکلا۔ عزیزانِ من! سوچیے' یہ ہے مکافاتِ عمل اور یہ جزا اور سزا کہیں باہر سے نہیں آ رہی۔ ہمارے ہاں تو محسوس تصور ہے: اِدھر ایک گڑھا ہے' اس کے اندر آگ جل رہی ہے' اُدھر باغات لگ رہے ہیں' وہاں ایک رضوان کھڑا ہے' اِدھر والے کو اُدھر بھیج دیجیے' یا اُدھر والے کو اِدھر پھینک دیجیے۔ یہ ہے ہمارے ہاں کا تصور۔ یہ صرف سمجھانے کی چیزیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر' ہر عمل کا نقش' اس کی ذات پر ساتھ کے ساتھ منقوش ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس کے یہ اعمال' جو اس کی ذات کی صلاحیت کو پروان چڑھاتے ہیں یا نشو و نما دے رہے ہیں' زیادہ ہو جائیں گے' وہ انسانی ذات نشو و نما یافتہ ہو جائے گی۔ پچھلے ہی درس میں' میں نے کہا تھا کہ وہ Pass Marks حاصل کر لے' اس کا یہ پلڑا ثقلت ہو جائے گا' یہ پلڑا جھک جائے گا' اسے اگلے درجے میں چڑھا دیا جائے گا' وہ زندگی کے اگلے درجے میں چلا جائے گا۔ جس کا یہ پلڑا کم رہ جائے گا' وہ روک دیا جائے گا۔ وہاں تو آگے بڑھنے کا یا رکنے کا یہی اصول ہے لیکن اب یہ جو مثال میں نے دی ہے' یہ پاس مارکس کی ہے اور پیپرز کی ہے۔ یہاں پر

---

[1] پکا' محکم' سچا' قانونی کانٹا۔

پھر ہمارے ہاں تو سفارش ہی کام دیتی ہے: ''منے دا داخلہ بیج دتا؟ بیج دتا۔ اوے لیا پتہ انور دا' داخلہ تو پیلاں ای؟ پتہ لے لیا۔ فیر انتظام وی کچھ کر لیا ہیگا؟ اوہو ابا جی نے پیلاں ای کر لیا ہیگا سی۔ اوتوتے اپنے ناغے وی کیتے' حاضریاں وی پوریاں نہیں سن۔ اووی پوریاں کروالیاں سن اوناں نے۔ امتحان اینیں دینا اے' تے کردا پھردا اے او پیو۔ ہوگیا ہے انتظام۔ اونتیجہ کدوں نکلنا اے؟ او کدوں نکلے سانوں پتہ ہیگا؟ ابا جی نے پہلے ای پتہ لے لیا سی'' ❶ عزیزانِ من! خدا کے ہاں یہ چیز نہیں۔ وہاں تو مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (99:8) ہے۔ جو ذرا برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا' اس کی سزا پائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق پورے قرآن میں شفیع کا لفظ نہیں آتا

لہٰذا اصولاً بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں شفاعت کا جو تصور ہے' وہ تصور تو بنیادی طور پر' قطعی طور پر' دین کی اساس کے ہی خلاف جاتا ہے' خلاف ہی نہیں جاتا بلکہ اس کی ساری عمارت ہی ڈھا دیتا ہے اور پھر اس سے تو خدا کا تصور بڑا ہی باطل ہو جاتا ہے کہ وہ سفارشیں مان مان کے مجرموں کو جنت میں بھیجے گا اور حضور نبی اکرم ﷺ یا انبیاء کرام علیہ السلام کے متعلق یہ تصور ابھرتا ہے کہ وہ مجرم کی سفارش کریں گے' معاذ اللہ معاذ اللہ۔ ایک ہی لفظ میں یہ بات صاف ہو جائے گی کہ عزیزانِ من! سارے قرآن میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق شفیع کا لفظ تک نہیں آیا۔ شفیع المذنبین تو ہم نے قائم کیا ہے۔

شفاعت کا قرآنی مفہوم

یہ شفاعت کیا ہوتی ہے؟ عربی زبان میں دو لفظ ہیں: ایک ''وتر'' اور دوسرا ''شفاع'' یا ''شفع''۔ ''وتر'' تو تنہا ہوتا ہے' یعنی فرد' یعنی اکیلی چیز' جب کہ شفاع یا شفع کے معنی ہوتے ہیں: ''دو ہو جانا' کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا' دوسرا آدمی۔'' یہ حقِ شفعہ/شفعاء آپ نے دیکھا۔ یہ شفعہ/شفعاء وہی ہے کہ مثلاً یہ مکان بک رہا ہو تو وہ قانون بھی آپ کو یہ اجازت دیتا ہے کہ آپ وہ قیمت دے کر مکان کے مالک بن جائیں جو قیمت دوسرے لوگ اس مکان کی لگائیں۔ یہ فقہ کی ایک اصطلاح بھی ہے۔ فقہ میں ہمارے ہاں یہ چیز آجائے گی کہ جو اس کے ساتھ والے مکان میں رہتا ہو' وہ اس بکنے والے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ حق کفایت ہو جاتا ہے۔ اسی واسطے اس کو شفعہ/شفعاء کہتے ہیں کہ جس کی جائیداد ساتھ لگتی ہے۔ وہ زمین بک رہی ہو جس کی ساتھ کسی دوسرے کی زمین ہو' اس کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ اسے حقِ

---

❶ کیا مُنے کا داخلہ بھیج دیا ہے؟ ہاں بھیج دیا۔ ارے کیا انور کا پتہ داخلہ سے پہلے ہی لے لیا تھا؟ ہاں پتہ لے لیا تھا۔ پھر کیا کچھ انتظام بھی کیا؟ ارے بھئی! ابا جی نے پہلے ہی اس کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ ارے! تمہاری تو غیر حاضریاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ انہوں نے ہی حاضریاں بھی پوری کروا دی تھیں۔ امتحان تو اس نے دینا ہے مگر یہ سب کچھ کر اس کا باپ رہا ہے۔ ہاں اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ بھئی! نتیجہ کب نکلے گا؟ ہمیں معلوم ہے کہ کب نکلے گا۔ ابا جی نے تو پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔

شفعہ کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ''اس کے ساتھ کھڑا ہوا ہوتا'' ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔ یہاں بھی وہی ہے جسے کہتے ہیں: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (5:2)۔ برو تقویٰ کے کاموں میں دوسرے کی معاونت کیا کرو۔ اسے ہی کہتے ہیں بھئی! کہ جو سچائی کے کام میں کھڑا ہوا اس کے ساتھ کھڑے ہو جایا کرو۔ یہ ساتھ کھڑے ہو جانا اس کی سفارش کرنے کی بات ہے۔ یہاں کہا ہے کہ برو تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ یہ جو مدد کرنے کی چیز ہے اس مدد کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔

عدالت کی تمثیلی منظر کشی

قرآنِ کریم نے بات تو مکافاتِ عمل کی بتائی ہے لیکن اسے سمجھانے کے لیے قرآن نے نقشہ عدالت کا ہی دیا ہے: عدالت ہے' وہاں جج کھڑا ہے' مجرم کو ہتھکڑیاں پہنائے ہوئے' آگے سے کھینچتے ہوئے لایا جاتا ہے۔ یہ ڈاکو بڑے بھاری مجرم ہیں۔ یہ دھکیلنے والا سپاہی پیچھے بھی ہوتا ہے تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔ یہ سب کچھ وہاں کھڑا ہوتا ہے اور صاحب! گواہ بھی بلائے جاتے ہیں' انہیں شاہد کہا جاتا ہے۔ مجرم کے حق میں بھی تو گواہی دی جاتی ہے' مجرم کے حق میں گواہی دینے والا' وہاں عدالت کے کٹہرے میں' اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کو اس مجرم کا شفیع کہتے ہیں یعنی شہادت دینے والا' گواہی دینے والا۔ مجرم وہاں اندر جاتا ہے' مجرم تو تنہا ہی ہوتا ہے۔ وہاں کوئی اور اس کا مددگار نہیں ہوتا' البتہ اگر کوئی شہادت دینے والا ہو تو وہ ہوتا ہے' جو اس کی اس وقت مدد کرتا ہے۔ ''اوہدے نال کھلو جاندا اے اوتھے''۔ [1]

یہ جو شفاعت ہے' قرآنِ کریم میں اس کے معنی ہی ''گواہی دینے'' یا ''شہادت دینے کے'' ہیں۔ اس نے اس لفظ کو اسی طرح سے استعمال کیا ہے۔ آپ غور کیجیے' یہ بڑی اہم چیز ہے عزیزانِ من! وقت تھوڑا ہے' کیا عرض کروں' بات لمبی سمجھانے کی ہے۔ بہرحال' پہلے تو قرآن نے وہ نقشہ جو میں نے کہا تھا' کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ جب انسانی پیکروں کو از سرِ نو توانائی عطا کی جائے گی تو یہ وہ اخروی زندگانی کا دور ہوگا۔ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (50:20)۔ جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ وہی ہے جو تمہیں کہا جاتا تھا کہ عدالت کے اندر مقدمہ پیش ہوگا۔ آج وہ اس کی وعید ہے! تاریخ آ گئی ہے' کیا بات ہے وعید کی!! وہ جو مقدمے کی تاریخ تھی آ گئی۔ پھر کیا ہو؟ کہا: وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ (50:21)۔ اُس وقت ہر شخص' اپنے اعمال کا نتیجہ سننے کے لیے حاضرِ عدالت ہوگا۔ قرآن ہر نفس کو پہلے ہی مجرم نہیں قرار دے رہا۔ کہہ رہا ہے کہ ہر نفس اس عدالت کے اندر آئے گا: مَعَهَا سَآئِقٌ (50:20)۔ وہ خود تو تنہا آئے گا لیکن اس کے ساتھ پولیس کا سپاہی ہوگا۔ یہ مجرم کی بات ہے۔ وہ دھکیل کے اندر لے جائے گا۔ مجرم جس کو پتہ ہو کہ ابھی وہاں سے پھانسی کی سزا کا حکم ہوتا ہے' اس کا ایک ایک قدم ہزار ہزار من کا ہو جاتا ہے۔ وہ عدالت کی طرف جاتا نہیں ہے! اس سائق کے کہنے کی کیا بات ہے کہ وہ اسے دھکیل کے لیجانے والا ہے اور شہید ساتھ ہوگا یعنی گواہ ساتھ ہوگا۔ یہ اس کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ بس اندر مجرم کے ساتھ یہ ہونگے۔ میں

---

[1] یہ وہاں اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے۔

نے کہا یہ ہے کہ قرآن نے سمجھانے کے لیے یہ پورا نقشہ کھینچا ہے۔ دوسری جگہ (43:86) میں اس کی وضاحت کی ہے۔ یہ بڑے اہم حوالے ہیں۔ کہا: وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ (43:86)۔ یہ لوگ خدا کے سوا جن ہستیوں کو صاحبِ قوت و اقتدار مانتے ہیں اور اپنی مدد کے لیے انہیں پکارتے ہیں' انہیں اس کی استطاعت ہی نہیں کہ وہ ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ کھڑے ہو سکیں۔ عزیزانِ من! یہ جو اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ سفارش کر دیں گے' وہ شفاعت کر دیں گے قطعاً غلط ہے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

شہادت کے لیے ذاتی علم کا ہونا ضروری ہے

عزیزانِ من! شفاعت کے متعلق اسی آیت کے اگلے حصے میں ارشاد خداوندیہ ہے: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ (43:86)۔ عدالتِ خداوندی میں کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکے گا' بجز اس کے جو حق کے ساتھ شہادت دینے کے لیے آئے۔ یہاں شفاعت کا لفظ خود بتا دیا اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ (43:86)۔ بجز اس کے جو حق کی گواہی دے۔ اور بڑی عجیب چیز ہے: وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (43:86)۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کو اُس کا براہِ راست علم ہو۔ ''اوتھے کیہدے میں سنیا سی جی کہ اے بڑا نیک آدمی ہونداسی۔''[1] بالکل نہیں! عزیزانِ من! قانونِ شہادت میں اس گواہی کو جو دوسروں کے علم پہ مبنی ہو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے شاہد کا اپنا علم ہونا چاہیے۔ وہ کہے گا: بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (43:86)۔ اس کے متعلق ذاتی علم ہو اور حق کے ساتھ شہادت دے۔ یہ شفاعت ہے' جو ہمارے ہاں منظور کی جائے گی اور اسی لیے نبی اکرم ﷺ کو شاہد و مبشرًا و نذیرًا کہا گیا ہے حضور ﷺ کو بھی شہید کہا گیا ہے: كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143)۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسی قوم بنایا جائے جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو' جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلے پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی اور اس کا فریضۂ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب ہو۔ وہ دیکھے کہ کوئی قوم' ظلم اور زیادتی پر تو نہیں اتر آئی۔ اور ان کے اعمال کا محاسب' نگران' اُن کا رسول ہو جسے اس نظامِ خداوندی کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عزیزانِ من! حضور ﷺ شہید ہیں' شاہد ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ ہم اور سوال کرنے کے علاوہ رسولوں سے یہ پوچھیں گے کہ تم نے اپنی دعوت ان تک پہنچائی تھی۔ جی! پہنچائی تھی۔ بتاؤ انہوں نے اس دعوت کا کیا جواب دیا تھا۔ یہ گواہی ہے' رسول کی یہ شہادت ہے۔ یہ ہے شفاعت: شہادت بالحق۔ جسے علم ہو' وہ مجرم کے ساتھ آ کے کھڑا ہو یعنی کہ ایسے بات کرے۔ خدا تو علیم ہے' خبیر ہے۔ وہ بھی ایسے ہی بات کرے۔ یہ وہ ہے جسے اعمال نامہ کہتے ہیں۔ وہ تو کھلی ہوئی کتاب ہے' اس نے اسے خود پڑھنا ہے لیکن قرآن تو ہمیشہ اسے محسوس انداز میں' محاکاتی انداز میں بات سمجھاتا ہے:

---

[1] (یہ نہیں ہے کہ) وہ وہاں یہ کہہ دے کہ جی! میں نے تو سنا ہی تھا کہ یہ بڑا نیک آدمی ہوتا تھا۔

عدالت کا وہ نقشہ کھینچا' عدالت کے نقشے میں ضروری ہے مجرم ہو' یونہی چھڑانے والے' باہر سے سارے چلے آئیں۔نہیں' اکیلا ہوگا۔البتہ ایک گواہ ہوگا۔ **مَنۡ اَذِنَ لَـهُ الرَّحۡمٰنُ** (20:109)۔ ہر ایک اندر نہیں جا کے گواہی دینا شروع کر دے گا۔گواہ بھی تو وہی گواہ ہوتا ہے جسے عدالت گواہ کے طور پر بلاتی ہے۔یہ ہے: **مَـنۡ اَذِنَ لَـهُ الـرَّحۡمٰنُ** (20:109)۔گواہوں کی لسٹ دے دی۔کیا گواہ جھوٹے ہی ہوں؟ نہیں صاحب! عدالت جن گواہوں کی اجازت دے گی' وہ گواہ اس کے ساتھ آ کے کھڑا ہو سکے گا۔ اسے یہ کہنا ہوگا کہ ''جی! مجھے اس کے متعلق ذاتی علم ہے اور پھر حق کے ساتھ شہادت دے۔شفاعت اس کا نام ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی اپنی قوم کے متعلق شہادت

عزیزانِ من! نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو قرآن میں یہ ہے کہ یہ ایک فرد تو ایک طرف رہا' وہاں تو پورے کی پوری قوم آئے گی۔ یہ ہمارے ہی متعلق بات ہو رہی ہے۔انفرادی مقدمے کی بجائے حضورؐ خدا سے کہیں گے کہ یا اللہ! **اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا** (25:30)۔ یہ ہے میری وہ قوم جس نے قرآن کو چھوڑ دیا ہوا تھا۔ ہماری شہادت تو وہاں یہ ہوگی۔عزیزانِ من! رسول ہمارے متعلق کہہ دے گا کہ ان کو عدالت میں فرداً فرداً پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔رسول پکارے گا کہ ''اے میرے رب! یہ ہے وہ میری قوم۔'' وہاں قومی ہے' جس نے اس قرآن کو مہجور کر دیا تھا' رسیوں میں باندھ کے رکھ دیا' اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ شہادت ہمارے متعلق ہوگی۔میں کیا کیا عرض کروں۔

قرآن نے دوسرے مقام پر شفاعت کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے تو یہ سنیئے کہ کبھی یہ تصور بھی آتا ہے کہ کوئی کسی کی سفارش کرے اور سفارش بھی وہ کرے جو اس کے خلاف جائے۔اسے تو سفارش کہتے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو اس کے خلاف جانے والی چیز ہوتی ہے۔سفارش کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اس کے حق میں کچھ بات کہے۔شفاعت کے وہ معنی جو قرآن میں ہیں' انہیں ذہن میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن کیا کہتا ہے: **يَعۡلَمُوۡنَ** (43:86)۔علم ہونا چاہیے اور پھر **شَهِـدَ بِالۡحَقِّ** (43:86)۔وہ حق کے ساتھ سفارش کرے۔ یہ وہ شفاعت ہے۔کہا: **مَـنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا** (4:85)۔جو حسنہ شفاعت کرے' جو صحیح صحیح شہادت دے' جو حق کے ساتھ اس کے متعلق بات کرے جس کا اسے علم ہے۔یہ جو اس کا اس طرح سے شہادت دینا ہے' یہ بھی ایک نیک کام ہے۔ اس کو اس کا اجر ملے گا۔ **وَمَـنۡ يَّشۡـفَعۡ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا** (4:85)۔ اور جو کسی کے خلاف آ کر کسی کے کان میں بات کہہ جائے گا' وہ برابر کا مجرم تصور کیا جائے گا۔ یہاں دونوں جگہ شفاعت کا لفظ ہے۔تو شفاعتِ حسنہ بھی ہے اور شفاعت سیئہ بھی ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی چیز ہے: جھوٹی گواہی کسی کے خلاف دیئے جائے' یہ شفاعۃ سیئہ ہے۔ سچی بات کسی کے متعلق کہے' ایسی بات کہے جو مبنی بر علم ہو' یہ **شفاعة حسنة** ہے۔

شفاعت کا ترجمہ سفارش کرنا غلط ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے اندر جو شفاعت ہے' یہ ہے اس کا سارا مقصد۔ سفارش اس کا غلط ترجمہ ہے۔ ہمارے ہاں تو جب لفظ شفاعت آئے گا تو اس کا مفہوم سفارش آئے گا' یعنی شفاعت کے معنی اب سفارش ہو گئے ہیں۔ اور پھر اس کے متعلق تو ہمارے ہاں ہے کہ وہ قوم جو اعمال کے ذریعے جنت حاصل کرنا نہیں چاہتی بلکہ بخشش کے ذریعے حاصل کرنے کی خواہاں ہے تو یہ وہی بات ہے جسے یہ بخش دینا بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی شفاعت کی جائے گی' ان مجرموں کی سفارش کی جائے گی اور یہ پھر بخش دیئے جائیں گے' سفارش پر معاف ہی کر دیئے جائیں گے' ہمارے ہاں تو تصور ہی یہ ہے۔

شفاعت کے متعلق یہ تصور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے

عزیزانِ من! یہ تھا شفاعت کا وہ تصور جسے کفارہ کی شکل میں عیسائیوں نے اپنے ہاں لیا ہے۔ سینٹ پال (Saint Paul -c.A.D.5-67) کا یہ قول ہے کہ ہر بچہ گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لے کے پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ یہ آلائش اعمال کے ذریعہ سے قطعاً دور نہیں ہوسکتی۔ اگر تم اس فریب میں ہو کہ اعمال سے اس آلائش کو دور کر دو گے تو اس کو ذہن سے نکال دو۔ اس کے لیے صرف حضرتِ مسیح جسے وہ ابن اللہ یا اللہ ہی کہتے ہیں' کے کفارہ پر ایمان لانا ہوگا۔ جو اس عقیدہ کفارہ پر ایمان لے آئے گا' وہ حضرتِ مسیح کی جو صلیب کے اوپر' بقول ان کے' یہ موت ہے وہ ان کا خون اِن کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا' فدیہ بن جائے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ وہ اعمال کے ذریعے نہیں جائیں گے۔ یہودیوں نے یہ تصور لیا کہ ہمارے بڑوں نے' سبت کے زمانے میں خدا کی ایک بہت معصیت کی تھی۔ اس کی وجہ سے ہم کچھ دنوں کے لیے جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ جب ان بڑوں کو پتہ چلے گا تو اس زمانے میں تو وہ وہیں عدالت میں ہونگے۔ وہ اس کے ساتھ ہی کچھ کرتے پھر رہے ہوں گے "یا گواہیاں لبدے پھردے ہون گے"۔ [1] جب انہیں پتہ چلے گا تو وہ آئیں گے۔ سفارش کر کے ہمیں جہنم سے نکال کے جنت میں لے جائیں گے۔ یہ تصور یہود و نصاریٰ کا آ رہا تھا۔ وہ کفارہ ہو' یا یہود کی' ان کے انبیاء کی یہ سفارش ہو' وہ کہتے یہ تھے کہ اس سے نجات ہوسکتی ہے۔ اعمال کے ذریعے سے نجات نہیں ہوسکتی۔

شفاعت کے سلسلہ میں وضعی روایات

ہمارے ہاں بھی اس قسم کی وضعی روایات موجود ہیں۔ یعنی اس قسم کی ایک روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے معاذ اللہ! یہ کہا ہے کہ کوئی شخص عمل کے ذریعے سے نہیں بخشا جاسکتا' شفاعت کے ذریعہ سے بخشا جاسکتا ہے۔ اور پھر آپ کے ہاں اس کا نقشہ ہے کہ وہ

---

[1] یا وہ گواہیاں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔

سارے میدان میں' حشر میں' فیصلے ہو جائیں گے۔ تل تلا کے جنت والے جنت میں' جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ بھی عدالت کا دفتر بند کر کے کہیں جانیوالے ہونگے۔ اس کے بعد وہ دیکھیں گے کہ ایک شخص میدان میں سجدے میں پڑا ہوا ہے۔ سارا میدان خالی ہے۔ تو اللہ میاں کہیں گے کہ صاحب! یہ کون ہے' پتہ لو۔ پھر یہ صاحب کھڑے ہو جائیں۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں: کس قسم کی وہ روائتیں ہیں جو ہمارے ہاں در آگئیں اور راہ پا گئیں۔ پھر معلوم کیا جاتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرم سجدے میں پڑے ہیں۔ پوچھا جائے گا کہ اے میرے محبوب! ساری دنیا جنت کے اندر چلی گئی اور یہ ابھی تک باہر ہیں۔ کہیے کیا کہتے ہیں!! کہنے لگے: جی! کہنا میں نے کیا ہے! میری ساری امت جہنم کے اندر' تو ''میں سونہاں لگدا جنت اچ جاندا ہویا۔''[1] معاذ اللہ معاذ اللہ!! میں تو جنت میں ''نہیں جا سکتا''، تو وہ بھی تو خدا کے محبوب ہیں' پیارے ہیں' صاحب! تو اللہ میاں یہ کیسے دیکھ لے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ میری محبوب امت جہنم میں ہو! یہ نہیں دیکھ سکتے کہ یہ جنت سے باہر رہ گئے۔ انہوں نے کہا: نہیں بھئی! آپ تو جائیے۔ کہنے لگے: میں تو جاؤں گا ہی نہیں۔ بھئی! کیا بات ہے؟ شرط ہے صاحب! میری جو امت ہے پہلے انہیں بھیجیے' بعد میں میں جاؤنگا۔ تو حکم دیا کہ جاؤ' جا کے ان میں سے نکالو' تو پھر وہ اس طرح سے نکالیں گے: ''اوکرین نال چکدے ہوندے ناں اینج کر کے۔''[2] تو وہ اس میں سے نکالیں گے تو پھر وہ جنت میں ڈالیں گے۔ چلیے صاحب! ابھی تو بہت ہیں' پھر اور نکالیں گے اور نکالیں گے' پھر اس کے بعد جب سب کو بخشوا لیں گے تو اس کے بعد حضور ﷺ جنت میں تشریف لے آئیں گے۔ **اَللّٰھُمَّ صَلِّی عَلٰی** اس کے بعد وعظ میں آپ کے ہاں درود ہوتا ہے۔ آپ سوچیے تو سہی وہ رسول ﷺ جس نے زندگی کے آخری سانس میں بیٹی سے کہہ دیا کہ فاطمہ! یہ نہ سمجھنا کہ رسول کی بیٹی ہو' اس لیے بخشی جاؤ گی۔ وہاں فاطمہ کے اعمال صرف بخشوائیں گے' وہاں تو رسول کو بھی رسول کے اعمال بخشوائیں گے۔ ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے' عزیزانِ من! اور بدعمل قوم جو ہے وہ اس قسم کے فریب میں اپنے آپ کو مبتلا رکھتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد جرائم کے اوپر وہ جری ہو جاتی ہے۔ آج جرائم اتنے کیوں بڑھ رہے ہیں؟ ہر مجرم کو یہ سہارا ہوتا ہے کہ کوئی بات نہیں' اگر پکڑا بھی جاؤنگا تو چھوٹ جاؤنگا' بڑے بڑے سفارش کرنیوالے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر یہ اتنے جرائم کیوں عام ہو رہے ہیں؟ Unconsciously اس کے اندر یہ چیز ہے کہ کوئی بات نہیں ہے صاحب! یہاں سفارش ڈلوا دونگا تو نہیں پکڑا جاؤنگا۔ باقی رہا تمہارے وہاں کا۔ تو ایمان تو ہے' وہاں بھی اس قسم کا ہمارا شفیع المذنبین ہے۔ وہ وہاں بخشوا لے گا۔ یہاں بھی راوی عیش لکھتا ہے۔ وہاں بھی ہم چلے جائیں گے۔ کونسی چیز ہے جو آپ کو ارتکابِ جرم سے مانع ہو جائے؟ عزیزانِ من! لیکن قرآن نے کہا: **لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ** (4:123)۔ نہ تو ان یہود و نصاریٰ کی آرزوؤں کے مطابق' نہ تمہاری اس قسم کی بیہودہ آرزوؤں کے مطابق زندگی کی خوش گواریاں اور شادابیاں مل سکتی ہیں۔

---

[1] کہا میں جنت میں جاتا اچھا لگتا ہوں؟

[2] وہ ایسے ہی نکالیں گے جس طرح یہ کرین سے نکالتے ہیں ۔

کہا: بَلاَ ہرگز نہیں۔ اس میں کسی کے ذاتی جذبات کا سوال ہی نہیں۔ یہ سب کچھ ایک محکم اور غیر متبدل قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ وہاں تو ایک ہی اصول ہے کہ **مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا** (4:124)۔ جس نے بھی اپنے آپ کو قوانین خداوند کے سامنے جھکا دیا اور حسن کارانہ زندگی بسر کی، وہی ہے جو جنت میں جا سکے گا، ان کی محنت کے ماحصل میں ذرہ برابر کمی نہی کی جائے گی۔ ایسا کرنا ظلم ہوگا یہی جنت میں جائیں گے۔ دوسرا کوئی نہیں جا سکے گا۔ اسی لیے قرآن نے للکار کر کہا: **لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا** (19:87)۔ اس دن کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہوگا، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اپنے آپ کو خدائے رحمان کے قانون کے معاملے سے باندھ رکھا ہے اور اس طرح ایک دوسرے کے رفیق و یاور و دلبر بن گئے ہیں۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ مریم کی آیت 87 تک آ گئے۔ 88 آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم ط

❀......❀......❀......❀

بائیسواں باب: سورۃ مریم (آیات 88 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ
الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾
اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾
وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ
وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ
مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1976 کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ مریم کی آیت 88 سے ہو رہا ہے: (19:88)۔

عیسائیت کا بنیادی عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کفارے پر ایمان

سورۃ مریم کے شروع میں بھی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گفتگو کی گئی تھی اور اس کے بعد ہم اس سورۃ کی آخری آیات پر پہنچ رہے ہیں تو ان میں بھی قرآنِ کریم نے ان کے بنیادی عقائد کو بیان کیا ہے۔ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ' ان کی ساری تعلیم کا نقطہ ماسکہ' یہ ہے کہ اعمال کے بدلہ میں نجات نہیں ہو سکتی اور نہ ہوتی ہی ہے۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ انسان کوئی جرم ہی نہ کرے تاکہ جہنم سے اس کی نجات ہو جائے۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے ازلی ماں باپ کی آلائش پیدائش کے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے' اور نہ ہی یہ ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں نے دنیا میں تو کوئی گناہ ہی نہیں کیا میں تو پاک صاف ہوں۔ بات یہ نہیں ہے۔ وہ تو عیسائیت کے مطابق پہلے سے ہی اپنے ساتھ وہ آلائش لے کر آتا ہے۔ اب اس کی آلائش صاف کرنے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ اچھا بھئی! ہم یہاں کوئی نیک کام کریں گے' اس سے یہ آلائش' یہ داغ' یہ دھبہ' دھل جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ نیک کام سے تو یہ دھل ہی نہیں سکتا۔ یہ تو وہ سیاہی ہے جو اگر ایک دفعہ لگ گئی تو پھر اس کے دھلنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر سوال پیدا ہوا کہ اسے دھو ڈالنے کے لیے کیا کیا جائے؟ پیدا ہوئے تو اِس ازلی آلائش کو ساتھ لانے کی ان کی اپنی ذمہ داری نہیں تھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق گناہ کی وہ آلائش ساتھ آئی۔ اس

ان کے اختیار میں نہیں کہ اس کے دھبے کو دھوڈالے۔ اس لیے انہوں نے کہا: نہیں' درمیان میں ایک راستہ ہے' اسے اختیار کیا جائے گا اور کہا کہ وہ راستہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان کا ہے۔ تو گویا یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان کا عقیدہ عیسائیت کی بنیاد ہے۔ ❶ اسی کو قرآنِ کریم نے پچھلی آیت میں شفاعت کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اور میں نے پورا درس اسی پہ صرف کیا تھا کہ اس کے معنی قرآن کی رو سے کیا ہیں۔ یہ جو تصور ہے کہ کسی کی وساطت سے' کسی کی Intercession سے' کسی کے درمیان میں آنے سے' کسی کے کفارے سے' کسی کی وجہ سے' انسان کی نجات ہو جائے گی' یہ قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسی کا جواب پچھلی آیت میں دیا گیا تھا کہ اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی دوسرے کی مداخلت سے' سفارش سے' کسی دوسرے کے اعمال کے بدلے میں' کسی دوسرے کی نجات ہو جائے۔ پھر سوال یہ ہے کہ کفارہ کے عقیدے کی بنیاد کیا تھی؟ بقول ان کے کفارہ کے عقیدے کی بنیاد یہ تھی کہ بے شک وہ جس نے نوعِ انسانی کے نجات دہندہ ہونے کے لیے اپنی جان دی ہے' وہ کوئی عام مخلوق نہیں تھی' کوئی عام شخصیت نہیں تھی۔ اس اتنے بڑے کام کو سرانجام دینے کے لیے تو کوئی غیر معمولی شخصیت ہونی چاہیے تھی۔ سو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے' جنہوں نے یہ کام سرانجام دے دیا۔

عیسائیت کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دو خصوصیات اور ان کا مقصد

انہیں غیر معمولی شخصیت قرار دینے کے لیے عیسائیت نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق دو چیزیں وضع کیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ یہ ایک منفرد چیز ہو گئی۔ اس مقام پہ کوئی دوسرا ہے ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ انہیں صلیب دیا گیا تھا۔ انہوں نے وفات نہیں پائی۔ یہ آسمان پہ خدا کے ہاں زندہ اٹھا لیے گئے۔ یہ اِن کے لیے دوسری منفرد چیز ہوئی۔ پوری کائنات میں نوعِ بشری کے اندر یہ دو خصوصیتیں ہیں جو منفرد ہیں اور کسی دوسرے بشر میں نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ تھی ان کے لیے' منفرد شخصیت' جو پہلے بنائی۔ اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دینے کے لیے تو اتنی بڑی شخصیت کی ضرورت تھی۔ اب اس دیوار پر پہلا ردا یہ رکھا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے اور اس کے بعد یہ کہ صاحب! بن باپ کے پیدا ہوئے تو یہ کیا منفرد شخصیت بنی! انہوں نے کہا: نہیں' یہ اللہ کے بیٹے تھے' کسی انسان کے بیٹے نہیں تھے۔ خدا کے بیٹے تھے' وہ ابن اللہ ہوئے' خدا کے بیٹے۔ پھر اس کے بعد اس پہ موت بھی نہیں' انہوں نے وفات بھی نہیں پائی۔ یوں یہ منفرد خصوصیت ٹھہری۔ یہ اسے لے کے آئے۔ اس قسم کی شخصیت کا جو کفارہ تھا' خون دینا تھا' جو جان دینی تھی' یہ نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن سکتا تھا' ورنہ یونہی نہیں کہ اگر کوئی ہماں تماں بھی جان دیدے تو اس طرح سے وہ ان کا کفارہ بن جائے۔ انہوں نے

---

❶ واضح رہے کہ کفارہ کا عقیدہ رومن کیتھولک تک ہی محدود نہیں ہے۔ عیسائیوں کا بظاہر معقول پسند فرقہ پروٹسٹنٹ بھی اس بات میں' رومن کیتھولک جیسے متشدد فرقے سے پیچھے نہیں۔ اس فرقے کے بانی مارٹن لوتھر (Martin Luther: 1484-1546) کا یہ قول مشہور ہے:

Sin hard but believe harder

''خوب گناہ کرو لیکن اس کے ساتھ...... کفارہ پر...... ایمان کو اور مضبوط کرتے جاؤ۔''

کہا کہ نہیں' کفارے کے لیے یہ خصوصیات تھیں۔ یہ ہے عیسائیت کے اس سارے اعتقادات کی لم اور یہ ہے ان کا نقطہ ماسکہ۔ یہاں سے ابن اللہ کی بات آئی۔ آپ نے غور کیا کہ انہوں نے کس مقصد کے لیے یہ اعتقادات وضع کیے تھے؟ مسلمانوں کے ساتھ منفرد شخصیت بنانے کے لیے جب ان عیسائیوں کے اس زمانے میں مناظرے ہوئے' مقابل میں اسلام آیا تو انہوں نے یہ سوچ لیا کہ حقائق کی رو سے تو یہ اسلام کے مقابلے میں کبھی بازی جیت نہیں سکتے۔ اگر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی اس منفرد خصوصیت کے بارے مسلمانوں کو قائل کرا دیا جائے تو اس کے بعد پھر جب مقابلے میں یہ اپنے رسول کو لائیں گے تو ان میں تو یہ خصوصیت نہیں ہے۔ وہ تو نہ بن باپ کے پیدا ہوئے' نہ وہ زندہ آسمان پہ ہیں۔ یہاں ہم مات دے دیں گے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی یہ دونوں خصوصیات آپ کے ہاں عقیدہ بن گئیں اور پھر یہ اتنی شدت کے ساتھ اختیار کی گئیں کہ خدا کے خلاف تو پھر بھی آپ سن سکتے ہیں لیکن اگر کوئی یہ کہہ دے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے نہیں پیدا ہوئے تھے اور وہ آسمان پہ زندہ نہیں اٹھائے گئے تو اس کا پیچھا کوئی نہیں چھوڑتا۔ یعنی بات ہوئی تو کیا خوب مزا آیا' اس پراپیگنڈے کا۔ یہ ہے صحت۔

معاملہ تو صرف حضرتِ عیسیٰؑ کی نبوت پہ ایمان لانے کا ہے اور تمام انبیاء سابقہؑ کے ساتھ ہمارا تعلق ہی اتنا ہے کہ ہم یہ جانیں اور مانیں کہ یہ اپنے وقت میں خدا کے پیغمبر تھے جو آئے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (5:75)۔ اس سے پہلے بھی خدا کے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔ اتنی بات پہ ایمان ہے۔ باقی انبیاء کے متعلق تو اتنا سا ایمان بھی کافی ہے لیکن ہمارے ہاں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صرف نبوت پہ ایمان کافی نہیں ہے' اس پہ بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ انہوں نے وفات نہیں پائی۔ چنانچہ اس بات پر آپ کے عیسائیوں کے ساتھ اتنے مناظرے نہیں ہوتے اور اب ہو ہی کیا سکتے ہیں کیونکہ یہ نہ ماننے پر عیسائیت سے بھی خارج اور اسلام سے بھی خارج۔

نہ ماننے پر عیسائیت سے بھی خارج اور اسلام سے بھی خارج

اب جب کہ یہ دونوں چیزیں آپ کے ہاں بھی مشترک ہیں' خود مسلمانوں میں ان چیزوں کے اوپر باہمی مناظرے ہوتے ہیں' اس پہ سر پھٹول ہوتی ہے' کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ عیسائیت نے کہا کہ جو یہ نہیں مانے گا وہ عیسائیت کے دائرے سے خارج ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ چیز تم نہیں مانتے' تو تم بھی اسلام کے دائرے سے خارج۔ دیکھا آپ نے یہ چیزیں کہاں تک پہنچتی ہیں۔ یہ چیزیں بڑی گہری سازشیں ہوتی ہیں۔ چودہ سو سال سے آپ کے ہاں یہ چیزیں ہیں۔ یورپ والے جو عیسائی تھے وہ تو چھوڑ بیٹھے۔ ان کے ہاں کی جو مزید تحقیقات تھیں انہوں نے ان دونوں چیزوں کی تردید کر دی ہے اور اب ان دنوں تو میرے پاس ایسی اچھی اچھی کتابیں آتی ہیں' اب انہوں نے یہ تو Question کرنا شروع کر دیا ہے کہ تاریخی اعتبار سے کچھ اس قسم کی جیسے کہ تم بتاتے ہو' ایسی شخصیت ہی نہیں ملتی۔ یورپ تو یہاں تک پہنچا ہوا ہے۔ عیسائیوں کی سلطنتوں میں' یہ کچھ کہنے کے باوجود' وہ عیسائی تسلیم کیے جاتے ہیں اور عیسائی رہتے ہیں لیکن آپ کے ہاں اگر کوئی حیات و وفاتِ مسیح کی بات کہہ دے اور ان کے بن باپ پیدا ہونے کے متعلق کوئی انکار کر دے تو وہ دائرہ اسلام سے

خارج ہوجاتا ہے۔ مگر وہ مسیحیت کے دائرے سے خارج نہیں ہورہے۔ کیا بات ہوئی یا للعجب! یعنی آپ اس مسئلہ کے جوان کے ہاں کا ایک وضع کردہ عقیدہ تھا' زیادہ مؤید ہیں۔

قرآنِ کریم میں پہلی آیت میں تو شفاعت کے متعلق یہ کہا کہ کفارہ' شفاعت' Intercession کا قانونِ مکافات کے اندر تصور ہی نہیں اور اگلی بات یہ کہی کہ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (19:88)۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے مسیح ابنِ مریم کو اپنا بیٹا بنا رکھا ہے اور وہ ہمارے گناہوں کو بخشوا دے گا۔ دیکھیے ان کے طرف یہ کہتے ہیں: خدا کا بیٹا۔ اوئے خدا کا بیٹا؟ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا (19:89)۔ اس قدر خطرناک' اس قدر تباہ کن عقیدہ' جو تم نے گھڑ رکھا ہے۔ "کتنا تباہ کن ہے" کم ہی ایسے الفاظ قرآنِ کریم میں کسی اور چیز کے متعلق آئے ہونگے' عزیزانِ من! قرآن نے کہا: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (19:90)۔ یہ ایسی خطرناک بات ہے کہ جس سے آسمان پھٹ پڑے' زمین کا سینہ شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر دھماکے سے گر پڑیں۔ ارے! عقیدہ!! یہ ایسی خطرناک چیز ہے کہ اس کے اوپر عنقریب ہے کہ آسمان پھٹ کے گر پڑے' زمین شق ہوجائے' پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں' تو اس طرح عقیدے کا اعتزال ہوا' تردید ہوئی کہ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (19:91)۔ ذرا غور تو کرو کہ یہ کہتے کیا ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ الامان والحفیظ! قرآنِ کریم نے خدا کے ہاں بیٹے کا عقیدہ' ایسا خطرناک عقیدہ بتایا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آسمان سنے تو گر پڑے' زمین شق ہوجائے' پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں۔

عیسائیت کے عقیدہ کی بنیاد کو تسلیم کرلیا

عزیزانِ من! خدا کا بیٹا تو بہرحال آپ نہیں کہتے۔ آپ بھی اس کے خلاف جہاد کرتے ہیں لیکن ان کا بن باپ پیدا ہونا تو آپ کا بھی جزوِ ایمان ہے۔ انہوں نے آپ سے بن باپ کا منوا کے تو خدا کا بیٹا منوایا۔ بنیاد تو آپ مان رہے ہیں۔ جب وہ آپ سے مناظرے میں پوچھتے ہیں کہ فرمایئے کہ کیا خیال ہے اور یہ دور تو ہم پہ گزر چکا ہے۔ ابتدائی دور ہمارا بھی بڑے زوروں کا ہوتا تھا کہ صاحب! اگر وہ خدا کے بیٹے نہیں تو وہ ہم سے پوچھتے ہیں کہ فرمایئے کہ وہ پھر کس کے بیٹے تھے؟ وہ پوچھتے ہیں کہ پھر بتایئے؟ بنیاد آپ تسلیم کررہے ہیں۔ اس کے اوپر کی جو Super Structure ہے اس پہ تو ان کے ساتھ آپ لڑائی جھگڑا کررہے ہیں۔ "ڈانگے سوٹے ہونڈے یاؤ"۔ [1] آپ کو بھی بنیاد تسلیم ہے پھر ان کی منفرد الوہیت جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے' ان کے ہاں وہ اس کی Dignity ہے' وہ تو آپ بھی مان رہے ہیں۔

---

[1] مرلی دتھا ہوتے پھررہے ہو۔ لڑائی جھگڑا کررہے ہو۔

لایموت تو صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے

خدا لا یموت ہے۔ خدا کی یہی ایک صفت ہے کہ اسے موت نہیں آتی۔ جی ہاں! کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے؟ کہ جی وہ وفات نہیں پا گئے تو یہ پھر خدائی صفت نہیں تو اور کیا ہے؟ ابن اللہ کی بنیاد وہ آپ تسلیم کر رہے ہیں۔ الوہیت کی خصوصیت یہ ہے کہ خدا کو موت نہیں آتی۔ یہی کہتے ہیں کہ وہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (2:253)۔ ہے' لا یموت ہے۔ وہ اس میں موجود ہے' الوہیت مسیح آپ تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ جو حضرت مسیح کے متعلق ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے عزیزانِ من! قرآن کے اندر چار لفظ ہیں۔ ایک آیت کے چار لفظ ہیں کہ وہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (2:255)۔ وہ سب کو زندگی عطا کرتا ہے لیکن اپنی زندگی کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ وہ ہر شے کو قیام اور توازن عطا کرتا ہے لیکن اسے اپنے قیام کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ یہ جواب ہے کہ اس کے بعد آگے بات ہی نہیں چل سکتی۔ ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ اب عیسائیت کو چھوڑ دیجیے۔ مگر کہا یہ جاتا ہے کہ آپ اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب! باپ کے بغیر تو بہر حال بیٹا پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اگر نہیں ہو سکتا تو کہیے خدا قادرِ مطلق ہے یا نہیں؟ کہا کہ جی ہاں! وہ ہے۔ پھر کہا کہ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے یا نہیں؟ کہا: کہ جی ہاں! کر سکتا ہے۔ قادرِ مطلق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تو بات ہی الگ ہو گئی۔ یہ بھی ایک الجھی ہوئی بحث ہے۔

دو فرقوں کی قادرِ مطلق ہونے پر بحث اور اس کی حقیقت

میں آپ لوگوں کو الجھایا نہیں کرتا' ورنہ اگر میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے ہاں آپس میں کیا کچھ مناظرے ہوتے ہیں تو آپ کو حقیقت حال معلوم ہو گی۔ ہمارے ہاں اہلسنت جماعت کے دو فرقے ہیں: دیوبندی اور بریلوی۔ اِن کے ہاں خدا کے قادرِ مطلق ہونے کی ایک بحث چلا کرتی ہے۔ بریلوی حضرات ان سے پوچھا کرتے ہیں: کیا خدا قادرِ مطلق ہے؟ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں بول سکتا تو خدا قادرِ مطلق نہیں رہا۔ اگر بول سکتا ہے تو جھوٹا ہو گیا۔ یہ مناظرہ یوں ہوتا ہے۔ ایک بیوی نے اپنے شوہر کے خلاف عدالت میں دعویٰ کیا تھا کہ یہ مجھے پیٹتا رہتا ہے' عدالت میں بیوی کے وکیل نے بھی تو یہی سوال کیا تھا کہ ''آپ بتائیے کہ آپ نے اپنی بیوی کو مارنا چھوڑا ہے یا نہیں چھوڑا۔'' اب اگر وہ کہے کہ جی! چھوڑ دیا ہے تو ثابت ہو گیا کہ یہ مارا کرتا تھا' اگر کہے کہ نہیں چھوڑا تو ثابت ہو گیا کہ یہ اب بھی مارتا ہے۔ بیوی کے وکیل نے مقدمہ جیت لیا۔

عزیزانِ من! یہ بندۂ ناچیز جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا مصروفِ خطاب ہے اس کی تو عمر اس میں گزر گئی۔ وہاں مناظرے میں یہ سن کے آتا تو باقی سارا وقت اسی سوچ میں غرق رہتا کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔ اور آخر میں پھر چیلنج دے دینا کہ ہاں اب آیئے اب مقابلہ کریں گے: کوئی کم ای نئیں کرن دتا اینہاں نے''۔ [1] انہوں نے اس قوم کو اس میں ایسا

[1] انہوں نے تو کوئی کام ہی نہیں کرنے دیا۔

الجھایا ہے کہ ''کسی ہور کم جوگے رئے نئیں ہیگے۔'' ❶ الجھایا ہوا ہے' صاحب! اس کے ساتھ کہ بتایئے خدا قادرِ مطلق ہے یا نہیں۔ سنیئے' عزیزانِ من! آیئے' سورۃ انعام کی آیت 101 پر بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:101)۔ خدا کے متعلق تم پوچھتے ہو۔ وہ تو اس سارے سلسلہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے' اس وقت وجود میں لایا جب پہلے کوئی شے نہیں تھی' کوئی میٹریل نہیں تھا' کوئی مادہ مسالہ نہیں تھا۔ وہ تو Nothingness سے وجود میں لانے والا ہے اس سے بڑا قادرِ مطلق جس نے ایسا کر دیا ہے کون ہوسکتا ہے' وہ سب کچھ کرسکتا ہے' جسے تم کہتے ہو۔ اور یہ کہا کہ اس کے ساتھ کامہ دے کے فل سٹاپ بھی نہیں آگے لیکن یہ کچھ کرنے کے بعد اس نے ساتھ ہی فرمایا کہ ہم نے یہاں کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ اب وہ ان قوانین کے خلاف بھی جو چاہے کرسکتا ہے لیکن اب وہ ان قوانین کے خلاف کرتا نہیں ہے اور نہ ہی کرے گا۔ اور کہا کہ خدا کے تو خدا ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اتنے بڑے اقتدارات کا مالک ہونے کے باوجود اس نے اپنے اوپر جو پابندی عائد کی ہے وہ اسکے خلاف کبھی نہیں کرے گا۔ اور اگلا جو میں نے کہا وہ اسی سانس میں کامے کے بعد کہا: بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:101)۔ خدا وہ ہے جس نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو Originate کیا ہے یعنی وہ اسے بغیر کسی ذریعے اور واسطے کے براہِ راست عدم (Nothingness) سے وجود میں لایا ہے۔

خدا کی تو کوئی بیوی ہی نہیں

اب یہاں یہ رہا کہ تم یہ کہتے ہو کہ خدا کے ہاں بیٹا ہے۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ (6:101)۔ ذرا اس بات کو سوچو کہ اس کے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (6:101)۔ اس کی تو بیوی نہیں ہے جب کہ بیٹا ہونے کے لیے تو بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو Nothingness سے کائنات کو وجود میں لاسکتا ہے وہ اب دلیل یہ دے رہا ہے کہ خدا کے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ Nothingness سے تو وہ اتنی عظیم کائنات کو بغیر میٹریل' بغیر کسی Cause کے وجود میں لے آتا ہے لیکن جب اس نے خود یہ طے کر دیا کہ یہاں اولاد مرد اور عورت کے باہمی اختلاط سے ہوگی تو یہ قاعدہ اپنے اوپر بھی منضبط کر لیا۔ میں تو ہوں' اللہ میاں تو ہے' مگر اللہ کی بیوی نہیں ہے۔ تو کہا کہ بیوی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔ چار لفظوں کے اندر وہ دلیل دی ہے جس کا کوئی توڑ نہیں' جس کی کوئی کاٹ نہیں ہے صاحب! بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:101)۔ قادرِ مطلق ہے تو ایسا ہے کہ عدم سے کائنات کو وجود میں لے آیا اور اس کے بعد جو اپنے لیے قانون وضع کیا تو اس کی پابندی کی یہ کیفیت ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اب یہاں کہا کہ آگے بچہ یا بیٹا پیدا ہوگا تو وہ مرد اور عورت کے اختلاط سے پیدا ہوگا اور چونکہ خدا کے ہاں بھی بیوی نہیں ہے اس لیے اس کے ہاں بیٹے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ خلافِ قانونِ خداوندی ہوگا' جو وہ نہیں کرتا' وہ جو نہیں کرے گا' باوجود

❶ اب یہ کسی دوسرے کام کے رہے ہی نہیں۔

اس کے کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔عزیزانِ من! اسی دلیل کو الٹا دیجئے: اگر بیوی کے بغیر' عورت کے بغیر' تنہا مرد کے ہاں بیٹا یا اولاد نہیں ہو سکتا تو مرد کے بغیر' تنہا عورت کے ہاں کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا کو تو یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش نہیں آئی کہ انہوں نے خدا کو باپ قرار دیا تھا۔اس لیے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اگر مجھے باپ قرار دیتے تو بیٹے کے لیے تو بیوی کی ضرورت ہے۔اگر یہ کہیں خدا کو ماں قرار دیتے تو وہ یہ دلیل دیتا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے' میرا تو خاوند نہیں ہے۔چونکہ انہوں نے اس کے متعلق نہیں کہا تھا اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلیل تو یکساں ہے۔اگر عورت کے بغیر' مرد بچہ نہیں پیدا کرسکتا تو مرد کے بغیر عورت بھی بچہ نہیں پیدا کرسکتی۔یہی تو دلیل دی ہے باوجود اس کے کہ خدا بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (6:101) ہے۔کہا کہ ولد' اولاد والی بات نہیں ہے۔

تولید اور تخلیق میں فرق

کیا بات ہے! خَالِقَ كُلِّ شَىۡءٍ (6:102)۔وہ ہر شے کا خالق ہے۔عزیزانِ من! تولید اور تخلیق میں یہ فرق ہے: تولید Reproduction ہے۔بچہ مرد اور عورت' نر (Male) اور مادہ (Female) کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے۔تخلیق Creation ہے' وہ یہ ہے کہ جس کے لیے جنسی اختلاط کی ضرورت نہیں ہے۔وہ خالق ہے' والد نہیں ہے۔اس کے ہاں تخلیق ہے' تولید نہیں ہے۔تولید کے لیے ایک جنس کے ساتھ دوسری جنس کا ہونا ضروری ہے۔تخلیق کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ اس کے اندر Creativeness ہے' تولید نہیں ہے۔اور تولید کے لیے تو جیسا میں نے عرض کیا کہ جب یہ دلیل ہے کہ میرے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے کہ جب بیوی نہیں' عورت نہیں' تو قرآن نے جوڑے کی ضرورت بتادی تو اسی جوڑے کے بغیر صرف عورت سے کس طرح سے پیدا ہو' اگر مرد نہیں ہے۔ قرآن نے دو لفظوں میں بتادیا عزیزانِ من! اس کے بعد گنجائش ہی نہیں: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ (6:102)۔یہ ہے اللہ جو تمہارا نشوونما دینے والا ہے۔ ''اور اے ہے تہاڈا اللہ' اے ای رب تہاڈا''[1] ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ (6:102)۔یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا نشوونما دینے والا ہے اور جس کا قانون تمام کائنات میں جاری وساری ہے۔اس کے سوا کسی اور کا اقتدار واختیار نہیں ہے۔وہ ہر شے کا خالق اور کارساز ہے۔اس لیے تم بھی اُس رب کی محکومیت اختیار کرو۔پھر آپ نے دیکھ لیا کہ وہ کیسا رب ہے: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102)۔یہ بات قرآن ہی میں ہے' عزیزانِ من! کہ وہ جو برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم' ہے۔وہ خدا' جو تصور وتخیل میں بھی نہیں آسکتا' اس کے متعلق قرآن بتاتا ہے کہ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102)۔یہ ہے تمہارا خدا۔دیکھا! وہ صفات گناتا ہے کہ اگر ان صفات کو صحیح طور پہ سمجھ لیا جائے تو ذلک یہ ہے تمہارا خدا! اگر نہ دیکھا جائے تو گمان وقیاس میں بھی نہ آئے۔قرآنِ کریم خدا کی ایسی Description دیتا ہے کہ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ ہے تمہارا خدا!

---

[1] یہ ہے تمہارا اللہ' یہ ہے تمہارا رب۔

اصل بات خدا کو ماننا نہیں بلکہ اس تصور کو قبول کرنا ہے جو قرآن میں محفوظ ہے

میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ اسلام' دین' ایمان کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ آپ کے ہاں خدا کا تصور کیا ہے' خدا کے نہ ماننے والے تو دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں اگرچہ آج کل کمیونزم کی وجہ سے خدا سے انکار کرنے والوں کی تعداد کوئی زیادہ ہوگئی ہے ورنہ دنیا میں خدا کو سب مانتے ہیں اور اہلِ کتاب تو بہرحال خدا کو مانتے ہیں لیکن وہ خدا کو کیسا مانتے ہیں' کیا خدا کو اپنے تصور کے مطابق مانتے ہیں؟ یہ ہے اصل سوال۔ قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ان سب سے خاص طور سے کہا گیا ہے کہ ایمان لاؤ خدا پر۔ وہ تو کہیں گے صاحب! ہم تو خدا کو مانتے ہیں اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے' وہ خدا کو مانتے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا پر ایمان لاؤ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن ان کے ایمان کو' ایمان باللہ کو' خدا پر ایمان کو' تسلیم ہی نہیں کرتا۔ کیوں نہیں تسلیم کرتا؟ ایمان کے اعتبار سے تو وہ خدا کو مانتے ہیں۔ اس لیے تسلیم نہیں کرتا کہ وہ خدا کو اُن صفات سے نہیں مانتے جو قرآن نے بیان کی ہیں' جو خود خدا نے اپنے متعلق بیان کی ہیں۔ تو خدا جسے قرآن نے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (6:102) کہا ہے: یہ ہے تمہارا خدا! یہ جو تمہارا خدا ہے' اس پہ ایمان لانا' ایمان باللہ کہلائے گا۔ اپنے طور پہ خدا مان لینا ایمان باللہ نہیں کہلائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آپ کو الجھا دیئے جاتے ہیں۔ قرآن تو ان کو ایمان باللہ' خدا پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور اس کے بعد ان کو جواب دیتا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ ان میں سے وہ بھی تھے' جنہوں نے کہا تھا کہ یہ یہود و نصاریٰ تو کم از کم خدا کو تو مانتے ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو خدا ہی کو نہیں مانتے۔ قرآن نے تو ان یہود و نصاریٰ کو بھی کہا کہ تم فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137)۔ اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح اِس ضابطہ حیات پر ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو اُس وقت یہ خدا کے متعین کردہ صحیح راستے پر ہوں گے۔

عیسائیت کے ایمان اور مسلمانوں کے ایمان میں فرق

اگر یہ اس طرح ایمان لائیں جیسے تم قرآن کی رو سے ایمان لاتے ہو تو پھر ان کو مومن تسلیم کیا جاسکتا ہے ورنہ ان کا خدا پر ایمان تو ایمان ہی نہیں ہے۔ لیکن آج آپ مسلمانوں کی کیفیت تو دیکھیے کہ وہ ان کا خدا پر ایمان تو ضرور تسلیم کرتے ہیں' آج بھی وہی پراپیگنڈا ہے۔ آج بھی یہ مانتے ہیں کہ یہ یہود و نصاریٰ خدا پر ایمان رکھتے ہیں' بس فرق اتنا ہے کہ یہ رسالت محمدیہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے۔ خدا پر ایمان رکھتے ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن انہیں خدا پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے مگر یہ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا پر تو ایمان رکھتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ پراپیگنڈہ کیوں ہوا کہ یہ سارے خدا کو ماننے والے ہیں؟

امریکہ سے اٹھنے والی آواز

آج 7 مارچ 1976ء کے صبح کے اخبار میں کوئی دس پندرہ برس پہلے کی بات آئی جب یورپ کی عیسائی سلطنتوں اور خاص طور پہ امریکہ کے اعصاب پہ روس کا ہوّا سوار تھا اور وہ بڑی قوتوں سے ابھر رہا تھا۔ مسلمانوں کی مملکتوں کو روس کے خلاف اپنے ساتھ ملانے کی

ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے روس کے خلاف مسلمانوں کی سلطنتوں کو ساتھ ملانے کی خاطر ایک آواز بلند کی۔ جن کا حافظہ کوئی مدد دیتا ہے انہیں یاد ہوگا کہ ایک آواز بلند ہوئی تھی۔ یہ آواز بھی امریکہ سے ہی بلند ہوئی تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ:

Believers in God unite together against this atheism

Believers in! آؤ' دنیا کے خدا پرستو! آؤ اکٹھے ہو جاؤ۔ [1] اس الحاد کے خلاف ایک متحدہ محاذ بناؤ' اے دنیا کے خدا پرستو! God یہ خدا کے ماننے والے کون تھے؟ یہ تھے یورپ کی سلطنتیں' امریکہ کی سلطنت اور اس کے ساتھ یہ مسلمان پورے کے پورے۔ دعوت کیا دی جا رہی تھی؟ کہ دیکھو! الحاد کا ایک طوفان برپا ہو رہا ہے' خدا کے انکار کا ایک سیلاب آرہا ہے ٹھیک ہے۔ تمہارے ہمارے باقی اختلافات ساتھ سہی' یہ تو قدرِ مشترک ہے کہ تم بھی اللہ کے ماننے والے ہو ہم بھی اللہ کے ماننے والے ہیں' آؤ اللہ کو ماننے والو! ان خدا کے منکرین کے خلاف محاذ بناؤ۔ دیکھا کہ کس طرح سے خدا کی مذہب کی Exploitation ہوتی ہے۔'' کہا جا رہا ہے کہ محاذ بناؤ۔ ادھر مسلمانوں کو ساتھ جوڑنے کے لیے وہ آواز بلند ہوئی ہے۔ یعنی خود مسلمانوں کے خلاف' عیسائیوں کی یہ سلطنتیں ایک جتھہ اور محاذ بنائے ہوئے ہیں' کہیں ابھرنے نہیں دیتیں۔ یہ سلطنتیں ان کو جینے نہیں دیتیں اور ان کے خلاف جو دشمن اٹھا ہے اس کی مدافعت کے لیے' محاذ بنانے کے لیے' مسلمانوں کو اپیل کی جا رہی ہے۔ ان کے لطیف جذبات کی آڑ میں یہ کچھ کہا جا رہا ہے کہ دیکھیے تمہارے خدا سے الحاد کا ایک محاذ بن رہا ہے۔ اٹھو! محاذ بناؤ' ان کے خلاف آؤ خدا کے ماننے والو! اور بھولا [2] مسلمان نہیں بھولا: فرق صرف یہ ہے کہ مروجہ مذہب نے اس کے ہاں سے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم کر دی ہے۔ کسی نے ان سے یہ کہا: نہیں بھئی! ہم تو تمہیں خدا کے ماننے والے مانتے ہی نہیں اور نہ ہی کسی نے ان سے یہ کہا کہ بھائی اکٹھے ہونے کی' محاذ بنانے کی' کوئی اور وجہ بتایئے ہم تو تمہیں خدا کے ماننے والے مانتے ہی نہیں۔

خدا کو اس طرح ماننے کی کوئی اہمیت نہیں ہے

قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کے ماننے والے نہیں ہو' ہم تمہیں کیسے مانیں کہ تم خدا کے ماننے والے ہو۔ ایسا بالکل نہیں کہا۔ سب نے کہا کہ ٹھیک کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ اگر درمیان میں سے میں نکال دیجیے تو میں عرض کروں کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے صرف طلوعِ اسلام کی ایک آواز تھی' میری آواز تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے مسلسل اس پر لکھا۔ قرآن کی رو سے یہ بتایا کہ قرآن ان کو خدا پر ایمان لانے والے مانتا ہی نہیں۔ یہ ہمیں اپنے ساتھ ملا کے ہمیں بھی اسی قسم کا خدا ماننے والا بنانا چاہتے ہیں جیسا یہ خدا کو خود ماننے والے ہیں۔ اور ان کا سارا مقصد یہ ہے کہ انہیں روس کے خلاف ایک محاذ بنانا ہے۔ میں نے کہا: سیاسی تقاضوں کے اعتبار سے سوچیے' آن

---

[1] اس نکتے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورہ النحل' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ۲۰۰۳ء عنوان ''نعمتوں کو ذاتی ملکیت بنا لینا'' ص-132۔

[2] سیدھا سا۔

میرٹ (On Merit) تو بات اور ہے۔ اس بات پہ نہ آ جایئے۔ آپ کے جذبات کو Exploit کر رہے ہیں' کون سنتا تھا! اس سیرت کانفرنس کے اندر' جو آج کل منعقد ہو رہی ہے' میں نے کہا کہ آج کے ہی اخبار میں یہ چیز ہے۔ یہ مستشرقین بھی خیر سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مستشرق منٹگمری واٹ کا جو خطبہ ہے' جو اس نے مقالہ پڑھا' اس کا ایک اقتباس آج صبح کے اخبار میں بھی ہے۔ اس میں اس شخص نے یہی بات کہی ہے کہ ہم خدا کے ماننے والے ہیں' جو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں: آپ بھی' ہم بھی' یہ سب۔ یہ امتِ واحدہ ہیں' یہ خدا کے ماننے والے ہیں' آ ؤ ہم الحاد اور بے دینی کے سیلاب کو روکنے کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ یہ وہی چیز ہے' یہ ہیں وہ مقاصد جن کو لے کے' یہ تو کسی جگہ بھی چوکتے ہی نہیں۔ آپ کی سیرت کانفرنس کے اندر وہ تشریف لائے۔ آپ کا پورا مجمع وہاں موجود ہے' سو سے زیادہ مندوبین اکٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پورے کے پورے اجتماع کے اندر کل 43 اسلامی مملکتوں کے نمائندے تھے۔ صرف ایک شخص نے یہ کچھ کہا ہے لیکن کسی ایک شخص نے اسے نہیں کہا کہ ہم آپ کو خدا پرست نہیں مان سکتے۔ تعریف ہو رہی ہے کہ ہاں صاحب! دیکھیے! خدا کے ماننے والے ایک سیلاب کے خلاف' ایک محاذ بنا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! یوں آپ کو پہلے دن سے Exploit کیا جا رہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں نبی اکرم ﷺ کا مقام: بخاری کی ایک روایت

پہلے دن سے عیسائیت نے' یہودیت نے' معاذ اللہ معاذ اللہ' اپنے رسول کے مقابل میں' آپ کے رسول کو ''اتنا'' بنا دیا' بس وہ ایک ہی روایت کافی ہے کہ حضور جب معراج میں تشریف لے گئے اور وہاں اللہ تعالیٰ نے پچاس نمازیں روز پڑھنے کا حکم دیا اور آپ اس تحفہ کو خوشی خوشی لے کر واپس تشریف لے آئے اور حضرت موسیٰؑ نے پوچھا تو آپ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ تحفہ دیا ہے کہ امت کے لیے پچاس نمازیں روز کی بنتی ہیں۔ کہنے لگے: کیا کہہ رہے ہو! پچاس نمازیں نہیں پڑھی جائیں گی۔ پھر خدا کے ہاں جاؤ' اس کو اس خدا کے ہاں سے بدلوا لو جس نے یہ کہا ہوا ہے: **لا تبدیل لحکم . لامبدل لکلمۃ.** ہماری بات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے کہا کہ ''جی لے ہو نہیں سکدی' اسے کرا کے دساں گے۔''[1] سوچیے عزیزانِ من! یہ آپ کے صحاحِ ستہ کی روایت' بخاری کی روایت' اصحہ من کتب کی روایت ہے۔ آپ تشریف لے گئے۔ آدھی رہیں۔ پھر آ گئے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پھر کہہ رہے ہیں کہ جاؤ! اب بھی نہیں۔ پھر گئے' پھر آئے' پھر گئے' پھر آئے' پانچ نماز روزانہ تک آئے۔ پھر بھی انہوں نے کہا: نہیں' یہ بھی زیادہ ہیں' نہیں پڑھی جائیں گی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بار بار جاتے شرم آتی ہے۔ ذرا یہ تصور رکھیے: پہلے تو آپ کے ہاں خدا کا یہ تصور کہ خدا' جس نے نمازیں فرض کیں' اس کو پتہ نہیں کہ نہیں پڑھی جائیں گی۔ ''تھما دیتیاں کہ چل گیا' جل چل گیا' نئیں تے بدل دیاں گے۔''[2]

---

[1] جی! یہ ہو نہیں سکتا۔ (مگر) ہم تو یہ کرا کر ابتا دیں گے۔

[2] ان کے پلے ڈال دیں کہ کام چل گیا تو سب درست ورنہ بدل دیں گے۔

معاذ اللہ معاذ اللہ' ان کے مقابلے میں آپ کے رسول! سوچیے' عزیزانِ من! کتنی گہری سازشیں ہوتی ہیں۔ اپنے رسول کے مقابلے میں یہ رسول! آپ دیکھتے ہیں کیا نظر آتے ہیں! بابا! یہ نہیں پڑھی جائیں گی اور وہ آپ چل پڑتے ہیں' بار بار جاتے ہیں۔ آپ کے تصور کا وہ خدا جس پہ ایمان لانے کے لیے آپ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ کل کو کہیں گے کہ اس خدا پہ ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے آپ کا رسول جس کی رسالت پہ ایمان لانے کے اوپر آپ دعوت دیتے ہوئے یہ رسول ہی ہے تمہارا کہ اگر اتفاق سے ہمارے رسول راستے میں نہ مل جاتے اور وہ یہ کچھ نہ کراتے تو پوچھتے مسلمانوں سے کہ پڑھتے پچاس نمازیں' ہر روز' اور آخر پھر ہمارے رسول نے ہی کہا تھا کہ یہ بھی نہیں پڑھی جائیں گی' تو بتاؤ کیا ٹھیک تھا یا نہیں۔ یہ ہیں' عزیزانِ من! جو آپ کے خلاف سازشیں ہیں۔ یہود نے تو یہ کیا۔ نصاریٰ یہ کر رہے ہیں کہ وہ خصوصیت کبریٰ جو انہوں نے اپنے رسول کی منوائی تھی اسے انہوں نے آپ کا جزو ایمان بنا دیا۔ یہ ہے ان کی ابن اللہ کی بات۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا قصہ

یہ ابن اللہ ہونے کی بات آپ تسلیم کر رہے ہیں۔ ایک ہی دلیل قرآن کے اندر آئی تھی۔ اس کا جواب نہیں۔ اس کے باوجود آپ مانتے چلے جا رہے ہیں: دیتا رہے وہ دلیل! یہ وہ عقیدہ تھا جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے اگر آسمان سنے تو ٹوٹ کے گر پڑے' زمین شق ہو جائے' پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ ٹھیک ہے کہ اگر وہ ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ کہا کہ ہم ابن اللہ نہیں کہتے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ وَمَا يَنۢبَغِى لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا (19:92)۔ یہ بات ہرگز ہرگز اللہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اپنے لیے بیٹا بنائے۔ میں زیادہ لمبی بحث میں نہیں جانا چاہتا کہ آج کل اب کچھ ایسا درمیان میں ایک طبقہ سا پیدا ہو رہا ہے جس کا مطمع نگاہ یہ ہے کہ گاندھی جی بھی خوش رہے' راجیہ سے سرکار بھی خوش رہے' یہ وہ مولوی صاحبان بھی ناراض نہ ہوں' ورنہ وہ دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ انہوں نے کچھ یوں کہا ہے کہ بات کچھ بنتی نظر نہیں آتی ہے کہ دو جرثوموں کا جنسی اختلاط جب تک نہ ہو' آگے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ اب سائنس میں یہ بھی چیزیں موجود ہیں اور اُدھر کوئی کوشش کر رہا ہے کہ بعض ایسی بھی مخلوق ہیں جو Creative ہیں' جرثومہ ہیں۔ جراثیم ہیں' جرثومے ہیں کہ جو جوڑا نہیں ہوتا۔ ایک کے اندر سے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ چلیے جرثومے! یہاں سے ثابت ہو گیا کہ جی دیکھیے' کوئی کہتے ہیں جی! آپ دیکھیے وہ Test- Tube Babies کی بھی تو کچھ سکیم نکل رہی ہے یعنی یہ ثابت کرنے کے لیے' اگر یہ چیزیں اسی طریقے سے ہوئی تھیں جو آپ کہتے ہیں کہ Scientific طریقے سے ہو سکتی ہیں تو پھر اس میں خوبی کی بات کیا ہوئی۔ یوں نہ ملایا یہ کچھ کر دیا' لیکن وہ نہ ہماری زبان سے کہلاؤ کہ وہ باپ سے پیدا ہوئے' ہاں یہ مان لینے سے آسمان ٹوٹ پڑے گا' زمین شق ہو جائے گی' پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اگر ہماری زبان سے آپ نے یہ کہلوالیا۔ دل سے تو کچھ ہم بھی مانتے ہیں: ''کہ گل تے ایسی جئی ہیگی''[1] لیکن زبان سے نہیں کہہ سکتے۔ کیوں نہیں کہہ سکتے؟ کون بھڑوں کے چھتے کو چھیڑے۔ کہتے ہیں تم نے کہہ

---

[1] بات تو ایسی ہی ہے۔

کے دیکھ لیا' ٹھیک ہے۔

مجھے تو اپنا صرف فریضہ ادا کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ تو سوال نہیں۔ مجھے ان سے کچھ نہیں کہنا۔ میں ان پہ اعتراض ہی نہیں کرتا۔ یہ کوئی ایسی میرٹ والی چیز نہیں ہے کہ میں نے یہ کہہ دیا ہے' ٹھیک ہے۔ قرآن کی رو سے مجھے یہ قرآن کی بات سمجھ میں آئی۔ قرآن لے کے اٹھتا ہوں تو میرا فریضہ ہے کہ جو سچائی مجھے قرآن دے اسے آگے پیش کروں۔ اس کے عواقب کچھ نہیں بھی ہوں' جو بھی ہیں ہوا کریں' بہرحال قرآن یہ کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ بیٹے کی ضرورت کاہے کو پیش آئی۔ اس کے بنانے کے لیے کیا اس کا کوئی کام رکا ہوا تھا؟ کیا کام رکا ہوا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے انسان پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ بقول ان کے اللہ تعالیٰ انسان کا جو بچہ دنیا میں بھیج رہا ہے اس کی پشت کے اوپر وہ آلائش لگی ہوئی ہے' ٹھپہ لگا ہوا ہے' دھلتا ہی نہیں ہے:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبط دوا ہے اور میں ہوں

قرآن حکیم کی تعلیم انسانی ذہن کی تمام پیچیدگیوں کو دُور کر دیتی ہے

آلائش دھلتا بھی نہیں ہے' مگر وہ انہیں بھیجتا بھی چلا جارہا ہے اور پھر جب یہ مرتے ہیں تو وہ جہنم میں چلے جارہے ہیں۔ یہ ہے عیسائیت کا عقیدہ کہ اس کے اوپر تو سوچ پیدا ہوگئی کہ جیسے عہد نامہ عتیق میں ہے کہ خدا انسان کو پیدا کرنے کے بعد پچھتایا کہ یہ کیا ہوگیا کہ انسان پیدا بھی ہوتے ہیں' پیدا ہوتے ہیں گناہگار' گناہ دھل نہیں سکتے' مرتے ہیں تو گناہوں کی وجہ سے جہنم میں بھیجنا پڑتا ہے تو یہ کہا کہ ساری مخلوق جو میں پیدا کیے جارہا ہوں وہ تو جہنم میں چلی جائے گی۔ ''تے جنت تے اونوں ٹھیکے تے دے دیاں گے اسیں۔''❶ یعنی عیسائیت کا تو یہی قول ہے۔ یہ ہے مذہب' عزیزانِ من! بچے بھی اس بات کو سن کے ہنسیں گے اور میرے سامنے جو بچے ہیں وہ تو ہنس رہے ہیں۔ کیا کیا جائے معاذ اللہ معاذ اللہ ان کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ پھر باپ بیٹے نے آپس میں مشورہ کیا۔ ''بیٹے نے پوچھیا ہونا اے کہ ابا جی! تسی آج ان پھسے ہوئے کیوں بیٹھے ہیگے او معاذ اللہ معاذ اللہ' اُوناں نے دسیا کہ بیٹا ایک ایسی مصیبت اچ پھس گیا ہیگا آں حل کوئی نئیں لبدا تے' او نے کیا ہونا پتر کاہدے واسطے ہوندے نیں۔''❷ میں حل کر دیتا ہوں اور وہ یہ حل تھا کہ میں جاتا ہوں' میں اپنی جان

---

❶ تو پھر جنت کو ٹھیکے پہ دے دیں گے۔

❷ بیٹے نے پوچھا ہوگا کہ ابا جان! آج آپ اس طرح گرفتار بلا کیوں ہیں؟ معاذ اللہ معاذ اللہ! انہوں نے بتایا کہ بیٹا! آج ایک مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں جس کا کوئی حل نہیں مل رہا۔ تو پھر اس نے کہا ہوگا کہ ابا جان! پھر یہ بیٹے کس لیے ہوئے ہیں۔

دیتا ہوں۔ ''تسی کوئی بہانہ ای لبنا اے ناں ایناں دے بخشن دا جیہڑا کر بیٹھے او' تو [1] ٹھیک ہے پھر کہنا کہ صاحب! میرے اکلوتے بیٹے کا جو خون ہے اس خون بہا کی اتنی قیمت ہے کہ میں اس کی قیمت اسی طرح ادا کر سکتا ہوں کہ جو اس چیز کو ماننے والے ہوں ان کو جنت میں بھیجتا چلا جاؤں گا۔ یہ تجویز بیٹے نے کی۔ ''اونے کیا ہونا اے اشکے او بلیا جیندا رہو۔'' [2] یعنی یہ تھا بقول عیسائیت کے خدا کا رکا ہوا کام جس کے لیے یہ طریقہ تجویز ہوا' یہ طریقہ سوچنا پڑا۔ قرآن یہ کہنے کے بعد کہتا ہے: **مَا يَنۡبَغِىۡ** (19:92). یہ بات ہرگز خدا تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں' کیا بات ہے! اس کو ضرورت ہی نہیں تھی' یہ اس کے شایانِ شان ہی نہیں' ضرورت نہیں تھی' تم کہتے ہو کہ خدا کا ایک کام رکا ہوا تھا: **اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا** (19:93)۔ کام رکا ہوا تھا' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے وہ تو ہمارے ہی پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ مسیح نے ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

آخر کار تو یہ بھی خدا کی بارگاہ میں پیش ہونگے

بہرحال یہ بھی تو ہمارے ہاں ہی آئیں گے' آنے دیجیے۔ **لَقَدۡ اَحۡصٰهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا** (19:94)۔ یہ ہماری مملکت کے دائرے سے باہر نہیں چلے جاسکیں گے۔ انہیں بھی ہم نے گھیر رکھا ہے۔ اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں: ان کے اپنے ذہن کا قیاسی تصور' مذہبی عقیدہ ہے کہ کفارے پہ ایمان لائے تو سارے گناہ دھل گئے۔ کہنے لگے: ہم ایک ایک گن رہے ہیں' آنے دو۔ **وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا** (19:95)۔ اس عدالت کے اندر سب حاضر ہونگے۔ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت سب اس کے سامنے تن تنہا آئیں گے۔ کوئی کسی کے ساتھ نہیں ہوگا اور ہر ایک اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اور اس انداز سے ہوں گے کہ ان کے یہ جن کے کفارے میں یہ کہتے ہیں' ہم بخشے جائیں' وہ بھی اس وقت ساتھ نہیں ہوگا۔ اس لیے ان سے کہہ دو کہ نجات کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ نجات کا طریقہ یہ ہے کہ **اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا** (19:96)۔ جیسا قرآن ایمان کہتا ہے' ایمان ایسے لاؤ۔ جنہیں وہ عملِ صالح کہتا ہے' وہ کام کرو۔ اب جو یہ سوال پیدا ہو جائے کہ صاحب! ایک اتنا بڑا متحدہ محاذ بنا دیا جائے گا اگر ان کو آپ نے کہہ دیا کہ تم تو ہم میں سے نہیں ہو' ہم الگ ہیں تو پھر ہمارا مددگار کون ہوگا۔ خدا کی بارگاہ میں تو ان چیزوں کا کوئی وزن ہی نہیں۔

---

[1] ان کے بخشنے کا آپ نے تو کوئی بہانہ ہی ڈھونڈھنا ہے جو کچھ کہ آپ کر چکے ہیں۔

[2] اس نے کہا ہوگا کہ شاباش میرے بیٹے شاباش! جیتے رہو۔

حضور ﷺ کو مدینہ کیلئے اہلِ قریش کی دعوت

عزیزانِ من! زمانہ نزولِ قرآن کے حالات کو سامنے رکھیے۔ ایک مختصر سی' چھوٹی سی جماعت تھی' ساری دنیا سے لڑائی' واقعی ساری دنیا سے لڑائی تھی۔ جو مدینے کے انصار کا ایک گروہ حضور کو دعوت دینے کے لیے آیا تھا کہ قریش نے یہاں اتنا تنگ کر رکھا ہے تو کوئی بات نہیں' ہمارے ہاں کے حالات مساعد ہیں' آپ وہاں تشریف لے چلیے۔ تو آپ نے ان سے اقرار نامہ لیا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ تو ان کا ایک بڑا نمائندہ دروازے میں کھڑا تھا۔ اس وقت کے دستور کے مطابق وہ جب جاتے تھے تو ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر جسے اس زمانے میں عہد کرنا کہا جاتا تھا۔ وہ عہد کرتے تھے تو اس نے کہا تھا کہ اے! ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے' بیعت کرنے والو! یا ضمانت دینے والو! سوچ بھی لیا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ انہوں نے کہا: سوچ لیا ہے۔ انہوں نے کہا: ایک دفعہ اور سوچ لو! یہ بیعت ایک اقرار نامہ ہے' لہٰذا یہ یاد رکھو کہ یہ جن وانس کے خلاف' ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اگر تم میں اس کے برداشت کی قوت ہے تو پھر یہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھو۔ تم یہ چھوٹی سی بات نہیں کر رہے۔ یہ تھی وہ چیز! واقعی یہ ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ تھا کہ ان کے دل میں بھی یہ بات تھی کہ قریش وغیرہ سے تو یوں بگڑی ہوئی ہے یہ جو اہلِ کتاب ہیں ان کے ساتھ یہ کہہ کے کہ تم بھی خدا پرست نہیں ہو' ان سے بگاڑ لی جائے تو تنہا رہ جائیں گے۔ کہا: ڈرو نہیں: **سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا** (19:96)۔ تم یہ نظام قائم کر کے دیکھو۔ دیکھو! دنیا کس طرح اس کی طرف خود کھنچی چلی آئے گی: **يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا** (110:2)۔ ابتداء میں مشکلات تو آئیں گی اور ضرور آئیں گی' آتی ہیں۔ یہ دنیا کے خلاف اعلان جنگ ہے' ہر شخص' ہر عقیدے' ہر اہلِ مذہب کے خلاف' ان کے عقائد کے خلاف' اعلانِ جنگ ہے لیکن کہا: تھوڑے سے عرصے کے لیے صبر سے کام لو' تم استقامت دکھاؤ تو ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ دنیا اس کی طرف کھنچی چلی آئے گی۔ یہ نظام قائم کس طرح سے ہوگا؟ اس کے لیے کہا: **فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا** (19:97)۔ یہ سب اس قرآن پر عمل کرنے سے ہوگا جسے ہم نے سمجھنے کے لیے بڑا آسان کر دیا ہے۔ جماعت مومنین کو ان کے اس حسنِ عمل کے عوض خوش گوار نتائج کی بشارت دے دے اور جو لوگ سچائی کے مقابلے میں ہٹ اور جذبہ پر اڑے ہوئے ہیں' انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ آخری آیتیں آ گئیں عزیزانِ من! میں کہا کرتا ہوں کہ ہر سورۃ کی آخری آیتوں میں ان کے اندر کے مواد کا ملخص' خلاصہ' آ جاتا ہے۔ وہ تو یوں سمجھو کہ ''تت کڈ کے رکھیا جاندا اے''[1] وہ تو جو پہلے دی گئی ساری چیزوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ یہ قرآن کا عمومی انداز ہے۔

---

[1] اس کا لبِ لباب ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے خلاف ایک گہری سازش یعنی قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا تھا

اس آیت میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ بِلِسَانِکَ (19:97)۔ تیری زبان میں ہے۔ یہ اس لیے کہ رسول سب سے پہلے اپنی قوم کی طرف آتا ہے۔ اس کی وحی اسی کی زبان میں آنی چاہیے۔ قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہا کہ یہ بلسانک ہے یعنی اسے ہم نے تیری زبان میں نازل کیا ہے اور ضمناً یہ بات ذہن میں رکھیے کہ چونکہ یہاں لسانک آ گیا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ زبان ایک واحد تفویضہ ہے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کیا کیا عجوبہ سی چیزیں آتی ہیں صاحب! آپ نے طلوعِ اسلام میں دیکھا ہوگا۔ شاید پچھلا طلوعِ اسلام تھا '(فروری ۱۹۷۶ء) جس میں عنوان تھا ''اب قرآن کی باری آئی'' درس میں میں شخصیات کو نہیں لاتا لیکن جب کوئی چیز حقائق کی آتی ہے تو بات کہنی پڑتی ہے۔ اس میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ صاحب (1978-1903) نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ قرآن درحقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ اسے خدا نے سات زبانوں میں نازل کیا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سات زبانوں میں ملا تھا انہی زبانوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن آگے دیا تھا' حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک یہ قرآن سات زبانوں میں تھا' پھر اس پر آپس میں جھگڑے ہونے لگے' سات مختلف قرآن ہو گئے۔ یعنی جب زبان الگ ہوتی ہے تو وہ تو الگ کتاب ہوتی ہے تو پھر اس میں اختلافات پیدا ہوئے۔ عزیزانِ من! وہ میرا مضمون نکال لیجیے۔ اس کے اندر اقتباس موجود ہیں۔ ان کی تحریر موجود ہے۔ ترجمان القرآن کے اندر یہ لکھا ہوا ہے کہ اختلافات پیدا ہوئے۔ اِن اختلافات کو مٹانے کے لیے حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا کیا؟ انہوں نے چھ زبانوں والے قرآن کو تو جلا دیا اور ایک زبان والا باقی رکھا۔ معاذ اللہ! اوکس کی اتھارٹی سے؟ ملاحظہ فرمائیے کہ خدا نے نازل کیا سات زبانوں میں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دیا سات زبانوں کے اندر۔ انہیں کہاں سے یہ اتھارٹی مل گئی اور کس اتھارٹی کے ماتحت یہ ایک زبان والا قرآن رکھا اور باقی چھ زبانوں والا' کیوں نہ رکھا؟ کہ جی! یہ ان کی اپنی زبان میں تھا' قریش تھے' حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ بھی' یہ قریش کی زبان میں تھا۔ اُف! خدایا!

تیرے نشتر کی زدشریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

عزیزانِ من! دیکھیے اس لپیٹ میں کون کون نہیں آ جاتا: خدا نے سات زبانوں میں شائع کیا۔ کچھ پتہ نہیں کہ اس کی وجہ سے بعد میں خدا پہ اختلاف پیدا ہو جائیں گے۔ اس کے رسول نے سات زبانوں کے اندر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ احساس نہیں کیا۔ یہ قرآن آگے بھی حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک چلا' ان سے یہ بات پیدا ہوئی۔ انہیں وحی تو نہیں آتی تھی: سات زبانوں میں منزل من اللہ قرآن موجود تھے۔ یہ کس کی اتھارٹی اور سمجھ یا حکم کے مطابق ان میں سے چھ کو الگ کر دیا' ایک رکھا۔ یہ ہے جو آپ کو سبق دیا جا رہا ہے کہ یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ کوئی پکی روٹی کا ''ملا'' ہے' جو کہ جی! مسجد کا ملا ہے وہ یہ باتیں کر جاتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ جن کے متعلق یہ چیز کہی جا رہی ہے وہ تو اعلیٰ مقام پہ فائز ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ امام ابن تیمیہ' امام احمد بن حنبل کے مفہوم ہیں' یہ ان کے ہاں سے

آیا' ان کے متعلق کہا گیا۔ یہ کچھ قرآن کی بابت وہ لکھ رہے ہیں جنہیں جدید ترین مفسر کہا جا رہا ہے۔ ہاں تو بقول اُن کے یہ ایک جو قرآن تھا' یہ باقی رکھا اور عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے متعلق لمبی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ لسان کا لفظ ہے۔ لسان! عربی مبین میں لسان تو واحد کا صیغہ ہوتا ہے۔ اس کی جمع تو السنہ آنی تھی لیکن اس کے اندر یہ کچھ نہیں آیا۔ قرآن میں کہیں نہیں لکھا ہوا کہ ہم نے اسے سات زبانوں میں نازل کیا: یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ (19:97)۔ یہاں بھی تو لفظ لسان ہی ہے جو صیغ واحد ہے۔ کہتا رہے قرآن' عزیزانِ من! آپ تو کہتے ہیں کہ قرآن سات زبانوں میں ہے۔ مگر قرآن نے کہا ہے کہ عربی زبان میں ہے۔ خود عربی زبان میں ایک ایک لفظ کے لیے سو سو الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن جو عربی زبان ہی کا لفظ آیا ہے' اس کی جگہ عربی زبان کا کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو وہ بھی خدا کا قرآن نہیں رہتا۔ میں نے گزارش کیا ہے کہ کسی ترجمہ کا قرآن کا نعم البدل ہونا تو ایک طرف رہا' وہ تو خدا کا قرآن ہی نہیں رہتا۔

ذکر کچھ تفاسیر جلالین کا

عزیزانِ من! ہمارے ہاں اس قسم کی تفاسیر ہیں۔ جلالین ہمارے ہاں ایک تفسیر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عربی زبان میں لکھی جائے گی اور یہ ہے بھی عربی زبان میں۔ بہرحال قرآن کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں ہی وہ اسے سمجھائیں گے تو انہوں نے کیا ہی یہ ہے کہ قرآن کا لفظ لکھا ہے اور اس کے بعد قوسین کے اندر عربی زبان کے جو اس کے اور مترادف ہو سکتے ہیں' سمجھانے کے لیے وہ رکھ دیئے ہیں۔ پھر انہیں اگر آپ یوں اکٹھا کریں گے تو ایک طرف قرآن کا عربی متن ہوگا اور اس متن کے سامنے عربی مترادفات ہوں گے۔ اس میں یہی کیا گیا ہے۔ اس سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ اور وہ دوسرے الفاظ جو عربی زبان کے ہیں وہ تو قرآن کے ہو ہی نہیں سکتے خواہ وہ عربی کے کیسے الفاظ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہاں کہا یہ جا رہا ہے کہ قرآن سات زبانوں کے اندر نازل ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی ہی طرف سے' اپنے ہی فیصلے کے مطابق' چھ جلا دیئے ہیں' ایک رکھا۔ وحی تو آنی نہیں تھی پھر یہ کیسے بلسانک ہوا؟

قرآن حکیم کی تعلیم سے بہرہ یاب ہونے والی قوموں کے برعکس سوختہ بخت قوموں کی حالت زار اور اُن کا انجام

بات یہاں سے آئی تھی: لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (19:97)۔ یہ جماعتِ مومنین' جوان صداقتوں کو لے کے اٹھی ہے اور ابتدائی زندگی کے اندر انہیں بڑی دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے' انہیں کہہ دو: گھبراؤ نہیں۔ لِتُبَشِّرَ (19:97)۔ موسمِ خزاں میں آنے والی بہار کی انہیں خوش خبری دے دو۔ تو کہیں گے: نہیں کیونکہ اس میں تو ہمیں سوکھی ہوئی ٹہنیاں' لکڑیاں نظر آتی ہیں: نہ کوئی سبز پتہ' نہ کوئی پھول ہے' نہ کچھ اور ہے۔ کہا کہ ایمان بالغیب کے تحت ان ٹہنیوں کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔ اب یہ غیب میں ہے' کل ہی مشہود ہو کے سامنے آ جائیں گے: لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (19:97)۔ یہ تھی اتنے جھگڑے

نکالنے والی قوم' بات بات پہ بحث کرلو جی' مناظرے کرلو جی۔ کہا کہ جھگڑے نکالنے والی قوم کو آگاہ کرو کہ ایک تباہی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ یاد رکھو! یوں بات ان کی سمجھ میں نہ آئے تو ان سے کہو آؤ کہ تاریخ تو تمہارے سامنے ہے۔ ان اقوامِ سابقہ کی تاریخیں تو تمہاری اپنی کتابوں کے اندر بھی لکھی ہوئی ہیں۔ دیکھتے ہو کہ وہ قومیں کیسے مٹیں۔ خود تمہاری کتابوں میں بھی یہ لکھا ہوا ہے کہ جب فلاں قوم نے اس قسم کے جرائم کیے تھے تو وہ مٹ گئی۔ جب فلاں قوم نے اس قسم سے خدا کے خلاف سرکشیاں کی تو اس طرح مٹ گئی۔ اسے تو تم مانتے ہو تو پھر سوچو تو کہ **وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ** (19:98)۔ ہم نے ان سے پیشتر کتنی قومیں تھیں جنہیں ہلاک کر دیا' تباہ کر دیا' جنہیں ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق نیست و نابود کر دیا۔ ان سے یہ کچھ کہو۔ کیا الفاظ ہیں عزیزانِ من! بات تو اتنی بھی کافی تھی کہ **من قرن** (19:98)۔ ہر زمانے کے اندر قوم اٹھی' اسے تباہ کر دیا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ کیسے تباہ ہوئی ہیں؟

عزیزانِ من! آخری آیت ہے۔ کپکپا دینے والی ہے۔ کہا: **هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ** (19:98)۔ کیا ان میں کوئی بھی تمہیں محسوس طور پر نظر آتی ہے؟ کہیں ان کے غیر مرئی افسانے تو ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے تو قرآن نے کہا: **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ** (10:44)۔ یقین رکھو! خدا کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ انہیں پھر ہم نے افسانے بنا دیا: **هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ** (19:98)۔ کیا ان میں سے کوئی بھی اس طرح محسوس طور پہ نظر آتی ہے؟ یہ تو نظر آنے والی بات ہے۔ مزید کہا: **اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا** (19:98)۔ ان کا ذکر تو رہا ایک طرف' کیا ان کی تمہارے کان میں کوئی بھنک بھی پڑتی ہے؟ کہا: پھر قومیں اس طرح سے تباہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ بات ان کو بتا دو' ابھی سنبھل جانے کا وقت ہے' ورنہ یہ کچھ ہوا کرتا ہے۔ اور یہیں ختم کرنے کے فوراً بعد ہی اگلی سورۃ شروع کر دی جس میں یہی بات محسوس طور پر' تاریخ کی داستان دہرا دی کہ اور کچھ نہیں تو یہودی اور نصاریٰ تو دونوں حضرتِ موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کو مانتے ہیں' انہیں تو مانتے ہو' آؤ! ہم سے سنو۔ اس کے بعد پھر سورۃ طٰہٰ شروع ہو گئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀......❀

کتابیات

سورۃ الکھف اور سورۃ مریم کے اشاعتی مراحل میں جن کتب کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ انوار ہاشمی: تہذیب کی کہانی (نیا ایڈیشن)، کراچی بک سنٹر کراچی، ۱۹۷۹

۲۔ پرویز: لغات القرآن (جلد اول، بار اول) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۰

۳۔ پرویز: لغات القرآن (جلد دوم، بار اول) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۰

۴۔ پرویز: لغات القرآن (جلد سوم، بار اول) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۱

۵۔ پرویز: لغات القرآن (جلد چہارم، بار اول) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۱

۶۔ پرویز: سلیم کے نام خطوط (چوتھا ایڈیشن)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، ۱۹۶۶

۷۔ پرویز: شاہکار رسالت......حضرت عمر فاروق......(ایڈیشن چہارم) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، ۱۹۸۷

۸۔ پرویز: برقِ طور (ایڈیشن چہارم)، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ۱۹۹۳

۹۔ پرویز: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں (پانچواں ایڈیشن)، طلوع اسلام (ٹرسٹ رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۹۶

۱۰۔ پرویز: شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۶

۱۱۔ پرویز: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل (ایڈیشن اول)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور، ۲۰۰۳

۱۲۔ ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی، شاہد عشقی، خالد وہات، ساقی جاوید، اور محمد ناظم خان ماتلوی، گلزار اردو (حصہ دوم) سندھ ٹیکسٹ بورڈ، جام شورو، ۱۹۹۵

۱۳۔ ڈاکٹر محمد اقبال ضرب کلیم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶

۱۴۔ ڈاکٹر محمد اقبال: ارمغانِ حجاز اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۶

۱۵۔ ڈاکٹر محمد اقبال: بال جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۶

۱۶۔ ڈاکٹر محمد اقبال: بانگِ درا، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۶

۱۷۔ رامپوری آسی ضیائی، ایم ایس طاہر شادانی اور حفیظ الرحمٰن احسن، تحسین اردو، ایوانِ ادب، لاہور، ۱۹۹۲

۱۸۔ روزنامہ جسارت' کراچی' مجریہ ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ (خصوصی اشاعت)

۱۹۔ فیروز اللغات اردو جدید (نیا ایڈیشن)' فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور

۲۰۔ علامہ تمنا عمادی و دیگر علمائے کرام: امام زہری (حدیثِ سیرت کے مدون اول) و امام طبری (تفسیر و تاریخ کے مدون اول) تصویر کا دوسرا رخ' الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' کراچی

۲۱۔ مرزا اسداللہ خان غالب: دیوان غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور ۲۰۰۲

۲۲۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیر نگرانی) پرویز: مطالب فرقان فی دروس القرآن، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور

۲۳۔ پرویز: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۴ء

۲۴۔ پرویز: شعلۂ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۴ء

۲۵۔ پرویز: سلسبیل: مجموعہ خطبات و مقالات، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۷ء

۲۶۔ پرویز: معراج انسانیت (معارف القرآن، جلد چہارم)، ناشر ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ۱۹۴۹ء

۲۷۔ سید نذیر نیازی (مترجم معہ مقدمہ، حواشی اور تصریحات): حکیم الامت حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ: تشکیل جدید الھیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۸ء

۲۸۔ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم: وضع اصطلاحات، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۶۵ء

۲۹۔ ڈاکٹر نجم الاسلام (مدیر): تحقیق (آٹھواں نواں مشترکہ شمارہ) شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، نیو کیمپس جام شورو، ۹۵-۱۹۹۴ء

Bibblography

English Section

1- Fromm, Erich: The Sanc Society, Faweett Premier, New York, 1955
2- Fromm, Erich: Escape From Freedom, Avon Books, New York, 1965.
3- Fromm, Erich: Man For Himself: An Inquiry in to the Psychology of Ethics, Fawcett Premier, New York, 1975
4- Fromm, Erich: To Have Or To Be, Continuum, New York, 1976.
5- Manzoor-ul-Haque, Dr: The Quran`s Concept of self Integration; The Motive- Valence for Learning slamming new intrusions and old Obsessions, Islamic Univesity: Quarterly Academic Journal, ICIS, London, vol1, NO 3, 1994, pp 7-24.
6- Manzoor-ul-Haque, Prof. Dr. (Chief Editor), The Sindh University Journal of Education, Vol. XXX, 1998, Faculty of Education, University of Sindh, Elsa Kazi Campus, Hyderabad Sindh, 2000.
7- Manzoor-ul-Haque, Dr. The Quranic Model of Education, Muslim Education Quarterly, Winter Issue, Vol. 10, No.2 1993 (Islamic Academy, Cambridge, (UK)
8- Mirza, Tahir Ahmaed: Revelation, Rationality, Knowledge and Truth, Islamic International Publicationas Ltd, Surrey, UK. 1998.
9- Reader,s Digest Universal Dictionary, Reader`s Digest Association Limited, London, 1990.
10- Sheikh, M. Saeed (Ed) (1989) Allama Muhammad Iqbal: The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore: Iqbal Academy Pakistan, Institute of Islamic Culture.
11- Unwin, J.D (1934) Sex and Culture, London: Oxford University Press.

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)